تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان

تالیف

نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

(۱۸۳۲-۱۸۹۰ء)

تصحیح و تنقیح و نظر ثانی

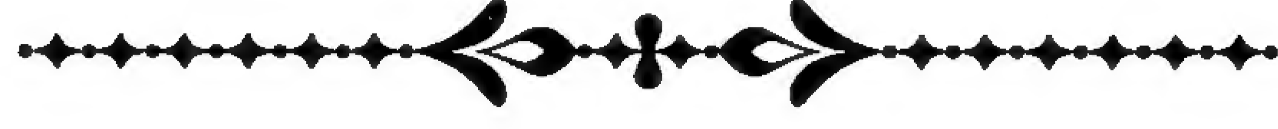
فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف رحمۃ اللہ علیہ | حافظ عبد اللہ سلیم حفظہ اللہ

تسہیل: محمد یحییٰ قریشی تخریج: حافظ حامد مشتاق فاضل مدینہ یونیورسٹی

جلد یازدہم

دار ابی الطیب للبحث والتحقیق

مکتبہ قدوسیہ



نام کتاب: ______________ تفسیر ترجمان القرآن

تالیف: ______________ نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

قیمت: ______________

طبع اول: ______________ جون 2025ء



ناشر

دار ابی الطیب

للبحث والتحقیق

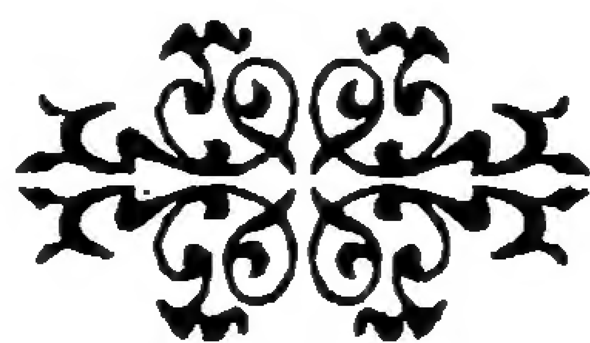
گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ

www.darabitayyab.com @ darabitayyab1@gmail.com

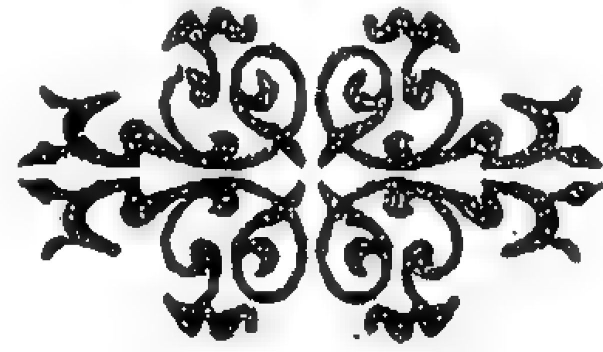
www.facebook.com/darabitayyab/

+92-55-3823990

فہرست



فہرست مضامین



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْمُلْكِ

سورۃ الملک کی فضیلت:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رفعاً کہا ہے کہ قرآن میں تیس (۳۰) آیت کی ایک سورت ہے، اس نے اپنے صاحب کی شفاعت کی، یہاں تک کہ وہ بخشا گیا، وہ سورت ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ ﴾ ہے۔[1] (رواه أحمد وأهل السنن الأربعة وحسنه الترمذي وابن الضريس والحاكم وصححه وابن مردويه والبيهقي في الشعب) سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ رفعاً کہتے ہیں: قرآن میں ایک سورت ہے، اس نے اپنے صاحب کی طرف سے جھگڑا کیا، یہاں تک کہ اس کو جنت میں داخل کیا۔[2] (رواه الطبراني والحافظ الضياء المقدسي وابن مردويه)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایک صحابی نے ایک جگہ خیمہ لگایا، وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ ایک قبر ہے، وہ ایک انسان کی قبر تھی، اس نے سورۃ الملک پڑھی، یہاں تک کہ اسے ختم کیا، پھر آ کر نبی کریم ﷺ سے کہا کہ میں نے ایک قبر پر خیمہ لگایا، مجھے گمان نہ تھا کہ وہ قبر ہے، اس قبر والے نے اندر سے سورۃ الملک شروع سے آخر تک پڑھی۔ فرمایا: "هِيَ الْمَانِعَةُ هِيَ الْمُنْجِيَةُ تُنْجِيهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ" یعنی یہ سورت منع کرنے والی اور عذاب سے نجات دینے والی ہے۔[3] (رواه الترمذي وقال: حديث غريب والحاكم وابن مردويه وابن النضر والبيهقي في الدلائل)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کا قول یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سوتے نہیں تھے جب تک سورۃ السجدہ اور سورۃ الملک نہ پڑھ لیتے۔ (رواه الترمذي) امام طاؤس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دونوں سورتیں قرآن کی ہر سورت پر ستر حسنہ بڑھ کر ہیں۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ یہ سورت میری امت میں سے ہر انسان کے دل میں ہو۔[5] (رواه الطبراني وهو غريب) ایک دفعہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک شخص

---

① مسند أحمد (۲۹۹/۲) سنن أبي داؤد (۱۴۰۰) سنن الترمذي (۲۸۹۱) سنن النسائي الكبرىٰ (۱۷۸/٦) سنن ابن ماجه (۳۷۸٦) مستدرك الحاكم (۷۵۳/۱) شعب الإيمان (۴۹۳/۲) صحيح الجامع (۲۰۹۱)

② المعجم الأوسط (۷٦/٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (۳٦٤٤)

③ سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۸۹۰) اس کی سند میں "یحییٰ بن عمرو بن مالک" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع: ٦١٠١)

④ سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۸۹۲) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٨٧٣)

⑤ المعجم الكبير (۲٤۱/۱۱) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه إبراهيم بن الحكم بن أبان وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ۲۷۰/۷)

سے کہا: میں تجھ کو ایک ایسی حدیث کا تحفہ نہ دوں جس سے تو خوش ہو جائے؟ اس نے کہا: ہاں، تو فرمایا کہ سورۃ الملک پڑھ اور اپنے گھر والوں کو اور اپنی ساری اولاد کو سکھا اور اپنے بچوں کو تعلیم کر کہ یہ سورت نجات دینے والی ہے اور مجادلہ (جھگڑا) کرنے والی ہے۔

یہ قیامت کے دن اپنے رب سے اپنے پڑھنے والوں کے لیے لڑائی یا جھگڑا کرے گی اور عذابِ نار سے اس کے لیے نجات چاہے گی اور اس کے سبب سے اس کا پڑھنے والا عذابِ قبر سے نجات پائے گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «لَوَدِدْتُ أَنَّهَا فِي قَلْبِ كُلِّ إِنْسَانٍ مِنْ أُمَّتِي» [1] (رواه عبد بن حميد والطبراني والحاكم وابن مردويه)

فتح البیان میں کہا ہے کہ اس سورت کا نام سورت تبارک اور واقعہ اور منجیہ ہے اور تورات میں اس کا نام مانعہ ہے، اس کی تیس آیتیں ہیں اور مکہ میں نازل ہوئی۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: سب کے قول کے مطابق۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اس کو مکی کہا ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت رفعاً یہ ہے کہ ﴿تَبٰرَكَ﴾ عذابِ قبر سے روکتی ہے۔[4] (أخرجه ابن مردويه والنسائي وصححه الحاكم) سیدنا رافع بن خدیج اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما نے سنا کہ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: مجھ پر یہ سورت ایک ہی بار میں نازل ہوئی، اس کی تیس (۳۰) آیتیں ہیں، یہ قبروں میں مانع ہے، یعنی عذابِ قبر سے منع کرتی ہے۔[5] (رواه ابن مردويه)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرُۨ ۝۱ الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝۲ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۭ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝۳ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝۴ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاۗءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ۝۵

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

وہ ذات بڑی ہی بابرکت ہے جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ①

---

① مسند عبد بن حميد (۲۰٦/۱) المعجم الكبير (۲٤۱/۱۱) ② تفسير القرطبي (۲۰۵/۱۸) ③ الدر المنثور (۲۳۰/۸)
④ الدر المنثور (۲۳۱/۸) ⑤ الدر المنثور (۲۳۱/۸) فتح البيان (۲۲۷/۱٤، ۲۲۸)

وہ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا، تا کہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔ اور وہ زبردست ہے، خوب بخشنے والا ② وہ جس نے سات آسمان اوپر نیچے پیدا کیے۔ (اے انسان!) تو رحمان کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں دیکھے گا، پھر نگاہ ڈال، کیا تو کوئی دراڑ دیکھتا ہے؟ ③ پھر بار بار نگاہ دوڑا، (تیری) نگاہ ذلیل و خوار ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی، جبکہ وہ تھکی ماندی ہوگی ④ اور البتہ یقیناً ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے زینت دی ہے اور انھیں شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا ہے، اور ہم نے ان کے لیے بھڑکتی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے ⑤

موت وحیات، آسمان اور ستاروں کی تخلیق:

موضح القرآن میں کہا ہے کہ اگر موت نہ ہوتی تو اچھائی اور برائی کا بدلہ کہاں ملتا۔ فرق یہ کہ جیسا چاہیے ویسا نہ ہو۔ انتھی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اپنے نفسِ کریم کی تمجید کی ہے اور یہ خبر دی ہے کہ بادشاہت اسی کے ہاتھ میں ہے، یعنی اپنی مخلوقات میں جس طرح تصرف کرنا چاہے کوئی اس کے حکم کو ٹالنے والا نہیں ہے۔ اس کے غلبے اور حکمت اور عمل کی وجہ سے کوئی اس کے فعل کے بارے میں سوال نہیں کر سکتا۔ اس لیے یہ فرمایا کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے، پھر موت اور حیات کے پیدا کرنے کا ذکر کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ موت بھی ایک وجودی امر ہے، کیوں کہ مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خلائق کو عدم سے وجود بخشا۔ یہ اس لیے کہ ان کا امتحان کرے کہ کس کے عمل اچھے ہیں اور کس کے برے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ﴾ [البقرة: ٢٨] ''تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو؟ حالانکہ تم مردے تھے اس نے تمھیں زندہ کیا۔''

پہلی حالت جو عدم تھی، اس کا نام موت رکھا اور اس ایجاد کا نام حیات مقرر کیا، لہٰذا فرمایا: ﴿ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ﴾ [البقرة: ٢٨] ''پھر تمھیں مار ڈالے گا، پھر زندہ کرے گا۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے رفعاً کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو موت سے ذلیل کیا اور دنیا کو زندگی کا گھر ٹھہرایا پھر موت کا اور آخرت کو جزا کا گھر ٹھہرایا۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم) معمر نے اس کو موقوفاً روایت کیا ہے۔ احسن عمل سے عملِ خیر مراد ہے۔ محمد بن عجلان نے کہا: یہ نہیں فرمایا کہ ''أَكْثَرُ عَمَلًا''، یعنی حسنِ عمل پر نظر کی نہ کہ عمل کی قلت و کثرت پر۔[2] لہٰذا حدیث میں آیا ہے: «أَخْلِصْ دِيْنَكَ يَكْفِيْكَ الْعَمَلُ الْقَلِيْلُ»[3] ''اپنی دین داری میں مخلص ہو جا، تجھے تھوڑا عمل بھی کافی ہوگا۔''

﴿ اَلْعَزِيْزُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی شان عظیم ہے اور اس کی جناب بہت بلند اور زبردست ہے۔ وہ

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (٣٣٦٣/١٠) یہ روایت مرسل ہے۔ ② تفسیر ابن کثیر (٥٠٨/٤) ③ مستدرك الحاكم (٣٤١/٤)

بخشنے والا ہے، جو بندہ توبہ کرتا ہے اور اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو بخش دیتا ہے، حالاں کہ پہلے وہ گناہ گار اور حکم کی مخالفت کرنے والا تھا۔ پس اگرچہ وہ عزیز ہے لیکن بخشنے والا، رحم کرنے والا صرفِ نظر کرنے والا اور درگزر کرنے والا ہے۔ اس نے آسمان کے سات طبقے بنائے ایک کے بعد ایک۔ بعض نے کہا: یہ طبقات آپس میں ملے ہوئے ہیں یعنی علویات ایک کے اوپر ایک۔ بعض نے کہا: متفاصلات ہیں، ان کے درمیان خلا ہے، یہی قول زیادہ صحیح ہے، اس پر حدیثِ اسراء یعنی حدیثِ معراج بھی دلیل ہے۔ تفاوت کی نفی کا یہ مطلب ہے کہ وہ مصطحت و مستوی ہیں، ان کے بیچ میں کوئی اختلاف و تنافر و مخالفت و نقص و عیب و خلل نہیں ہے۔ لہٰذا فرمایا ہے کہ آسمان کی طرف نظر اٹھا کر غور سے دیکھ کہ ان میں کوئی عیب یا نقصان یا خلل یا شگاف ہے کہ نہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ضحاک اور ثوری رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ ﴿ فُطُوْرٍ ﴾ "شقوق" کے معنی میں ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خروق کے معنی میں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ فُطُوْرٍ ﴾ سے مراد کمزوری ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: خلل ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ خَاسِئًا ﴾ بہ معنی ذلیل ہے۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا: بہ معنی "صاغر" ہے، یعنی خوار۔ ﴿ حَسِيْرٌ ﴾ کے معنی ہیں: کلیل، یعنی درماندہ۔ (قالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما) امام مجاہد، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا: ﴿ حَسِيْرٌ ﴾ وہ ہے جو تھک کر رہ جائے۔[1] آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اگر تو بار بار نظر کرے گا تو ہر بار تیری نظر عیب اور خلل سے تھک کر لوٹ آئے گی اور باوجود بار بار دیکھنے کے کوئی نقصان نہ پائے گی۔

پھر کسی قسم کے نقص کے نہ ہونے کا ذکر کرنے کے بعد اس کے کمال اور زینت کا ذکر فرمایا کہ ہم نے آسمان میں جو سیارے اور ثوابت رکھے ہیں ان تاروں سے ان کو رونق دی ہے اور ہم شیطانوں کو ان چراغوں کی جنس سے مار کر نکال دیتے ہیں۔ اس جگہ جنس کا لفظ ہم نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ خود ستاروں سے ان کو نہیں مارتے، بلکہ شہب، جو تاروں کے علاوہ ہیں، ان سے ان کو مارتے ہیں اور کبھی وہ شہب انھی تاروں سے مستمد ہوتے ہیں۔ واللہ أعلم.

پھر فرمایا کہ یہ رجم کرنا تو اس دنیا میں ان شیاطین کی رسوائی کے لیے ہے اور آخرت میں عذابِ سعیر ہے جس طرح کہ سورۃ الصافات کے شروع میں فرمایا ہے: ﴿ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِالْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴾ [الصافات: ۷۔ ۱۰] "ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں کی زینت سے آراستہ کیا اور حفاظت کی ہر سرکش شیطان سے، عالمِ بالا کے فرشتوں (کی باتوں) کو سننے کے لیے وہ کان بھی نہیں لگا سکتے، بلکہ ہر طرف سے وہ مارے جاتے ہیں۔ بھگانے کے لیے اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے مگر جو کوئی ایک آدھ

[1] تفسیر الطبري (۲۳/۵۰۶، ۵۰۷) تفسیر ابن کثیر (۴/۵۰۸)

بات اچک لے بھاگے تو (فوراً ہی) اس کے پیچھے دہکتا ہوا شعلہ لگ جاتا ہے۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ستارے تین کام کے لیے بنائے گئے ہیں: ایک آسمان کی رونق، دوسرے شیاطین کا بھگانا، تیسرے علامت جس سے راہ معلوم کریں، اب جو کوئی ان کے سوا کوئی اور بات بنائے گا وہ اپنی رائے سے کہے گا اور اپنے نصیب اور حصے اور بہرے سے چوک جائے گا اور جو بات وہ جانتا نہیں وہ بہ تکلف بیان کرے گا۔[1] (رواه ابن جرير وابن أبي حاتم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ برکت سے ﴿ تَبٰرَكَ ﴾ کا صیغہ نکلا۔ برکت بڑھنے اور زیادہ ہونے کو کہتے ہیں، یعنی اللہ بڑی برکت والا ہے مخلوقین کی صفات سے متعالی و متعاظم (بلند و عظیم) ہے۔ یا دائم ہے جس کے وجود کی ابتداء اور دوام کی انتہاء نہیں ہے۔ یا ﴿ تَبٰرَكَ ﴾ بہ معنی تقدس ہے۔ پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ ملک سے مراد آسمان اور زمین و دنیا اور آخرت کی بادشاہت ہے، وہ جس کو چاہے عزت دے یا ذلیل کرے یا بلند فرمائے یا پست کرے۔ بعض نے کہا ہے کہ ملک سے مراد نبوت ہے یا امر و نہی و سلطان، یعنی تمام مخلوقات پر غلبہ اور اختیار ہے کہ جس طرح چاہے ان میں تصرف کرے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ملک تمام قدرت و استحکام سے عبارت ہے،[2] لیکن پہلے معنی زیادہ مناسب ہیں، کیوں کہ اس میں عموم پر حمل ہے اور یہ مدح میں اکثر ہے اور ثنا میں ابلغ ہے اور تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ وہ ایسا قدرت والا ہے کہ اپنی حکومت میں اسے کوئی شے عاجز نہیں کر سکتی۔ وہ ہر قسم کے انعام اور انتقام، رفع، وضع، اعطاء اور منع کا تصرف رکھتا ہے۔ موت روح کا بدن سے تعلق منقطع ہونا ہے اور جان کا تن سے جدا ہونا ہے اور حیات روح کا بدن سے تعلق اور اس کا جسم سے متصل ہونا ہے۔ موت حیات کے برعکس ایک وجودی صفت ہے یا مراد دنیا میں موت ہے اور آخرت میں حیات ہے، لیکن یہ قول بعید ہے۔ موت کو حیات سے پہلے اس لیے رکھا کہ اشیاء میں اصل عدم اور حیات ہے اور حیات اشیاء کو عارض ہوتی ہے، یا یہ کہ موت قہر کے زیادہ قریب ہے۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خلقِ موت سے مراد نطفہ و مضغہ و علقہ ہے اور حیات سے مراد یہ ہے کہ اس کو انسان بنایا اور اس میں روح پیدا کی۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ موت دُنبے کی صورت پر ہے جس چیز پر اس کا گزر ہوتا ہے وہ مر جاتی ہے اور حیات گھوڑے کی طرح ہے جس شے پر گزرتی ہے وہ زندہ ہو جاتی ہے۔[3] (قاله المقاتل والكلبي)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ﴾ [السجدة: ١١] ''کہہ دیجیے کہ تمھیں موت کا فرشتہ فوت کرے گا جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓىِٕكَةُ ﴾ [الأنفال: ٥٠] ''جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا ﴾ [الأنعام: ٦١] ''اس کی

---

[1] تفسير الطبري (٥٠٨/٢٣) تفسير ابن أبي حاتم (٢٩١٣/٩) تفسير ابن كثير (٥٠٨/٤، ٥٠٩)

[2] فتح البيان (٢٢٩/١٤) [3] تفسير القرطبي (٢٠٧/١٨، ٢٠٦) فتح القدير (٣٤٤/٥)

روح ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے قبض کر لیتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا ﴾ [الزمر: ٤٢]
''اللہ ہی روحوں کو ان کی موت کے وقت قبض کر لیتا ہے۔''

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: حیات وہ شے ہے جس کے ہوتے ہوئے احساس صحیح ہو اور موت اس کی ضد ہے۔ ان کے پیدا کرنے سے مراد اس مصحح (اللہ تعالیٰ کی ذات) کا ایجاد کرنا اور عدم میں لے جانا ہے۔ یعنی اے مکلفو! ہم نے تمھاری موت اور حیات اس لیے بنائی ہے، تاکہ ہم تم سے وہ معاملہ کریں جو ایک ممتحن کرتا ہے اور ورنہ اللہ کا علم تو شروع ہی سے ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔[1]

﴿ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ دیکھیں تم میں سے کون سا شخص موت کو بہت یاد کرتا ہے اور خوب مستعد اور خوف زدہ ہے۔ یا اللہ کی اطاعت کی طرف جلدی کرنے والا اور اللہ کی حرام کردہ چیزوں سے بہت بچنے والا ہے۔ یا کون سا شخص عمل میں زیادہ خالص اور زیادہ صحیح ہے۔ خالص وہ ہوتا ہے جو صرف اللہ کے لیے ہو اور ثواب یعنی صحیح وہ ہوتا ہے جو سنت کے مطابق ہو۔ یا تم میں سے کون سا شخص دنیا میں بڑا زاہد اور تارک ہے، لیکن عام معنی لینا زیادہ بہتر ہے۔ لفظ ''طباق'' طبق کی جمع ہے یا ''طبقة'' کی جمع ہے یا مصدر ہے یا ''ذات طباق'' کے معنی میں ہے۔ کچھ بھی ہو بعض آسمان بالائے مطبق ہیں ہر آسمان دوسرے آسمان پر ایک قبہ ہے اور دنیا کا آسمان زمین پر قبہ ہے۔

امام بقاعی رحمہ اللہ نے کہا: طباق ہے، یعنی ان کا ہر جزو دوسرے کے جزو کے مطابق ہے، کوئی جزو اس سے خارج نہیں ہے،[2] اس لیے نبی کریم ﷺ کو یا ہر صالح خطاب کو فرمایا ہے کہ بھلا کیا تو رحمان کی پیدائش میں کچھ فرق پاتا ہے۔ یہ ﴿ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ﴾ کی دوسری صفت ہے۔ ﴿ تَفٰوُتٍ ﴾ سے مراد تناقض، تباین، اعوجاج اور تخالف ہے، یعنی ان میں اس قسم کا کوئی نقص نہیں ہے، بلکہ یہ سب مستقیم ہیں اور اپنے خالق پر دلیل ہیں، اگرچہ صورت اور صفت میں مختلف ہوں، مگر اس حیثیت سے متفق ہیں۔ ﴿ تَفٰوُتٍ ﴾ کی حقیقت آپس میں مناسبت نہ ہونا ہے کہ بعض شے بعض سے فوت ہو جائے۔

﴿ فُطُوْرٍ ﴾ کی اصل شق ہونا اور دراڑ پڑنا ہے، چنانچہ اس کی نفی فرمائی اور بار بار دیکھنے کے لیے ارشاد کیا، کیوں کہ یہ بار بار کا کرنا حجت قائم کرنے کے لیے اور عذر قطع کرنے کے لیے سب سے مؤثر بات ہے، یا پہلی بار کا دیکھنا اس کے حسن اور برابری کو دیکھنا ہے اور دوسری بار کا دیکھنا اس کی سیر اور کواکب کی انتہا کا نظر آنا ہے۔ سمائے دنیا سے مراد وہ آسمان ہے جو زمین سے نزدیک ہے باقی آسمانوں میں، صرف اسی آسمان کو لوگ دیکھتے ہیں۔

''مصابیح'' سے مراد ستارے ہیں۔ آسمان ان تاروں کی وجہ سے نہایت خوبصورت، حسین خلقت اور کامل

---

[1] تفسير النسفي (٢٦٣/٤) [2] نظم الدرر للبقاعي (٩٦/٨)

صورت ہو گیا ہے۔ تاروں کو چراغ اس لیے کہا ہے کہ چراغ کی طرح چمکتے ہیں۔ بعض کواکب اگرچہ دوسرے آسمانوں میں ہیں، لیکن دیکھنے میں ایسا لگتا ہے کہ یہ سب اسی آسمانِ دنیا پر ہیں، کیوں کہ آسمانوں کا جرم (جسم یا جثہ) ایسا نہیں ہے کہ اس سے اوپر کی طرف دیکھا نہ جا سکے، یہ اجرام صاف وشفاف ومصقل (صیقل کیے گئے) ہیں۔ پھر آسمان کی زینت اور رونق کے علاوہ ان مصابیح کا دوسرا فائدہ شیاطین کو رجم کرنا ہے جو بات چرانے کے لیے اوپر جاتے ہیں۔ ان تاروں میں سے شہب، یعنی آگ نکلتی ہے اور اس جن کو قتل کرتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴾ [الصافات: ١٠] ”مگر جو کوئی ایک آدھ بات اچک لے بھاگے تو (فوراً ہی) اس کے پیچھے دہکتا ہوا شعلہ لگ جاتا ہے۔“ غرض یہ کہ یہ تارے اپنی جگہ سے جدا نہیں ہوتے ان سے آگ کا شعلہ نکل کر شیطان کے پیچھے لگ جاتا ہے۔[1]

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۶
اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ ۝۷ تَكَادُ
تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۭ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ
اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝۸ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَاۗءَنَا نَذِيْرٌ ڏ فَكَذَّبْنَا
وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ښ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ۝۹
وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ
السَّعِيْرِ ۝۱۰ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝۱۱

اور جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا، ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے، اور (وہ) برا ٹھکانا ہے ⑥ جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے تو اس کی دھاڑ سنیں گے اور وہ جوش مارے گی ⑦ قریب ہے کہ وہ غیظ وغضب سے پھٹ پڑے۔ جب بھی کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا، اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے: کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ ⑧ وہ کہیں گے: کیوں نہیں! یقیناً ڈرانے والا ہمارے پاس آیا تھا، چناں چہ ہم نے (اس ڈرانے والے کی) تکذیب کی اور ہم نے کہا کہ اللہ نے (کسی پر) کچھ بھی نہیں اُتارا، تم تو بہت بڑی گمراہی میں ہو ⑨ اور وہ کہیں گے: کاش ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو ہم دوزخ والوں میں نہ ہوتے ⑩ پھر وہ اپنے گناہ کا اعتراف کریں گے، چناں چہ دوزخ والوں پر لعنت ہے ⑪

---

[1] فتح البیان (۱۴/۲۲۹۔۲۳۴)

جہنم اور اس میں داخل ہونے والوں کا ذکر:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "مصیر" سے مراد انجام کار اور برا انقلاب ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "شہیق" سے مراد چیخنا ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "فوران" سے مراد غلیان ہے۔[1] یعنی جس طرح بہت سے پانی میں تھوڑے دانے جوش مارتے ہیں، اسی طرح دوزخ جوش زن ہوگی۔ لگتا ہے کہ غصے کے مارے اس کے بعض اجزاء بعض سے جدا ہو جائیں۔ اس سوال اور جواب میں اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ کسی کو اتمام حجت کے بغیر اور رسول بھیجے بغیر عذاب نہیں کرتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ [بني إسرائيل: ١٥] "اور ہماری سنت نہیں کہ رسول بھیجنے سے پہلے ہی عذاب کرنے لگیں۔"

نیز فرمایا: ﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَتْلُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ رَبِّكُمْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ [الزمر: ٧١] "جب وہ اس کے پاس پہنچ جائیں گے اس کے دروازے ان کے لیے کھول دیے جائیں گے، اور وہاں کے نگہبان ان سے سوال کریں گے کہ کیا تمھارے پاس تم میں سے رسول نہیں آئے تھے؟ جو تم پر تمھارے رب کی آیتیں پڑھتے تھے اور تمھیں اس دن کی ملاقات سے ڈراتے تھے؟ یہ جواب دیں گے کہ ہاں درست ہے لیکن عذاب کا حکم کافروں پر ثابت ہو گیا۔" اسی طرح اس جگہ بھی اپنی جانوں کو ملامت کریں گے لیکن یہ ندامت کچھ کام نہ آئے گی بلکہ اپنے قصور کا اقرار کریں گے۔ ابو البختری سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے کہ لوگ ہلاک نہ ہوں گے، یہاں تک کہ خود اپنا عذر پیش کریں گے۔[2] (رواہ أحمد) دوسری حدیث میں یوں ہے کہ کوئی شخص آگ میں داخل نہ ہوگا، لیکن وہ جانتا ہوگا کہ جنت کی نسبت آگ ہی اس کے لائق تر ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ "شہیق" سے مراد منکر ہے، جیسے: اول نہیق کے وقت گدھے کی آواز، یہ سب آوازوں سے زیادہ بری آواز ہوتی ہے۔ پس پہلے دوزخ ایک دھاڑ مارے گی جس طرح کہ خچر جو کے لیے آواز کرتا ہے، پھر ایک ایسی چیخ مارے گی جس سے ہر کوئی ڈر جائے گا اور گھٹنوں کے بل ہو جائے گا اور وہ دیگ کی طرح ابلتی ہوگی، قریب ہے کہ غصے کے مارے کافروں پر پھٹ جائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: متفرق ہو جائے۔[4] فوج سے مراد مردوں کی جماعت ہے، یہ کفار کی جماعت ہوگی۔ "خزنة" سے مراد عذاب کے فرشتے ہیں، وہ ان سے

---

[1] تفسير الطبري (٥٠٩،٥٠٨/٢٣) تفسير ابن كثير (٥٠٩/٤) [2] مسند أحمد (٢٦٠/٤) صحيح الجامع (٥٢٣١)
[3] ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت نہیں ملی ہے، البتہ تفسیر ابن کثیر (٥٠٩/٤) میں اسی طرح ذکر ہے۔ [4] تفسير الطبري (٥٠٩/٢٣)

ڈانٹ ڈپٹ اور ملامت کے طور پر پوچھیں گے کہ کیا دنیا میں تمھارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے: ہاں آیا تھا، ہر فوج کا ایک ڈرانے والا تھا، یہ ان کا اللہ کے انصاف کا اقرار ہے کہ اللہ نے تو رسول بھیج کر ہم کو ڈرایا تھا، لیکن ہم نے ان کو اللہ کی طرف سے نہ سمجھا، بلکہ ان کو جھٹلایا، یہاں تک کہ زیادتی کی اور یوں کہا کہ اللہ نے کوئی شے بھی نہیں اتاری، چہ جائے وعد اور وعید وغیرہما کے، تم سب بڑی گمراہی میں پڑے ہو۔

یہ قول کفار کا رسولوں سے تھا یا آگ کے ان فرشتوں کا قول ان افواج سے ہوگا۔ یا رسول یہ بات کفار سے کہیں گے۔ لیکن جمہور مفسرین نے پہلے قول کو ہی غالب ٹھہرایا ہے۔ پھر اس مقولہ کے بعد وہ یہ کہیں گے کہ کاش! ہم پیغمبروں کی بات سنتے یا سمجھتے تو آج دوزخ میں کیسے ہوتے۔ معلوم ہوا کہ تکلیف کا دارومدار سمعی اور عقلی دلیلوں پر ہے اور یہ دونوں حجتیں لازم ہیں۔ چنانچہ جب انھوں نے یہ اقرار کر لیا تو اللہ نے کہا کہ اے آگ والو! دور ہو جاؤ، یعنی اللہ کی رحمت سے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”سُحْقًا“ بہ معنی ”بُعْدًا“ ہے اور امام سعید بن جبیر اور ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جہنم میں ایک جنگل ہے۔[1]

اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ
كَبِیْرٌ ﴿۱۲﴾ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ
بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ﴿۱۴﴾
هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا
وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾

بے شک جو لوگ اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے ⑫ اور تم اپنی بات چھپا کر کہو یا اُسے پکار کر کہو، بے شک وہ سینوں کے بھید خوب جانتا ہے ⑬ بھلا وہ نہ جانے گا جس نے (سب کو) پیدا کیا۔ اور وہی باریک بین، بہت باخبر ہے ⑭ وہی ہے جس نے زمین کو تمھارے تابع کر دیا، لہٰذا تم اس کی راہوں میں چلو اور اس (اللہ) کے رزق میں سے کھاؤ، اور اسی کی طرف جی اُٹھنا ہے ⑮

اللہ تعالیٰ سے بن دیکھے ڈرنے والوں کی جزاء کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اس شخص کا حال بتایا ہے جو اللہ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا ہے، جبکہ لوگوں سے غائب ہوتا ہے اور گناہوں سے باز رہتا ہے اور تنہائی میں اللہ کی اطاعت بجا لاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

---

[1] تفسیر الطبري (۲۳/۵۱۰، ۵۱۱) فتح البيان (۱۴/۲۳۵_۲۳۷)

کے سوا اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ ایسے شخص کے لیے مغفرت اور اجر کبیر ہے، اس کے گناہ معاف ہو کر اسے بڑا ثواب دیا جائے گا جس طرح کہ صحیح میں آیا ہے کہ سات شخصوں کو اللہ اپنے عرش کے سائے میں جگہ دے گا، ان میں سے ایک شخص وہ ہوگا جس کو ایک صاحب منصب و جمال عورت نے بلایا اور اس نے کہا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور دوسرا وہ شخص ہے جس نے چھپا کر صدقہ دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو علم نہیں کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا۔[1]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم آپ کے پاس ایک حالت پر ہوتے ہیں اور جب آپ سے جدا ہوتے ہیں تو اور ہی حالت پر ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ تمھارا معاملہ تمھارے رب کے ساتھ کیسا ہے؟ کہا کہ اللہ پاک ہمارا رب ہے پوشیدہ طور پر بھی اور اعلانیہ طور پر بھی۔ فرمایا: یہ نفاق نہیں ہے۔[2] (رواہ البزار) معلوم ہوا کہ اللہ کے ساتھ پوشیدہ اور ظاہر میں ایک جیسا معاملہ نہ ہونا نفاق ہوتا ہے۔ پھر اللہ پاک نے اس بات پر آگاہ کیا کہ اللہ خفیہ اور پوشیدہ چیزوں پر مطلع ہے۔ تمھارے سینے میں جو خیال ہوتا ہے، وہ اللہ کو معلوم ہے، تمھاری کوئی چھپی اور کھلی بات اس پر پوشیدہ نہیں ہے، کیا بھلا خالق کو اپنی مخلوق کا علم نہیں ہوتا؟ اللہ بڑا لطیف اور خبر رکھنے والا ہے۔

پھر مخلوق پر اپنی نعمت کا ذکر کیا جو زمین کی تسخیر اور تذلیل کے متعلق ہے کہ ہم نے اس زمین کو ساکن اور برقرار کر دیا ہے، نہ وہ ممتد (پھیلائی گئی) ہو نہ مضطرب، اس میں پہاڑ رکھ دیے ہیں اور چشمے جاری کر دیے ہیں اور راہیں نکال دی اور منافع مہیا کر دیے اور پھل اور کھیتی کی جگہ مقرر کر دی، اب تم زمین کے جس حصے میں چاہو سفر کرو اور طرح طرح کے کسب و تجارت کے لیے چلو پھرو اور یہ جان لو کہ تمھاری سعی اور کوشش سے کچھ نہیں ہوتا، جب تک کہ اللہ ہی رزق کو تم پر آسان نہ کر دے۔ لہٰذا فرمایا: ﴿ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ﴾ معلوم ہوا کہ اسباب کے لیے سعی کرنا کوئی توکل کے منافی نہیں ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: اگر تم اللہ پر توکل کرو جیسا کہ چاہیے تو وہ تم کو اس طرح رزق دے جس طرح پرندوں کو دیتا ہے کہ بھوکے جاتے ہیں اور پیٹ بھر کر آتے ہیں۔[3] (رواه الترمذي وصححه و النسائي و ابن ماجه)

اس حدیث میں اللہ پر توکل کے ساتھ پرندوں کا صبح شام کو آنا جانا ثابت کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تسخیر کرنے والا اور چلانے والا اور سبب پیدا کرنے والا ہے اور قیامت کے دن اسی کی طرف پھر جانا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سدی اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مناکب سے مراد اطراف و فجاج (کھلے راستے) و نواحی (گرد و نواح) ہیں۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جبال (پہاڑ) ہیں۔[4] بشیر بن کعب رحمہ اللہ نے اس آیت کو پڑھ کر اپنی ایک ام ولد سے کہا کہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣١)

[2] مسند البزار (٣٠٨/١٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٠٢٠)

[3] سنن الترمذي (٢٣٤٤) سنن ابن ماجه (٤١٦٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٢٥٤) [4] تفسير الطبري (٥١٢/٢٣)

اگر تو مناکب کو جانتی ہے تو میں نے تجھے آزاد کیا۔ اس نے کہا کہ پہاڑ مراد ہیں۔ بشیر نے سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے پوچھا، انھوں نے کہا: ”هِيَ الْجِبَالُ“[1] (رواه ابن أبي حاتم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ غیب میں ڈرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے عذاب کو نہیں دیکھا ہے، لیکن خوف سے اللہ کے اس عذاب پر ایمان لائے ہیں، یا لوگوں کی آنکھ سے غائب ہیں اور علاحدگی میں اللہ کا ڈر رکھتے ہیں اور پوشیدہ اس کی اطاعت کرتے ہیں تو علانیہ تو بدرجہ اولیٰ ڈرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ لوگ ابوبکر، عمر، علی اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم ہیں،[2] ان کے لیے گناہوں کی بڑی بخشش ہے اور ایک بڑا اجر ہے جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اجر یہی جنت ہے اور اس جیسا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ﴾ [یٰسٓ: ۱۱] ”اور رحمان سے بے دیکھے ڈرے۔“

آیت کا ظاہر عام ہے۔ پھر کہا کہ اللہ کے علم میں چھپی ہوئی اور کھلی ہوئی بات برابر ہے۔ تم پیغمبر کے حق میں اپنی بات چھپاؤ یا کھول کر کہو وہ سب جانتا ہے۔ ”سر“ کو ”جهر“ سے پہلے اس لیے رکھا کہ وہ رسوا ہوں اور جس بات سے انھیں خوف ہے وہ پہلے ہی ان کو جتا دی جائے۔ اس جگہ ”صدور“ سے مراد ”قلوب“ ہیں۔ یہ کہنے میں کہ کیا خلاق کو اپنی مخلوق کا علم نہیں ہے، اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ بندوں کے افعال کا خالق ہے۔ ”لطیف“ کے یہ معنی ہیں کہ کوئی مخفی راز اس پر پوشیدہ نہیں رہتا۔

”ذلول“ سے مراد یہ ہے کہ زمین کو سہل و نرم و فرمانبردار کر دیا ہے، تم اس پر رہتے بستے ہو اور چلتے پھرتے ہو اور اس میں بیج بوتے ہو، اس پر ہل جوتتے ہو۔ اگر زمین درشت اور سخت ہوتی تو تم اس پر نہ سکونت کر سکتے اور نہ اس پر چل سکتے۔ اب تم اس کی چاروں اطراف میں چلو پھرو، استدلال کرو اور رزق تلاش کرو۔ مناکب سے مراد راستے اور جوانب، اطراف اور نواحی ہیں۔ امام قتادہ اور شہر بن حوشب رحمہ اللہ نے کہا: پہاڑ ہیں۔[3] کسی نے کہا: کھلے راستے ہیں، اصل میں منکب جانب کے معنی میں ہے۔ پھر فرمایا کہ اس کا رزق کھاؤ، اللہ کی نعمت کی تلاش کرو۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ پیشہ ور بندۂ مومن کو دوست رکھتا ہے۔[4] (أخرجه الطبراني وابن عدي والبيهقي والحكيم الترمذي)

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳۶۳/۱۰) تفسیر ابن کثیر (۵۰۹/٤، ۵۱۰) [2] الدر المنثور (۲۳٦/۸)

[3] تفسیر الطبري (۵۱۲/۲۳) فتح القدیر (۳٤۸/۵)

[4] المعجم الکبیر (۳۰۸/۱۲) شعب الإیمان (۸۸/۲) اس کی سند میں ”عاصم بن عبید اللہ اور ابو الربیع“ ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ۱۷۰٤)

میں کہتا ہوں: میری جائے پیدائش اور وطن زمین میاں دو آب تھا۔ ۱۲۷۱ ہجری سے میرا رزق سرزمین مالوہ کے پہاڑوں میں اتارا، میں رزق کی تلاش میں وطن چھوڑ کر ان مناکبِ ارض میں آ رہا، اب تک اسی جگہ پر ہوں۔ "نشور" سے مراد جزا کے لیے قبروں سے نکلنا ہے، اس وقت نعمت کی شکر گزاری کے متعلق سوال ہوگا۔ اس لیے اللہ کی شکر گزاری میں مبالغہ کرنا چاہیے، یہ ایک وعید شدید ہے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى آلَائِهِ فِيْ كُلِّ حَالٍ وَّمَآلٍ"[1]

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ﴿۱۶﴾ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ﴿۱۷﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۱۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ ۚ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ۚ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ ۭ بَصِيْرٌ ﴿۱۹﴾

کیا تم اس (اللہ) سے بے خوف ہوگئے ہو جو آسمان میں ہے، یہ کہ وہ تمھیں زمین میں دھنسا دے تو ناگہاں وہ لرزنے لگے؟ (16) یا تم اس (اللہ) سے بے خوف ہوگئے ہو جو آسمان میں ہے، یہ کہ وہ تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیجے؟ پھر جلد تم جان لو گے کہ میرا ڈرانا کیسا ہے؟ (17) اور البتہ یقیناً تکذیب کر چکے وہ جو اُن سے پہلے تھے، چناں چہ (دیکھ لو) میرا عذاب کیسا تھا (18) کیا انھوں نے اپنے اوپر پر پھیلاتے اور سکیڑتے ہوئے پرندے نہیں دیکھے۔ انھیں (اللہ) رحمان کے سوا کوئی نہیں تھامتا، بے شک وہ ہر چیز کو دیکھ رہا ہے (19)

لوگوں کے لیے زمین کی تسخیر:

یہ بھی مخلوق پر اللہ کا ایک لطف و رحم ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ ان کو عذاب کرنے پر قادر ہے اس سبب سے کہ بعض لوگ کفر کرتے ہیں اور غیر کو اس کی عبادت میں شریک ٹھہراتے ہیں، لیکن وہ حوصلہ اور درگزر اور تجاوز کرتا ہے اور عذاب میں دیر لگاتا ہے جلدی نہیں کرتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴾ [الفاطر: ۴۵] "اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کے اعمال کے سبب دار و گیر فرمانے لگتا تو روئے زمین پر ایک جان دار کو نہ

[1] فتح البیان (۱۴/۲۳۷۔۲۳۹)

چھوڑتا، لیکن اللہ تعالیٰ ان کو ایک معیادِ معین تک مہلت دے رہا ہے، لہٰذا جب ان کی وہ معیاد آ پہنچے گی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آپ دیکھ لے گا۔"

﴿ تَمُوْرُ ﴾ سے مراد آنا جانا، اضطراب کرنا ہے۔ "حَاصِبٌ" سے مراد وہ ہوا ہے جس میں کنکریاں ہوں اور دماغ کو توڑ دیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٦٨] "تو کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو کہ تمھیں خشکی کی طرف (لے جا کر زمین) میں دھنسا دے یا تم پر پتھروں کی آندھی بھیج دے۔ پھر تم اپنے لیے کسی نگہبان کو نہ پا سکو۔" اسی طرح اس جگہ یہ دھمکی دی ہے کہ اب تمھیں جلدی معلوم ہو جائے گا کہ میرا ڈرانا کیسا ہے اور جھٹلانے والے اور مخالفت کرنے والے کا انجام کیسا ہو گا۔ پہلی اُمتوں اور گزرے ہوئے زمانوں کی حالت کے متعلق خیال کرو کہ میں نے ان پر کیسا انکار کیا اور ان پر کس طرح کا سخت اور دردناک عذاب اتارا۔

پھر فرمایا کہ پرندے ہوا میں کبھی اپنے پر کھول دیتے ہیں اور کبھی بند کر لیتے ہیں، اللہ ہی نے ہوا کو ان کا مسخر کر دیا ہے، یہ اس کی رحمت اور عنایت ہے، وہ ہر چیز کو دیکھنے والا ہے، وہ جانتا ہے کہ کس مخلوق کے مناسبِ حال کون سی بات ہے اور کس شے میں کس بات کی صلاحیت ہے اور یہ اس کے اس فرمان سے ظاہر ہے: ﴿ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ [النحل: ٧٩] "کیا ان لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا جو تابع فرمان ہو کر فضا میں ہیں، جنھیں بجز اللہ تعالیٰ کے اور کوئی تھامے ہوئے نہیں، بے شک اس میں ایمان لانے والے لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ آسمان والے سے مراد عرش و قدرت و سلطان ہے، یعنی عالمِ علوی یا مراد فرشتے اور جبریل علیہ السلام ہیں، یا اللہ تعالیٰ ہے اور یہ حق ہے، اس لیے کہ ظاہر نظمِ قرآنی کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان پر ہے۔ اس جگہ حرف ﴿ فِيْ ﴾ حرفِ "علیٰ" کے معنی میں ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کی سزا سے بے خوف و خطر ہو، وہ چاہے تو تم کو قارون کی طرح زمین میں دھنسا دے اور اپنی عادت کے خلاف زمین حرکت میں آ جائے اور سکون و اطمینان کو چھوڑ دے یا تم کو لے بیٹھے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خسف کے وقت اللہ زمین کو حرکت دیتا ہے، جن کو خسف کرنا ہوتا ہے وہ زندہ لوگ زمین کے نیچے چلے جاتے ہیں اور زمین ان کے اوپر ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اسفلِ سافلین میں جا پہنچتے ہیں۔[1] پھر اللہ نے اپنا ڈر دوبارہ بتایا۔

---

[1] تفسیر الرازي (٦٢/٣٠)

﴿ مَنْ فِي السَّمَآءِ ﴾ کے الفاظ مخلوق سے الگ اور سب اعلیٰ سے بھی بلند ہونے پر دلیل ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ عرش پر مستوی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴾ [طٰہٰ: ۵] ''جو رحمان ہے عرش پر قائم ہے۔'' ''حاصب'' سے مراد پتھر ہے جس طرح کہ لوط علیہ السلام کی بستی پر پتھر برسائے تھے، یا ''حاصب'' وہ بادل ہے یا ہوا ہے جس میں سنگریزے ہوں۔ ''نذیر'' سے مراد عذاب الٰہی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔

''من قبل'' سے مراد قوم نوح اور عاد، ثمود، قوم لوط، اصحاب ایکہ، اصحابہ الرس اور قوم فرعون ہے اور صیغۂ غیب اس لیے استعمال کیا ہے تاکہ کافروں سے اعراض کا اظہار ہو۔ ﴿ نَكِيْرِ ﴾ سے مراد عذاب ہے نہ کہ فقط ان کی تکذیب۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت تسلی دی ہے اور آپ کی قوم کو خوب دھمکی دی ہے۔ پھر پرندوں کے اڑنے کا ذکر کیا اور کہا کہ رحمان ان کو ہوا میں تھامتا ہے ورنہ اصولی طور پر وزنی چیز نیچے کی طرف آتی ہے اوپر کو نہیں جاتی۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ اپنی تدبیر کو عالم سے روک لے تو ابھی سارے افلاک گر پڑیں، لیکن وہ عجیب وغریب چیزوں کا خالق اور ان کی تدبیر کرنے والا ہے ہر چیز کی مصلحت اسی کو معلوم ہے۔[1]

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ۭ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ۝۲۰ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ۝۲۱ اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۲ قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۲۳ قُلْ هُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۴ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۵ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۠ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۲۶ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِيْۗـــــَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ۝۲۷

بھلا ایسا کون ہے جو سوائے رحمان کے تمھاری فوج بن کر تمھاری مدد کرے؟ کافر تو نرے دھوکے میں ہیں (20) بھلا ایسا کون ہے جو تمھیں رزق دے، اگر رحمان اپنا رزق روک لے؟ (کوئی نہیں)

[1] فتح البیان (۱۴/۲۴۰۔۲۴۲)

لیکن وہ سرکشی اور (حق سے) گریز پر اڑے ہوئے ہیں ㉑ بھلا جو شخص اوندھا ہو کر اپنے چہرے کے بل چلتا ہو، وہ زیادہ ہدایت یافتہ ہے یا وہ جو بالکل سیدھا ہو کر صراطِ مستقیم پر چلتا ہو؟ ㉒ کہہ دیجیے: وہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا اور تمھارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔ تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو ㉓ کہہ دیجیے: وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں پھیلایا، اور اسی کے حضور تم اکٹھے کیے جاؤ گے ㉔ اور وہ (کافر) کہتے ہیں: یہ (قیامت کا) وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو؟ ㉕ کہہ دیجیے: بے شک (اس کا) علم تو صرف اللہ کے پاس ہے اور بس میں تو واضح طور پر ڈرانے والا ہوں ㉖ پھر جب وہ اسے قریب دیکھیں گے تو کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے اور کہا جائے گا: یہی ہے جو تم مانگتے تھے ㉗

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مدد کر سکتا ہے نہ رزق دے سکتا ہے:

اللہ نے مشرکوں سے، جو اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو پوجتے ہیں اور اس غیر سے مدد اور رزق مانگتے ہیں، یہ فرمایا کہ تم کو تمھاری امید حاصل نہ ہوگی۔ یہ ان کے باطل اعتقاد کی تردید ہے، یعنی اللہ کے سوا کوئی تمھارا دوست اور بچانے والا اور مددگار نہیں ہے۔ اے کافرو! تم دھوکے میں پڑے ہوئے ہو، اللہ تعالیٰ اگر اپنا رزق تم سے روک لے تو کوئی بھی عطا کرنے والا اور اللہ کو روکنے والا اور اس وحدہ لاشریک لہ کے سوا کوئی مددگار نہیں ہے۔ وہ اس بات کو جانتے ہیں، اس کے باوجود غیر کی عبادت کرتے ہیں اور اپنی سرکشی، گناہوں اور گمراہی میں قائم اور ڈٹے ہوئے ہیں۔ ﴿ عُتُوٍّ ﴾ سے مراد دشمنی اور تکبر ہے اور ﴿ نُفُوْرٍ ﴾ سے مراد حق سے روگردانی ہے۔ حق بات کو سنتے ہیں اور نہ اس کی پیروی کرتے ہیں۔

کافر و مومن کی ایک مثال:

پھر اللہ نے مومن اور کافر کی ایک مثال بیان کی کہ کافر کی اپنے کفر میں مثال ایسی ہے جیسے کوئی اوندھے منہ ٹیڑھا ہو کر چلے، اسے کچھ معلوم نہیں کہ کدھر کو چلتا ہے اور کہاں جاتا ہے بلکہ سرگشتہ اور حیران ہے اور راہ کو بھول گیا ہے۔ چنانچہ ایسا شخص راہ یاب ہوگا یا وہ شخص جو سیدھا ہو کر کھلی راہ پر چلتا ہے، خود بھی سیدھا ہے اور جس راہ پر چل رہا ہے وہ بھی سیدھی راہ ہے۔ یہ دنیا میں ان کی مثال ہے اور آخرت میں بھی اسی طرح ہوں گے۔ مومن کا حشر اس طرح سے ہوگا کہ وہ سیدھا صراطِ مستقیم پر چلے گا، وہ اس کو جنت تک پہنچا دے گی اور کافر کا حشر یوں ہوگا کہ وہ منہ کے بل چل کر نارِ جہنم میں جا گرے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴾ [الصافات: ۲۲۔ ۲۳] ”ظالموں کو اور ان کے ہمراہیوں کو اور (جن) جن کی وہ اللہ کے علاوہ پرستش کرتے تھے (ان سب کو) جمع کر کے انھیں دوزخ کی راہ دکھا دو۔“

"أزواج" سے مراد اشباہ، یعنی مشابہ ہیں۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ کریم ﷺ سے کہا گیا کہ لوگ اپنے منہ کے بل کس طرح اٹھائے جائیں گے؟ فرمایا جس نے ان کو پاؤں پر چلایا ہے، وہ اس بات پر قادر ہے کہ ان کو منہ کے بل چلائے۔ (رواہ أحمد) یہ حدیث دوسرے طریق سے صحیحین میں بھی آئی ہے۔[1] پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا اس کے بعد کہ تم کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھے اور تم کو کان، آنکھ اور دل دیے، یعنی عقل اور فہم بخشا، تم اس نعمت کا بہت کم شکر کرتے ہو، یعنی ان قویٰ کو جن کا تم پر انعام کیا ہے، تم اس کی اطاعت اور احکام کی بجا آوری اور اس کی ممنوعہ چیزوں میں جیسے استعمال کرنا چاہیے نہیں کرتے۔ حالانکہ اسی نے تم کو زمین کے چاروں اطراف میں پھیلایا ہے، باوجود زبان و بات چیت و رنگ و شکل وصورت کے مختلف ہونے کے اور اس فرق کے باوجود تم اکٹھے کیے جاؤ گے اور تمھیں دوبارہ پیدا کیا جائے گا جس طرح کہ پہلی بار تم کو پیدا کیا گیا ہے۔

قدرتِ تخلیق سے آخرت کی دلیل:

پھر کفار کی گفتگو کی خبر دی کہ وہ قیامت کے منکر ہیں اور اس وقوع کو بعید جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس تفرق کے بعد وہ اکٹھا ہونا جس کی تم ہم کو خبر دیتے ہو، وہ کب واقع ہوگا؟ سو اے پیغمبر! تم ان لوگوں سے کہہ دو کہ اس وقت کا صحیح طور پر علم اللہ ہی کو ہے، لیکن اللہ نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں تمھیں یہ بتا دوں کہ یہ بات ضرور ہونے والی ہے تم اس سے بچو میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں، میرا کام تو صرف پہنچا دینا ہے۔ چنانچہ میں نے تم کو اللہ کا حکم پہنچا دیا۔

پھر فرمایا کہ جب قیامت قائم ہوگی اور کافر اس کو دیکھیں گے اور جان لیں گے کہ ہاں جو آنے والی ہے وہ نزدیک ہے، اگر اس کا زمانہ دراز ہو تو ان کے منہ برے ہو جائیں گے، کیونکہ شر ہر طرف سے ان کو گھیر لے گا اور جو ان کے خیال اور وہم وگمان میں بھی نہ تھی وہ ظاہر ہو جائے گی: ﴿ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ [الزمر: ٤٨] "جو کچھ انھوں نے کیا تھا اس کی برائیاں ان پر کھل پڑیں گے اور جس کا وہ مذاق کرتے ہیں وہ انھیں آ گھیرے گا۔" لہٰذا ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر ان سے کہا جائے گا کہ لو یہ وہ چیز ہے جس کے لیے تم جلدی کرتے تھے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿ جُنْدٌ ﴾ بہ معنی "حِزْبٌ" ہے، یعنی فوج، یعنی تمھارے پاس کوئی ایسا لشکر نہیں ہے جو تم کو اللہ کے عذاب سے روکے، تم تو دھوکے میں گرفتار ہو۔ "رزق" سے مراد بارش ہے کہ اگر اللہ بارش نہ

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٤٨٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٠٦) مسند أحمد (١٦٧/٣)

برسائے تو کون تم کو رزق دے سکتا ہے، بلکہ اگر رزق موجود ہو اور تناول کے لیے تیار ہو، کھانے والا کھانے کے لیے لقمہ اٹھائے، لیکن اللہ اس کو نگلنے کی قوت روک لے تو سارے آسمان اور زمین والے اگر چاہیں تو اس لقمے کو گلے سے اتار نہ سکیں۔ لجاج کہتے ہیں: گھسن پڑنے کو باوجود بہت سے حادثات اور موانع (رکاوٹوں) کے۔ ﴿عُتُوٍّ﴾ بہ معنی عناد ہے۔ ﴿نُفُوْرٍ﴾ بدکنے کو کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی گمراہی وطغیان میں پڑے ہیں۔[1]

پھر ہر ایک کے لیے مشرک اور موحد کے حال کی وضاحت اور تحقیق کے لیے مثال بیان کی۔ "مکب" وہ ہے جو منہ کے بل گرے، دائیں بائیں سامنے نہ دیکھے، ایسا شخص ٹھوکر کھانے اور اوندھے منہ گرنے سے بچ نہیں سکتا۔ یا مراد اندھا ہے جس کو راستہ نہیں ملتا، وہ ہمیشہ گرتا پڑتا راہ میں چلتا ہے۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ بھلا ایسا آدمی منزلِ مقصود تک جا سکتا ہے یا وہ شخص جو سیدھے منہ کے ساتھ بغیر کسی خبط (دیوانہ پن) اور لغزش کے ایک ایسے سیدھے راستے پر چلا جاتا ہے جس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ گمراہی میں سرنگوں ہے اور دوسرا راہ یابی میں برابر ہے۔[2] "مکب" ابوجہل ہے اور برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ کافر کا حشر منہ کے بل ہے اور مومن کا حشر جنت کی طرف ہے،[3] جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ﴾ [بني إسرائيل: ٩٧] "ایسے لوگوں کا ہم بروزِ قیامت اوندھے منہ حشر کریں گے۔" پھر کہا کہ اے اشرفِ خلق یعنی اے نبی! تم ان کو یاد دلا دو کہ اللہ نے کیسے مفاسد (خرابیاں) ان سے دور کیے اور کیسے مصالح ان کے لیے جمع فرمائے ہیں اور ان کو چاہیے کہ کسی حال میں بھی اعتماد نہ کریں، مگر اللہ پر جس نے ان کو کان دیے کہ اللہ پاک کی آیتیں سنیں اور اس کے اوامر ونواہی سے نصیحت پکڑیں اور آنکھیں دیں جن سے آیاتِ تکوینیہ کو دیکھیں جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر شاہد ہیں اور دل دیے جن سے اس کی مخلوقات وآیاتِ تنزیلیہ وتکوینیہ میں غور وفکر کریں اور ایمان اور اطاعت کی سیڑھیاں چڑھتے جائیں۔

کان آنکھ دل کا ذکر اس لیے کیا کہ یہ علم کے آلات ہیں، ان آلات سے سننے والی چیزوں، دیکھنے والی چیزوں اور سمجھنے والی چیزوں کا ادراک کر سکتے ہیں، اس میں اللہ تعالیٰ نے حجت کو واضح کر دیا ہے اور عذر کو کاٹ دیا ہے اور ان کی ناشکری کی مذمت کی کہ وہ ان حواس کا استعمال نہیں کرتے کہ یہ کس لیے پیدا کیے گئے ہیں اور عطا کیے گئے ہیں۔ قلتِ شکر سے مراد عدمِ شکر ہے، کیوں کہ یہ خطاب کفار کو ہے۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم رب کی ان نعمتوں کا شکر نہیں کرتے اور اس کو واحد نہیں جانتے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا دانت درد کرتا ہو وہ اس جگہ اپنی انگلی رکھ کر یہ آیت

---

(1) تفسير الطبري (٢٣/٥١٥)
(2) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٦٣)
(3) تفسير الطبري (٢٣/٥١٦) فتح البيان (١٤/٢٤٥)
(4) فتح القدير (٥/٣٥١)

پڑھے: ﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾[1] (أخرجه الخطيب في تاريخه و ابن النجار عنه رفعاً بلفظ "من اشتكى ضرسه فليضع أصبعه عليه وليقرأ هاتين الآيتين سبع مرات وهو الذي أنشاكم ... إلى ... تشكرون فإنه يبرأ بإذن الله" أخرجه الدار قطني في الأفراد)

پھر اللہ نے یہ خبر دی کہ یہ مشرک اور کافر استہزاء کے طور پر قیامت کے وقت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو ہم کو بتا دو کہ وہ کس وقت اور کس دن آئے گی۔ چنانچہ یہ علم اللہ کو ہے لیکن اس کے آنے میں کچھ شک و شبہہ نہیں ہے۔ میں نے اللہ کے حکم سے تم کو ڈرا دیا ہے مگر جب وہ آ جائے گی اور قریب ہو گی تو ان کے منہ اتر جائیں گے۔ کسی نے کہا: اس سے مراد عذابِ بدر ہے یا حشر یا قیامت کے دن عذابِ آخرت ہے۔ کچھ بھی ہو اس کو دیکھ کر یہ سب رُو سیاہ ہو جائیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ﴾ [آل عمران: ١٠٦] ''جس دن بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض سیاہ۔'' اور اس وقت ملامت اور توبیخ کے طور پر یہ بات کہی جائے گی کہ یہ موجود عذاب جس کا تم مشاہدہ کرتے ہو، یہ وہی چیز ہے جو دنیا میں تم مانگتے تھے اور اس کے آنے کی جلدی کرتے تھے۔

﴿ تَدَّعُوْنَ ﴾ کے معنی ہیں: تمنا کرنا، مانگنا۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد باطل یا جھوٹ کا دعویٰ ہے، کیوں کہ ان کا قول یہ تھا کہ نہ بعث ہے نہ حشر نہ جنت نہ نار۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ کہتے تھے: ﴿ رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا ﴾ [ص: ١٦] ''اے ہمارے رب! ہماری سرنوشت تو ہمیں روزِ حساب سے پہلے ہی دے دے۔'' امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: ان کا یہ قول تھا: ﴿ اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاۗءِ ﴾[2] [الأنفال: ٣٢] ''اے اللہ! اگر یہ قرآن آپ کی طرف سے واقعی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔''

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ ﴿٢٨﴾ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ ﴿٢٩﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاۗؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَاۗءٍ مَّعِيْنٍ ۝ ﴿٣٠﴾

کہہ دیجیے: بھلا بتاؤ تو! اللہ خواہ مجھے اور ان کو جو میرے ساتھ ہیں، ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کرے تو کافروں کو دردناک عذاب سے کون پناہ دے گا؟ (28) کہہ دیجیے: وہ رحمان ہے، ہم

---

[1] الدر المنثور (٨/٢٣٧) [2] تفسیر القرطبي (١٨/٢٢١) فتح البيان (١٤/٢٤٢_٢٤٧)

اس پر ایمان لائے اور اسی پر ہم نے توکل کیا، چناں چہ تم جلد جان لو گے کہ کون کھلی گمراہی میں ہے ㉙ کہہ دیجیے: بھلا بتاؤ تو! اگر تمھارا (کنوؤں کا) پانی گہرا ہو جائے تو تمھارے پاس نتھرا (جاری) پانی کون لائے گا؟ ㉚

موت سے عبرت حاصل کرو:

اللہ نے نبیِ کریم ﷺ کو حکم دیا کہ تم ان مشرکوں سے جو اللہ کی نعمتوں کے منکر ہیں ان سے یہ کہہ دو کہ بھلا تم اپنی جانوں کو تو چھڑاؤ۔ تمھیں اللہ سے چھڑانے والا کوئی نہیں، مگر یہی کہ توبہ کرو اور دینِ الٰہی کی طرف رجوع کرو اور جس عذاب اور سزا کی تم تمنا کرتے ہو، اس کا واقع ہونا تمھیں کچھ فائدہ نہ دے گا، برابر ہے کہ اللہ ہم کو عذاب کرے یا ہم پر رحم کرے تم کو اس کی بڑی سزا اور دردناک عذاب سے کوئی بچاؤ نہیں ہے۔ ہم نے تو سب کاموں میں اللہ ہی پر بھروسا کیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ [ھود: ۱۲۳] ''پس تجھے اسی کی عبادت کرنی چاہیے اور اسی پر بھروسا کرنا چاہیے۔'' لہٰذا اظہارِ رحمت کے لیے یہ سنا دیا کہ اب عن قریب تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں اور تم میں سے کون گمراہ تھا اور دنیا اور آخرت کا انجام کس کے لیے ہے۔

بوقتِ صبح شود ہمچو روز معلومت کہ با کہ باختۂ عشق در شبِ دیجور

''صبح کے وقت تجھے روزِ روشن کی طرح معلوم ہو جائے گا کہ اندھیری رات میں تو نے کس چاند کے ساتھ انتہائی محبت کا اظہار کیا۔''

پھر فرمایا کہ اگر تمھارا یہ پانی زمین کی جڑ میں چلا جائے تو کوئی اس کو نہیں لا سکتا، تم ہزار بار اس کو لوہار کے آلات اور مضبوط ہاتھوں سے اس کو کھودو کبھی وہ پانی برآمد نہ ہو۔ یہ اللہ ہی کی قدرتِ عظیمہ اور سخت قوت ہے کہ اس نے یہ پانی دیا اور اپنے فضل و کرم سے اس کو روئے زمین پر جاری فرمایا اور زمین کے چاروں طرف ضرورت کے مطابق کہیں تھوڑا کہیں زیادہ بہایا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے: مطلب یہ ٹھہرا کہ اللہ تعالیٰ کفار کو نجات نہ دے گا۔ خواہ وہ اپنے رسول کو مومنین کے ساتھ ہلاک کر دے جس طرح کہ کفار کو تمنا ہے، یا مہلت دے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہم باوجود ایمان کے خوف اور رجا (امید) میں ہیں، لیکن تم کو باوجود اس کفر کے عذاب سے کون بچا سکتا ہے اور ہم تمھیں جس کی عبادت کی طرف بلاتے ہیں، وہی ساری نعمتوں کا مالک ہے، ہم اسی پر ایمان لائے ہیں۔ ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے، اسی پر ہمارا بھروسا ہے، وہی نفع دینے والا اور نقصان دینے والا ہے نہ کہ کوئی اور۔ اب تم جلد جان لو گے کہ ہم گمراہ ہیں یا تم گمراہ

تھے۔ اس کلام میں کفار کو بڑی تہدید ہے۔ ﴿مَعِيْنٍ﴾ کے معنی شیریں یا صاف پانی یا رواں اور نمایاں پانی ہیں۔
امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پڑھنے والا جب اس آیت کو پڑھے تو یوں کہے: "اَللّٰهُ يَأْتِيْنَا وَهُوَ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ"

حکایت:

یہ آیت بعض متجبرین کے سامنے پڑھی گئی تو اس نے کہا: "تَأْتِيْ بِهِ الْفُؤُوْسُ وَالْمَعَاوِلُ"، "کلہاڑے اور کدھال اس کو نکال لائیں گے۔" اس کی آنکھ کا پانی جاتا رہا اور وہ اندھا ہو گیا۔ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الْجُرْأَةِ عَلَى اللّٰهِ وَآيَاتِهِ.[1]

---

[1] تفسیر الجلالین (۱/۷۵۷) فتح البیان (۱۴/۲۴۸۔۲۴۹)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْقَلَمِ

اس کو سورت نون بھی کہتے ہیں۔ اس کی باون (۵۲) آیتیں ہیں۔ امام حسن، عکرمہ، عطاء اور جابر رحمہ اللہ نے اس کو مکی کہا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شروع سے لے کر لفظ "خرطوم" تک مکی ہے اور وہاں سے لے کر ﴿ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ تک مدنی ہے، پھر وہاں سے لے کر ﴿ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴾ تک مکی، پھر وہاں سے لے کر ﴿ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ تک مدنی، پھر باقی مکی ہے۔[1] (كذا قال الماوردي) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: جب کسی سورت کا شروع مکہ میں اترتا تو وہ مکی سورتوں میں لکھی جاتی تھی۔ پھر جو اللہ چاہتا وہ اس میں زیادہ کر دیتا۔ سب سے پہلے قرآن ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ ﴾ اترا، پھر سورت نون، پھر مزمل اور پھر مدثر۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: یہ سورت مکی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔[2]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۟ۙ مَاۤ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۟ۚ
وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۟ۚ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۟
فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۟ۙ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۟ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ
بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۪ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۟

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

نٓ قسم ہے قلم کی اور (اس کی) جو وہ لکھتے ہیں ① (اے نبی!) آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ② اور بے شک آپ کے لیے البتہ بے انتہا اجر ہے ③ اور یقیناً آپ خُلقِ عظیم پر (کاربند) ہیں ④ پھر جلد ہی آپ دیکھ لیں گے اور وہ (کفار) بھی دیکھ لیں گے ⑤ کہ تم میں سے کون دیوانہ ہے ⑥ بے شک آپ کا رب ہی اسے بہتر جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکا اور وہی بہتر جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو ⑦

① تفسير القرطبي (۲۲۳/۱۸) ② الدر المنثور (۲۴۰/۸) فتح القدير (۳۵۴/۵)

﴿نٓ وَالْقَلَمِ﴾ کی تفسیر:

نٓ، صٓ اور قٓ کی طرح جو حروفِ ہجا سورتوں کے شروع میں آتے ہیں، ان پر پہلے ﴿الٓمّٓ﴾ میں کلام گزر چکا ہے۔ اللہ پاک ہی جانے کہ ان سے کیا مراد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ "نٓ" سے مراد وہ بڑی مچھلی ہے جو آبِ محیط عظیم پر ساتوں زمینوں کو اٹھائے ہوئے ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اللہ نے قلم پیدا کیا اس سے کہا کہ لکھ۔ اس نے کہا: کیا لکھوں؟ فرمایا: تقدیر کو لکھ، اس دن سے لے کر قیامت تک جو کچھ جاری ہونے والا ہے وہ سب لکھ۔ اس نے لکھا۔

پھر اللہ نے نون کو پیدا کیا، پانی کا بخار اٹھایا، اس سے آسمان بنے، زمین نون کی پشت پر بچھائی گئی۔ نون نے اضطراب کیا، زمین کانپنے لگی، تب اس کو پہاڑوں سے جمایا، تو اسی لیے وہ زمین پر فخر کرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ سب سے پہلے جو چیز میرے رب عزوجل نے بنائی، وہ قلم ہے۔ اس سے کہا کہ لکھ تو اس نے جو کچھ قیامت تک ہونے والا تھا لکھا۔ پھر اللہ نے نون کو پانی پر پیدا کیا، پھر اس پر زمین کو بچھایا۔[1] اس کو امام طبرانی رحمہ اللہ نے رفعاً بھی روایت کیا ہے، ان الفاظ میں کہ سب سے پہلے اللہ پاک نے قلم وحوت کو پیدا کیا۔ اس نے کہا: میں کیا لکھوں؟ فرمایا: جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے وہ لکھ دے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ﴾ سو نون مچھلی ہے اور قلم یہی قلم ہے۔[2]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت رفعاً یہ ہے کہ پہلی چیز جو اللہ نے بنائی وہ قلم ہے، پھر نون کو بنایا، یہ دوات ہے، پھر کہا لکھ۔ اس نے کہا: کیا لکھوں؟ فرمایا: عمل یا رزق یا اثر یا اجل سے جو ہوتا ہے اور جو ہوگا۔ اس نے قیامت تک کا سارا حال لکھا۔ فذلك قوله: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ﴾۔ پھر قلم پر مہر لگا دی، اب وہ قیامت تک نہ بولے گا، پھر عقل پیدا کی اور کہا: مجھے قسم ہے اپنی عزت کی، میں تجھ کو اس شخص کے اندر کامل کروں گا جس کو دوست رکھتا ہوں اور تجھ کو اس شخص سے ناقص کروں گا جس کو میں دشمن رکھتا ہوں۔[3] (رواہ ابن عساکر) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نون وہ مچھلی ہے جو ساتویں زمین کے نیچے ہے۔[4] امام بغوی اور مفسرین کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے کہ اس مچھلی کی پشت پر ایک پتھر ہے جس کی اونچائی آسمانوں اور زمین کی موٹائی کی طرح ہے اور اس کی پشت پر ایک بیل ہے جس کے چالیس ہزار سینگ ہیں، اس کی پشت پر ساتوں زمین اور جو کچھ ان میں ہے وہ ہیں۔[5] واللہ أعلم.

---

[1] تفسیر الطبري (٢٣/ ٥٢٣، ٥٢٤) [2] المعجم الکبیر (١١/ ٤٣٣) اس کی سند میں "مؤمل بن اسماعیل" متکلم فیہ راوی ہے۔
[3] تاریخ دمشق (٦١/ ٣٨٥) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٦٣٠٩)
[4] تفسیر الطبري (٢٣/ ٥٢٤) [5] تفسیر البغوي (٨/ ١٨٦)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: بعض اہلِ علم نے حدیث: «أَوَّلُ طَعَامٍ يَأْكُلُهُ أَهْلُ الْجَنَّةِ زِيَادَةُ كَبِدِ حُوتٍ» ① ''جنتی سب سے پہلے مچھلی کا جگر کھائیں گے۔'' کو اسی معنی پر محمول کیا ہے، یہ عجیب بات ہے۔ کسی نے کہا: نون، نور کی ایک تختی ہے۔ معاویہ بن قرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے کہ نون ایک تختی ہے نور کی اور قلم نور کا ہے جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے اس کو لکھتا ہے۔ ② (رواه ابن جرير وهو مرسل غريب) امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: مجھے خبر ملی ہے کہ قلم نور کا ہے اور اس کی لمبائی سو سال کی راہ ہے۔ ③ یا نون سے مراد دوات ہے۔ یہی قول امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ کا ہے۔ ④

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رفعاً کہا ہے: اللہ نے نون کو پیدا کیا یہ دوات ہے۔ ⑤ (رواه ابن أبي حاتم و هذا غريب جدا)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: اللہ نے نون کو پیدا کیا، یہ دوات ہے۔ پھر قلم بنایا اور کہا: لکھ۔ اس نے کہا: کیا لکھوں؟ فرمایا: وہ جو قیامت تک ہونے والا ہے عمل، معمول بہ، یا فجور، یا تقسیم کیا جانے والا رزق حلال یا حرام۔ پھر ہر وہ شے جو دنیا میں داخل ہونے کے لائق تھی، اس کے بارے میں لکھا کہ وہ اس جگہ کتنا رہے گی اور کس طرح باہر جائے گی۔ پھر بندوں پر نگہبان مقرر کیے اور لکھنے کے لیے خزانچی مقرر کیے سو حفظہ ہر دن خزنہ سے اس دن کا عمل لکھ لیتے ہیں، جب رزق فنا ہو جاتا ہے اور اثر منقطع ہو جاتا ہے اور اجل مکمل ہو جاتی ہے تو حفظہ خزنہ کے پاس آتے ہیں اور اس دن کے عمل کے بارے میں طلب کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ہم تمھارے صاحب کے لیے اپنے پاس کوئی چیز نہیں پاتے، وہ پھر کر آتے ہیں تو اسے مردہ پاتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کیا تم عرب کی قوم نہیں ہو۔ تم سنتے ہو کہ حفظہ کہتے ہیں: ﴿ إِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾ [الجاثية: ۲۹] ''ہم تمھارے اعمال لکھواتے جاتے تھے۔'' بھلا کہیں اصل کے بغیر نسخ بھی ہوتا ہے۔ ⑥ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ظاہر یہ ہے کہ ﴿ وَالْقَلَمِ ﴾ سے مراد جنسِ قلم ہے جس سے لکھتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴾ [العلق: ۳-۵] ''تو پڑھتا رہ تیرا رب بڑے کرم والا ہے جس نے قلم کے ذریعے (علم) سکھایا، جس نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔''

اللہ پاک نے قسم کھائی اور خلق کو تعلیم کتابت کی نعمت کے بارے میں بتایا جس کی وجہ سے علوم حاصل ہوتے ہیں۔ اسی لیے ﴿ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴾ فرمایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا: ''سطر'' سے مراد لکھنا ہے۔ ⑦ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ علم ہے۔ ⑧ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ساطر ملائکہ ہیں اور

① صحيح البخاري (۴۲۱۰) ② تفسير الطبري (۲۳/۵۲۵) تفسير ابن كثير (۵۱۴/۴) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔
③ تفسير ابن كثير (۵۱۴/۴) ④ تفسير الطبري (۲۳/۵۲۵) ⑤ اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
⑥ تفسير الطبري (۲۳/۵۲۴، ۵۲۵) ⑦ تفسير الطبري (۲۳/۵۲۷، ۵۲۸) ⑧ تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۶۴/۱۰)

مسطور بندوں کے اعمال ہیں۔ ① بعض نے کہا ہے کہ قلم سے مراد وہ چیز ہے جس کو اللہ نے اپنی قدرت سے آسمان و زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار برس پہلے جاری کیا تھا تمام مخلوق کی تقدیروں کو لکھنے کے لیے اور جو احادیث قلم کے ذکر کے بارے میں آئی ہیں ان کو روایت کیا۔

ولید بن عبادہ بن صامت رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میرے باپ جب مرنے لگے تو مجھے بلا کر کہا کہ میں نے نبی ﷺ سے سنا ہے کہ فرماتے تھے: « إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ: اُكْتُبْ قَالَ: يَا رَبِّ وَمَا أَكْتُبُ؟ قَالَ: أُكْتُبِ الْقَدَرَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى الْأَبَدِ » ② (رواه أحمد والترمذي وقال: حسن غريب صحيح وأبو داود في كتاب السنة) ”اللہ نے پہلے قلم پیدا کیا اور کہا: لکھ اور اس نے کہا: کیا لکھوں؟ کہا: تقدیر اور ہر ہونے والی چیز لکھو۔“

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے رفعاً روایت یہ ہے: « إِنَّ أَوَّلَ شَيْءٍ خَلَقَهُ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَأَمَرَهُ فَكَتَبَ كُلَّ شَيْءٍ » ③ (رواه ابن جرير وهو غريب من هذا الوجه ولم يخرجوه) ”اللہ نے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اسے ہر چیز لکھنے کا حکم دیا۔“ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: قلم سے مراد وہ ہے جس نے ذکر لکھا اور سطر سے مراد لکھنا ہے۔ ④ پھر کہا کہ بحمد اللہ تو مجنون نہیں ہے جس طرح کہ تیری قوم کے جاہل لوگ کہتے ہیں اور تو اُن کے پاس جو ہدایت اور حق لے کر آیا ہے، اسے جھٹلا کر تجھ کو دیوانہ ٹھہراتے ہیں، بلکہ تجھ کو تو بہت بڑا اجر اور ثواب ملے گا جو کبھی منقطع نہ ہو گا، کیونکہ تو نے خلق کو اللہ کی رسالت پہنچا دی ہے اور ان کی ایذا دہی پر صبر کیا۔ ﴿ مَمْنُوْنٍ ﴾ بہ معنی مقطوع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴾ [هود: ١٠٨] ”یہ بے انتہا بخشش ہے۔“ اور اس کا فرمان ہے: ﴿ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴾ [التين: ٦] ”ان کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہو گا۔“ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یہ معنی محسوب ہے، اس کا مطلب بھی وہی ٹھہرا جو ہم نے کہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق کا ذکر:

﴿ خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ سے مراد دینِ اسلام ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس، مجاہد، ابو مالک، سدی، ربیع بن انس، ضحاک اور ابن زید رضی اللہ عنہم کا ہے۔ امام عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ادبِ عظیم ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم ﷺ کے خلق کا حال پوچھا گیا تو کہا: آپ ﷺ کا خلق قرآن تھا۔ امام سعید رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ”كَمَا هُوَ فِي الْقُرْآنِ“. دوسری روایت میں یہ ہے کہ سعید بن ہشام نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا کہ نبی کریم ﷺ کا خلق کیا تھا؟ کہا: کیا تو قرآن نہیں پڑھتا؟ کہا: ہاں! کہا تو رسول اللہ ﷺ کا خلق یہی قرآن تھا۔ ⑤ یہ سوال و جواب سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کئی الفاظ و طرق سے آیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کے امر و نہی کا بجالانا۔ نبی کریم ﷺ کی عادت و خو و خصلت تھی کہ اللہ نے قرآن میں

① تفسير ابن كثير (٥١٥/٤) ② مسند أحمد (٣١٧/٥) سنن الترمذي (٣٣١٩) سنن أبي داود (٤٧٠٠) صحيح الجامع (٢٠١٧)
③ تفسير الطبري (٥٢٦/٢٣) ④ تفسير الطبري (٥٢٧/٢٣، ٥٢٨) ⑤ تفسير الطبري (٥٢٨/٢٣-٥٣٠)

جس بات کا حکم کیا ہے اس کو بجا لاتے اور جس بات سے منع فرمایا ہے اس سے باز رہتے۔ اس کے سوا آپ ﷺ مجبول تھے (یعنی آپ ﷺ کی جبلت تھی) کہ حیا، کرم، شجاعت، درگزر، بردباری اور ہر اچھی عادت اور خلقِ جمیل پر تھے۔

صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ میں نے دس برس نبیِ کریم ﷺ کی خدمت کی، آپ ﷺ نے کبھی مجھ کو اُف تک نہ کہا اور میرے کسی کام میں یہ نہ فرمایا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا یا کیوں نہ کیا؟ آپ ﷺ خلق میں سب لوگوں سے بہتر تھے، آپ کی ہتھیلی سے زیادہ نرم کبھی میں نے کوئی ٹسر و ریشم نہ چھوا اور نہ آپ ﷺ کے پسینے سے زیادہ خوشبو دار کوئی مشک و عطر سونگھا۔[1] بخاری میں سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ نبیِ کریم ﷺ سب لوگوں سے زیادہ خوبصورت اور خوب سیرت تھے، نہ لمبے تھے نہ چھوٹے تھے۔[2] ترمذی رحمہ اللہ نے اس بارے میں روایات کتاب الشمائل میں جمع کی ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبیِ کریم ﷺ نے اپنے ہاتھ سے نہ کبھی کسی خادم کو مارا اور نہ کسی عورت کو اور نہ کسی شے کو، مگر یہ کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے تھے اور جب آپ ﷺ کو دو چیزوں کے درمیان اختیار دیا جاتا تو آپ ﷺ اس شے کو اختیار کرتے اور پسند فرماتے جو ان دونوں میں سہل تر ہوتی بشرطیکہ وہ کام گناہ نہ ہوتا اور اگر گناہ ہوتا تو سب لوگوں سے زیادہ اس گناہ سے دور رہتے اور اپنی جان کا بدلہ کسی شے سے نہیں لیا۔ ہاں اگر اللہ کی حرمتوں کی ہتک دیکھتے تو اللہ کے لیے انتقام لیتے۔[3] (رواه أحمد)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رفعاً کہتے ہیں: « إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ صَالِحَ الْأَخْلَاقِ »[4] (رواه أحمد) ''مجھے اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔'' پھر اللہ نے فرمایا: اے محمد! تم اور یہ تمھارے مخالفین اور جھٹلانے والے جلد جان لیں گے کہ تم میں یا ان میں کون مفتون (فتنہ میں پڑا ہوا) یا ضال (گمراہ) تھا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہے: ﴿ سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُ ﴾ [القمر: ٢٦] ''اب سب جان لیں گے کل کو کہ کون جھوٹا اور شیخی خور تھا؟'' اور اس فرمان کے مطابق ہے: ﴿ وَإِنَّآ أَوْ إِيَّاكُمْ لَعَلَىٰ هُدًى أَوْ فِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ﴾ [السبا: ٢٤] ''ہم یا تم یا تو یقیناً ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں ہیں؟'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ جان لینا قیامت کے دن ہوگا۔ ''مفتون'' بہ معنی مجنون ہے۔ یہی قول امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: کون مفتون ہے، یعنی شیطان کے ساتھ زیادہ تر۔[5] مفتون وہ ہے جو حق سے فتنے میں پڑ کر گمراہ ہو جائے۔ پھر کہا کہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ دونوں فرقوں میں سے کون راہ یاب ہے اور کون گمراہ ہے۔[6]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿ مَآ أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ﴾ اس طرح کہ کوئی یوں کہے کہ ''أَنْتَ بِحَمْدِ اللّٰهِ عَاقِلٌ''، گویا یہ فرمایا کہ تو دیوانگی سے بری ہے اور اللہ کی نعمت کے ساتھ متلبس ہے۔ نعمت سے مراد رحمت ہے

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٠٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠١٥)
② صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٥٦) ③ مسند أحمد (٢٣٢/٦)
④ مسند أحمد (٣٨١/٢) السلسلة الصحيحة (٤٥) ⑤ تفسير الطبري (٥٣٢_٥٣٠/٢٣) ⑥ تفسير ابن كثير (٥١٧_٥١٣/٤)

اور یہ آیت کفار کی تردید کرتی ہے جنھوں نے یہ کہا تھا: ﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ﴾ [الحجر: ٦] ''اے وہ شخص جس پر قرآن اتارا گیا ہے یقیناً تو تو کوئی دیوانہ ہے۔'' اجر سے مراد ثواب ہے، یعنی اس تحمل، نبوت کی ذمے داری اور طرح طرح کی تکالیف کا رنج اٹھانے کا تجھ کو بے حساب ثواب ملے گا۔ حسن نے کہا ہے کہ ''مکدر بمن'' نہ ہوگا، یعنی اس پر احسان نہیں جتلایا جائے گا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اجر بغیر عمل کے ہو گا۔[1] بعض نے کہا ہے کہ غیر منقوص (جس میں کمی نہ کی جائے گی) ہوگا۔

﴿ خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ سے مراد اسلام و دین ہے۔ اسی کو امام واحدی رحمہ اللہ نے اکثر مفسرین سے روایت کیا ہے۔[2] امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے پہلے قلم کی قسم کھائی، پھر ملائکہ کے لکھنے کی۔ یا ان کی لکھی ہوئی چیز کی قسم کھائی تین چیزوں پر: ایک جنون کی نفی پر، دوسری اجر کے ثابت ہونے پر اور تیسری نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دینِ اسلام پر ہونے کی۔ خلق سے مراد قرآنِ کریم ہے۔ امام حسن اور عوفی رحمہما اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے اوامر کو ماننا اور نواہی سے بچنا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ تو اس خلق پر ہے جس کا حکم تجھ کو اللہ نے قرآن میں دیا ہے، یا مراد خلق سے امت سے نرمی کرنا اور ان کا اکرام کرنا ہے، یا مراد طبعِ کریم ہے۔

امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا: یہی ظاہر ہے۔ لغت میں خلق ادب اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔[3] ابو عبداللہ جدلی نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا تھا کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق کیسا تھا؟ کہا: نہ فاحش تھے اور نہ متفحش تھے، نہ بازاروں میں چلاتے تھے اور نہ بدی کا بدلہ بدی سے لیتے، بلکہ معاف فرماتے اور درگزر کرتے تھے۔[4] (أخرجه ابن أبي شيبة والترمذي و صححه وابن مردويه)

پھر فرمایا کہ اے محمد! تم اور یہ کفار عن قریب دیکھ لیں گے، جب کہ حق ظاہر ہوگا اور پردہ اٹھ جائے گا کہ تم میں سے کون مفتون تھا، یعنی اس وقت حق کا باطل سے امتیاز ہو جائے گا۔ دنیا میں اس کا ظہور انجام کار کے لحاظ سے غلبۂ اسلام سے اور کافروں کے قتل اور مغلوب ہونے سے یا قیامت میں ہوگا۔ یہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ ہے اور ان کے لیے وعید ہے۔ مفتون سے یہ مراد ہے کہ فتنۂ جنون میں کون گرفتار ہے، یا ''مفتون'' سے مراد عذاب کیا گیا ہے۔ اور اس جیسا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ﴾ [الذاريات: ١٣] ''ہاں یہ وہ دن ہے کہ یہ آگ پر تپائے جائیں گے۔'' بعض نے کہا ہے کہ ''مفتون'' سے مراد شیطان ہے، کیوں کہ وہ اپنے دین میں گرفتارِ فتنہ ہے۔ امام قتادہ اور مقاتل رحمہما اللہ نے کہا: یہ یومِ بدر کے عذاب کی وعید ہے۔[5]

---

[1] تفسير القرطبي (٢٢٦/١٨)
[2] فتح القدير (٣٥٥/٥)
[3] فتح القدير (٣٥٥/٥)
[4] مصنف ابن أبي شيبة (٢١١/٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠١٦)
[5] فتح البيان (٢٥٥/١٤-٢٥٧)

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۸ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝۹ وَلَا تُطِعْ كُلَّ
حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝۱۰ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۢ بِنَمِيْمٍ ۝۱۱ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ۝۱۲
عُتُلٍّۢ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ۝۱۳ اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝۱۴ اِذَا
تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۱۵ سَنَسِمُهٗ عَلَى
الْخُرْطُوْمِ ۝۱۶

تو آپ تکذیب کرنے والوں کی اطاعت نہ کریں ⑧ وہ چاہتے ہیں کہ آپ (کچھ) نرم پڑیں
تو وہ بھی نرم پڑ جائیں ⑨ اور آپ ہر قسمیں کھانے والے ذلیل کی بات نہ مانیں ⑩ جو طعنے
دینے والا، انتہائی چغل خور ہے ⑪ بھلائی سے روکنے والا، حد سے گزرنے والا، سخت گناہ گار
ہے ⑫ سنگدل اور ان (سب عیوب) کے علاوہ بے نسب ہے ⑬ اس لیے کہ (وہ) مال اور
بیٹوں والا ہے ⑭ جب اس پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ (یہ) پہلوں کے
افسانے ہیں ⑮ ہم جلد اسے (اس کی) سونڈ (ناک) پر داغ لگائیں گے ⑯

جھٹلانے والوں کے مغالطوں کو قبول مت کریں:

ڈھیلے ہونے سے یہ مراد ہے کہ تو ان کے بتوں کو بھلا کہہ تو وہ تیری باتوں کو پسند کریں۔ ﴿حَلَّافٍ﴾ سے ﴿زَنِيْمٍ﴾ تک کافر کے وصف ہیں۔ آدمی اپنے اندر دیکھے اور یہ خصلتیں چھوڑے۔ بے نسب یعنی بدنام بدی سے، مال اور بیٹوں سے مشہور ہے، یعنی دنیا میں طالع مند ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ولید تھا جو قریش کا ایک سردار تھا ناک پر داغ شاید دنیا میں پڑا ہو یا آخرت میں جلنے سے پڑے گا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ہم نے تجھ پر انعام کیا تجھ کو مستقیم شریعت عطا کی خلقِ عظیم دیا، اب تو ان جھٹلانے والوں کی اطاعت نہ کر۔ یہ تو یہی چاہتے ہیں کہ تو مداہنت کرے تو یہ بھی مداہنت کریں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تو اگر ان کے ساتھ ترخص (رخصت دینا) کرے تو وہ بھی تیرے ساتھ ترخص کریں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اگر تو ان کے معبودوں کی طرف جھکے اور حق کو چھوڑ دے تو یہ بھی ایسا ہی کریں۔ ﴿حَلَّافٍ﴾ اس لیے فرمایا کہ جھوٹا آدمی اپنے ضعف اور خواری کے سبب سے جھوٹی قسم کھا کر اپنا بچاؤ کرتا ہے اور ہر وقت بے محل اللہ کے ناموں کے استعمال پر جرأت کرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿مَهِيْنٍ﴾ سے مراد دروغ گو ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ضعیف القلب ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿حَلَّافٍ﴾ مکابر ہے، ﴿مَهِيْنٍ﴾ ناتواں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ هَمَّازٍ ﴾ وہ ہے جو غیبت کرتا ہے۔[1] ﴿ مَشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ ﴾ وہ ہے جو لوگوں کے درمیان چل پھر کر فساد کراتا ہے اور چغل خوری کرتا ہے، دو لوگوں کے درمیان فساد ڈلواتا ہے جو حالقہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبیِ کریم ﷺ کا گزر دو قبروں پر ہوا، فرمایا: ان دونوں کو عذاب ہو رہا ہے اور یہ عذاب کسی بڑے کام پر نہیں ہو رہا: ان میں سے ایک پیشاب سے نہیں بچتا تھا، یعنی اس کی چھینٹوں سے، دوسرا ادھر کی بات ادھر لگاتا، یعنی چغل خوری کرتا تھا۔[2] (رواه الشيخان وبقية الجماعة)

...... سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جنت میں قتات، نمام، یعنی چغل خور داخل نہ ہوگا۔[3] (رواه أحمد والجماعة إلا ابن ماجه) عبدالرزاق رحمہ اللہ کی حذیفہ رضی اللہ عنہ سے رفعاً روایت یہ ہے: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ» يَعْنِيْ نَمَّامًا[4] سیدہ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں فرمایا: کیا خبر نہ دوں میں تم کو تمھارے خیار کی؟ کہا: ہاں، فرمایا: وہ لوگ ہیں کہ جب نظر آئیں تو اللہ عزوجل یاد آئے۔ پھر کہا: کیا میں تم کو تمھارے شرار کی خبر نہ دوں؟ وہ وہ لوگ ہیں جو چغل خوری کے لیے چلتے پھرتے ہیں، دوستوں میں فساد ڈالنے والے ہیں، پاک لوگوں کے عیب تلاش کرنے والے ہیں۔[5] (رواه أحمد) اس کو امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔ عبدالرحمان بن غنم سے رفعاً روایت کیا ہے، ان الفاظ سے کہ اللہ کے بندوں میں سے بہترین وہ ہیں کہ ان کو دیکھ کر اللہ پاک یاد آئے اور اللہ کے بدترین بندے وہ ہیں جو چغل خوری کے لیے چلتے پھرتے ہیں، دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں، بری لوگوں کے عیب ڈھونڈتے ہیں۔[6]

﴿ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ ﴾ وہ ہے جو اپنے خیر کو روکتا ہے اور اپنے پاس کی چیز خرچ نہیں کرتا، مال حلال کے لینے میں حد سے آگے بڑھ جاتا ہے، محرمات کو حاصل کرتا ہے۔ ﴿ عُتُلٍّ ﴾ کے معنی بد مزاج، سخت خو، فظ، غلیظ، جموع ومنوع ہیں۔ حارثہ بن وہب رحمہ اللہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ کیا خبر نہ دوں میں تم کو اہلِ جنت کی؟ ہر ضعیف متضعف ہے، اگر اللہ پر قسم کھالے تو اللہ اس کو سچا کر دے۔ کیا خبر نہ دوں میں تم کو اہلِ نار کی؟ ہر بد خو مشٹنڈا تکبر کرنے والا ہے۔[7] (رواه أحمد، وأصحاب الستة إلا أبا داود) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں اہلِ نار کا ذکر

---

[1] تفسير الطبري (٢٣/٥٣٣_٥٣٤)

[2] صحيح البخاري (٢١٣) صحيح مسلم (٢٩٢) سنن أبي داود (٢٠) سنن الترمذي (٧٠) سنن النسائي (٢٠٦٨) سنن ابن ماجه (١٣٤٧)

[3] صحيح البخاري (٥٧٠٩) صحيح مسلم (١٠٥) مسند أحمد (٥/٣٨٢) سنن أبي داود (٤٨٧١) سنن الترمذي (٢٠٢٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٩٦)

[4] مسند أحمد (٥/٣٨٩) [5] مسند أحمد (٦/٤٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١١٩)

[6] مسند أحمد (٤/٢٢٧) صحيح الترغيب والترهيب (٣/٤٧)

[7] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٣) مسند أحمد (٤/٣٠٦) سنن الترمذي الحديث (٢٦٠٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٩٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١١٦)

کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ہر جعظری جواظ متکبر جموع منوع ہے، یعنی ہر بے صبرا، تکبر کرنے والا، مال جمع کرنے والا اور مال کو روک کر رکھنے والا۔[1] (تفرد به أحمد)

اہلِ لغت نے کہا ہے کہ جعظری فظ غلیظ، یعنی سخت دل کو کہتے ہیں، جواظ جموع منوع کو کہتے ہیں، یعنی جو مال جمع کرے اور خرچ نہ کرے۔ عبد الرحمان بن غنم نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ "عتل زنیم" کون ہے؟ فرمایا: سخت خو تندرست بڑا کھانے پینے والا جس کو کھانا پینا بہ خوبی ملتا ہے ظلم کرنے والا لوگوں پر کشادہ پیٹ۔[2] (رواه أحمد) دوسری روایت یہ ہے کہ جواظ، جعظری و عتل زنیم جنت میں داخل نہ ہوگا۔[3] یہ حدیث مرسلاً بھی بہت سے تابعین سے آئی ہے۔ امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے رفعاً کہا ہے کہ آسمان اس بندے سے روتا ہے جس کے بدن کو اللہ نے تندرست رکھا اور اس کا پیٹ کشادہ کیا اور اس کو خوب دنیا دی اور وہ لوگوں پر ظلم کرتا ہے: "عتل زنیم"[4] (رواه ابن جرير وهكذا رواه ابن أبي حاتم من طريقين مرسلين) اسی پر بہت سے سلف نے نص کی ہے، جیسے: امام قتادہ، عکرمہ، حسن اور مجاہد رحمہم اللہ وغیرہم کہ ﴿ عُتُلٍّ ﴾ سے مراد تندرست کھانے پینے نکاح کرنے میں سخت توانا ہے۔[5]

صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ زنیم قریش میں ایک مرد تھا جو شر کے ساتھ بہت مشہور تھا جس طرح کہ بکریوں میں گوسفند زنمہ دار مشہور ہوتی ہے[6] اور عرب کی لغت میں زنیم پسر خواندہ کو کہتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ اور بہت سے ائمہ کا یہی قول ہے۔ سیدنا حسان رضی اللہ عنہ نے بعض کفار قریش کی مذمت میں کہا ہے:

وَأَنْتَ زَنِيمٌ نِيطَ فِي آلِ هَاشِمٍ　　　كَمَا نيط خَلْفَ الرَّاكِبِ الْقَدَحُ الْفَرْدُ

دوسرے نے کہا ہے:

زَنِيمٌ لَيْسَ يُعْرَفُ مَنْ أَبُوهُ　　　بَغِيُّ الْأُمِّ ذُو حَسَبٍ لَئِيمٌ

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ زنیم ولد الزنا فاحش لئیم کو کہتے ہیں۔ پھر یہ شعر پڑھا:

زَنِيمٌ تَدَعَاهُ الرِّجَالُ زِيَادَةً　　　كَمَا زِيْدَ فِيْ عَرَضِ الْأَدِيمِ الْأَكَارِعِ[7]

بعض نے کہا: ﴿ زَنِيمٍ ﴾ سے اخنس بن شریق ثقفی حلیف بنی زہرہ مراد ہے اور کچھ لوگوں کا بنی زہرہ کے متعلق یہ اعتقاد ہے کہ زنیم اسود بن عبد یغوث زہری ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "زنیم" ملحق النسب ہے۔ امام سعید بن میسب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زنیم وہ ہے کہ قوم کے ساتھ چپکا دیا گیا اور وہ اس قوم کا نہیں ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "زنیم" ولد الزنا ہے، یعنی حرام زادہ۔ مومن کافر سے اس طرح پہچانا جاتا ہے جس

---

① مسند أحمد ١٦٩/٢ امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" مجمع الزوائد (٧٢١/١٠)

② مسند أحمد (٢٢٧/٤)　③ مسند أحمد (٢٢٧/٤)　④ تفسير الطبري (٥٣٦/٢٣) یہ روایت مرسل ہے۔

⑤ تفیسر ابن کثیر (٥١٨/٤)　⑥ صحيح البخاري (٤٦٣٣)　⑦ تفسیر ابن کثیر (٥١٩/٤)

طرح کہ گوسفند زنمہ دار بکریوں میں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ زَنِيْمٍ ﴾ وہ شخص ہے جو شر کے ساتھ مشہور ہے جس طرح کہ زنمہ دار بکری پہچانی جاتی ہے اور زنیم ملصق ہے، یعنی پیوستہ کیا ہوا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ﴿ زَنِيْمٍ ﴾ لغت ہے، غیر معروف کو زنیم کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ دعی ہے۔

اصحابِ تفسیر نے کہا: وہ شخص ہے جو گوسفند کی طرح زنمہ رکھتا ہو۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے کان کی جڑ میں ایک زنمہ تھا۔ اور "لئیم"، ملصق فی النسب کو بھی زنیم کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ زنیم وہ مریب ہے جو معروف بالشر (برائی کے لیے مشہور) ہو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: وہ ہے جو اس صفت کے ساتھ گوسفند کی طرح مشہور ہو۔ امام ابو رزین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زنیم ہونا کفر کی علامت ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زنیم معروف باللوم ہے گوسفند زنمہ دار کی شہرت کی طرح۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زنیم کے معنی کے بارے میں اقوال بہت ہیں سب کا مرجع اس طرف ہے کہ زنیم معروف بالشر شخص کو کہتے ہیں جو لوگوں میں برا مشہور ہو اور غالباً ایسا آدمی دعی ولدالزنا ہوتا ہے۔ اس پر دوسروں کی نسبت شیطان کا تسلط زیادہ ہوتا ہے[1] جس طرح کہ حدیث میں آیا ہے: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ وَلَدُ الزِّنَا»[2] دوسری حدیث میں آیا ہے: «وَلَدُ الزِّنَا شَرُّ الثَّلَاثَةِ إِذَا عَمِلَ بِعَمَلِ أَبَوَيْهِ»[3] میں کہتا ہوں کہ ولدِ زنا کا جنت میں داخل نہ ہونا عملِ بد پر موقوف ہے۔ اگر اس کا عمل صالح ہے تو کوئی امر جنت میں دخول سے مانع نہیں، مطلق اسی مقید پر محمول ہے۔ (واللہ أعلم)۔ صراح میں کہا ہے: "زنمہ وروش گوش بز يُقْطَعُ فِي الْأُذُنِ فَيُتْرَكُ مُعَلَّقًا زنیم ومزنم مردیکہ بقومی ملحق شدہ باشد کہ نہ از ایشان بود" انتہیٰ۔

پھر اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے تو اس پر مال اور بیٹوں کا انعام کیا ہے، اس نے مقابلے میں ہماری آیتوں کا انکار کیا اور ان سے روگرداں ہوا اور یہ زعم کیا کہ یہ جھوٹ ہے ﴿ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ سے لیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝ وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۝ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ۝ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۝ كَلَّا ۭ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ۝ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ۝ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ ۝ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۝ ثُمَّ نَظَرَ ۝ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۝ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۝ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴾ [المدثر: ۱۱ - ۳۰] "مجھے اور اسے چھوڑ دے جسے میں نے اکیلا پیدا کیا ہے اور اسے بہت سا مال دے رکھا ہے اور حاضر باش فرزند بھی، اور میں نے اسے بہت کچھ کشادگی دے رکھی ہے۔ پھر بھی اس کی

---

① تفسیر الطبري (۵۳۹،۵۳۸/۲۳) تفسیر ابن کثیر (۵۱۹/٤)

② سنن النسائي الکبریٰ (۱۷۷/۳) ③ مسند أحمد ۱۰۹/٦

چاہت ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں۔ نہیں نہیں، وہ ہماری آیتوں کا مخالف ہے۔ عنقریب میں اسے ایک سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔ اس نے غور کر کے تجویز کی۔ اسے ہلاکت ہو کیسی (تجویز) سوچی؟ وہ پھر غارت ہو کس طرح اندازہ کیا۔ اس نے پھر دیکھا، پھر تیوری چڑھائی اور منہ بنایا، پھر پیچھے ہٹ گیا اور غرور کیا اور کہنے لگا یہ تو صرف جادو ہے جو نقل کیا جاتا ہے۔ سوائے انسانی کلام کے کچھ بھی نہیں۔ میں عنقریب اسے دوزخ میں ڈالوں گا اور تجھے کیا خبر کہ دوزخ کیا چیز ہے؟ نہ وہ باقی رکھتی ہے نہ چھوڑتی ہے۔ کھال کو جھلسا دیتی ہے اور اس میں انیس (۱۹) (فرشتے) مقرر ہیں۔"

پھر فرمایا: ہم اس کی سونڈ پر داغ دیں گے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اس کا حال کھول کر ظاہر کر دیں گے، یہاں تک کہ سب لوگ اس کو پہچان لیں۔ اس کی حالت کسی پر مخفی نہ رہے گی جس طرح کہ سونڈھ کا داغ چھپا نہیں رہتا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خرطوم پر داغ ایک عیب ہے جو جدا نہیں ہوتا خصوصاً ناک کا داغ۔ یہی قول امام سدی رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ بدر کے دن مقاتلہ کرے گا، اس کو اس لڑائی میں تلوار کا ایک داغ لگے گا۔[1] بعض نے کہا: اہلِ نار جیسا داغ ہوگا، یعنی قیامت کے دن سیاہ چہرہ ہو جائے گا۔ بجائے وجہ کے خرطوم فرمایا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے کوئی مانع نہیں ہے کہ سب امور دنیا اور آخرت میں جمع ہو جائیں۔ یہی قول زیادہ مناسب ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا کہ بندہ احقاب تک (دس سال کی عمر تک) مومن لکھا جاتا ہے، پھر احقاب تک، یعنی مدت دراز تک ایمان دار ہوتا ہے، پھر مرتا ہے اور اللہ اس پر غصے ہوتا ہے اور کوئی بندہ احقاب تک کافر لکھا جاتا ہے، پھر مرتا ہے اور اللہ اس سے راضی ہوتا ہے اور جو شخص مرا اور وہ "ھماز لماز" اور ملقب شخص تھا تو قیامت کے دن اس کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ اللہ اس کی خرطوم پر دونوں لب سے ایک داغ دیتا ہے۔[2]

(رواه ابن أبي حاتم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے: اللہ پاک نے فرمایا کہ تو جھٹلانے والوں کا کہنا نہ مان، یعنی مشرکین رؤسائے کفارِ قریش کا جو تجھ کو اپنے باپ داداؤں کے دین کی طرف بلاتے ہیں۔ اس میں دوسروں کو اشارہ ہے کہ کفار کی اطاعت نہ کریں، یا اطاعت سے مجرد مدارات ہے کہ مضمر یعنی ضمیر کے خلاف اظہار کرے جس طرح کہ وہ چاہتے ہیں کہ تو ادھان کرے، یعنی ڈھیلا ہو تو وہ بھی ایسا کریں۔ ادہان کہتے ملاینت و مسامحت (نرمی اور چشم پوشی) اور مدارات کو۔

---

[1] تفسير الطبري (٥٤١/٢٣)

[2] المعجم الأوسط (٣٣٧/٨) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٦٥/١٠) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٥١٧)

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر تو نرم ہو تو وہ بھی تیرے ساتھ نرم پڑ جائیں۔ یہی امام کلبی رحمہ اللہ کا قول ہے، یعنی اگر تو ان کو نہ چھیڑے تو وہ بھی تجھ کو نہ چھیڑیں۔

امام ضحاک اور سدی رحمہما اللہ نے کہا: یعنی اگر تو کفر کرے تو وہ اپنے کفر پر متمادی و مستمر رہیں (دیر تک جاری رہیں)۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا: اگر تو جھوٹ بولے تو وہ بھی جھوٹ بولیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اگر تو اس امر کو چھوڑ دے تو وہ بھی چھوڑ دیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: اگر تو اپنے دین میں ان کی مصانعت کرے تو وہ بھی تیرے ساتھ مصانعت کریں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: اگر تو ان کی طرف جھکے تو وہ بھی تیری طرف مائل ہوں۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر ایک مدت تک تو ان کے آلہہ کی عبادت کرے تو وہ بھی ایک مدت تک تیرے معبود کی عبادت کریں۔[1] ﴿حَلَّافٍ﴾ وہ ہے جو اکثر جھوٹی قسم کھاتا ہے، جس کو حلف کی عادت ہے، اس کے ڈرانے کے لیے یہی آیت کافی ہے۔

﴿مَّهِيْنٍ﴾ مہانت سے ماخوذ ہے، یعنی کم عقل بے تمیز۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی شر کی کثرت کرنے والا۔ امام حسن رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ فاجر عاجز مراد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ کے نزدیک حقیر۔ بعض نے کہا ہے کہ یعنی ذلیل۔ کسی نے کہا ہے کہ یعنی رذیل۔ ابو عثمان نہدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب لوگوں نے یزید سے بیعت کی تو مروان نے کہا کہ یہ سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی سنت ہے۔ عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی سنت نہیں ہے، بلکہ ہرقل کی سنت ہے۔ مروان نے کہا: اسی شخص کے متعلق یہ آیت اتری ہے: ﴿وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ﴾ [الأحقاف: ١٧] ''اور جس نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ تم سے میں تنگ آ گیا۔''

یہ بات سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سنی تو کہا کہ یہ آیت عبد الرحمان کے بارے میں نہیں آئی، لیکن تیرے باپ کے حق میں یہ آیت اتری ہے: ﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ﴾[3] (أخرجه ابن مردويه) ﴿هَمَّازٍ﴾ وہ ہے جو لوگوں کی غیبت کرتا ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿هَمَّازٍ﴾ وہ ہے جو اپنے بھائی کی طرف آنکھ سے اشارہ کرتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿هَمَّازٍ﴾ عیب گو ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جو لوگوں کے منہ پر کہے وہ ﴿هَمَّازٍ﴾ ہے اور جو پیٹھ پیچھے کہے وہ ''لَمَّاز'' ہے۔ یہی امام ابو العالیہ، حسن اور عطاء بن ابی رباح رحمہم اللہ کا قول ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے اس کے برعکس کہا ہے۔[4] بعض نے کہا ہے کہ ﴿هَمَّازٍ﴾ وہ ہے جو لوگوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرے اور ان کو مارے اور ''لَمَّاز'' وہ ہے جو زبان سے کہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ''هُمَز'' و ''لُمَز'' وزن اور معنی میں ایک ہے۔

''همزات الشياطين'' سے مراد وہ خیالات ہیں جو انسان کے دل میں ڈالتا ہے، جو شخص لوگوں کے درمیان

---

(1) تفسير القرطبي (٢٣٠/١٧) فتح القدير (٣٥٦/٥)
(2) تفسير الطبري (٥٣٤/٢٣)
(3) الدر المنثور (٢٤٦/٨)
(4) تفسير القرطبي (٢٣١/١٨، ٢٣٢)

فساد کرانے کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ہے وہ ﴿ مَشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ ﴾ ہے۔ ایک قوم کی بات بطور چغلی وفساد دوسری قوم کے پاس جا کر کہنا نمیمہ ہے، یعنی چغل خوری ہے۔ ﴿ مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ ﴾ سے مراد مال میں بخل کرنا ہے کہ خرچ کی جگہ پر خرچ نہ کرے۔ یا وہ شخص جو اپنے گھر والوں اور کنبے کو اسلام سے روکے۔ حسن نے کہا: یہ وہ شخص ہے جو اپنے اہل سے یہ کہے کہ تم میں جو کوئی دینِ اسلام میں داخل ہوگا میں کبھی اس پر خرچ نہیں کروں گا اور نہ اس کو نفقہ دوں گا۔[1]

﴿ مُعْتَدٍ ﴾ ہے، یعنی ظلم میں حد سے آگے بڑھ گیا ہے۔ ﴿ اَثِيْمٍ ﴾ یعنی "كثير الإثم" ہے۔

﴿ عُتُلٍّ ﴾ ہے، یعنی سخت خو بدزبان ہے، یا باطل میں بڑا جھگڑالو ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ "قاسي القلب" (سخت دل) ہے، یا لوگوں کو امر مکروہ کرنے پر اُکساتا ہے، جیسے: جس وضرب یا فاحش، لئیم ہے۔ ﴿ زَنِيْمٍ ﴾ بہ معنی پسر خواندہ ہے، یعنی آٹھ مذکورہ عیوب کے بعد ایک وصف یہ بھی رکھتا ہے کہ مستلحق بالقوم ہے ماخوذ ہے زنمہ سے جو بکری کے حلق میں لٹکتا ہے یا ﴿ زَنِيْمٍ ﴾ بہ معنی ستمگار ہے، یا وہ شخص جب اس کا گزر ایک قوم پر ہو تو وہ کہیں کہ یہ برا آدمی ہے۔ اس جگہ بعدیت رتبہ کی ہے نہ خارج میں۔ ان آیات کا نزول اخنس کے حق میں ہوا ہے، یا ولید بن مغیرہ کے حق میں۔ جمہور اسی کے قائل ہیں۔ بعض نے کہا: ابو جہل بن ہشام کے حق میں، یا اسود بن یغوث کے حق میں ہوا۔ (قاله ابن عباس) اس زنیم کے جھٹلانے کا مدار متمول اور صاحبِ اولاد ہونے پر تھا۔

﴿ اَسَاطِيْرُ ﴾ سے مراد کذوبہ ہے، یعنی اگلے لوگوں کی جھوٹی کہانی۔ ﴿ الْخُرْطُوْمِ ﴾ سے مراد ناک ہے کہ جب تک جیتا رہے یہ عار داغ کی ناک پر باقی رہے۔ امام ابو عبید، ابو زید اور مبرد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ الْخُرْطُوْمِ ﴾ ناک کو کہتے ہیں۔[2] ناک کی تخصیص اس لیے کی کہ اس جگہ پر داغ کا ہونا نہایت معیوب اور بدنما ہوتا ہے اور ناک کی جگہ سونڈ بولنا استہجان (حقیر سمجھنا) اور استہزاء (ٹھٹھا کرنا) ہے لعین کے ساتھ، کیوں کہ خرطوم درندوں کی ناک کو کہتے ہیں اور اس کا زیادہ تر استعمال ہاتھی اور سؤر کی ناک میں ہوتا ہے۔ امام سمین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ الْخُرْطُوْمِ ﴾ سارے چہرے سے عبارت ہے۔ کل کو جز سے تعبیر کیا ہے، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ اس لعین کی ناک بدر کے دن زخمی ہوئی اور وہ داغ ناک پر تمام عمر باقی رہا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم اس کو آخرت میں ایک داغ دیں گے جس سے وہ آگ میں پہچانا جائے گا۔[3]

إِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ﴿١٧﴾ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿١٨﴾ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿١٩﴾ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿٢٠﴾ فَتَنَادَوْا

[1] تفسير القرطبي (١٨/٢٣٢) [2] فتح القدير (٥/٣٥٧) [3] معاني القرآن (٥/٢٠٧) فتح البيان (١٤/٢٥٨-٢٦٢)

مُصْبِحِيْنَ ﴿٢١﴾ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿٢٢﴾
فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿٢٣﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ
مِّسْكِيْنٌ ﴿٢٤﴾ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿٢٥﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا
اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿٢٦﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿٢٧﴾ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ
لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿٢٨﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا
ظٰلِمِيْنَ ﴿٢٩﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿٣٠﴾ قَالُوْا
يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿٣١﴾ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا
مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴿٣٢﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ
الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٣﴾

بے شک ہم نے انھیں آزمایا، جیسے ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا، جب انھوں نے قسم کھائی کہ البتہ صبح ہوتے ہی اس کے پھل کو ضرور توڑ لیں گے ⑰ اور وہ ”ان شاء اللہ“ نہیں کہہ رہے تھے ⑱ تو آپ کے رب کی طرف سے کوئی پھرنے والا (عذاب) اس (باغ) پر پھر گیا، جب کہ وہ سو رہے تھے ⑲ پھر وہ (باغ) کٹی کھیتی کی طرح ہو گیا ⑳ پھر صبح ہوتے ہی انھوں نے ایک دوسرے کو پکارا ㉑ کہ تم اپنی کھیتی پر صبح سویرے چلو، اگر تمھیں پھل توڑنا ہے ㉒ چناں چہ وہ چل پڑے اور آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے ㉓ کہ آج تمھارے پاس باغ میں کوئی مسکین داخل نہ ہونے پائے ㉔ اور وہ صبح سویرے (یہ سوچ کر) لپکتے گئے کہ وہ (مسکینوں کو) روکنے پر قادر ہیں ㉕ پھر جب انھوں نے باغ دیکھا تو کہا: یقیناً ہم (راہ) بھول گئے ہیں ㉖ (نہیں) بلکہ ہم تو محروم کر دیے گئے ہیں ㉗ ان کا بہترین کہنے لگا: کیا میں نے تمھیں نہیں کہا تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے؟ ㉘ انھوں نے کہا: پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہم ہی ظالم تھے ㉙ پھر وہ ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے ملامت کرنے لگے ㉚ (اور) کہنے لگے: ہائے ہم پر افسوس! بے شک ہم ہی سرکش تھے ㉛ شاید ہمارا رب بدلے میں اس سے بہتر ہمیں دے، بے شک ہم اپنے رب کی طرف رغبت کرنے والے ہیں ㉜ اسی طرح ہوتا ہے عذاب۔ اور آخرت کا عذاب تو سب سے بڑا ہے۔ کاش! وہ جان لیتے ㉝

موضح قرآن میں کہا ہے کہ پانچ بھائی تھے، ان کا باپ میوہ کا ایک باغ چھوڑ کر مرا، اس کی پیداوار سے سارا گھر آسودہ تھا، جس دن باغ کا پھل اتارنے کا ارادہ کرتا شہر کے تمام فقیر جمع ہو جاتے، سب کو کچھ نہ کچھ دے دیتا، اس سے برکت تھی۔ بعد میں بیٹوں نے سوچا کہ اتنا جو فقیر لے جائیں وہ اپنے ہی کام آ جائے تو اچھا ہے۔ آپس میں مشورہ کیا کہ صبح سویرے پھل توڑ کر گھر لے آئیں گے، فقیر جائیں گے تو وہاں کچھ نہ پائیں گے اور ایسا یقین کیا کہ ان شاء اللہ بھی نہ کہا۔ رات کو آگ لگی یا دھاڑ پڑی، سب پھل صاف ہو گیا۔ پہلے اپنی جگہ ہی نہ پہچانی، سمجھے کہ کہیں اور جا نکلے ہیں، بعد میں سمجھ آئی کہ ہم بے نصیب ہیں اگر اللہ کی طرف سے سمجھتے تو اس نعمت کو فقیروں سے روکنے کی ترکیب نہ بناتے۔ انتہی۔

کفار کے اعمال ضائع ہونے کی ایک مثال:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ نے کفارِ قریش کے لیے بیان فرمائی ہے، اس عظیم رحمت اور بڑی نعمت کی بابت جو ان کو عطا فرمائی تھی اور وہ رسول اللہ ﷺ کا ان کی طرف مبعوث ہونا ہے، انھوں نے اس نعمت و رحمت کا مقابلہ اس طرح سے کیا کہ آپ کو جھٹلایا اور رد کیا اور آپ ﷺ سے لڑنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے ان کی آزمائش کی ہے، ویسے ہی جیسے کہ باغ والوں کی کی تھی۔ جنت سے مراد بوستان ہے جس میں ہر طرح کے میوے اور پھل ہوں۔ انھوں نے قسم کھائی تھی اور اللہ کا نام نہ لیا تھا، اللہ نے ان کی قسم توڑ دی، راتوں رات ان کے باغ پر آفت آ گئی، وہ صریم (کٹی ہوئی کھیتی) کی طرح ہو گیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی شبِ سیاہ کی طرح۔[1] امام ثوری اور سدی رحمہما اللہ نے کہا: اس کھیت کی طرح جس کو کاٹ کر خرمن کیا ہو اور بھوسا سا ہو گیا ہو۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ تم معاصی سے بچو۔ بندہ کوئی گناہ کرتا ہے، پھر اس کے سبب سے اس رزق سے محروم ہو جاتا ہے جو اس کے لیے مہیا کیا گیا تھا، پھر نبی کریم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ﴾[2] (رواه ابن أبي حاتم) یعنی وہ اپنے گناہ کی وجہ سے اپنے اس باغ کی پیداوار سے محروم ہو گئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی وہ کھیتی انگور کی تھی۔ ﴿حَرْدٍ﴾ کے معنی قوت وشدت کے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اپنی کوشش پر چلے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اپنے غصے میں۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مساکین پر غصے میں۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے گاؤں کا نام حرد تھا،[3] لیکن یہ بہت بعید ہے۔ پھر جب وہاں پہنچے تو دیکھا

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٦٦)

[2] تفسیر ابن کثیر (٤/٥٢١) اس کی سند میں "لیث بن ابی سلیم اور عمر بن صبح" ضعیف راوی ہیں۔ [3] تفسیر ابن کثیر (٤/٥٢١)

کہ وہ ساری تازگی اور بہار اور پھلوں کی کثرت مستحیل ہو کر سیاہ مٹی ہو گئی، اس سے فائدہ اٹھانے کے قابل کوئی چیز بھی نہ رہی۔ پہلے تو یہ سمجھے کہ شاید ہم راہ بھول گئے ہیں۔[1] (قاله ابن عباس وغيره) پھر غور کیا تو یقین ہوا کہ نہیں یہ ہمارا ہی کھیت ہے، تب اپنی محرومیِ قسمت پر افسوس کرنے لگے۔ ''أوسط'' سے مراد بہترین اور زیادہ انصاف کرنے والا ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، محمد بن کعب، ربیع بن انس، ضحاک اور قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔ امام مجاہد، سدی اور ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: تسبیح سے مراد استثناء ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس زمانے کا استثناء یہی تسبیح تھی۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ استثناء یہ ہے کہ ان شاء اللہ کہے،[2] یا تسبیح سے مراد نعمتِ الٰہی کا شکر بجا لانا ہے۔ لیکن بعد میں تسبیح کا اقرار کرنا بے سود ہوا۔ اب اس اعتراف کا کچھ فائدہ نہیں، اس لیے ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے اور ایک دوسرے کو جواب یہی گناہ کا اقرار اور اعتراف خطا تھا، کہنے لگے کہ ہم نے زیادتی کی اور ہم حد سے بڑھ گئے، ہم سے بغي وطغيان (حد سے بڑھنا اور سرکشی) ہوا، اب ہم اللہ کی طرف راغب ہیں، یعنی دنیا میں اس کو بدل (عطا) کر کے یا آخرت میں۔ بعض سلف نے کہا ہے کہ یہ لوگ اہلِ یمن میں سے تھے۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صنعاء سے چھ میل کے فاصلے پر ضروان نامی ایک گاؤں تھا، یہ وہاں کا قصہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اہلِ حبشہ تھے، ان کا باپ ان کے لیے یہ باغ چھوڑ کر مر گیا تھا۔ وہ اہلِ کتاب تھے ان کا باپ اچھی راہ پر چلتا تھا، جو کچھ پیداوار ہوتی اس میں بہ قدرِ ضرورت اسی باغ میں لگاتا اور بچوں کے لیے ایک سال کا خرچہ رکھ کر باقی صدقہ کر دیتا تھا۔ جب وہ مر گیا، اس کے بیٹے اس کی جائیداد کے وارث ہوئے، کہنے لگے: ہمارا باپ احمق تھا کہ جو زیادہ بچتا وہ فقیر کو دے دیتا، ہم اگر نہ دیں گے تو ہمارے پاس بہت جمع ہو جائے گا، جب سب نے اس بات کا پکا ارادہ کر لیا تو اللہ نے ان کو سزا دی کہ گرہ کا مال بھی برباد ہو گیا، نہ راس المال باقی رہا اور نہ اس کا فائدہ اور نہ صدقہ۔

اللہ نے سب چھین لیا اور فرمایا کہ جو کوئی اللہ کے حکم کے خلاف کرتا ہے اور اللہ پاک کے دیے ہوئے مال میں بخل کرتا ہے اور اس کی نعمت کا شکر بجا نہیں لاتا اور مسکین کے حق کو روکتا ہے اور فقیر اور حاجت مند کو نہیں دیتا اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کو کفر سے بدل ڈالتا ہے اس پر اسی طرح کا عذاب آتا ہے۔ یہ تو دنیا کا عذاب ہوا جو تم نے سنا۔ رہا آخرت کا عذاب تو وہ اس عذاب سے کہیں بڑھ کر ہے۔ سیدنا علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ رات کو میوہ مت توڑو اور نہ کھیتی کی کٹائی کرو۔[3] (رواه البيهقي)

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۳۳٦٦/۱۰) [2] تفسير الطبري (۵۵۱،۵۵۰/۲۳) تفسير ابن كثير (۵۲۱/٤)

[3] سنن البيهقي الكبرىٰ (۱۳۳/٤) تفسير ابن كثير (۵۲۲-۵۲۰/٤) السلسلة الصحيحة رقم الحديث (۲۳۹۳)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے ہم نے کفارِ مکہ کو بھوک اور خشک سالی سے نبیِ کریم ﷺ کی بد دعا کے سبب سے آزمایا، یہاں تک کہ انھوں نے مردار اور ہڈیاں کھائیں۔ ہم نے ان کو مال اس لیے دیے تھے کہ وہ ہمارا شکر کریں، نہ اس لیے کہ وہ اترائیں، لیکن جب وہ اترانے لگے اور نبیِ کریم ﷺ سے دشمنی کی تو ہم نے ان کو بھوک اور قحط میں مبتلا کیا جس طرح کہ باغ والوں کے ساتھ کیا تھا، ان کی خبر ان کے نزدیک مشہور تھی۔ یہ باغ یمن کی زمین میں تھا، صنعاء سے دو فرسخ پر۔ یہ اس شخص کا تھا جو اللہ کا حق ادا کرتا تھا۔ جب وہ باغ اس کی اولاد کو ملا تو انھوں نے بخل سے لوگوں کو اس کی خیر سے محروم رکھا۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قومِ ثقیف تھی، یمن میں رہتی تھی اور وہ مسلمان تھے۔ باپ کی طرف سے ان کو باغ اور کھیتی ملی تھی، ان کا باپ جب باغ اور کھیتی و نخیل (کھجور) کو قطع کرتا تو مساکین کا حق دیتا۔ اس کے بیٹوں نے کہا: مال تھوڑا ہے اور عیال بہت ہیں، ہم وہ کام نہیں کر سکتے جو ہمارا باپ کرتا تھا اور پختہ ارادہ کر لیا کہ اس میں سے مساکین کو کچھ نہ دیں گے، چنانچہ ان کا انجام وہ ہوا جو اللہ نے بیان فرمایا۔[1] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ کافر تھے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ اور جمہور نے کہا ہے کہ مسلمان تھا۔[2] امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صنعاء سے دو فرسخ پر تھے، اللہ نے ان کے باغ کو جلا دیا۔ یا یہ باغ صروان میں تھا، بہ صادِ مہملہ۔ یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے سے تھوڑے زمانے میں تھے۔[3] (قاله الزرقاني و القرطبي و البيضاوي)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: حبشی تھے۔[4] انھوں نے قسم کھائی تھی کہ ہم صبح کے وقت فقراء کے اکٹھے ہونے سے پہلے جا کر میوہ وغیرہ کاٹ لائیں گے۔ رات کو اللہ کی طرف سے اس باغ پر بلا آئی، یہ سوتے رہے، باغ آگ سے جل کر خاک سیاہ ہو گیا۔[5] (قاله المقاتل) بعض نے کہا: طائف سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ انھوں نے اس باغ کو اُکھیڑ کر پھینک دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد اللہ کا حکم ہے۔[6] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ تم نافرمانی سے بچو، بندہ ایک گناہ کرتا ہے تو اس کے سبب سے علم کا ایک باب بھول جاتا ہے، پھر کوئی گناہ کرتا ہے تو رات کے قیام سے محروم رہتا ہے، پھر کوئی گناہ کرتا ہے تو رزق سے بے نصیب ہو جاتا ہے جو اس کے لیے مہیا تھا۔ پھر نبیِ کریم ﷺ نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا: وہ اپنے گناہوں کے سبب سے اپنے باغ کی خیر سے محروم ہو گئے۔[7] (رواه عبد بن حميد و ابن مردويه و ابن أبي حاتم)

اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ عزم پر انسان کی پکڑ ہوتی ہے، کیوں کہ ان کی سزا اسی عزم کی وجہ سے

---

① فتح القدير (٣٦٠/٥) ② تفسير النسفي (٢٦٩/٤) ③ تفسير القرطبي (٢٣٩/١٨)

④ تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٦٥/١٠) ⑤ فتح القدير (٥/ ٣٦٠) ⑥ تفسير الطبري (٥٤٤/٢٣)

⑦ اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

ہوئی تھی، ابھی وہ کام بھی نہیں کیا تھا، اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [الحج: ٢٥] ”جو بھی ظلم کے ساتھ وہاں الحاد کا ارادہ کرے ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔“ اور صحیح میں مروی ہے کہ جب دو مسلمان تلواریں لے کر آمنے سامنے آتے ہیں تو قاتل ومقتول دونوں آگ میں جاتے ہیں۔ کہا: اے اللہ کے رسول! قاتل تو قاتل تھا، مقتول کا کیا حال ہے؟ فرمایا: وہ اپنے مقابل کے قتل کا حریص تھا۔[1] یہ محمول ہے عزمِ مصمم پر اور جو بات دل میں بغیر عزم کے گزرتی ہے اس کی پکڑ نہیں ہے۔[2] (قاله القرطبي)

”صریم“ خزیمہ کی لغت میں راکھ کو کہتے ہیں۔ مورج نے کہا ہے کہ ”صریم“ ریت ہے جس میں کوئی چیز نہیں اُگتی۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”صریم“ بہ معنی مقطوع ہے، یعنی اس سے خیر منقطع ہوگئی۔ اس جگہ سے مراد پھلوں، کھیتوں، انگوروں اور کھجوروں کے پیدا ہونے کی جگہ ہے۔ ﴿ حَرْدٍ ﴾ کے معنی ہیں منع وغضب وقصد کے۔ امام قتادہ، مقاتل، کلبی، حسن اور مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ یہی قصد مراد ہے۔ امام قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ﴿ حَرْدٍ ﴾ بہ معنی ”حسد“ ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی حاجت وفاقہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ معنی انفراد ہے۔ یہی قول امام اصمعی رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ اس لفظ کی تفسیر ان سب معانی کے ساتھ کی گئی ہے۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”حرد“ ان کی بستی کا نام ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے باغ کا نام ہے۔[3]

”أوسط“ سے مراد افضل واَمثل وخیر ہے، یعنی ان میں جو شخص بہتر، دانا، عقلمند اور خوش نفس تھا، اس نے کہا کہ میں نے پہلے ہی تم سے کہا تھا کہ تم نے تسبیح کیوں نہ کی۔ معلوم ہوا کہ اوسط نے کہا تھا کہ تم استثناء کرو، لیکن انھوں نے اس کا کہنا نہ مانا۔ یا تسبیح سے مراد استغفار ہے کہ تم اس عزم سے تائب ہو جاؤ، پھر جب باغ کو برباد دیکھا تو ایک دوسرے سے شکوہ کرنے لگے۔ کسی نے کہا: تو نے ہی یہ رائے ہم کو دی تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ تو نے ہی ہم کو محتاجی سے ڈرایا تھا۔ تیسرے نے کہا: تو نے ہی ہم کو مال کے جمع کرنے کی رغبت دلائی تھی۔ پھر ایک نے اپنی سرکشی کا اقرار کیا اور کہا: قریب ہے کہ اس کے بدلے میں اللہ ہم کو اس سے بہتر دے گا، پھر ہم وہی کام کریں گے جو ہمارا باپ کیا کرتا تھا، جب اللہ کو پکارا اور اس سے زاری وخاکساری کی تو اللہ تعالیٰ نے اسی رات ان کو اس سے بہتر باغ بدلے میں دے دیا۔ اللہ نے جبریل علیہ السلام کو حکم دیا کہ اس جلے ہوئے باغ کو یہاں سے اُکھیڑ کر زغر میں لے جا اور وہاں کا باغ لا کر اس جگہ رکھ دے۔ زغر شام کی زمین میں ہے، وہاں ایک چشمہ ہے کہ جب اس کا پانی سوکھ جائے گا تو یہ دجال کے نکلنے کی علامت ہوگی۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ جب انھوں نے اخلاص کیا اور اللہ نے ان

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١) صحيح مسلم (٢٨٨٨) ② تفسير القرطبي (٢٤١/١٨)
③ تفسير القرطبي (٢٤٢/١٨، ٢٤٣) فتح القدير (٣٦١/٥، ٣٦٢)

کی صدقِ نیت پہچان لی تو ان کو اس باغ کے بدلے میں ایک باغ عطا کیا جس کا نام حیوان تھا، یعنی حیات افزاء، اس میں انگوروں کا ایک خوشہ خچر کے برابر ہوتا۔ ابو خالد یمانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں اس باغ میں گیا، اس میں ایک ایک خوشہ ایک سیاہ مرد کے برابر دیکھا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: باغ والوں کا یہ کہنا کہ ﴿ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ﴾ معلوم نہیں کہ اللہ پر ایمان لانا تھا یا جس وقت سختی پہنچنے پر مشرک ایسی بات کہتے ہیں، اس طرح انھوں نے کہا تھا۔ گویا حسن رحمہ اللہ نے ان کے مومن ہونے میں توقف کیا۔ کسی نے امام قتادہ رحمہ اللہ سے پوچھا تھا کہ اصحاب جنت اہلِ جنت تھے یا اہلِ نار؟ کہا: تو نے مجھے تعب کی تکلیف دی۔ اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ تائب ہو کر مخلص ہو گئے تھے۔[1] (حكاه القشيري) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ وہ عذاب ہے جس میں ہم نے ان کو اور اہلِ مکہ کو عذابِ دنیا میں مبتلا کیا اور جو کوئی ان کی راہ پر چلے، اس کو بھی اسی طرح کا عذاب ہوگا اور آخرت کا عذاب دنیا کے عذاب سے زیادہ شدید اور بڑا ہے اگر وہ جانیں، لیکن وہ نہیں جانتے۔[2]

اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴿٣٤﴾ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ ﴿٣٥﴾ مَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٦﴾ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِیْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿٣٧﴾ اِنَّ لَكُمْ فِیْهِ لَمَا تَخَیَّرُوْنَ ﴿٣٨﴾ اَمْ لَكُمْ اَیْمَانٌ عَلَیْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٩﴾ سَلْهُمْ اَیُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِیْمٌ ﴿٤٠﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْیَاْتُوْا بِشُرَكَآىِٕهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ ﴿٤١﴾

بے شک متقین کے لیے ان کے رب کے ہاں نعمت کے باغات ہیں (34) کیا پھر ہم مسلمانوں کو مجرموں کے برابر ٹھہرائیں گے؟ (35) تمھیں کیا ہوا، تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ (36) کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھ لیتے ہو؟ (37) (کہ) یقیناً تمھارے لیے اس (کتاب) میں تمھاری من مانی باتیں ہوں؟ (38) کیا تم نے ہم سے یومِ قیامت تک پہنچنے والی قسمیں لی ہیں کہ تمھارے لیے وہ ہوگا جو تم فیصلہ کرو گے؟ (39) ان سے پوچھیے کہ ان میں کون اس کا ذمہ لیتا ہے؟ (40) کیا ان کے کوئی شریک ہیں؟ تو چاہیے کہ وہ اپنے شریک لے آئیں، اگر وہ سچے ہیں (41)

فرماں بردار اور مجرم لوگ برابر نہیں ہیں:

اللہ تعالیٰ نے جب دنیا کے باغ والوں کا ذکر کیا اور اللہ عزوجل کی نافرمانی اور امرِ الٰہی کی مخالفت کے سبب

[1] تفسير القرطبي (١٨/٢٤٥) [2] فتح البيان (١٤/٢٦٢-٢٧٠)

سے ان کو جو سزا پہنچی وہ بیان فرمائی تو اب آخرت میں اہلِ جنت کا ذکر کیا اور فرمایا کہ جو لوگ متقی ہیں اور اللہ کی اطاعت کرتے ہیں، ان کے لیے دارِ آخرت میں جناتِ نعیم ہیں جو نہ تباہ ہوں اور نہ ختم ہوں۔ پھر فرمایا کہ مسلمین اور مجرمین جزا میں برابر نہ ہوں گے، قسم ہے زمین و آسمان کے رب کی! پھر فرمایا: کیا تمھارے ہاتھ میں کوئی کتاب ہے جو آسمان پر سے اتری ہے، تم اس کی حفاظت اور اس کو ایک دوسرے سے لیتے آئے ہو، یعنی وہ خلفاً عن خلف چلی آئی ہے اور اس میں تمھارے دعوے کے مطابق تاکیدی حکم شامل ہے۔ ایمان، یعنی قسم سے مراد عہد و پیمان ہے، چنانچہ کون شخص اس کا متکلف یا ذمہ دار ہے۔ کیا اصنام و انداد ان کے شرکاء ہیں۔ اچھا اگر وہ سچے ہیں تو اپنے شرکاء کو لائیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ کفر اور معاصی سے پرہیز کرنے والوں کے لیے ان کے رب کے پاس دارِ آخرت میں آرام والے باغات ہیں جو ہر دھندلے پن سے خالص ہیں، وہاں عیش و عشرت میں کسی قسم کی تلخی اور خوف اور زوال نہیں تو کیا وہ مسلمین مجرموں کی طرح ہیں۔ یہ اس لیے کہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے افضل جانتے تھے۔ کافر قریش کے سردار تھے، دنیا میں خود کو اپنے مال و منال کی وجہ سے نصیب ور خیال کرتے تھے اور مسلمانوں کو دنیا کے مال و اسباب کی قلت کی وجہ سے حقیر و فقیر سمجھتے تھے۔ جب آخرت کا ذکر سنتے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بہت کچھ عطا کرے گا تو کہتے کہ اگر ایسا ہی ہوا جیسا کہ محمد کا زعم ہے، تب بھی ہمارا اور اُن مسلمانوں کا حال ویسا ہی ہوگا جیسا کہ اس دنیا میں ہے۔ اللہ نے ان کی تردید کی اور فرمایا: کیا ہم تم کو اور ان کو برابر کر دیں گے؟ جس طرح کہ دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ﴾ [الحشر: ٢٠] ''اہلِ نار اور اہلِ جنت (باہم) برابر نہیں جو اہلِ جنت ہیں وہی کامیاب ہیں (اور جو اہلِ نار ہیں وہ ناکام ہیں)۔'' (قاله علي القاري) یعنی مسلمان اور کافر یکساں نہیں ہیں اور نہ جنتی اور دوزخی برابر ہیں۔

پھر فرمایا: کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم کو یہ بات لکھی ہوئی ملی ہے کہ مطیع عاصی کی طرح ہوتا ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [الصَّافات: ١٥٦۔ ١٥٧] ''یا تمھارے پاس اس کی کوئی صاف دلیل ہے تو جاؤ اگر سچے ہو تو اپنی ہی کتاب لے آؤ۔'' یا تم نے اللہ سے کوئی مضبوط عہد لے لیا ہے کہ وہ تم کو جنت میں داخل کرے گا اور اس عہد پر قسما قسمی ہو چکی ہے۔ بھلا بتاؤ کہ اس حکم کا جو خارج از صواب ہے کون ذمہ دار ہوا ہے کہ جو وہاں مسلمانوں کو ملے گا وہی تم کو بھی ملے گا۔ ابن کیسان نے کہا کہ اس جگہ زعیم وہ ہے جو دعویٰ اور حجت کے ساتھ قائم ہو۔

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''زعیم'' بہ معنی رسول ہے۔[1] یا ان کے سوا اور شرکاء ہیں جو اس قول میں شریک

[1] تفسير القرطبي (١٨/٢٤٧، ٢٤٨)

ہوئے ہیں اور یہی ان کا بھی مذہب ہے اس صدق دعویٰ پر گواہی دیتے ہیں۔ بعض نے کہا: شرکاء سے مراد اصنام ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب اور ظاہر ہے، یا یہ معنی ہیں کہ کیا ان کے شرکاء ہیں جو اُن کو مسلمانوں کی طرح کر دیں گے۔ اچھا تو وہ اپنے ان شرکاء کو لے آئیں اگر اس بات میں پکے اور سچے ہیں۔ یہ امر ادنیٰ درجہ تقلید ہے، تعجیز کے لیے فرمایا۔ قاضی رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں ان سب امور کی نفی کی تنبیہ کی ہے جن کو وہ عقل یا نقل یا وعد یا تقلیدِ محض سے اپنے دعویٰ پر دلیل کے طور پر لاتے ہیں اور غور وفکر کرنے کے مختلف مرتبوں کے بارے میں بتایا ہے اور بے اصل اور بے سند باتوں کو جھٹلانے کے طریقوں کے بارے میں بتایا ہے۔[1]

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿٤٢﴾
خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ
إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ ﴿٤٣﴾ فَذَرْنِي وَمَنْ يُّكَذِّبُ
بِهَٰذَا الْحَدِيثِ ۖ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٤٤﴾
وَأُمْلِي لَهُمْ ۚ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿٤٥﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ
مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ ﴿٤٦﴾ أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿٤٧﴾

جس دن پنڈلی کھول دی جائے گی اور انھیں سجدے کے لیے بلایا جائے گا تو وہ (سجدہ) نہ کر سکیں گے (42) ان کی نظریں جھکی ہوں گی، ان پر ذلت چھا رہی ہو گی۔ اور تحقیق (دنیا میں) انھیں سجدے کے لیے بلایا جاتا تھا، جبکہ وہ صحیح سالم تھے (43) لہٰذا چھوڑ دیجیے مجھے اور اس کو جو اس حدیث (قرآن) کو جھٹلاتا ہے، ہم انھیں آہستہ آہستہ (تباہی کی طرف) لے جائیں گے، اس طرح کہ انھیں علم تک نہ ہو گا (44) اور میں انھیں ڈھیل دیتا ہوں، بے شک میری تدبیر انتہائی پختہ ہے (45) (اے نبی!) کیا آپ ان سے اجر مانگتے ہیں جو وہ چٹی کے بوجھ سے دبے جا رہے ہیں؟ (46) کیا ان کے پاس (علمِ) غیب ہے تو وہ (اس سے) لکھ لاتے ہیں؟ (47)

موضح قرآن میں لکھا ہے کہ حشر کے دن ہر اُمت اس کے ساتھ جائے گی جس کو پوجتے تھے۔ مسلمان کھڑے رہ جائیں گے۔ پروردگار اس صورت میں آئے گا جس میں وہ نہ پہچانیں۔ فرمائے گا: میں تمھارا رب ہوں، میرے ساتھ آؤ، کہیں گے۔ نعوذ باللہ۔ ہمارا رب آئے گا تو ہم پہچان لیں گے۔ فرمائے گا: کچھ اس کی نشانی جانتے ہو؟ کہیں گے: جانتے ہیں، پھر ان کی پہچان کے مطابق ظاہر ہو گا اور پنڈلی کھولے گا تو سجدے میں گر پڑیں گے۔ جو سچے

[1] تفسير البيضاوي (٣٧٤/٥) فتح البيان (٢٧٠/١٤_٢٧٢)

نیت سے سجدہ نہیں کرتا تھا اس کی پیٹھ نہ مڑے گی، وہ الٹا ہو کر سجدہ کرے گا۔ ایسا ان کی توحید کا اعتقاد آزمانے کے لیے ہوگا کہ صورت پوجنے سے ایسے بے زار ہیں۔ انتہیٰ۔

قیامت کے دن کی ہولناکیوں کا ذکر:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے جب متقین کے لیے جناتِ نعیم کا ذکر کیا تو اب یہ بھی فرمایا کہ یہ جناتِ نعیم ان کو کب اور کس دن ملیں گے۔ چنانچہ وہ دن جس میں یہ امرِ واقعہ ہوگا قیامت کا دن ہے، جہاں ہولناکیاں، زلزلے و آزمائش و امتحان اور بہت بڑے بڑے امور ہوں گے۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ ہمارا رب اپنی پنڈلی کھولے گا، اس وقت اس کو ہر ایمان دار عورت اور مرد سجدہ کرے گا اور باقی وہ شخص رہ جائے گا جو دنیا میں دکھاوے اور سنانے کے لیے سجدہ کرتا تھا، اس کی پشت ایک تختہ بن جائے گی۔[1] (رواه البخاري)

یہ حدیث صحیحین میں کئی طرق اور الفاظ سے آئی ہے اور ایک حدیث طویل مشہور ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: پنڈلی کھلنے کے دن سے مراد امرِ عظیم ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شدتِ امر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: قیامت کے دن یہ ایک بڑی سخت گھڑی ہوگی۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ قیامت کی ہولناکیوں کا ایک شدید اور سخت امر ہوگا۔ اس وقت کشفِ امر اور ظہورِ اعمال ہوگا۔[2] سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے رفعاً کہا ہے کہ کشفِ ساق سے مراد نورِ عظیم ہے جس کے لیے سجدے میں گر پڑیں گے۔[3] (رواه ابن جرير وأبو يعلى وفيه رجل مبهم)

دارِ آخرت میں ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی، ان پر ذلت چھائی ہوگی۔ یہ سزا اس حالت کی ہے جس پر وہ دنیا میں تھے۔ جب ان کو دنیا میں سجدہ کرنے کے لیے بلایا جاتا تھا تو اپنی عزت اور تکبر کی وجہ سے نہیں آتے تھے، باوجود اس کے کہ وہ صحت مند اور سلامت تھے۔ اب یہاں یہ سزا ملی کہ آخرت میں رب عزوجل کی تجلی کے وقت، جبکہ مومنین سجدہ کریں گے، کوئی کافر اور منافق سجدہ نہ کر سکے گا، ہر ایک کی پشت ایک طبق (تختہ کی طرح سیدھی) ہو جائے گی، وہ جب سجدہ کرنے کا ارادہ کرے گا تو سجدے کے برعکس پشت کے بل گر پڑے گا۔

قرآن مجید کو جھٹلانے والوں کی وعید:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھ کو اور اس حدیث، یعنی قرآن کو جھٹلانے والے کو چھوڑ دے۔ یہ ایک سخت دھمکی ہے کہ میں پہلے تو اس کے ساتھ استدراج کروں گا، یعنی اس کو آہستہ آہستہ کھینچوں گا اور اس کی سرکشی میں مدد دوں گا اور مہلت میں رکھوں گا، پھر غالب اقتدار والے کی طرح اس کو پکڑ لوں گا اور اس کو معلوم بھی نہ ہوگا، بلکہ اس کے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٣٥) [2] تفسير الطبري (٥٥٥،٥٥٤/٢٣)

[3] تفسير الطبري (٥٥٩/٢٣) مسند أبي يعلىٰ (٢١٥/١٣) اس کی سند میں "مولیٰ عمر بن عبدالعزیز" مجہول اور "روح بن جناح" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٣٣٩)

اعتقاد میں یہ بات ہوگی کہ یہ اللہ کی طرف سے میری بزرگی ہے، حالانکہ حقیقت میں یہ اہانت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [المومنون: ٥٥۔ ٥٦] ''کیا یہ (یوں) سمجھ بیٹھے ہیں؟ کہ ہم جو بھی ان کے مال و اولاد بڑھا رہے ہیں وہ ان کے لیے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں (نہیں نہیں) بلکہ یہ سمجھتے ہی نہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٤٤] ''پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کشادہ کر دیے، یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو ان کو ملی تھیں وہ خوب اترا گئے ہم نے ان کو دفعتاً پکڑ لیا، پھر تو وہ بالکل مایوس ہو گئے۔'' اور اس جگہ یہ کہا ہے: ﴿ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴾ یعنی ہم نے ان کو تاخیر اور مہلت دی ہے، یہ ان کے ساتھ ہمارا کید ہے اور چال ہے۔ لہٰذا اللہ نے اپنے کید کو متین فرمایا، یعنی اس شخص کے حق میں عظیم ہے جو اللہ کے حکم کی مخالفت کرتا ہے اور رسولوں کو جھٹلانے والا ہے اور معصیت پر جرأت کرتا ہے۔

صحیحین میں رفعاً آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر نہیں چھوڑتا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظٰلِمَةٌ ۭ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴾[1] [ھود: ١٠٢] ''تیرے پروردگار کی پکڑ کا یہی طریقہ ہے جبکہ وہ بستیوں کے رہنے والے ظالموں کو پکڑتا ہے بے شک اس کی پکڑ دکھ دینے والی اور نہایت سخت ہے۔'' پھر فرمایا کہ اے محمد! تم ان کو اللہ کی طرف بلاتے ہو بغیر اُجرت کے جو تم لو، بلکہ تم کو اللہ کے پاس سے ثواب کی امید ہے اور صرف اپنی جہالت، کفر اور دشمنی سے تم کو جھٹلاتے ہیں۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین کے نزدیک کشفِ ساق شدتِ امر و صعوبتِ خطب ہے۔ لغتِ عرب میں یہ محاورہ مشہور ہے۔ امام زمخشری رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ جہنم کی ساق مکشوف ہوگی، یا عرش کی، یا یہ کہنے سے یہ مراد ہے کہ قرب سے یا ساقِ رب سے نورِ رب مراد ہے کہ وہ ظاہر ہوگا۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: وہاں نہ کوئی کشف ہے اور نہ ساق، لیکن یہ شدت اور سختی سے کنایہ ہے، اس لیے کہ جب لوگ شدت اور سختی میں مبتلا ہوتے ہیں تو کشفِ ساق کرتے ہیں اور جس نے تشبیہ دی ہے تو اس نے علمِ بیان میں عطف کی تنگی اور قلتِ نظر کے سبب سے دی ہے، اگر یہی بات ہوتی جس طرح کہ تشبیہ دینے والے نے زعم کیا ہے تو ساق کا پہچانا جانا ضروری تھا، اس لیے کہ تشبیہ دینے والے کے نزدیک ساق معہود ہے۔[4] انتھی۔

---

(1) صحيح البخاري (٤٤٠٩) صحيح مسلم (٢٥٨٣)
(2) تفسير ابن كثير (٥٢٣/٤، ٥٢٤)
(3) الكشاف (٥٩٨/٤)
(4) تفسير النسفي (٢٧١/٤)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ساق کھولے گا۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کشفِ ساق سے مراد امرِ عظیم ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کشفِ ساق کرے گا تو ہر مومن سجدے میں گر پڑے گا اور کافر کی پیٹھ سخت ہو جائے گی جیسے: ایک ہڈی۔[1]

علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس آیت کی تفسیر میں غنی کر دیا ہے اس حدیث کے سبب سے جو صحیح بخاری وغیرہ میں سیدنا ابو سعید سے رفعاً آئی ہے[2] کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: « يَكْشِفُ رَبُّنَا سَاقَهُ فَيَسْجُدُ لَهُ كُلُّ مُؤْمِنٍ وَ مُؤْمِنَةٍ، وَيَبْقٰى مَنْ كَانَ يَسْجُدُ فِي الدُّنْيَا رِيَاءً وَّسُمْعَةً، فَيَذْهَبُ لِيَسْجُدَ فَيَعُوْدُ ظَهْرُهُ طَبَقًا وَّاحِدًا » ''ہمارا رب اپنی پنڈلی کو کھولے گا تو ہر مومن مرد اور مومن عورت اس کو سجدہ کریں گے اور جو دنیا میں ریاکاری اور شہرت کے لیے سجدے کرتے تھے وہ سجدہ کرنے کی کوشش کریں گے تو ان کی کمر ایک تختہ بن جائے گی۔''

یہ حدیث صحیحین میں کئی طریق اور الفاظ سے آئی ہے۔ بعض میں طول ہے اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے رفعاً کہا ہے: « نُوْرٌ عَظِيْمٌ فَيَخِرُّوْنَ لَهٗ سُجَّدًا »[3] ''وہ نورِ عظیم ہے تو وہ اس کے لیے سجدے میں گر جائیں گے۔'' (أخرجه أبو يعلى وابن جرير وابن المنذر وابن مردويه والبيهقي وضعفه) اس سے کچھ تجسیم و تشبیہ لازم نہیں آتی، کیونکہ اللہ نے کہہ دیا ہے: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴾ [الشوریٰ: ۱۱] ''اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔'' اور جب اللہ کی نہر آئی تو پھر معقل کی نہر باطل ہوگئی۔ نبی مکرم ﷺ کے ارشاد کے سامنے کسی کے قول و تفسیر کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ شیوخِ اسلام نے اس لفظ کو اس کے ظاہر پر جاری رکھا ہے اور باطن معنی کا کشف نہیں کیا۔ تاویل متکلمین کا مذہب ہے اور یہ تکذیب کی ایک قسم ہے۔ علامہ نسفی، بیضاوی اور زمخشری رحمہم اللہ یہ سب اہلِ کلام تھے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے ''حجة الله البالغة'' میں کیا خوب کہا ہے: ''وَاسْتَطَالَ هٰؤُلَاءِ الْخَائِضُوْنَ عَلٰى مَعْشَرِ أَهْلِ الْحَدِيْثِ وَسَمُّوْهُمْ مُشَبِّهَةً، وَّقَالُوْا: هُمُ الْمُسْتَتِرُوْنَ بِالْبِلْكَفَةِ، وَقَدْ وَضَحَ عَلَيَّ وُضُوْحًا بَيِّنًا أَنَّ اسْتِطَالَتَهُمْ هٰذِهِ لَيْسَتْ بِشَيْءٍ وَ أَنَّهُمْ مُخْطِئُوْنَ فِيْ مَقَالَتِهِمْ رِوَايَةً وَّدِرَايَةً وَّخَاطِئُوْنَ فِيْ طَعْنِهِمْ أَئِمَّةَ الْهُدٰى''[4] انتھیٰ. ''ان کج بحثوں نے جماعت اہل الحدیث پر زبان درازی کرتے ہوئے ان کو مشبہہ کا نام دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ لوگ ''بلا کیف'' کے پردے میں چھپنے والے ہیں اور مجھ پر یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ ان کی یہ زبان درازی کچھ بھی نہیں ہے اور یہ کہ وہ اپنی باتوں میں غلطی پر ہیں نقلاً بھی اور عقلاً بھی اور وہ ہدایت کے پیشواؤں پر اعتراض کرنے میں خطا کار ہیں۔'' امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں: مفسرین کہتے ہیں کہ ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کو ایک سجدہ کرے گی فقط کفار اور منافقین باقی رہ جائیں گے۔ وہ بھی چاہیں گے کہ ہم سجدہ

[1] الرد على الجهمية لابن منده (١/١٧، ١٦) الدر المنثور (٨/٢٥٤) [2] فتح القدير (٥/٣٦٩) صحيح البخاري (٤٦٣٥)
[3] ان دونوں روایتوں کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [4] حجة الله البالغة (١/١٣٣، ١٣٤)

کریں لیکن نہ کر سکیں گے، ان کی پیٹھیں خشک ہو جائیں گی، سجدہ کے لیے نرم نہ پڑیں گی۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس لیے کہ وہ دنیا میں اللہ پر ایمان نہ رکھتے تھے[1] اور سجدہ کی طرف یہ بلانا ایمان کے امتحان کے لیے ہو گا نہ کہ تکلیف دینے کے لیے، کیوں کہ آخرت تکلیف کا گھر نہیں ہے۔ ان کی آنکھیں نوی (کھجور کی گٹھلی) ہوں گی، ان پر ہر طرف سے ذلت سوار ہو گی، وہ دنیا میں جب سجدے کے لیے بلائے جاتے تھے تو نہیں آتے تھے، حالانکہ بھلے چنگے ہوتے تھے۔ امام ابراہیم تیمی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بلانا اذان اور اقامت سے تھا۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ" سنتے تھے اور جواب نہ دیتے تھے۔[2] کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا: اللہ کی قسم یہ آیت باجماعت نماز سے پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ لوگ کافر ہیں، دنیا میں امن کی حالت میں بلائے جاتے تھے اور آج ان کا بلانا حالتِ خوف میں ہو گا۔[3] ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ اذان سنتے تھے اور نماز کے لیے نہیں آتے تھے۔[4] (أخرجه البيهقي في شعب الإيمان)

پھر اللہ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی فرمائی اور کہا: مجھ کو اور اس حدیث کو جھٹلانے والے کو چھوڑ دے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی تو اپنے دل کو اس کے ساتھ مشغول نہ کر، بلکہ اس کو میرے حوالے کر، میں تیرے امر کا کفیل ہوں۔[5] حدیث سے مراد قرآن ہے۔ (قاله السدي) کسی نے کہا ہے کہ قیامت کا دن ہے۔ پھر فرمایا: یہ استدراج ہے، کیوں کہ وہ اس کو انعام گمان کرتے تھے اور انجام کار میں غور و فکر نہیں کرتے تھے کہ بعد میں کیا معاملہ دیکھیں گے۔

امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم ان پر انعام کو پورا کرتے ہیں اور شکر کو بھلا دیتے ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہت سے لوگ استدراج میں ہیں، اس لیے کہ ان کے ساتھ احسان کیا گیا ہے اور بہت سے لوگ فتنے میں پڑے ہوئے ہیں، اس لیے کہ ان کی تعریف ہوتی ہے اور بہت سے لوگ مغرور ہیں، اس لیے کہ مستور ہیں۔[6]

استدراج کا مطلب یہ ہے کہ معالجہ ترک کر دیا جائے اور اصل معنی ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل کرنا ہے اور کید و مکر و استدراج کے معنی یہ ہیں کہ امن کی راہ سے پکڑا جائے۔ اللہ پاک کو کائد، ماکر، مستدرج نہیں کہیں گے۔ املاء کے معنی امہال ہیں، یعنی ڈھیل دینا۔

﴿مَتِيْنٌ﴾ سے مراد قوی شدید ہے جس سے کوئی شے فوت نہ ہو۔ اللہ نے اپنے احسان کا نام کید و استدراج رکھا، اس لیے کہ انجام کے لحاظ سے وہ کید کی صورت میں ہے اور اس کا وصف متانت کے ساتھ کیا ہے، اس لیے کہ ہلاکت کے اسباب میں اس کا بہت زیادہ اثر ہے۔ پھر فرمایا کہ ان سے اپنے اس کام کی اجرت نہیں مانگتا کہ ان پر بھاری تاوان ہو، یا ان کے پاس علمِ غیب ہے کہ وہ لوحِ محفوظ سے اپنے مطلب کی حجتیں نقل کرتے اور لکھتے ہیں اور جو چاہتے ہیں وہ بکتے ہیں۔[7]

---

[1] فتح القدير (٣٦٦/٥) [2] تفسير القرطبي (٢٥١/١٨) [3] الدر المنثور (٢٥٥/٨)
[4] شعب الإيمان (٧٥/٣) [5] معاني القرآن (٢١١/٥) فتح القدير (٣٦٦/٥) [6] تفسير القرطبي (٢٥١/١٨)
[7] فتح البيان (٢٧٢/١٤ـ ٢٧٦)

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ
وَهُوَ مَكْظُومٌ ﴿٤٨﴾ لَوْلَا أَنْ تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِنْ رَبِّهِ لَنُبِذَ
بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ ﴿٤٩﴾ فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿٥٠﴾
وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا
الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ﴿٥١﴾ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ﴿٥٢﴾

چنانچہ آپ اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کریں اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہوں، جب اس نے (اللہ کو) پکارا تھا، جبکہ وہ غم سے بھرا ہوا تھا (48) اگر اس کے رب کا احسان اسے نہ سنبھالتا تو وہ چٹیل میدان میں پھینکا جاتا، جبکہ وہ مذموم ہوتا (49) پھر اس کے رب نے اسے نوازا اور اس کو صالحین میں شامل کیا (50) اور بلاشبہہ قریب ہے کہ کافر (لوگ) اپنی (بری) نظروں سے آپ کو پھسلا دیں گے، جب وہ یہ ذکر (قرآن) سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بے شک وہ تو یقیناً دیوانہ ہے (51) اور یہ (قرآن) تو سب جہانوں کے لیے نصیحت ہے (52)

موضح قرآن میں فرمایا ہے یعنی اللہ کا حکم دیکھے تو بد دعا کر اور یونس علیہ السلام کی طرح دیر سے جھنجھلا کر نہ کر۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی یہ کہے کہ میں یونس علیہ السلام سے بہتر ہوں وہ جھوٹا ہے۔ کفار نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھور گھور کر دیکھتے کہ ڈر کر چھوڑ دے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد! تم اپنی قوم کی ایذا دہی پر اور ان کے تمھیں جھٹلانے پر صبر کرو، اللہ تعالیٰ جلد ان پر حکم کرے گا یعنی فیصلہ کرے گا اور تمھارا انجام بخیر ہوگا دنیا اور آخرت میں، اسی طرح تمھارے متبعین کا انجام ہوگا، تم ذوالنون کی طرح نہ ہو۔ ان کا نام یونس بن متی علیہ السلام تھا، یہ اپنی قوم پر خفا ہو کر چل دیے۔

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کرنے اور یونس علیہ السلام کی طرح نہ ہونے کا حکم:

ان کا قصہ کتاب اللہ میں آیا ہے کہ دریا پر سوار ہوئے، مچھلی نے ان کو لقمہ بنا لیا اور دریا کے اندھیروں کے اندر لے گئی، انھوں نے وہاں پر اللہ کے لیے دریا کا تسبیح کرنا سنا تو ان ظلمات میں پکار اٹھے: ﴿ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ ﴾ [الأنبياء: ٨٧] ”الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے، بے شک میں ظالموں میں ہو گیا۔“ اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْغَمِّ ۚ وَكَذَٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِينَ ﴾ [الأنبياء: ٨٨] ”تو ہم نے اس کی پکار سن لی اور اسے غم سے نجات دے دی اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح بچا لیا کرتے ہیں۔“ نیز فرمایا: ﴿ فَلَوْلَا أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ ﴿١٤٣﴾ لَلَبِثَ فِي بَطْنِهِ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴾ [الصّٰفّٰت: ١٤٣- ١٤٤]

"پس اگر یہ پاکی بیان کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک اس کے پیٹ میں ہی رہتے۔" معلوم ہوا کہ تسبیح دنیا اور آخرت کے ظلمات اور تکالیف سے نجات بخش ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو خطا کا اعتراف کرنے پر بڑا رحم آتا ہے۔ "يَا رَبِّ عَبْدُكَ هَذَا يَبُوْءُ لَكَ بِإِثْمِهِ فَاغْفِرْ لَهُ فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ"

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَكْظُوْمٌ ﴾ اس جگہ بہ معنی مغموم ہے۔ اور امام عطاء خراسانی اور ابو مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی مکروب، یعنی تکلیف دیا گیا ہے۔[1] حدیث میں آیا ہے کہ جب یونس علیہ السلام نے ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ۸۷] کہا: یہ کلمہ ان کی زبان اور دل سے نکل کر عرش کے گرد نالاں ہوا۔ ملائکہ نے کہا کہ یہ ایک معروف کمزور سی آواز ہے جو بلادِ غریبہ کی ہے، یعنی دور سے آ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم اس کو نہیں پہچانتے؟ کہا: نہیں! فرمایا: یہ یونس ہے۔ کہا: اے رب! یہ تیرا بندہ وہ ہے جس کا عملِ صالح ہمیشہ آتا تھا اور اس کی دعا قبول ہوتی تھی؟ فرمایا: ہاں! کہا: "أَفَلَا تَرْحَمُ مَا كَانَ يَعْمَلُهُ فِي الرَّخَاءِ فَتُنَجِّيَهُ مِنَ الْبَلَاءِ" یعنی تو اس کے عمل رخا (فراخی کے وقت کے عمل) پر رحم فرما کر اس کو اس بلا سے نجات دے۔ اللہ نے مچھلی کو حکم دیا اس نے ان کو ایک چٹیل میدان میں اُگل دیا۔[2] لہٰذا اللہ نے فرمایا کہ ہم نے اس کو قبول کر کے من جملہ صالحین کے کر دیا۔ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: یہ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس طرح کہے کہ میں یونس بن متی علیہ السلام سے بہتر ہوں۔[3] (رواه أحمد و رواه البخاري من حديث أبي هريرة رضي الله عنه)

نظر کا لگ جانا برحق ہے:

پھسلا دینے سے مراد حسد کرنا ہے بغض کے سبب سے۔ اگر اللہ کی وقایت اور حمایت نہ ہوتی، یعنی اگر اللہ نہ بچاتا اور حمایت نہ کرتا۔ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ نظرِ بد لگ جاتی ہے اور اللہ کے حکم سے اس کا اثر ہونا بھی برحق ہے۔ یہ بات بہت سی حدیثوں میں بھی آئی ہے جو طرقِ کثیرہ و متعددہ سے روایت کی گئی ہیں۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا رُقْيَةَ إِلَّا مِنْ عَيْنٍ أَوْ حُمَةٍ أَوْ دَمٍ»[4] "دم صرف نظر لگنے یا بخار یا نکسیر پھوٹنے سے کیا جاتا ہے۔" (رواه أبو داود وابن ماجه ومسلم والترمذي والبخاري) سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «إِنَّ الْعَيْنَ لَتُوْلِعُ الرَّجُلَ بِإِذْنِ اللّٰهِ فَيَتَصَاعَدُ حَالِقًا ثُمَّ يَتَرَدَّى مِنْهُ»[5] "یقیناً نظر انسان کو اللہ کے حکم سے دیوانہ کر دیتی ہے۔ بسا اوقات انسان بلندی پر چڑھتا اور ترقی کرتا ہے (اور) پھر وہ (نظرِ بد کی وجہ سے) اس سے گر جاتا

---

[1] تفسير الطبري (۲۳/۵٦۲، ۵٦۳) تفسير ابن كثير (٤/۵۲٤)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (۸/٦٤٦٤) اس کی سند میں "یزید رقاشی" ضعیف راوی ہے۔ [3] صحيح البخاري (۳۲۳۱، ۳۲۳٤)

[4] صحيح البخاري (۵۳۷۸) صحيح مسلم (۲۲۰) سنن أبي داود (۳۸۸۹) سنن ابن ماجه (۳۵۱۳)

[5] مسند أحمد (۵/۱٤٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۸۸۹)

ہے۔'' (أخرجه أبو يعلىٰ وإسناده غريب ولم يخرجوه) حابس تیمی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے: «لَا شَيْءَ فِي الْهَامِ، وَالْعَيْنُ حَقٌّ، وَأَصْدَقُ الطِّيَرَةِ الْفَالُ»[1] ''ہام کی کوئی حقیقت نہیں اور نظر لگنا برحق ہے اور نیک فال سب سے اچھا شگون ہے۔'' (رواه أحمد والترمذي واستغربه) یہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی انہی الفاظ سے آئی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: «اَلْعَيْنُ حَقٌّ تَسْتَنْزِلُ الْحَالِقَ»[2] ''نظر کا لگنا برحق ہے یہ سربلندی کو تنزلی سے بدل دیتی ہے۔'' (رواه أحمد وهو غريب) ان کی دوسری روایت رفعاً یہ ہے: «اَلْعَيْنُ حَقٌّ، وَلَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابَقَ الْقَدَرَ سَبَقَتِ الْعَيْنُ وَإِذَا اسْتُغْسِلْتُمْ فَاغْسِلُوْا»[3] ''نظر لگنا برحق ہے، اگر کوئی چیز تقدیر پر سبقت لے جا سکتی ہوتی تو نظر سبقت لے جاتی اور جب تم سے غسل کرنے کا مطالبہ کیا جائے تو غسل کر دیا کرو۔'' (انفرد به مسلم دون البخاري) ان کی تیسری روایت یہ ہے کہ سیدنا حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو یہ تعویذ کرتے تھے: «أُعِيذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ وَّعَيْنٍ لَّامَّةٍ» ''میں تم دونوں کو اللہ تعالیٰ کے کلماتِ تام کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان، زہریلے جانور سے اور ہر لگنے والی نظرِ بد (کے شر) سے۔'' اور فرماتے: اسی طرح ابراہیم علیہ السلام، اسحاق اور اسماعیل علیہما السلام کے لیے عوذہ کرتے تھے۔[4] (أخرجه البخاري و أهل السنن)

سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کا نظرِ بد سے اغتسال کا قصہ سنن ابن ماجہ میں آیا ہے۔[5] (رواه النسائي أيضا) سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنوں اور انسانوں کی نظرِ بد سے عوذہ کرتے (پناہ مانگتے) تھے۔ جب معوذتین اتریں تو ان کو لے لیا اور ما سوا کو چھوڑ دیا۔[6] (رواه ابن ماجه والترمذي وحسنه) ان کی تیسری روایت یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام آئے اور کہا: اے محمد! کیا تم بیمار ہو؟ کہا: ہاں! کہا: «بِسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُّؤْذِيْكَ وَشَرِّ كُلِّ نَفْسٍ وَّعَيْنٍ، اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ، بِسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيْكَ»[7] ''اللہ کے نام کے ساتھ میں تجھے دم کرتا ہوں ہر اس چیز سے جو تجھے تکلیف دے اور ہر انسان اور ہر آنکھ کے شر سے، اللہ تجھے شفا دے، اللہ کے نام کے ساتھ میں تجھے دم کرتا ہوں۔'' (رواه أحمد ورواه مسلم وأهل السنن إلا أبا داود) اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا: اے اللہ کے رسول! بنی جعفر کو نظر لگ جاتی ہے، کیا میں ان کے لیے رقیہ کراؤں؟ فرمایا: ہاں، اگر کوئی شے تقدیر پر سبقت کرتی تو یہی نظر کرتی۔[8] (رواه أحمد والترمذي وصححه وابن ماجه والنسائي)

---

(1) مسند أحمد (٧٠/٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٦١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٩٤٩)

(2) مسند أحمد (٢٧٤/١) السلسلة الصحيحة (١٢٥٠) (3) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٨٨)

(4) صحيح البخاري (٣١٩١) سنن أبي داود (٤٧٣٧) سنن الترمذي (٢٠٦٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٥٠/٦) سنن ابن ماجه (٣٥٢٥)

(5) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٠٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٣٨١/٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٠٢٠)

(6) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٥٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥١١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٩٠٢)

(7) صحيح مسلم (٢١٨٦) مسند أحمد (٢٨/٣) سنن الترمذي (٩٧٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٢٤٩/٦) سنن ابن ماجه (٣٥٢٣)

(8) مسند أحمد (٤٣٨/٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٥٩) سنن ابن ماجه (٣٥١٠) صحيح الجامع (٥٢٧٦)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا تھا کہ نظر کا دم کرائیں۔[1] (رواہ ابن ماجہ و رواہ الشیخان أیضًا) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت رفعاً یہ ہے: «اِسْتَعِيْذُوْا بِاللّٰهِ فَإِنَّ النَّفْسَ حَقٌّ»[2] ''اللہ تعالیٰ کی پناہ پکڑو و بلاشبہہ نظر کا لگنا برحق ہے۔'' رواہ ابن ماجہ) سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا: «أَكْثَرُ مَنْ يَّمُوْتُ مِنْ أُمَّتِيْ بَعْدَ كِتَابِ اللّٰهِ وَقَضَائِهِ وَقَدَرِهِ بِالْأَنْفُسِ»[3] (رواہ البزار) یعنی اس امت کے اکثر لوگ قضا و قدر کے بعد اسی نظر بد سے مرتے ہیں۔ ان کی دوسری روایت رفعاً یہ ہے: «اَلْعَيْنُ حَقٌّ لَتُوْرِدُ الرَّجُلَ الْقَبْرَ وَالْجَمَلَ الْقِدْرَ، وَإِنَّ أَكْثَرَ هَلَاكِ أُمَّتِيْ فِي الْعَيْنِ»[4] ''نظر کا لگنا برحق ہے، یہ آدمی کو قبر میں اور اونٹ کو ہنڈیا میں پہنچا دیتی ہے۔ میری امت کی اکثر ہلاکتیں اسی نظر کی وجہ سے ہوتی ہیں۔'' تیسری روایت یہ ہے: «قَدْ تُدْخِلُ الرَّجُلَ الْعَيْنُ فِي الْقَبْرِ وَتُدْخِلُ الْجَمَلَ الْقِدْرَ»[5] ''نظرِ بد انسان کو قبر میں اور اونٹ کو ہنڈیا میں اتار دیتی ہے۔'' (ورواہ محمد بن منذر الهروي وهذا إسناد رجاله كلهم ثقات ولم يخرجوه) سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت یہ ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا عَدْوٰى وَلَا طِيَرَةَ وَلَا هَامَةَ وَلَا حَسَدَ وَالْعَيْنُ حَقٌّ»[6] ''کسی سے خود بخود مرض کا چمٹ جانا، بدفالی اور مقتول کی کھوپڑی سے الو کے نکلنے کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ نیز حسد نہ کرو، البتہ نظر کا لگنا برحق ہے۔'' (تفرد به أحمد)

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام آئے اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مغتم (مغموم) پایا، کہا: یہ کیا غم ہے جو میں تیرے چہرے پر دیکھتا ہوں؟ فرمایا: حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو نظرِ بد لگ گئی ہے۔ کہا: عین کی تصدیق کرو، عین حق ہے، تم نے ان کو ان کلمات سے عوذہ نہ کر دیا؟ کہا: وہ کیا کلمات ہیں؟ کہا: کہہ «اَللّٰهُمَّ ذَا السُّلْطَانِ الْعَظِيْمِ ذَا الْمَنِّ الْقَدِيْمِ ذَا الْوَجْهِ الْكَرِيْمِ وَلِيَّ الْكَلِمَاتِ التَّامَّاتِ وَالدَّعْوَاتِ الْمُسْتَجَابَاتِ عَافِ الْحَسَنَ وَالْحُسَيْنَ مِنْ أَنْفُسِ الْجِنِّ وَأَعْيُنِ الْإِنْسِ» ''اے اللہ! عظیم سلطان! قدیم سے احسان کرنے والے! باعزت چہرے والے! کلماتِ تامہ کے مالک! اور دعاؤں کے قبول کرنے والے! حسن و حسین کو جنوں اور انسانوں کی نظرِ بد سے عافیت و شفا عطا فرما!'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کلمات کہے تو وہ اٹھ کر آپ کے سامنے کھیلنے لگے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «عُوْذُوْا أَنْفُسَكُمْ وَنِسَاءَكُمْ وَأَوْلَادَكُمْ بِهٰذَا التَّعْوِيْذِ فَإِنَّهُ لَنْ يَتَعَوَّذَ الْمُتَعَوِّذُوْنَ بِمِثْلِهِ»[7] ''اپنے آپ

---

[1] صحيح البخاري (٥٤٠٦) صحيح مسلم (٢١٩٥) سنن ابن ماجه (٣٥١٢) [2] سنن ابن ماجه (٣٥٠٨) صحيح الجامع (٩٣٨)

[3] كشف الأستار عن زوائد البزار (٤٠٣/٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٧٤٧)

[4] الكامل لابن عدي (١٨٥/٥) اس کی سند میں ''علی بن ابی علی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[5] الكامل لابن عدي (٤٠٨،٤٠٧/٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٢٤٩)

[6] مسند أحمد (٢٢٢/٢) اس کی سند میں ''رشدین بن سعد'' ضعیف راوی ہے، البتہ اس روایت میں "ولا حسد" کے الفاظ کے علاوہ باقی الفاظ صحیحین اور دیگر کئی جگہوں پر مروی ہیں۔

[7] تاریخ دمشق (٤٦١،٤٦٠/٢٤) تفسیر ابن کثیر (٥٢٨-٥٢٤/٤) اس کی سند میں ''حارث اعور'' ضعیف راوی ہے۔

کو، اپنی عورتوں کو اور اپنے بچوں کو ان کلمات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دیا کرو، پناہ پکڑنے والوں کے لیے ان سے بہتر کلمات نہیں ہیں۔" (رواه الحافظ ابن عساكر) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس جگہ چشم زخم کے متعلق اور احادیث بھی لکھی ہیں، یہاں ان کو ملخص کر کے لکھا گیا ہے، ان احادیث سے ارقا و استرقاء دونوں قولاً وفعلاً ثابت ہیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ رقیہ کچھ توکل کے برخلاف نہیں ہے، بلکہ اس کے کرنے کا حکم ہے اور اس مسئلے میں قولِ فیصل یہی ہے کہ جس رُقیہ میں کوئی ایسا لفظ نہ ہو جس میں شرک وکفر کا اظہار یا وہم ہوتا ہو اور وہ رقیہ عربی زبان میں ہو اس کے استعمال کرنے کا جواز احادیث سے ثابت ہے، اجمالاً بھی اور تفصیلاً بھی۔ اور جو رُقیہ ایسا ہے کہ خود قرآن وحدیث سے ثابت ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، جیسے: معوذتین و رقیۂ عین اور اسی طرح کے اور رقی۔ اور وہ رقی جو علماء ومشائخ نے لکھے ہیں، اگر ان میں کتاب وسنت کے اصل مقصود کی کوئی مخالفت نہ ہو تو وہ بھی جائز العمل ہیں۔ اس بارے میں رسالہ "الداء والدواء" انتہائی نفع دینے والا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ تو اپنے رب کے حکم پر صبر کر جو اس کے علمِ سابق میں مقدر ہو چکا ہے۔ اس جگہ حکم سے مراد کفار کو مہلت دینا اور رسول اللہ ﷺ کی نصرت میں تاخیر ہے، یا تبلیغ رسالت میں دیر لگنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت آیتِ سیف سے منسوخ ہے۔ پھر فرمایا کہ تو غضب وضجر (بے چینی و بے قراری) وعجلت میں یونس علیہ السلام کی طرح نہ ہو جا کہ ان کی طرح تو بھی کبھی آزمائش میں مبتلا ہو۔ ﴿ مَكْظُوْمٌ ﴾ سے مراد غیظ اور تکلیف سے پر ہونا ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ غم دل میں ہوتا ہے اور کرب، یعنی تکلیف جسم میں اور انفاس میں ہوتا ہے۔[1] یونس علیہ السلام کا قصہ سورۃ الانبیاء، سورۃ الصافات اور سورت یونس میں گزر چکا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ مَكْظُوْمٌ ﴾ سے مراد محبوس ہے، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

﴿ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ﴾ سے مراد توبہ کی توفیق ہے۔ اللہ پاک نے ان کی توبہ قبول کی۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نعمت نبوت تھی۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: عبادتِ سالفہ تھی۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: ندائے ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴾ تھی۔ ابن بحر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مچھلی کے پیٹ سے نکالنا تھا۔[2] کسی نے کہا ہے کہ مراد رحمت ہے۔ "عراء" اس روئے زمین کو کہتے ہیں جو گھاس، درخت اور پہاڑ سے خالی ہو۔ ﴿ مَذْمُوْمٌ ﴾ سے مراد "مَلُوْمٌ" ہے، جس کو گناہ پر ملامت کریں، یا وہ شخص جو ہر خیر سے دور ہو، یا مذنب، معاتب یا معاقب کے معنی میں ہے۔

---

[1] النكت والعيون للماوردي (٧٣/٦) [2] تفسير القرطبي (٢٥٤/١٨)

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گناہ کرنے پر مذموم ہے اور یہ واقعہ نبوت سے پہلے تھا، اس آیت کے سیاق کی دلیل سے: ﴿ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾[1] یہ مفسرین کا ایک قول ہے کہ وہ اس وقت نبی نہ تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیغمبر بنایا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ پہلے ہی سے نبی تھے اور "اِجْتِبَاء" کے یہ معنی ہیں کہ وحی ان سے منقطع ہوگئی تھی، وہ پھر آنے لگی، اللہ نے ان کو صالحین میں کر لیا، یعنی کاملین فی الصلاح میں اور گناہ سے بچایا اور نبوت کو پھیر دیا اور وہ دوبارہ اپنے نفس اور اپنی قوم میں نبی ہوئے اور ان کی توبہ قبول کی اور اس صبر کے سبب سے ایک لاکھ لوگوں کی طرف بھیجے گئے، یا اور زیادہ لوگوں کی طرف۔ "اِزْلَاقٌ وَزَلَقٌ" سے مراد ہلاکت، اصراف اور فتنہ ہے، یعنی ایسی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ لگتا ہے کہ تجھے پچھاڑ دیں اور تیری جگہ سے تجھ کو گرا دیں یا مراد نظرِ بد لگانا ہے۔ قریش کی ایک قوم جو تجربہ کار تھی، اس نے نظر لگائی، لیکن اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو ان کی چشم زخم سے بچا لیا اور نظر کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اس پر یہ آیت اتری۔

امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنی اسد نظر لگاتے تھے۔ اس میں عین کے حق ہونے کی دلیل ہے۔ اسی طرح سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے: «اَلْعَيْنُ حَقٌّ»[2] یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ جمہور علماء نے ظاہر حدیث کو لیا ہے اور نظرِ بد کا لگ جانا حق بتایا ہے۔ اہلِ بدعت کا ایک گروہ اس کی حقیقت کا منکر ہے۔ وہ گروہ کسی شمار میں نہیں ہے، جبکہ صحیح احادیث میں اس کا ثبوت آ چکا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "رُقْيَةُ الْعَيْنِ هٰذِهِ الْاٰيَةُ"[3] یعنی یہ آیت نظرِ بد کا دم ہے، اس کو پڑھ کر دم کرے تو چشمِ زخم کا اثر جاتا رہے گا۔

وإن یکاد بخوانید و در فراز کنید

"﴿ وَاِنْ يَّكَادُ ﴾ (سورۃ القلم کی آیت نمبر ۵۱) پڑھیے اور دروازہ کھول دیجیے۔"

اس جگہ ذکر سے مراد قرآن ہے۔ وہ قرآن کا سننا سخت مکروہ رکھتے تھے اور نبی کریم ﷺ کو دیوانہ کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر رد کیا اور فرمایا کہ یہ قرآن تذکرۂ عالمین ہے، اس کو پڑھنے والا سب لوگوں سے زیادہ عقل رکھتا ہے اور متین الرائے ہے، جیسا کہ اللہ سبحانہ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ﴾ [الزخرف: ٤٤] "اور یقیناً یہ (خود) آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے نصیحت ہے۔" یا ضمیر نبیِ مکرم ﷺ کی طرف پھرتی ہے کہ آپ ﷺ خود ایک یادگار ہیں سارے جہان کے لیے اور اُن کے لیے اشرف ہیں۔

---

[1] تفسير الرازي (٣٠/٨٧) [2] صحيح البخاري (٥٤٠٨) صحيح مسلم (٢١٨٧) [3] تفسير النسفي (٤/٢٧٣)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَةُ الْحَاۗقَّةِ

اس سورت کی اکاون (۵۱) یا باون (۵۲) آیتیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق مکے میں اتری۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم بھی اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو نمازِ فجر یا اس جیسی نمازوں میں پڑھا کرتے تھے۔[2] (رواه الطبراني)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَاۗقَّةُ ۝۱ مَا الْحَاۗقَّةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاۗقَّةُ ۝۳ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ
بِالْقَارِعَةِ ۝۴ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝۵ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا
بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝۶ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ
حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝۷
فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝۸ وَجَاۗءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ
وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۝۹ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝۱۰
اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاۗءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝۱۱ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً
وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝۱۲

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

ثابت ہونے والی ① کیا ہے ثابت ہونے والی؟② اور آپ کو کس نے خبر دی کیا ہے ثابت ہونے والی؟③ ثمود اور عاد نے اس تہلکہ خیز (قیامت) کو جھٹلایا④ تو جو ثمود تھے وہ انتہائی اونچی خوفناک آواز سے ہلاک کیے گئے⑤ اور جو عاد تھے تو یخ تند و تیز بے قابو آندھی سے ہلاک ہوئے⑥ اللہ نے اسے ان پر سات راتیں اور آٹھ دن جڑ کاٹنے (فنا کرنے) کے لیے

---

① تفسير القرطبي (٢٥٦/١٨- ط: دار الكتب المصرية، القاهرة) ② الدر المنثور (٢٦٣/٨)

مسلط رکھا، پھر آپ اس قوم کو پچھاڑے (ہلاک کیے) ہوئے دیکھتے ہو، گویا وہ کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں ⑦ پھر کیا آپ ان کی کوئی باقیات دیکھتے ہیں؟ ⑧ اور فرعون جو اس سے پہلے تھے اور الٹائی گئی بستیوں والے گناہ کرتے تھے ⑨ پھر انھوں نے اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی تو اس (رب) نے انھیں نہایت سخت گرفت میں لے لیا ⑩ بے شک جب پانی میں طغیانی آئی تو ہم نے تمھیں بہتی ناؤ میں سوار کیا ⑪ تاکہ ہم تمھارے لیے اس (فعل) کو نصیحت بنا دیں اور (تاکہ) یاد رکھنے والے کان اسے یاد رکھیں ⑫

امرِ عظیم قیامت اور سابقہ امتوں کی ہلاکت کا ذکر:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حاقۃ قیامت کا نام ہے، کیوں کہ اس میں وعدے اور وعید پورے ہوں گے۔ لہٰذا اللہ نے اس کو ایک امرِ عظیم ٹھہرایا ہے اور کہا ہے کہ ﴿ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے جھٹلانے والی اُمتوں کے ہلاک کرنے کا ذکر کیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طاغیہ سے مراد صیحہ ہے، یعنی ایک ایسی چنگھاڑ ہوئی جس نے ان کو بے حس و حرکت کر دیا۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ''طاغية'' سے مراد زلزلہ ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''طاغية'' ذنوب ہیں۔ امام ربیع اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد طغیان ہے۔ ﴿ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ﴾ [الشمس: ١١] ''(قومِ) ثمود نے اپنی سرکشی کے باعث جھٹلایا۔'' امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ عقرِ ناقہ سے عبارت ہے۔ ''ریح صرصر'' سے مراد ٹھنڈی ہوا ہے۔ امام قتادہ، سدی، ربیع اور ثوری رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ تیز ہوا مراد ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس ہوا نے ان کے دل اکھاڑ دیے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ہوا اُن پر بے رحمت و برکت ہو کر چلی اور بے حساب چلی۔ سات رات اور آٹھ دن تک مسلسل ان پر مسلط رہی۔ ''حسوم'' سے مراد یہ ہے کہ پوری ہوا لگاتار چلی۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام مجاہد، عکرمہ اور ثوری رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔

امام عکرمہ اور ربیع رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ وہ ان پر شوم تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ ﴾ [حم السجدة: ١٦] ''منحوس دنوں میں۔'' امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جمعہ سے[1] اور کسی نے کہا ہے کہ بدھ سے شروع ہوئی، اسی کو لوگ اعجاز کہتے ہیں، گویا یہ نام اس آیت سے لیا گیا ہے: ﴿ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ﴾ یا اس لیے کہ وہ عجز شتاء میں ہوتی ہے، یعنی آخر موسمِ سرما میں اور ان دنوں کو ایام عجوز کہتے ہیں، کیوں کہ قومِ عاد کی ایک عجوز، یعنی بڑھیا ایک تہ خانہ میں جا گھسی تھی، ہوا نے اس کو آٹھویں دن قتل کیا۔[2] (حكاه البغوي) والله أعلم. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''خاوية'' بہ معنی ''خربة'' ہے، یعنی ویرانہ۔[3] کسی نے کہا: یعنی پرانا ہوا۔ ایک

① تفسیر الطبري (٢٣/٥٧١-٥٧٣) تفسیر ابن کثیر (٤/٥٢٩) ② تفسیر البغوي (٨/٢٠٨) ③ الدر المنثور (٨/٢٦٦)

ایک کو اٹھا کر زمین پر دے مارتے، وہ مردہ ہو کر سر کے بل گر پڑتا اور کھوپڑی پھٹ جاتی اور جسم کھجور کے تنے کی طرح بغیر ٹہنیوں پڑا رہ جاتا۔

صحیحین میں مرفوعاً مروی ہے: «نُصِرْتُ بِالصَّبَا وَأُهْلِكَتْ عَادٌ بِالدَّبُوْرِ»[1] ''بادِ صبا (مشرق سے چلنے والی ہوا) سے میری مدد کی گئی ہے اور بادِ دبور (مغرب سے چلنے والی ہوا) سے قومِ عاد کو ہلاک کیا گیا۔'' سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ نے عاد پر، جس ہوا سے وہ ہلاک ہوئے، صرف انگوٹھی کے برابر کھولا تھا، اس کا گزر بستی والوں پر ہوا۔ اس نے ان کو اور ان کے مویشیوں اور اموال کو زمین اور آسمان کے درمیان اٹھا لیا۔ شہر والوں نے جب اس ہوا کو دور سے دیکھا تو کہا کہ ﴿ هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ﴾ [الأحقاف: ٢٤] ''یہ ابر ہم پر برسنے والا ہے۔'' یعنی یہ ایک بادل ہے پانی دے گا۔ ہوا نے بستی والوں کو ان کے مویشیوں سمیت شہر والوں پر گرا دیا۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ہوا کے دو پر اور ایک دم ہے۔[3] اللہ نے کہا: بھلا تو دیکھتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی باقی رہا بلکہ جو لوگ ان کی طرف منسوب تھے، وہ بھی از اول تا آخر فنا ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے کوئی خلف نہ رکھا۔

پھر فرعون اور کفارِ قبط کا ذکر کیا اور الٹی بستیوں کی یاد دلائی۔ ان امتوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تھی۔ ربیع نے کہا ''خاطئة'' سے مراد معصیت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد خطایا ہیں۔[4] لہٰذا یہ فرمایا کہ انھوں نے اپنے رسولوں کی نافرمانی کی، یہ ایک جنس ہے، یعنی ہر اُمت نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا۔ سب نے تو یہ کام کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [الشعراء: ١٠٥] ''قومِ نوح نے بھی نبیوں کو جھٹلایا۔'' ﴿ كَذَّبَتْ عَادُ ۨ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [الشعراء: ١٢٣] ''عادیوں نے بھی رسولوں کو جھٹلایا۔'' ﴿ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ﴾ [الشعراء: ١٤١] ''ثمودیوں نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا۔'' حالاں کہ ہر امت کی طرف ایک ہی رسول آیا تھا، لہٰذا اس جگہ یوں کہا: ﴿ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ ﴾

﴿ رَّابِيَةً ﴾ سے مراد سخت، بڑی اور دردناک پکڑ ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا یعنی مہلک طغیان سے مراد پانی کی حد سے زیادتی ہے اللہ کے حکم سے اور موجود مقدار پر اونچا ہو جانا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ پانی کی کثرت مراد ہے۔[5] یہ طغیانی نوح علیہ السلام کی اپنی قوم پر بد دعا کے سبب سے آئی تھی، جبکہ قوم نے ان کی تکذیب اور مخالفت کر کے غیر اللہ کی عبادت اختیار کر لی تھی۔ تب اللہ نے نوح علیہ السلام کی دعا سن لی اور ساری زمین میں طوفان آ گیا، کوئی فردِ بشر باقی نہ بچا، سوائے ان کے جو ان کے ساتھی کشتی میں تھے۔ اب ساری دنیا کے آدمی نوح علیہ السلام کے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٨٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٠٠)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٦٩) اس کی سند میں ''مسلم ملائی'' ضعیف راوی ہے۔
[3] الدر المنثور (٣٩٧/٨) [4] تفسير الطبري (٥٧٦/٢٣) [5] تفسير الطبري (٥٧٧/٢٣)

سلالہ اور اولاد سے ہیں۔ سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہر قطرۂ آب فرشتے کے ہاتھ سے ایک پیمانے اور اندازے کے مطابق اترتا تھا۔

کشتی، اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت:

جب نوح علیہ السلام کا دن آیا تو براہِ راست پانی کو اترنے کا حکم ہوا نہ کہ اس کے خازنوں کو۔ وہ پانی خزان (خازنوں) پر بھی بڑھ گیا، یہی مراد ہے پانی کی طغیانی سے۔ اسی طرح کبھی ہوا نہیں چلی مگر فرشتے کے ہاتھ پر ایک اندازے سے۔ جب عاد کا دن آیا تو براہِ راست ہوا کو حکم ہو گیا۔ خزان دھرے رہے ہوا نکل پڑی۔ یہی مراد ہے ﴿ عَاتِيَةٍ ﴾ سے کہ اس نے اپنے خزانچیوں پر سرکشی کی۔[1] لہٰذا اللہ نے لوگوں پر احسان رکھا کہ ہم نے طغیانی کے وقت تم کو پانی کی سطح پر کشتی میں لادلیا، تاکہ یہ بات تمھارے لیے ایک یادگار رہے یعنی جنس کشتی کو باقی رکھا کہ اس پر تم دریا پر سوار ہوتے ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ ۝ لِتَسْتَوُا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ ﴾ [الزخرف: ۱۲۔ ۱۳] ”اور تمھارے لیے کشتیاں بنائیں اور چوپائے جانور (پیدا کیے) جن پر تم سوار ہوتے ہو تاکہ تم ان کی پیٹھ پر جم کر سوار ہوا کرو، پھر اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو جب اس پر ٹھیک ٹھاک بیٹھ جاؤ۔“

نیز فرمایا: ﴿ وَآيَةٌ لَّهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ۝ وَخَلَقْنَا لَهُم مِّن مِّثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ ﴾ [یٰسٓ: ۴۱۔ ۴۲] ”اور ان کے لیے ایک نشانی (یہ بھی) ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا اور ان کے لیے اسی جیسی اور چیزیں پیدا کیں جن پر یہ سوار ہوتے ہیں۔“ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے سفینۂ نوح کو یہاں تک باقی رکھا کہ اس امت کے اوائل نے اس کو پایا۔[2] لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے اور ظاہر ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ اس نعمت کو یاد رکھنے والے کان یاد رکھیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ وَاعِيَةٌ ﴾ سے مراد حافظہ سامعہ ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ﴿ وَاعِيَةٌ ﴾ وہ کان ہے جس نے اللہ کی بات اس کی کتاب میں سن کر سمجھ بوجھ لی۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: اس کے کانوں نے سنا اور اس کو یاد کر لیا۔[3] یعنی وہ شخص ہے جو سمع صحیح و عقلِ رجیح رکھتا ہے اور یہ ہر سمجھنے والے یاد رکھنے والے کے بارے میں عام ہے۔ امام مکحول رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَاعِيَةٌ ﴾ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ علی کا کان ایسا ہی کر دے۔ تب سے علی رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ میں نے کوئی شے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر پھر کبھی فراموش نہیں کی۔[4] (رواه ابن أبي حاتم وابن جرير وهو حديث مرسل) سیدنا بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ

---

[1] تفسیر الطبري (۵۷۲/۲۳) [2] تفسیر الصنعاني (۲۵۸/۳) [3] تفسیر الطبري (۵۸۹/۳۲)

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳۶۹/۱۰) تفسیر الطبري (۵۷۹/۲۳) یہ روایت مرسل ہے۔

کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کہا: «إِنِّي أُمِرْتُ أَنْ أُدْنِيَكَ وَلَا أُقْصِيَكَ وَأَنْ أُعَلِّمَكَ وَأَنْ تَعِيَ وَحَقٌّ لَكَ أَنْ تَعِيَ »[1] اس پر یہ آیت اتری۔ (رواه ابن أبي حاتم و ابن جرير) یعنی مجھ کو حکم ہوا ہے کہ میں تجھ کو نزدیک کروں اور دور نہ رکھوں اور تجھ کو سکھاؤں اور تو یاد کرے اور تجھے یہی چاہیے کہ تو یاد رکھے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿ اَلْحَآقَّةُ ﴾ قیامت ہے، اس لیے کہ اس میں امر کا تحقق ہوگا، یعنی امر ثابت ہوگا اور خود وہ بھی ثابت ہوگی بغیر کسی شک و شبہہ کے۔[3] (قاله الطبري) امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمام مفسرین کے قول کے مطابق یہ قیامت ہے اور یہ سچی ہے اور اس لائق ہے کہ سچی سمجھی جائے اور قیامت کے سارے احکام سچے ہیں اور واجب الوقوع والوجود ہیں۔ امام کسائی اور مورج رحمہما اللہ نے کہا ہے: ﴿ اَلْحَآقَّةُ ﴾ "يَوْمُ الْحَق"[4] ہے، یہ نام اس لیے ہوا کہ ہر انسان اس میں حقیق، یعنی اس کے لائق ہوگا کہ اپنے عمل کی جزا پائے۔ یا وہ دن ایک قوم کے لیے نار کو حق کرے گا اور ایک قوم کے لیے جنت کو لازمی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تجھ کو کس نے بتایا کہ وہ حاقہ ہے، یعنی تو جب تک اس کی ہولناکیوں کا مشاہدہ نہ کرے گا تو اس کو نہیں جان سکتا۔ گویا کہ وہ مخلوقین کے دائرۂ علم سے باہر ہے۔ کسی ایک کی درایت (عقل) وہاں تک نہیں پہنچ سکتی اور نبیِ مکرم ﷺ اگرچہ قیامت کو جاننے والے تھے لیکن اس کی حقیقت اور صفت کا انھیں علم نہ تھا۔

یحییٰ بن سلام رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں ﴿ وَمَآ اَدْرٰىكَ ﴾ آیا ہے اس چیز کو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو بتا اور سکھا دیا اور جس جگہ ﴿ وَمَا يُدْرِيْكَ ﴾ آیا ہے، اس کی خبر آپ ﷺ کو نہیں دی۔ امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: قرآن میں جس جگہ ﴿ وَمَآ اَدْرٰىكَ ﴾ کہا ہے، نبی اکرم ﷺ کو اس کی خبر دی گئی ہے اور جس جگہ ﴿ وَمَا يُدْرِيْكَ ﴾ فرمایا ہے اس کی خبر نہیں دی گئی۔[5] (ذكره الخطيب) قارعہ سے مراد قیامت ہے اس لیے کہ وہ دلوں کو اپنی ہولناکیوں کی شدت کے ساتھ ٹھونکتی ہے اور خوف و فزع (گھبراہٹ) دلانے کے لیے مؤثر ہوتی ہے۔

امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "قارعة" سے مراد قرآن ہے جو انبیاء علیہم السلام پر اترا اور پیغمبر اپنی امتوں کو اس سے ڈراتے تھے اور وہ پیغمبروں کو جھٹلاتے تھے[6] یا "قارعة" ماخوذ ہے "قرعه" سے، اس لیے کہ کچھ اقوام کو اٹھا کر بلند کرنے والی ہے اور کچھ اقوام کو حط کرنے والی، یعنی گرا دینے والی ہے۔ ثمود صالح علیہ السلام کی قوم تھی، ان کے گھر بار حجر میں تھے، حجاز و شام کے درمیان۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وادیِ قریٰ تھا۔[7] ان قصوں کے ذکر کرنے کا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۷۰،۳۳۶۹/۱۰) تفسير الطبري (۵۷۹/۲۳) اس کی سند میں "عبداللہ بن زبیر ابو محمد" ضعیف راوی ہے۔
[2] تفسير ابن كثير (۵۲۹_۵۳۱) [3] تفسير الطبري (۵۶۶/۲۳) [4] فتح القدير (۳۷۰/۵)
[5] تفسير القرطبي (۲۵۷/۱۸) [6] فتح القدير (۳۷۱/۵) [7] تفسير القرطبي (۲۵۸/۱۸)

مقصد اس امت کو معاصی میں ان کی اقتداء کرنے سے ڈرانا ہے، تاکہ کہیں ان پر وہ بلا نہ اترے جو ان پر نازل ہوئی۔

"طاغية" اس صیحہ (چیخ) کو کہتے ہیں جو حد سے تجاوز ہو۔ یہ جبریل علیہ السلام کا صیحہ تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ "طاغية" سے مراد "رجفة" یعنی زلزلہ ہے، یا وہ فرقہ جس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹی تھیں، کیوں کہ ان کی وجہ سے ثمود ہلاک ہوئے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا "طاغية"، عاقرِ ناقہ ہے، وہ ایک شخص تھا جس کے ساتھ متفق ہونے کی وجہ سے ساری قوم برباد ہوئی۔[1] رہے عاد، وہ ہود علیہ السلام کی قوم تھے ان کے منازل احقاف میں تھے۔ یہ یمن میں عمان اور حضر موت کے درمیان ایک ریگستان تھا۔ ان کے شہر قریش کے قریب تر تھے اور نزدیک کی چیز سے عبرت زیادہ حاصل ہوتی ہے اور ان کی ہلاکت صیحہ سے اشبہ ہے جو تیز ہوا کے ساتھ آئی۔ یہ لوگ بادِ دبور سے ہلاک ہوئے۔

﴿صَرْصَرٍ﴾ سخت آواز والی ہوا کو کہتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿صَرْصَرٍ﴾ گرم ہوا کو کہتے ہیں،[2] یعنی لُو۔ اس کو ﴿عَاتِيَةٍ﴾ فرمایا، کیونکہ وہ ہوا کے خازنوں کی طاعت سے باہر نکل گئی اور وہ اس کی شدتِ ہبوب (تیز چلنا) کے سبب سے روک نہ سکے۔ یا اس نے عاد پر سرکشی کی کہ وہ اس کو پھیر نہ سکے، بلکہ اسی نے ان کو ہلاک کر ڈالا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿عَاتِيَةٍ﴾ بہ معنی "غالبة" ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[3] یہ ہوا ان پر سات رات آٹھ دن مسلط رہی۔ اس میں اس شخص پر رد ہے جس نے یہ کہا کہ اس کا سبب ستاروں کا اتصال تھا۔ اللہ نے تسخیر کا ذکر فرما کر اس مذہب کا رد کر دیا اور بتا دیا کہ یہ اس کی قضا و قدر سے ہوا نہ کہ اتصالِ کواکب سے۔

"حسوم" کے معنی "شوم و نحس" ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ہوا اتوار کے دن سے شروع ہوئی اور کسی نے کہا: جمعہ سے۔ کسی نے کہا کہ چہار شنبہ (بدھ) کی صبح سے دوسرے چہار شنبہ تک، یہ مہینہ مکمل تھا۔ ﴿صَرْعَىٰ﴾ سے مراد پچھاڑے ہوئے ہیں۔ وہ ایسے ہو گئے جیسے کہ کھجور کے کھوکھلے تنے، یعنی کھجور کے ایسے تنے جن کا اوپر والا حصہ نہ ہو، گرے ہوئے، یا پرانے یا خالی اندر سے کھوکھلے۔ ہوا ان کے منہ سے داخل ہوتی اور جو کچھ اُن کے پیٹ میں ہوتا، اس کو پیٹھ کی راہ سے نکال دیتی۔ جب آٹھویں دن وہ مر گئے تو ہوا نے انھیں اٹھا کر دریا میں ڈال دیا۔ صالح اور ہود علیہما السلام کی قوموں کا قصہ قرآن پاک میں کئی جگہ آیا ہے۔ ہمارے شیخ الشیوخ امام ربانی قاضی محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ ہود علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، بدرِ طالع میں اس کی صراحت ہے۔

﴿مَنْ قَبْلَهُ﴾ سے مراد قرونِ خالیہ و اُممِ ماضیہ ہیں۔ ﴿الْمُؤْتَفِكَتُ﴾ سے مراد قومِ لوط علیہ السلام کی بستیاں ہیں۔ یہ پانچ گاؤں تھے صنعہ، صعرہ، عمر، دودما اور سندوم۔ سب سے بڑا قصبہ یہی سندوم تھا۔[4] (قاله القرطبي)۔ ﴿الْمُؤْتَفِكَتُ﴾

---

[1] تفسیر القرطبي (۱۸/۲۵۸)
[2] تفسیر القرطبي (۱۸/۲۵۹)
[3] تفسیر الطبري (۲۳/۵۷۲) الدر المنثور (۸/۲۶۵)
[4] تفسیر القرطبي (۱۸/۲۶۲)

کے معنی منقلبات (نقل کی گئی) ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے ان کو اکھیڑ کر اور اپنے پروں پر رکھ کر آسمان کے قریب لے جا کر الٹ مارا۔ "خاطئة" سے مراد شرک و معصیت ہے۔ رسول سے مراد ہر امت کا رسول ہے، یا موسیٰ یا لوط علیہما السلام اس لیے کہ قریب تھے۔ ﴿ رَّابِيَةً ﴾ کے معنی "نامية زائدة" ہیں، یعنی اور امتوں کی نسبت ان کو سخت پکڑا۔[1] (قاله الزجاج) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ﴿ رَّابِيَةً ﴾ کے معنی "شديدة" ہے۔[2] طغیان سے مراد یہ ہے کہ پانی دنیا کے سب سے بلند پہاڑ سے پندرہ گز اونچا ہو گیا۔ یہ نوح علیہ السلام کے زمانے کا واقعہ ہے۔ ان کی قوم نے کفر اور تکذیب پر اصرار کیا۔ یا مراد پانی کا خزانِ آب (پانی کے داروغہ فرشتوں) پر طغیان، یعنی ان کے قابو سے باہر ہو جانا ہے، وہ اس کو روک نہ سکے۔[3] (قاله علي رضی اللہ عنہ)۔

﴿ اَلْجَارِيَةِ ﴾ سے مراد کشتی ہے، یعنی ہم نے تم کو اپنے آباء کی پشتوں میں کشتی پر لاد لیا، مراد سفینہ نوح علیہ السلام ہے، اس لیے کہ وہ پانی پر جا رہی تھی۔ سب سے پہلے انھوں نے کشتی بنائی۔ جبریل علیہ السلام اس کاریگری کے معلم، یعنی سکھانے والے تھے۔ اس کو پرندے کے سینے کی شکل پر تیار کیا تھا تاکہ جو چیز پانی پر چلے وہ اس چیز کے مقارب (قریب، برابر) ہو جو ہوا پر چلے۔ ان قصوں کے ذکر کرنے کا مقصد ان کے عذاب یاد دلانا ہے، تاکہ یہ امت ان اُمتوں کی چال پر نہ چلے اور رسول کی نافرمانی نہ کرے اور عبرت اور نصیحت حاصل کرے اور اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت اور منفرد کاریگری پر استدلال کرے۔ یا یہ فعل کہ مومنین کو بچا دیا اور کفار کو غرق کر دیا، تمھارے لیے تذکرہ، یعنی نصیحت ہے، یا یہ سفینہ جس کو اس امت کے شروع کے لوگوں نے پایا ہے یادگار ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سفینے کے تختے جودی پہاڑ پر اب تک باقی تھے، یہ اس لیے کہ یاد رکھنے والا کان اس ماجرے کو یاد رکھے۔[4]

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿13﴾ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿14﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿15﴾ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِیَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ﴿16﴾ وَّالْمَلَكُ عَلٰۤى اَرْجَآئِهَا ؕ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿17﴾ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿18﴾

پھر جب صور میں ایک ہی بار پھونک ماری جائے گی ⑬ اور زمین اور پہاڑ اُٹھا کر ایک ہی چوٹ سے ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے ⑭ تو اس دن واقع ہونے والی (قیامت) واقع ہوگی ⑮ اور

① فتح القدير (٣٧٣/٥) ② تفسير الطبري (٥٧٧/٢٣) ③ اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
④ تفسير القرطبي (٢٦٣/١٨) فتح البيان (٢٨٣/١٤_٢٩٠)

آسمان پھٹ جائے گا تو وہ اس دن بودا ہوگا⑯ اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور اس دن آٹھ (فرشتے) آپ کے رب کا عرش اپنے اوپر اُٹھائے ہوں گے⑰ اس دن تمھاری پیشی ہوگی اور تمھارا کوئی راز خفیہ نہ رہے گا⑱

روزِ قیامت کی ہولناکیوں کا بیان:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کی ہولناکیوں کی خبر دیتا ہے کہ پہلے نفخۂ فزع، یعنی بے چینی کا نفخہ ہوگا، اس کے بعد نفخۂ صعق ہوگا جس سے آسمان و زمین والے سارے بے ہوش ہو جائیں گے سوائے ان کے جن کو اللہ چاہے۔ اس کے بعد نفخۂ قیام ہوگا، سب لوگ رب العالمین کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اور بعث ونشور (دوبارہ زندہ ہونا اور اٹھنا) ہوگا۔ اس آیت میں اسی آخری نفخے کا ذکر ہے اور اس کو نفخۂ واحدہ فرمایا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت اور رکاوٹ نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اس بات کا محتاج ہوتا ہے کہ اسے دوبارہ کہا جائے اور تاکید کی جائے۔

امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ پچھلا نفخہ ہے لیکن ظاہر وہی ہے جو ہم نے کہا، لہٰذا اس جگہ زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک بار پٹک دینے کا ذکر کیا ہے، یعنی ادیم عکاظی (چمڑے) کی طرح برابر کر دیے جائیں گے اور زمین بدل دی جائے گی۔ اس دن واقعہ ہو پڑے گا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا: آسمان کہکشاں سے پھٹ پڑے گا، یعنی قیامت قائم ہوگی اور آسمان پھٹ کر کمزور ہو جائے گا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا﴾ [النباء: ١٩] ''اور آسمان کھول دیا جائے گا تو اس میں دروازے ہو جائیں گے۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ آسمان دریدہ و بریدہ ہو جائے گا اور عرش اس کے مقابلے میں ہوگا[1] اور فرشتے آسمان کے کناروں پر ہوں گے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اطرافِ فلک پر ہوں گے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابوابِ سماء پر ہوں گے۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آسمان ممتد ہو جائے گا، آسمان والے زمین والوں کو دیکھیں گے[2] اور عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس عرش سے مراد یا تو عرشِ عظیم ہے، وہ عرش ہے جو قیامت کے دن تمام معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے زمین پر رکھا جائے گا۔ واللہ أعلم.

سیدنا عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں حاملانِ عرش کا ذکر یوں آیا ہے کہ آٹھ بزِ کوہی ہوں گے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عرش کو اٹھانے والے فرشتے آٹھ ہیں، ہر ایک کے گوشۂ چشم سے آخر

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٧٠) تفسیر ابن کثیر (٤/٥٣١) ② تفسیر ابن کثیر (٤/٥٣١)

③ سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٧٢٣) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٣٢٠) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٩٣) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجۂ ضعف ہیں، تفصیل کے لیے دیکھیں: (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ١٢٤٧)

چشم تک سو برس کا فاصلہ ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: مجھ کو اذن ہوا ہے کہ میں تم کو حاملانِ عرش میں سے ایک فرشتے کے متعلق بتاؤں، اس کے کان کی لو سے گردن تک اتنا فاصلہ ہے کہ سات سو برس تک ایک پرندہ اڑے۔[1] (رواه ابن أبي حاتم وهذا إسناد جيد رجاله كلهم ثقات وقد رواه أبو داود في كتاب السنة ولفظه: "أذن لي أن أحدث عن ملك من ملائكة الله تعالىٰ من حملة العرش أن ما بين شحمة أذنه إلى عاتقه مسيرة سبع مائة عام")[2]

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حملۂ عرشِ ملائکہ کے آٹھ صفوف ہیں۔ یہی قول امام شعبی، عکرمہ، ضحاک، ابن جریر، سدی رحمہ اللہ اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی ہے کہ وہ صفوفِ ہشتگانہ ہیں۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ کروبین آٹھ جز ہیں، ان میں سے ہر جز کی تعداد اتنی ہے جتنی کہ انسانوں، جنوں، شیطانوں اور فرشتوں کی تعداد ہے۔[3] پھر فرمایا کہ جس دن تمھارا سامنا ہوگا تمھاری کوئی بات اللہ پر مخفی نہ رہے گی، کیوں کہ اللہ تمام بھیدوں اور سرگوشیوں کا عالم ہے اور تمام کھلی اور پوشیدہ چیزوں اور دل کی باتوں کو جانتا ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ تم اپنے نفس کا حساب کرلو اس سے پہلے کہ تمھارا حساب لیا جائے اور اپنی جانوں کو تولو اس سے پہلے کہ وہ تولی جائیں کہ یہ کل کے دن تمھارے حساب کو ہلکا کردے گا اور تم آج ہی اپنا حساب کرلو اور اللہ کے سامنے پیش ہونے کے لیے مزین ہو جاؤ۔[4]

نامہ کان بہ حشر خواہے داد — ہم درینجا سواد بائید کرد

''ہونی کرنی کا نامہ تو قیامت کے دن دے گا، اسے اسی دنیا میں تحریر کر لینا چاہیے۔''

سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ لوگ قیامت کے دن تین بار پیش کیے جائیں گے۔ دو بار میں تو جدال اور معذرت ہوگی اور تیسری بار میں نامۂ اعمال اڑ کر ہاتھوں میں آئیں گے۔ کوئی دائیں ہاتھ سے لے گا اور کوئی بائیں ہاتھ میں۔[5] (رواه أحمد و رواه ابن ماجه عن أبي هريرة) سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسی کے قریب قریب کہا ہے۔[6]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ نفخِ صور سے مراد نفخۂ اولیٰ ہے۔[7] قاضی و زمخشری رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اس نفخے سے سارا جہان ویران ہو جائے گا۔[8] امام کلبی اور مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد

---

① تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٧٠) ② سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٢٧) السلسلة الصحيحة (١٥١)

③ تفسير الطبري (٥٨٣،٥٨٢/٢٣) تفسير ابن كثير (٥٣٢/٤) ④ محاسبة النفس لابن أبي الدنيا (٢٢/١)

⑤ مسند أحمد (٤١٤/٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٧٧) اس کی سند میں انقطاع ہے حسن رحمہ اللہ کا سماع سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٦٤٣٢)

⑥ تفسير الطبري (٥٨٤/٢٣) تفسير ابن كثير (٥٣٢،٥٣١/٤)

⑦ فتح القدير (٣٧٣/٥) ⑧ تفسير البيضاوي (٣٨٠/٥) الكشاف (٦٠٥/٤)

نفخہ اخیرہ ہے۔[1] زمین اور پہاڑ صرف اللہ کی قدرت سے یا زبانیہ فرشتوں کے توسط سے یا سخت ہوا سے یا ملائکہ کے واسطے سے اپنی اپنی جگہ سے اٹھا لیے جائیں گے۔ یہ رفع لوگوں کے قبروں سے نکلنے کے بعد ہوگا، پھر ان کو ایک ہی دفعہ توڑ پھوڑ کر برابر کر دیں گے، ان کے اجزاء میں سے کوئی شے دوسری جز سے متمیز نہ ہوگی۔ ایک سیدھا چٹیل میدان ہو جائے گا جہاں کچھ اونچا نیچا نہ ہوگا۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ کفار کے چہروں پر غبار ہو جائے گا نہ کہ مومنین کے چہروں پر اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ظاہر ہے: ﴿وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝﴾[2] [عبس: ٤٠-٤١] ”اور بہت سے چہرے اس دن غبار آلود ہوں گے جن پر سیاہی چڑھی ہوئی ہوگی۔“

اس دن قیامت واقع ہوگی اور آسمان پھٹ جائے گا اور آسمان کے فرشتے اتر پڑیں گے، آسمان سست اور ڈھیلا پڑ جائے گا۔ قیامت کی ہولناکی سے ساقط القوۃ ہوگا، حالاں کہ پہلے بہت مستحکم تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ساقط و سک ہو جائے گا جیسے دھنی ہوئی روئی۔ ملائکہ اس کی اطراف اور کناروں پر کھڑے ہوں گے، یہ اطراف و جوانب ساقط نہ ہوں گی، یہ اس استثناء میں شامل ہے جس کا ذکر ﴿اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ [الأنعام: ١٢٨] میں کیا گیا ہے۔ قاضی نے کہا ہے کہ شاید ملائکہ کی ہلاکت اس کے بعد ہو۔[3] بعض نے کہا ہے کہ نفخہ ثانیہ سے زندہ ہو کر ارجائے باقیہ (باقی بچ جانے والے کنارے) پر کھڑے ہوں گے۔ یعنی آسمان فرشتوں کا مسکن ہے، جب وہ پھٹ گیا تو یہ اس کے کناروں پر جالگیں گے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قیامت کے دن اللہ حکم کرے گا کہ آسمان پھٹ جائے، فرشتے اس کے کناروں پر رہ جائیں گے، ان کو حکم ہوگا کہ زمین پر اترو اور زمین اور زمین والوں کا احاطہ اور محاصرہ کر لو۔[4] کسی نے کہا ہے کہ آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، ملائکہ ان قطعات پر ہوں گے، کیوں کہ وہ قطعات فی نفسہا منشق (پھٹے ہوئے) نہ ہوں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ”عَلَى حَافَاتِهَا يَعْنِي مَا لَمْ يَهِيْ مِنْهَا“[5] اور اس دن رب کے عرش کو آٹھ فرشتے سروں پر اٹھائیں گے، یا ملائکہ کی آٹھ صفیں ہوں گی جن کی گنتی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان آٹھ فرشتوں کی صورت بزِ کوہی کی سی ہوگی، ان کے سر ساتویں آسمان تک عرش کے نزدیک اور قدم زمینِ زیریں پر ہوں گے، ان کے سینگ پہاڑی بکرے کے سینگوں کی طرح ہوں گے، سینگ کی جڑ سے اس کے سرے تک پانچ سو برس کا فاصلہ ہوگا۔ آج عرش کو اٹھانے والے چار ہیں، اس دن آٹھ ہوں گے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ آسمان و زمین کے درمیان پانچ سو برس کا راستہ ہے اور ہر ایک آسمان اور زمین کی موٹائی پانچ سو برس کا راستہ ہے اور ہر ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو برس کا راستہ اور عرش پانی پر ہے اور اللہ پاک عرش پر ہے۔ تمھارے اعمال سے کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔[6] (أخرجه الدارمي و ابن خزيمة موقوفا)

---

[1] فتح القدير (٥/٣٧٣، ٣٧٤) [2] مستدرك الحاكم (٢/٥٤٣) [3] تفسير البيضاوي (٥/٣٨٠)
[4] تفسير القرطبي (١٧/١٦٩) [5] تفسير الطبري (٢٣/٥٨٢) الدر المنثور (٨/٢٦٩) [6] تفسير الخازن (٧/١٤٤)

اس بارے میں اور حدیثیں آئی ہیں، اس دن لوگ حساب کے لیے اللہ پر پیش کیے جائیں گے۔ اسی کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ وَعُرِضُوا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ﴾ [الكهف: ٤٨] ''اور سب کے سب تیرے رب کے سامنے صف بستہ حاضر کیے جائیں گے۔'' عرض (پیش کرنا) کچھ اس لیے نہ ہوگا کہ جو بات اللہ کو معلوم نہ تھی اب معلوم ہو جائے، بلکہ یہ عرض اعمال پر ملامت کے لیے اور آزمائش کے لیے ہوگی۔ ﴿ خَافِيَةٌ ﴾ سے مراد تمام پوشیدہ اعمال و اقوال و افعال کے تمام حالات اور دل کی باتوں کے سب حالات ہیں جن کو دنیا میں چھپاتے تھے، کوئی سی بات بھی کیوں نہ ہو۔[1]

فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَهْ ﴿١٩﴾ إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ ﴿٢٠﴾ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ﴿٢١﴾ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿٢٢﴾ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ﴿٢٣﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿٢٤﴾

پھر جسے اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا: لو! میرا اعمال نامہ پڑھو ⑲ بے شک مجھے یقین تھا کہ مجھے اپنے حساب کو ملنا ہے ⑳ چنانچہ وہ پسندیدہ زندگی میں ہوگا ㉑ بہشتِ بریں میں ㉒ اس کے پھل قریب جھکے ہوں گے ㉓ (کہا جائے گا:) مزے سے کھاؤ اور پیو ان (اعمال) کے بدلے جو تم نے گزرے دنوں میں آگے بھیجے ㉔

دائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال لینے والے خوش قسمت لوگ:

اللہ پاک نے اس شخص کی سعادت کی خبر دی ہے جس کو اس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ملے گا کہ وہ خوشی کے مارے ہر اس شخص سے کہے گا جس سے ملاقات ہوگی کہ آؤ میری کتاب پڑھو، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ اس کتاب میں لکھا ہے وہ صرف بھلائیاں اور نیکیاں ہیں۔ اللہ نے اس کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیا ہوگا۔ ابو عثمان نے کہا ہے کہ مومن کو اس کی کتاب اللہ کی طرف سے چپکے سے ملے گی، وہ اپنی برائیوں کو پڑھے گا جس برائی کو پڑھے گا تو اس کا رنگ بدلتا جائے گا، یہاں تک کہ جب حسنات پر گزرے گا اور ان کو پڑھے گا تب اس کا رنگ اپنی حالت پر آئے گا۔ پھر دیکھے گا کہ اس کی برائیاں اچھائیوں سے بدل گئی ہیں اس وقت کہے گا: آؤ میرا نامۂ اعمال پڑھو۔[2]

عبداللہ بن عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ غسیلِ ملائکہ کہتے ہیں کہ اللہ اپنے بندے کو قیامت کے دن کھڑا کرے گا۔ اس کی برائیاں صحیفے کی پشت پر ظاہر ہوں گی۔ اللہ پاک اس سے فرمائے گا: تو نے یہ کام کیا تھا؟ وہ کہے گا: ہاں اے رب!

---

[1] فتح البیان (١٤/ ٢٩١-٢٩٤) [2] تفسیر ابن کثیر (٤/ ٥٣٣)

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں نے تجھ کو رسوا نہ کیا اور میں نے تجھ کو بخش دیا۔ وہ اس وقت کہے گا: ﴿ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴾۔ یہ اس وقت ہوگا کہ روزِ رست خیز کی رسوائی سے نجات پالے گا۔[1] اللهم اجعلنا من هذا الجنس وتب علينا إنك أنت التواب الرحيم.

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: اللہ قیامت کے دن بندے کو اپنے پاس بلا کر اس کے سارے گناہوں کا اقرار کرائے گا، یہاں تک کہ جب وہ بندہ دیکھے گا کہ میں ہلاک ہوا اللہ تعالیٰ فرمائے گا: « إِنِّي سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا وَأَنَا أَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ » ''میں نے دنیا میں تجھ پر پردہ ڈال دیا اور آج تجھے معاف کرتا ہوں۔'' پھر اس کی کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں دے گا۔ رہا کافر و منافق تو ان کے لیے گواہ لوگ کہیں گے: ﴿ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [هود: ١٨] ''یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ باندھا، خبردار ہو کہ اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر۔''[2] (رواه البخاري بطوله)

گناہوں کا اقرار کرنا قیامِ حجت اور عذر قطع کرنے کے لیے انصاف کا تقاضا ہے اور اقرار کے بعد گناہوں کا بخشنا محض فضل ہے۔ اے رب! تو نے دنیا میں میرے صدہا گناہ پوشیدہ رکھے ہیں تو دوبارہ جی اٹھنے کے دن بھی مجھے مستور رکھ کر مغفور کرنا، تجھے گناہ کے معاف کرنے پر قدرتِ تامہ حاصل ہے۔ پھر اللہ نے کہا: وہ کہے گا مجھ کو گمان تھا کہ میں اپنے حساب سے ملوں گا، یعنی دنیا میں قیامت کے لازمی طور پر واقع ہونے پر یقین رکھتا تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ ﴾ [البقرة: ٤٦] ''جو جانتے ہیں کہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں۔''

﴿ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ﴾ سے مراد جنتِ عالیہ ہے جس کے محل بلند، جس کی حوریں حسین، جس کے گھر نعمت اور جہاں کی خوشی مستمر اور دائم رہنے والی ہے۔ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک شخص نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! اہلِ جنت بھی آپس میں ملاقات کریں گے؟ فرمایا: ہاں اوپر کے درجے والے نیچے کے درجے والوں کے پاس اتر کر آئیں گے، باہم تحیت و سلام کریں گے اور نچلے درجے کے لوگ اوپر کے درجے والوں کی طرف نہیں چڑھیں گے، اپنے اعمال کی کمی کی وجہ سے۔[3] (رواه ابن أبي حاتم)

صحیح میں مروی ہے کہ جنت کے سو درجے ہیں، درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔[4] میوے قریب ہوں گے، ہر کوئی لیٹے لیٹے اپنے سر پر ہاتھ بڑھا کر لے لے گا۔ یہ بہت سے اہلِ علم کا قول ہے۔ سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا مگر بذریعہ جواز، یعنی پروانۂ راہ داری کے ساتھ جو اس طرح ہوگا: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، هٰذَا كِتَابٌ مِنَ اللّٰهِ لِفُلَانِ ابْنِ

---

① تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٧١/١٠) ② صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٠٩)

③ تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٧١/١٠) اس کی سند میں ''سعید بن یوسف'' ضعیف راوی ہے۔

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٧٠)

فُلَانٍ، أَدْخِلُوْهُ جَنَّةً عَالِيَةً قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ"[1] (رواه الطبراني)۔ سلمان رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت رفعاً یہ ہے:
"يُعْطَى الْمُؤْمِنُ جَوَازًا عَلَى الصِّرَاطِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، هٰذَا كِتَابٌ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ لِفُلَانٍ أَدْخِلُوْهُ جَنَّةً عَالِيَةً قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ"[2] (رواه الضياء) مثلاً اس چٹھی کا مضمون یہ ہوگا کہ یہ خط ہے اللہ کی طرف سے صدیق بن حسن کے لیے کہ اس کو بہشت بریں میں داخل کرو جس کے میوے جھک رہے ہیں۔

جنت و انواعِ نعیم کا بیان رسالہ "هادي القلب السليم" میں تفصیل وار لکھا گیا ہے۔ وللّٰه الحمد۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ کھاؤ پیو خوب سیر ہو کر، بدلہ اس کا جو تم نے پہلے دنوں میں کیا تھا۔ از راہِ فضل و امتنان و انعام و احسان ہوگا، ورنہ صحیح میں فرمایا ہے: «اِعْمَلُوْا وَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاعْلَمُوْا أَنَّ أَحَدًا مِنْكُمْ لَنْ يُّدْخِلَهُ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ قَالُوْا: وَلَا أَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟! قَالَ: وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ مِنْهُ وَفَضْلٍ»[3] "سیدھے ہو کر اعمال بجا لاؤ، جان لو کہ کسی کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ لوگوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ کو بھی نہیں؟ فرمایا: ہاں مجھ کو بھی نہیں، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میرے شاملِ حال ہو۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ کتاب سے مراد وہ صحیفۂ اعمال ہے جس کو محافظ فرشتے لکھتے تھے۔ یہ اپنے اہل اور اقرباء سے کہے گا: لو اس کو پڑھو، میں نے دنیا میں یقین کر لیا تھا کہ آخرت میں میرا حساب ہوگا، یا اللہ مجھ کو میرے سیئات پر گرفتار کرے گا، چنانچہ اس نے مجھ پر بخشش کر کے اپنا فضل کیا اور مجھ سے مواخذہ نہ فرمایا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن میں مومن کا ظن جہاں بھی بیان ہوا ہے، اس کا معنی یقین ہے اور کافر کا ظن بہ معنی شک استعمال ہوا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظنِ آخرت یقین ہے اور ظنِ دنیا شک ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ مومن نے اللہ کے ساتھ حسنِ ظن کیا تھا، اس لیے آخرت کے لیے اچھا عمل کیا اور کافر اپنے رب سے بدگمان تھا، اس لیے برا عمل کرتا رہا۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ﴿رَّاضِيَةٍ﴾ بہ معنی "مرضية" ہے۔[4] عرب اکثر سعادات میں ﴿عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ﴾ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور رضا کو بھی کمال لذت کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے۔ ﴿عَالِيَةٍ﴾ سے مراد وہ جنت ہے جو ساتویں آسمان پر ہے، یا بلند منزلہ یا نفوس میں عظیم القدر ہے۔ "قطف" میوہ چننے کو کہتے ہیں۔ ﴿دَانِيَةٌ﴾ سے مراد کھڑے، بیٹھے، لیٹے، تکیہ لگائے جس طرح چاہیں میوہ لے لیں۔ "هني" سے مراد پاک لذیذ کھانا اور خوشگوار شراب (پینے کی چیز) ہے جس میں کسی طرح کا تنغص و تکدر (گدلا پن) نہ ہو۔ "أيام خالية" سے مراد دنیا کے ایام ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ایامِ صیام ہیں۔[5]

---

(1) المعجم الكبير (٦/٢٧٢) اس کی سند میں "عبدالرحمان بن زیاد اور اسحاق دہری" ضعیف راوی ہیں۔

(2) تفسیر ابن کثیر (٤/٥٣٣) اس کی سند میں "سعدان بن سعید" مجہول راوی ہے۔

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧١٦) تفسير ابن كثير (٤/٥٣٢_٥٣٤)

(4) تفسير القرطبي (١٨/٢٧٠) (5) فتح القدير (٥/٣٧٧) فتح البيان (١٤/٢٩٤_٢٩٦)

وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ١ۙ۬ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْۚ۝۲۵ وَ لَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْۚ۝۲۶ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَۚ۝۲۷ مَاۤ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْۚ۝۲۸ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْۚ۝۲۹ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُۙ۝۳۰ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُۙ۝۳۱ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُؕ۝۳۲ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِۙ۝۳۳ وَ لَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِؕ۝۳۴ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌۙ۝۳۵ وَّ لَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍۙ۝۳۶ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ۠۝۳۷

اور جسے اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا: کاش! مجھے میرا اعمال نامہ نہ دیا جاتا (25) اور مجھے خبر نہ ہوتی میرا حساب کیا ہے (26) کاش! وہی (موت) فیصلہ کن (ثابت) ہوتی (27) مجھے میرے مال نے کچھ فائدہ نہ دیا (28) میری سلطانی مجھ سے چھن گئی (29) (حکم ہوگا:) اسے پکڑو، پھر طوق ڈال دو (30) پھر اسے جہنم (کی آگ) میں جھونک دو (31) پھر ایک زنجیر میں، جس کی پیمائش ستر گز ہے، اسے جکڑ (یا پرو) دو (32) بے شک وہ اللہ عظیم پر ایمان نہیں لاتا تھا (33) اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے پر شوق دلاتا تھا (34) لہٰذا آج یہاں کوئی اس کا غم خوار دوست نہیں (35) اور زخموں کے دھوون کے سوا کوئی کھانا نہیں (36) خطا کاروں کے سوا اسے کوئی نہیں کھاتا (37)

بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال دیے جانے والوں کا برا حال ہوگا:

موضح قرآن میں کہا ہے کہ ہر ایک کے اعمال کے کاغذ اڑا دیں گے جس کے دائیں ہاتھ میں آیا تو یہ علامت ہوئی بھلائی کی اور جس کے بائیں ہاتھ میں آیا یا پیٹھ کی طرف سے آیا تو یہ علامت ہے برائی کی۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ نے شقی، یعنی بد بخت لوگوں کے حال کی خبر دی کہ جب عرصات میں ان کو بائیں ہاتھ میں کتاب دی جائے گی تو نہایت پشیمان ہو کر یہ کہے گا کہ کاش! یہ کتاب مجھ کو نہ دی جاتی۔ ﴿ اَلْقَاضِيَةَ ﴾ سے مراد موت ہے جس کے بعد حیات نہ ہو۔ یہی قول امام محمد بن کعب، ربیع اور سدی رحمہم اللہ کا ہے۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موت کی تمنا کرے گا، حالاں کہ دنیا میں وہ موت سے زیادہ کسی شے کو ناپسند نہیں

---

(1) تفسیر ابن کثیر (٥٣٤/٤)

کرتا تھا۔ کہے گا: میرا مال اور میری عزت و جاہ میرے کچھ کام نہ آئے اور اللہ کے عذاب اور تکلیف کو دور نہ کیا، بلکہ مجھ پر ایسی بلا آئی کہ میرا کوئی مددگار اور مجیر، یعنی پناہ دینے والا نہیں ہے۔[1]

اس وقت اللہ فرمائے گا: اس کو گرفتار کرو، گردن میں طوق ڈال کر جہنم میں جھونک دو۔ آگ کے فرشتے، یعنی زبانیہ فوراً اس حکم کی تعمیل کریں گے اور اس کو جہنم میں ڈال دیں گے۔ منہال بن عمرو رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صرف اس حکم پر کہ اس کو پکڑو ستر ہزار فرشتے دوڑ پڑیں گے اور ستر ہزار کو آگ میں ڈال دیں۔ امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چار لاکھ فرشتے جلدی کریں گے اور کوئی چیز باقی نہ رہے گی مگر وہ اس کو کچل پچل دے گی، وہ کہے گا: تجھ کو مجھ سے کیا واسطہ ہے، وہ شے جواب دے گی کہ رب تجھ پر غضبناک ہے، اس لیے ہر شے تجھ پر خفا ہے۔

چون ازدگشتی ہمہ چیز از تو گشت

''جب تو نے اس سے رخ پھیرا تو ہر چیز نے تجھ سے رخ پھیر لیا۔''

سیدنا فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ کہے گا: ﴿ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴾ تو ستر ہزار فرشتے دوڑ پڑیں گے کہ کون اس کی گردن میں طوق ڈالے،[2] پھر اس کو جہنم میں ٹھونس دیں گے۔ کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زنجیر ستر گز ہوگی، اس کا ہر حلقہ دنیا کے آہن کے بقدر ہوگا۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ زنجیر فرشتے کے ذراع سے ستر ذراع ہوگی، یعنی ان کے ناپ سے نہ کہ ہمارے ناپ سے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ﴿ فَاسْلُكُوْهُ ﴾ سے مراد ہے کہ اس کی پیٹھ میں داخل کریں گے اور منہ سے باہر نکلے گی، پھر اس زنجیر میں ان کو پرو دیں گے جس طرح کہ بھوننے کے لیے ٹڈی کو لکڑی میں پروتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ پیٹھ میں زنجیر ڈال کر دونوں نتھنوں سے باہر نکالیں گے، تاکہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکے۔[4]

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اگر ایک رصاصہ، جو کھوپڑی جتنا ہے، آسمان سے زمین پر چھوڑ دیا جائے جو پانچ سو برس کا راستہ ہے تو رات سے پہلے زمین پر پہنچ جائے اور اگر زنجیر کے سرے سے گرائیں تو تہہ تک پہنچنے میں رات دن چالیس سال تک چلے۔[5] (رواه أحمد والترمذي وحسنه) پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ نہ اللہ کے لیے قیام کرتا تھا، نہ اللہ کی اطاعت و عبادت بجا لاتا اور نہ مخلوق کو نفع دیتا تھا اور نہ ان کا حق ادا کرتا تھا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق ہے کہ توحید اختیار کریں اور کسی شے کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا بھی بندوں پر حق واحسان اور نیکی اور تقویٰ پر ان کے ساتھ تعاون کرنا ہے۔ لہٰذا نماز کے قائم کرنے اور زکات کے ادا کرنے کا

---

[1] تفسير الطبري (٥٨٧/٢٣) [2] تفسير ابن كثير (٥٣٤/٤) [3] تفسير الصنعاني (٣١٢/٣)

[4] تفسير الطبري (٥٨٩/٢٣) الدر المنثور (٢٧٤/٨)

[5] مسند أحمد (١٩٧/٢) سنن الترمذي (٢٥٨٨) اس کی سند میں ''ابوالسمح دراج'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع: ٤٨٠٥)

حکم دیا ہے اور نبی ﷺ نے اپنی روح کے قبض کیے جانے کے وقت فرمایا تھا:«اَلصَّلَاۃَ وَمَا مَلَکَتْ أَیْمَانُکُمْ»[1]

﴿حَمِيْمٌ﴾ سے مراد قریب ہے، یعنی رشتے دار یا سفارشی جس کی سفارش قبول کی جائے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿غِسْلِيْنٍ﴾ اہلِ نار کا بدترین طعام ہے۔ امام ربیع اور ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جہنم میں ایک درخت ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ غسلین کیا ہے لیکن گمان کرتا ہوں کہ زقوم ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اہلِ نار کا خون اور پانی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ دوزخیوں کا زرد آب ہے۔[2] نسال اللہ العافیة۔ نار اور اہلِ نار کا بیان رسالہ ''النذیر العریان'' میں باوجود اختصار کے سادہ اور پر کار ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ شمال سے مراد دستِ چپ (بایاں ہاتھ) ہے، وہ پیٹھ کے پیچھے ہوگا، ادھر سے نامۂ اعمال ملے گا، یا وہ ہاتھ سینے کی طرف سے الگ کر کے پیٹھ کے پیچھے سے نکالا جائے گا۔ جب اس کتاب میں اپنے سیئات اور برے انجام کو پردہ ہٹ جانے کے سبب سے ملاحظہ کرے گا تو نہایت حزن و تکلیف وغم واندوہ سے اس بات کی آرزو کرے گا کہ کاش! یہ کتاب مجھ کو نہ دی جاتی، کیوں کہ ان میں میری فضیحتیں اور قباحتیں ہیں اور میں نہیں جانتا کہ میرا حساب کیا ہے، کیونکہ سب بلا مجھ پر آئی۔ کاش! یہ موت ہو چکتی اور پھر میں دوبارہ اب زندہ نہ ہوتا اور یہ برا انجام اور عذاب اور کیفرِ کردار نہ دیکھتا۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: جس چیز سے موت مانگی جائے وہ موت سے بھی زیادہ بدتر ہے۔[3] یا یہ حالت موت سے بھی بڑھ کر تلخ ہے۔ نہ میرا مال کچھ کام آیا اور نہ میری حکومت نے مجھ کو کچھ نفع پہنچایا، بلکہ وہ ساری دولت اور سلطنت خاک میں مل گئی۔ یہ وہ مال تھا جس سے فقیر کا حق نہ دیا اور نہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کیا، بلکہ اس کی وجہ سے اللہ کی مخلوق پر اپنی عظمت بٹھائی اور بڑائی جتائی۔ یہ وہ سلطنت تھی جس میں بندوں اور بلاد پر ہر طرح کا ظلم کیا تھا، کسی کی کچھ ہستی نہ سمجھی تھی، اب نہ وہ مال رہا نہ وہ غلبہ، بلکہ حقیر، ذلیل، فقیر خوار ہو گیا اور نہ ہی اپنے اعضاء پر کچھ اختیار ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس دن اس کے اعضاء گواہی دیں گے کہ اس نے شرک اور کفر کیا تھا[4] تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اس کا ہاتھ اس کی گردن سے باندھو، اس کو طوق پہناؤ۔ یہ جہنم کے داروغوں سے خطاب ہے جو زبانیہ ہیں۔ یہ انیس نفر ہوں گے جن کا ذکر سورۃ المدثر میں آئے گا۔[5] مراد انیس (۱۹) عدد ہیں یا انیس (۱۹) صف یا انیس (۱۹) قسم۔[6] (حکاہ الرازي)

---

(1) سنن أبي داود (٥١٥٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٢٥٨/٤) سنن ابن ماجه (١٦٢٥) صحيح الجامع (٣٨٧٣)
(2) تفسير الطبري (٥٩١/٢٣) تفسير ابن كثير (٥٣٤/٤، ٥٣٥)
(3) تفسير الطبري (٥٨٧/٢٣)
(4) تفسير البغوي (٢١٢/٨)
(5) رقم الآية (٣٠)
(6) تفسير الرازي (١٧٩/٣٠)

"جحیم" بہت بڑی آگ کو کہتے ہیں۔ ﴿ ثُمَّ ﴾ کا حرف ترتیب زمان کے لیے ہے۔ پہلے طوق پہنائیں گے، پھر دوزخ میں لے جائیں گے، پھر زنجیر میں جکڑ کر بند کریں گے۔ ہر عذاب پہلے عذاب سے زیادہ سخت ہو گا۔ نسال اللہ العافیۃ۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صلات کے معنی یہ ہیں کہ آگ کے اندر لے جانے میں خوب سا مبالغہ کرو اور بار بار اس میں غوطے دو جس طرح کہ گوسفند کو بھوننے کے لیے بار بار آگ پر سینکتے ہیں اور خوب بھونتے ہیں۔ وہ لوگوں پر تعاظم کرتا تھا، یعنی ان میں بڑا بنتا تھا، اب اس کے مناسب حال یہ ہے کہ بڑی آگ میں اسے غوطے دیے جائیں۔ "سلسلہ" حلقہ ہائے منتظم کو کہتے ہیں، یعنی حلقہ درحلقہ پروئی ہوئی زنجیر، اس کی لمبائی ستر گز فرمائی۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: اللہ جانے کون سا گز ہو گا۔ بعض نے کہا ہے کہ فرشتے کے ہاتھ جتنا۔ نوف شامی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر ذراع ستر باع ہو گا اور ہر باع اس سے زیادہ لمبا ہو گا جو فاصلہ تیرے اور مکہ کے درمیان ہے۔ نوف اس وقت کوفہ کے صحن میں تھے۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر اس کا ایک حلقہ پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دیا جائے تو وہ رانگ کی طرح پگھل جائے۔[1] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا اندازہ اللہ ہی جانے[2] اور یہ عدد حقیقتاً ہے یا مبالغتاً۔ سوید ابن ابی نجیح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ سارے اہلِ نار اسی سلسلے میں ہوں گے۔[3] آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بعث پر ایمان نہیں رکھتا تھا، اس لیے کہ لوگ مساکین کو اللہ کے لیے دارِ آخرت میں ثواب کی امید پر کھلاتے ہیں نہ کہ دنیا میں اس کا عوض طلب کرنے کے لیے۔ چنانچہ جو کوئی بعث پر ایمان نہیں رکھتا اس کو کوئی شے مساکین کو کھانا کھلانے پر ترغیب نہیں دیتی۔

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کا ایک سلسلہ ہے، اس سے جہنم کے دیگدان جب سے اللہ نے دوزخ کو پیدا کیا ہے، ہمیشہ جوش مارتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ سلسلہ لوگوں کے گلے میں ڈالا جائے۔ اللہ نے ہم کو نصف سلسلہ مذکور سے نجات دی کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، چنانچہ تو اے ام الدرداء! طعامِ مسکین پر اپنے آپ کو آمادہ کر۔[4] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: میں نے ایسی اقوام پائیں جو اپنے گھر والوں کو قسم دیتے کہ وہ کسی سائل کو واپس نہ کریں اور بعض اپنی بی بی سے کہتے کہ شوربا زیادہ کرو کہ مسکینوں کے کام آئے اور کہتے کہ ہم نے آدھا سلسلہ تو ایمان لا کر نکال دیا اب کیا دوسرے نصف کو ہم کھانا کھلا کر نہ نکالیں۔[5]

اہلِ علم نے کہا ہے کہ ان دو امر کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ سب سے قبیح عقیدہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا ہے اور سب سے بری اور کمینی بات دل کا بخل اور سختی ہے۔ ﴿ غِسْلِيْنٍ ﴾ اہلِ نار کا دھوون ہے، یا جہنم

---

(1) تفسير القرطبي (٢٧٢/١٨) (2) تفسير النسفي (٢٧٢/٤) (3) فتح القدير (٣٧٨/٥)
(4) الدر المنثور (٢٧٤/٨) (5) تفسير الخازن (١٤٦/٧)

کا درخت ہے، یا دوزخیوں کا خون اور پیپ ہے۔ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ ﴿ غِسْلِيْنٍ ﴾ کا ایک ڈول دنیا میں بہا دیا جائے تو سب دنیا والے بدبو دار ہو جائیں۔[1] (رواہ الحاکم وصححہ) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ﴿ غِسْلِيْنٍ ﴾ اہلِ نار کے کھانوں میں سے ایک کھانا ہے۔[2] دوسری جگہ فرمایا ہے: ﴿ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ﴾ [الغاشیہ: ٦] ''ان کے لیے سوائے کانٹے دار درختوں کے اور کچھ کھانا نہ ہوگا۔'' ہوسکتا ہے کہ ﴿ ضَرِيْعٍ ﴾ یہی ﴿ غِسْلِيْنٍ ﴾ ہو۔ ''خاطئین'' سے مراد خطا کار اور گناہ گار ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: مراد اہلِ شرک ہیں۔[3] آیت اس بارے میں دلیل ہے کہ کفار مخاطب ہیں اپنی مختلف قسموں کے ساتھ اور مسکینوں کو نہ کھلانا کفر کی خصلت ہے۔[4]

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٣٩﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿٤٠﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿٤١﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٤٢﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٣﴾

تو میں ان چیزوں کی قسم کھاتا ہوں جو تم دیکھتے ہو (38) اور (ان کی) جو تم نہیں دیکھتے (39) بلاشبہ یہ (قرآن) رسولِ کریم (جبریل) کا قول ہے (40) اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں، تم کم ہی ایمان لاتے ہو (41) اور نہ (یہ) کسی کاہن کا قول ہے، تم کم ہی نصیحت پکڑتے ہو (42) (یہ تو) رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہے (43)

قرآنِ مجید کلام اللہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے اس بات پر قسم کھائی ہے کہ قرآن اس کا کلام اور وحی ہے اور اسی نے اس کتاب پاک کو اپنے رسول اور برگزیدہ بندے پر رسالت اور امانت کو پہنچا دینے کے لیے اتارا ہے۔ اپنے خلق مشہور و مغیب کے جو دلائل ہیں اس کے اسماء و صفات کی بنا پر رسولِ کریم سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ اضافت تبلیغ کے معنی میں ہے، اس لیے کہ رسول کی شان یہ ہے کہ وہ مرسل کی طرف سے بات پہنچاتا ہے۔ لہٰذا سورۃ التکویر میں یہ اضافت فرشتے رسول کی طرف فرمائی ہے: ﴿ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿١٩﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿٢٠﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴾ [التکویر: ١٩- ٢١] ''یقیناً یہ ایک بزرگ رسول کا کہا ہوا ہے جو قوت والا ہے، عرش والے (اللہ) کے نزدیک بلند مرتبہ

---

(1) مستدرك الحاكم (٥٤٤/٢) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔
(2) الدر المنثور (٢٧٥/٨) (3) فتح القدير (٣٧٩/٥) (4) فتح البیان (٢٩٦/١٤-٣٠١)

ہے جس کی (آسمانوں میں) اطاعت کی جاتی ہے، امین ہے۔'' اور یہ جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ پھر فرمایا کہ تمھارا صاحب، یعنی محمد ﷺ مجنون نہیں ہیں۔ تمھارے صاحب نے اس کو، یعنی جبریل علیہ السلام کو افقِ مبین میں دیکھا ہے، یعنی ان کی اصل صورت پر جو اللہ نے بنائی ہے اور وہ غیب کی بات پر کچھ متہم نہیں ہے اور یہ کسی شیطان رجیم کا کوئی قول نہیں۔

اسی طرح اس جگہ یہ فرمایا کہ یہ قول کسی شاعر اور کاہن کا نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی اضافت کبھی فرشتے رسول کی طرف فرمائی اور کبھی بشری رسول کی طرف، اس لیے کہ یہ دونوں اللہ کی طرف سے اس کی وحی اور کلام کے مبلغ ہیں جس پر اللہ نے ان کو امین کہا ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ یہ تنزیل رب العالمین کی طرف سے ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اسلام لانے سے قبل نکلا کہ نبی اکرم ﷺ سے تعرض کرو، وہ مجھ سے پہلے مسجد میں پہنچ گئے تھے، میں ان کے پیچھے کھڑا ہوا، انھوں نے سورۃ الحاقہ پڑھنا شروع کی، میں تالیفِ قرآن سے تعجب کرتا تھا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ واللہ! یہ محض شاعر ہے جس طرح کہ قریش کہتے ہیں، اتنے میں آپ ﷺ نے یہ پڑھا: ﴿ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۚ قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ ﴾ میں نے کہا: کاہن ہے۔ آپ ﷺ نے پڑھا: ﴿ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۚ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ ۝ تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾ تا آخر سورت، اس وقت میرے دل میں خوب ہی اسلام پڑ گیا۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''یہ من جملہ ان اسباب کے ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ہدایت کا ذریعہ بنایا، جس طرح کہ ہم نے ان کی سیرت کے الگ سے بیان میں ان کے اسلام لانے کی کیفیت کو خوب اچھی طرح بیان کیا ہے۔ وللّٰہ الحمد۔''[2] تفسیر ابن کثیر میں جابجا تفسیر کے علاوہ ان کی تالیفات کے بارے میں معلوم ہوتا ہے، لیکن صد افسوس کہ وہ میسر نہیں ہوتیں خصوصاً اس ظلمت کدہ کشورِ ہند میں۔ فإنا للّٰہ۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ میں مخلوقات مبصرات و مغیبات کی قسم کھاتا ہوں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ساری اشیاء کی جو دکھائی نہیں دیتیں ہیں،[3] اس میں تمام مخلوقات آ گئی اور غیر اللہ کی قسم کھانا ہمارے لیے ممنوع ہے۔ رہا اللہ پاک تو اس کو اختیار ہے کہ جس چیز کی چاہے قسم کھائے اور جس بات پر چاہے قسم کھائے۔ یہ مشرکین کے کلام پر رد ہے کہ بات وہ نہیں ہے جو تم کہتے ہو۔ یہ قرآن تو رسول کا قول ہے، یعنی تلاوت کیا ہوا اور رسول کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی بزرگی ہے۔ کریم یہ ہے کہ اخلاقِ بد سے دور ہو۔ یہ تقریر اس بنیاد پر ہے کہ رسولِ کریم سے مراد نبی ﷺ ہیں۔ یعنی اس قول کے مبلغ اور تلاوت کرنے والے محمد ﷺ ہیں۔ امام حسن، کلبی اور مقاتل رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مراد جبریل علیہ السلام ہیں،[4] دوسری آیت کی دلیل سے جو گزر چکی ہے۔

---

[1] مسند أحمد (١٧/١) اس کی سند میں انقطاع ہے، شریح بن عبید رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر (٥٣٥/٤) [3] فتح القدير (٣٧٩/٥) [4] تفسير القرطبي (٢٧٤/١٨)

بہر حال قرآن نہ قولِ محمد ﷺ ہے اور نہ قولِ جبریل علیہ السلام ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا قولِ مقدس ہے۔ اس جگہ تلاوت یا تبلیغ مقدر ہے اور رسول کے لفظ میں اس پر دلیل ہے، اس لیے لفظ "عن اللہ" نہیں کہا۔ پھر مشعریت، یعنی شعر ہونے کی نفی کی۔ شاعر وہ ہوتا ہے کہ جو قافیہ والا کلام وزن کیا ہوا بہ قصدِ وزن بولتا ہے۔ سو یہ قرآن نہ اضافت شعر سے ہے اور نہ مشابہ اضافت ہے اور نہ یہ کتابِ مقدس کسی کاہن کا کلام ہے، کیوں کہ کہانت اور چیز ہے۔ ابو جہل نے نبی اکرم ﷺ کو شاعر اور ولید بن مغیرہ نے ساحر اور عقبہ نے کاہن کہا تھا، اس پر یہ آیت اتری۔[1]

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿٤٤﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿٤٥﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ﴿٤٦﴾ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿٤٧﴾ وَإِنَّهُ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٤٨﴾ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنكُم مُّكَذِّبِينَ ﴿٤٩﴾ وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٥٠﴾ وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ﴿٥١﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٥٢﴾

اور اگر یہ ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا (44) تو یقیناً ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے (45) پھر البتہ ہم اس کی شہ رگ کاٹ ڈالتے (46) پھر تم میں سے کوئی ایک بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا (47) اور بلاشبہ یہ (قرآن) تو متقین کے لیے نصیحت ہے (48) اور یقیناً ہمیں علم ہے کہ تم میں سے بعض (اس کی) تکذیب کرتے ہیں (49) اور یقیناً وہ (جھٹلانا) کافروں کے لیے باعثِ حسرت ہے (50) اور بے شک یہ حق الیقین ہے (51) چنانچہ اپنے ربِ عظیم کے نام کی تسبیح کیجیے (52)

اگر رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی نسبت کوئی بناتے:

موضح قرآن میں کہا ہے کہ اگر یہ رسول ﷺ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بناتا تو اس کا پہلا دشمن اللہ تعالیٰ ہوتا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے قتل کر دیتا۔ یہ گردن مارنے کا دستور ہے کہ جلاد اس کا دایاں ہاتھ اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ لیتا ہے، تاکہ وہ سرک نہ جائے۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تمھارے اعتقاد کے مطابق۔ یعنی جیسا کہ تم خیال کرتے ہو، محمد ﷺ ہم پر افتراء باندھتے اور رسالت میں کمی بیشی کرتے یا اپنی طرف سے کچھ بنا کر ہماری طرف منسوب کرتے تو ہم جلد ہی ان کو عقوبت میں مبتلا کر دیتے۔ دائیں ہاتھ کا پکڑنا سزا دینے کے لیے سخت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "وَتِين" رگِ دل کو کہتے ہیں، جس سے دل معلق ہے۔ یہی قول امام عکرمہ،

[1] فتح البیان (۱۴/۳۰۱-۳۰۲)

سعید بن جبیر، حاکم، قتادہ، ضحاک، مسلم بطین اور حمید بن زیاد کا ہے۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا: "وَتِینٌ" دل ہے اپنی رگوں وغیرہ کے ساتھ۔[1] اور اگر ہم ایسا کرتے تو ہمارے اور اس کے درمیان تم میں سے کوئی رکاوٹ ڈالنے والا نہ ہوتا۔ بلکہ وہ تو سچے نیک راشد ہیں۔ اللہ نے ان کو تبلیغ کے لیے مقرر کیا ہے اور ان کی تائید واضح معجزوں اور قطعی دلیلوں کے ساتھ کی ہے اور یہ قرآن اہلِ تقویٰ کے لیے یادگار ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءٌ ۖ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ﴾ [حم السجدة: ٤٤] "آپ کہہ دیجیے! کہ یہ تو ایمان والوں کے لیے ہدایت وشفا ہے اور جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں تو (بہراپن اور) بوجھ ہے اور یہ ان پر اندھا پن ہے۔"

پھر فرمایا: ہم جانتے ہیں کہ تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس بیان اور وضاحت کے باوجود اس قرآن کو جھٹلاتے ہیں۔ سو یہ قرآن کفار پر حسرت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَذَٰلِكَ سَلَكْنَاهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ﴿٢٠٠﴾ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ ﴾ [الشعراء: ٢٠٠۔ ٢٠١] "اسی طرح ہم نے گناہ گاروں کے دلوں میں اس انکار کو داخل کر دیا ہے۔" نیز فرمایا: ﴿ وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ ﴾ [سبا: ٥٤] "ان کی چاہتوں اور ان کے درمیان پردہ حائل کر دیا گیا۔" امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قیامت کے دن یہ تکذیب ان پر حسرت ہوگی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[2] امام ابو مالک رحمہ اللہ نے کہا: حسرت ہے، یعنی ندامت۔[3] حالاں کہ یہ حق الیقین، یعنی سچی خبر ہے اس میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں ہے۔ پھر نبیِ مکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم اس کی تسبیح کرو جس نے یہ قرآنِ کریم تم پر اتارا ہے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿ تَقَوَّلَ ﴾ بات بنانے والے کو کہتے ہیں۔ افتراء کا نام "تقول" ہے، اس لیے کہ یہ ایک قولِ متکلف ہوتا ہے اور ہر دروغ گو اپنے جھوٹ کو بنا کر کہتا ہے۔ "أقاویل"، قول کی جمع ہے۔ اقوالِ متقولہ کو "أقاویل" از راہِ تصغیر وتحقیر کہتے ہیں۔ یعنی اگر محمد ﷺ یا جبریل علیہ السلام اس کلام کو اپنی طرف سے بنا کر لاتے تو ان کا دستِ راست پکڑ لیتے۔ لوگوں کی عادت ہے کہ جس کو سزا دینا چاہتے ہیں اس کو ذلیل کرنے کے لیے اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔ امام فراء، مبرد، زجاج اور ابن قتیبہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یمین سے مراد قوت وقدرت ہے۔[5] یہی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔[6] قوت کی جگہ یمین اس لیے کہا ہے کہ ہر شے کی قوت میامن میں ہوتی ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہم اس کو بہ طور صبر قتل کرتے جس طرح کہ ملوک اپنے جھٹلانے والے کے ساتھ غصے اور انتقام کی جلدی

---

[1] تفسير الطبري (٢٣/٥٩٣، ٥٩٤) تفسير ابن كثير (ط٤/٥٣٦)
[2] تفسر الطبري (٢٣/٥٩٥)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٧٢)
[4] تفسير ابن كثير (٤/٥٣٦)
[5] فتح القدير (٥/٣٨٠)
[6] الدر المنثور (٨/٢٧٦)

کرتے ہیں، یا اس سے مراد ازلال واہانت ہے۔

"وتین" ایک رگ ہے جو پشت سے چل کر دل سے آ ملی ہے اور مناطِ قلب ہے، اگر اس کو کاٹ ڈالیں تو آدمی مر جائے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا: مفسرین کہتے ہیں وہ نیاطِ قلب ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رگِ قلب ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: رسنِ قلب ہے پشت میں، اس کو نخاع بولتے ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: علباء و حلقوم کے درمیان ایک رگ ہے۔ گردن کے پٹھے کو علباء کہتے ہیں۔[2] یہ کہنا کہ ہمیں معلوم ہے کہ بعض تمھارے اس قرآن کو جھٹلاتے ہیں ایک بڑی حسرت اور ندامت ہوگا جب کہ وہ مومنین کے ثواب کا مشاہدہ کریں گے۔ یا یہ حسرت دنیا میں ہے کہ وہ اس کا معارضہ نہ کر سکے اور قرآن کی طرح کی کوئی سورت نہ لا سکے۔ یہ قرآن بعینہ حق الیقین ہے، اس لیے کہ اللہ کے پاس سے آیا ہے اور اس کے اردگرد شک وشبہہ راہ نہیں پاتا۔ یقین کی اضافت حق کی طرف صفت کی موصوف کی طرف اضافت ہے اور حق الیقین علم الیقین سے بڑھ کر ہے۔[3]

---

[1] فتح القدير (٣٨٠/٥) [2] تفسير القرطبي (٢٧٦/١٨) [3] فتح البيان (٣٠٢/١٤-٣٠٤)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ

اس کو سورۃ المعارج بھی کہتے ہیں، اس کی چوالیس (۴۴) آیات ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بالاتفاق مکہ میں اتری ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: «نَزَلَتْ بِمَكَّةَ»۔ ''یہ مکہ میں اتری ہے۔'' یہی قول سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا بھی ہے۔[2]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾
مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ؕ﴿۳﴾ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ
اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ﴿۴﴾ فَاصْبِرْ
صَبْرًا جَمِيْلًا ﴿۵﴾ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۙ﴿۶﴾ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ؕ﴿۷﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

ایک سائل نے عذاب مانگا جو واقع ہونے والا ہے ① کافروں پر، کوئی اسے ٹالنے والا نہیں ② اس اللہ کی طرف سے جو اونچے درجوں والا ہے ③ فرشتے اور روح (جبریل) اس کی طرف چڑھیں گے ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے ④ تو (اے نبی!) آپ صبرِ جمیل سے کام لیجیے ⑤ بے شک وہ (لوگ) اس کو دور دیکھتے ہیں ⑥ اور ہم اسے قریب دیکھتے ہیں ⑦

قیامت کے جلد واقع ہونے کا مطالبہ:

یعنی پیغمبر نے تم پر عذاب مانگا ہے، وہ کسی سے نہ ہٹایا جائے گا اور پچاس ہزار برس کا دن قیامت کا ہے۔ اس وقت سے لے کر جب سے قبروں سے نکلیں اس وقت تک جب تک دوزخ و بہشت بھر چکے۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ

① تفسیر القرطبي (۲۷۸/۱۸) ② الدر المنثور (۲۷۷/۸)

﴿وَعْدَهٗ﴾ [الحج: ٤٧] ’’اور عذاب کو آپ سے جلدی طلب کر رہے ہیں، اللہ ہرگز اپنا وعدہ نہیں ٹالے گا۔‘‘ وعدے سے مراد عذاب ہے جو لامحالہ واقع ہوگا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ کفار کا سوال عذاب کے لیے ہے اور وہ ہونے والا ہے۔ یہ سائل نضر بن حارث بن کلدہ تھا۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یہ ان کا قول ہے: ﴿اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾[2] [الأنفال: ٣٢] ’’اے اللہ! اگر یہ قرآن آپ کی طرف سے واقعی ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر کوئی دردناک عذاب واقع کر دے۔‘‘ ’’واقع‘‘ سے مراد یہ ہے کہ وہ عذاب کفار کے لیے تیار ہے، اللہ جب اس کو واقع کرنا چاہے گا تو کوئی اس کو دفع نہ کر سکے گا۔ ﴿ذِي الْمَعَارِجِ﴾ سے مراد ’’ذو الدرجات‘‘ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی علو (بلندی) وفواضل ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد آسمان کی سیڑھیاں ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی فواضل ونعم والا۔[3]

﴿ذِي الْمَعَارِجِ﴾ کی تفسیر:

’’عروج‘‘ سے مراد صعود ہے، یعنی اوپر کو چڑھنا۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا: روح اللہ کی ایک مخلوق ہے جو انسان کے مشابہ ہے اور انسان نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: یہ احتمال ہے کہ روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہوں اور یہ عطف خاص کا عام پر ہو۔ یا بنی آدم کی ارواح کے لیے اسمِ جنس ہے، کیوں کہ قبض ہو جانے کے بعد ارواح آسمان پر چڑھتے ہیں[4] جس طرح کہ امام احمد و ابو داود و نسائی و ابن ماجہ کے نزدیک براء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے اور یہ حدیث جو ارواحِ طیبہ کے قبض کرنے کے بارے میں ہے: « فَلَا يَزَالُ يُصْعَدُ بِهَا مِنْ سَمَاءٍ إِلَى سَمَاءٍ حَتَّى يُنْتَهَى بِهَا إِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ »[5] ’’اسے ایک آسمان سے دوسرے آسمان کی طرف لے جایا جاتا ہے، حتی کہ اسے ساتویں آسمان تک پہنچا دیا جاتا ہے۔‘‘ (الحديث بطوله) اس حدیث کے بعض رجال میں تکلم کیا گیا ہے لیکن مشہور ہے اور اس کا شاہد احمد، ترمذی اور ابن ماجہ کے نزدیک ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے۔[6] (وهذا إسناد رجاله على شرط الجماعة)

پچاس ہزار سال کے دن سے کیا مراد ہے؟

یہ ارشاد کہ وہ پچاس ہزار برس کا دن ہوگا، اس میں چار قول ہیں: ایک یہ کہ اس سے مراد وہ فاصلہ ہے جو عرشِ عظیم سے لے کر اسفل سافلین تک، یعنی ساتویں زمین کی قرارگاہ تک ہے۔ یہ پچاس ہزار برس کا رستہ ہے۔ یہ

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٤٩٨) [2] تفسير الطبري (٢٣/٥٩٦) [3] تفسير الطبري (٢٣/٦٠٠)
[4] تفسير ابن كثير (٤/٥٣٧) [5] مسند أحمد (٤/٢٨٧)
[6] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦٢) مسند أحمد (٢/٣٦٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٩٦٨)

عرش کی بلندی ہے اس مرکز سے جو ساتویں زمین کے وسط میں ہے۔ اسی طرح عرشِ عظیم کا اتساع (وسعت) ایک قطر سے دوسرے قطر تک پچاس ہزار سال کا ہے اور عرش سرخ یاقوت کا ہے۔ (كما ذكره ابن أبي شيبة في كتاب صفة العرش) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ امرِ الٰہی کا منتہیٰ سب سے نچلی زمین سے لے کر منتہائے امر فوق سماوات پچاس ہزار سال کا ہے، مراد آسمان سے زمین تک نزولِ امر ہے اور زمین سے آسمان تک ایک دن میں، اس کی مقدار ایک ہزار سال ہے، کیوں کہ زمین سے آسمان تک پانچ سو سال کی راہ ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو مجاہد رحمہ اللہ کا قول کہا ہے۔[1] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں موٹائی ہر زمین کی پانچ سو سال کی راہ ہے اور ایک زمین سے دوسری زمین تک اسی طرح فاصلہ ہے، یہ سب سات ہزار سال ہوئے اور موٹائی ہر آسمان کی پانچ سو برس کی راہ ہے اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک پانچ سو سال کی راہ ہے، یہ سب چودہ ہزار برس ہوئے اور ساتویں آسمان اور عرش کے درمیان چھتیس (۳۶) ہزار سال کی راہ ہے، یہ سب پچاس ہزار سال ہوئے۔[2] فذلك قوله تعالى: ﴿ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴾

دوسرا قول یہ ہے کہ اس مقدار سے مراد اس دنیا کے بقا کی مدت ہے، جب سے اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو پیدا کیا، اس وقت سے لے کر جب تک کہ قیامت قائم ہو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دنیا کی عمر پچاس ہزار سال ہے، اس عمر کا نام اللہ تعالیٰ نے ایک دن رکھا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دنیا اول سے آخر تک پچاس ہزار سالہ ہے کوئی نہیں جانتا کہ کتنی مدت گزری اور کتنی باقی ہے سوائے اللہ عزوجل کے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ یومِ فاصل ہے دنیا و آخرت کے درمیان، لیکن یہ بات نہایت غریب ہے۔ امام محمد بن کعب رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''وہ دنیا و آخرت کے درمیان فصل ہے۔'' چوتھا قول یہ ہے کہ یہ دن قیامت کا دن ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اسی طرح کہا ہے۔ (وإسناده صحيح) امام عکرمہ، ضحاک اور ابن زید رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[3]

یہ دن کفار پر پچاس ہزار برس کے برابر ہو جائے گا۔ اس بارے میں احادیث آئی ہیں: سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ یہ پچاس ہزار برس کا دن بہت ہی لمبا ہوگا۔ فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! وہ مومن پر اس فرض نماز سے بھی ہلکا ہوگا جو وہ دنیا میں پڑھتا تھا۔[4] (رواه أحمد و ابن جرير) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جو کوئی اونٹ رکھتا ہے عسر و یسر میں، ان کا حق ادا نہیں کرتا، وہ قیامت کے دن خوب موٹے تازے ہو کر آئیں گے اور اس شخص کو ایک چٹیل میدان میں اپنے اخفاف سے پامال کریں گے،

---

1. تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۷۳/۱۰) تفسير الطبري (٦٠١/٢٣) 2. تفسير ابن أبي حاتم (۳۳۷۳/۱۰) تفسير ابن كثير (٥٣/٤)
3. تفسير الطبري (٦٠١/٢٣، ٦٠٢) تفسير ابن كثير (٥٣٨/٤)
4. مسند أحمد (٧٥/٣) تفسير الطبري (٦٠٢/٢٣) اس کی سند میں ''دراج عن ابی الہیثم'' ضعیف راوی ہے۔

جب آخر تک پہنچ جائیں گے، تب پھر اول سے شروع کریں گے، یہ اس دن ہوگا جو پچاس ہزار برس کا ہے، یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ ہو اور وہ اپنا راستہ دیکھے، پھر اسی طرح گائیوں اور بکریوں والے کے متعلق فرمایا۔[1]

(الحديث. رواه أحمد و النسائي و أبو داود)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی دوسری حدیث کنز (خزانے، مال و دولت) کے مالک کے بارے میں ہے، اس کے ماتھے، کروٹ اور پیٹھ کو آگ کے تختوں سے گرم کریں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان فیصلہ کرے وہ دن تمھاری گنتی کے مطابق پچاس ہزار سال کا ہوگا۔ پھر وہ اپنا راستہ جنت یا آگ کی طرف دیکھے گا۔[2] (رواه أحمد و مسلم) اس جگہ مراد یہ ہے کہ وہ دن پچاس ہزار سال کا ہوگا، ورنہ ان احادیث کا محل ''كتاب الزكاة'' ہے۔ کسی نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا تھا کہ یہ کون سا دن ہے؟ کہا: یہ دو دن ہیں جن کا ذکر اللہ نے کیا ہے اللہ ہی ان کو جانے۔ میں اللہ کی کتاب میں بغیر کچھ جانے ہوئے کچھ کہنا مکروہ سمجھتا ہوں۔[3]

مترجم کہتا ہے: حدیث میں مروی ہے کہ اللہ پاک نے تمام مخلوق کی تقدیروں کو آسمانوں اور زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار برس پہلے لکھا ہے اور پچاس ہزار دنیا کی عمر ٹھہری اور پچاس ہزار برس قیامت کا دن ہوگا۔ یہ سب ڈیڑھ لاکھ سال ہوئے، ان کی ابتداء اور انتہاء سوائے اللہ کے کوئی نہیں جان سکتا اور ازل و ابد کا سلسلہ اللہ ہی جانے اور اگر دنیا کے فنا ہونے اور قیامت کے قائم ہونے کا فاصلہ پچاس ہزار سال ٹھہرے تو یہ دو لاکھ برس ہوتے ہیں۔ واللّٰہ أعلم۔

رسول اللہ ﷺ کو صبر کرنے کا حکم:

اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو فرمایا کہ تو اپنی تکذیب پر اور ان کے عذاب کے لیے جلدی کرنے پر جس کو وہ بعید جانتے ہیں صبر کر، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ﴾ [الشورىٰ: ۱۸] ''اس کی جلدی ان کو پڑی ہے جو اسے نہیں مانتے اور جو اس پر یقین رکھتے ہیں وہ تو اس سے ڈر رہے ہیں انھیں اس کے حق ہونے کا پورا علم ہے۔'' اس لیے یہ فرمایا ہے کہ وہ عذاب کا واقع ہونا اور ساعت کا قائم ہونا بعید اور ناممکن سمجھتے ہیں اور اہل ایمان کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ قریب ہے اگرچہ اس کا وقت اور مدت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، لیکن جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہے اور لامحالہ واقعہ ہونے والی ہے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿ سَاَلَ ﴾ سوال سے ہے اور سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ﴿ سَآىِٕلٌ ﴾

---

[1] مسند أحمد (٤٨٩/٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٦٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٤٢)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٨٧) مسند أحمد (٢٦٢/٢) [3] تفسير الطبري (٦٠٣، ٦٠٢/٢٣)

[4] تفسير ابن كثير (٥٣٦/٤-٥٣٩)

جہنم میں ایک وادی کا نام ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے پڑھا ہے: "سَالَ سَيْلٌ"[1] یعنی وہ جنگل عذاب سے بہتا ہے۔ یہ سوال اللہ سے تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یا مسلمین سے۔ نضر بن حارث جس نے یہ سوال کیا تھا بدر کے دن بھوکا پیاسا مارا گیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اسی کے قائل ہیں اور امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابوجہل تھا۔[2] کسی نے کہا ہے کہ حارث بن نعمان فہری تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت کفارِ قریش کی ایک جماعت کے حق میں اتری ہے، لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سائل نوح علیہ السلام تھے، انھوں نے اللہ سے عذاب کا سوال کفار کے لیے کیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بد دعا کی۔ عذاب سے مراد یا تو دنیا کا عذاب ہے جو بدر کے دن ہوا یا آخرت کا عذاب ہے جو دوزخ میں ہوگا۔

اللہ ﴿ذِي الْمَعَارِجِ﴾ ہے یعنی درجات کا صاحب ہے جس پر فرشتے چڑھتے ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد سماوات ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ معارج مخلوق پر اللہ کی نعمتیں ہیں۔ یا مراد عظمت ہے یا غرف (بالا خانے) یا اعمالِ صالحہ ہیں جو سنت کے آداب، خلوصِ نیت اور حضورِ قلب کے حساب سے متفاوت ہوتے ہیں۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے "ذِي الْمَعَارِجِ" پڑھا ہے۔[3] عروجِ ملائکہ سے مراد صعود، یعنی اوپر چڑھنا ہے۔ روح، جبریل علیہ السلام ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾ [الشعراء: ١٩٣] "اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے۔" یا اور کوئی فرشتہ، یا قبض کیے جانے کے بعد میت کی روح ہے اور پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔

﴿يَوْمٍ﴾ سے مراد دنیا کی عمر یا روزِ قیامت ہے، یعنی اگر اس دن کا متولی اللہ کے سوا کوئی اور ہوتا تو وہ دن پچاس ہزار برس کے برابر ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ ایک ساعت میں فارغ ہو جائے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ بندوں کی حساب کے لیے ٹھہرنے کی مدت اس قدر ہے۔ پھر اہلِ جنت، جنت میں اور اہلِ نار، نار میں جا رہیں گے، یا کفار پر یہ دن اس قدر دراز اور مومنین پر ظہر اور عصر کے درمیانی وقت کے برابر ہوگا، یا یہ شدائد اور سختیوں کے لحاظ سے صرف تمثیل ہے۔ عرب شدت کے دنوں کی صفت طول سے اور فرحت کے ایام کا ذکر اور صفت قصر سے کرتے ہیں۔ یومِ قصیر کی تشبیہ ابہامِ قطاۃ (مرغ) سے اور یومِ طویل کی تشبیہ ظلِ رمح (تیروں کا سائے) سے دیتے ہیں، اس صورت میں دنی تضاد اس آیت اور اس آیت میں نہیں ہے۔

﴿فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ اس لیے کہ اس کا سیاق بھی بر سبیلِ تشدید کفار پر ہے، یا کلام میں تقدیم تاخیر ہے: "أَيْ: لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ مِنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ" سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے: «مَا قَدْرُ طُولِ

[1] فتح القدير (٣٨٢/٥) [2] تفسير القرطبي (٢٧٨/١٨، ٢٧٩) [3] تفسير القرطبي (٢٨١/١٨)

يَوْمِ الْقِيَامَةِ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِلَّا كَقَدْرِ مَا بَيْنَ الظُّهْرِ إِلَى الْعَصْرِ »[1] (أخرجه ابن أبي حاتم والحاكم والبيهقي في البعث) ”مومنوں کے لیے قیامت کے دن کا وقت ظہر وعصر کے درمیانی وقت کے برابر ہوگا۔“ اگر حقیقت عدد مراد ہو تو عقل میں نہیں آتا کہ ایک ہی زمانے کی مقدار پچاس ہزار سال، ایک ہزار سال اور دو رکعت نماز کے برابر ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ حقیقتِ عدد ہی مراد ہے۔ قیامت کے دن پچاس موقف ہوں گے ہر موقف ہزار برس کا ہوگا۔ واللہ أعلم

بعض نے کہا: ملائکہ جب اسفلِ عالم سے عرش کی طرف جاتے ہیں تو یہ مسافت پچاس ہزار برس کی ہے اور اگر ہم اس زمین سے جس پر ہم ہیں آسمانِ دنیا کے اندر تک جائیں تو یہ ایک ہزار سال کی مسافت ہے۔ سورۃ السجدہ میں دونوں آیتوں کے درمیان جمع کی وجہ گزر چکی ہے۔[2] صبرِ جمیل وہ ہے کہ اس میں غیر اللہ کے سامنے شکوہ نہ ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ کوئی مصیبت زدہ قوم میں موجود ہو اور کوئی نہ جانے کہ وہ مصیبت زدہ ہے۔ یہ کافر اس واقع ہونے والے عذاب کو یا قیامت کے دن کو یا اس پچاس ہزار سال کے دن کو بعید سمجھتے ہیں، یعنی اس پر ایمان نہیں رکھتے اور ہم اس کو قریب دیکھتے ہیں یا ہماری قدرت میں ایسا ہونا کچھ مشکل بات نہیں ہے۔[3]

يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ ﴿٨﴾ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ﴿٩﴾ وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ﴿١٠﴾ يُبَصَّرُونَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ﴿١١﴾ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ﴿١٢﴾ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ﴿١٣﴾ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنجِيهِ ﴿١٤﴾ كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ﴿١٥﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ ﴿١٦﴾ تَدْعُو مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ﴿١٧﴾ وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ ﴿١٨﴾

جس دن آسمان پگھلے تانبے جیسا ہوگا (8) اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون جیسے ہو جائیں گے (9) اور کوئی جگری دوست کسی جگری دوست کو نہ پوچھے گا (10) حالاں کہ وہ انھیں دکھلا بھی دیے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کاش! عذاب سے (بچنے کو) اپنے بیٹے فدیے میں دے دے (11) اور اپنی بیوی اور اپنا بھائی (12) اور اپنا خاندان جو اسے پناہ دیتا تھا (13) اور جتنے زمین پر ہیں سب، پھر وہ (فدیہ) اسے نجات دلا دے (14) ہرگز نہیں! بے شک وہ بھڑکتی آگ ہے (15) چمڑیاں ادھیڑ دینے والی (16) وہ (ہر) اس شخص کو پکارے گی، جس نے پیٹھ پھیری اور (حق سے) منہ موڑا (17) اور (مال) جمع کیا اور سینت سینت کر رکھا (18)

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٠٤٩/٩) مستدرك الحاكم (١٥٨/١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨١٩٣)

[2] رقم الآية (٣) [3] فتح البيان (٣٠٧/١٤-٣١٢)

قیامت کی ہولناکیوں کا ذکر:

سب نظر آجائیں گے، یعنی دوستی ان کی نکمی تھی۔ انتھی.[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عطا، سعید بن جبیر، عکرمہ، سدی اور کئی ایک اہلِ علم رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ”مُھْلٌ“ سے مراد یہ ہے کہ جیسے تیل کی تلچھٹ اور ”عِھْنٌ“ سے مراد دھنی ہوئی اون ہے۔ یہی امام مجاہد، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ کا قول ہے۔ اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴾ [القارعة: ٥] ”پہاڑ دھنے ہوئے رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے۔“ کوئی یار کسی یار کا حال نہ پوچھے گا۔ ایک قریبی دوسرے قریبی کو بہت برے حال میں دیکھے گا۔ اپنے نفس کے شغل (پریشانی، مصروفیت) کی وجہ سے اپنے غیر سے سوال نہ کرے گا کہ تو کس حال میں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بعض کو بعض پہچانے گا اور آپس میں شناخت ہو گی، پھر ایک دوسرے سے بھاگے گا: ﴿ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَىِٕذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴾[1] [عبس: ٣٧] ”ان میں سے ہر ایک کو اس دن ایسی فکر (دامن گیر) ہو گی جو اس کے لیے کافی ہو گی۔“ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ۚ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ﴾ [لقمن: ٣٣] ”لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اس دن کا خوف کرو جس دن باپ اپنے بیٹے کو کوئی نفع نہ پہنچا سکے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کا ذرا سا بھی نفع کرنے والا ہو گا (یاد رکھو) اللہ کا وعدہ سچا ہے۔“

نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ﴾ [الفاطر: ١٨] ”اگر کوئی گراں بار دوسرے کو اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے بلائے گا تو وہ اس میں سے کچھ بھی نہ اٹھائے گا گو قرابت دار ہی ہو۔“ نیز اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: ﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَاۤ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَىِٕذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴾ [المومنون: ١٠١] ”پس جب صور پھونک دی جائے گا اس دن نہ تو آپس کے رشتے ہی رہیں گے، نہ آپس کی پوچھ گچھ۔“ نیز اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح: ﴿ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَىِٕذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴾ [عبس: ٣٤- ٣٧] ”اس دن آدمی اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا۔ ان میں سے ہر ایک کو اس دن ایسی فکر (دامن گیر) ہو گی جو اس کے لیے کافی ہو گی۔“ اس دن اس سے کوئی فدیہ قبول نہ ہو گا، اگرچہ سارے اہلِ زمین کو لے آئے اور پیارے سے پیارا مال، زمین بھر کے مثلاً سونا دے یا اولاد کو جو دنیا میں جگر کا ٹکڑا تھی پیش کرے، ہولناکیوں کو دیکھ کر اپنا آپ عذاب سے چھڑوانا چاہے گا مگر اس کی پذیرائی نہ ہو گی۔ فَنَسْأَلُ اللّٰهَ الْعَافِيَةَ.

[1] تفسير الطبري (٢٣/٦٠٤) تفسير ابن كثير (٥٤٠)

امام مجاہد اور سدی ؒ نے کہا ہے کہ ”فَصِيْلَةٌ“ سے مراد قبیلہ و عشیرہ ہے۔[1] امام عکرمہ ؒ نے کہا ہے کہ ”فَصِيْلَةٌ“، اس کی فخذ (ران) ہے۔ امام مالک ؒ نے کہا ہے کہ ماں ہے۔ نار کا وصف کیا کہ وہ ﴿ لَظٰى ﴾ ہے، یعنی سخت گرم۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد ؒ نے کہا: ”شَوٰى“ سے مراد سر کی کھال یا کھال اور کھوپڑی ہے۔ امام مجاہد ؒ نے کہا: وہ گوشت جو ہڈی کے نزدیک ہے۔ امام سعید بن جبیر ؒ نے کہا: پٹھا ہے۔ ابو صالح ؒ نے کہا ہے کہ ہاتھوں اور پاؤں کی اطراف ہیں، یا دونوں پنڈلیوں کا گوشت ہے۔ امام حسن بصری اور ثابت بنانی ؒ نے کہا ہے کہ مکارمِ وجہ، یعنی چہرے کی بزرگی ہے۔ امام حسن ؒ نے کہا ہے کہ آگ اس کی ہر چیز کو جلا دے گی فقط ایک دل باقی رہے گا جس سے وہ چلائے گا۔

امام قتادہ ؒ نے کہا ہے کہ ”شَوٰى“ کا سئہ سر، مکارمِ وجہ اور حلق اور اطراف ہیں۔ امام ضحاک ؒ نے کہا ہے کہ کھال کو ہڈی سے جدا کر دے گی، کوئی شے باقی نہ رہے گی۔ امام ابن زید ؒ نے کہا ہے کہ شوی آرابِ عظام ہیں۔[2] وہ ہڈیوں کو کاٹ دے گی، پھر ان کی کھال بدلی جائے گی۔ نار اپنے ابناء کو جو اس کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور یہ ٹھہر چکا ہے کہ وہ اس دارِ دنیا میں نار والوں کے اعمال کریں گے، ان کو قیامت کے دن درد اور بے چینی کی آواز سے پکارے گی، پھر اہلِ محشر کے درمیان میں سے ان کو ایسے چن لے گی جس طرح پرندہ دانے کو اٹھا لیتا ہے، کیوں کہ جس طرح اللہ نے کہا ہے: وہ دل سے جھٹلانے والے اور اپنے جوارح سے عمل کو ترک کرنے والے تھے، مال کو جمع کرتے تھے، بعض کو بعض پر رکھتے اور بند کرتے اور اس میں سے اللہ تعالیٰ کا حق نہ دیتے، زکات اور واجب نفقات کا حق نہ نکالتے تھے۔ حدیث میں آیا ہے: «وَلَا تُوْعِيْ فَيُوْعِيَ اللّٰهُ عَلَيْكِ»[3] عبداللہ بن عکیم ؒ کبھی کھیسہ بند نہ کرتے اور کہتے: میں نے اللہ کو سنا ہے، فرماتا ہے: ﴿ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴾ امام حسن بصری ؒ کہتے تھے: اے ابن آدم! تو نے سنا اللہ کی وعید کو اور پھر تو دنیا کو جمع کرتا ہے۔ امام قتادہ ؒ نے کہا ہے کہ ﴿ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴾ سے مراد ممنوع کا جمع کرنا ہے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے: ”مُهْلٌ“ پگھلے ہوئے تانبے کو کہتے ہیں اور سیسے اور چاندی کو۔ امام مجاہد ؒ نے کہا ”مُهْلٌ“ پیپ ہے صدید اور خون کی۔ ”عِهْنٌ“ رنگی ہوئی اون کو کہتے ہیں اور جو اون رنگی ہوئی نہ ہو وہ ”عِهْنٌ“ نہیں ہے۔ امام حسن ؒ نے کہا ہے کہ پہاڑ سرخ صوف کی طرح ہو جائیں گے۔ یہ اون بہت کمزور ہوتی ہے۔[5] یا مراد

[1] تفسير الطبري (٦٠٦/٢٣)
[2] تفسير الطبري (٦٠٩،٦٠٨/٢٣) تفسير ابن كثير (٥٤٠)
[3] صحيح البخاري (١٣٢٧) صحيح مسلم (١٠٢٩)
[4] تفسير الطبري (٦١٠/٢٣) تفسير ابن كثير (٥٤١،٥٤٠/٤)
[5] تفسير القرطبي (٢٨٤/١٨)

پہاڑوں کا رنگ برنگ ہو جانا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ جُدَدٌۢ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُوْدٌ ﴾ [الفاطر: ۲۷] ''مختلف حصے ہیں سفید اور سرخ کہ ان کی بھی رنگتیں مختلف ہیں اور بہت گہرے سیاہ۔'' سو جب پہاڑ گالا ہو کر ہوا میں اڑیں گے تو رنگی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے جس کو ہوا اڑائے پھرے۔

یہ ''عِهْنٌ'' کے معنی از روئے لغت ہیں اور پہلے پہل پہاڑ ریت کی طرح ہوں گے، پھر صوف کی طرح، پھر ''هباء منثور'' (پھیلا ہوا گرد وغبار) کی طرح۔ ﴿ حَمِيْمٌ ﴾ سے مراد قریبی رشتے دار ہے۔ سخت ہولنا کیوں کی وجہ سے کوئی رشتے دار کسی رشتے دار کا حال نہ پوچھے گا۔ وہ ہولنا کیاں قریبی رشتہ دار کو قریبی سے، خلیل کو خلیل سے غافل کر دیں گے، حالاں کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھیں گے۔ کوئی کسی سے مخفی نہ ہوگا۔ قیامت میں ہر مخلوق آمنے سامنے ہوگی، لیکن کوئی کسی سے بات نہ کرے گا اور نہ سائل ہوگا، اس لیے کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کافروں کو آگ میں وہ لوگ دکھائے گا، جنھوں نے دنیا میں ان کو گمراہ کیا تھا۔[1] یہ وہ بڑے بڑے سردار ہوں گے جن کی پیروی کی جاتی تھی، یا مراد فرشتے ہیں کہ وہ لوگوں کو پہچانیں گے۔ اس دن ہر کافر یا گناہ گار جس نے دوزخ کے لائق کام کیا ہے یہ چاہے گا کہ کسی طرح سے بھی اپنے آپ کو اس عذاب سے بچائے اگرچہ ایسا اپنی بیوی، بچے، بھائی بند دے کر ہی ہو سکے اور اپنی قوم وقبیلہ کو پیش کر کے چھوٹ جائے، اگر ان کا فدیہ لے لیا جائے۔

''فَصِيْلَةٌ'' سے مراد ''عَشِيْرَةٌ'' ہے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''فَصِيْلَةٌ''، قبیلہ سے کم تر ہے۔ ثعلب نے کہا ہے کہ آباء واجداد قریبی ہیں۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جسم کے اعضاء ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پرورش کرنے والے ہیں،[2] لیکن رہائی کب ہو سکتی ہے، وہ تو ایک تپتی ہوئی آگ ہے۔ ﴿ لَظٰى ﴾ جہنم کا دوسرا طبقہ ہے۔ ''شَوَى'' بہ معنی مفاصل ہے۔ (قاله الكسائي) یا بہ معنی دماغ یا انسان کی کھال ہے۔ یہ آگ اس کو بلاتی ہے جس نے دنیا میں حق سے پشت پھیری تھی اور روگرداں ہوا تھا۔ وہ کہے گی: ''إِلَيَّ يَا مُشْرِكُ، إِلَيَّ يَا مُنَافِقُ'' یا بلانے سے مراد ہلاک کرنا ہے، یا مراد یہ ہے کہ جہنم کے داروغہ پکاریں گے یا یہ تمثیل اور تخییل ہے حقیقتاً پکارنا نہ ہوگا۔ لیکن پہلا قول زیادہ مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی رو سے: ﴿ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ﴾ [ق: ۳۰] ''وہ جواب دے گی کیا کچھ اور زیادہ بھی ہے؟'' اور ظاہر الفاظ سے پھرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔ دنیا میں بھی پتھروں، درختوں اور جماد کا کلام کرنا ہو چکا ہے۔ پھر فرمایا کہ مال جمع کیا اور اس کو ظرف کے اندر بند کر کے رکھا اور خیر کے راستے میں خرچ نہ کیا اور نہ زکات دی۔[3]

---

[1] تفسیر القرطبي (۱۸/۲۸۶) [2] فتح القدير (۵/۳۸۵) [3] فتح البيان (۱۴/۳۱۲_۳۱۶)

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ﴿١٩﴾ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ﴿٢٠﴾ وَإِذَا
مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ﴿٢١﴾ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿٢٢﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ
دَائِمُونَ ﴿٢٣﴾ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّائِلِ
وَالْمَحْرُومِ ﴿٢٥﴾ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِينَ
هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ﴿٢٧﴾ إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ
مَأْمُونٍ ﴿٢٨﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿٢٩﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ
مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ
ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ﴿٣١﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ
رَاعُونَ ﴿٣٢﴾ وَالَّذِينَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ ﴿٣٣﴾ وَالَّذِينَ هُمْ
عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿٣٤﴾ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ﴿٣٥﴾

بے شک انسان کو بے صبر (تھڑ دِلا) پیدا کیا گیا⑲ جب اسے شر پہنچے تو گھبرا جاتا ہے⑳ اور
جب اسے خیر ملے تو نہایت روکنے والا (کنجوس) بن جاتا ہے㉑ مگر وہ نمازی ㉒ جو اپنی نماز
پر ہمیشہ قائم ہیں㉓ اور جن کے مالوں میں حق مقرر ہے㉔ سوالی اور محروم کا㉕ اور جو یومِ جزا
کی تصدیق کرتے ہیں㉖ اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں㉗ بے شک ان
کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں㉘ اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے
والے ہیں㉙ سوائے اپنی بیویوں یا اپنی لونڈیوں کے، پھر یقیناً ان پر کوئی ملامت نہیں㉚ پھر
جو کوئی اس کے علاوہ چاہے تو وہی حد سے گزرنے والے ہیں㉛ اور جو اپنی امانتیں اور اپنے
عہد نبھانے والے ہیں㉜ اور جو اپنی شہادتوں پر قائم ہیں㉝ اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے
ہیں㉞ وہی لوگ باغوں میں معزز ہوں گے㉟

انسان تھڑ دلا ہے:

اللہ تعالیٰ نے انسان کے حال کی خبر دی ہے کہ وہ اخلاق دنیہ پر مجبول ہوا ہے، یعنی اس کی خصلت میں ہے۔ "هَلُوْعٌ" کی تفسیر یوں فرمائی کہ برائی پہنچنے پر جزع کرتا ہے اور رعب کی شدت اور خوف کی کثرت سے اس کا دل پر قابو نہیں رہتا۔ اور اس شر کے بعد خیر حاصل ہونے سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اور جب اسے بھلائی پہنچتی ہے تو مال کو خرچ کرنے سے باز رہتا

ہے اور بخل کرتا ہے اور اس مال سے اللہ کا حق ادا نہیں کرتا۔ نہ زکات دیتا ہے نہ خیرات نکالتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «شَرُّ مَا فِي رَجُلٍ شُحٌّ هَالِعٌ وَجُبْنٌ خَالِعٌ» [1] (رواه أحمد وأبو داود) ''آدمی میں جو سب سے بری بات وہ بخل ہے جو انسان کو جزع فزع اور تنگی میں مبتلا کرتا ہے اور دل نکال دینے والی بزدلی ہے۔''

بے صبری سے بچ جانے والے خوش نصیب:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مگر نمازی لوگ، یعنی انسان اس حیثیت سے کہ قابلِ مذمت اوصاف کا حامل ہوتا ہے، اس ذمے سے وہ شخص بچ جاتا ہے جس کو اللہ بچاتا ہے اور توفیق دیتا ہے اور اسے خیر کی ہدایت کرتا ہے اور اس کے لیے ہدایت کے اسباب آسان کر دیتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں، نماز کے اوقات اور واجبات کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام مسروق اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا ہے۔[2] یا اس جگہ دوام سے مراد سکون اور خشوع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝﴾ [المومنون: ۱-۲] ''یقیناً ایمان والوں نے فلاح حاصل کر لی، جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔''

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے یہی کہا ہے اور یہ نماز طمانیت کے وجوب کی دلیل ہے،[3] اس لیے کہ جو شخص رکوع وسجود میں مطمئن نہیں ہوتا، وہ اپنی نماز پر دائم نہیں ہے، اس لیے کہ اس نے سکون نہیں کیا، بلکہ دو چار ٹکریں مار لیں جس طرح کوا چونچیں مارتا ہے، وہ ایسی نماز سے کبھی فلاح حاصل نہیں کرے گا۔ یا مراد وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی عمل کرتے ہیں تو اس پر دائم رہتے ہیں جس طرح کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ»۔[4] دوسرے الفاظ یہ ہیں: «مَا دَاوَمَ عَلَيْهِ صَاحِبُهُ»[5] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی کام کرتے تو اس پر ہیشگی فرماتے،[6] یعنی اس کو کیے جاتے چھوڑتے نہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے آیتِ باب کی تفسیر میں کہا ہے کہ دانیال علیہ السلام نے امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت میں کہا ہے: ''وہ ایسی نماز ادا کرتے ہیں کہ قومِ نوح وہ نماز پڑھتی تو غرق نہ ہوتی، قومِ عاد پڑھتی تو ان پر بے فائدہ ہوا نہ چھوڑی جاتی، قومِ ثمود پڑھتی تو ان کو چیخ کا عذاب نہ پکڑتا، سوتم نماز کو لازمی ادا کرو، اس لیے کہ وہ مومنوں کا ایک اچھا وصف ہے۔''[7]

پھر فرمایا: ان کے مال میں حاجت مندوں کے لیے حصہ ہے۔ اس کا بیان سورۃ الذاریات میں گزر چکا ہے۔[8]

''تصدیق یوم الدین'' سے مراد معاد وحساب وجزا پر ایمان لانا ہے، چنانچہ وہ اس شخص جیسا عمل کرتے ہیں جو ثواب کی امید رکھتا ہے، سزا سے ڈرتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ان کو اپنے رب کے عذاب کا خوف ہے، جو کوئی اللہ کے

---

[1] مسند أحمد (۳۰۲/۲) سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۵۱۱) صحيح الجامع، رقم الحديث (۳۷۰۹)
[2] مصنف ابن أبي شيبة (۲۸۰/۱) تفسير الطبري (۶۱۲/۲۳)
[3] تفسير الطبري (۶۱۲/۲۳) تفسير ابن كثير (۵۴۱/۴)
[4] صحيح البخاري (۶۰۹۹) صحيح مسلم (۲۸۱۸)
[5] صحيح البخاري (۶۰۹۷) صحيح مسلم (۷۸۲)
[6] صحيح مسلم، رقم الحديث (۷۴۶)
[7] تفسير الطبري (۶۱۲/۲۳)
[8] رقم الآية (۱۹)

حکم کو سمجھ لیتا ہے وہ امن میں نہیں ہوتا مگر اللہ کی امان سے۔ پھر فرمایا کہ اپنی شرم گاہ کو حرام سے باز رکھتے ہیں اور جس جگہ اللہ کا اذن نہیں ہے، وہاں سے بچاتے ہیں۔ بیبیوں اور کنیزوں کے پاس جانے پر کچھ ملامت نہیں، اس کے سوا حد سے بڑھنا ہے۔ سورت ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ [المومنون: ۱] میں اس مقام کی تفسیر مفصل گزر چکی ہے۔

پھر فرمایا کہ امانت میں خیانت نہیں کرتے، عہد شکنی نہیں کرتے، یہ مومنین کی صفتیں ہیں۔ ان سے الٹ منافقین کی صفتیں ہیں جس طرح کہ حدیث میں آیا ہے کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کہے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے، امانت رکھے تو خیانت کرے۔[1] دوسری روایت میں ہے کہ جب عہد کرے تو توڑ ڈالے، جب جھگڑے تو گالی بکے۔[2] شہادت پر قائم رہنے سے مراد یہ ہے کہ شہادت کی حفاظت کرتے ہیں۔ نہ زیادہ کریں نہ کم اور نہ پوشیدہ رکھیں۔ پھر نماز کی حفاظت کا ذکر کیا۔ یعنی نماز کے اوقات و ارکان و واجبات و مستحبات کی نگہبانی کرتے ہیں۔ کلام کا افتتاح اور اختتام نماز سے کرنا، اس بات پر دلیل ہے کہ نماز کا اہتمام منظور ہے اور اس کا شرف ظاہر کرنا ہے جس طرح کہ سورت ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ کے شروع میں گزر چکا ہے۔ لہٰذا وہاں یوں کہا تھا: ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ۱۰- ۱۱] ''یہی وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔'' اور یہاں یوں فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ یعنی جنت میں ان کا اکرام طرح طرح کی لذیذ اور مسرت بخش چیزوں کے ساتھ ہوگا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اس جگہ انسان سے مراد جنس ہے، اس لیے کہ وہ اپنے نفس سے مانوس اور اپنی خوبیوں کو دیکھنے والا اور اپنے رب اور دین کو بھولنے والا ہے۔ ''ھلع'' لغت میں شدید حرص اور بہت زیادہ جزع کو کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''ھلع'' ''شرہ'' ہے[3] یعنی حرص۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین کہتے ہیں کہ ''ھلعَ'' کی تفسیر جمع مابعد ہے کہ جب انسان کو فقر و حاجت و بیماری یا اس جیسی کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بہت زیادہ جزع کرتا ہے اور گھبرا جاتا ہے اور بے قرار ہوتا ہے اور جب تونگری یا ارزانی اور گنجایش آتی ہے تو مانع و ممسک، یعنی مال کو روک کر رکھنے والا ہو جاتا ہے۔ محمد بن عبداللہ بن طاہر نے ثعلب سے ''ھلع'' کے معنی پوچھے تھے۔ کہا کہ اللہ نے خود ہی تو اس کی تفسیر فرما دی ہے، اللہ کی تفسیر سے زیادہ روشن اور واضح کسی کی تفسیر نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ جب برائی پہنچے تو شدتِ جزع کا اظہار کرے اور جب بھلائی پہنچے تو بخل کرے، لوگوں کو نہ دے۔ امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا: ''ھلوع'' وہ ہے کہ بھلائی پہنچنے پر شکر نہ کرے اور برائی پہنچنے پر صبر نہ کرے۔[4]

---

[1] صحيح البخاري (٣٣) صحيح مسلم (٥٩)
[2] صحيح البخاري (٣٤) صحيح مسلم (٥٨)
[3] الدر المنثور (٢٨٤/٨)
[4] فتح القدير (٣٨٨/٥)

پھر اللہ تعالیٰ نے نمازیوں کو مستثنیٰ کیا، شرعی نماز ایمان کا لازمی جز ہے، یعنی نمازی لوگ ان صفاتِ ھلع وجزع ومنع پر نہیں ہوتے، بلکہ وہ صفاتِ محمودہ اور خصالِ مرضیہ (پسندیدہ خصلتیں) رکھتے ہیں، کیوں کہ ان کا ایمان اور توحید اور دینِ حق انھیں ان اوصافِ رذیلہ وخلالِ دنیہ سے منع کرتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ وہ نماز پر دائم ہیں، یعنی مواظبت رکھتے ہیں اور پابندی کرتے ہیں، کوئی شغل ان کو اس عبادت سے غافل نہیں کرتا اور نہ کوئی منہ پھیرنے والا اس سے منہ پھیرتا ہے یا سستی کرتا ہے، وہ نماز کو ادا وقضاء ترک نہیں کرتے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اپنا منہ قبلے کی طرف سے نہیں پھیرتے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد نفلی نماز ہے۔[1] امام نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد فرض نماز ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ وقت پر پڑھتے ہیں۔[3] سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نماز میں کسی اور طرف التفات نہیں کرتے۔ یہی قول سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا ہے۔[4] آیت سے مراد سارے مومنین ہیں نہ کہ صحابہ بالخصوص۔ امام قتادہ اور محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حقِ معلوم سے مراد زکاتِ مفروضہ ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زکات کا ماسوا ہے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ مراد صلہ رحمی ہے اور بوجھ کا اٹھانا۔ ظاہر اول ہے اس لیے کہ قرینِ نماز ہے۔

سائل وہ ہے جو لوگوں سے بھیک مانگتا ہے۔ محروم وہ ہے جو پارسائی کرتا ہے اور سوال سے بچتا ہے، اس کو لوگ غنی سمجھ کر محروم رکھتے ہیں: ﴿ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ﴾ [البقرۃ: ۲۷۳] ''نادان لوگ ان کی بے سوالی کی وجہ سے انھیں مال دار خیال کرتے ہیں۔'' سائل اور محروم کی تفسیر سورۃ الذاریات اور سورۃ المومنون میں گزر چکی ہے۔ ''یوم الدین'' سے مراد یومِ جزا ہے، یعنی قیامت کا دن جس میں کسی طرح کا شک نہیں کرتے اور نہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اپنے اعمال سے اس دن کی تصدیق کرتے ہیں۔ اپنی جانوں کو طاعات میں لقب دیتے ہیں، اس لیے کہ اس کی تصدیق سے یہ لازم آتا ہے کہ ''یوم الدین'' کے لیے اعمالِ صالح کرنے کے لیے استعداد پیدا کریں اور اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں باوجود اعمالِ طاعت کے، یعنی اس اطاعت کے مقابلے میں جو اُن پر واجب ہے اپنے اعمال کو حقیر جانتے ہیں، کیوں کہ ان کے رب کا عذاب مامون نہیں ہے، یعنی کسی کو یہ لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نڈر ہو جائے، کیوں کہ اگر وہ اطاعت میں کسی درجے تک کیوں نہ پہنچا ہو تو جائز ہو سکتا ہے کہ اس پر عذاب اترے۔ حق یہی ہے کہ ہر شخص کو ڈرنا چاہیے اور چاہیے کہ خوف اور رجا کے درمیان رہے۔

﴿ وَرَآءَ ذٰلِكَ ﴾ سے مراد بیویوں اور لونڈیوں کے ماسوا ہیں۔ یہ آیت متعہ کی اور مردوں اور جانوروں سے جنسی خواہش پوری کرنے، زنا اور مشت زنی کی حرمت کی دلیل ہے۔ اس کی تفسیر سورۃ المومنون میں گزر چکی ہے۔[6]

---

[1] تفسير القرطبي (۲۹۱/۱۸) [2] تفسير الطبري (۶۱۲/۲۳) [3] مصنف ابن أبي شيبة (۲۸۰/۱)
[4] تفسير الطبري (۶۱۲/۲۳) الدر المنثور (۲۸٤/۸) [5] تفسير القرطبي (۲۹۱/۱۸) [6] رقم الآية (۷)

امانت وعہد سے مراد جنس ہے۔ اس میں امانات عباد اور بندوں کے ساتھ کیے جانے والے عہود اور نذور اور ایمان داخل ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ امانات وہ ہیں جن پر عقل دلیل ہے اور عہود وہ ہیں جن پر شرع دلیل ہے۔ شہادت کو قائم کرنے سے یہ مراد ہے کہ حاکموں کے سامنے اچھی طرح سے گواہی دیتے ہیں ہر قریب و بعید کی اور بلند مرتبہ اور کمینے کی۔ گواہی دیتے وقت طاقت ور کو کمزور پر ترجیح نہیں دیتے اور گواہی کو چھپاتے نہیں اور نہ ہی بدلتے ہیں، دین میں پختگی اور مسلمین کے حقوق کے احیاء میں رغبت کے اظہار کی خاطر۔ سورۃ البقرہ میں شہادت کا ذکر گزر چکا ہے۔ صلات کی حفاظت سے مراد نماز کے ارکان و اذکار و شرائط کی حفاظت ہے کہ ان میں سے کسی چیز میں خلل نہیں ڈالتے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد وضو و رکوع و سجود ہیں۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد تطوع ہے[1] (حکم ماننا، فرض کے علاوہ نوافل و مستحبات ادا کرنا)۔ نماز کا ذکر دوبارہ کیا نماز کی فضیلت پر دلالت کے لیے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: ان صلوات میں مبالغات ہیں جو مخفی نہیں۔ یہ لوگ جو ان صفات کے ساتھ متصف ہیں یہ جنتوں میں طرح طرح کی کرامات کے ساتھ معزز اور مکرم ہوں گے۔[2]

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿٣٦﴾ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿٣٧﴾ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿٣٨﴾ كَلَّا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٩﴾ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿٤٠﴾ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿٤١﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿٤٢﴾ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ﴿٤٣﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿٤٤﴾

پھر (اے نبی!) کافروں کو کیا ہوا ہے کہ آپ کی طرف دوڑے آرہے ہیں؟ (36) دائیں سے اور بائیں سے گروہ کے گروہ (37) کیا ان میں سے ہر شخص طمع رکھتا ہے کہ اسے نعمتوں والی جنت میں داخل کیا جائے گا؟ (38) ہرگز نہیں! بے شک ہم نے انھیں اس چیز سے تخلیق کیا جسے وہ جانتے ہیں (39) پس میں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی قسم کھاتا ہوں، یقیناً ہم قادر ہیں (40) اس بات

[1] تفسير القرطبي (۲۹۲/۱۸) [2] فتح البيان (۳۱۶/۱۴-۳۲۰)

پر کہ (انھیں) بدل کر ان سے بہتر لے آئیں، اور ہم عاجز و مغلوب نہیں ﴿41﴾ چناں چہ آپ انھیں چھوڑ دیجیے وہ باتیں بنائیں اور کھیلیں حتی کہ اپنے اس دن سے دو چار ہوں، جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے ﴿42﴾ جس دن وہ قبروں سے دوڑتے نکلیں گے، جیسے وہ آستانوں کی طرف دوڑ رہے ہوں ﴿43﴾ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی، ان پر ذلت چھا رہی ہو گی۔ یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا ﴿44﴾

کافروں کی سرزنش:

جو کافر نبی اکرم ﷺ کے وقت میں موجود تھے اور آپ ﷺ کو اور وحی اور واضح معجزات کو دیکھتے تھے، اس کے باوجود سب کے سب بھاگ جاتے اور دائیں بائیں جدا ہو کر چل دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر انکار فرمایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿49﴾ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ ﴿50﴾ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ ﴾ [المدثر: ۴۹۔ ۵۱] ”انھیں کیا ہو گیا ہے؟ کہ نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں گویا کہ وہ بدکے ہوئے گدھے ہیں جو شیر سے بھاگے ہوں۔“ اسی طرح اس جگہ کہا کہ ان کافروں کو کیا ہوا ہے کہ یہ تیرے پاس سے نفرت کر کے چل دیتے ہیں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مُهْطِعِينَ ﴾ بہ معنی ”مُنْطَلِقِينَ“[1] ہے۔ اور ﴿ عِزِينَ ﴾ بہ معنی ”متفرقین“ ہے۔ مراد ان کا دائیں اور بائیں طرف متفرق ہو جانا ہے جس طرح کہ امام احمد رحمہ اللہ نے اہلِ اہواء و بدعت کے حق میں کہا تھا: وہ کتاب کے مخالف ہیں، کتاب میں مختلف ہیں اور کتاب کی مخالفت پر متفق ہیں۔

یہ ذکر امام احمد رحمہ اللہ کے وقت کا ہے اور اس وقت کتاب کے ساتھ سنت بھی آ ملی ہے کہ حدیث کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تجھ کو دائیں بائیں سے دیکھتے ہیں۔ ﴿ عِزِينَ ﴾ سے مراد لوگوں کی جماعت ہے کہ دائیں اور بائیں سے روگرداں ہو کر مذاق اور ٹھٹھا کرتے ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دائیں بائیں متفرق ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ آدمی کیا کہتا ہے،[2] یعنی نہ اللہ کی کتاب میں رغبت کرتے ہیں اور نہ اس کے رسول میں۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ باہر تشریف لائے، لوگوں کو حلقہ حلقہ بیٹھا دیکھ کر فرمایا: «مَا لِيَ أَرَاكُمْ عِزِينَ»[3] (رواه أحمد و مسلم و أبو داود والنسائي و ابن جرير)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنے اصحاب پر باہر نکلے وہ حلقہ حلقہ تھے۔ کہا: کیا ہے کہ میں تم کو پراگندہ دیکھتا ہوں؟ یعنی الگ الگ بیٹھے ہو مل کر نہیں بیٹھتے۔[4] (رواه ابن جرير) حافظ ابن کثیر کہتے ہیں: یہ

---

① تفسير الطبري (۲۳/٦۱۹) ② تفسير الطبري (۲۳/٦۱۹، ٦۲۰)

③ صحيح مسلم (۴۳۰) مسند أحمد (۵/۹۳) سنن أبي داود (۴۸۲۳) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/۴۹۸) تفسير الطبري (۲۳/٦۲۰)

④ تفسير الطبري (۲۳/٦۲۰)

عمدہ اسفاد ہے، میں نے اس سند سے کتبِ ستہ میں نہیں دیکھا۔ پھر اللہ نے کہا: کیا یہ لوگ یہ طمع رکھتے ہیں کہ جناتِ نعیم میں جائیں اور حالت یہ ہے کہ اللہ کے رسول سے بھاگتے ہیں اور حق سے گریز کرتے ہیں۔ نہیں، بلکہ ان کا ٹھکانا تو جہنم ہے، پھر قیامت کے واقع ہونے کا اور عذاب کا ثبوت دیا جس کے وہ منکر ہیں اور اس کا ہونا بعید جانتے ہیں اور اس دوبارہ زندہ ہونے کے معاملے میں مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا کرنے سے استدلال فرمایا کہ دوبارہ پیدا کرنا پہلی دفعہ کے پیدا کرنے سے آسان ہے۔ ان کو پہلی دفعہ پیدا کرنے کا اعتراف ہے، پھر وہ لوٹائے جانے کا انکار کیوں کرتے ہیں؟ ان کی پیدائش منی سے ہوئی ہے جو ایک ضعیف چیز ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴾ [المرسلات: ۲۰] ''کیا ہم نے تمھیں حقیر پانی سے (منی سے) پیدا نہیں کیا۔'' اور فرمایا: ﴿ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسٰنُ مِمَّ خُلِقَ ۞ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۞ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآىِٕبِ ۞ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۞ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآىِٕرُ ۞ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴾ [الطارق: ۵- ۱۰] ''انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے، وہ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے، بیشک وہ اسے پھیر لانے پر یقیناً قدرت رکھنے والا ہے جس دن پوشیدہ بھیدوں کی جانچ پڑتال ہوگی تو نہ ہوگا اس کے پاس کچھ زور نہ مددگار۔''

پھر اب مشارق و مغارب کی قسم کھائی، یعنی اس ذات پاک کی جس نے آسمان و زمین بنائے اور مشرق و مغرب ٹھہرائے اور تاروں کو مسخر کیا کہ وہ مشرق سے نکل کر مغرب میں غائب ہوتے ہیں۔ تقدیرِ کلام یہ ہے کہ جو تم سمجھتے ہو کہ قیامت اور حساب کتاب اور دوبارہ جی اٹھنا اور نشور نہیں ہے تو بات یوں نہیں بلکہ یہ سب کچھ ہونے والا ہے اور لا محالہ ہوگا یہ قیامت کے دن کی نفی کے متعلق ان کے زعمِ فاسد کا رد ہے، حالاں کہ یہ منکرین اللہ کی ایسی عظیم قدرت دیکھ چکے ہیں جو قیامت کے قائم کرنے سے بھی بڑھ کر ہے اور وہ زمین و آسمان کا پیدا کرنا اور ان دونوں کے درمیان جو مخلوقات ہیں ان کا مسخر کرنا ہے، جیسے: حیوانات، جمادات اور سب موجود چیزوں کی مختلف قسمیں۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [المؤمن: ۵۷] ''آسمان وزمین کی پیدائش یقیناً انسان کی پیدائش سے بہت بڑا کام ہے، لیکن (یہ اور بات ہے کہ) اکثر لوگ بے علم ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ؕ بَلٰۤى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [الاحقاف: ۳۳] ''کیا وہ نہیں دیکھتے کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے وہ نہ تھکا، وہ یقیناً مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے؟ کیوں نہ ہو وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۞ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [یٰسین: ۸۱- ۸۲] ''جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے کیا وہ ان جیسوں کے پیدا کرنے پر قادر نہیں، بے شک قادر ہے اور وہی تو پیدا کرنے والا دانا (بینا) ہے۔

وہ جب کبھی کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے اتنا فرما دینا (کافی ہے) کہ ہو جا، وہ اسی وقت ہو جاتی ہے۔‘‘

اس جگہ یوں کہا ہے کہ ہم بہتر ان سے بدل سکتے ہیں، یعنی قیامت کے دن ہم ان کا اعادہ اس سے بہتر بدنوں میں کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر شے پر حاوی ہے، ہم کچھ عاجز نہیں ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَلَّنْ نَجْمَعَ عِظَامَهُ ۝ بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَنْ نُسَوِّيَ بَنَانَهُ ﴾ [القيامة: ٣-٤] ’’کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع کریں گے ہی نہیں، ہاں ضرور کریں گے، ہم تو قادر ہیں کہ اس کی پور پور تک درست کر دیں۔‘‘ نیز فرمایا: ﴿ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ۝ عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾ [الواقعة: ٦٠- ٦١] ’’ہم ہی نے تم میں موت کو متعین کر دیا اور ہم اس سے ہارے ہوئے نہیں ہیں کہ تمھاری جگہ تم جیسے اور پیدا کر دیں اور تمھیں نئے سرے سے اس عالم میں پیدا کریں جس سے تم (بالکل) بے خبر ہو۔‘‘

امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ ہم کو اس بات پر قدرت ہے کہ ہم تم سے بہتر بدل میں لائیں[1] یعنی ایسی امت لائیں جو ہماری اطاعت کرے نافرمانی نہ کرے۔ اور اس آیت کو اس آیت کے مثل ٹھہرایا ہے: ﴿ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ﴾ [محمد: ٣٨] ’’اور اگر تم روگردان ہو جاؤ تو وہ تمھارے بدلے تمھارے سوا اور لوگوں کو لائے گا جو پھر تم جیسے نہ ہوں گے۔‘‘ لیکن پہلے معنی زیادہ ظاہر ہیں۔ دوسری آیات اس پر دلیل ہیں۔ واللہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم۔ پھر فرمایا: اے پیغمبر! تم ان کو چھوڑ دو ان کے کفر، تکذیب اور عناد میں، یہاں تک کہ یہ یوم موعود سے جا ملیں، یعنی کل کے دن ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اس جھٹلانے کا انجام کیا ہوا اور اپنے کیے کا وبال چکھیں گے۔

سَتَعْلَمُ لَيْلَى أَيَّ دِيْنٍ تَدَايَنَتْ وَأَيُّ غَرِيْمٍ فِي التَّقَاضِي غَرِيْمُهَا[1]

’’لیلیٰ کو عنقریب اپنے دین کا پتا چل جائے گا اور تقاضے میں اس کا غریم کیسا ہے وہ یہ بھی جان لے گی۔‘‘

اللہ تعالیٰ جب ان کو موقفِ حساب کی طرف بلائے گا تو قبروں سے جلد نکل پڑیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا: ﴿ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ ﴾ کے معنی ہیں: ”إِلَىٰ عَلَمٍ يَسْعَوْنَ“ یعنی گویا ایک نشان کی طرف دوڑے جاتے ہیں۔ امام ابو العالیہ اور یحییٰ بن کثیر رحمہما اللہ نے کہا: ”إِلَىٰ غَايَةٍ يَسْعَوْنَ إِلَيْهَا“[2] ﴿ نُصُبٍ ﴾ مصدر ہے ”منصوب“ کے معنی میں اور ﴿ نُصُبٍ ﴾ بہ معنی صنم ہے، یعنی موقف کی طرف وہ اس طرح سے جلدی کریں گے، جیسے: دنیا میں کسی بت خانے یا گرجا گھر کی طرف دوڑے جاتے تھے کہ سب سے پہلے کون پہنچ کر ڈنڈوت و استلام کرے۔ یہ قول امام مجاہد، یحییٰ اور ابن کثیر رحمہم اللہ سے مروی ہے۔ امام مسلم بطین، قتادہ، ضحاک، ربیع بن انس، ابی صالح، عاصم بن بہدلہ اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم بھی اسی کے قائل ہیں۔[3] ذلت کا چھا جانا جو فرمایا یہ اس تکبر کے مقابلے میں ہو گا جو وہ دنیا میں طاعت سے کرتے تھے۔ یہ دن وہ ہے جس کا ان کو وعدہ تھا۔

---

[1] تفسیر الطبري (٦٢٢/٢٣) [2] تفسیر الطبري (٦٢٤/٢٣، ٦٢٥) [3] تفسیر ابن کثیر (٥٤٤/٤)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿ مُهْطِعِيْنَ ﴾ بہ معنی "مُسْرِعِيْنَ" ہے، یعنی ان کو کیا ہوا ہے کہ یہ تیری طرف دوڑ کر آتے ہیں اور تیرے گرد بیٹھتے ہیں اور تیرے حکم کی تعمیل نہیں کرتے۔ یا تکذیب کی طرف جلدی کرتے ہیں اور استہزاء کرتے ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: تیری طرف نظر کرتے ہیں۔[1] ﴿ عِزِيْنَ ﴾ سے مراد جماعتیں ہیں۔ مفسرین نے کہا ہے کہ مشرکین کہتے تھے کہ اگر یہ لوگ جنت میں جائیں گے تو ہم ان سے پہلے بہشت میں داخل ہوں گے۔ اس پر یہ آیت اتری۔ پھر نشاۃِ اولیٰ سے نشاۃِ ثانیہ پر استدلال کیا۔ یا یہ معنی ہیں کہ ہم نے جس کام کے لیے ان کو پیدا کیا ہے، وہ اس کو جانتے ہیں، وہ کام حکم کو بجالانا اور جس کے بارے میں نہی کی جائے اس کام کو نہ کرنا ہے۔ اور نفس کو علم وعمل سے کامل کرنا ہے اور ثواب اور عقاب کے لیے معترض (پیش) ہونا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ [الذاريات: ٥٦] "میں نے جنات اور انسانوں کو صرف اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔"

امام ابن عربی رحمہ اللہ نے فتوحاتِ مکیہ میں فرمایا ہے کہ اللہ پاک نے انسان کو چار طرح بنایا: ایک وہ قسم ہے جو کسی نر اور مادہ سے نہیں ہیں، یہ آدم علیہ السلام ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو صرف نر سے ہے نہ کہ مادہ سے وہ حوا علیہا السلام ہیں۔ تیسری قسم وہ ہے جو فقط مادہ سے ہے وہ عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ چوتھی قسم وہ ہے جو نر اور مادہ دونوں سے ہے یہ سارے لوگ ہیں۔ انتھی۔ اور یہ سب اسی خاک کے پتلے ہیں، خاک میں گئے اور قیامت کے دن پھر اسی خاک سے نکلیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر دن کے مشرق ومغرب کی قسم کھائی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سورج کا ہر دن ایک مطلع ہے جس سے وہ نکلتا ہے اور ہر دن ایک مغرب ہے جس میں وہ ڈوبتا ہے۔ یہ مشرق ومغرب دوسرے روز کے مشرق ومغرب سے الگ ہے۔[2] یا مراد ہر تارے کا مشرق ومغرب ہے۔

یہ قسم اس بات پر کھائی کہ اگر ہم چاہیں تو ان منکرین سے بہتر لوگ بدل کر لے آئیں جو دنیا میں زبردست بڑے مال دار، بہت صاحبِ اولاد اور بہت عزت وجاہ اور خادموں والے ہوں اور ان سب کا دل ایک ہو۔ وہ تیری بات سنیں اور توقیر وتعظیم کریں اور جس بات سے تیرا سینہ کشادہ ہو، اسی کے لیے کوشاں ہوں۔ ان لوگوں کے عمل کے بدلے میں جو ہزء وتصفیق وتصفیر کرتے ہیں، یعنی مسخرا پن اور ٹھٹھا کرتے ہیں اور سینے کی تنگی کا باعث ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار اور تابعین بالاحسان میں یہی اوصاف رکھے تھے کہ ان کا رزق وسیع ہوگیا۔ کسریٰ اور قیصر کے خزانے ان کے ہاتھ آئے، زمین میں متمکن ہوئے، یہاں تک کہ دنیا کے بادشاہ ہو گئے اور ایسے عمل کیے جس سے آخرت کا ملک بھی ملا۔ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کرب دور کیا اور اُن کی رضا جوئی میں جان ومال فدا کر دیا۔

---

(1) تفسير القرطبي (١٨/٢٩٣) (2) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٧٤)

۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم کچھ اس کام کے کرنے میں مغلوب نہیں ہیں، بلکہ جو چاہیں وہ کر ڈالیں، مگر بات اتنی ہے کہ ہماری مشیت اور علم کا تقاضا ہے کہ سزا میں تاخیر کی جائے اور یہ کہ ہم ان کو دوسری مخلوق سے نہ بدلیں۔ سو اے رسول! تم ان کو ان کے باطل میں چھوڑ دو، یہ دنیا میں خوب لہو ولعب کر لیں اور تم اپنے کام میں مشغول ہو، کیوں کہ تمھارا فرض صرف پہنچا دینا ہے۔ یہ کفار کو تہدید ہے اور رسول اللہ ﷺ کو تسلی ہے۔ اس چھوڑ دینے کی ابتداء غرغرہ (موت کا وقت) ہے اور انتہاء نفخۂ ثانیہ ہے جس وقت کہ دونوں قسم کے لوگ اپنی اپنی جگہ پر قرار پکڑیں گے۔ امام بقاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت آیتِ سیف سے منسوخ ہے،[1] لیکن راجح یہ ہے کہ منسوخ نہیں ہے۔

"أجداث" جمع ہے "جدث" کی۔ "جدث" قبر کو کہتے ہیں۔ "سراع" جمع ہے "سریع" کی بہ معنی جلد باز۔ ابو عمرو رحمہ اللہ نے کہا: ﴿نُصُبٍ﴾ شبکہ صائد، یعنی شکاری کے جال کو کہتے ہیں۔ جب کوئی نخچیر جال میں گرفتار ہوتا ہے تو اس کی طرف دوڑ کر جاتے ہیں کہ کہیں وہ جال سے نکل نہ جائے۔[2] یا مراد علم یا رایہ، یعنی جھنڈا ہے۔ خشوع کہتے ہیں ذلت وخضوع کو ان پر ذلت چڑھی آتی ہوگی، اس لیے کہ جو کوئی دنیا میں حق سے تکبر وتعزز کرتا ہے، وہ آخرت میں ذلیل ہوگا اور جو حق کے سامنے متذلل (پست، ذلیل) ہوتا ہے، وہ وہاں معزز ہوگا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ذلت سے مراد روسیاہی ہے۔[3] یہ وہ دن ہے جس کا وعدہ رسولوں کی زبان پر دنیا میں دیا گیا تھا، اب وہ دن حاضر اور موجود ہو گیا اور جس عذاب کا وعدہ دیا گیا تھا، وہ واقع ہو گیا۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہی عذاب ہے جس کا سوال سورت کے شروع میں کیا تھا۔ اب سورت کے آخر میں بھی وہی بات دہرائی گئی ہے۔[4]

---

[1] نظم الدرر للبقاعي (١٥٩/٨) [2] اللباب في علوم الكتاب (٣٧٧/١٩)

[3] تفسير القرطبي (٢٩٧/١٨) [4] فتح البيان (٣٢٠/١٤ـ٣٢٥)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ نُوْحٍ

اس کی انتیس (۲۹) یا اٹھائیس (۲۸) آیتیں ہیں۔ مکہ میں اتری ہے۔ سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: "نَزَلَتْ بِمَكَّةَ" [1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ
قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ
لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲﴾ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۳﴾
يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ
اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَاۗءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بے شک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ تو اپنی قوم کو ڈرا، اس سے پہلے کہ انھیں دردناک عذاب آلے ① اس نے کہا: اے میری قوم! بے شک میں تمھیں کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں ② یہ کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ③ وہ گناہوں سے تمھاری مغفرت کرے گا اور تمھیں ایک مقرر وقت تک مہلت دے گا۔ بے شک جب اللہ کا مقرر وقت آجائے تو وہ مؤخر نہیں ہوتا۔ کاش! تمھیں علم ہوتا ④

نوح علیہ السلام کی اپنی قوم کو دعوت:

یعنی اللہ کی بندگی کرو، تاکہ دنیا میں قیامت تک نوعِ انسانی رہے اور قیامت کو دیر نہ لگے گی۔ اور اگر سب مل کر بندگی چھوڑ دو گے تو سارے ابھی ہلاک ہو جاؤ گے۔ ایسا طوفان آیا کہ ایک آدمی نہ بچا۔ نوح علیہ السلام کی اطاعت سے ان کا بچاؤ ہو گیا۔ انتہیٰ۔

---

[1] الدر المنثور (۲۸۸/۸)

اللہ پاک نے خبر دی کہ ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا کہ وہ قوم کو اللہ کی بلا اور آفت کے نازل ہونے سے پہلے ڈرا دیں، اگر وہ توبہ کر کے رجوع لائیں گے تو وہ بلا اُن سے اٹھ جائے گی۔ چناں چہ انھوں نے ایسا ہی کیا کہ کھول کر اپنی قوم سے کہہ دیا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اس سے ڈرو۔ حرام کردہ چیزوں کو چھوڑ و اور گناہوں سے بچتے رہو۔ امر و نہی میں میرا کہنا مانو، جب تم ایسے کام کرو گے تو اللہ تمھارے گناہ بخش دے گا۔

اس جگہ حرف ﴿ مِنۡ ﴾ زیادہ ہے، یا "عَنْ" کے معنی میں، یا تبعیض کے لیے آیا ہے۔ اجل کی تاخیر سے مراد لمبی عمر ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ طاعت و بر (نیکی) اور صلہ رحمی سے عمر بڑھتی ہے جس طرح کہ حدیث میں آیا ہے: « صِلَةُ الرَّحِمِ تَزِيْدُ فِي الْعُمْرِ »[1] "صلہ رحمی عمر میں اضافہ کرتی ہے۔" پھر فرمایا کہ طاعت اختیار کرنے میں جلدی کرو سزا کے آنے سے پہلے، اس لیے کہ جب اللہ کا حکم آ جاتا ہے تو پھر دیر نہیں لگتی اور نہ کوئی اس کو روک سکے اور کوئی اس کو کیسے روکے کہ اللہ کی ذات قاہر عزیز (زبردست اور غالب) ہے۔ اس کی عزت کے سامنے ساری مخلوق گردن جھکائے ہوئے ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ قومِ نوح سے مراد روئے زمین کے سارے آدمی ہیں جو ان کے وقت میں موجود تھے۔ لہٰذا جب انھوں نے کفر اور انکار کیا تو اللہ نے سارے اہلِ زمین کو غرق کر دیا۔ نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں جن کو اللہ نے بھیجا اور غیر اللہ کی عبادت سے منع کیا۔ یہ غیر اللہ کی عبادت انھی نوح علیہ السلام کے وقت میں نکلی تھی۔ ورنہ معلوم ہے کہ ان سے پہلے اور رسول ہو چکے ہیں، جیسے: آدم وشیث وادریس علیہم السلام نوح علیہ السلام کے والد لامک بن متوشلخ بن اخنوخ بن قینان بن شیث بن آدم علیہم السلام تھے۔ سب پیغمبروں میں انھی کی عمر دراز ہوئی۔ بلکہ سب لوگوں میں یہ سب سے پہلے صاحبِ شریعت ہوئے اور انھوں نے سب سے پہلے شرک سے ڈرایا۔ ان کا قصہ سورۃ العنکبوت میں گزر چکا ہے،[2] سریانی زبان میں نوح کے معنی ساکن ہیں۔

﴿ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴾ سے مراد آگ کا عذاب ہے جو اعمالِ خبیثہ پر ہوتا ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد نزولِ طوفان ہے۔[3] یہ کہنے میں کہ اللہ کو پوجو اور اس سے ڈرو شرک کی نفی ہے۔ اجل کی تاخیر سے یہ مراد ہے کہ جو آخری مدت تمھارے لیے مقرر کی ہے اس زمانے تک جو معین معلوم ہے، تم کو مہلت دی جائے گی۔ یا اس تاخیر سے مراد عمروں میں برکت ہے اگر ایمان لائیں اور اگر ایمان نہ لائیں تو برکت نہیں ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمھاری اجل کے آخر تک تمھیں ڈھیل دے گا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عذاب کچھ تاخیر کرے گا کہ تم متاصل

(1) شعب الإيمان ٣/٢٤٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٧٦٠) (2) رقم الآية (١٤) (3) تفسير القرطبي (١٨/٢٩٨)

(جڑ سے اکھڑے ہوئے) نہ ہو جاؤ۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی تم کو غرق کر کے اور جلا کر اور قتل کر کے نہ مارے گا۔[1]

﴿ اَجَلَ اللّٰهِ ﴾ سے مراد موت ہے کہ جب موت آئے گی تو دیر نہ لگے گی اور اس وقت ایمان لانا ممکن نہ ہو گا، اس لیے تم ایمان اور اطاعت کی طرف جلدی کرو۔ یا جب موت آئے گی تو خواہ عذاب کے ساتھ آئے یا عذاب کے بغیر تاخیر نہ ہوگی۔ امام شوکانی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ آیاتِ کریمات میں اجل کی زیادتی یا کمی نہ ہونے کی دلیل ہے اور صحیح احادیث میں صلہ رحمی وغیرہ پر عمر کے زیادہ ہونے کی دلیل ہے؟! اس کے جواب میں امام ربانی رحمہ اللہ نے عمر کی زیادتی کے بارے میں بعض احادیث کا ذکر کرنے کے بعد یہ کہا ہے کہ عمر محدود اور معلوم ہے نہ وہ متقدم ہو نہ متاخر، ہاں جب کوئی آدمی صلہ رحمی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی عمر بڑھا دیتا ہے اور زیادہ کر دیتا ہے یہی حکم ان تمام امور کا ہے جن کے متعلق عمر کے زیادہ اور کم ہونے کی دلیلیں آئی ہیں، کیوں کہ وہ دلیلیں خاص ہیں اور خاص عام پر مقدم ہوتا ہے۔[2]

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ
دُعَآءِيْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝ وَاِنِّيْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ
جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا
وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّيْٓ
اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا
رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝
وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ
اَنْهٰرًا ۝ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۝ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ۝
اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝
وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ
مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝
وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۝ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا
فِجَاجًا ۝

اس نے کہا: میرے رب! بے شک میں نے اپنی قوم کو رات دن دعوت دی ⑤ چناں چہ میری دعوت نے ان کے (حق سے) فرار ہی کو زیادہ کیا ⑥ اور میں نے جب بھی انھیں دعوت دی،

---

(1) تفسیر القرطبي (۱۸/۲۹۹) (2) فتح البیان (۱٤/۳۲۹۔۳۳۲)

تا کہ تو ان کی مغفرت کرے، تو انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں اور اپنے کپڑے (اوپر) لپیٹ لیے اور ضد کی اور انتہائی تکبر کیا⑦ پھر بے شک میں نے انھیں کھلی دعوت دی⑧ پھر میں نے ان سے علانیہ کہا اور چپکے چپکے بھی سمجھایا⑨ چناں چہ میں نے کہا: تم اپنے رب سے استغفار کرو۔ بے شک وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے⑩ وہ تم پر آسمان سے موسلا دھار بارش برسائے گا⑪ اور تمھیں مال اور بیٹوں سے بڑھائے گا اور تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور نہریں جاری کرے گا⑫ تمھیں کیا ہوا ہے کہ اللہ کے لیے وقار (عظمت) کا عقیدہ نہیں رکھتے؟⑬ حالانکہ اس نے تمھیں کئی مرحلوں میں تخلیق کیا ہے⑭ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے سات آسمان تہ بہ تہ کیسے تخلیق کیے؟⑮ اور اس نے ان میں چاند کو روشن اور سورج کو چراغ بنایا؟⑯ اور اللہ ہی نے تمھیں زمین سے (خاص انداز سے) اُگایا؟⑰ پھر وہ تمھیں اس میں لوٹائے گا، اور پھر تمھیں (دوبارہ) نکالے گا⑱ اور اللہ نے زمین کو تمھارے لیے بچھونا بنایا⑲ تا کہ تم اس کی کھلی راہوں میں چلو⑳

نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کا شکوہ:

اللہ نے اپنے بندے اور رسول نوح علیہ السلام کے حال کی خبر دی ہے کہ انھوں نے اپنے رب سے شکایت کی کہ میری قوم نے میرے ساتھ یہ کیا اور میں نے اس مدتِ دراز تک صبر کیا، یہ ساڑھے نو سو برس تھے، اور قوم کو ہدایت کی اور پہلی قوموں کے طریقوں کے بارے میں واضح کر دکھایا اور رات دن ان کو بلایا کہ تیرا حکم مانیں اور تیری اطاعت کریں، تیری رضا مندی کو تلاش کرتے رہیں تو وہ میرے اس بلانے سے اور بھی زیادہ گریز کرنے لگے اور کان بند کر لیے اور کپڑے اوڑھ لیے کہ بات نہ سنیں، جس طرح کہ اللہ نے کفارِ قریش کے حال کی خبر دی: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ﴾ [حم السجدة: ٢٦] ''اور کافروں نے کہا: اس قرآن کو سنو ہی مت (اس کے پڑھے جانے کے وقت) اور بیہودہ گوئی کرو کیا عجب کہ تم غالب آ جاؤ۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کپڑے پہننے سے یہ مراد ہے کہ صورت نا آشنا بناتے کہ پہچانے نہ جائیں۔ امام سعید بن جبیر اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سر چھپاتے تا کہ بات نہ سنیں۔[1] اصرار سے مراد استمرار ہے، یعنی شرک و کفرِ عظیم پر جم جانا ہے۔ استکبار سے مراد اتباعِ حق سے عار کرنا ہے اور حق کے لیے فرمانبردار نہ ہونا ہے۔ ''جہار'' سے مراد یہ ہے کہ لوگوں میں کھل کر سب کے روبرو کہہ دیا۔ اعلان سے مراد با آوازِ بلند کلامِ ظاہر ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٥٤٥/٤)

"إسرار" سے مراد چپکے سے کہنا ہے۔ غرضیکہ طرح طرح سے دعوت کی، تاکہ اس کا زیادہ اثر ہو اور کہا: تم اللہ کی طرف رجوع کرو، ان برے افعال سے توبہ کرو، اللہ غفار ہے جو کوئی توبہ کرتا ہے اس کی توبہ کو قبول فرماتا ہے، اگرچہ اس کے گناہوں میں شرک وکفر ہی کیوں نہ ہو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اللہ تم پر خوب موسلا دھار پانی آسمان سے برسائے گا۔ اسی جگہ سے اس سورت کا نمازِ استسقاء میں پڑھنا مستحب ہے، اس آیت کے سبب سے۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بارش طلب کرنے کے لیے منبر پر چڑھے اور استغفار سے زیادہ کچھ نہ کیا اور صرف آیاتِ استغفار کو پڑھا۔ ان میں سے ایک یہ آیتِ باب تھی: ﴿ اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ﴾ پھر کہا: "لَقَدْ طَلَبْتُ الْغَيْثَ بِمَخَارِجِ السَّمَاءِ الَّتِي يُسْتَنْزَلُ بِهَا الْمَطَرُ"[1] یعنی میں نے آسمان کے ان مخرجوں سے پانی مانگا جن سے کہ مینہ اتارا جاتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ مِّدْرَارًا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ایک کے پیچھے ایک آئے، یعنی لگاتار پانی برسنا۔[2] پھر کہا کہ جب اللہ کی طرف توبہ کرو گے اور استغفار بجا لاؤ گے تو تم پر رزق کی کثرت ہو گی اور اللہ پاک آسمان کی برکات سے تم کو پانی دے گا اور تمھارے لیے زمین کی برکات اُگائے گا اور کھیتی پیدا کرے گا اور دودھ دے گا اور مال و اولاد سے مدد فرمائے گا اور باغ عطا کرے گا جن میں ہر طرح کے میوے ہوں گے اور ان کے درمیان نہریں بہتی ہوں گی۔ دعوت کا یہ مقام ترغیب کے طور پر تھا، پھر اس طریقے سے ہٹ کر ترہیب کا طریقۂ دعوت اختیار کیا اور کہا تم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پاک کی عظمت نہیں کرتے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور ضحاک رحمہما اللہ کا ہے،[3] یعنی اس کے عذاب اور سزا سے نہیں ڈرتے۔

"رجا" اس جگہ خوف کے معنی میں ہے۔ حالاں کہ تم کو طرح طرح بنایا ہے، پہلے تم نطفہ تھے، پھر علقہ ہوئے، پھر مضغہ بنے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، قتادہ، یحییٰ بن ابی رافع، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[4] "طباق" سے مراد یہ ہے کہ ایک کے اوپر ایک ہے۔ یہ فقط سمع ونقل سے لیا جاتا ہے، یا ان امور سے جن کا ادراک حواس سے ہوتا ہے اور وہ ستاروں کی چال اور کسوفات (گہن) سے معلوم ہوتے ہیں، کیوں کہ سبع سیارہ ایک دوسرے کے کاسف (گہن لگانے والے) ہوتے ہیں۔ کواکبِ سبعہ میں سے قریب ایک قمر ہے آسمانِ دنیا پر اس سے جو مافوق، یعنی اوپر ہے اس کو کسوف لگتا ہے اور عطارد دوسرے آسمان پر ہے اور زہرہ تیسرے آسمان پر اور سورج چوتھے آسمان پر اور مریخ پانچویں آسمان پر اور مشتری چھٹے آسمان پر اور زحل ساتویں آسمان پر اور باقی کواکب

---

[1] سنن البيهقي الكبرىٰ (٣٥١/٣) اس کی سند میں انقطاع ہے، شعبی رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ دیکھیں: (إرواء الغليل: ١٤١/٤)

[2] تفسير ابن كثير (٥٤٦/٤) [3] تفسير الطبري (٦٣٤/٢٣) [4] تفسير الطبري (٦٣٥/٢٣، ٦٣٦)

جو ثابت ہیں، چلتے پھرتے نہیں، وہ آسمانِ ہشتم میں ہیں جس کو فلکِ ثوابت کہتے ہیں اور اہلِ شرع کے نزدیک اس فلکِ ثامن کا نام کرسی ہے اور فلکِ نہم جس کو فلکِ اطلس بھی کہتے ہیں، اثیر بھی بولتے ہیں، وہ فلک ہے جس کی حرکت دوسرے تمام افلاک کے برخلاف ہے، یہ اس لیے کہ اس کی حرکت مبدءِ حرکات ہے اور وہ مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتا ہے اور تمام افلاک کی حرکت اس سے برعکس مغرب سے مشرق کی طرف ہے اور سیارہ ہر فلک کو اپنی چال کے مطابق طے کرتا ہے۔

قمر ایک ماہ میں طے کرتا ہے اور آفتاب سال بھر میں کرتا ہے اور زحل ہر تیس سال میں ایک دفعہ طے کرتا ہے۔ یہ طے کرنا افلاک کی وسعت کے مطابق ہوا کرتا ہے، اگرچہ سب کی حرکت سرعت میں متناسب ہے۔ یہ ان کے کلام کی تلخیص ہے۔ اس مقام میں اور اُن کے درمیان بہت سے مواضع میں اختلاف ہے۔ اس اختلاف کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے، مقصود صرف اسی قدر ہے کہ اللہ نے سات آسمان تہ بہ تہ بنائے اور چاند کو اُجالا اور سورج کو چراغ ٹھہرایا، دونوں کی چمک میں فرق رکھا۔ ان میں ہر ایک لیل ونہار کی شناخت کے لیے الگ الگ نمونہ ہے۔ سورج کے طلوع اور غروب ہونے سے یہ شناخت ہوتی ہے۔

چاند کے لیے کئی منزلیں اور برج مقرر کیے ہیں اور اس کا نور متفاوت رکھا ہے، کبھی زیادہ ہو کر انتہا تک پہنچتا ہے، پھر گھٹنا شروع ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ چھپ جاتا ہے، اس سے ماہ وسال کا گزرنا معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴾ [یونس: ۵] ”وہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو نورانی بنایا اور اس کے لیے منزلیں مقرر کیں تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں بے فائدہ نہیں پیدا کیں۔ وہ یہ دلائل ان کو صاف صاف بتلا رہا ہے جو دانش رکھتے ہیں۔“ جس قدر علمِ ہیئت کتاب وسنت سے ثابت ہے، اس کا بیانِ استقراء کتاب ”هداية السائل“ میں کیا گیا ہے۔

نبات اسم مصدر ہے، اس کا اس جگہ لانا بہت اچھا تھا۔ اللہ نے فرمایا: ہم نے تم کو زمین سے اُگایا اور جب تم مر گئے تو پھر تم کو زمین میں لے جائیں گے اور قیامت کے دن پھر تم کو زمین سے نکالیں گے جس طرح کہ پہلی بار پیدا کیا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مردے کو دفن کرنا چاہیے نہ کہ جلانا چاہیے، نہ پانی میں بہا دینا اور نہ ہوا پر اڑانا اور نہ زمین پر پھینک دینا چاہیے۔ پھر زمین کو ایک بساط بنایا اور بڑے بڑے پہاڑوں کو گاڑ کر اسے قرار دیا اور چلنے کے لیے راستے نکالے کہ اس کی اطراف اور نواحی میں چلیں پھریں۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ان سب باتوں کی خبر دی اور اللہ کی قدرت وعظمت آسمان وزمین کی پیدائش میں بتائی اور آسمانوں اور زمین کے منافع اور فوائد سے آگاہ کیا اور اس کا خالق اور رازق ہونا جتلا دیا۔ اس لیے اسی کی عبادت کرنا واجب ہے وہ وحدہ لا شریک لہ ہے، اس

کا کوئی نظیر اور عدیل اور شریک اور ضد اور کفو (ہمسر) نہیں ہے۔ وہ نہ بیوی رکھتا ہے نہ اولاد، نہ اس کا کوئی وزیر ہے نہ مشیر۔ بَلْ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ نوح علیہ السلام نے اپنے رب سے مناجات کی اور قوم کے گریز اور سرکشی کا حال بیان کیا، حالاں کہ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم تھا۔ "غفران" کے لیے بلانا: اس سے مراد تو یہ ہے کہ توبہ کرو تو تمھارے گناہ بخشے جائیں، وہ کم بخت کان بند کر لیتے اور کپڑے اوڑھ لیتے، تاکہ ان کی بات نہ سن سکیں۔ وہ اپنے کفر پر جمے ہوئے تھے اور حق کو قبول کرنے سے غرور کرتے تھے۔ ان کو ہر طرح پر سمجھایا، کھلے طریقے سے اور چھپ چھپ کر، مگر انھوں نے ایک بات نہ مانی، ہر چند کہا کہ استغفار کرو تمھارا رب غفار ہے۔ آسمان سے تم پر لگا تار پانی برسائے گا، ان کی ایک نہ سنی۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ حصولِ باراں کے لیے استغفار ایک بڑا سبب ہے۔ پھر کہا کہ تم کو مال اور (فرزند) اولاد دے گا اور نہریں جاری کرے گا۔ یہ اس لیے کہا کہ قوم ان چیزوں کو محبوب رکھتی تھی۔

حکایت:

ایک شخص نے امام حسن بصری رحمہ اللہ سے قحط کی شکایت کی؛ کہا کہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو۔ دوسرے نے فقیری کا گلہ کیا، تیسرے نے کہا: اولاد نہیں ہوتی، چوتھے نے کہا: زمین کی پیداوار کم ہے، سب کو یہی جواب دیا کہ استغفار کرو۔ ربیع بن صبیح نے کہا: لوگ آئے، انھوں نے ہر طرح کا شکوہ تم سے کیا اور مختلف چیزوں کا سوال کرتے تھے، تم نے سب کا ایک ہی جواب دیا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے آیتِ باب پڑھی[1]: "فَلِلّٰهِ دَرُّهٗ مَا أَفْهَمَهٗ"۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا: جس کو اللہ کی طرف سے حاجت ہو، وہ اپنی مراد کو نہ پہنچے گا مگر استغفار پیش کرنے سے۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا: استغفار سے مراد صرف زبان سے "أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ" کہنا نہیں ہے، بلکہ گناہوں سے رجوع کرنا اور زبان اور دل کا پاک کرنا ہے۔[2] وقار کے معنی عظمت ہیں۔ توقیر تعظیم کو کہتے ہیں، یعنی تم کو کیا عذر ہے کہ تم اللہ سے نہیں ڈرتے اور اس کی عظمت کا حق بجا نہیں لاتے اور اس کی توحید اور اطاعت نہیں کرتے۔ یا یہ معنی ہیں کہ تم اللہ سے اپنے لیے وقار کی امید نہیں رکھتے۔ اگر تم اس پر ایمان لاؤ تو وہ تم کو موقر کر دے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ اسی معنی کی طرف گئے ہیں۔[3]

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ رجا اعتقاد کے معنی میں ہے،[4] یعنی ان کے رجا نہ کرنے کا مطلب اللہ سے انکار ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اگر تم نوح علیہ السلام کا وقار کرتے اور ان کا استخفاف کرنا چھوڑ دیتے تو یہ

---

[1] روح المعاني (۷۳/۲۹)
[2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (۲۵۰/۸)
[3] تفسير البيضاوي (۳۹۴،۳۹۳/۵)
[4] تفسير أبي السعود (۳۸/۹)

اللہ ہی کا وقار تھا۔ امام سعید بن جبیر، ابو العالیہ اور عطاء ﷭ نے کہا ہے: وقار سے مراد یہ ہے کہ تم اللہ سے نہ ثواب کی امید رکھتے ہو اور نہ اس کے عذاب کا خوف ہے۔ امام مجاہد اور ضحاک ﷭ نے کہا: تم اللہ کی عظمت کی کچھ پروا نہیں رکھتے۔ امام قطرب ﷫ نے کہا: یہ حجاز کی لغت ہے کہ "لَمْ أُبَلِ" کے بجائے "لَمْ أَرْجُ" بولتے ہیں۔ امام قتادہ ﷫ نے کہا ہے کہ مراد وقار سے عاقبتِ ایمان ہے۔ امام ابن کیسان ﷫ نے کہا ہے کہ تم کو اللہ کی عبادت اور اطاعت میں اس بات کی امید نہیں ہے کہ وہ تم کو تمھاری توقیر پر ثوابِ خیر دے گا۔ امام ابن زید ﷫ نے کہا ہے کہ تم اللہ کی اطاعت بجا ہی نہیں لاتے۔ امام حسن ﷫ نے کہا کہ تم اللہ کا حق نہیں پہچانتے اور نہ ہی اس کی نعمت کا شکر بجا لاتے ہو۔[1]

حکایت:

سیدنا علی بن ابی طالب ﷜ نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ننگے نہا رہے ہیں بغیر ازار اور تہبند کے، خوب چلا کر فرمایا: ﴿مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا﴾[2] (رواه عبد الرزاق في المصنف) اطوار سے مراد مختلف احوال ہیں، کبھی تم کو عناصر بنایا، پھر اغذیہ، پھر اخلاط، پھر نطف، پھر مضغ، پھر علق، پھر عظام ولحوم، پھر ایک دوسری خلق پیدا کی۔ "طور" لغت میں بہ معنی "مرة" ہے، یعنی ایک بار۔ امام ابن الانباری ﷫ نے کہا: "طور" بہ معنی حال ہے اور ہیئت ہے۔[3] "أطوار" سے مراد یہ ہے کہ پہلے کودک کیا، پھر جوان، پھر بوڑھا۔ یا "أطوار" سے مراد افعال و اقوال و اخلاق کا مختلف ہونا ہے، یعنی جس نے تم کو ان اطوارِ بدیعہ پر بہ کرات و مرات و تارات بنایا، تم اس کی توقیر میں کس طرح کمی کرتے ہو۔ یہ بات کوئی عقل مند نہیں کرتا۔ پھر آسمان و زمین کی پیدائش کا ذکر کر کے اپنی کمال قدرت اور بدیع صنعت پر استدلال کیا۔

طباق سے مراد یہ ہے کہ ہر آسمان و زمین دوسرے آسمان پر مطبق ہے، جیسے: قبہ اور ایک دوسرے کا مماس (چھونے والا) نہیں ہے۔ امام حسن ﷫ نے کہا ہے کہ اللہ نے سات آسمان سات زمینوں پر بنائے ہیں، ہر دو آسمان اور ہر دو زمین کے درمیان مخلوق اور امر ہے۔[4] قمر کو زمین کا نور ٹھہرایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس ﷠ نے کہا ہے کہ چاند کا آسمان میں منہ عرش کی طرف ہے اور پشت زمین کی طرف۔[5] ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ یہ زمین کے لیے روشنی ہیں، آسمان میں ان کی کوئی چمک نہیں ہے۔[6] سورج زمین کا چراغ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو ﷠ نے کہا ہے کہ چاند اور سورج کے منہ آسمان کی طرف ہیں اور ان کی پشت زمین کی طرف ہے، میں تم پر کتاب اللہ کی ایک آیت پڑھتا

---

[1] تفسير القرطبي (۳۰۳/۱۸)

[2] مصنف عبد الرزاق (۶۸۶/۱) میں یہ روایت سیدنا علی ﷜ کے بجائے مرفوعاً مروی ہے، نیز اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

[3] فتح القدير (۳۹۶/۵) [4] تفسير القرطبي (۳۰۴/۱۸) [5] مستدرك الحاكم (۵۴۵/۲) [6] الدر المنثور (۲۹۲/۸)

ہوں، پھر آیتِ باب پڑھی۔[1] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت یہ ہے کہ سورج اور چاند اہلِ سماوات کے لیے اسی طرح درخشاں ہیں جس طرح کہ اہلِ زمین کے لیے ہیں۔[2]

حکایت:

امام شہر بن حوشب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما، امام کعب احبار رحمہ اللہ جمع ہوئے، ان کے آپس میں کچھ عتاب تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا: اے کعب! تو ہم سے پوچھو، ہم جس بات کی خبر دیں گے اس کی تصدیق میں قرآن کی سند لائیں گے۔ کعب رحمہ اللہ نے کہا: بھلا چاند سورج کا نور ساتوں آسمانوں میں اسی طرح ہے جیسا کہ زمین میں ہے؟ کہا: ہاں تو نے یہ آیت نہیں دیکھی۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: اس پر اجماع ہے کہ سورج چوتھے آسمان پر ہے اور اس کی روشنی چاند کی روشنی سے قوی ہے۔[4] خطیب رحمہ اللہ نے کہا سورج پانچویں آسمان پر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جاڑوں میں چوتھے آسمان پر ہوتا ہے اور گرمی میں ساتویں آسمان پر۔

اس سے مراد کہ ہم نے تم کو زمین سے اُگایا، یہ ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو ادیمِ ارض (زمین کے چمڑے) سے بنایا۔ انبات، انشا کے بجائے استعارہ ہے، کیوں کہ یہ زمین پر آنے سے پہلے ہے۔ پھر موت کے بعد زمین میں لوٹایا جائے گا، پھر قیامت کے دن زمین سے جی اٹھیں گے۔ یہ لامحالہ ہونے والا ہے۔ زمین کو بساط ٹھہرایا کہ جس طرح گھروں میں فرش (بستر) پر لوٹتے ہیں، اسی طرح زمین پر تقلب کرتے ہیں۔ فجاج سے مراد کھلے راستے ہیں، یعنی بڑی بڑی کشادہ راہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد مختلف راستے ہیں۔[5] بعض نے کہا ہے کہ فج وہ راستہ ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان میں ہو۔ پھر جب نوح علیہ السلام کو ان کے ایمان لانے سے ناامیدی ہوگئی اور جان لیا کہ یہ ہرگز مومن نہیں بنیں گے تب انھوں نے کہا:[6]

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا ۟ۚ﴿۲۱﴾ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۟ۚ﴿۲۲﴾ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ۬ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۟ۚ﴿۲۳﴾ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ۬ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴿۲۴﴾

نوح نے کہا: اے میرے رب! بے شک انھوں نے میری نافرمانی کی اور ان کی اتباع کی جنھیں ان کے مال اور اولاد نے خسارے ہی میں بڑھایا (21) اور انھوں نے بڑے بڑے مکر کیے (22) اور

[1] تفسير الطبري (٦٣٧/٢٣) [2] فتح القدير (٣٩٧/٥) [3] الدر المنثور (٢٩٢/٨)
[4] تفسير النسفي (٢٨٤/٤) [5] تفسير الطبري (٦٣٨/٢٣) [6] فتح البيان (٣٣٢/١٤_٣٣٩)

انھوں نے کہا: تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑو، اور ہرگز نہ چھوڑو تم وَدّ کو اور نہ سُواع کو اور نہ یَغُوث اور یَعُوق اور نَسر کو (23) اور بلاشبہہ انھوں نے بہتوں کو گمراہ کیا، اور (اے اللہ!) تو ظالموں کو ضلالت ہی میں زیادہ کر (24)

نوح علیہ السلام کا اپنے رب کے ہاں شکوہ:

اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے حال کی خبر دی ہے کہ جب وہ طرح طرح سے دعوت دینے، ترغیب اور ترہیب سے فارغ ہوئے اور دیکھا کہ وہ کسی طرح پر بھی راہِ راست پر نہیں آتے تو ان کا حال اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ یہ میرے نافرمان اور جھٹلانے والے ہیں اور ان دنیا داروں کے تابع ہیں جو اللہ کے حکم سے غافل ہو گئے ہیں اور مالدار اور صاحبِ اولاد ہیں۔ اور یہ حقیقت میں استدراج تھا نہ کہ عزت واکرام۔ لہٰذا کہا کہ یہ ایسے لوگوں کے تابعدار بنے ہیں جن کا مال اور اولاد ان کو نقصان پہنچائے گا۔ لفظ ''ولد'' بہ ضم و فتح دونوں طرح پر پڑھا گیا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں مگر ''کبّار'' سے مرادمکرِ عظیم ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: یعنی کبیر۔ عرب کہتے ہیں کہ امرِ عجیب وعجاب وعجّاب، ورجل حسان وحسّان و جمال وجمّال بہ تخفیف وتشدید ایک ہی معنی میں ہیں۔[1] مراد اس مکرِ کبار سے یہ ہے کہ انھوں نے ان کی نظر میں یہ بات دکھائی کہ ہم حق و ہدایت پر ہیں جس طرح کہ قیامت کے دن کہیں گے: ﴿بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا﴾ [سبا: ٣٣] ''بلکہ دن رات مکروفریب سے ہمیں اللہ کے سات کفر کرنے اور اس کے شریک مقرر کرنے کا تمھارا حکم دینا ہماری بے ایمانی کا باعث ہوا۔''

قوم نوح کے بت:

سواع وغیرہا بتوں کے نام ہیں جن کو اللہ کے سوا پوجتے تھے۔ بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ وہ بت جو قومِ نوح علیہ السلام میں تھے، اب عرب میں آ گئے۔ ''ود'' قبیلۂ کلب میں دومۃ الجندل کے مقام میں تھا۔ ''سواع'' ہذیل کا بت ہے۔ ''یغوث'' قبیلۂ مراد کا بت تھا، پھر سبا کے نزدیک بنی غطیف کے غار میں رہا۔ ''یعوق'' ہمدان کا بت ہے۔ ''نسر'' حمیر کا بت ہے جو ذی کلاع کی آل میں ہیں۔

یہ قومِ نوح علیہ السلام کے نیک لوگوں کے نام ہیں، جب وہ لوگ مر گئے تو شیطان نے ان کی قوم کو وحی کی کہ تم ان کی نشست گاہوں میں یہ بت کھڑے کر کے ان کے وہی نام رکھو۔ انھوں نے اسی طرح کیا لیکن ان کو پوجا نہیں، یہاں تک کہ جب اس زمانے کے لوگ ہلاک ہو گئے اور علم جاتا رہا تو ان کی پرستش ہونے لگی۔[2] امام عکرمہ، ضحاک، قتادہ

---

[1] تفسیر الطبري (٢٣/٦٣٨، ٦٣٩)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٣٦)

اور ابن اسحاق رحمہ اللہ سے بھی اسی کے لگ بھگ مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ اصنام نوح علیہ السلام کے زمانے میں پوجے جاتے تھے۔

محمد بن قیس نے کہا: یعوق ونسر آدم اور نوح علیہما السلام کے درمیان کے زمانے میں ایک صالح قوم تھی اور کچھ لوگ ان کی اقتدا کرتے تھے۔ جب وہ مر گئے تو ان کے یاروں نے کہا، جو ان کے مقتدی تھے، کہ اگر ہم ان کی صورتیں بنا لیں تو ہمیں عبادت کا زیادہ شوق ہوگا جب ہم ان کو یاد کریں گے۔ پھر ان کی تصویریں بنائیں۔ پھر جب یہ لوگ مر گئے اور دوسرے لوگ آئے تو ابلیس نے ان کے کان میں یہ پھونکا کہ تم سے پہلے کے لوگ ان مورتوں کو پوجتے تھے اور ان کے ذریعے سے ان پر بارش برستی تھی، یہ ان مورتوں کو پوجنے لگے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ آدم علیہ السلام کے چالیس بچے تھے، بیس لڑکے اور بیس لڑکیاں، ان میں سے ہابیل قابیل صالح اور عبدالرحمان جن کا نام عبدالحارث رکھا گیا تھا، وہ زندہ رہے۔ ود کو شیث کہتے تھے اور ہبۃ اللہ بھی انھی کا نام تھا ان کے بھائیوں نے انھیں اپنا سردار مقرر کیا تھا، ان سے سواع، یغوث، یعوق اور نسر پیدا ہوئے۔[2] (رواہ ابن عساکر)

عروہ بن زبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ جب آدم علیہ السلام بیمار پڑے تو ان کے پاس ود، یغوث، یعوق، سواع اور نسر ان کے بیٹے موجود تھے، سب میں زیادہ نیک اور بڑی عمر کے ود تھے۔ ابو جعفر کھڑے پڑھ رہے تھے، ان کے پاس یزید بن المہلب کا ذکر ہوا۔ انھوں نے نماز پڑھ کر کہا: تم یزید بن المہلب کا ذکر کرتے ہو، یہ شخص اس زمین میں قتل ہوا جہاں سب سے پہلے غیر اللہ کی عبادت کی گئی، پھر ایک اور مرد کا ذکر کیا کہ وہ مسلمان تھا اور اپنی قوم میں پسندیدہ تھا، لوگ اس سے محبت رکھتے تھے۔ وہ جب مر گیا تو بابل کے علاقے میں اس کی قبر کے گرد اعتکاف کیا اور اس پر بہت سا جزع (رونا پیٹنا) کیا۔

ابلیس نے ان کی جزع فزع کو دیکھ کر ایک انسان کی صورت میں آ کر کہا، میں دیکھتا ہوں کہ تم اس مرد پر بہت سا جزع کرتے ہو، بھلا میں تمھارے لیے اس جیسی ایک صورت نہ بنا دوں کہ وہ تمھاری مجلس میں رہا کرے اور تم اس کو یاد رکھو۔ کہا: ہاں! اس نے اس شخص کی طرح ایک صورت تیار کر دی، انھوں نے اس کو اپنی مجلس میں رکھا اور اس کو یاد کرتے۔ ابلیس نے ان کا یاد کرنا دیکھ کر کہا۔ کیا: میں تم میں سے ہر ایک شخص کے گھر کے لیے ایسی ہی صورت نہ بنا دوں کہ وہ ہر ایک کے گھر میں رہے اور اس کو دیکھ کر وہ اس شخص کو یاد کر لیا کرے اور اسے دور نہ جانا پڑے، کہا: ہاں! تب اس نے ہر ایک گھر والے کے لیے اسی طرح کی ایک صورت بنا دی، سب اس پر متوجہ ہوئے اور اس کا ذکر کرتے۔ اس قوم کے فرزندوں نے دیکھا کہ ان تصاویر کے ساتھ یہ کچھ کیا جاتا ہے، پھر نسل بڑھی اور ود کو یاد کرنا پرائی بات ہوگئی، یہاں تک کہ ان تماثیل کو اللہ کے سوا معبود ٹھہرا لیا۔ اولاد کی اولاد ان کو پوجنے لگی۔ سب سے پہلے اللہ کے سوا جس کو پوجا گیا، وہ "ود" نام کا بت تھا۔[3] (رواہ ابن أبي حاتم)

---

[1] تفسیر الطبري (۶۳۹/۲۳، ۶۴۰) [2] تاریخ دمشق (۲۷۳/۲۳) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳۷۵/۱۰، ۳۳۷۶)

نوح علیہ السلام کی اپنی قوم پر بد دعا:

نوح علیہ السلام نے کہا: اے رب! ان بتوں نے ایک کثیر تعداد میں مخلوق کو گمراہ کر دیا ہے، یعنی ان کی عبادت پہلی قرون (زمانے) سے لے کر ہمارے زمانے تک سارے عرب وعجم اور بنی آدم کی ساری اصناف میں مستمر ہو گئی، یعنی رچ بس گئی۔ اور خلیل علیہ السلام نے اپنی دعا میں کہا تھا: ﴿ وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ﴾ [إبراهيم: ٣٥۔ ٣٦] ”(اے میرے پروردگار!) مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے پناہ دے، اے میرے پالنے والے معبود! انھوں نے بہت سے لوگوں کو راہ سے بھٹکا دیا ہے۔“ اور نوح علیہ السلام کا یہ کہنا کہ ان کو گمراہی میں بڑھا، قوم پر بد دعا ہے ان کی سرکشی اور کفر اور عناد کے سبب سے جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے گروہ پر بد دعا کی تھی: ﴿ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴾ [یونس: ٨٨] ”اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو نیست و نابود کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے سو یہ ایمان نہ لانے پائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں۔“ اللہ نے ہر ایک نبی کی اپنی امت کے حق میں دعا قبول کی اور قومِ نوح علیہ السلام کو ان کی تکذیب کے سبب سے طوفان سے ہلاک کر دیا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کی شکایت بیان کی کہ وہ میرے کہنے پر نہیں چلتے۔ اہلِ ثروت و جاہ کی تابعداری میں لگے رہتے ہیں جس کا نتیجہ ان کے خسران کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور اس قوم کے یہ رؤسا بڑے مکار اور دغا باز ہیں۔ اہلِ علم نے اس مکر میں اختلاف کیا ہے کہ وہ کیا مکر تھا جس کو بڑا بتایا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ نچلے طبقے کے، یعنی غریب لوگوں کو نوح علیہ السلام کے قتل پر بڑھکا دیا اور کہا کہ جس طرح ہو سکے ان کو ایذاء دو اور ستاؤ، لوگوں کو ان پر ایمان لانے سے باز رکھو، کوئی ان کی طرف جھکنے اور اُن کی بات سننے نہ پائے۔ بعض نے کہا ہے کہ عوام کو یہ دھوکا دیا کہ ہمارے پاس اموال اور اولاد کی کثرت ہے۔ ضعیف لوگوں نے سمجھ لیا کہ اگر یہ حق پر نہ ہوتے تو یہ نعمتیں ان کو کہاں سے ملتیں۔

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکر یہ تھا کہ اللہ کے لیے جورو اور بچے ٹھہرائے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا کہ مکر سے مراد یہ ہے کہ بڑوں نے چھوٹوں سے یہ کہا: ﴿ لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ ﴾[1] تم اپنے معبودوں کی پوجا کو نہ چھوڑو۔ یا مکر سے مراد کفر ہے، یا اللہ اور رسول پر افتراء کرنا ہے۔ ”آلِهَةٌ“ سے مراد بت اور تصویریں ہیں جن کو وہ پوجتے تھے۔ ان کے بعد پھر عرب نے پوجا۔ یہی جمہور کا قول ہے۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا: ”هٰذِهِ أَسْمَاءُ قَوْمٍ صَالِحِيْنَ“ یہ قوم

[1] تفسیر القرطبي (١٨/٣٠٧)

آدم اور نوح علیہما السلام کے درمیانی عرصے میں تھی، پھر ان کے بعد وہ لوگ آئے جو ان بتوں کی عبادت میں اپنے آباء واجداد کے مقتدی ہوئے۔ ابلیس نے آ کر ان سے کہا کہ اگر تم ان کی مورتیں بنا لو تو یہ تمھاری عبادت میں زیادہ شوق اور مزے کا موجب ہوگا۔ چنانچہ قوم نے اسی طرح کیا، پھر جو لوگ ان کے بعد آتے گئے وہ ان کو پوجتے رہے۔ ابلیس نے سمجھا دیا کہ تمھارے اگلے ان کی عبادت کرتے تھے تم بھی ان کو پوجو۔ بتوں کی عبادت کی ابتداء اسی وقت سے ہوئی ہے[1] اور ان مورتوں کا نام اسی قوم کے نام پر رکھا گیا، کیوں کہ وہ صورتیں اسی قوم کی مورتیں تھیں۔

امام واقدی رحمہ اللہ نے کہا: "ود" مرد کی صورت پر تھا اور "سواع" عورت کی صورت پر اور "یغوث" شیر کی شکل اور "یعوق" گھوڑے کی شکل پر اور "نسر" گدھ پرندے کی شکل پر تھا۔ امام بقاعی رحمہ اللہ نے کہا: یہ کچھ اس بات کے برخلاف نہیں کہ یہ صورتیں قومِ صالحین کی تھیں، اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ صورتیں ان کے معانی سے منتزع (کھینچ کر نکالی ہوئی) ہوں۔ "ود" رجولیت (مردانگی) میں کامل تھا اور "سواع" ایک عابدہ عورت تھی اور "یغوث" ایک بہادر آدمی تھا اور "یعوق" ایک تیز رو اور قوی انسان تھا اور "نسر" ایک مردِ عظیم طویل العمر تھا۔[2] (ومثله في القرطبي)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے حبشہ کی سرزمین میں ایک گرجا گھر کا ذکر کیا جس کا نام ماریہ تھا، اس میں تصویریں تھیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا: ان میں جب کوئی صالح شخص مر جاتا تو اس کی قبر پر مسجد بنا کر اس میں اس شخص کی تصویر تیار کرتے۔ یہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک تمام مخلوق سے بدترین ہیں۔[3] بالجملہ نوح علیہ السلام نے کہا کہ اے رب! ان بڑے لوگوں اور سرداروں نے، یا ان بتوں اور اوثان نے ایک جہان کو گمراہ کر ڈالا ہے سو تو ان کو اور زیادہ گمراہ کر دے، یعنی ان کو عذاب کر۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی دلیل سے: ﴿ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَٰلٍ وَسُعُرٍ ﴾ [القمر: ٤٧] "بے شک گناہ گار گمراہی میں اور عذاب میں ہیں۔" یہ ان پر نوح علیہ السلام کی بد دعا تھی۔[4]

مِمَّا خَطِيٓـَٔـٰتِهِمْ أُغْرِقُوا۟ فَأُدْخِلُوا۟ نَارًا فَلَمْ يَجِدُوا۟ لَهُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ أَنصَارًا ﴿٢٥﴾ وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى ٱلْأَرْضِ مِنَ ٱلْكَٰفِرِينَ دَيَّارًا ﴿٢٦﴾ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا۟ عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوٓا۟ إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾ رَّبِّ ٱغْفِرْ لِى وَلِوَٰلِدَىَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِىَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَٱلْمُؤْمِنَٰتِ وَلَا تَزِدِ ٱلظَّٰلِمِينَ إِلَّا تَبَارًۢا ﴿٢٨﴾

[1] تفسير البغوي (٢٣٢/٨) [2] تفسير القرطبي (٣٠٩/١٨) نظم الدرر للبقاعي (١٧٥/٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٨) [4] فتح البيان (٣٣٩/١٤ـ٣٤٣)

وہ اپنی خطا کاریوں کی وجہ سے غرق کیے گئے، پھر دوزخ میں داخل کیے گئے، تو انھوں نے اللہ کے سوا کوئی اپنا مددگار نہ پایا(25) اور نوح نے کہا: (اے) میرے رب! کفر کرنے والوں کا زمین پر کوئی گھر نہ چھوڑ(26) بلاشبہ اگر تو انھیں چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور (آیندہ) فاجر کافر ہی جنیں گے(27) (اے) میرے رب! تو میری اور میرے والدین کی مغفرت فرما اور (ہر) اس شخص کی جو میرے گھر میں مومن ہو کر داخل ہو اور مومنین اور مومنات کی (مغفرت کر) اور ظالموں کو ہلاکت (اور بربادی) ہی میں زیادہ کر(28)

خطا کاریوں کی تباہ کاریاں:

اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ قوم نوح علیہ السلام بہ سبب کثرتِ ذنوب اور زیادتی اور کفر پر جمے رہنے اور رسول کی مخالفت کرنے کے پانی میں ڈوب کر آگ میں جا پہنچی، یعنی سمندر کی موجوں کے بعد جہنم کی حرارت کی طرف منتقل ہوئے اور کوئی مددگار، داد رس اور پناہ دینے والا ایسا نہ ہوا جو اُن کو اللہ کے عذاب سے بچاتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ﴾ [هود: ٤٣] ''نوح علیہ السلام نے کہا: آج اللہ کے امر سے بچانے والا کوئی نہیں، صرف وہی بچیں گے جن پر اللہ کا رحم ہوا۔'' نوح علیہ السلام نے یہ دعا کی کہ اے رب! کسی کافر کو روئے زمین پر باقی نہ چھوڑ کہ وہ بسے اور رہے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''دیّار'' سے مراد واحد ہے، یعنی ایک شخص کو بھی نہ چھوڑ۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''دیّار'' وہ ہے جو گھر والا ہو۔[1] اللہ نے نوح علیہ السلام کی دعا سن لی جتنے آدمی روئے زمین پر تھے اور کافر تھے یہاں تک کہ نوح علیہ السلام کا بیٹا، وہ سب ڈوب گئے، ان کے بیٹے نے کہا تھا: ﴿ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ﴾ [هود: ٤٣] ''میں تو کسی بڑے پہاڑ کی پناہ میں آ جاؤں گا جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔'' اور اپنے باپ سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ نوح علیہ السلام نے اس سے کہا: ﴿ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴾ [هود: ٤٣] ''اسی وقت ان دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی اور وہ ڈوبنے والوں میں سے ہو گیا۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما رفعاً کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قومِ نوح میں سے اگر کسی پر رحم کرتا تو ایک عورت پر کرتا جس نے پانی کو دیکھ کر اپنے بچے کو اٹھا لیا اور ایک پہاڑ پر چڑھ گئی، جب پانی اس پہاڑ پر پہنچا تو اس نے بچے کو اپنے کندھوں پر رکھ لیا، جب پانی کندھوں تک پہنچا تو بچے کو اپنے سر پر اٹھا لیا، جب پانی سر تک پہنچا تو بچے کو دونوں ہاتھوں میں اونچا کیا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٥٤٨/٤)

سو اگر اللہ پاک ان میں سے کسی پر رحم کرتا تو اس عورت پر کرتا۔[1] (رواه ابن أبي حاتم و هذا حديث غريب و رجاله ثقات)

پھر اللہ تعالیٰ نے اصحابِ معینہ کو، جو نوح علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے تھے، نجات دی، یہ وہی لوگ تھے جن کو کشتی میں سوار کرنے کا اللہ نے حکم دیا تھا۔ نوح علیہ السلام نے کہا تھا: اے رب! اگر تو ان میں سے ایک نفس کو باقی چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے۔ بندوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان کے بعد پیدا ہوں گے۔ یہ تو کافر فاجر ہیں جتنے ہیں، یعنی اعمال میں فاجر و فاسق دل میں کافر و مشرک۔ ان کو یہ بات بطور امتحان معلوم ہو چکی تھی اس لیے کہ ساڑھے نو سو برس ان میں رہے تھے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لفظ ﴿ بَيْتِيَ ﴾ سے مراد مسجد ہے،[2] لیکن آیت کو اس کے ظاہر پر محمول کرنے سے کوئی مانع نہیں ہے، یعنی جو شخص کہ ان کے گھر میں داخل ہو اور وہ مومن ہو اس کو تو بخش دے۔ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا: « لَا تَصْحَبْ إِلَّا مُؤْمِنًا وَّلَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ إِلَّا تَقِيٌّ » یعنی تو نہ بیٹھ مگر ایماندار کے پاس اور تیرا کھانا نہ کھائے مگر پرہیز گار مرد۔[3] (ورواه أحمد وأبو داود والترمذي وقال: إنما نعرفه من هذا الوجه) لفظ مومنین و مومنات دعائے عام ہے، سارے زندوں اور مردوں کو شامل ہے، اس لیے اس طرح کی دعا نوح علیہ السلام کی اقتداء کرتے ہوئے مستحب ہے اور ادعیہ ماثورہ میں آئی ہے۔ ”تبار“ سے مراد ہلاکت ہے۔ (قاله السدي) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی دنیا اور آخرت میں خسارہ۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ طوفان میں ڈوب جانے کے بعد نارِ آخرت میں داخل ہوئے۔ یا مراد عذابِ قبر ہے۔ نوح علیہ السلام کو جب ان کے ایمان لانے اور کفر سے باز رہنے کی طرف سے مایوسی ہوگئی تو ان کی ہلاکت کی دعا کی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کو وحی آئی کہ ﴿ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ ﴾ [هود: ٣٦] ”تیری قوم میں سے جو ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اور کوئی اب ایمان لائے گا ہی نہیں۔“ تب انھوں نے بد دعا کی۔ اللہ نے دعا قبول کی اور ان کو ڈبو دیا۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ اس وقت ہوا کہ اللہ نے ہر مومن کو پشتِ پدر اور رحمِ مادر سے نکال لیا اور عورت اور مرد عقیم، یعنی عذاب سے ستر برس یا چالیس برس پہلے بانجھ ہو گئے۔ امام مقاتل، ربیع، ابن زید اور عطیہ رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عذاب کے وقت ان میں کوئی بچہ نہ تھا مگر امام حسن اور ابو العالیہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ان کو بچوں کے ساتھ ہلاک کیا۔ یہ عذاب اللہ کی طرف سے عدل تھا، لیکن ان کے بچوں اور اولاد کو بغیر عذاب کے ہلاک کیا اور ان کو عذاب سے۔[5] ”دیّار“ وہ ہے جو ساکنِ دار ہو اور زمین کا دورہ کرے، یا دوران سے

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٧٦) اس کی سند میں ”شبیب بن سعید عنہ ابن وھب“ ضعیف راوی ہے۔

(2) تفسير الطبري (٢٣/٦٤٢) (3) مسند أحمد (٣/٣٨) سنن أبي داود (٤٨٣٢) سنن الترمذي (٢٣٩٥) صحيح الجامع (٧٣٤١)

(4) تفسير ابن كثير (٤/٥٤٩) (5) تفسير القرطبي (١٨/٣١٢)

ماخوذ ہے بہ معنی تحرک۔ فاجر طاعت چھوڑ دینے والے کو کہتے ہیں۔ ''کفّار'' وہ ہے جو کفرانِ نعمت کرے، یعنی ان سے جو کوئی پیدا ہوگا وہ ایسا ہی ہوگا کہ فجور و کفر کرے گا۔ پھر نوح علیہ السلام نے اہلِ ایمان کے لیے دعا کی۔ پہلے اپنے لیے اور اپنے ماں باپ کے لیے پھر عموماً سب مومنین اور مومنات کے لیے۔ ان کے ماں باپ مسلمان تھے، باپ کا نام لامک یا لمک بن متوشلخ بن اخنوخ، یہ نام ہے ادریس علیہ السلام کا، یہ ادریس علیہ السلام کے پڑپوتے ہوئے۔ ان کی ماں کا نام شمخی بروزن سکری بنت انوش ہے۔ یا والدین سے مراد آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد باپ دادا ہیں اور ایک قراءت میں ''وَلِوَلَدَيَ'' افراداً وتثنیتاً آیا ہے۔ مراد سام و حام ہیں اور ''وَلِوَالِدَيَّ'' بھی پڑھا ہے، یعنی باپ کو خاص طور پر ذکر کیا، اس لیے کہ ماں سے اشرف ہے۔ امام ضحاک اور کلبی رحمہما اللہ کے نزدیک گھر سے مراد مسجد ہے۔[1] بعض نے کہا: وہ مسکن ہے جس میں وہ رہتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ سفینہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دین ہے۔ مومن کی قید سے ان کی بیوی اور ایک بچہ خارج ہوگیا جس نے کہا تھا کہ پہاڑ مجھے پانی سے بچالے گا، پھر عام طور پر سب اہلِ ایمان مرد و عورت کے لیے دعا کی۔

پھر کفار پر بد دعا کی، کفار کے ساتھ اطفال بھی ڈوب گئے سزا کے طور پر نہیں بلکہ والدین پر عذاب میں سختی کے لیے، تاکہ وہ بچوں کو ڈوبتے ہوئے دیکھ کر تکلیف پائیں، اس لیے کہ بچے اپنی جان سے بھی زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے: «يَهْلِكُونَ مَهْلَكًا وَاحِدًا، وَيَصْدُرُونَ مَصَادِرَ شَتَّى»[2] ''وہ سب اکٹھے ہلاک ہوں گے اور (قیامت کے روز) واپسی کے مختلف راستوں پر نکلیں گے۔'' امام حسن رحمہ اللہ نے پوچھا تھا: ''اللہ تعالیٰ نے ان کی براءت کا اظہار کر کے انھیں بغیر عذاب کے ہلاک کیا۔''[3] اہلِ علم نے کہا: نوح علیہ السلام کی یہ دعا اور بد دعا قیامت تک ہر مومن اور ہر ظالم ستمگار کے لیے ہے۔[4] میں کہتا ہوں: نوح علیہ السلام کے رتبۂ عالی کو دیکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی کس قدر عزت تھی کہ ان کی بد دعا سے ایک آباد جہاں کو ایک ہی دفعہ عورتوں اور بچوں سمیت غرق کر دیا۔

پھر اسی طرح ہر پیغمبر کی دعا پر ان کی خاص قوم کو ہلاک کیا اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت للعالمین بنایا اور اس امت کو امتِ مرحومہ ٹھہرا کر دنیا کے عذاب سے بچا دیا۔ نوح علیہ السلام آدمِ ثانی ہیں۔ دنیا میں انھی کی نسل باقی ہے اور ابراہیم علیہ السلام خاتم الانبیاء کے جدِ امجد آدمِ ثالث تھے، ان کی نسل میں بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل علیہ السلام ہیں، انھوں نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے بتوں کی عبادت سے بچنے کی دعا مانگی تھی اور امامت کی درخواست کی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ [البقرة: ١٢٤] ''میرا وعدہ ظالموں سے نہیں۔'' یعنی یہ منصبِ امامت

---

[1] تفسیر القرطبي (٣١٤/١٨) فتح البیان (٣٤٥/١٤)
[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٨٤)
[3] روح المعاني (٨٠/٢٩)
[4] فتح البیان (٣٤٣/١٤۔٣٤٥)

میرا ایک جلیلۃ القدر عہدہ ہے، یہ اس کو ملے گا جو ظالم، یعنی مشرک نہ ہوگا۔ چنانچہ اولادِ ابراہیم علیہ السلام میں سے صلحاء بنی آدم کے ائمہ ہوئے اور جو ظالم نکلے وہ اس نعمت سے محروم رہے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو اور ہماری ذریت کو نوح اور ابراہیم علیہما السلام کی دعاؤں کا مصداق رکھے اور اگر شامتِ اعمال سے اور اغوائے نفس و حبِ دنیا و خواہشات کے غلبہ اور ابلیس لعین کے گمراہ کرنے سے اگر کوئی گناہ یا شرکِ خفی یا جلی ہم سے ہوگیا ہو تو ہم ہزار زبان و دل سے تائب ہو کر بخشش مانگ کر آرزو کرتے ہیں کہ توحیدِ خالص بے ریا پر زندہ رہ کر کلمۂ شہادتین پر مریں اور اللہ کی رحمتِ واسعہ کے سمندر میں غوطہ زن ہوں۔ اللھم آمین.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَةُ الجِنّ

اس کی اٹھائیس (۲۸) آیتیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب کے قول کے مطابق یہ مکہ میں اتری۔①
سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "نَزَلَتْ بِمَكَّةَ"، یہی قول سیدہ عائشہ اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کا بھی ہے۔ اس کو سورت ﴿قُلْ اُوْحِيَ﴾ بھی کہتے ہیں۔②

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا
سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝۱ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ
نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝۲ وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا
وَلَدًا ۝۳ وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝۴ وَّاَنَّا
ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝۵
وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ
فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝۶ وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ
يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝۷

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔
(اے نبی!) کہہ دیجیے: میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے (قرآن) غور سے سنا، تو انھوں نے کہا: بے شک ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے ① وہ رُشد و ہدایت کی راہ دکھاتا ہے، تو ہم اس پر ایمان لائے ہیں، اور ہم کسی کو بھی اپنے رب کا ہرگز شریک نہیں ٹھہرائیں گے ② اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت اونچی ہے، نہ اس نے (اپنی) کوئی بیوی

① تفسیر القرطبي (۱/۱۹) ② الدر المنثور (۸/۲۹۶)

بنائی ہے اور نہ اولاد ③ اور یہ کہ ہمارا بے وقوف اللہ کی بابت ناحق جھوٹی باتیں لگاتا رہا ہے ④ اور یہ کہ ہمارا خیال تھا کہ انسان اور جن اللہ پر ہرگز جھوٹ نہیں بولیں گے ⑤ اور بے شک انسانوں کے کچھ مرد جنوں کے کچھ مردوں کی پناہ پکڑتے تھے، تو انھوں نے ان کو سرکشی میں بڑھایا ⑥ یہ کہ انھوں نے خیال کیا تھا جیسے تم (جنوں) نے خیال کیا تھا کہ اللہ کسی کو دوبارہ ہرگز نہیں اُٹھائے گا ⑦

جنوں کا قرآن سننا اور ایمان لانا:

سورت احقاف میں گزرا ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ نماز پڑھتے تھے، کتنے جن سن کر ایمان لے آئے، اپنی قوم سے جا کر بیان کیا۔ یہ ان کے بیان کی اللہ پاک نے رسول ﷺ پر وحی فرمائی۔ اس کے بعد بہت دفعہ نبیِ مکرم ﷺ کے پاس جن آ کر ملے اور ایمان اور قرآن سیکھا۔ جو گمراہیاں آدمیوں میں تھیں، وہ جنوں میں بھی تھیں۔ اللہ کی بیوی اور بیٹا بتاتے تھے۔ پھر کہا کہ ہم میں جو بے وقوف تھے، وہ ایسی باتیں کہتے تھے۔ یا ابلیس کو کہا ہو، اس سے ہم بھی بہک گئے۔ جتنا آدمی جنوں کے آگے التجا کرتے ہیں، اتنا ہی وہ مغرور ہوتے ہیں۔ ان کو یہ گمان تھا کہ اللہ قبروں سے نہ اٹھائے گا یا کوئی رسول نہ بھیجے گا۔ پہلے رسول جو ہو چکے سو ہو چکے۔ انتہیٰ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو حکم دیا کہ تم اپنی قوم کو خبر دو کہ جن اس قرآن کو سن کر ایمان لے آئے اور انھوں نے اس کلام کی تصدیق کی اور اس کے حکم کے فرمانبردار ہوئے۔ ﴿ اَلرُّشْدِ ﴾ سے یہاں مراد سداد اور نجاح ہے، یہ مقام اس کلام کے مشابہ ہے: ﴿ وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ﴾ [الأحقاف: ٢٩] ''اور یاد کرو! جبکہ ہم نے جنوں کی ایک جماعت کو تیری طرف متوجہ کیا کہ وہ قرآن سنیں۔'' اس بارے میں جو احادیث آئی ہیں ہم ان کا ذکر کر چکے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ جَدُّ رَبِّنَا ﴾ سے مراد رب کا فعل، امر اور قدرت ہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ "جد اللّٰه" سے مراد مخلوق پر اللہ کی نعمتیں، قدرت اور انعام ہے۔

امام مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد جلال ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جلال، عظمت اور امر ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امر ہے۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ، امام مجاہد اور ابن جریج رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی "تَعَالٰی ذِكْرُهٗ" ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی "تَعَالٰی رَبُّنَا"۔ پھر جنوں نے جبکہ وہ قرآن پر ایمان لائے اور مسلمان ہو گئے تو اللہ کی صاحبہ و ولدہ سے تنزیہ کی۔ امام مجاہد، عکرمہ، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ "سفیه" سے مراد ابلیس ہے۔ امام ابو مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ شَطَطًا ﴾ بہ معنی جور (ظلم) ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ظلم کثیر۔[1]

---

① تفسیر الطبري (٢٣/٦٤٨_٦٥٠) تفسیر ابن کثیر (٤/٥٥٠)

جنوں کا اقرار کہ اللہ تعالیٰ کے بیوی بچے نہیں ہیں:

احتمال ہے کہ ''سفیہ'' سے مراد اسمِ جنس ہو، یعنی جس کسی کو یہ زعم ہے کہ اللہ بیوی اور بچے رکھتا ہے وہ بڑا احمق ہے۔ لہٰذا کہا کہ ہمارا بے وقوف اسلام لانے سے پہلے اللہ پر ''زُور'' یعنی جھوٹ اور باطل کہتا تھا۔ ہم کو یہ گمان نہ تھا کہ جن اور انسان اللہ پر جھوٹ باندھنے کے لیے بیوی اور بچوں کی نسبت اس کے ساتھ کرنے کی طرف مائل ہوں گے، لیکن جب ہم نے قرآن سنا اور اس پر ایمان لائے تو جان لیا کہ وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے۔ ہم کو یہ اعتقاد تھا کہ ہمیں انسانوں پر فضیلت ہے، اس لیے کہ انسان ہم سے پناہ پکڑتے تھے۔

جنوں کی سرکشی کا ایک بڑا سبب:

جاہلیت میں عرب کی یہ عادت تھی کہ جب بھی وہ کسی وادی میں یا کسی جنگل میں کسی وحشت ناک جگہ پر اترتے تو وہ اس وادی یا جگہ کے عظیم (جن) سے پناہ پکڑتے، اس سے ڈر کر کہ کہیں اس علاقے کے جن! ان کو نہ ستائیں، جس طرح کوئی دشمن کے شہروں میں جاتا تو کسی بڑے شخص کی پناہ و ذمہ وخفارت (امان) لیتا۔ جنوں نے جب دیکھا کہ انسان ہم سے پناہ گیر ہوتے ہیں اور ڈرتے ہیں تو وہ اور بھی خوف دلانے اور ڈرانے میں بڑھ گئے یہاں تک کہ سب سے زیادہ لوگ انہی جنوں سے ڈرتے اور پناہ چاہتے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''رھق'' یعنی جرأت میں زیادہ ہو گئے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی آدمی اپنے اہل کو لے کر نکلتا اور کسی زمین پر اترتا تو کہتا: ''أَعُوذُ بِسَيِّدِ هَذَا الْوَادِي مِنَ الْجِنِّ أَنْ أُضَرَّ أَنَا فِيهِ أَوْ مَالِي أَوْ وَلَدِي أَوْ مَاشِيَتِي'' ''میں اس وادی کے جن سردار کی پناہ پکڑتا ہوں کہ میرے مال واولاد وجانوروں کو کوئی نقصان پہنچے۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے پناہ پکڑنے سے جن اور زیادہ ستانے لگے۔[1] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن انسانوں سے ویسا ہی ڈرتے تھے، جیسا کہ انسان جنوں سے ڈرتے ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ انسان جب کسی وادی میں آ کر اترتے تو جن وہاں سے بھاگ جاتے، قوم کا سردار کہتا: ''أَعُوذُ بِسَيِّدِ هَذَا الْوَادِي'' ''میں اس وادی کے سردار جن کی پناہ پکڑتا ہوں۔'' جنوں نے کہا: یہ تو ہم سے ڈرتے ہیں جس طرح کہ ہم ان سے ڈرتے ہیں، تب وہ انسانوں کے قریب ہونے لگے اور ان کو دیوانہ بنا لیا۔[2] امام ابو العالیہ، ربیع اور زید بن اسلم رحمہم اللہ نے کہا: ''رَهَقًا أَيْ: خَوْفًا''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''أَيْ: إِثْمًا'' یہی امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ''طُغْيَانًا''۔[3] کردم ابن ابی سائب انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں اپنے باپ کے ساتھ مدینے سے کسی کام کو نکلا، اس

---

[1] تفسیر الطبري (٦٥٦/٢٣) تفسیر ابن کثیر (٥٥٠/٤) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٣٧٧/١٠)

[3] تفسیر الطبري (٦٥٦/٢٣) تفسیر ابن کثیر (٥٥٠/٤، ٥٥١)

وقت مکہ میں نبیِ مکرم ﷺ کا ذکر شروع ہوا تھا، رات کو ہم بکریوں کے ایک چرواہے کے پاس رہے۔ آدھی رات کے وقت ایک بھیڑیا آیا اور بکری کا ایک بچہ اٹھا کر لے گیا، چرواہے نے جست کر کے کہا: "يَا عَامِرَ الْوَادِيْ جَارَكَ" "اے اس وادی کے سردار! اپنے پڑوسی کی مدد کر۔" ایک منادی نے، جس کو ہم دیکھ نہیں پاتے تھے، ندا کی: "يَا سَرْحَانُ أَرْسِلْهُ" "اے بھیڑیے! اس بکری کو چھوڑ دے۔" وہ بکری دوڑتی ہوئی آئی اور بکریوں کے ریوڑ میں داخل ہو گئی، اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر مکہ میں یہ آیت اتاری: ﴿ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ... الخ ﴾[1] (رواه ابن أبي حاتم)

امام عبید بن عمیر، مجاہد، ابو العالیہ، حسن، سعید بن جبیر اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے، یہ بھیڑیا، جس نے بکری کا بچہ پکڑ لیا تھا، جن ہو گا تا کہ انسان کو ڈرائے اور وہ اس سے ڈر جائے، پھر جب بکریوں کے چرواہے نے اس کی پناہ پکڑی، تب اس کو چھوڑ دیا، تا کہ وہ آدمی گمراہ ہو جائے خوار ہو کر اپنے دین سے خارج ہو۔[2] (والله أعلم)۔ جنوں نے بھی تمھاری طرح یہ گمان کیا تھا کہ اب اللہ اس مدت کے بعد کوئی رسول مبعوث نہ کرے گا۔[3] (قاله الكلبي و ابن جرير)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے: اے محمد! تم لوگوں سے کہہ دو مجھ کو وحی آئی ہے، یعنی تا کہ وہ یہ بات جان لیں کہ تم جنوں کی طرف بھی مبعوث ہو انسانوں کی طرح اور قریش یہ معلوم کر لیں کہ باوجود سرکشی کے جن قرآن سن کر اور قرآن کا اعجاز پہچان کر ایمان لائے ہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ نے جنوں کو دیکھا یا نہیں۔ قرآن کا ظاہر یہ ہے کہ نہیں دیکھا، بلکہ جنوں کا قرآن کو سن کر ایمان لانا جبریل علیہ السلام کی زبان سے وحی کے ذریعے معلوم ہوا۔ صحیح میں مروی ہے: « مَا قَرَأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلَى الْجِنِّ وَمَا رَآهُمْ »[4] "رسول اللہ ﷺ نے جنوں پر قرآن پڑھا اور نہ ان کو دیکھا۔" عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں، بلکہ نبی ﷺ نے ان کو دیکھا۔ اسی کو علماء نے راجح کہا ہے اور یہ دونوں قول صحیح ہیں اور پہلی بات پہلے ہوئی، پھر یہ سورت آئی۔ پھر حکم ہوا کہ تم ان کے پاس جاؤ۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ سورت جس کو نبیِ کریم ﷺ پڑھتے تھے: ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ﴾ [العلق: ۱] "پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا" تھی۔ اس کا ذکر سورۃ الاحقاف میں ہو چکا ہے۔[5]

﴿ نَفَرٌ ﴾ جماعت کو کہتے ہیں جو تین سے دس تک ہو۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا: وہ نو (۹) جن تھے۔ بعض نے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۳۷۷) اس کی سند میں "عبدالرحمن بن اسحاق" ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسیر ابن کثیر (٤/٥٥١)
[3] تفسیر الطبري (۲۳/٦٥٧) [4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٤٤٩) [5] فتح البیان (۱٤/۳٤۹)

کہا: سات تھے۔[1] جنوں کے وجود کے بارے میں لوگوں کو قدیماً وحدیثاً اختلاف ہے۔ اکثر فلسفی منکر ہیں اور ان کی ایک جماعت اعتراف کرتی ہے۔ وہ جن کو ارواحِ سفلیہ کہتے ہیں اور ان کا یہ اعتقاد ہے کہ ارواحِ فلکیہ کی نسبت اسرع الإجابة (جلدی سننے والے) ہیں، مگر اضعف ہیں۔ رہے دوسری ملتوں کے جمہور جو رسولوں اور شریعتوں کے متبعین ہیں وہ سب جنوں کے وجود کے معترف ہیں، اختلاف اگر ہے تو ان کی ماہیت (شکل وصورت) میں۔ کتابِ عزیز اور سنتِ مطہرہ جنوں کے وجود کے متعلق بیان کرتے ہیں تو اب کسی منکر کا اعتبار نہیں رہا۔ إِذَا جَاءَ نَهْرُ اللّٰهِ بَطَلَ نَهْرُ مَعْقِلٍ.

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن، جان کی اولاد ہے۔ یہ شیاطین نہیں ہیں اور امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: ابلیس کی اولاد ہے۔[2] بعض نے کہا: یہ اجسامِ عاقلہ خفیہ ہیں ان پر ناریت (آگ سے ہونا) وہوا غالب ہے اور کہا ہے کہ ارواحِ مجردہ کی ایک قسم ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جن نفوسِ بشریہ ہیں جو بدنوں سے جدا ہو گئے ہیں۔ اہلِ علم کا اس بات میں اختلاف ہے کہ مومنین جن جنت میں جائیں گے یا نہیں، جیسا کہ ان کے نافرمان آگ میں جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق جو سورت تبارک میں ہے: ﴿ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ﴾ [الملك: ٥] ''اور انھیں شیطانوں کو مارنے کا ذریعہ بنا دیا اور شیطانوں کے لیے ہم نے (دوزخ کا جلانے والا) عذاب تیار کر دیا۔'' اور بقول جن جو اس سورت میں ہے: ﴿ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴾ [الجن: ١٥] ''اور جو ظالم ہیں وہ جہنم کا ایندھن بن گئے۔'' وغير ذلك من الآيات.

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنت میں جائیں گے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہیں جائیں گے، اگرچہ نار سے پھیرے جائیں گے لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے اس دلیل سے: ﴿ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴾ [الرحمن: ٥٦] ''ان کو ہاتھ نہیں لگایا کسی انسان یا جن نے اس سے قبل۔'' اس کے سوا سورۃ الرحمٰن میں اور بھی آیتیں ہیں جو جنوں کے بہشت میں جانے پر دلیل ہیں۔[3] حق یہ ہے کہ اللہ نے جنوں میں کوئی رسول نہیں بھیجا، بلکہ سارے رسول نوعِ انسانی ہی میں سے ہوئے ہیں اگرچہ آیت ''قد أرسلنا إليكم رسلا منكم'' میں جن کی رسالت کی طرف اشعار (خبر دی گئی) ہے، بہ خلاف اس کے کہ بہت سی آیتوں میں اس کا انکار ہے۔

یہ آیات اس بات پر دلیل ہیں کہ اللہ نے رسول نہیں بھیجے مگر بنی آدم سے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جن جنوں کا ذکر اس سورۃ الجن میں ہے وہ نصیبین کے جن تھے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ایک گروہ کے ساتھ سوقِ عکاظ کی طرف گئے۔ شیاطین اور آسمان کی خبروں کے درمیان حیلولت (رکاوٹ) ہو گئی اور ان پر شہاب چھوڑے جاتے تھے۔ شیاطین اپنی قوم کے پاس واپس آئے۔ قوم نے کہا: تم کو کیا

---

(1) تفسير البغوي (٨/٢٣٥) (2) تفسير القرطبي (١٩/٥) (3) تفسير القرطبي (١٩/٥، ٦) (4) مسند أحمد (١/٤٥٨)

ہوا ہے؟ کہا: ہمارے اور آسمانی خبروں کے درمیان حیلولت ہوگئی ہے اور ہم کو شہابوں سے مارا جاتا ہے۔ کہا: ضرور کوئی واقعہ ہوا ہے تم زمین کے چاروں طرف پھر جاؤ اور دیکھو کہ وہ کیا امر ہے جس کی وجہ سے تمھارے اور آسمانی خبروں کے درمیان حیلولت ہوگئی ہے۔

وہ لوگ جو تہامہ کی طرف تھے نبی اکرم ﷺ کے پاس پہنچے اس وقت نبیِ کریم ﷺ سوقِ عکاظ کے ارادے سے نکلے ہوئے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ صبح کی نماز پڑھ رہے تھے۔ جنوں نے جب قرآن سنا تو کان رکھا اور کہا کہ یہی ہمارے اور آسمان کی خبر کے درمیان حائل ہے۔ پھر اپنی قوم کے پاس آ کر کہا: "يَا قَوْمَنَا! إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا يَّهْدِيْ إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهٖ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ أَحَدًا" اللہ نے اس پر یہ آیت اتاری: ﴿ قُلْ أُوْحِيَ إِلَيَّ ﴾[1] (رواه أحمد و البخاري و مسلم والترمذي وغيرهم)

"عَجَبَ" سے یہ مراد ہے کہ فصاحت و بلاغت و کثرتِ معانی ونحوہا میں ایک عجیب شے ہے۔ یا وعظ و نصیحت میں یا برکات میں یہ قرآن حق اور ثواب اور ایمان ہے اور ہدایت کا رستہ دکھانے والا ہے۔ یا اللہ کی توحید اور معرفت کی راہ دکھلاتا ہے۔ ہم نے تصدیق کی کہ ہاں یہ اللہ ہی کی طرف سے آیا ہے۔ اب ہم مخلوق میں سے کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں گے اور نہ کسی کو اس کے ساتھ معبود بنائیں گے، کیوں کہ الوہیت اور ربوبیت کے ساتھ ہی متفرد ہے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ وہ جن مشرک تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہودی تھے اور کسی نے کہا ہے کہ نصاریٰ تھے اور بعض نے کہا ہے کہ مجوس تھے۔

اس میں بنی آدم کے کفار کو جھڑکی ہے کہ جن تو قرآن کو سن کر پہلی ہی بار ایمان لے آئے اور آیاتِ یسیرہ کو غور سے سن کر ان سے فائدہ حاصل کیا اور انھوں نے اپنی عقلوں سے یہ معلوم کر لیا کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور انسان کافر اس سے نفع نہیں لیتے۔ خصوصاً ان کے رئیس اور سردار، حالاں کہ وہ مختلف اوقات میں اسے بار بار سنتے ہیں اور وہ اُن پر مکرر پڑھا جاتا ہے اور خود رسول اس قرآن کو ان کی زبان میں پڑھ کر ان کو سناتا ہے۔ لہٰذا اللہ نے ان کو خوب ہی ذلت کی مار دی اور بری طرح قتل کیا۔ رہا آخرت کا عذاب تو وہ دنیا کے عذاب اور آفت سے کہیں بڑھ کر ہے۔

اہلِ لغت کے نزدیک ﴿ جَدُّ ﴾ بہ معنی عظمت وجلال ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد غنا ہے۔[2] مالدار آدمی کو "رَجُلٌ مَجْدُوْدٌ"، یعنی محفوظ کہتے ہیں، یعنی بختاور۔ حدیث میں مروی ہے: « وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ »[3] امام ابوعبیدہ اور اخفش رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ جَدُّ ﴾ بہ معنی ملک و سلطان ہے۔ امام محمد باقر و جعفر صادق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کا کوئی جد نہیں ہے۔ جنوں نے یہ بات جہالت کے طور پر کہی ہے۔[4] بعض نے "جِدٌّ" بہ کسرِ جیم پڑھا

---

[1] صحيح البخاري (٤٦٣٧) صحيح مسلم (٤٤٩) مسند أحمد (٢٥٢/١) سنن الترمذي (٣٣٢٣)

[2] تفسير الطبري (٦٤٩/٢٣) [3] صحيح البخاري (٨٠٨) صحيح مسلم (٥٩٣) [4] تفسير القرطبي (٨/١٩)

ہے جو "هزل" کی ضد ہے۔ اللہ کی شان اس سے بڑی ہے کہ وہ جورو اختیار کرے، کیوں کہ جورو حاجت کے لیے ہوتی ہے اور ولد اُنس کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ ہر نقص سے پاک صاف ہے۔ جنوں نے کفار کی غلطی سے آگاہ کیا کہ وہ اللہ کے لیے جورو اور بیٹا ثابت کرتے ہیں۔

"سفیه" سے مراد جاہل ہے۔ "شطط" سے مراد جھوٹ بولنے میں غلو ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ "سفیه" سے مراد نافرمان اور مشرک جن ہیں، یا ابلیس ہے۔ سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے رفعاً ابلیس ہی کہا ہے۔ (أخرجه الديلمي) امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی سند واہی (کمزور ترین) ہے۔[1] اصل میں "شَطَطٌ: بُعْدٌ عَنِ الْقَصْدِ" کے معنی میں ہے اور حد سے آگے بڑھنا اور اس جگہ کفر میں غلو یا ظلم مراد ہے۔ ہم یہ خیال کرتے تھے کہ جن اور انسان اللہ پر جھوٹ نہیں باندھتے، یہ جو اللہ کے لیے صاحبہ (بیوی) یا اولاد بتاتے ہیں یہ سچ ہوگا، لیکن اب قرآن سن کر ہم نے جان لیا کہ ان کا یہ دعویٰ محض جھوٹ تھا اور جاہلیت کے زمانے میں کچھ لوگ جنوں کی پناہ پکڑتے تھے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے جن کی پناہ پکڑی وہ اہلِ یمن کی ایک قوم تھی، پھر بنی حنفیہ کی قوم تھی، پھر یہ رسم سارے عرب میں چل نکلی۔ جب اسلام آیا تو لوگ اللہ کی پناہ مانگنے لگے اور جنوں کو چھوڑ دیا۔[2]

"رهق" کلامِ عرب میں بہ معنی آثم وغشیانِ محارم ہے۔ یا "رهق" سے مراد خوف ہے۔ جاہل کہتے تھے: "أَعُوْذُ بِفُلَانٍ مِنْ سَادَاتِ الْعَرَبِ مِنْ جِنِّ هٰذَا الْوَادِيْ" "میں اس وادی کے سردار جن کی پناہ پکڑتا ہوں۔" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ لوگ جاہلیت میں جب کسی وادی کے اندر اترتے تو کہتے: "نَعُوْذُ بِسَيِّدِ هٰذَا الْوَادِيْ مِنْ شَرِّ مَا فِيْهِ" "ہم اس وادی کے سردار جن کی اس وادی کے شر و فساد سے پناہ پکڑتے ہیں۔" ان کے اسی امر کے ساتھ بڑی فریفتگی تھی اور یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے ظاہر ہے: ﴿فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا﴾[3]

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝۸ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝۹ وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝۱۰

اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو اسے سخت پہرے داروں اور شہابوں (شعلوں) سے بھرا پایا ⑧ اور یہ کہ ہم آسمان کے ٹھکانوں میں سن گن لینے کو بیٹھا کرتے تھے، چنانچہ اب جو سننے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شہاب اپنی گھات میں پاتا ہے ⑨ اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ کیا زمین والوں کے لیے برا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب نے ان کے لیے بھلائی کا ارادہ کیا ہے ⑩

---

[1] الدر المنثور (۸/۲۹۸) [2] تفسير القرطبي (۱۹/۱۰) [3] الدر المنثور (۸/۳۰۱) فتح البيان (۱۴/۳۴۹-۳۵۵)

بعثتِ رسول سے پہلے جنّوں کا آسمان کی خبریں چرانا:

اللہ تعالیٰ نے جب اپنے رسول کو مبعوث کیا اور ان پر قرآنِ مجید اتارا تو حفاظت کا یہ بندوبست کیا کہ آسمان کو چوکی پہرے والوں سے بھر دیا اور ہر طرف سے شیطانوں کو ان کی نشست کی جگہوں سے اکھیڑا جہاں وہ پہلے بیٹھا کرتے تھے، تاکہ قرآن میں سے کچھ چرا کر کاہنوں کی زبان پر جا کر نہ ڈال دیں اور اس کام میں کوئی التباس (شک وشبہہ) نہ ہو اور سچی اور جھوٹی باتیں آپس میں خلط ملط نہ ہو جائیں۔ یہ مخلوق پر اللہ کا لطف وکرم اور بندوں پر رحمت تھی اور شیاطین کی دست برد سے کتابِ کریم کی حفاظت تھی۔ اب جو کوئی یہ چاہتا کہ آسمان سے کوئی بات ہاتھ لگے تو ایک انگارہ اس کے پیچھے لگ کر اسے ہلاک کر دیتا، اس لیے وہ عاجز ہو کر کہنے لگے کہ ہم نہیں جانتے کہ آسمان میں یہ جو بات ہوگئی ہے، اس سے زمین والوں کے ساتھ کسی شر کا ارادہ ہے یا اللہ نے ان کے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔

اس جگہ عبارت میں ادب کی رعایت رکھی کہ شر کو غیر فاعل کی طرف اسناد کیا۔ حدیث میں ہے: «وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ» ''اور شر کی نسبت تیری طرف نہیں ہے۔'' اور خیر کی اضافت اللہ عزوجل کی طرف کی۔ تارے اس سے پہلے بھی ٹوٹتے تھے، لیکن اتنی کثرت سے نہیں ٹوٹتے تھے، بلکہ گاہے گاہے ایسا ہوتا تھا جس طرح کہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ ہم نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے، اتنے میں ایک تارہ ٹوٹا اور اس کی روشنی ہوئی۔ فرمایا: تم اس بارے میں کیا کہتے تھے؟ ہم نے کہا: ہم یہ کہتے تھے کہ کوئی بڑا شخص پیدا ہوگا یا کوئی بڑا شخص مرے گا۔ فرمایا: یہ بات نہیں ہے، لیکن جب اللہ آسمان میں کوئی حکم جاری کرتا ہے...۔[1] (الحديث)

یہ مکمل حدیث سورت سبا میں گزر چکی ہے،[2] اسی وجہ سے جنّ اس کا سبب تلاش کرنے کے لیے زمین کے چاروں طرف دوڑے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ نماز پڑھتے ہوئے پایا، جان گئے کہ اسی وجہ سے آسمان کی حفاظت کی گئی ہے۔ کچھ تو ایمان لائے اور کچھ اپنی سرکشی پر باقی رہے جس طرح کہ سورۃ الاحقاف میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث گزر چکی ہے۔[3] اس میں شک نہیں ہے کہ جب یہ امر حادث ہوا، یعنی آسمان میں شہابِ ثاقب کی کثرت ہوئی اور ان سے جنوں کو مارنے لگے تو جنوں اور انسانوں سب کو ایک ہول سا ہوا اور وہ ڈر گئے اور انھوں نے یہ گمان کیا کہ یہ امر جہان کی ویرانی کے لیے ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آسمان کی حراست نہ ہوتی تھی، مگر اس وقت کہ جب زمین پر کوئی نبی یا اللہ کا دین ظاہر ہوتا۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے شیاطین آسمانِ دنیا پر جا کر جگہ جگہ بیٹھ جاتے اور آسمان میں جو کوئی نئی چیز ہوتی اس کا پتا لگاتے۔ جب نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو ایک رات ان شیاطین پر انگاروں کی بھرمار ہوئی۔ اہلِ طائف

(1) صحیح مسلم، رقم الحديث (٢٢٢٩) (2) رقم الآية (٢٣) (3) رقم الآية (٢٩)

اس سے سخت گھبرائے اور کہا کہ آسمان والے ہلاک ہوئے، یہ اس لیے کہا ہے کہ آسمان پر آگ کی شدت دیکھی اور تاروں کا ٹوٹنا پایا، اپنے غلاموں کو آزاد کرنے لگے اور چارپایوں کو چھوڑ دیا۔ عبد یا لیل بن عمرو بن عمیر نے کہا: اے اہلِ طائف! تم پر افسوس ہے تم اپنے اموال کو روکو اور معالمِ نجوم، یعنی ستاروں کی طرف دیکھو، اگر ان کو اپنی اپنی جگہوں میں ٹھہرا ہوا پاؤ تو جان لو کہ آسمان والے ہلاک نہیں ہوئے۔ یہ بات ابن ابی کبشہ، یعنی محمد ﷺ کے سبب سے ہوئی ہے اور اگر دیکھو کہ تارے اپنی جگہوں میں نہیں ہیں تو جان لو کہ آسمان والے ہلاک ہوئے۔ دیکھا تو سب تارے موجود تھے وہ اپنے مال کے خرچ کرنے سے رک گئے۔

اس رات شیاطین کو عجیب طرح کی گھبراہٹ تھی، ابلیس کے پاس آ کر کہا کہ یہ ماجرا گزرا ہے۔ اس نے کہا کہ تم ہر زمین سے ایک مٹھی خاک میرے پاس لاؤ، میں اس کو سونگھوں، وہ لائے تو اس نے سونگھ کر کہا: تمھارا صاحب مکہ میں ہے۔ نصیبین کے سات (۷) جنوں کو روانہ کیا، وہ مکہ آئے نبیِ مکرم ﷺ کو مسجد الحرام میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا، آپ ﷺ قرآن پڑھ رہے تھے، آپ ﷺ کے نزدیک ہوئے قرآن کے سننے پر حرص کی، یہاں تک کہ قریب تھا کہ ان کے سینے آپ ﷺ کو پہنچیں اللہ نے ان کے حال کی وحی نبیِ مکرم ﷺ پر اتاری۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس فصل کا ذکر کتاب "السیرة" کے شروع میں مفصل کیا ہے۔[1] واللّٰہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ جنوں نے کہا کہ ہم نے آسمان کو چھوا، یعنی ہم آسمان کی خبر کے طالب ہوئے۔ "لمس" بہ معنی "مس" ہے، اس کو طلب کے لیے استعارہ کیا ہے۔ "حرس شدید" سے مراد جمعِ اقویا تمام قویٰ کو جمع کرنا ہے، اس جمع سے مراد نگہبان فرشتے ہیں جو چوری چھپے باتیں سننے سے روکتے ہیں۔ "حرس" "حارس" کی جمع ہے۔ "حارس" بہ معنی نگہبان ہے، اس کا مصدر حراست ہے یا "حرس" اسم مفرد ہے بہ معنی "حراس" جیسے خدم بہ معنی خدام۔ "مقاعد" سے مراد وہ جگہیں ہیں کہ وہاں خبریں سننے کے لیے بیٹھتے تھے۔ سرکشان جن کا دستور تھا کہ ملائکہ سے آسمان کی خبر لگاتے اور کاہنوں کو آ کر سناتے۔ اللہ پاک نے جب محمد ﷺ کو مبعوث کیا تو آسمان کی حراست شہبِ محرقہ (جلانے والے شہاب) سے فرمائی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آسمان پر جابجا وحی سننے کے لیے بیٹھتے، جب کوئی کلمہ سنتے تو نو کلمے اپنی طرف سے ملا کر پہنچاتے۔ وہ کلمہ تو حق ہوتا اور جو اپنی طرف سے بڑھاتے وہ باطل ہوتا۔ جب نبیِ کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو ان کا بیٹھنا بند ہو گیا، یہ ذکر ابلیس سے کیا، اس سے پہلے تارے نہ ٹوٹتے تھے۔ ابلیس نے کہا: یہ بات اس لیے ہے کہ زمین میں کوئی نیا امر پیدا ہوا ہے، اس نے اپنے لشکر کو بھیجا، انھوں نے نبیِ کریم ﷺ کو مکہ میں

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٥٥١، ٥٥٢)

دو کوہ کے درمیان نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ واپس آ کر ابلیس کو خبر دی۔ اس نے کہا: یہی حادثہ زمین میں ہوا ہے۔[1] (أخرجه أحمد والترمذي وصححه والنسائي وغيرهم)

اہلِ علم کا اس بات میں اختلاف ہے کہ رمیِ شیاطین (شیاطین کو شہاب سے مارنا) رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی ہوتی تھی یا نہیں؟ ایک قوم نے کہا کہ نہیں ہوتی تھی۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے معمر سے نقل کیا ہے کہ میں نے زہری رحمہ اللہ سے کہا: کیا جاہلیت میں بھی رمی بالنجوم ہوتی تھی؟ کہا: ہاں۔ میں نے کہا: اس آیت کا حال کیا ہے: ﴿ أَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ﴾ کہا جب نبی اکرم ﷺ مبعوث ہوئے تو اس امر کی سختی اور شدت بڑھ گئی۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مبعث سے پہلے بھی تارے ٹوٹتے تھے، لیکن نگرانی کی اس قدر شدت نہ تھی جو مبعث کے بعد ہوئی۔ وہ بعض احوال میں کوئی بات چرالاتے جب مبعث ہوئی تو بالکل روک دیے گئے۔

عبدالمالک بن سابور نے کہا ہے کہ آسمان عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ کے زمانہ فترت (جس زمانے میں کوئی رسول نہ ہو) میں محروس نہ تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی مبعث کی وجہ سے آسمان محروس ہوا اور شیاطین کو انگاروں سے مارنے لگے اور انھیں آسمان کے قریب آنے سے روک دیا گیا۔ امام نافع بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شیاطین فترت میں سنتے تھے، لیکن مرمی (رمی سے مارا جانا) نہیں ہوتے تھے، مبعث کے بعد مار پڑنے لگی۔[2] امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا کہ صحیح یہ ہے کہ یہ رمی بعث سے قبل بھی تھی، جب نبی اکرم ﷺ مبعوث ہوئے تو رجم کی کثرت ہوگئی اور خوب زیادہ ہوگئی، یہاں تک کہ جن اور انسان متنبہ ہوگئے اور بات چرانے سے روک دیے گئے۔[3] امام ابن زید رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ شیطان نے کہا: ہم نہیں جانتے کہ اس منع کرنے سے اللہ کا ارادہ کیا ہے، وہ کوئی عذاب زمین پر اتارے گا یا کوئی رسول بھیجے گا۔[4] لیکن یہ بات زیادہ بہتر ہے کہ یہ قول جنوں کا آپس میں تھا نہ کہ قول ابلیس کا۔[5]

وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآىِٕقَ قِدَدًا ۟ۙ (11)
وَّاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ
هَرَبًا ۟ۙ (12) وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤی اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ یُّؤْمِنْ
بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ۟ۙ (13) وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ
وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۟ (14)
وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۟ۙ (15) وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا
عَلَی الطَّرِیْقَةِ لَاَسْقَیْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ۟ۙ (16) لِّنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ ؕ وَمَنْ
یُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ یَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ۟ۙ (17)

---

[1] مسند أحمد (٣٢٣/١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٢٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٥٠٠/٦) [2] فتح القدير (٤٠٥/٥)
[3] الكشاف (٦٢٨/٤) [4] تفسير القرطبي (١٤/١٩) [5] فتح البيان (٣٥٦/١٤_٣٥٨)

اور یہ کہ ہم میں سے نیک بھی ہیں اور اس کے سوا بھی ہیں، ہم مختلف طریقوں (مذاہب) پر تھے ⑪ اور یہ کہ ہمیں یقین ہو چکا کہ ہم اللہ کو زمین میں ہرگز عاجز نہیں کر سکتے اور نہ (کہیں) بھاگ کر ہی عاجز کر سکتے ہیں ⑫ اور یہ کہ جب ہم نے ہدایت (کی بات) سنی تو اس پر ایمان لے آئے، پھر جو کوئی اپنے رب پر ایمان لائے تو اسے نہ تو کسی نقصان کا خوف ہوگا اور نہ ظلم کا ⑬ اور یہ کہ ہم میں مسلمان بھی ہیں اور ظالم بھی، پھر جو کوئی اسلام لائے تو انھوں نے ہدایت کی راہ ڈھونڈ لی ⑭ اور لیکن جو ظالم ہیں تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں ⑮ اور (وحی کی گئی ہے) کہ اگر (لوگ) سیدھی راہ پر قائم رہتے تو ہم انھیں خوب سیراب کرتے ⑯ تاکہ ہم اس میں انھیں آزمائیں، اور جو کوئی اپنے رب کے ذکر سے منہ موڑے گا تو اسے وہ بڑھتے چڑھتے عذاب میں مبتلا کرے گا ⑰

جنّوں میں مومن بھی ہیں اور کافر بھی:

اللہ پاک نے جنوں کے حال کی خبر دی ہے کہ انھوں نے اپنا حال یوں بیان کیا کہ ہم مختلف راہوں اور متفق رایوں پر تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ ﴿طَرَآىِٕقَ قِدَدًا﴾ سے مراد یہ ہے کہ ہم میں کوئی مومن اور کوئی کافر تھا۔ امام اعمش رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک جن آتا تھا۔ میں نے کہا: تمھیں کون سا کھانا پسند ہے؟ کہا: چاول، میں چاول لایا، دیکھا کہ لقمہ اٹھاتا ہے اور کوئی اٹھانے والا نظر نہیں آتا۔ میں نے کہا: تم میں بھی یہ خواہشات ہیں جو ہم میں ہیں؟ کہا: ہاں۔ میں نے کہا: تم میں رافضی کون ہیں؟ کہا: ہم میں سے بدترین ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ اسناد اپنے شیخ حافظ ابو الحجاج مزی پر عرض کی، کہا: "هٰذَا إِسْنَادٌ صَحِيْحٌ إِلَى الْأَعْمَشِ"[1] حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے عباس بن احمد دمشقی کے ترجمے میں ذکر کیا ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے کسی جن کو سنا اور میں اس وقت اپنے گھر میں تھا کہ اس نے یہ پڑھا:

قُلُوْبٌ بَرَاهَا الْحُبُّ حَتّٰى تَعَلَّقَتْ ... مَذَاهِبُهَا فِيْ كُلِّ غَرْبٍ وَّشَارِقٍ
تَهِيْمُ بِحُبِّ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَبُّهَا ... مُعَلَّقَةٌ بِاللّٰهِ دُوْنَ الْخَلَائِقِ[2]

"محبتِ خدا نے دلوں کو پُر کر دیا ہے، یہاں تک کہ مشرق و مغرب میں اس کی جڑیں جم گئی ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کی محبت میں حیران و پریشان اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں جو ان کا رب ہے، انھوں نے مخلوق سے کٹ کر اللہ تعالیٰ سے تعلقات جوڑ لیے ہیں۔"

امام ربانی قاضی محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ کی ایک جن سے ملاقات ہوئی، اس نے ان سے مصافحہ کیا۔ یہ کہتے ہیں: میں نے اس کا کفِ دست بہت چوڑا پایا اور انگلیاں ایک پور کے برابر تھیں، ہمارے جیسی نہ تھیں کہ ہر انگلی میں

[1] تفسیر ابن کثیر (٥٥٢/٤) [2] تاریخ دمشق (٢٤٣/٢٦)

تین تین پور ہوتے ہیں۔ پھر جن نے کہا: ہم جانتے ہیں کہ اللہ کی قدرت ہم پر حکمران ہے، ہم اس کو زمین میں عاجز نہیں کر سکتے، اگرچہ کتنا ہی کیوں نہ بھاگیں، وہ قادر ہے۔ ہم میں سے کوئی اس کو تھکا نہیں سکتا۔ ہم نے ہدایت سن کر یقین کیا۔ وہ اس بات پر فخر کرتے تھے اور بلاشبہ یہ امر ان کے لیے باعث فخر و شرفِ رفیع وصفت حسنہ ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ "بخس و رھق" سے یہ مراد ہے کہ ان کے حسنات کم ہوں اور نہ دوسروں کی برائیاں ان پر لادی جائیں،[1] جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴾ [طه: ١١٢] "نہ اسے بے انصافی کا کھٹکا ہوگا نہ حق تلفی کا۔"

"قاسط" وہ ہے جو حق سے جدا اور علاحدہ ہو اور "مقسط" وہ ہے جو عادل ہے۔ "تحری" سے مراد اپنے نفس کے لیے نجات طلب کرنا ہے۔ "حطب" سے مراد ایندھن ہے۔ قاسطین جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ پھر فرمایا کہ اگر یہ قاسطین، یعنی حق سے منہ پھیرنے والے طریقۂ اسلام پر قائم رہتے اور اس پر ہمیشگی اختیار کرتے اور حق کی طرف آتے تو ہم ان کو بہت سا پانی پلاتے، یعنی وسیع رزق دیتے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ﴾ [المائدة: ٦٦] "اور اگر یہ لوگ تورات اور انجیل اور ان کی طرف جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمایا گیا ہے ان کے پورے پابند رہتے تو یہ لوگ اپنے اوپر سے اور نیچے سے روزیاں پاتے اور کھاتے۔" اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح: ﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الأعراف: ٩٦] "اور اگر بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیزگاری اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے۔"

معلوم ہوا کہ صراطِ مستقیم دینِ حق پر استقامت کرنے سے رزق کا ادرار (فراوانی) ہوتی ہے اور اس کے برعکس حال الٹ ہو جاتا ہے جس طرح کہ ہمارے اس زمانے میں اہلِ اسلام کی کیفیت ہوگئی ہے کہ استقامت چھوڑ دینے کی وجہ سے کم رزق اور ذلیل وخوار ہو گئے ہیں۔ اس بنیاد پر اس جگہ افتتان کے معنی اختیار و امتحان کے ہیں جس طرح کہ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے: "تاکہ ہم انھیں آزمائیں کہ کون ہدایت پر قائم رہتا ہے اور کون گمراہ ہوتا ہے۔" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "استقامت علی الطریقة" سے مراد طاعت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسلام ہے، یہی قول امام سعید بن جبیر، سعید بن المسیب، عطا، سدی، محمد بن کعب قرظی رحمہم اللہ کا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: "اگر وہ سب ایمان لاتے تو ہم ان کو دنیا سے وسعت عطا فرماتے۔" امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد طریقۂ حق ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں اور اس پر دونوں مذکورہ آیات سے استشہاد کیا ہے۔ سب کا یا اکثر کا قول یہی ہے کہ اس جگہ فتنے سے مراد ابتلاء ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت کفارِ قریش کے حق میں اتری ہے، جبکہ سات سال تک قحط میں گرفتار رہے۔[2]

---

[1] تفسیر الطبري (٦٦٠/٢٣) [2] تفسیر الطبري (٢٣/٦٦٢۔٦٦٣) تفسیر ابن کثیر (٥٥٣/٤)

اس آیت کے معنی میں دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ اَلطَّرِيْقَةِ ﴾ سے مراد ضلالت ہے، یعنی ہم ان پر دنیا کی توسیع استدراج کے طور پر کرتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٤٤] ''پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کشادہ کر دیے یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو ان کو ملی تھیں وہ خوب اترا گئے ہم نے ان کو دفعتاً پکڑ لیا، پھر تو وہ بالکل مایوس ہو گئے۔'' نیز جیسا کہ اس کا فرمان ہے: ﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّ بَنِيْنَ ۝ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ٥٥- ٥٦] ''کیا یہ (یوں) سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم جو بھی ان کے مال و اولاد بڑھا رہے ہیں وہ ان کے لیے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں؟ (نہیں نہیں) بلکہ یہ سمجھتے ہی نہیں۔''

یہ قول ابومجلز لاحق بن حمید رحمہ اللہ کا ہے، کیوں کہ انھوں نے کہا ہے کہ ''وَأَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ أَيْ: طَرِيْقِ الضَّلَالَةِ'' اس کو بغوی رحمہ اللہ نے ربیع بن انس، زید بن اسلم کلبی اور ابن کیسان رحمہم اللہ سے حکایت کیا ہے۔[1] ﴿ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ﴾ اسی کا موید ہے۔ اس معنی کا مصداق اس زمانے میں زمین کے ہر حصے میں اِلا ماشاء اللہ موجود ہے، جو دولت، حکومت، ثروت اور رزق کی فراوانی جو اہلِ ضلالت کو حاصل ہے وہ کسی فردِ بشر پر مخفی نہیں ہے اور جو کوئی اس گمراہی کے راستے پر مستقیم ہے، وہ نہایت خوش حالی میں بسر کر رہا ہے اور جو راہِ سنت پر چلتا ہے، وہ خونِ جگر پیتا ہے، اس کے لیے رزق کی تنگی اور انتہاکِ آبرو ہی سرمایہ ہے۔ عذابِ صعد سے مراد سخت عذاب ہے جو بہت شاق، جوڑ جوڑ کو الگ کرنے والا اور دردناک ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا: یعنی ایسی مشقت کا عذاب جس کے ساتھ کچھ راحت نہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ جہنم میں ایک پہاڑ ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دوزخ میں ایک کنواں ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ بعض جنات نے بعض سے کہا کہ قرآن سننے سے پہلے ہم میں بعض لوگ اچھی صفات والے تھے اور بعض اچھی صفات والے نہ تھے اور بعض نے کہا: اچھی صفات والوں سے مراد مومنین ہیں اور ان کے علاوہ جو تھے وہ کفار تھے۔ پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد مسلم اور مشرک ہے۔[3] ﴿ طَرَآئِقَ قِدَدًا ﴾ سے مراد متفرق جماعتیں اور مختلف فرقے ہیں۔ یعنی مختلف اصناف اور علاحدہ علاحدہ مذاہب کے ماننے والے، ''قِدَة'' کسی شے کے حصے، یعنی ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ امام سدی اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد مختلف

---

[1] تفسیر الطبري (٦٦٣/٢٣) تفسیر البغوي (٢٤١/٨) [2] تفسیر الطبري (٦٦٤/٢٣) تفسیر ابن کثیر (٣٣٥/٤)

[3] تفسیز الطبري (٦٥٩/٢٣)

دین ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مختلف اھواء (خواہشات، خیالات) ہیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "أھواء شتی"۔[2] امام سعید بن میتب رحمہ اللہ نے کہا: مسلمان و یہود و نصاریٰ و مجوس تھے، یہی قول مجاہد رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: جن بھی تمھاری طرح قدریہ، مرجیہ، خوارج، روافض اور شیعہ وسنیہ ہیں۔[3] (وكذا قال السدي)

اس جگہ ظن سے مراد علم و یقین ہے، یعنی تفکر اور آیاتِ الٰہی میں استدلال سے ہم نے یقین کیا کہ ہم زمین میں کسی جگہ بھی ہوں اللہ پاک کو عاجز نہیں کر سکتے اور نہ اس سے بھاگ کر بچ سکتے ہیں۔ یہ جنات کے عقائد و احوال کا ذکر ہے۔ ہم نے جب ھدیٰ، یعنی قرآن کو سنا ہم ایمان لائے، ہم نے اس کی تصدیق کی، بے شک یہ اللہ ہی کے پاس سے آیا ہے اور کافر انسانوں کی طرح ہم نے اس کو نہیں جھٹلایا۔ جو اللہ پر ایمان لاتا ہے اس کو کمی و ظلم و مکروہ کا کچھ خوف نہیں ہوتا۔ "بخس" بہ معنی نقصان ہے اور "رھق" بہ معنی عدوان و طغیان۔ ہم میں کچھ لوگ مسلمان ہیں یہ وہ ہیں جو نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے اور کچھ لوگ ستمگار جائرین ہیں جو منکر ہوئے اور طریقِ حق سے طریقِ باطل کی طرف جھکے۔

حکایت:

حجاج نے جب امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کو قتل کرنا چاہا، کہا: تو میرے حق میں کیا کہتا ہے؟ انھوں نے کہا: "قَاسِطٌ عَادِلٌ" قوم نے کہا: اس نے کیا اچھی بات کہی، قسط و عدل کے ساتھ وصف کیا۔ حجاج نے کہا: اے جاہلو! اس نے مجھ کو ظالم مشرک کہا، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴾[4] اور قولہ تعالیٰ: ﴿ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ۱] "پھر بھی کافر لوگ (غیر اللہ کو) اپنے رب کے برابر قرار دیتے ہیں۔" (ذكره الخطيب)

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا: "تحری" طلبِ احری والیق کو کہتے ہیں، اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جن جنت میں ثواب پائیں گے اور اُن میں سے اللہ کے علم میں جو قاسط ظالم ہیں، وہ دوزخ کے ایندھن ہوں گے، جہنم کو ان سے سلگائیں گے جس طرح کہ کافر انسانوں سے اس کو تیز کریں گے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ کافر جن کو آگ کا عذاب ہوگا۔[5] جن اگرچہ آگ سے پیدا ہوئے ہیں، لیکن اس کیفیت سے بدل کر گوشت اور خون کے بن کر دوزخ میں عذاب دیے جائیں گے، اسی طرح کہا ہے۔ نیز زیادہ تیز آگ کمزور آگ کو کھا لیتی ہے۔ ضعیف قوی کا ایندھن ہو جاتا ہے۔ ﴿ الطَّرِيْقَةِ ﴾ طریقہ سے مراد اسلام ہے اور پانی سے رزق کی فراوانی مراد ہے۔ یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ﴾ [الأعراف: ٩٦] "اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز گاری اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے۔"

---

[1] تفسير القرطبي (١٥/١٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٧٧/١٠) [3] تفسير القرطبي (١٥/١٩)
[4] تفسير الرازي (٦٢٨/٤) [5] تفسير النسفي (٢٨٨،٢٨٧/٤)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ قول: ﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ [الطلاق: ۲- ۳] ''اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو۔'' نیز اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرح ہے: ﴿ اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ ﴾ [نوح: ۱۰- ۱۲] ''اپنے رب سے اپنے گناہ بخشواؤ (اور معافی مانگو) وہ یقیناً بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان کو خوب برستا ہوا چھوڑ دے گا اور تمھیں خوب پے در پے مال اور اولاد میں ترقی دے گا۔'' امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر ان کا باپ اللہ کی عبادت پر مستقیم رہتا اور آدم علیہ السلام کو سجدہ کرتا اور کافر نہ ہوتا اور اس کی اولاد اسلام پر اس کی تابع ہوتی تو ہم ان پر انعام کرتے[1] اور امتحان لیتے کہ یہ کس طرح نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں۔

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر کفر کے طریقے پر جمے رہتے اور سب کے سب کافر ہوتے تو ہم ان پر رزق فراخ کرتے، یہ ہمارا مکر اور استدراج ہوتا، تاکہ یہ فتنے میں پڑ کر دنیا اور آخرت میں عذاب دیے جاتے،[2] اللہ تعالیٰ کے اس قول کی دلیل سے: ﴿ وَلَوْ لَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴾ [الزخرف: ۳۳] ''اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ تمام لوگ ایک ہی طریقے پر ہو جائیں گے تو رحمان کے ساتھ کفر کرنے والوں کے گھروں کی چھتوں کو ہم چاندی کی بنا دیتے اور زینوں کو (بھی) جن پر چڑھا کرتے۔'' لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جہاں پانی ہوتا ہے وہاں مال ہوتا ہے اور جہاں مال ہوتا ہے وہاں فتنہ ہوتا ہے۔[3] ذکرِ رب سے مراد قرآن ہے یا عبادت یا موعظت یا توحید یا یہ سب امور۔

''صعد'' سے مراد شاق و تکلیف ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''صعد'' سے مراد چکنا پتھر ہے جو جہنم میں ہوگا، اہلِ نار کو اس پر چڑھنے کی تکلیف دیں گے۔ وہ جب پتھر کی چوٹی تک پہنچیں گے تو اوپر سے جہنم میں پھسل پڑیں گے،[4] جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴾ [المدثر: ۱۷] ''عنقریب میں اسے ایک سخت چڑھائی چڑھاؤں گا۔'' ﴿ صَعُوْدًا ﴾ ''عقبہ کؤد'' (پہاڑ کی چوٹی) کو کہتے ہیں۔[5]

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۝۱۸ وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ
عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ۝۱۹ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا
رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ۝۲۰ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝۲۱

[1] فتح القدير (٥/٤٠٨) [2] تفسير القرطبي (١٩/١٨، ١٩) [3] تفسير الطبري (٢٣/٦٦٣)
[4] تفسير القرطبي (١٩/٢٠) [5] فتح البيان (٢٤/٣٥٨_٣٦٢)

قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ۬ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۙ﴿۲۲﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ﴿۲۳﴾ حَتّٰۤی اِذَا رَاَوْا مَا یُوْعَدُوْنَ فَسَیَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾

اور یہ کہ مسجدیں اللہ ہی کے لیے ہیں، لہٰذا اللہ کے ساتھ کسی کو بھی نہ پکارو (18) اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ (محمد ﷺ) اللہ کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا تو قریب تھا کہ لوگ (کفار) اس پر ٹوٹ پڑیں (19) کہہ دیجیے: بے شک میں اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا (20) کہہ دیجیے: بلاشبہ میں تمھارے لیے کسی نقصان کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ بھلائی کا (21) کہہ دیجیے: یقیناً مجھے اللہ (کے عذاب) سے کوئی پناہ نہ دے گا اور اس کے سوا میں ہرگز کوئی جائے پناہ نہیں پاؤں گا (22) اللہ کا حکم اور اس کے پیغام پہنچانے کے سوا (میں کوئی اختیار نہیں رکھتا) اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو بے شک اس کے لیے آتشِ جہنم ہے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ابد تک (23) حتی کہ جب وہ دیکھیں گے جس (عذاب) کا اُن سے وعدہ کیا جاتا ہے تو انھیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار کمزور تر اور تعداد میں کم تر ہیں (24)

توحید اختیار کرنے اور شرک سے کنارہ کشی کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا کہ عبادت کی جگہوں میں اس کی توحید کریں اور اس کے ساتھ کسی اور کو ہرگز نہ پکاریں اور شریک نہ ٹھہرائیں جس طرح کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾ کے بارے میں کہا ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے کلیساؤں اور گرجا گھروں میں جاتے تو اللہ کے ساتھ اَوروں کو بھی شریک کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ سب لوگ صرف اللہ کی توحید کریں کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہرائیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جس دن یہ آیت اتری اس دن زمین میں سوائے مسجد الحرام اور مسجد ایلیا، یعنی بیت المقدس کے کوئی مسجد نہ تھی۔[2] امام اعمش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم کو اجازت دیں، ہم بھی آپ کے ہمراہ نمازوں میں آپ کی مساجد میں حاضر ہوا کریں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری کہ تم نماز پڑھو، لوگوں سے مخالطت نہ کرو، یعنی ان میں گھل مل نہ جاؤ۔[3]

[1] تفسير الطبري (٦٦٥/٢٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٧٨/١٠) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٧٨/١٠) یہ روایت مرسل ہے۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنّوں نے عرض کی: ہم کس طرح مسجد میں آئیں، ہم آپ سے دور رہتے ہیں۔ یا کس طرح ہم نماز میں حاضر ہوں اور ہم دور ہیں؟ اس پر یہ آیت آئی۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت سب مسجدوں کے حق میں اتری ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اعضائے سجود کے حق میں آئی ہے، یعنی یہ مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، اس میں غیر اللہ کے لیے سجدہ نہ کرنا چاہیے۔[1] اس جگہ پر ایک صحیح حدیث کا ذکر کیا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے رفعاً کہا ہے، مجھ کو حکم ہوا ہے کہ میں سات عضو پر سجدہ کیا کروں: پیشانی پر اور ناک کی طرف اشارہ کیا اور دونوں ہاتھ اور دونوں زانو اور قدموں کے اطراف پر۔[2] (رواه عبد الرزاق بن طاؤس عن أبيه عن ابن عباس رضي الله عنهما)

جنّوں کا قرآن کی سماعت کی طرف لپکنا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو حرص کے مارے آپ سے قریب ہونے لگے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر نہ ہوئی، یہاں تک کہ رسول (فرشتہ) آیا اور ﴿قُلْ اُوْحِيَ﴾ لایا۔ یہ قول سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جنّوں نے اپنی قوم سے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے ہیں اور اُن کے اصحاب ان کے ہمراہ رکوع وسجدہ بجالاتے ہیں۔ ان کو اصحاب کی طواعیت (اتباع) پر تعجب ہوا اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ اللہ کا بندہ جب کھڑا ہوتا ہے تو لوگ اس پر اکٹھے ہونے لگتے ہیں۔ یہ دوسرا قول امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کھڑے ہو کر لا الہ الا اللہ کہتے ہیں اور لوگوں کو اُن کے رب کی طرف بلاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ان پر عرب لوگ سب کے سب جمع ہو جائیں گے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انسانوں اور جنّوں کا اس امر پر اکٹھ ہو جاتا ہے، تاکہ ان کو زیر کریں، لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ مانا، مگر ان کی مدد کرنا اور دشمن پر ان کو غالب کرنا۔ یہ تیسرا قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابن زید رحمہ اللہ کا قول اختیار کیا ہے[3] اور وہی زیادہ ظاہر ہے، اس کے بعد یہ فرمایا ہے: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا﴾ یعنی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء دی اور مخالفت کر کے ستایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا اور سب نے مل کر ایکا کیا کہ جو حق آپ صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں، اس کو باطل کریں اور آپ کی دشمنی پر مجتمع ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ میں تو صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں، یعنی صرف اللہ کی عبادت کرتا ہوں اور اسی کی پناہ پکڑتا ہوں اور اسی پر بھروسا رکھتا ہوں، کسی کو اس کا شریک نہیں کرتا، میں تو تمھاری طرح کا ایک بشر ہوں

---

[1] تفسير الطبري (٢٣/٦٦٥) تفسير ابن كثير (٤/٥٥٤) [2] صحيح البخاري (٧٧٩) صحيح مسلم (٤٩٠)

[3] تفسير الطبري (٢٣/٦٦٦_٦٦٨)

میرے پاس وحی آتی ہے اور میں اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں، مجھ کو تمھاری ہدایت یا گمراہی کے بارے میں کسی شے میں کوئی اختیار نہیں ہے، بلکہ اس سب امر کا لوٹنا اللہ ہی کی طرف ہے، پھر اپنے نفس کی خبر دی کہ اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو کوئی شخص مجھ کو اللہ کے عذاب سے نہیں چھڑا سکتا اور نہ ہی میرے لیے اللہ کے سوا کوئی سرک جانے کی جگہ ہے۔

رسول کے ذمے صرف پہنچا دینا ہے:

امام مجاہد اور سدی رحمہ اللہ نے کہا: "ملتجد" سے مراد ملجا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ملجا و نصیر ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ معنی ولی وموئل ہے۔[1] مگر یہی رسالت کو پہنچا دینا مجھ کو رہائی دے سکتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ﴾ [المائدة: ٦٧] "اے رسول! جو کچھ بھی آپ کی طرف رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے پہنچا دیجیے، اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی اور آپ کو اللہ تعالیٰ لوگوں سے بچا لے گا۔" اب جو کوئی اس بلاغ کے بعد اللہ اور رسول کا نافرمان ہوگا اس کی جزا جہنم ہے، وہ ہمیشہ اس میں رہا کرے گا، کبھی دوزخ سے باہر نہ ہوگا، یہ جنوں اور انسانوں کے مشرکین قیامت کے دن جب وعدہ کو سچا دیکھیں گے تب جان لیں گے کہ کس کی مدد کمزور تھی اور کس کی گنتی تھوڑی تھی، مومنین موحدین کی یا مشرکین کی جن کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اللہ کے لشکر کے سامنے یہ بہت تھوڑے ہوں گے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اللہ نے مجھ کو وحی کی کہ یہ مسجدیں اللہ کے ساتھ مختص ہیں۔ مسجد وہ جگہ ہے جو نماز کے لیے بنائی جاتی ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: مساجد سے مراد بقاع (گھر، جگہ) ہیں، اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کے لیے ساری زمین مسجد کر دی گئی۔ یا اس سے مراد سجدہ کے اعضاء ہیں۔ اللہ نے اپنے بندوں پر ان اعضاء کا انعام کیا ہے، اب ان سے کسی غیر کے لیے سجدہ نہیں کرنا چاہیے کہ اس میں اللہ کی نعمت کا انکار ہے۔ یہی امام عطا رحمہ اللہ کا قول ہے۔ یا مساجد سے مراد نماز ہے، کیوں کہ سجدہ نماز کا ایک رکن ہے۔[2] (قالہ الحسن) یا وہ گھر ہیں جو ملتوں والے عبادت کے لیے بناتے ہیں۔

یہی قول زیادہ ظاہر معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ مساجد کی اضافت اللہ کی طرف ان کے شرف اور تکریم کے لیے ہے اور کبھی اس کی نسبت غیر کی طرف تعریف (پہچان) کے لیے آتی ہے جس طرح حدیث میں مروی ہے: «صَلَاةٌ فِي

---

[1] تفسير الطبري (٦٧٠/٢٣) تفسير ابن كثير (٥٥٥/٤) [2] تفسير القرطبي (٢١،٢٠/١٩)

مَسْجِدِيْ هٰذَا خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيْمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ »[1] (ذكره القرطبي) ''میری اس مسجد میں نماز دیگر مساجد کی نسبت ہزار درجے بہتر ہے سوائے مسجد حرام کے۔'' اس جگہ دعا سے مراد عبادت ہے، یعنی مخلوق میں سے کسی کی عبادت نہ کرنی چاہیے، وہ کوئی ہو کہیں ہو۔ اس میں مشرکین کو جھڑکی ہے جو اللہ کے ساتھ مسجد الحرام میں غیر کو پکارتے ہیں۔ یا معنی یہ ہیں کہ تم مساجد میں صرف اللہ کا ذکر کیا کرو اس میں غیر اللہ کا کچھ حصہ نہ رکھو۔

صحیح حدیث میں مروی ہے کہ جو کوئی اپنی گم شدہ چیز کی مسجد میں جستجو کرے تو تم کہو: « لَا رَدَّهَا اللّٰهُ عَلَيْكَ » ''اللہ تجھے یہ چیز واپس نہ لوٹائے۔'' کیوں کہ مسجدیں کچھ اس لیے نہیں بنائی گئی ہیں۔[2] ﴿ عَبْدُ اللّٰهِ ﴾ سے اس جگہ نبی اکرم ﷺ مراد ہیں۔ نبی اللہ و رسول اللہ نہ فرمایا، اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کے نزدیک سب سے پسندیدہ نام یہی تھا اور چونکہ یہ نام آپ ﷺ کے کلام میں واقع ہوا ہے اس لیے اپنے نفس سے انکساری کے طور پر اس طرح سے تعبیر کی۔ یا عبد اللہ کا عبادت کرنا جو لفظ ''یدعو'' سے ظاہر ہوتا ہے کچھ بعید نہیں ہے۔ یہ امر بطنِ نخل (کھجوروں کے باغ کے درمیان) میں واقع ہوا تھا جس طرح کہ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[3] امام حفناوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس آیت کا سیاق دوسری دفعہ میں زیادہ ظاہر ہے جب جن مکے میں حج کے لیے آئے تھے اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تھے اور جن بارہ ہزار سے زیادہ تھے اور پہلی بار بطنِ نخل میں صرف سات یا نو آئے تھے، ان کے حق میں یہ کہنا ظاہر نہیں کہ ﴿ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴾۔

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہجرت کے قبل نبی اکرم ﷺ مکہ کے گرد و نواح کی طرف نکلے اور میرے لیے ایک خط کھینچ دیا اور فرمایا کہ تو کچھ نہ کرنا جب تک کہ میں نہ آؤں۔ پھر فرمایا کہ اگر تو کوئی شے دیکھے تو ڈر نہ جانا، پھر ذرا آگے بڑھ کر بیٹھ گئے، اتنے میں کچھ سیاہ لوگ آئے گویا رجالِ زط ہیں، میر آزاد نے کہا: زط معرب جٹ ہے، قوم جاٹ کے لوگ اسی طرح کالے بھجنگے ہوتے ہیں۔ اور وہ لوگ جس طرح اللہ نے کہا: آپ ﷺ پر ہجوم کر آئے۔[4] (أخرجه ابن مردويه و أبو نعيم في الدلائل)

پھر فرمایا کہ میں تمھاری برائی اور بھلائی کا مالک نہیں ہوں۔ یعنی مجھے یہ قدرت نہیں ہے کہ تم سے سرکشی کو دور کر دوں یا تمھاری طرف کوئی خیر بھیجوں، کیوں کہ نفع دینے والا اور ضرر دینے والا اللہ سبحانہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ''ضر'' سے مراد کفر اور ''رشد'' سے مراد ہدیٰ ہے، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ نکرہ سیاقِ نفی میں واقع ہوا ہے تو اب دنیا اور دین کے ہر ضرر اور ہر رشد کو شامل ہوگا۔ اور یہ فرمانا کہ مجھ کو اللہ سے کوئی نہیں بچا سکتا قولِ صالح علیہ السلام کی طرح ہے: ﴿ فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ إِنْ عَصَيْتُهٗ ﴾ [هود: ٦٣] ''اگر میں نے اس کی نافرمانی کر لی تو کون ہے

---

[1] صحیح البخاري (١١٣٣) صحیح مسلم (١٣٩٤) تفسیر القرطبي (٢١/١٩)۔ [2] صحیح مسلم (٥٦٨)
[3] تفسیر الجلالین (٧٧٢/١) [4] المعجم الکبیر (٦٦/١٠) اس کی سند میں ''موسیٰ بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔

جواس کے مقابلے میں میری مدد کرے؟'' یہ دوسروں کے عجز کا بیان کرنے کے بعد اپنے نفس کے عجز کا بیان ہے۔

''ملتحد'' جائے پناہ وحرز ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: ''ملتحد'' سے مراد مدخل ہے زمین میں سرنگ کی طرح[1] یا مذہب ومسلک ہے۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ پھر بلاغ کو مستثنیٰ کیا، کیوں کہ اس میں اعظم رشد ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اللہ کی توفیق سے بلاغ کی قدرت رکھتا ہوں۔[2] رہا کفر وایمان سو اس کا مالک نہیں ہوں، ہاں خود اس کی رسالت پر عمل کر سکتا ہوں۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اگرچہ اس وقت میں اکیلا اور کمزور ہوں اور قلیل تعداد میں ہوں اور وہ اتنے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی ان کی گنتی نہیں جان سکتا، لیکن انھیں قیامت کے دن معلوم ہو جائے گا کہ قوی کون تھا اور ضعیف کون تھا۔ سبحان اللہ! رسولوں کا کلام کیا اعظم واکرم ہوتا ہے اور قوم کی قوت ان کے مولیٰ کی طرف سے بیان کرتے ہیں جس کے ہاتھ میں بادشاہت ہے اور زمین وآسمان کے سارے لشکر ہیں۔ اس کے برعکس جب جابر لوگ بات کریں گے تو اپنے نفس کی قوت اور عظمت اور دوسروں کی حقارت اور کمزوری ہی بیان کریں گے۔[3]

قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ﴿۲۵﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾

کہہ دیجیے: میں نہیں جانتا کہ جس (عذاب) کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ قریب ہے یا اس کے لیے میرے رب نے کوئی لمبی مدت رکھی ہے (25) (وہی) عالم الغیب ہے، وہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا (26) سوائے کسی رسول کے جسے وہ پسند کرے، پھر بے شک وہ اس (رسول) کے آگے اور پیچھے نگہبان لگا دیتا ہے (27) تاکہ وہ معلوم کرے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے ہیں، اور اس نے ان (کے گرد وپیش) کا احاطہ کیا ہوا ہے اور اس نے ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے (28)

رسول اللہ ﷺ کو بھی قیامت کا علم نہیں ہے:

اللہ پاک نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم لوگوں سے کہہ دو کہ مجھ کو قیامت کے وقت کا علم نہیں ہے اور میں نہیں جانتا کہ وہ وقت قریب ہے یا دور۔ ﴿ اَمَدًا ﴾ سے مراد مدتِ طویل ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ

[1] تفسیر القرطبي (۲۶/۱۹) [2] تفسیر الطبري (۶۷۰/۲۳) [3] فتح البیان (۳۶۷-۳۶۲/۱۴)

آیت اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حدیث جس کا اکثر جاہل تداول کرتے ہیں (دست بدست لیتے ہیں) کہ زمین کے نیچے ہزار برس سے زیادہ نہ رہیں گی، جھوٹ ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہم نے یہ حدیث کسی کتاب میں نہیں دیکھی۔[1] انتھیٰ. میں کہتا ہوں اس گھڑی ہوئی حدیث کا جھوٹ اب تجربہ سے بھی ثابت ہو گیا ہے کہ ہجرت کو تیرہ سو برس گزر چکے ہیں اور قیامت قائم نہیں ہوئی۔

امام سیوطی رحمہ اللہ نے اخبار و آثار کے قرائن سے یہ بات لکھی ہے کہ اس امت کا بقا ابتدائے ہجرت سے قیامِ ساعت تک پندرہ سو برس سے زیادہ نہ ہوگا، سو اس تعداد سے اب صرف دو سو برس باقی ہیں۔ ہر چند اشراطِ صغریٰ ساعت (قیامت کی چھوٹی نشانیوں) کا ظہور مکمل ہو چکا ہے، لیکن قیامت کی بڑی نشانیوں کے وقوع کا بھی انتظار ہے۔ واضح حق یہی ہے کہ قیامت کا علم کسی نبی، ولی، عالم و شیخ کو نہیں دیا گیا۔ لہٰذا جب کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھتا کہ قیامت کا وقت کب ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ جواب نہ دیتے۔ ایک دفعہ جبریل علیہ السلام ایک اعرابی کی شکل میں آئے اور کہا کہ مجھے قیامت کی خبر دو۔ فرمایا: ''مسئول سائل سے زیادہ نہیں جانتا۔''[2] اور جب ایک اعرابی نے بڑی آواز سے پکار کر کہا تھا: اے محمد! ساعت کب ہوگی؟ تو فرمایا: ''وہ یقیناً واقع ہونے والی ہے مگر تو نے اس کے لیے تیار کیا کی ہے۔ اس نے کہا: میں نے کثرتِ صلاۃ و صیام سے تو تیاری نہیں کی، صرف یہ کیا ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔'' تو فرمایا: « فَأَنْتَ مَنْ أَحْبَبْتَ » حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''مسلمان اس حدیث سے بہت خوش ہوئے۔''[3] نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ [لقمان: ٣٤] ''بے شک اللہ تعالیٰ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔''

غرض یہ کہ یہ علم باری تعالیٰ کی خصوصیتوں میں سے ہے۔ اس جگہ کسی کو الہام و کشفِ منام کی حجت نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اس کے وقوع کا کوئی خاص وقت یا تاریخ مقرر کرنے کی کوئی خاص دلیل ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ اس کا آنا اچانک ہوگا، جبکہ لوگ غافل ہوں گے۔ کوئی اونٹنی وغیرہ کا دودھ دوھتا ہوگا، کوئی بازار میں کپڑا خرید رہا ہوگا کہ یکدم نفخۂ صور کی آواز آنے لگے گی، ہاتھ کا نوالہ ہاتھ میں رہ جائے گا، منہ تک نہ جائے گا کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔ قربِ ساعت کی بڑی علامت یہی دین و عمل کی طرف سے غفلت کا غلبہ، حبِ دنیا میں انہماک اور امورِ خانہ داری و معاش و زمین و باغ و سواریوں و منکح و لباس کی درستی اور مکانات وغیرہ کی آرائش ہے جس کا نمونہ چودھویں صدی ہجری کے آغاز سے روز افزوں ہے۔

ہمہ اندر زمن بتو این ست — کہ تو طفلی و خانہ رنگین است

''میری طرف سے آپ کے لیے ایک نہایت راز کی بات یہ ہے کہ تو ابھی بچہ ہے اور یہ گھر (دنیا) رنگ برنگی ہے۔''

---

[1] تفسير ابن كثير (٤/٥٥٥) [2] صحيح البخاري (٥٠) صحيح مسلم (٨)
[3] صحيح البخاري (٦٧٤٣) صحيح مسلم (٢٦٣٩) سنن الترمذي (٢٣٨٥)

سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے: « يَا بَنِيْ آدَمَ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ فَعُدُّوْا أَنْفُسَكُمْ مِنَ الْمَوْتٰى وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ إِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَآتٍ »[1] (رواه ابن أبي حاتم) یعنی اے لوگو! اگر تم کو کچھ علم ہے تو اپنی جانوں کو مردوں میں گن لو، واللہ! جس کا تم سے وعدہ ہے، یعنی قیامت کا وہ آنے والی ہے۔ ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کی روایت رفعاً یہ ہے: ''یہ امت اللہ تعالیٰ کو ہرگز نصف یوم سے عاجز نہیں کر سکے گی۔''[2] (انفربه أبو داود في آخر كتاب الملاحم)

پھر ابو داود رحمہ اللہ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے رفعاً یوں روایت کیا ہے کہ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس امت کو آدھے دن تک کی مہلت دے دے۔ سعد رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آدھے دن سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: پانچ سو سال۔[3] (انفرد به أبو داود) اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اُمتِ اسلام پانچ سو سال سے پہلے فنا نہ ہوگی اور زیادہ مدتِ بقا کا کوئی ذکر نہیں کیا، لہٰذا اب تک یہ امتِ مرحومہ مشمول بقا ہے، حالاں کہ تاحال تیرہ سو سال گزر چکے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل کتاب ''حجج الكرامة'' میں لکھی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بقا کی انتہائی مدت اور قیامت کے قائم ہونے کے وقت کا علم نہ تھا۔ پھر اہلِ علم و اہلِ ریاضت کا اس کے تعین کے بارے میں غور و خوض کرنا بالکل بے سود ہے۔ ہم قیامت کے قائم ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اور تعیینِ وقت اللہ کے علم کے سپرد کرتے ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آیت: ﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴾ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ﴾ [البقرة: ٢٥٥] ''اور وہ اس کے علم میں کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنا وہ چاہے۔'' اسی طرح اس جگہ فرمایا ہے کہ اللہ ہی دانائے غیب و شہادت ہے اور اس کی مخلوق میں سے کوئی بھی اس کے علم میں سے کسی شے پر مطلع نہیں ہے مگر وہ چیز جس پر اللہ نے اس کو اطلاع دی ہے۔ یہ حکم عام ہے اور فرشتوں اور انسانوں کے رسولوں کو شامل ہے۔ پھر فرمایا کہ ہم رسول کے آگے پیچھے چوکیدار رکھتے ہیں، یعنی رسول مزید ملائکہ معقبات کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے جو اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اللہ کی وحی کے مطابق مدد دیتے ہیں۔ یہ بات اس لیے ہے کہ تبلیغِ رسالت کا حال معلوم ہو۔

﴿ لِيَعْلَمَ ﴾ کی ضمیر میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض نے کہا ہے کہ ضمیر نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف عائد کی ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام کے ہمراہ چار فرشتے محافظ ہیں، تاکہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو جائے کہ انھوں نے اللہ کے پیغاموں کو پہنچا دیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ''تاکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہو جائے کہ رسولوں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور فرشتوں نے ان کی حفاظت کی۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''رصد'' سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو شیاطین سے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرتے

[1] شعب الإيمان (٣٥٥/٧) اس کی سند میں ''ابوبکر بن ابی مریم'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٤٩٧٧)

[2] سنن أبي داود (٤٣٤٩) السلسلة الصحيحة (١٦٤٣) [3] سنن أبي داود (٤٣٥٠) صحيح الجامع (٢٤٨١)

تھے۔ یہاں تک کہ جن کی طرف وہ بھیجے گئے ہیں ان پر ظاہر ہو جائیں اور اہلِ شرک جان لیں کہ انھوں نے اپنے رب کی رسالت کو پہنچا دیا۔ یہی قول امام ابن ابی نجیح رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی تاکہ مکذبینِ رسل جان لیں کہ انھوں نے اللہ کی رسالت پہنچا دی،① لیکن اس میں نظر ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعقوب نے "لِيُعْلَمُ" بالضم پڑھا ہے، یعنی تاکہ لوگ جان لیں کہ رسولوں نے تبلیغ کر دی ہے۔② اور احتمال ہے کہ ضمیر اللہ عزوجل کی طرف عائد ہو۔ اس کو ابن الجوزی رحمہ اللہ نے "زاد المسیر" میں حکایت کیا ہے۔③

اس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کی حفاظت اپنے فرشتوں سے کرتا ہے، تاکہ وہ رسالت کو ادا کرنے پر قابو پائیں اور جو وحی ان پر آتی ہے اس کی نگہبانی کریں، تاکہ جان لے کہ انھوں نے اپنے رب کی رسالت پہنچا دی اور یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ [البقرۃ: ۱۴۳] "جس قبلہ پر تم پہلے سے تھے اسے ہم نے صرف اس لیے مقرر کیا کہ ہم جان لیں کہ رسول کا سچا تابعدار کون ہے اور کون ہے جو اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاتا ہے۔" اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ﴾ [العنکبوت: ۱۱] "جو لوگ ایمان لائے اللہ انھیں بھی ظاہر کر کے رہے گا اور منافقوں کو بھی ظاہر کر کے رہے گا۔" اور اس طرح کی اور آیات۔ اس بات کا علم کہ اللہ تعالیٰ اشیاء کو ان کے وجود سے پہلے سے قطعی طور پر اور لامحالہ عالم ہے۔ لہٰذا اس کے بعد یہ فرمایا کہ ﴿اَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا﴾۔④

فتح البیان کا بیان:

اس مقام میں فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے: تو کہہ میں نہیں جانتا کہ جس عذاب یا یوم الحساب کا تم سے وعدہ ہے وہ اس دم واقع ہوگا یا اس وقت کے قریب یا اس کے لیے کوئی انتہاء اور مدت ٹھہرائی گئی ہے کہ اس سے کم مدت میں اس کے آنے کی توقع نہیں ہے۔ یہ آیت کچھ اس حدیث کے خلاف نہیں ہے کہ میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح متصل ہیں۔⑤ کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کو اتنا معلوم تھا کہ دنیا کی باقی ماندہ مدت گزری ہوئی مدت سے بہت قلیل ہے۔ رہی اس کے قریب کی مقدار کی شناخت سو وہ معلوم نہ تھی، اس کا علم اللہ ہی کو ہے، وہ ہر حال میں متوقع ہے اس میں کچھ کلام نہیں۔ کلام وقت کی تعیین میں ہے سو اس کا علم نبی اکرم ﷺ کو نہ تھا۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ قیامت کے دن کو کوئی نہیں پہچانتا سوائے اللہ سبحانہ کے۔⑥

مطلب یہ ہوا کہ عذاب کے وقت کا علم غیب کا علم ہے۔ غیب کو اللہ کے سوا کون جانے، وہی عالمِ غیب ہے،

① تفسیر الطبري (۲۳/۶۷۳، ۶۷۴) ② تفسیر البغوي (۸/۲۴۵) ③ زاد المسیر (۸/۳۸۶)
④ تفسیر ابن کثیر (۴/۵۵۶، ۵۵۷) ⑤ صحیح البخاري (۴۶۵۲) صحیح مسلم (۲۹۵۱) ⑥ فتح القدیر (۵/۴۱۱)

اس کے غیب کو کوئی نہیں جانتا اور نہ وہ کسی کو بتائے مگر جس کسی کو رسولوں میں سے پسند کرے اس پر غیب کی کوئی بات ظاہر کر دیتا ہے، تا کہ خود اس کے ساتھ متاثر ہو تو اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے سوا کسی کو غیب کا علم نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ خود اللہ نے اس کی تصریح فرمائی ہے اور کہا ہے: ﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ [النمل: ٦٥] ''کہہ دیجیے کہ آسمانوں والوں میں سے زمین والوں میں سے سوائے اللہ کے کوئی غیب نہیں جانتا۔''

اس استثناء میں ساری مخلوق کے علمِ غیب کی نفی ہے، خواہ وہ مقرب فرشتہ ہو یا نبی مرسل۔ پھر کسی اور شیخ، ولی، پیر، شہید، جن، بھوت اور پری کی کیا ہستی ہے کہ غیب کا علم رکھے یا کسی کو غیب کی خبر دے سکے۔ نجومی اور کاہن جس بات کی خبر دیتے ہیں وہ سب جھوٹ اور باطل ہیں، لہٰذا ان کی بات پر یقین کرنے سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے رسولِ مرتضیٰ کو اس عام نفی سے مستثنیٰ کر لیا، کیوں کہ وحی کے ذریعے سے کوئی مخفی بات ان کو بتا دیتا ہے اور وہ علم ان کے لیے معجزہ ہوتا ہے اور ان کی نبوت اور رسالت پر سچی دلیل ہوتا ہے۔ منجم اور کنکریوں کے ساتھ مار کر حال معلوم کرنے والا اور ناطر شانہ زمین اور پرندوں کو زجر کرنے والے رسولِ مرتضیٰ نہیں ہے کہ اللہ نے ان کو اپنے علمِ غیب میں سے کسی چیز پر مطلع کیا ہو، بلکہ وہ تو کفار، اللہ پر جھوٹ باندھنے والے اور اہلِ حدس، تخمین، کذب اور ظن ہیں۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسولِ مرتضیٰ سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں،[1] لیکن اس میں بُعد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ بعض غیب پر اطلاع یہ ہے کہ معجزہ اور احکام ہوں جن سے مکلّف کیا جائے اور جزائے اعمال اور آخرت کے حالات کا بیان اور اسی طرح کی اور باتیں جن کا تعلق رسالت سے ہے، اللہ ان پر رسول کو آگاہ کر دیتا ہے نہ کہ ان غیب کی باتوں پر جو رسالت کے متعلق ہیں جیسے قیامت قائم ہونے کا وقت۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے بھی اسی کے لگ بھگ کہا ہے۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ ستارے مجھے حادثات پر دلالت کرتے ہیں وہ اللہ کا کافر اور قرآن کا منکر ہے۔[2]

امام زمخشری رحمہ اللہ نے کشاف میں کہا ہے کہ اس میں کرامات کا ابطال ہے (یعنی باطل ہونا)، اس لیے کہ جن لوگوں کی طرف یہ کرامات مضاف ہیں وہ اگرچہ پسند کیے جانے والے اولیاء ہیں، لیکن رسول نہیں ہیں اور اللہ نے تمام پسندیدہ لوگوں میں سے صرف رسولوں کو غیب کی اطلاع دینے کے لیے خاص کیا ہے اور اس آیت میں کہانت اور جادو اور علمِ نجوم کا ابطال ہے، اس لیے کہ ان فنون کے اہل لوگ اللہ کی رضا سے بہت دور ہیں اور اللہ کے غصے میں سب سے زیادہ داخل ہیں۔[3]

---

[1] الدر المنثور (٣٠٩/٨) [2] فتح القدير (٤١٢/٥) [3] الكشاف (٦٣٤/٤، ٦٣٥)

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میرے نزدیک اس آیت میں ان اقوال پر کوئی دلیل نہیں ہے، اس لیے کہ اس غیب میں سے کوئی حصہ عموم میں نہیں آیا، اس لیے یہ ایک ہی غیب پر محمول ہے وہ غیب قیامت کے وقت کا علم ہے کیوں کہ یہ جملہ ﴿ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ ﴾ کے بعد واقع ہوا ہے۔کوئی یہ کہے کہ پھر اس جگہ استثناء کے کیا معنی ہیں؟ تو ہم کہیں گے کہ شاید جب قیامت قریب ہو تو اللہ ان پر ظاہر کر دے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴾ [الفرقان: ۲۵] ''اور جس دن آسمان بادل سمیت پھٹ جائے گا اور فرشتے لگا تار اتارے جائیں گے۔''

اس وقت فرشتے قیامت کے قائم ہونے کو جان لیں گے۔ یا یہ استثناء منقطع ہے، یعنی اللہ جس رسول کو پسند کر لیتا ہے، اس کے آگے پیچھے حفاظت کرنے والے فرشتے حفاظت کے لیے رہتے ہیں، تاکہ کوئی سرکش جن اور انسان اس کو ستا نہ سکے۔ اور اس بات کی دلیل کہ یہ مراد نہیں ہے کہ اللہ کسی کو اپنے بھید پر آگاہ نہیں کرتا مگر رسولوں کو، یہ ہے کہ شق، سطیح دو کاہن تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے آپ کے عارف ہو گئے تھے اور عرب کے نزدیک اس علم میں مشہور تھے، یہاں تک کہ کسریٰ نے بھی ان کی طرف رجوع کیا۔ یہ قصہ تواتر کے قریب ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ رسولوں کے غیر کو بھی بعض غیب کی باتوں پر مطلع فرما دیتا ہے اور ساری ملت والوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خوابوں کی تعبیر کرنے والا مستقبل کے امور کی خبر دیتا ہے اور وہ اس خبر دینے میں سچا ہوتا ہے۔

حکایت:

سلطان سنجر بن ملک شاہ نے ایک کاہنہ عورت کو بغداد سے خراسان میں بلایا تھا اور اس سے آیندہ کے کچھ امور کا حال پوچھا تھا، اس نے جو کچھ کہا ویسا ہی واقعہ ہوا اور بہت سے محققینِ علم کلام اور حکمت نے مجھ سے کہا کہ اس نے امورِ غائبہ کو تفصیل وار بتایا تھا، اس کی خبر کے مطابق واقع ہوا۔ ابو البرکات رحمہ اللہ نے اس کا حال کتاب ''المعتبر'' میں مبالغتاً لکھا ہے اور کہا ہے کہ میں نے تیس برس تک اس کے حال میں غور کیا، یہی بات ثابت ہوئی کہ وہ غیب کی خبریں دیتی تھی اور وہ خبر واقع کے مطابق ہوتی تھی۔[1] انتہیٰ. ہم خود الہاماتِ صادقہ والے اصحاب اور جادوگروں میں یہی بات مشاہدہ کرتے ہیں اور احکامِ نجومیہ کو واقعہ کے مطابق پاتے ہیں، اگرچہ کبھی وہ آگے پیچھے بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ان امورِ محسوسہ کے خلاف پر قرآن دلیل ہے تو قرآن پر طعن آتی ہے، اس لیے اس مقام کی تاویل وہی ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں۔ انتہیٰ کلامه.

امامِ ربانی، عالمِ رحمانی قاضی محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رازی کا یہ قول اس جگہ کوئی صیغہ عموم کا نہیں

(1) تفسیر الرازي (۳۰/۱۴۸، ۱۴۹)

ہے باطل ہے، اس لیے کہ مصدر و اسم جنس کی اضافت صیغہ ہائے عموم میں سے ہوتی ہے جس طرح کہ ائمۂ اصولِ فقہ وغیرہم نے تصریح کی ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ استثنائے منقطع ہے صرف دعویٰ ہے، نظمِ قرآنی اس دعوے سے انکار کرتی ہے۔ رہے شق اور سطیح تو وہ اس زمانے میں تھے جس زمانے میں شیاطین آسمان میں استراقِ سمع کرتے تھے (یعنی باتیں سن لیتے تھے) اور جو کچھ سنتے اسے کاہنوں کے کان میں ڈال دیتے تھے، وہ سچ میں جھوٹ ملا لیتے جس طرح کہ صحیح حدیث میں آیا ہے[1] اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ ﴾ [الصفت: ١٠] ''مگر جو کوئی ایک آدھ بات اچک لے بھاگے۔'' اور اس طرح کی اور آیات ہیں۔

کہانت کے بارے میں بیان اس شریعتِ حقہ میں وارد ہوا ہے کہ اس وقت میں بعض غیب کو جاننے کے لیے استراقِ شیاطین کے واسطے سے ایک طریقہ تھا، یہاں تک کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت پر وہ روک دیے گئے اور انھوں نے کہا: ﴿ وَاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ﴾ سو جس وقت کہانت کا دروازہ کھلا تھا، وہ مخصوص ہے ادلہ کے ساتھ وہ اس عموم کی مخصصات میں سے ٹھہرا تو اب رازی مرحوم کا زعم اس آیتِ شریف پر کہانت وارد کرنے کے بارے میں غیر وارد ہے۔ رہی کاہنہ کے بارے میں حکایت سو وہ ایک حدیثِ خرافہ ہے (عجیب وغریب قصہ ہے) اور اگر فرض کیا جائے کہ اس عورت کی خبروں میں سے کوئی خبر واقع کے مطابق ہوئی تو وہ اس حدیث میں داخل ہے: ''اس امت میں کچھ لوگ محدثین ہیں اور عمر بھی ان میں سے ہے۔'' اور اس عموم کی مخصص ٹھہرے گی نہ نقض۔ رہی وہ جرأت جو رازی نے اللہ کی کتاب پر کی ہے۔[2] اور کہا ہے کہ کوئی کہے کہ یہ قرآن تو ان امورِ محسوسہ کے خلاف پر دلیل ہے۔ الخ.

چنانچہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ تقریر کوئی ان کی پہلی لغزش نہیں ہے اور نہ پہلی خطا بلکہ ان کے نزدیک اس کے بہت سے اشباہ اور امثال موجود ہیں جس سے رگِ فلسفت کی نبض دھڑکتی ہے اور مباحثِ تفسیر میں شیطان نے جابجا ٹھوکر ماری ہے۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ وہ خبر جو اس عورت سے اور اس جیسی اور جگہوں سے ان کو پہنچے اس سے قرآن کی طرف طعن کرنے کا راستہ نکالا گیا۔ اب اگر کوئی یوں کہے کہ جب قرآنی دلیل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ اپنے کسی پسندیدہ رسول کو کسی غیب پر آگاہ کر دیتا ہے تو اس رسول کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ بعض امت کو وہ بات بتا دے یا نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں فرض بنتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے یہ بات ثابت ہے اور سنتِ مطہرہ کو پہچاننے والے پر مخفی نہیں ہے۔

صحیح حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک دفعہ کھڑے ہو کر جو کچھ کہ قیامت تک ہونے والا تھا، سب کی خبر دی اور فتنوں اور اس جیسی اور باتوں کے متعلق کوئی شے بیان کرنے سے باقی نہ چھوڑی، کسی کو یاد رہی اور کوئی بھول گیا۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم ﷺ نے ان فتن کی خبر دی تھی جو آپ ﷺ کے بعد ہوں گے، یہاں تک

[1] صحيح البخاري (٣٠٣٨) صحيح مسلم (٢٢٢٨) [2] صحيح مسلم (٢٣٩٨)

کہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان سے سوال کیا اور ان کی بات کی طرف راجع ہوئے۔[1] صحیح وغیرہ میں ثابت ہوا ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا: وہ کون سا فتنہ ہے جو موجِ بحر کی طرح موج زن ہوگا؟ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تمھارے اور اس فتنے کے درمیان ایک دروازہ ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ کھولا جائے گا یا ٹوٹ جائے گا؟ کہا: ٹوٹ جائے گا، تب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جانا کہ باب سے مراد وہ خود ہیں اور ٹوٹ جانے سے مراد قتل ہے۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ کیا عمر جانتے تھے؟ کہا: ہاں، اس طرح جیسے کہ آج کی رات کے بعد کل ہے۔[2] اسی طرح انھوں نے ابوذر رضی اللہ عنہ کو ان کے حادثات کی خبر دی تھی اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو ذی الثدیہ کے حال پر مطلع کر دیا تھا۔ اس طرح کی روایات کثیر تعداد میں ہیں، اگر سب جمع کی جائیں تو ایک مستقل کتاب بن جائے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو اب اس بات سے کوئی مانع نہیں ہے کہ اس اُمت کے بعض صلحاء بعض غیب کی خبروں کے ساتھ مختص ہوں جن کو اللہ نے اپنے رسول کے لیے ظاہر کیا تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا اظہار اپنی امت کے بعض لوگوں پر کیا اور اس "بعض أمتي" نے اس کا اظہار اپنے بعد والوں کے لیے کیا۔ صالحین کے کرامات اسی قبیل سے ہوں اور یہ سب فیضِ ربانی جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے ہو۔[3] انتھیٰ کلامه. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے غیب سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی بھیجی اور بعض غیوب کا علم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا اور اپنا حکم جتلایا جس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔[4]

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا کہ اس غیب کی جس کی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی ہے حفاظت کی جاتی ہے، اس کے آگے پیچھے رصد ہے، یعنی فرشتے مقرر ہیں جو شیاطین سے رسول کی نگہبانی کرتے ہیں۔ یا وحی کے آگے پیچھے حراست کرنے والے فرشتے مقرر ہیں جو شیطانوں کو استراقِ سمع (چوری چھپے سننے) سے باز رکھتے ہیں۔ آگے پیچھے سے مراد ساری اطراف ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ہر نبی کے ساتھ شیطانوں سے حفاظت کرنے والے فرشتے مقرر کیے ہیں کہ وہ کہیں فرشتے کی صورت سے مشابہ ہو کر نہ آ جائیں، پھر اگر کوئی شیطان فرشتے کی صورت میں آتا ہے تو فرشتے کہہ دیتے ہیں کہ یہ شیطان ہے، اس سے بچو اور جب فرشتہ آتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ تیرے رب کا قاصد ہے۔[5] اور ﴿ لِيَعْلَمَ ﴾ کی ضمیر میں وہی دو قول ہیں جو اوپر گزر چکے ہیں۔[6] واللّٰه أعلم.

---

(1) صحيح مسلم (٢٨٩١) (2) صحيح البخاري (٥٠٢) صحيح مسلم (١٤٤) (3) فتح القدير (٥/٤١٢۔٤١٤)
(4) تفسير الطبري (٢٣/٦٧١) (5) تفسير القرطبي (١٩/٢٩) (6) فتح البيان (١٤/٣٦٨۔٣٧٤)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سُوْرَةُ الْمُزَّمِّلِ

اس کی انیس (۱۹) یا بیس (۲۰) آیتیں ہیں اور مکہ میں اتری ہے۔ امام حسن، عطاء، عکرمہ اور جابر رحمہم اللہ کے قول کے مطابق یہ ساری سورت مکی ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دو آیتیں: ﴿ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ ﴾ اور دوسری جو اس سے متصل ہے مکے میں نہیں اتریں۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ ﴾ تا آخر سورت مدینے میں نازل ہوئی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یہ سورت مکہ میں اتری ہے سوائے ان دو آیتوں کے: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ ﴾۔[2]

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قریش دار الندوہ میں اکٹھے ہوئے اور کہا کہ اس مرد کا کچھ نام رکھو جس سے تم لوگوں کو روکو۔ کہا: کاہن۔ کہا وہ کاہن نہیں ہے۔ کہا: مجنون۔ کہا: وہ مجنون بھی نہیں ہے۔ کہا: ساحر۔ کہا: ساحر بھی نہیں ہے۔ یہ کہہ کر مشرکین متفرق ہو گئے۔ یہ خبر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کپڑوں میں تزمل تدثر کیا، یعنی اپنے آپ کو لپیٹا۔ جبریل علیہ السلام نے آ کر کہا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴾، ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴾[3] (أخرجه البزار والطبراني وأبو نعيم في الدلائل)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں ایک رات اپنی خالہ میمونہ کے گھر رہا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے لگے، تیرہ رکعتیں پڑھیں، ان میں دو رکعتیں فجر کی تھیں۔ میں نے ہر رکعت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کا اندازہ کیا جو ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴾ کے برابر تھا۔[4] (أخرجه أبو داود والبيهقي في السنن)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۲ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝۳ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝۴ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝۵ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا ۝۶

[1] تفسير القرطبي (۳۱/۱۹) [2] الدر المنثور (۳۱۱/۸)

[3] كشف الأستار عن زوائد البزار (۷۷/۳) المعجم الأوسط (۳۱۹/۲) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه معلى بن عبد الرحمن الواسطي وهو كذاب" (مجمع الزوائد: ۲۷۳/۷)

[4] سنن أبي داود (۱۳۶۵) سنن البيهقي الكبرىٰ (۸/۳) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (صحيح أبي داود: ۱۰۶/۵)

اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اے چادر میں لپٹنے والے! ① رات میں قیام کیجیے مگر تھوڑا سا ② (یعنی) رات کا نصف، یا اس سے تھوڑا سا کم کیجیے ③ یا اس پر (کچھ) زیادہ کیجیے اور قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے ④ یقیناً ہم جلد آپ پر ایک بھاری بات ڈالیں گے ⑤ بلاشبہ رات کا اُٹھنا (نفس کے) کچلنے میں زیادہ سخت اور دعا و ذکر کے لیے مناسب تر ہے ⑥ یقیناً دن میں آپ کے لیے بہت مصروفیت ہے ⑦ اور اپنے رب کا نام ذکر کیجیے اور سب سے کٹ کر اسی کی طرف متوجہ ہو جائیے ⑧ (وہ) مشرق و مغرب کا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا اسی کو کارساز بنا لیجیے ⑨

قیام اللیل کا حکم:

یہ سورت شروع میں اتری ہے جب نبی اکرم ﷺ کو وحی کی دہشت سے سردی لگی تو اپنے اوپر کپڑے لپیٹے۔ اللہ نے یہی نام لے کر پکارا اور کہا: رات کو کھڑا رہ، یعنی نماز پڑھ۔ اسلام کے شروع میں رات ہی کی نماز فرض ہوئی مگر کسی رات کو اگر نہ پڑھ سکے تو معاف ہے۔ پھر فرمایا: ریاضت کر تو بھاری بوجھ آسان ہو۔ رات کی عبادت بڑی ریاضت ہے، نفس روندا جاتا ہے اور اس وقت دعا اور ذکر سیدھا ادا ہوتا ہے، یعنی دل سے ادا ہوتا ہے۔ دن کے وقت لوگوں کو سمجھاتا ہے۔ عبادت کے لیے رات کا وقت رکھ۔ انتہی۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو حکم دیتا ہے کہ تزمل چھوڑ کر اللہ کے لیے قیام کر۔ تزمل رات کو کپڑے لپیٹنے کو کہتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ [السجدة: ١٦] ''ان کی کروٹیں اپنے بستروں سے الگ رہتی ہیں اپنے رب کو خوف اور امید کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے وہ خرچ کرتے ہیں۔'' لہٰذا نبی اکرم ﷺ اس حکم کی بجا آوری کرتے اور رات کو کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ یہ نماز تنہا نبی اکرم ﷺ پر واجب تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ [بني إسرائيل: ٧٩] ''رات کے کچھ حصے میں تہجد کی نماز میں قرآن کی تلاوت کریں۔ یہ زیادتی آپ کے لیے ہے عنقریب آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود میں کھڑا کرے گا۔''

سورت مزمل کا شانِ نزول:

اس جگہ قیام کی مقدار کا بیان کیا اور فرمایا: رات کو کھڑا ہو مگر تھوڑا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ضحاک اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اے مزمل! یعنی اے نائم (سونے والے)! امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اے مزمل اپنے کپڑوں میں! امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قطیفہ (روئی دار کپڑا، رضائی) میں لپٹے ہوئے تھے جب یہ آیت اتری۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اے محمد! تم نے قرآن کو لپیٹ رکھا ہم نے تم کو حکم دیا ہے کہ تم آدھی رات کھڑے رہو، کچھ کم یا بیش، اس میں تم پر کوئی حرج نہیں ہے اور قرآن کو ترتیل سے پڑھو، یعنی ٹھہر ٹھہر کر کہ اس میں قرآن کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح پڑھتے تھے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سورت کو اتنا ٹھہر کر پڑھتے کہ وہ اپنے بڑے سے بڑی ہو جاتی۔ [1]

تلاوتِ قرآن کا طریقہ:

صحیح بخاری میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت دراز ہوتی، پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی، بسم اللہ کو دراز کیا، پھر رحمٰن کو، پھر رحیم کو دراز کیا۔ [2] سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کیسی تھی؟ کہا: اپنے پڑھنے کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے۔ آیت آیت کو الگ الگ پڑھتے۔ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ [الفاتحة: ١۔ ٤] ”شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ بدلے کے دن (یعنی قیامت) کا مالک ہے۔“ [3] (رواه أحمد وأبو داود والترمذي) یعنی اتنی عبارت کو چار قطعہ کرتے، ہر ٹکڑا علاحدہ ہوتا۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ صاحبِ قرآن سے کہا جائے گا: پڑھ اور چڑھ اور ترتیل کر جس طرح کہ تو دنیا میں ترتیل کرتا تھا، یعنی ٹھہر ٹھہر کر سمجھ سمجھ کر پڑھتا تھا، تیری منزل آخری آیت کے پاس ہے جس کو تو پڑھے گا۔ [4] (رواه أحمد وأبو داود والترمذي والنسائي)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”حسن صحیح“ ہے۔ تفسیر کے شروع میں وہ حدیثیں گزر چکی ہیں جو ترتیل کے مستحب ہونے پر اور قراءت کو خوش الحانی سے کرنے پر دلیل ہیں جس طرح کہ حدیث میں آیا ہے کہ قرآن کو اپنی آوازوں سے رونق دو۔ [5] اور وہ ہم میں سے نہیں ہے جو قرآن کے ساتھ تغنی نہیں کرتا، یعنی لے سے نہیں پڑھتا۔ [6]

---

① تفسير ابن كثير (٥٥٨،٥٥٧/٤) ② صحيح البخاري (٥٠٤٦)

③ مسند أحمد (٣٠٢/٦) سنن أبي داود (٤٠٠١) سنن الترمذي (٢٩٢٣) صحيح الجامع (٥٠٠٠)

④ مسند أحمد (١٩٢/٢) سنن أبي داود (١٤٦٤) سنن الترمذي (٢٩١٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٢٢/٥) السلسلة الصحيحة (٢٢٤٠)

⑤ سنن أبي داود (١٤٦٨) سنن النسائي (١٠١٥) سنن ابن ماجه (١٣٤٢) صحيح الجامع (٣٥٨٠) ⑥ صحيح البخاري (٧٠٨٩)

اس شخص کو، یعنی سیدنا ابو موسی رضی اللہ عنہ کو مزامیرِ آلِ داود سے ایک مزمار دیا گیا ہے۔ سیدنا ابو موسی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر میں جانتا کہ میرے پڑھنے کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سنتے ہیں تو میں اس کو اور بھی زیادہ آراستہ کرتا۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: ”لَا تَنْثِرُوْهُ نَثْرَ الدَّقَلِ وَلَا تَهُذُّوْهُ هَذَّ الشِّعْرِ قِفُوْا عِنْدَ عَجَائِبِهِ وَحَرِّكُوْا بِهِ الْقُلُوْبَ وَلَا يَكُنْ هَمُّ أَحَدِكُمْ آخِرَ السُّوْرَةِ“[2] (رواه البغوي) یعنی تم کھجور کے دانے کی طرح اس کو نہ جھاڑو اور شعر کی طرح نہ پڑھو، بلکہ عجائبِ قرآن پر توقف کرو اور دلوں کو حرکت دو تمھارا قصد آخر سورت نہ ہو کہ جلدی سے سورت ختم کر لو۔

سیدنا ابو وائل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے آ کر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا: میں نے آج کی رات ایک رکعت میں مفصل پڑھی۔ کہا: ”هَذًّا كَهَذِّ الشِّعْرِ“ یعنی یہ تو شعر خوانی ہوئی کہ لگاتار پڑھ گئے۔ میں ان نظائر کو پہچانتا ہوں جن کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک دوسرے کے ساتھ ملاتے تھے، پھر بیس سورتیں مفصل کی ذکر کیں۔ ہر رکعت میں دو سورتیں۔[3] انتہیٰ۔

میں کہتا ہوں: اس بیان سے یہ بات ثابت ہوئی کہ ترتیل سے مراد اچھی طرح آواز بنا کر ہر آیت کا جدا جدا پڑھنا مراد ہے نہ وہ تجوید جو قراء نے اس زمانے میں ایجاد کی ہے اور نہ وہ تغنی جس کو آج کل اہلِ مصر نے اختیار کیا ہے۔ جو لوگ الفاظ کے مخارج سے نکالنے میں مبالغہ کرتے ہیں اور چہرہ ٹیڑھا اور سیدھا ہوتا ہے یا راگنی میں اس طرح پڑھتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کی سمجھ نہیں آتی یہ طرزِ قراءت بالکل خلافِ سنت ہے۔ ہر شخص قراءت کو مفصل اور مقطع کرے اور بہ قدرِ جلت اپنی آواز کو خوش نما بنائے، اس سے زیادہ اس کو کوئی تکلیف نہیں دی گئی۔ مخارجِ حروف کی رعایت کرنے میں قرآن کی قراءت کا اور اس میں غور وفکر کرنے اور سمجھنے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ جس طرح کہ کوئی خوش نویس حروف کی شکلوں کو حسین بنانے میں رہ کر غالباً غلط لکھتا ہے۔

نزولِ وحی کی کیفیت:

امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن کو قولِ ثقیل فرمایا ہے، یعنی اس پر عمل کرنا گراں اور دشوار ہے۔[4] یا وہ نزول کے وقت ثقیل تھا اپنی عظمت کے سبب سے جس طرح کہ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی اتری، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ران میری ران پر تھی، قریب تھا کہ میری ران ٹوٹ جائے۔[5] سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کو وحی کا احساس ہوتا ہے؟ فرمایا: میں صلاصل سنتا ہوں تو اسی وقت خاموش ہو جاتا ہوں جس دفعہ مجھے وحی آتی ہے مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرا دم نکل جائے گا۔[6] (تفرد به أحمد)

---

(1) صحيح البخاري (٤٧٦١) صحيح مسلم (٧٩٣) سنن البيهقي الكبرىٰ (١٢/٣) (2) تفسير البغوي (٢٥١/٨)
(3) صحيح البخاري (٧٤٢) (4) تفسير الطبري (٦٨١/٢٣) (5) صحيح البخاري (٢٦٧٧)
(6) مسند أحمد (٢٢٢/٢) اس کی سند میں ”ابن لهيعہ“ ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٧٧٨)

صحیح بخاری میں ہے کہ سیدنا حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا: آپ کو وحی کس طرح آتی ہے؟ فرمایا: کبھی کبھی تو صلصلۂ جرس کی طرح آتی ہے، یہ مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے، پھر وہ حالت نہیں رہتی میں اس کو یاد کر لیتا ہوں جو کچھ فرشتہ کہتا ہے۔ اور کبھی کوئی فرشتہ کسی انسان کی شکل میں آ کر مجھ سے بات کرتا ہے۔ میں اس کا کہنا یاد رکھتا ہوں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے سخت سردی کے دن آپ پر وحی اترتی دیکھی، جب وحی آ چکی آپ ﷺ کی پیشانی سے فصد کی طرح پسینہ بہنے لگا۔[1] (هذا لفظه)

امام احمد رحمہ اللہ کی روایت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر وحی آتی اور آپ سواری پر ہوتے تو وہ اپنی گردن نیچے ڈال دیتی۔[2] عروہ کی روایت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو اونٹنی پر سوار ہونے کی حالت میں وحی آتی، وہ اپنی گردن زمین پر رکھ دیتی اور حرکت نہ کر سکتی، یہاں تک کہ وحی آ چکتی۔[3] (رواه ابن جرير و هذا مرسل)۔ حدیث کے الفاظ اس جگہ ''جران'' ہے۔ یعنی باطنِ عنق (گردن) کا نیچے کا حصہ۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ اختیار کیا ہے کہ وہ دونوں وجہ سے معاً ثقیل ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس طرح کہ یہ دنیا میں ثقیل ہے، اسی طرح قیامت کے دن میزان میں ثقیل ہے۔

قیام اللیل کا شرف و فضل:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''نشأ'' حبشہ کی زبان میں ''قام'' کے معنی میں ہے، یعنی ﴿ نَاشِئَةَ الَّيْلِ ﴾ سے مراد قیامِ شب ہے۔ عمر، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ساری رات ناشئہ ہے۔ یہی قول امام مجاہد اور کئی ایک اہلِ علم کا ہے۔ يُقَالُ: نَشَأَ، إِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ بعد عشاء ہے۔ امام ابومجلز، قتادہ، سالم، ابو حازم اور محمد بن منکدر رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[4] غرض یہ ہے کہ ﴿ نَاشِئَةَ الَّيْلِ ﴾ شب کے ساعات اور اوقات ہیں۔ شب کی ہر ساعت کا نام ناشئہ ہے، یہ آناتِ شب ہوئے۔ مقصد یہ ہوا کہ رات کا قیام دل و زبان کے درمیان سخت پامالی ہے اور قراءت کے لیے جامع تر ہے۔ لہٰذا فرمایا ہے کہ ﴿ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ﴾ یعنی دل جمعی کے لیے بہت مناسب اور قراءت کرنے اور تلاوت کو سمجھنے کے لیے دن میں قیام کرنے کی نسبت زیادہ بہتر ہے۔ کیوں کہ دن کے وقت لوگوں کا انتشار ہوتا ہے اور معاش کے اوقات اور آوازوں کا شور وغل ہوتا ہے۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو ''أَصْوَبُ قِيلًا'' پڑھا ہے۔ ایک شخص نے کہا ہے کہ ہم تو ﴿ اَقْوَمُ قِيْلًا ﴾ پڑھتے ہیں، کہا کہ ''أَصْوَبُ، أَقْوَمُ، أَهْيَأُ'' اور مثل اس کے ایک ہیں، یعنی معنی میں۔[5] یہ پڑھنا آیت کے معنی سمجھانے کے لیے تھا نہ کہ اس لیے کہ قرآن کا لفظ یوں ہے۔ لہٰذا اللہ نے فرمایا کہ تجھ کو دن میں لمبا شغل ہے۔

---

① صحيح البخاري (٦) ② مسند أحمد (١١٨/٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله رجال الصحيح'' (مجمع الزوائد: ٤٦٠/٨)
③ تفسير الطبري (٦٨١/٢٣) یہ روایت مرسل ہے۔ ④ تفسير الطبري (٦٨٢/٢٣، ٦٨٣) ⑤ تفسير الطبري (٦٨٥/٢٣)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور عطاء بن ابی مسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد فراغت اور نوم (نیند) ہے۔ امام ابو العالیہ، مجاہد، ابو مالک، ضحاک، حسن، قتادہ، ربیع اور سفیان ثوری رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یعنی لمبی فراغت۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی فراغ و بغیہ و منقلب، یعنی فرصت و جستجو اور کاموں کا لوٹنا پھرنا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی تطوع کثیر۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی شغلِ حوائج۔ اب تو رات کو اپنے دین کے لیے فارغ ہو۔ یہ اس وقت تھا جب صرف رات کی نماز فرض تھی۔

رات کے قیام کا انداز:

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر احسان فرمایا اور اس کو ہلکا کر دیا اور موقوف فرمایا اور کہا کہ رات کو اٹھ مگر تھوڑا آخر آیت تک، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآىِٕفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ١ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ١ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ١ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ١ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ﴾ [المزمل: ۲۰] نیز فرمایا: ﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾[1] [بني إسرائيل: ۷۹] ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ بات اس طرح پر ہے جس طرح کہ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا اور اس پر دلیل امام احمد رحمہ اللہ کی سعید بن ہشام سے روایت ہے۔ کہتے ہیں: میں نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو قیام کس طرح کرتے تھے۔ کہا: تو نے یہ سورۃ المزمل نہیں پڑھی؟ میں نے کہا کہ ہاں اللہ نے قیامِ لیل کو اس سورت کے شروع میں فرض کیا تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب رضی اللہ عنہم نے ایک سال تک قیام کیا، یہاں تک کہ پاؤں پر ورم آ گیا اور اللہ نے اس سورت کا اخیر بارہ مہینے تک روکے رکھا، پھر اس سورت کے آخر میں تخفیف اتاری اور قیامِ لیل تطوع (نفل) ٹھہرا فرض کے بعد۔ میں نے ارادہ کیا کہ قیام کروں، پھر مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وتر یاد آیا۔ میں نے کہا کہ اے ام المومنین! مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کے متعلق بتاؤ۔ کہا: ہم مسواک اور وضو کا پانی تیار کر دیتے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے رات کو اٹھ کر مسواک اور وضو کر کے آٹھ رکعت نماز پڑھتے، درمیان میں نہ بیٹھتے مگر آٹھویں رکعت کے نزدیک اور ذکر اور دعا کر کے سلام پھیرتے جس کو ہم سنتے۔ پھر بیٹھ کر دو رکعت پڑھتے سلام کے بعد یہ گیارہ رکعتیں ہوئیں؛ اے بیٹے! یعنی وتر کے ساتھ۔ پھر جب آپ مسن (بڑی عمر کے) ہوئے اور بدن آپ کا گوشت سے بھاری ہوا تو سات رکعت کا وتر کرتے، پھر دو رکعت بیٹھ کر پڑھتے سلام پھیرنے کے بعد؛ اے بیٹے! یہ نو رکعتیں ہوئیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت

[1] تفسیر الطبري (۶۸۶/۲۳) تفسیر ابن کثیر (۵۵۹/۴)

یہ تھی کہ جب کوئی نماز پڑھتے تو اس پر ہمیشگی کرنے کو پسند فرماتے اور جب کبھی نیند یا درد یا مرض کی وجہ سے رات کا قیام نہ کر سکتے تو دن کو بارہ رکعت نماز پڑھتے۔ میں نہیں جانتی کہ نبی اکرم ﷺ نے کبھی پورا قرآن ایک رات میں صبح تک پڑھا ہو، یا ایک مکمل مہینا سوائے رمضان مبارک کے روزے رکھے ہوں۔[1] (رواه أحمد بتمامه)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس حدیث کی تصدیق کی ہے اور مسلم رحمہ اللہ نے اس کے مثل حدیث قتادہ رحمہ اللہ سے روایت کی ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دوسری روایت یہ ہے کہ میں نبی اکرم ﷺ کے لیے بوریا بچھا دیتی تھی، آپ ﷺ رات کو اس پر نماز پڑھتے، لوگوں نے سن کر اجتماع کیا۔ نبی اکرم ﷺ غصے میں آ کر باہر نکلے اور وہ ان پر مہربان تھے، ڈرے کہ کہیں یہ قیامِ شب ان پر فرض نہ ہو جائے۔ فرمایا: اے لوگو! اعمال میں سے وہ عمل کرو جس کی تم کو طاقت ہے۔ اللہ ثواب سے ملول نہیں ہوتا (تھکتا نہیں)، یہاں تک کہ تم ملول ہو اور اعمال میں سے بہتر عمل وہ ہے جس پر ہمیشگی کی جائے۔ اور یہ سورت اتری۔ کوئی شخص رسی باندھتا اور اس سے لٹکتا۔ آٹھ ماہ تک یہی صورت رہی۔ جب اللہ نے دیکھا کہ یہ اللہ کی رضا مندی کی جستجو کرتے ہیں تو ان پر رحم کیا اور فرض کی طرف پھیر دیا اور قیامِ لیل چھوڑ دیا گیا۔ (رواه ابن جرير) اسی کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بھی طریق موسیٰ زبیدی سے روایت کیا ہے اور وہ ضعیف ہے[2] اور اصل حدیث صحیح میں ہے، لیکن نزولِ سورت کے اضافے کے بغیر۔[3]

اس کے سیاق سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ سورت مدینے میں اتری ہو، حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بلکہ یہ سورت مکے میں نازل ہوئی ہے اور یہ سیاق کہ اس سورت کے شروع کے اور آخری حصے کے نزول کے درمیان آٹھ ماہ کا وقت تھا، غریب ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کی روایت میں ایک سال کا فاصلہ گزر چکا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اولاً جب مزمل کا پہلا حصہ نازل ہوا تو لوگ قیامِ ماہ رمضان کی طرح قیام کرتے۔ سورت کے شروع کے اور آخر کے حصے کے درمیان تقریباً ایک سال گزرا۔[4]

دوسری روایت یہ ہے کہ "كَانَ بَيْنَهُمَا سَنَةٌ" امام ابو عبدالرحمان نے کہا ہے کہ جب ﴿ يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴾ اتری، لوگ ایک سال تک قیامِ لیل کرتے رہے، یہاں تک کہ پاؤں سوج گئے اور پنڈلیاں ورم کر آئیں، تب یہ آیت اتری: ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ﴾، لوگوں نے راحت پائی۔ یہی قول امام حسن بصری اور سدی رحمہما اللہ کا ہے۔ سعید بن ہشام رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: مجھے نبی اکرم ﷺ کے قیام کے متعلق بتائیں، کہا: تو مزمل نہیں پڑھتا؟

---

[1] صحيح مسلم (٧٤٦) مسند أحمد (٦/ ٥٣)

[2] تفسير الطبري (٢٣/ ٦٧٨) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣٣٧٩) اس کی سند میں "موسیٰ بن عبیدہ" ضعیف راوی ہے۔

[3] صحيح البخاري (٥٥٢٣) صحيح مسلم (٧٨٢) [4] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/ ٣٣٨٠)

کہا: ہاں۔ کہا کہ نبی اکرم ﷺ اور اصحاب رضی اللہ عنہم نے اتنا قیام کیا کہ پاؤں سوج گئے اور سورت کا آخری حصہ آسمان میں چھے ماہ تک رکا رہا، پھر نازل ہوا۔[1] (رواه ابن أبي حاتم)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک یا دو سال تک قیام کیا، یہاں تک کہ پنڈلیاں سوج گئیں اور پاؤں ورم کر آئے، تب اللہ پاک نے سورت کے آخری حصے میں تخفیف نازل فرمائی۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اللہ نے نبی اکرم ﷺ پر مزمل اتاری آپ ﷺ دس برس تک اس حال پر رہے کہ رات کو اللہ کے حکم کے مطابق قیام کرتے اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کا ایک گروہ آپ ﷺ کے ہمراہ قیام کرتا، پھر دس برس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى ... ﴾ تب دس برس کے بعد تخفیف فرمائی۔ (رواه ابن جرير) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ مومنین پر یہ آیت گراں گزری، اللہ نے ان سے تخفیف کی اور رحم فرمایا اور یہ آیت بھیجی: ﴿ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ..... إلى قوله: .... فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ﴾۔ فوسع الله وله الحمد ولم يضيق.[2]

پھر نبی اکرم ﷺ کو ﴿ تَبَتَّلْ ﴾ کا حکم دیا، یعنی اللہ کا بہت سا ذکر کر اور اسی کی طرف آ جا اور عبادت کے لیے خالی ہو جبکہ تجھ کو شغل سے اور امورِ دنیا سے فرصت اور فراغت ہوا کرے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ﴾ [الإنشراح: ۷] ”پس جب تو فارغ ہو تو عبادت میں محنت کر۔“ یعنی فارغ ہو کر اطاعت اور عبادت کے لیے مستعد ہو۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی فارغ البال ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ابو صالح، عطیہ، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تَبَتَّلْ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ خالص اس کی عبادت کر۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اجتہاد کر اور اپنے نفس کو چھڑا کر اس کی طرف لا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عابد کو متبتل کہتے ہیں۔[3]

اسی جگہ سے یہ حدیث ہے: « نَهَى عَنِ التَّبَتُّلِ »[4] یعنی عبادت کو منقطع کرنے اور تزوج کے ترک کرنے سے منع فرمایا۔ وکیل سے یہاں مراد مالک و متصرف ہے، یعنی جس طرح تو صرف اللہ کی عبادت کرتا ہے اسی طرح تو فقط اس پر بھروسا بھی کر اور اسے اپنا وکیل سمجھ لے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ [هود: ۱۲۳] ”پس تجھے اسی کی عبادت کرنی چاہیے اور اسی پر بھروسا رکھنا چاہیے۔“ نیز جیسا کہ اس کا فرمان ہے: ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ [الفاتحة: ٤] ”ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔“ اس معنے میں اور بہت سی آیتیں ہیں جن میں صرف اللہ کی عبادت اور اطاعت کا اور اللہ پر توکل کرنے کا حکم ہے۔[5]

---

① تفسیر الطبري (٦٧٩/٢٣) تفسیر ابن کثیر (٥٦٠/٤، ٥٦١) ② تفسیر الطبري (٦٧٩/٢٣) ③ تفسیر الطبري ٦٨٧/٢٣۔٦٨٩)
④ سنن الترمذي (١٠٨٢) سنن النسائي (٣٢١٤) سنن ابن ماجه (١٨٤٩) صحيح الجامع (٢٨٧٦)
⑤ تفسیر ابن کثیر (٥٥٧/٤۔٥٦١)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ تزمل کپڑے میں ملفوف ہونے کو کہتے ہیں۔ یہ نبی اکرم ﷺ کو خطاب ہے، اس کے معنی میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے کہا ہے کہ شروع شروع میں جب جبریل علیہ السلام وحی لاتے تو نبی اکرم ﷺ وحی کے خوف سے کپڑے میں لپٹ رہتے۔ یا مزمل سے مراد تزمل بہ نبوت یا التزامِ رسالت ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے یوں ہی کہا ہے اور مزمل بہ تخفیفِ زاء پڑھا ہے۔ زمل بہ معنی حمل ہے۔ اونٹ کو زاملہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ مسافر کا اسباب اٹھاتا ہے۔ یا مراد تزمل بالقرآن ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سونے کے لیے کپڑا اوڑھنا ہے۔[1] اسی طرح امام قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ مشرکوں کی طرف سے کوئی بری بات آپ کو پہنچی تھی، اس پر آپ ﷺ کپڑوں میں متزمل اور متدثر ہوئے۔

حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرشتے کی آواز سن کر اس کی طرف نظر کی، آپ ﷺ کو رعشہ ہوا اور اپنے گھر والوں کے پاس آ کر فرمایا: « زَمِّلُوْنِي دَثِّرُوْنِي »[3] یعنی مجھ کو رضائی لحاف اوڑھا دو کہ سردی لگتی ہے اور بدن کانپتا ہے۔ یہ خطاب نبی اکرم ﷺ کو نزولِ وحی کی ابتداء میں ہوا تھا، پھر اس کے بعد نبوت اور رسالت کا خطاب ہونے لگا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "زَمَّلْتَ هٰذَا الْأَمْرَ فَقُمْ بِهِ"۔ یعنی تو نے اس بار کو اٹھایا ہے اب تو اس کے ساتھ قیام کر۔[4] امام سہیلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مزمل کچھ نبی اکرم ﷺ کا نام نہیں ہے جس طرح کہ بعض لوگوں نے اس کو آپ ﷺ کے ناموں میں گنا ہے۔ بلکہ یہ لفظ اس حالت سے مشتق ہے جس پر کہ آپ ﷺ خطاب کے وقت کپڑے اوڑھے ہوئے اور لپیٹے ہوئے تھے۔ اسی طرح مدثر ہے۔[5]

اس خطاب میں دو فائدے ہیں: ایک تو ملاطفت (مہربانی کرنا)۔ عرب کا دستور ہے کہ جب ملاطفت کا ارادہ کرتے ہیں اور غصہ کرنا نہیں چاہتے تو اس شخص کی موجودہ حالت سے ایک نام مشتق کر کے خطاب کرتے ہیں جس طرح کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے خفا ہو کر مسجد میں آ کر سو رہے تھے۔ نبی اکرم ﷺ ان کے پاس آئے دیکھا کہ سوئے ہیں اور پہلو پر خاک لگ رہی ہے۔ فرمایا: « قُمْ يَا أَبَا تُرَابٍ »[6] اس میں عدمِ عتاب ظاہر کیا اور مہربانی کا اظہار فرمایا، اسی طرح سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: « قُمْ يَا نَوْمَانُ »[7] وہ سوئے تھے، ان کے ساتھ مہربانی فرمائی اور ترکِ عتاب کا اظہار فرمایا، اسی طرح اللہ پاک کا اپنے رسولِ مقبول ﷺ کو مزمل اور مدثر کے الفاظ سے یاد کرنا ہے۔ اس میں انسیت و مہربانی نکلتی ہے، تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ کو ان پر کچھ ناراضی نہیں ہے۔ دوسرا فائدہ: ہر مزمل کو جو رات بھر پڑا سویا رہتا ہے، یہ تنبیہ کرنا ہے کہ وہ قیام لیل کے لیے اٹھے اور اللہ کا ذکر کرے، اس لیے کہ جو اسم کسی فعل سے

---

[1] تفسير القرطبي (٣٢/١٩) [2] تفسير الطبري (٦٧٦/٢٣) [3] صحيح البخاري (٣، ٤٦٣٨)
[4] مستدرك الحاكم (٥٤٧/٢) [5] تفسير القرطبي (٣٣/١٩)
[6] صحيح البخاري (٤٣٠) صحيح مسلم (٢٤٠٩) [7] صحيح مسلم (١٧٨٨)

مشتق ہوتا ہے، اس نام میں مخاطب کے ہمراہ اس عمل کا ہر عامل بھی شریک سمجھا جاتا ہے اور صفتِ مذکور کے ساتھ متصف سمجھا جاتا ہے۔ (ذکرہ الخطیب) رات کو کھڑا ہو، یعنی نماز کے لیے، کیوں کہ یہ وقت خلوت اور تنہائی اور خفیہ وستر کا ہے۔

اَللَّيْلُ لِلْمُعَاشِقِيْنَ سِتْرٌ   يَا لَيْتَ أَوْقَاتِهِ تَدُوْمُ

''رات عاشقوں کے لیے پردے کا کام دیتی ہے، کاش وہ ختم نہ ہوتی۔''

یا ﴿ قُمِ ﴾ کا لفظ بہ معنی ''صَلِّ'' ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ قیام جس کا حکم دیا گیا کیا یہ نبی اکرم ﷺ پر فرض تھا یا نفل؟ بعض نے کہا ہے کہ حکم وجوب کے لیے ہے۔ یہ قیام آپ ﷺ پر واجب تھا، بلکہ امت پر بھی اور پہلے سب انبیاء پر بھی واجب تھا اور سب سے پہلے دعا و انذار کے بعد نبیِ مکرم ﷺ پر یہی قیامِ لیل واجب ہوا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ دلائل اسی بات کو تقویت دیتے ہیں کہ قیام صرف نبی اکرم ﷺ پر فرض تھا۔ یا آپ ﷺ پر اور پہلے پیغمبروں پر، یا آپ ﷺ پر اور ساری امت پر۔ یہ تین قول ہیں: پہلا قول سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا ہے، کیوں کہ خطاب صرف نبی اکرم ﷺ ہی کی طرف متوجہ ہے۔ دوسرا قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ تیسرا قول سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[1] (كذا في الخطيب والخازن وغيرهما) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کو آیت: ﴿ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ ..... الخ ﴾ نے منسوخ کر دیا ہے۔[2] قلیل سے مراد یسیر، یعنی ساری رات نماز پڑھ مگر تھوڑی رات نہ پڑھ، آرام لے۔ قلیل نصف سے کم کو، یا چھٹے حصے سے کم کو، یا اڑھائی سے کم کو کہتے ہیں۔ امام مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ مراد تہائی رات ہے۔[3]

میں کہتا ہوں: اللہ نے ہم کو اس اختلاف سے بے نیاز کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ ﴿ نِصْفَهٗۤ ﴾ یعنی نصف شب قیام کر، یا نصف سے کچھ کم ثلث تک، یا کچھ زیادہ دو ثلث تک۔ گویا یہ فرمایا کہ دو ثلث شب، یا نصف شب، یا ایک ثلث شب قیام کرو۔ ﴿ اَوِ ﴾ نصف شب کے قیام اور ثلث شب قیام کے درمیان کوئی مدت اختیار کرنے کے لیے ہے جو الفاظ: ﴿ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ﴾ سے ظاہر ہوتا ہے اور دو ثلث قیام کے درمیان جو ﴿ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ ﴾ سے سمجھا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک معنی یہ ہیں کہ رات کو کھڑا ہو مگر نصف یا نصف سے کم یا نصف سے زیادہ مت کھڑا ہو۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین کہتے ہیں کم کر نصف سے کچھ تہائی تک یا بڑھا نصف پر دو تہائی تک۔ اللہ نے قیامِ شب میں گنجایش رکھی اور ان گھڑیوں میں قیام کا اختیار دیا۔[4]

پھر ناسخ کے بارے میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ناسخ یہ آیت ہے: ﴿ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ ... الخ ﴾ تا آخر سورت۔ بعض نے کہا کہ ناسخ: ﴿ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ ﴾ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ناسخ ﴿ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ﴾ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس حکم کی ناسخ نمازِ پنج گانہ ہے۔ یہی قول امام مقاتل، شافعی اور ابن کیسان رحمہم اللہ

---

[1] تفسير القرطبي (۱۹/۳٤)　[2] سنن البيهقي الكبرىٰ (۲/۵۰۰)

[3] تفسير القرطبي (۱۹/۳۵)　[4] فتح القدير (۵/ ٤۱۸، ٤۱۹)

کا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ ناسخ ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ﴾ ہے۔ قرآن شریف میں کوئی ایسی سورت نہیں ہے کہ اس کا آخری حصہ پہلے حصے کا ناسخ ہو، مگر یہ سورت اور اس منسوخی کے درمیان چھے ماہ یا ایک سال کی مدت گزری تھی۔ یہ اس بنیاد پر کہ ساری سورت مکی ہے اور اگر ناسخ ﴿ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ ﴾ ہے تو مدنی ہے اب فاصلہ دس سال کا ہوتا ہے، کیوں کہ جس کو منسوخ کیا گیا، اس کا نزول ابتدائی وحی میں مکہ کے مقام پر ہوا تھا اور جس نے منسوخ کیا اس کا نزول مدینہ میں ہوا، اس لیے ناسخ اور منسوخ کے درمیان کم سے کم مدت دس برس ہوتی ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[2] بعض نے کہا ہے کہ تقدیر مکہ میں منسوخ ہو کر تہجد باقی رہ گیا تھا، وہ مدینے میں منسوخ ہوا۔ بعض نے کہا ہے کہ سورت کے شروع کا حصہ آخری حصے سے منسوخ ہوا، پھر آخری حصہ سورت کا نمازِ پنج گانہ سے منسوخ ٹھہرا۔

امام حسن اور ابن سیرین رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ رات کی نماز ہر مسلمان پر فرض ہے اگرچہ اتنی ہی دیر ہو کہ بکری کو دوہے۔[3] ”ترتیل“ سے مراد امہال ہے تدبر کے ساتھ، یعنی ٹھہر ٹھہر کر حرفوں کو خوب کھول کھول کر اور وقف اور اس کی حرکات کو خوب اچھی طرح ادا کر کے پڑھ، تاکہ سننے والا اس کو گن سکے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حرف حرف پڑھ۔[4] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سارے حرفوں کو واضح کر اور حقِ اشباع پورا کر۔[5] اصل ترتیل بہ معنی تنضید، تنسیق اور حسنِ نظام ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ خوب واضح کر کے پڑھ۔[6] مصدر سے فعل کی تاکید مبالغہ و ایجابِ امر پر دلیل ہے، اس طرح سے کہ بعض حروف بعض سے چھپ نہ جائیں اور حروف کے بولنے، یعنی ان کی آواز میں کمی نہ آئے، بلکہ اپنے معروف مخرج سے پوری حرکت معتبرہ کے ساتھ نکلے۔ قاری کے لیے یہ بات ضروری ہے۔ یعلی بن مالک رحمہ اللہ نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت اور نماز کا حال پوچھا تھا: کہا: تم کو ان کی نماز سے کیا واسطہ ہے؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کا بیان کیا اور اس کو مفسر حرف حرف کر کے بتایا۔[7] (أخرجه النسائي)

ترمذی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تقطیع قراءت فرماتے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کہہ کر ٹھہر جاتے پھر ﴿ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ کہتے اور ٹھہر جاتے، پھر ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ کہتے اور ٹھہر جاتے۔[8] عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کے دن ناقہ پر دیکھا سورۃ الفتح پڑھتے تھے۔ قراءت میں ترجیع فرماتے۔[9] (أخرجه الشيخان)۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر ہمارے پاس آئے ہم قرآن

---

[1] تفسير القرطبي (١٩/٣٦) [2] تفسير الطبري (٢٣/٦٧٩) [3] تفسير القرطبي (١٩/٣٦)
[4] تفسير القرطبي (١٩/٣٧) [5] معاني القرآن (٥/٢٤٠) [6] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٨٠)
[7] سنن النسائي (١٠٢٢) [8] سنن الترمذي (٢٩٢٧) صحيح الجامع (٥٠٠٠)
[9] صحيح البخاري (٤٠٣١) صحيح مسلم (٧٩٤)

پڑھ رہے تھے، ہم میں عربی اور عجمی تھے، فرمایا: پڑھتے جاؤ، یہ سب پڑھنا اچھا ہے قریب ہے کہ کچھ قومیں ایسی آئیں گی جو اس کو، یعنی قرآن کو سیدھا کریں گے جس طرح کہ قدح کو سیدھا کرتے ہیں، وہ اس کو جلد جلد پڑھیں گے نہ کہ آہستہ آہستہ سے دیر کر کے۔[1] (أخرجه أبو داود)

ایک روایت میں یوں ہے کہ وہ ان کے گلے سے آگے نہ بڑھے گا۔[2] اس بارے میں احادیث آئی ہیں، یہ حدیثیں اس بات پر دلیل ہیں کہ جو پڑھنا ایسا ہو کہ اس میں حلق پھٹے، ناک منہ ٹیڑھا ہو، حرفوں کو مخارج سے خوب زور سے نکالا جائے۔ درستیٔ الفاظ پر نظر نہ ہو، وہ پڑھنا خلافِ سنت ہے جس طرح کہ اس زمانے کے قاری مصر، مکہ اور مدینہ وغیرہ میں غنہ سے پڑھتے ہیں۔ یہ علمِ تجوید بدعت ہے۔ (كما في المصفى شرح المؤطا)

ترتیل کا مقصد یہ ہے کہ اول وقت قراءت کے حاضر ہو نہ کہ حرفوں کا حلقوم سے چہرے اور منہ کو ٹیڑھا کر کے اور الحانِ غنا سے نکالنا۔ قولِ ثقیل سے مراد قرآنِ عظیم وفرقانِ کریم ہے۔ یہ کلام صاحبِ خطر وعظمت ہے، کیوں کہ رب العالمین کا کلام ہے اور جو شے ذو خطر و مقدار ہوتی ہے وہ ثقیل ہے۔ رسالہ "فصل الخطاب في فضل الكتاب" سے اس قولِ ثقیل کی قدر ورفعت اور عزت ومنفعت معلوم ہو سکتی ہے، اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واللہ! اس کے فرائض اور حدود ثقیل ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا حلال وحرام ثقیل ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس پر عمل کرنا ثقیل ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اس کے وعدہ اور وعید ثقیل ہیں۔

امام محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منافقین اور کفار پر ثقیل ہے، کیوں کہ اس میں ان پر حجت قائم کی گئی ہے اور ان کی گمراہی کا بیان ہے اور ان کی پردہ دری ہے اور ان کے ادیان کا بطلان ہے اور ان کے معبودوں کی برائی ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ثقیل بہ معنی کریم ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زریں ہے خفیف سفساف نہیں ہے، کیوں کہ ہمارے رب کا کلام ہے۔ حسین بن فضل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ثقیل ہے، اس کو نہیں اٹھاتا مگر وہ دل جو مؤید بتوفیق ہے اور وہ نفس جو مزین بتوحید ہے۔[3] بعض نے کہا ہے کہ زبان پر ہلکا ہے اور قیامت کے دن ثواب کے لیے ترازو میں بھاری ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ثابت ہے، جیسے: بھاری چیز اپنی جگہ میں ثابت ہوتی ہے، یعنی اس کا اعجاز ہمیشہ برقرار ہے کبھی زائل نہیں ہوتا۔ بعض نے کہا ہے کہ حقیقت میں ثقیل ہے، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی آتی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناقے پر ہوتے تو وہ اپنی گردن زمین پر ڈال دیتا۔ بعض نے کہا ہے کہ ثقیل ہے، یعنی صرف عقل کلی طور پر اس کے فوائد اور معانی کو نہیں سمجھ سکتی۔ متکلمین اس کے معقولات کے سمندر میں غوطہ لگاتے ہیں۔ فقہاء اس کے احکام میں بحث کرتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ معانی ولغت وغیرہ کرتے ہیں اور ہمیشہ ہر بعد میں آنے والا ایسے فوائد پاتا ہے جو اس سے پہلوں کو حاصل نہ ہوئے۔ معلوم ہوا کہ اکیلے انسان کو اسے مستقل طور پر اٹھانے کی قوت نہیں ہے جس

---

[1] سنن أبي داود (٨٣٠) صحيح الجامع (١١٦٧) [2] صحيح البخاري (٣٣١٤) صحيح مسلم (١٠٦٤)
[3] تفسير القرطبي (٣٨/١٩)

طرح کہ کوئی کوہِ گراں بار ہو کہ ساری مخلوق اس کو اٹھانے سے عاجز ہو۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ سارے معانی قرآن کے اندر ہیں۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قولِ ثقیل "لا إله إلا الله" کہنا ہے، اس لیے کہ حدیث میں واضح طور پر آیا ہے کہ "لا إله إلا الله" زبان پر ہلکا ہے اور میزان میں بھاری ہے۔[1] انتہیٰ. میں کہتا ہوں کہ حدیثِ بطاقہ میں فرمایا ہے: ﴿وَلَا يَثْقُلُ مَعَ اسْمِ اللّٰهِ شَيْءٌ﴾[2] "اللہ کے نام سے کوئی چیز وزنی نہیں ہے۔"

﴿ نَاشِئَةَ الَّيْلِ ﴾ سے مراد شب کی گھڑیاں، اوقات اور لمحات ہیں کہ اولاً فاولاً ناشی (پیدا) ہوتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رات کو جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ ناشئہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ نفس ہے جو رات کو عبادت کے لیے بستر پر سے اٹھتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ناشئہ وہ قیام ہے جو نیند کے بعد ہو۔ اگر نیند کے بعد نہ ہو تو ناشئہ نہیں ہے۔ یا مراد طاعاتِ شب ہیں۔ امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب تو شب کے پہلے حصے میں سو رہا، پھر اُٹھ بیٹھا تو یہ "منشأة و نشأة" ہوا۔ اس سے ﴿ نَاشِئَةَ الَّيْلِ ﴾ ہے۔ امام عکرمہ اور عطاء رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ آغازِ لیل ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساری رات ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آخر لیل کا قیام ہے۔ صحاح میں کہا ہے کہ شب کی پہلی گھڑیاں ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عشائے آخرہ کے بعد سے صبح تک۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اول شب ہے، نمازی پر ﴿ نَاشِئَةَ الَّيْلِ ﴾ کی نماز بہ نسبت دن کی نماز کے گراں تر ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ وقت سونے کا ہوتا ہے۔ یا معنی یہ ہیں کہ اس وقت کی نماز دل کے نہایت موافق ہوتی ہے اور قرآن کا سمجھنا خوب ہوتا ہے۔ مواطات بہ معنی موافقت ہے۔

امام مجاہد اور ابن ابی ملیکہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ وہ وقت دل، کان، آنکھ اور زبان کے درمیان بہت یکسوئی پیدا کرتا ہے، اس لیے کہ اس وقت آوازیں منقطع ہو جاتی ہیں اور حرکات تھم جاتی ہیں۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ اس وقت کا قیام بہت سخت ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أثبت العمل" ہے اور جو عبادت کی کثرت کا ارادہ رکھتا ہے، اس کے لیے ادوم (قائم رکھنے والا) ہے۔ شب کے وقت معاش کی مصروفیات سے فرصت حاصل ہو جاتی ہے۔ عبادت کے لیے خاطر جمع ہوتی ہے اور اس کے لیے بغیر رکاوٹ کے دوام حاصل ہوتا ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نشاط شدید ہوتی ہے، یعنی لطف بہت آتا ہے۔[3]

﴿ اَقْوَمُ قِيْلًا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ بات خوب واضح ہوتی ہے اور قول نہایت سدید (درست) اور استقامت نہایت شدید ہوتی ہے اور صحیح راستے پر ہمیشگی حاصل ہوتی ہے، کیوں کہ آوازیں تھم جاتی ہیں اور دنیا ساکن ہو جاتی ہے اور نماز پڑھنے والے پر قراءت میں کوئی اضطراب نہیں ہوتا۔ امام قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یعنی وہ وقت قراءت

---

(1) تفسير القرطبي (۱۹/۳۹) (2) سنن الترمذي (۲٦۳۹) صحيح الجامع (۱۷۷٦)

(3) تفسير القرطبي (۱۹/۳۹) فتح القدير (۵/۴۱۹، ۴۲۰)

کے لیے بہت اچھا اور قول کو بہت زیادہ ثبت کرنے والا ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ وقت سمجھنے کا ہوتا ہے۔ امام ابو علی فارسی نے کہا ہے کہ استقامت میں سخت تر ہے، کیوں کہ شب میں انسان فارغ البال ہوتا ہے۔

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن کے قول کے لیے زیادہ واضح ہوتا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لطف اور اخلاص میں مکمل ہے اور زیادہ بابرکت ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے لائق ہے کہ قرآن کو سمجھے بوجھے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ دعا کی قبولیت بہت جلدی سے حاصل ہوتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ سب معانی مراد ہوں۔ "سبح" سے مراد حاجات میں تصرف ہے، یعنی مشغولیت اور حاجات کو حاصل کرنے کے لیے آگے پیچھے دوڑنا اور آنا جانا ہے۔ "سبح" چلنے پھرنے اور چکر لگانے کو کہتے ہیں، اسی سے سباحت فی الماء ہے، کیوں کہ تیرنے میں انسان ہاتھ پاؤں مارتا ہے، سباحت سے حاجات میں تصرف کا اشارہ کیا۔ بعض نے کہا ہے کہ "سبح" سے مراد فراغ ہے۔ یعنی تو دن کو حاجات کے لیے فارغ رہتا ہے، اب رات کو نماز پڑھ عبادت کرو۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "سبح" کا مطلب کام کاج اور خواب کے لیے خالی ہونا ہے۔

خلیل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "سبح" نوم ہے اور تمدد (کھینچنا)۔ بعض نے اس کو "سبخ" بہ خائے معجمہ پڑھا ہے بہ معنی خفت وسعت واستراحت، یعنی اللہ نے تجھ سے فکر کو ہلکا کر دیا ہے اور "سبخ" بہ معنی سکون ہے۔ امام ابو عمرو نے کہا ہے کہ بہ معنی نوم و فراغت ہے۔[2] پھر فرمایا: تو اپنے رب کا نام یاد کر، یعنی اسمائے حسنیٰ کے ساتھ اس کو پکار، یا ابتدائے نماز میں اس کا نام لے، یا وعد و وعید میں اس کو یاد کر تا کہ عبادت وافر مقدار میں کرے اور معصیت سے دوری ہو۔ یا اللہ کے ذکر اور قرآن کی تلاوت پر ہمیشگی کر، یا علم حاصل کرنے پر شب و روز محنت کر، یا تسبیح و تہلیل و تحمید و صلات اور قراءتِ قرآن پر ہمیشگی کر۔[3] (قاله القاضي كالكشاف)

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نماز پڑھ اپنے رب کے لیے۔[4] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بسم اللہ کہہ قراءت کے شروع میں،[5] خواہ یہ قراءت نماز میں ہو یا نماز سے باہر۔ یہ اس وقت ہے کہ سورت کے شروع سے پڑھے اور اگر سورت کے درمیان سے پڑھے تو اگر نماز کے علاوہ ہو تو بسم اللہ کا کہنا سنت ہے اور اگر نماز میں ہو تو بسم اللہ نہ کہے۔ اس لیے کہ سورۃ الفاتحہ کے بعد قراءت ایک ہی قراءت گنی جاتی ہے۔ انتہی

میں کہتا ہوں کہ اگر سورت کے درمیان بسم اللہ نہ پڑھنے کی علت یہی ہے تو بسم اللہ پڑھنے کی دلیل اگرچہ سورت کے درمیان میں ہو، یہ حدیث صریح ہے: «كُلُّ أَمْرٍ ذِي بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيهِ بِاسْمِ اللّٰهِ فَهُوَ أَقْطَعُ»[6] "ہر ذی بال امر جو اللہ کے نام سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکتا ہوتا ہے۔" اور قرآن پاک کا ہر جملہ بلکہ ہر لفظ ذی بال

---

① تفسير القرطبي (٤١/١٩) فتح القدير (٤٢٠/٥)
② تفسير القرطبي (٤٣،٤٢/١٩)
③ تفسير البيضاوي (٤٠٦/٥) الكشاف (٦٤٠/٤)
④ تفسير القرطبي (٤٣/١٩)
⑤ تفسير الجلالين (٧٧٣/١)
⑥ الدر المنثور (٢٦/١)

ہے، اس میں کچھ شک وشبہہ نہیں ہے تو اب ہر قراءت کو بسم اللہ ہی سے شروع کرنا چاہیے۔ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ فاتحہ کے ہمراہ اثنائے سورت ایک قراءت سمجھی جائے اور سورت کے شروع سے پڑھنا ایک قراءت نہ ٹھہرے، بلکہ بسم اللہ ہر سورت سے پہلے ایک آیت ہے۔ وہ نفسِ قراءت میں داخل ہے، اثنائے سورت پر حدیثِ مذکورہ کی روشنی میں بسم اللہ پڑھنا چاہیے کہ اس جگہ بسم اللہ اس سے الگ ہے۔ واللہ أعلم.

﴿ تَبَتَّلْ ﴾ بہ معنی انقطاع ہے، یعنی عبادت میں مشغول ہو کر سب سے الگ ہو جا۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تَبَتَّلْ ﴾ دنیا و مافیہا کو ترک کرنا اور التماس ما عند اللہ ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ مراد اخلاص ہے یا توکل۔ وکیل وہ ہے جو قائم بامور ہو اور سب کاموں میں اس پر اعتماد ہو، یا بہ معنی کفیل ہے۔ امام بقاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان ہر کام کو چھوڑ دے، کیوں کہ یہ ایک طمع فارغ ہے، بلکہ مراد ہر اس چیز کے طلب کرنے میں اجمال ہے جس کی طرف انسان مندوب ہے، تاکہ سبب میں متوکل ہو اور مسبب کا منتظر ہو۔ اسباب کو بے فائدہ چھوڑ کر مسببات میں طمع نہ کرے کہ یہ اس طرح ہوگا کہ کوئی بیوی کے بغیر اولاد کی طلب کرے اور یہ اس حکمت کے برعکس ہے جو اس جہان میں رکھی گئی ہے اور بنیاد اس کی اسباب پر ہے۔[2]

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ﴿10﴾ وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا ﴿11﴾ اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِيْمًا ﴿12﴾ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ﴿13﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ﴿14﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿15﴾ فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿16﴾ فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ﴿17﴾ السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ۭ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا ﴿18﴾

اور جو کچھ وہ کہتے ہیں، اس پر صبر کیجیے اور انھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دیجیے ⑩ اور مجھے اور تکذیب کرنے والے آسودہ حال لوگوں کو تنہا چھوڑ دیجیے اور انھیں تھوڑی سی مہلت دیجیے ⑪ بے شک ہمارے پاس بیڑیاں اور بھڑکتی آگ ہے ⑫ اور گلے میں اٹکنے والا طعام اور دردناک عذاب ہے ⑬ جس دن زمین اور پہاڑ کانپیں گے اور پہاڑ ریت کے بھربھرے ٹیلے ہوں گے ⑭ بے شک ہم نے تمھاری طرف ایک رسول بھیجا جو تم پر شاہد ہے جیسے ہم نے فرعون کی طرف

① فتح القدير (٤٢١/٥) ② نظم الدرر للبقاعي (٢٠٩/٨) فتح البيان (٣٧٧/١٤-٣٨٨)

رسول بھیجا تھا⑮ چنانچہ فرعون نے رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے نہایت سختی سے پکڑ لیا⑯
پھر تم (عذاب سے) کیسے بچو گے، اگر تم نے اس دن کا انکار کیا جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا؟⑰
جس (کی شدت) سے آسمان پھٹ جائے گا۔ اس (اللہ) کا وعدہ ہو کے رہنا ہے⑱

کفار کی اذیتوں پر صبر کرنے کا حکم:

اس دن کی شدت سے یا درازی سے، اگرچہ وہاں جیسے ہیں ویسے ہی رہیں گے لیکن مدت اتنی ہے کہ لڑکے بوڑھے ہو جائیں۔ انتہیٰ.

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو مکذبین کے قول پر صبر کرنے کا حکم دیا کہ قوم کے سفہاء کی بات پر آزردہ نہ ہو، بلکہ ان کو بغیر عتاب کیے اور بات کیے چھوڑ دو۔ پھر کفار کو وعید کی اور دھمکی دی کہ یہ مالدار ہیں اور دوسروں کی نسبت اطاعت کی انھیں زیادہ قدرت حاصل ہے اور حقوق کا جو مطالبہ یہ لوگ کر سکتے ہیں وہ غیر نہیں کر سکتا۔ فرمایا کہ مجھے اور ان کو چھوڑ دے میں ان کو سمجھ لوں گا اور اللہ کے غضب کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔ امہالِ قلیل سے مراد تھوڑا سا وقت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴾ [لقمان: ٢٤] ”ہم ان کو گو کچھ یونہی سا فائدہ دے دیں، لیکن (بالآخر) ہم انھیں نہایت بیچارگی کی حالت میں سخت عذاب کی طرف ہنکا لے جائیں گے۔“ لہٰذا اس جگہ یہ فرمایا ہے کہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، طاؤس، محمد بن کعب، ابن بریدہ، ابوعمران جونی، ابومجلز، ضحاک، حماد بن ابی سلیمان، قتادہ، سدی، ابن المبارک اور ثوری رحمہ اللہ وغیرہم کا ہے۔[1]

”جحیم“ دہکتی آگ کو کہتے ہیں۔ ”غُصَّةٍ“ گلے میں پھنسنے کو کہتے ہیں کہ اندر جائے نہ باہر آئے۔ یہی قول ہے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا۔[2] ”رجفه و کوه“ سے مراد زلزلہ ہے۔ ”مهیل“ سے یہ مراد ہے کہ پہاڑ جو پہلے ٹھوس پتھر تھے اب ریت کے ٹیلے ہو جائیں گے۔ پھر ہوا میں ایسے اڑیں گے کہ ان میں سے کچھ باقی نہ رہے گا۔ زمین ایک ہموار میدان ہو جائے گی نہ کوئی وادی ہو گی نہ ٹیلا، یعنی کسی شے کی بلندی اور پستی نہ رہے گی، ایک چٹیل صاف برابر جگہ ہو گی۔ پھر کفارِ قریش کو خطاب کیا اور ان سے مراد سارے لوگ ہیں، کہ رسول تم پر، یعنی تمھارے اعمال کا شاہد ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام مجاہد، قتادہ، سدی اور ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اخذِ وبیل سے مراد شدید ہے،[3] یعنی تم ڈرو کہ کہیں اس رسول کے جھٹلانے سے تمھاری وہی حالت نہ ہو جو فرعون کی ہوئی تھی کہ اللہ نے اس کو عزیز مقتدر (غالب قدرت والے) کا سا پکڑنا پکڑ لیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴾ [النازعات: ٢٥]۔

---

① تفسیر ابن کثیر (٥٦٢/٤) ② تفسیر الطبري (٦٩١/٢٣) ③ تفسیر الطبري (٦٩٣/٢٣)

تو (سب سے بلند و بالا) اللہ نے بھی اسے آخرت کے اور دنیا کے عذاب میں گرفتار کرلیا۔" سوتم ہلاکت اور تباہی و بربادی کے زیادہ مستحق ہو گے، اگر تم رسول کی تکذیب کرو گے، کیوں کہ تمھارا رسول موسیٰ بن عمران علیہ السلام سے زیادہ اشرف اور اعظم ہے۔

عذابِ قیامت کی وعید:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ سے اسی طرح مروی ہے اور یہ جو فرمایا ہے کہ پھر تم اس دن کیسے بچو گے جو لڑکوں کو بوڑھا کر دے، اگر تم منکر ہو گئے۔ اس کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ اگر تم کفر کرو گے تو اس دن تمھیں بڑی گھبراہٹ سے امان کس طرح حاصل ہو گی۔ دوسرے یہ کہ اگر تم قیامت کے دن کا انکار کرو گے اور منکر ہو جاؤ گے تو تم کس طرح بچ سکتے ہو۔ یہ دونوں معنی خوب ہیں لیکن پہلے معنی زیادہ بہتر ہیں۔ اس دن کی ہولناکیوں کی شدت اور زلازل و بلابل اور مخاوف و قلاقل کی سختیوں سے لڑکا بوڑھا ہو جائے گا جس وقت کہ اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام سے فرمائے گا کہ آگ کا لشکر نکال، وہ کہیں گے: کتنا؟ فرمائے گا: ہر ہزار میں سے نوسو ننانوے آگ میں بھیج اور ایک جنت کی طرف روانہ کر۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا: یہ قیامت کے دن ہو گا۔ اس دن اللہ تعالیٰ آدم علیہ السلام سے فرمائے گا: اٹھ اور اپنی ذریت میں سے ایک لشکر آگ کی طرف بھیج۔ وہ کہیں گے: اے رب! کتنا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہر ہزار میں سے نوسو ننانوے اور نجات ایک پائے گا۔ یہ بات مسلمانوں پر سخت گزری اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہچان لی، پھر ان کے چہروں پر یہ بات دیکھ کر فرمایا کہ بنی آدم بہت ہیں۔ یاجوج ماجوج آدم ہی کی اولاد ہیں، ان میں سے کوئی شخص نہیں مرتا، یہاں تک کہ اس کی پشت سے ہزار مرد منتشر ہوتے ہیں، سو ان میں اور اُن کے اشباہ میں تمھارے لیے سپر (ڈھال) ہے۔[1] (رواه الطبراني وهذا حديث غريب) ان حدیثوں کا ذکر پہلے سورۃ الحج میں گزر چکا ہے۔ امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آسمان منتشر ہو گا (پھٹ جائے گا) یعنی شدت اور ہول سے مشتبہ ہو گا اور کسی نے کہا ہے کہ ﴿ بِهٖ ﴾ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے لیکن یہ قول قوی نہیں ہے، اگرچہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے، اس لیے کہ اس جگہ اللہ کا ذکر نہیں آیا، پھر ضمیر کس طرح عائد ہو گی۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ تو اس بات پر صبر کر جو میرے حق میں کہتے ہیں اور صاحبہ اور اولاد بتاتے ہو اور اس بات پر صبر کر جو تیرے حق میں کہتے ہیں کہ ساحر اور شاعر ہے اور تکلیف دیتے ہیں اور گالیاں بکتے ہیں اور استہزاء کرتے ہیں تو اس کا کچھ رنج نہ کر اور ان سے متعرض نہ ہو اور ان کے مکافات کے شغل میں نہ لگ، بلکہ ان سے کنارہ کش ہو اور مدارات کر (نرمی کر اور ان کو چھوڑ دے) اور اپنا کام اللہ کو سونپ دے کہ اللہ تیرے لیے ہی کافی ہے۔

---

[1] المعجم الكبير (١١/٣٦٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه عثمان بن عطاء الخراساني وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٧/٢٧٦)

[2] تفسير ابن كثير (٤/٥٦٢)

آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرف ست با دوستان تلطف با دشمناں مدارا

''دونوں جہانوں میں بے فکری و خوشحالی ان باتوں کی تفسیر ہے کہ دوستوں کے ساتھ مہربانی اور دشمنوں سے نرم رویہ رکھا جائے۔''

ہجرِ جمیل وہی ہے کہ جس میں کچھ جزع فزع اور گلہ شکوہ نہ ہو۔ یہ حکم قتال کا حکم آنے سے پہلے تھا، فرمایا کہ مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو چھوڑ دے میں تجھ کو ان سے کافی ہوں تیرا انتقام ان سے لے لوں گا۔ کہتے ہیں کہ یہ آیت مطعمین کے حق میں بدر کے دن اتری ہے، وہ دس اشخاص تھے۔ امام یحییٰ بن سلام رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ بنومغیرہ تھے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے خبر لگی ہے کہ وہ بارہ آدمی تھے جو مالدار تھے وہ صاحبِ وسعت، دولتمند اور لذتِ دنیا میں پڑے ہوئے تھے۔

''نعمت'' بالفتح بہ معنی تنعم ہے اور بالکسر بہ معنی انعام اور بالضم بہ معنی عسرت۔ ''تمھیل'' سے مراد یہ ہے کہ ان کو تھوڑی سی ڈھیل دے اجل کے پورا ہونے۔ یا یومِ بدر کی طرح دنیا میں عذاب آنے تک۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اس آیت کے اترنے سے تھوڑی سی مدت کے بعد واقعہ بدر ہوا۔ یا قیامت کا دن مراد ہے، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ اس لیے کہ اس وعید کے بعد عذاب وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ عذابِ آخرت کی وعید ہے۔ ''أنکال'' جمع ہے ''نکل'' کی بہ معنی قید جس کو فارسی میں پا بہ جولان ہونا اور اردو میں بیڑی ڈالنا کہتے ہیں۔ یہی قول امام حسن اور مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ انکال، یعنی قیود۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی اغلالِ حدید (لوہے کے طوق)۔ پہلے معنی لغت میں زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد طرح طرح کے شدید عذاب ہیں۔ ابوعمران جونی نے کہا ہے کہ یہ وہ قیود ہیں جو کبھی کھولے نہ جائیں۔ ''جحیم'' سے مراد آتشِ سوزاں وشعلہ زن ہے۔ ''غصة'' سے یہ مراد ہے کہ گلے سے نہ اترے، بلکہ حلق میں پھنس جائے، نہ باہر آئے اور نہ اندر جائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ زقوم کا درخت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضریع کا درخت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ﴾ [الغاشية: ٦] ''ان کے لیے سوائے کانٹے دار درختوں کے اور کچھ کھانا نہ ہو گا۔'' بعض نے کہا ہے کہ خارِ عوسج ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خارِ گلو گیر ہے کہ نہ داخل ہو نہ خارج۔[1]

''غصة'' کہتے ہیں کسی چیز کے حلق میں اٹکنے کو، ہڈی ہو یا اور کچھ، اس کی جمع ''غصص'' ہے۔ عذابِ الیم سے مراد دوسری قسم کا عذاب ہے، اس کا دکھ دل تک پہنچے گا۔ ''رجفه'' سے مراد تحرک، زلزلہ، اضطراب اور رعدہ

[1] تفسير القرطبي (١٩/٤٥، ٤٦) فتح القدير (٥/٤٢١، ٤٢٢)

شدیدہ (شدید گرج)۔ پہاڑ جو زمین کی میخیں اور مراسی ہیں، وہ اس دن ریت کے ٹیلے ہو جائیں گے۔ "کثیب" فراہم شدہ ریت کو کہتے ہیں اور "مہیل" وہ ہے جو پاؤں کے نیچے گزرے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ریگِ رواں۔ امام ضحاک اور کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مہیل" وہ ہے جس پر سے پاؤں پھسلے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ پاؤں میں جائے جس طرح جوتے میں کیچڑ لپٹ جاتا ہے۔[2]

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ ان کا قصہ اہلِ مکہ کے درمیان مشہور تھا، کیوں کہ کفارِ مکہ یہود کے ہمسائے تھے۔ "وبیل" سے مراد شدید، ثقیل، غلیظ ہے۔ فرمایا کہ تم دنیا میں کفر پر باقی رہنے کی صورت میں اپنے آپ کو اس دن سے یا وہاں کے عذاب سے کیوں کر بچا سکتے ہو، حالاں کہ وہ دن ایسا سخت اور ہولناک و دردمند ہو گا کہ بچے کو بوڑھا کر دے گا۔ یہ بات حقیقتاً ہو گی اور وہ اسی طرح پر ہو جائیں گے۔ یا تمثیل ہے کہ عظیم ہولناکی دیکھ کر مضبوط لوگ کمزور اور اعضاء ضعیف ہو جاتے ہیں اور انسان کمزوری اور قوت کے کم ہونے میں بوڑھے کی طرح ہو جاتا ہے۔ یا مراد اس دن کا طول ہے کہ بچے بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں گے، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے اور اس میں سخت ڈانٹ اور بڑی ملامت ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اس دن کی سختی اور بڑی ہولناکی اور ہیبت سے آسمان پھٹ جائے گا۔

یہ پھٹنا نزولِ ملائکہ کے سبب سے ہو گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴾ [الانفطار: ١] "جب آسمان پھٹ جائے گا۔" نیز فرمایا: ﴿ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ ﴾ [الشوریٰ: ٥] "قریب ہے کہ آسمان اوپر سے پھٹ پڑیں۔" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ زبانِ حبشہ میں "منفطر" بہ معنی ممتلی (بھرا ہوا) ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ آسمان بوجھل اور ثقیل ہو جائے گا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ منشق ہو جائے گا[3] (پھٹ جائے گا)

اللہ کا وعدہ دوبارہ زندہ ہونے اور حساب ہونے کی بابت لامحالہ ہونے والا ہے، اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے۔[4]

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝۱۹ اِنَّ رَبَّكَ
يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَ طَآئِفَةٌ
مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَ اللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ
تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ
سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ
يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖؗ فَاقْرَءُوْا

[1] فتح القدير (٤٢٢/٥)
[2] تفسير الطبري (٦٩٢/٢٣)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٨١/١٠)
[4] فتح البيان (٣٨٨/١٤-٣٩٢)

مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا
حَسَنًا ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ
خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۰﴾

بے شک یہ (قرآن) تو نصیحت ہے، پھر جو کوئی چاہے اپنے رب کی راہ پکڑ لے ⑲ یقیناً آپ کے رب کو علم ہے کہ آپ قریباً دو تہائی رات یا نصف رات یا ایک تہائی رات قیام کرتے ہیں اور آپ کے ساتھیوں میں سے ایک گروہ بھی۔ اور اللہ ہی رات اور دن کا (پورا) اندازہ کرتا ہے۔ اسے علم ہے کہ تم اسے نبھا نہیں سکو گے، چنانچہ اس نے تم پر مہربانی کی، پھر قرآن میں سے جتنا آسان ہو تم پڑھو۔ اسے علم ہے کہ تم میں کتنے بیمار ہوں گے اور کتنے اور زمین میں اللہ کا فضل ڈھونڈتے پھریں گے اور کتنے اور اللہ کی راہ میں لڑیں گے، چنانچہ اس (قرآن) میں سے جتنا آسان ہو پڑھو، اور نماز قائم کرو اور زکات دو اور اللہ کو قرضِ حسنہ دو۔ اور تم اپنے آپ کے لیے جو نیکی آگے بھیجو گے تو اسے اللہ کے ہاں بہتر اور زیادہ اجر والی پاؤ گے۔ اور اللہ سے استغفار کرو۔ بے شک اللہ خوب بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے ⑳

نصیحت تو عقل مند ہی حاصل کرتے ہیں:

رات کے جاگنے کا حکم ایک برس رہ کر موقوف ہوا اور یہ آیت اتری۔ انتھی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ سورت ایک نصیحت ہے جس سے عقل مند نصیحت حاصل کرتے ہیں، اب جو شخص چاہے اپنے رب کی طرف راہ اختیار کرے۔ اس شخص کی یہ مشیت اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے مشروط ہے جس طرح کہ دوسری سورت میں فرمایا ہے: ﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴾ [الدھر: ۳۰] ''اور تم نہ چاہو گے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی چاہے بیشک اللہ تعالیٰ علم والا باحکمت ہے۔'' نیز فرمایا کہ تو کبھی اتنا اور کبھی اتنا قیام رات کو کرتا ہے اور کچھ لوگ تیرے ہمراہ قیام کرتے ہیں، یہ سب تمھارے ارادے کے بغیر ہوتا ہے لیکن تم نے قیامِ لیل پر مواظبت (ہمیشگی) جس طرح کہ تم کو حکم دیا ہے نہیں کر سکتے ہو۔

قیام اللیل کے وجوب کا نسخ:

یہ تم پر شاق ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ اللہ رات دن کا اندازہ کرتا ہے، کبھی یہ دونوں برابر ہوتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے کا کچھ حصہ لے لیتا ہے۔ سو تم اس فرض کو جو تم پر واجب کیا ہے احصا نہیں کر سکتے۔ تو اب تم سے جتنا بن سکے

اتنا قرآن پڑھو، وقت کی تحدید نہ رکھو، بلکہ رات میں جس قدر اٹھ سکو قیام کر لو۔ نماز کو قراءت کے لفظ سے تعبیر کیا جس طرح کہ سورت سبحان میں فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا ﴾ [بنی اسرائیل: ۱۱۰] ''نہ تو تو اپنی نماز بہت بلند آواز سے پڑھ اور نہ بالکل پوشیدہ۔''

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اصحاب نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ نماز میں قراءتِ فاتحہ متعین نہیں ہے، بلکہ اگر فاتحہ یا غیر فاتحہ قرآن میں سے پڑھے گا، اگرچہ ایک ہی آیت ہو تو بھی اس کو کافی ہے اور اس کی تائید میں حدیثِ مسیٔ، جو صحیحین میں ہے، پیش کرتے ہیں، کیوں کہ اس میں مروی ہے: « ثُمَّ اقْرَأْ مَا تَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ ».[1] ''پھر قرآن سے جو تجھے میسر ہو پڑھ۔'' جمہور نے اس کا جواب سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے دیا ہے۔ یہ حدیث بھی صحیحین میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ »[2] ''جس نے فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہے۔'' اور صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے رفعاً مروی ہے: « كُلُّ صَلَاةٍ لَّا يُقْرَأُ فِيهَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ فَهِيَ خِدَاجٌ فَهِيَ خِدَاجٌ فَهِيَ خِدَاجٌ غَيْرُ تَمَامٍ »[3] ''جس نماز میں خاتمہ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے مکمل نہیں ہے۔ اور صحیح ابن خزیمہ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت اس طرح ہے: « لَا تُجْزِئُ صَلَاةٌ مَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ »[4] ''اس کی نماز کفایت نہیں کرتی جس نے فاتحہ نہ پڑھی۔''

یہ حدیثیں ﴿ مَا تَيَسَّرَ ﴾ کے الفاظ کی تفسیر ہیں، اس سے نماز میں فاتحہ کی تعیین واجب ٹھہری، اگرچہ مقتدی ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اللہ جانتا ہے کہ اس امت میں ایسے لوگ ہوں گے جن کو قیامِ لیل میں عذر ہو گا۔ کوئی بیمار ہو گا، کوئی زمین میں رزق کی جستجو، یعنی کسب و تجارت کے لیے باہر جائے گا اور بعض لوگ اس سے زیادہ اہم کام میں مشغول ہوں گے، یعنی اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ یہ آیت بلکہ یہ ساری سورت مکی ہے۔ اس وقت تک قتال مشروع نہیں ہوا تھا۔ یہ نبوت کی ایک بڑی دلیل ہے، کیوں کہ اس میں مغیباتِ مستقبلہ (آیندہ ہونے والی باتوں) کی خبر دی ہے، لہٰذا فرمایا ہے کہ جتنا قیام کرنا آسان ہو اتنا ہی کرو۔

امام ابو رجاء محمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حسن رحمہ اللہ سے کہا: اے ابو سعید! تم اس شخص کے حق میں کیا کہتے ہو جس کو سارا قرآن دل سے یاد ہے، یعنی حافظِ قرآن ہے اور وہ قرآن کے ساتھ قیام نہیں کرتا بلکہ فقط فرض نماز پڑھتا ہے؟ کہا اس نے قرآن کو تکیہ بنایا، اللہ اس کو لعنت کرے اللہ نے عبدِ صالح سے کہا تھا: ﴿ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ ﴾ [یوسف: ٦٨] ''اور بلاشبہہ ہمارے تعلیم دینے کی وجہ سے وہ صاحبِ علم تھا۔'' ﴿ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ﴾ [الأنعام: ٩١] ''اور تم کو بہت سی ایسی باتیں بتائی گئی ہیں جن کو نہ تم جانتے تھے نہ تمہارے بڑے۔'' میں نے کہا کہ اے ابو سعید! اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ﴾ کہا: ہاں! اگرچہ پانچ آیت ہی ہوں۔[5]

---

[1] صحيح البخاري (٧٢٤) صحيح مسلم (٣٩٧) [2] صحيح البخاري (٧٢٣) صحيح مسلم (٣٩٤)
[3] صحيح مسلم (٣٩٥) [4] صحيح ابن خزيمة (٢٤٨/١) [5] تفسير الطبري (٦٩٨/٢٣)

اس سے ثابت ہوا کہ ظاہر مذہبِ حسن رحمہ اللہ یہی ہے کہ حاملینِ قرآن پر قیام واجب ہے اگرچہ رات کو تھوڑا ہی سا کیوں نہ پڑھیں۔ لہٰذا حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ ایک شخص صبح تک سوتا رہتا ہے۔ فرمایا: اس شخص کے کان میں شیطان پیشاب کر گیا ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ مراد فرض نماز ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ قیامِ لیل ہے۔

سنن میں مروی ہے کہ وتر کرو تم اے اہلِ قرآن۔[2] دوسری حدیث میں فرمایا ہے: جو شخص وتر نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے،[3] اس سے زیادہ غریب قول من جملہ حنابلہ میں سے ابو بکر بن عبد العزیز کا ہے کہ رمضان کے مہینے کا قیام واجب ہے۔ واللہ أعلم. سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے رفعاً کہا ہے کہ ﴿مَا تَيَسَّرَ مِنۡهُ﴾ سو آیتیں ہیں۔[4] (رواہ الطبراني)۔ یہ حدیث سخت غریب ہے۔ سوائے معجم طبرانی کے اور کسی کتاب میں نہیں دیکھی۔ نماز اور زکات سے مراد زکات وزکاتِ مفروضہ ہے۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ زکات کی فرضیت مکہ میں نازل ہوئی تھی، لیکن نصب و مخرج کی مقدار کا بیان مدینہ میں ہوا۔ واللہ أعلم.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، مجاہد، حسن، قتادہ رحمہم اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ اس آیت نے اس قیامِ لیل کو منسوخ کر دیا جو مسلمین پر اللہ نے واجب کیا تھا۔ منسوخ اور ناسخ کے درمیان مدت کے بارے میں اختلاف ہے۔ اقوال کا یہ اختلاف پہلے گزر چکا اور صحیحین میں نبی مکرم ﷺ سے ثابت ہے کہ ایک شخص سے کہا تھا کہ «خَمۡسُ صَلَوَاتٍ فِي الۡيَوۡمِ وَاللَّيۡلَةِ» ”دن رات میں پانچ نمازیں۔“ اس نے کہا ہے کہ ”هَلۡ عَلَيَّ غَيۡرُهَا؟“ ”کیا مجھ پر ان کے علاوہ بھی ہیں؟“ فرمایا: «لَا إِلَّا أَنۡ تَطَوَّعَ»۔[5] ”نہیں، سوائے نفل کے۔“

صدقے کا حکم:

قرضِ حسن سے مراد صدقات ہیں۔ اللہ ان پر جزائے حسن دیتا ہے اور بڑھا کر عطا کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَنۡ ذَا الَّذِيۡ يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضۡعَافًا كَثِيۡرَةً﴾ [البقرة: ٢٤٥] ”ایسا بھی کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دے پس اللہ تعالیٰ اسے بہت بڑھا چڑھا کر عطا فرمائے۔“ پھر فرمایا کہ جو کچھ تم آگے بھیجو گے، وہ سب کا سب تم کو حاصل ہوگا اور وہ اس سے بہتر ہوگا جو تم دنیا میں اپنے لیے رکھتے ہو۔

سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: تم میں کس کو اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہے؟ کہا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ہر کسی کو اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ پیارا ہے۔ فرمایا: جان لو کہ تم کیا کہتے ہو؟ کہا: اے اللہ کے رسول! ہم تو یہی جانتے ہیں۔ فرمایا: تم میں سے ہر کسی کا مال وہ ہے جو اس نے

---

[1] صحيح البخاري (٣٠٩٧) صحيح مسلم (٧٧٤)

[2] سنن الترمذي (٤٥٣) سنن النسائي الكبرىٰ (١٧١/١) سنن ابن ماجه (١١٧٠) صحيح الجامع (٢٥٣٨)

[3] سنن أبي داود (١٤١٩) [4] المعجم الكبير (٢٩/١١) اس کی سند میں ”عبدالرحمان بن طاؤس“ ضعیف راوی ہے۔

[5] صحيح البخاري (٣٦) صحيح مسلم (١١)

آگے بھیجا اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو پیچھے چھوڑا۔[1] (رواه البخاري)۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ذکر اور استغفار بہت کیا کرو، اللہ استغفار کرنے والوں کو بخش دیتا ہے۔ اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ فَتُبْ عَلَيَّ وَاغْفِرْ لِي إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ یہ آیتیں جو اوپر گزریں ایک موعظت و نصیحت ہیں، یا یہ سارے قرآن کی طرف اشارہ ہے نہ کہ صرف اس سورت کی طرف۔ اب جس کو اپنی تجارت مطلوب ہو وہ اطاعت کے اہم طریقے، یعنی توحید کو اختیار کرے اور ایک ایسی راہ پکڑے جو اس کو جنت تک پہنچا دے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کوئی ایمان لانے کا ارادہ کرے تو وہ اللہ کی رضا اور رحمت کا راستہ اختیار کرے اور اس میں راغب ہو کہ یہ اس کے لیے بہت ممکن ہے، کیوں کہ اللہ نے اس کے لیے حجتیں اور دلائل ظاہر کر دیے ہیں۔[2] عدمِ احصا سے مراد عدمِ طاقت ہے، یعنی تم کو تمام رات کے قیام کی طاقت نہیں ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساری رات کا قیام کبھی فرض نہیں ہوا تھا،[3] مگر اللہ تعالیٰ نے اور زیادہ آسانی اور تخفیف فرما دی۔

امام حفناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ توبہ سے مراد لغوی توبہ ہے نہ کہ گناہ سے توبہ۔ اور تخفیف دو رکعت پر بھی صادق ہے۔ اب تم نمازِ شب میں اتنا پڑھو جتنا کہ آسان ہو بغیر وقت کے انتظار کے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اسی کو راجح کہا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قراءت سے مراد مغرب اور عشاء کی نماز ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد سو آیتیں ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے سو آیتیں پڑھیں، قرآن اس سے حجت نہ کرے گا۔ امام کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شخص قانتین میں لکھا جائے گا۔ امام سعید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پچاس آیتیں پڑھے۔[4] قیس بن ابی حازم کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نماز پڑھی؛ اول رکعت میں الحمد للہ پڑھی اور سورۃ البقرہ کی پہلی آیت، پھر رکوع کیا، جب ہم نماز پڑھ چکے تو ہماری طرف منہ کر کے کہا: اللہ فرماتا ہے: ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ﴾۔ اس کو دارقطنی اور بیہقی رحمہ اللہ نے حسن اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے غریب کہا ہے۔[5]

سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم فاتحہ اور ماتیسر پڑھیں۔[6] بالجملہ یہ آیت ناسخ وجوب قیامِ لیل ہے۔ ''صلاۃ'' کا نام قرآن ہے۔ جیسے اللہ کا قول ﴿ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ﴾ شافعی رحمہ اللہ نے کہا سنت دلیل ہے اس بات پر کہ فقط واجب یہی پانچ نمازیں ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ قیام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور

---

[1] صحيح البخاري (٦٠٧٧) مسند أبي يعلىٰ (٩٧/٩) [2] تفسير القرطبي (٥١/١٩) [3] تفسير القرطبي (٥٣/١٩)
[4] تفسير القرطبي (٥٣/١٩) فتح القدير (٤٢٦/٥) [5] سنن الدارقطني (٣٣٨/١) سنن البيهقي الكبرىٰ (٤٠/٢)
[6] سنن أبي داود (٨١٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: صحيح أبي داود (٤٠١/٣)

امت دونوں کے حق میں منسوخ ہو گیا۔ بعض نے کہا ہے کہ منسوخ قیام نہیں، بلکہ اس کی مقدار ہے، بلکہ اس کا وجوب باقی ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امت کے حق میں منسوخ ہے اور نبی اکرم ﷺ کے حق میں باقی ہے۔ زیادہ بہتر اور صحیح یہ ہے کہ رات کا قیام نبی اکرم ﷺ اور آپ کی امت کے حق میں علی العموم منسوخ ہے اور ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ﴾ میں وجوب کے باقی ہونے پر دلیل نہیں ہے، اس لیے کہ اگر مراد قراءت قرآن ہے تو یہ نمازِ مغرب اور عشاء وغیرہ نوافل موکدہ میں موجود ہے اور اگر مراد نمازِ شب ہے تو یہ مغرب اور عشاء کی نماز نوافل کے ساتھ پڑھنے سے حاصل ہو جاتے ہوں۔

احادیثِ صحیحہ میں وجوب کی تصریح صرف پانچ وقت کی نماز کے متعلق آئی ہے، اس سے قیامِ لیل کا وجوب اٹھ گیا جس طرح کہ یہ وجوب اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق اٹھ گیا: ﴿ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ﴾ [بني إسرائيل: ٧٩] ''تہجد کی نماز میں قرآن کی تلاوت کریں یہ زیادتی آپ کے لیے ہے۔'' امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین کہتے ہیں: ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ﴾ صدرِ اسلام میں تھا، پھر پنج گانہ نماز سے منسوخ ہو گیا اور خاص نبی اکرم ﷺ پر باقی رہا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ﴾[1] لیکن اس میں نظر ہے، اس لیے کہ نمازِ پنج گانہ کا وجوب کچھ وجوبِ قیامِ لیل کا منافی نہیں ہے۔ اور ناسخ کی یہ شرط ہے کہ اس کا حکم منسوخ کیے گئے حکم کے منافی اور برعکس ہو، جیسے کہ ایک سال کی عدت واجب ہونے کا حکم چار ماہ کی عدت واجب ہونے کے حکم سے منسوخ ہوا۔ فلیتامل.

تو اس کا منسوخ ہونا اس کے بغیر درست ٹھہرا۔ جیسے کہ پہلے بیان کردہ حدیث میں ہے کہ « لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ »[2]

پھر فرمایا کہ بیمار و مسافر و مجاہد کو قیامِ لیل کی طاقت نہیں ہو سکتی۔ کہتے ہیں جو شخص کوئی شے ایک شہر سے دوسرے شہروں میں صابر اور محتسب ہو کر لے جائے گا اور اسی دن کے نرخ سے اس کو فروخت کر دے گا تو وہ اللہ کے نزدیک شہید ہو گا، پھر یہ آیت پڑھی۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اللہ کے راستے میں شہید ہونے کے علاوہ کوئی اور موت پیدا نہیں کی جو مجھے زیادہ پسند ہو جو پالان کے دو حصوں کے درمیان آئے جس پر میں زمین میں سفر کروں اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کروں۔ امام طاؤس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ارملہ اور مساکین پر سعی کرنے والا مجاہد کی طرح ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔[3] اللہ تعالیٰ نے اس جگہ رخصت کے مقتضی تین سبب بیان فرمائے ہیں اور ساری رات سے قیام کے وجوب کو اٹھا لیا جو انہیں عذروں کے سبب سے تھا جو نوبت بہ نوبت آتے رہتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ اس رخصت کے بعد اب کیا کرنا چاہیے۔ یہ چاہیے کہ جتنا میسر ہو اتنا قرآن پڑھے اور پانچ وقت کی نماز ادا کرے اور زکات واجب دے۔ حارث عکلی نے کہا ہے کہ صدقہ فطر دے اس لیے کہ زکات کا وجوب اس

[1] فتح القدير (٥/٤٢٧) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] تفسير القرطبي (١٩/٥٦)

کے بعد ہوا تھا۔[1] یا صدقۂ تطوع (نفلی) یا سارے بھلائی کے کام کرے اور اللہ کو قرضِ حسن دے، یعنی مقروض کے سوا راہ خیر اُور مال بھی اچھی طرح خرچ کرے دل کی خوشی سے۔ قرض کی اضافت اپنی طرف کی اس لیے کہ فقیر پر احسان نہ رکھے، کیوں کہ اس قربت میں فقیر اس کا معاون ہے تو اس کا فقیر پر کچھ احسان نہ ہوا بلکہ فقیر کا احسان اس پر ہوا۔ اس کی تفسیر سورۃ الحدید میں گزر چکی ہے۔[2]

امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرضِ حسن اہل وعیال پر خرچ کرنا ہے[3] یا مالِ حلال کا اخلاصِ دل سے خرچ کرنا اور مستحق کو دینا یا جہاد میں خرچ کرنا یا فرض زکات کا اچھی طرح سے نکالنا۔ لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے، اس دلیل سے کہ فرمایا کہ جو کچھ تم آگے بھیجو گے، اس کو اللہ کے پاس پاؤ گے، کیوں کہ عموم ظاہر ہے کوئی سی بھی بھلائی ہو، یا موت کے بعد خرچ کرنے کی وصیت کرو۔ پھر استغفار کرنے کا ارشاد فرمایا، اس لیے کہ تم گناہ کے ارتکاب سے خالی نہیں رہتے اور فرمایا کہ میں گناہوں کو بخشنے والا اور اہلِ ایمان پر مہربان ہوں، گناہ گاروں کی ستر پوشی کرتا ہوں، اہلِ جہد وتوقیر سے تخفیف فرماتا ہوں۔[4]

---

[1] تفسیر القرطبي: (۵۸/۱۹) [2] رقم الآیة (۱۸) [3] تفسیر القرطبي (۵۸/۱۹) [4] فتح البیان (۳۹۸۔۳۹۳/۱۴)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَۃُ الْمُدَّثِّرِ

اس سورت کی پچپن (۵۵) یا چھپن (۵۶) آیتیں ہیں۔ سب کے نزدیک مکے میں اتری ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم بھی اسی کے قائل ہیں۔[1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝۴ وَالرُّجْزَ
فَاهْجُرْ ۝۵ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝۶ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝۷ فَاِذَا نُقِرَ
فِي النَّاقُوْرِ ۝۸ فَذٰلِكَ يَوْمَىِٕذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝۹ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ
يَسِيْرٍ ۝۱۰

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اے لحاف میں لپٹنے والے! ① اٹھیے اور ڈرایئے ② اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجیے ③ اور اپنے کپڑے پاک رکھیے ④ اور ناپاکی چھوڑ دیجیے ⑤ اور حصولِ کثرت کے لیے احسان نہ کیجیے ⑥ اور اپنے رب کے لیے صبر کیجیے ⑦ پس جب صور میں پھونکا جائے گا ⑧ تو وہ دن سخت مشکل دن ہوگا ⑨ کافروں کے لیے آسان نہ ہوگا ⑩

سورت علق کے بعد نازل ہونے والی آیات:

یہ سورت اتری تو لوگوں کو دعوت دینے کا حکم ہوا اور نماز کا اور نماز کے ساتھ تکبیر ہے اور کپڑے پاک رکھنے اور پلیدی سے دور رہنے کا حکم ہوا۔ اور پلید بت کو کہا کہ اکثر دودھ اور تیل میں آلودہ رہتا ہے اور یہ بات سکھائی کہ اگر کسی کو کچھ دے تو اس سے بدلے کا طلبگار نہ ہو۔ اپنے رب کے دینے پر شاکر رہ۔ "ناقور" سے مراد نفخِ صور ہے۔ انتہیٰ

بخاری میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت آئی ہے کہ سب سے پہلے جو قرآن اترا وہ یہی ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴾ تھا۔

[1] الدر المنثور (۳۲۴/۸)

جمہور نے اس کے برخلاف یہ کہا ہے کہ سب سے پہلے سورت ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ﴾ [العلق: ۱] ’’پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔‘‘ اتری۔ یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوسلمہ عبدالرحمان سے پوچھا کہ پہلے قرآن کا کون سا حصہ اترا؟ کہا: ’’مُدَّثِّر‘‘۔ میں نے کہا: لوگ کہتے ہیں: ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ ﴾ اترا۔ کہا کہ جو تو نے مجھ سے پوچھا: یہی میں نے سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے پوچھا تھا، انھوں نے کہا کہ میں تجھ سے وہی بات کہوں گا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کہی تھی، فرمایا: میں حرا میں مجاور تھا۔ جب مجاورت پوری کر کے نیچے اترا مجھے پکارا، میں نے داہنی طرف دیکھا کچھ نظر نہ آیا، پھر بائیں طرف دیکھا کچھ نظر نہ آیا، سامنے بھی کچھ نہ دیکھا اور پیچھے بھی کچھ نہ دیکھا۔ میں نے سر اٹھایا تو ایک شے دیکھی، میں نے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آ کر کہا: مجھے لحاف اوڑھا دو اور مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈالو۔ انھوں نے یہی کیا اور ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴾ اتری۔[1] (رواه البخاري)

صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت یوں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فترتِ وحی کا ذکر کرتے تھے۔ فرمایا: میں چلا جاتا تھا اتنے میں ایک آواز آسمان سے سنی، آنکھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا کہ وہی فرشتہ جو حراء میں میرے پاس آیا تھا آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے۔ میں زمین پر گھٹنے کے بل جھک گیا اور اپنے اہل کے پاس آ کر کہا: « زَمِّلُوْنِيْ دَثِّرُوْنِي » مجھ کو کپڑا اوڑھا دو۔ انھوں نے لحاف اوڑھا دیا۔ اللہ نے یہ آیت بھیجی: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴾۔ سیدنا ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رجز سے مراد اوثان ہیں، پھر وحی کا آنا گرم ہوا اور لگاتار آنے لگی۔[2] (هذا لفظ البخاري وهذا السياق هو المحفوظ)

اس سے یہ نکلتا ہے کہ وحی کا نزول اس سے قبل تھا، کیوں کہ یہ کہا کہ وہی فرشتہ آیا جو حرا میں تھا اور وہ جبریل علیہ السلام تھے، ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ﴾ لائے تھے، پھر فترت (وقفہ) ہوگئی، پھر اس کے بعد فرشتہ آیا۔ ان کو جمع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وحی کے وقفے کے بعد جو پہلی شے اتری وہ یہی سورت ’’مدثر‘‘ ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ سے مذکور حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔[3] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ولید بن مغیرہ نے قریش کے لیے کھانا تیار کرایا۔ جب سب کھا چکے تو کہا تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ کسی نے کہا کہ ساحر ہے، کسی نے کہا کہ ساحر نہیں ہے۔ بعض نے کہا کہ کاہن ہے، بعض نے کہا کہ کاہن نہیں ہے، کسی نے کہا کہ شاعر ہے اور بعض نے کہا کہ شاعر نہیں ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ ایک سحرِ ماثور ہے، اس پر سب کی رائے جمع ہوئی۔ یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غمگین ہو کر سر پر کپڑا ڈالا اور لحاف میں لپٹے، یعنی جس طرح کوئی رنجیدہ شخص اوڑھ لپیٹ کر پڑا رہتا ہے۔ اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی۔[4] (رواه الطبراني)

---

[1] صحيح البخاري (٤٦٣٨) [2] صحيح البخاري (٤٦٤٢) صحيح مسلم (١٦١) [3] مسند أحمد (٣٢٥/٣)

[4] المعجم الكبير (١٢٥/١١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’فيه إبراهيم بن يزيد الخوزي وهو متروك‘‘ (مجمع الزوائد: ٢٥٦/٧)

﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴾ کی تفسیر:

یہ کہنے سے کہ اٹھ اور ڈرا، مراد پکے ارادے سے کمر کس لینا ہے۔ اس سے ارسال (رسالت) ثابت ہوا جس طرح کہ شروع سے نبوت ثابت ہوئی تھی۔ تکبیر سے مراد رب کی تعظیم ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: طہارتِ ثیاب سے کیا مراد ہے؟ کہا کہ معصیت اور غدرہ پر مت پہن۔ دوسری روایت یہ ہے کہ مراد لباس کی پاکی ہے۔ تیسری روایت یہ ہے کہ مراد گناہوں سے پاکیزگی ہے۔ یہی قول امام ابراہیم، شعبی اور عطاء رحمہم اللہ کا بھی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد طہارتِ نفس ہے نہ کہ لباس کی پاکی۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اپنے عمل کو پاک کر اور صالح بنا۔ یہی قول امام ابورزین رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ تو نہ کاہن ہے اور نہ ساحر، ان لوگوں کے کہنے سننے سے اعراض کر۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ کپڑوں کو معاصی سے بچا کر رکھ۔ عرب عہد شکن شخص کو چرکین جامہ کہتے تھے اور وفادار شخص کو پاک جامہ کہتے تھے۔ شاعر نے کہا ہے:

إِذِ الْمَرْءُ لَمْ يُدَنَّسْ مِنَ اللُّؤْمِ عِرْضُهٗ فَكُلُّ رِدَآءٍ يَّرْتَدِيْهِ جَمِيْلٌ

''جب انسان قابلِ ملامت عمل سے اپنی عزت کو داغ دار نہ کرے تو جونسا لباس بھی وہ زیبِ تن کر لے وہ اسے جچتا ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی جو کپڑا تو پہنتا ہے چاہیے کہ وہ لاطائل نہ ہو۔ امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا: یعنی کپڑے کو پانی سے دھو۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ مشرکین طہارت نہ کرتے تھے، اللہ نے حکم دیا کہ تم کپڑوں اور بدن کی طہارت کرو۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ یہ آیت ان سب معانی کو مع طہارتِ قلب کے شامل ہو سکتی ہے، اس لیے کہ امرأ القیس کے شعر میں جامہ کا اطلاق دل پر آیا ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دل اور نیت کو پاک کر۔ امام قرظی اور حسن رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اپنی خلق کو نیک کر۔ [1]

﴿ اَلرُّجْزَ ﴾ سے کیا مراد ہے؟

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ''رُجز'' سے مراد بت ہیں۔ یہی قول امام مجاہد، عکرمہ، قتادہ، زہری اور ابن زید رحمہم اللہ کا ہے کہ ''رُجز'' اوثان ہے۔ امام ابراہیم اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا: یعنی نافرمانی کو چھوڑ دے۔ [2] بہر حال اس سے کسی شے کا تلبس لازم نہیں آتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ﴾ [الأحزاب: ١] ''اے نبی! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا اور کافروں اور منافقوں کی باتوں میں نہ آ جانا۔'' اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴾ [الأعراف: ١٤٢] ''میرے بعد ان کا انتظام رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا اور بدنظم لوگوں کی رائے پر عمل مت کرنا۔''

[1] تفسیر الطبري (٢٤/١٠-١٢) تفسیر ابن کثیر (٥٦٦/٤) [2] تفسیر الطبري (١٣/٢٤)

﴿ وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ﴾ کی تفسیر:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ﴾ یعنی کچھ دے کر اس سے زیادہ لینے کی خواہش نہ کر۔ امام عکرمہ، مجاہد، عطاء، طاؤس، ابو الاحوص، ابراہیم نخعی، ضحاک، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تو اپنے عمل کا احسان اللہ تعالیٰ پر مت رکھ کہ زیادہ چاہے۔ یہی امام ربیع رحمہ اللہ کا قول ہے، اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگوں پر نبوت کا احسان نہ رکھ کہ اس کے عوض تو ان سے بہت سی دنیا لینا چاہے۔[1] یہ چار قول ہوئے، ان سب میں زیادہ ظاہر پہلا قول ہے، واللہ اعلم۔

رسول اللہ ﷺ کو لوگوں کی ایذا رسانی پر صبر کرنے کا حکم اور قیامت کے ساتھ نصیحت:

پھر فرمایا کہ تو ان کی ایذا پر اپنا صبر کرنا اللہ کے لیے ٹھہرا۔ (قاله مجاهد) امام نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''اِصْبِرْ عَطِيَّتَكَ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ''۔ ''اس عطیے پر اللہ عزوجل کا شکر ادا کر۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، شعبی، زید بن اسلم، حسن، قتادہ، ضحاک، ربیع، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ النَّاقُوۡرِ ﴾ بہ معنی صور ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ النَّاقُوۡرِ ﴾ سینگ کی شکل کا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: مجھے کس طرح چین آئے، حالاں کہ قرن والا قرن کو منہ میں لیے ہوئے ہے اور ماتھا جھکائے ہوئے منتظر ہے کہ کب حکم ہو کہ صور پھونکے۔ اصحاب رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ ہم کو آپ کیا حکم کرتے ہیں؟ فرمایا: « حَسۡبُنَا اللّٰهُ وَنِعۡمَ الۡوَكِيۡلُ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلۡنَا » کہو۔[3] (رواه أحمد وابن أبي حاتم) پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ دن کافروں پر سخت ہو گا آسان نہ ہو گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَقُوۡلُ الۡكٰفِرُوۡنَ هٰذَا يَوۡمٌ عَسِرٌ ﴾ [القمر: ٨] ''کافر کہیں گے یہ دن تو بہت سخت ہے۔''

حکایت:

زرارہ بن ابی اوفیٰ بصرہ کے قاضی تھے، ایک دن صبح کو نماز پڑھائی اور یہ سورت پڑھی، جب اس آیت پر پہنچے: ﴿ فَاِذَا نُقِرَ فِى النَّاقُوۡرِۙ فَذٰلِكَ يَوۡمَئِذٍ يَّوۡمٌ عَسِيۡرٌۙ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ غَيۡرُ يَسِيۡرٍ ﴾ تو ایک چیخ مار کر مردہ ہو کر گر پڑے۔[4] (رحمه الله تعالىٰ)۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے کہا کہ جب نبی اکرم ﷺ کو وحی کا آنا شروع ہوا تو جبریل علیہ السلام آئے۔ آپ ﷺ نے ان کو آسمان و زمین کے درمیان ایک تخت پر دیکھا جیسے کہ ایک نورِ درخشاں ہو۔ آپ ﷺ گھبرا کر بے ہوش ہو گئے، جب افاقہ ہوا تو سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور پانی مانگ کر اپنے

---

[1] تفسير الطبري (٢٤/١٣/١٦) [2] تفسير الطبري (٢٤/١٦_١٨)
[3] مسند أحمد (١/٣٢٦) صحيح الجامع (٤٥٩٢) [4] تفسير ابن كثير (٤/٥٦٧)

اوپر ڈالا اور فرمایا: «دَثِّرُوْنِي دَثِّرُوْنِي» یعنی مجھے کپڑا اوڑھاؤ۔ آپ کو ایک لحاف اوڑھایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴾ یعنی نزولِ وحی کے وقت فرشتے کو دیکھ کر رعب میں آ کر کپڑے میں لپٹے ہوئے۔

"دثار" وہ ہے جس کو شعار پر پہنیں۔ "شعار" وہ ہے جو بدن سے ملا ہو۔ حدیث میں آیا ہے: «اَلْأَنْصَارُ شِعَارٌ وَالنَّاسُ دِثَارٌ» [1] "انصار شعار ہیں اور لوگ دثار۔" امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اے مدثر بہ نبوت واثقالِ نبوت۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ مجاز بعید ہے، اس لیے کہ آپ ﷺ اس وقت نبی نہ تھے۔ کسی نے کہا کہ سب سے پہلے قرآن میں سے یہی آیت اتری۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ اِقْرَاْ ﴾ اتری۔ احادیث کے درمیان جمع کا طریق یہ ہے کہ علی الاطلاق پہلی نازل کی جانے والی وحی ﴿ اِقْرَاْ ﴾ ہے اور فترتِ وحی کے بعد سب سے پہلے نازل کی جانے والی ﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴾ ہے۔

سلیمان جمل رحمہ اللہ نے نزولِ قرآن کی ترتیب پر تفسیر کے شروع پر استیفائے کلام کیا ہے، یعنی مکمل کلام کیا ہے اور امام خازن رحمہ اللہ نے اس کو نقل فرمایا ہے۔ [2] پھر اللہ نے کہا کہ اٹھ اور اہلِ مکہ کو عذاب سے ڈرا، اگر وہ اسلام نہ لائیں گے۔ یا اپنے بستر سے اٹھ اور جامہ میں تدثر کو ترک کر، یعنی یہ کپڑا اوڑھ کر پڑے رہنا چھوڑ دے اور اس منصب کے ساتھ مشغول ہو جا جو اللہ تے تجھ کو دیا ہے۔ اس جگہ انذار سے مراد نبوت کے بارے میں یا توحید کے متعلق بتانا ہے، یا اس سے مراد عزم اور صمیم کے ساتھ کھڑے ہو جانا ہے، یا یہ معنی ہیں کہ اٹھ اور نماز پڑھ اور نماز پڑھنے کا حکم کر۔ رب سید، مالک اور امور کی اصلاح کرنے والے کو کہتے ہیں۔ یہ کبریاء اور عظمت کے ساتھ اللہ پاک کا وصف ہے عقیدے کے طور پر اور زبانی اقرار کے طور پر۔ وہ اس سے بڑا ہے کہ کوئی اس کا شریک ہو جس طرح کہ کفار کا عقیدہ ہے اور اس سے بہت عظیم ہے کہ کوئی صاحبہ اور اولاد رکھتا ہو۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تکبیر سے مراد تقدیس ہے کہ اللہ کو اضداد و انداد اور اصنام سے خالی کرے، یعنی مبرا کرے اور غیر اللہ کو ولی نہ ٹھہرائے اور اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے اور اس کے غیر کا کوئی فعل یعنی کاریگری نہ سمجھے، ہر فعل اور نعمت کو اسی کی طرف سے جانے۔ [3]

اس جگہ "ثیاب" سے مراد لغوی معنی کی بنا پر پہنا ہوا لباس ہے۔ اللہ نے حکم دیا کہ کپڑا نجاسات سے پاک رکھ اور مطہر کر۔ یا جامہ سے مراد عمل یا نفس یا دل یا خلق ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد تقصیرِ جامہ (لباس کا چھوٹا کرنا) ہے اور یہ آلودگی اور ناپاکی سے زیادہ دور ہوتا ہے اور لمبا کپڑا زمین پر گھسٹتا ہے۔ یہی قول امام طاؤس رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ [4] عرب کی عادت کپڑوں کو لمبا رکھنا تھا، یہ لمبا کرنا فخر اور تکبر اور اترانے کے لیے ہوتا ہے۔ یہ بات چھوٹے لباس میں نہیں ہوتی۔ انتہی۔ اب عرب کے رہنے والوں نے وہی جاہلیت کے زمانے کی عادت کپڑے لمبے رکھنے کی اختیار کر لی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري (٤٣٣٠) صحيح مسلم (١٠٦١) [2] تفسير الخازن (١٧٢/٧، ١٧٣)
[3] تفسير القرطبي (٦٢/١٩) [4] فتح القدير (٤٣٠/٥)

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اہلِ حرمین شریفین کے حق میں کہا ہے: ’’عَمَائِمُ كَالْأَبْرَاجِ وَكَمَائِمُ كَالْأَخْرَاجِ‘‘ ’’ابراج کی طرح عمامے اور اخراج کی طرح آستینیں۔‘‘ مشائخ و علماء بڑی بڑی پگڑیاں باندھتے ہیں یہ بھی نہی میں داخل ہے۔

خانہ شرع خرابست کہ اربابِ صلاح　　در عمارت گری گنبد دستار خود اند

کنند گور پر سقال زیارتِ زاہد　　کہ زیر گنبد دستار زندہ درگورست

’’شریعت کا خانہ تباہ و برباد ہے، کیوں کہ اصلاح کرنے والے اس خانے کی تعمیر میں خود ہی گنبد ہیں اور خود ہی طنبورہ۔ زاہد کی زیارت قبر کو پوجنے والے کرتے ہیں، کیوں کہ گنبد کے نیچے بزرگ کی پگڑی قبر میں ہے۔‘‘

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ غدر، ظلم اور اثم پر کپڑا مت پہن تو اس کو ایسے حال میں پہن کہ تو نیک کردار اور ستھرا ہو۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ غلط قسم کی کمائی سے نہ پہن۔[2] لیکن پہلے معنی زیادہ بہتر ہیں، اس لیے حقیقی معنی وہی ہیں اور جامہ کا مجازاً استعمال غیر جامہ کے لیے کسی علاقہ کی وجہ سے ہمراہ قرینہ کے ہو، اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ اطلاق کے وقت وہی مجاز مراد ہو اور اطلاق کے وقت حقیقت پر محمول کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ نماز میں طہارتِ جامہ کے واجب ہونے پر آیت دلیل ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب ہم تطہیر کو حقیقت پر محمول کریں گے تو آیت میں تین احتمال ہیں۔ ایک امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ آیت سے اس امر کا بتانا مقصود ہے کہ نماز نہیں ہوتی مگر پاک کپڑے میں۔ دوسرا قول امام ابن زید رحمہ اللہ کا ہے کہ مشرک اپنے کپڑوں کو نجاست سے نہیں بچاتے تھے، اللہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کپڑوں کو نجاست سے بچانے کا حکم دیا۔ تیسرا قول یہ ہے کہ مشرکین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پلیدی ڈال دی تھی۔ اللہ نے حکم دیا کہ تم اپنے کپڑے ان قاذورات (پلیدیوں، گندگیوں) سے پاک کرو۔[3]

لغت میں ’’رُجز‘‘ کے معنی عذاب کے ہیں۔ شرک اور بتوں کی عبادت کو ’’رُجز‘‘ اس لیے کہتے ہیں کہ عذاب کا سبب ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ’’رُجز‘‘ اساف اور نائلہ ہیں، یہ کعبے کے نزدیک دو بت تھے۔ امام سدی اور ربیع رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ’’رُجز‘‘ بالضم بہ معنی وثن ہے اور بالکسر بہ معنی عذاب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ’’رُجز‘‘ اصنام ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ’’رُجز‘‘ وعید ہے۔[4] پھر فرمایا کہ تو کسی چیز کا انعام کر کے کثرت کا طالب نہ ہو۔ اس کراہت سے کہ کہیں بہ سبب عطا کے مال ناقص نہ ہو جائے۔ اس صورت میں استکثار سے مراد عوض ہے وہ کسی طرح پر کیوں نہ ہو۔ یا رب پر اعبائے رسالت اور نبوت کا احسان نہ رکھ، یا تھوڑا دے کر بہت کی خواہش نہ کر، یا اس سے بہتر طلب نہ کر۔

---

[1] تفسير البغوي (٢٦٤/٨)　[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٨٢/١٠)　[3] تفسير الرازي (١٦٩/٣٠)

[4] تفسير الطبري (١٣/٢٤) تفسير القرطبي (٦٧/١٩)

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اس امر کو اپنے رسول پر حرام کیا، اس لیے کہ انھیں اشرف آداب اور بلند اخلاق کے ساتھ مامور کیا گیا ہے اور امت کے لیے یہ بات مباح ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ استکثارِ خیر (زیادہ بہتر بدلہ طلب کر کے) ناتواں مت ہو، یعنی ہلکا مت ہو۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تیرا عمل تیری نظر میں عظیم نہ ہو، یا لوگوں پر قرآن کا احسان رکھ کر ان سے اجر کا طالب نہ ہو۔ امام محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تو اپنا مال مصانعت (بڑے بڑے قلعے تعمیر کرنے کے لیے) میں نہ دے۔ امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تو جب کسی کو کچھ دے تو اپنے رب کے لیے دے اور اس کی اطاعت اور فرائض پر ثابت قدم رہ۔[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تکلیف پر اور جھٹلائے جانے پر صبر کر[2] یا اللہ کے موارد قضا پر یا بلوے پر یا اوامر و نواہی پر صابر رہ۔ اور اگر یہ سب معانی لیے جائیں تو بھی کوئی حرج نہیں، کیوں کہ یہ سب اشیاء صبر کرنے کے لائق ہیں۔

کلامِ عرب میں ﴿نُقِرَ﴾ آواز کو کہتے ہیں۔ اس جگہ ﴿نُقِرَ﴾ سے مراد نفخِ صور ہے یعنی نفخۂ ثانیہ۔ اور کسی نے کہا ہے کہ پہلا نفخہ۔ سورۃ الانعام اور سورۃ النحل میں اس پر کلام گزر چکا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "ناقور" صور ہے،[3] یعنی وہ لمبا نرسنگا جس میں ساری روحوں کے برابر سوراخ ہیں۔ چنانچہ روحیں ان سوراخوں میں جمع کر کے صور پھونکا جائے گا۔ ہر سوراخ سے روح نکل کر اپنے جسم میں، جس سے نکالی گئی تھی لوٹ جائے گی، اللہ کے حکم سے زندہ ہو کر۔ وہ دن جس دن کہ یہ صور پھونکا جائے گا کافروں پر سخت ہو گا آسان نہ ہو گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومنین پر آسان ہو گا۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا کہ احتمال ہے کہ کافروں اور مومنوں دونوں پر مشکل ہو، لیکن کفار پر بہت زیادہ مشکل ہو۔[4]

ذَرْنِىْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ﴿11﴾ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴿12﴾
وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ﴿13﴾ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ﴿14﴾ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ﴿15﴾
كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ﴿16﴾ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿17﴾ اِنَّهٗ فَكَّرَ
وَقَدَّرَ ﴿18﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿19﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿20﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿21﴾
ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿22﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿23﴾ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا
سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿24﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿25﴾ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ﴿26﴾ وَمَآ
اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿27﴾ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ﴿28﴾ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿29﴾ عَلَيْهَا
تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿30﴾

مجھے اور اس کو تنہا چھوڑ دیجیے جسے میں نے اکیلا ہی پیدا کیا ﴿11﴾ اور اسے مال وافر دیا ﴿12﴾ اور

[1] تفسیر القرطبي (٦٧/١٩) فتح القدير (٤٣١/٥)
[2] تفسير القرطبي (٦٩/١٩).
[3] تفسير الطبري (١٨/٢٤)
[4] تفسير الرازي (١٧٤/٣٠) فتح البيان (٤٠١/١٤-٤٠٦)

حاضر باش بیٹے (دیے)⑬ اور اس کے لیے خوب فراخی کا سامان کیا⑭ پھر وہ طمع رکھتا ہے کہ میں (اسے) مزید دوں⑮ ہرگز نہیں! بلاشبہ وہ ہماری آیات سے سخت عناد رکھتا ہے⑯ میں اسے جلد مشکل چڑھائی چڑھاؤں گا⑰ بے شک اس نے غور وفکر کیا اور اندازہ لگایا⑱ تو وہ مارا جائے! کیسا اندازہ لگایا؟⑲ پھر وہ مارا جائے! کیسا اندازہ لگایا؟⑳ پھر اس نے دیکھا㉑ پھر تیوری چڑھائی اور منہ بسورا㉒ پھر پیٹھ پھیری اور تکبر کیا㉓ پھر اس نے کہا: یہ (قرآن) تو صرف جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے㉔ یہ تو صرف ایک بشر کا قول ہے㉕ میں جلد اسے سقر (جہنم) میں ڈالوں گا㉖ اور آپ کیا سمجھے کہ سقر کیا ہے؟㉗ وہ نہ باقی رکھے گی اور نہ چھوڑے گی㉘ چمڑی جھلسا دینے والی ہے㉙ اس پر اُنیس (فرشتے مقرر) ہیں㉚

قرآنِ کریم کو جادو کہنے والوں کی سرزنش:

کہتے ہیں کہ یہ ولید کو فرمایا، وہ دور دور ملک دیکھ آیا تھا۔ کافروں نے اس کو کہا تو سن محمد کیا پڑھتا ہے، تجویز کر کہ کیا ہے جو محمد نے پڑھا۔ اس نے منہ بنا کر کہا کہ یہ جادو ہے۔ دوزخ میں ایک پہاڑ ہے کافر کو سیدھا اس پر چڑھائیں گے، یہ بھی ایک عذاب ہے۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس خبیث پر دنیا کی نعمتوں کا انعام کیا تھا اور اس نے شکر کی جگہ کفران کیا تھا اور اس کے مقابلے میں اللہ کی آیات کا انکار کیا تھا اور افتراء باندھ کر ان آیات کو بشر کا قول ٹھہرایا تھا، اس خبیث کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد کیا کہ اے پیغمبر! تو مجھ کو اور اس کو چھوڑ دے اور اس پر اپنی نعمتوں کی گنتی بتائی اور کہا کہ وہ ماں کے پیٹ سے اکیلا پیدا ہوا ہے، اس کے پاس نہ مال تھا نہ اولاد تھی۔ پھر اللہ نے اس کو بہت سا مال کثیر و وسیع دیا۔ کہتے ہیں کہ ہزار دینار یا لاکھ دینار یا زمین جس کا خراج آتا تھا، یا اور کچھ۔ اور اس کو متعدد فرزند بخشے جو ہر وقت اس کے پاس حاضر رہتے۔ تجارت کے لیے سفر نہ کرتے، بلکہ اس کے غلام و مزدور اور گماشتے تجارت کرتے اور یہ بیٹے باپ کے پاس رہتے اور وہ ان سے فائدہ اٹھاتا اور بھرپور رہتا۔

امام سدی، ابو مالک اور عاصم بن عمر بن قتادہ رحمہم اللہ کے قول کے مطابق یہ تیرہ شخص تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دس نفر تھے۔[1] اس قدر اولاد کا ہونا بہت بڑی نعمت ہے۔ ''تمھید'' سے مراد مختلف قسم کے مال پر قبضہ ہے کہ سب طرح کا اثاثہ رکھتا تھا، اس کے باوجود اور زیادہ مال و منال کا طمع رکھتا تھا۔ اللہ نے کہا کہ وہ تو ہماری آیتوں کا دشمن ہے، یعنی علم کے بعد کہ یہ نعمتیں اللہ پاک کی طرف سے ہیں، کفرانِ نعمت کرتا

① تفسير الطبري (٢١/٢٤) تفسير ابن كثير (٥٦٨/٤)

ہے۔ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ "وَیْل" جہنم میں ایک وادی ہے، کافر چالیس سال تک اس میں گرتا رہے گا اس سے پہلے کہ اس کی تہہ تک پہنچے۔ صعود آگ کا ایک پہاڑ ہے، اس پر کافر ستر برس تک چڑھا کرے گا، پھر نیچے گرے گا، ہمیشہ اسی طرح ہوتا رہے گا۔[1] (رواہ أحمد و الترمذي واستغربه)

سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صعود آگ میں ایک پہاڑ ہے، اس پر چڑھنے کی تکلیف دی جائے گی۔ جب اس پر ہاتھ رکھے گا، گل جائے گا، جب اٹھالے گا تو وہ پھر عود کر آئے گا، جب پاؤں رکھے گا تو گل جائے گا، جب اٹھالے گا تو پھر عود کر آئے گا۔[2] (رواہ ابن أبي حاتم و البزار و ابن جریر)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ صعود دوزخ میں ایک پتھر ہے، کافر اس پر منہ کے بل گھسیٹا جائے گا۔[3] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صعود جہنم میں ایک چکنا پتھر ہے، کافر کو اس پر چڑھنے کی تکلیف دیں گے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ صعود عذاب سے مشقت ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک عذاب ہے جس میں کوئی راحت نہیں ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[4] اس سے پوچھا تھا کہ یہ قرآن کیا چیز ہے؟ اس نے دل میں سوچ کر بتایا کہ سحر ہے، پھر منہ بنا کر پشت پھیر کر چلا اور حق کو قبول کرنے سے غرور کیا۔ قرآن پاک کا فرمانبردار نہ ہوا اور کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جادو، جو اگلوں سے چلا آتا ہے، سیکھا ہے یہ کچھ اللہ کا کلام نہیں ہے۔ اس شخص سے مراد ولید بن مغیرہ مخزومی ہے۔ یہ قریش کے سرداروں میں سے ایک سردار تھا (لعنه الله تعالیٰ)۔

امام عوفی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی خبر یوں دی ہے کہ وہ ابو بکر بن ابی قحافہ یعنی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور قرآن کا سوال کیا، جب اس کو خبر دی تو قریش کے پاس آ کر کہنے لگا: ابن ابی کبشہ کی بات پر بہت تعجب ہے کہ اللہ کی قسم! وہ نہ تو شعر ہے نہ جادو اور نہ ہی جنونی فرامات، بلکہ ان کی بات تو کلام اللہ پر مشتمل ہے۔ قریش کے لوگوں نے یہ بات سن کر مان لی اور کہا: واللہ! اگر ولید صابی ہو گیا تو سارے قریش صابی ہو جائیں گے۔ ابو جہل بن ہشام نے کہا کہ واللہ! میں تم کو اس کے حال سے کفایت کروں گا۔ پھر ولید کے گھر آ کر کہا: تو نے نہیں دیکھا کہ تیری قوم نے تیرے لیے صدقہ جمع کیا ہے۔ اس نے کہا کہ کیا میں ان سے زیادہ مالدار اور اولاد والا نہیں ہوں؟ ابو جہل نے کہا کہ لوگ یہ چرچا کرتے ہیں کہ تو ابو بکر بن ابی قحافہ کے پاس جاتا ہے کہ وہاں کھانا کھائے۔ ولید نے کہا کہ کیا میرے کنبے والے یہ کہتے ہیں؟ واللہ! میں آج سے ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس نہ پھٹکوں گا

---

[1] مسند أحمد (۷۵/۳) سنن الترمذي (۳۱٦٤) اس کی سند میں "دراج عن ابی الہیثم اور ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہیں۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ٦١٤٨)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳۸۳/۱۰) تفسیر الطبري (۲۳،۲۲/۲٤) اس کی سند میں "عطیہ عوفی" ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳۸۳/۱۰) [4] تفسیر الطبري (۲۳/۲٤) تفسیر ابن کثیر (٥٦٨/٤)

اور نہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اور نہ ابن کبشہ کے پاس جاؤں گا، اس کی بات تو ایک اثر کرنے والا سحر ہے۔ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت اتاری۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگوں کا یہ زعم ہے کہ ولید نے یہ بات کہی تھی: یہ شخص جو کہتا ہے میں نے اس کا جائزہ لیا ہے، یہ شعر تو نہیں ہے، کیوں کہ اس کلام میں تو بہت حلاوت ہے۔ اس میں بہتر چمک دمک ہے۔ یہ غالب ہو سکتا ہے مغلوب نہیں، لیکن اس کے جادو ہونے میں قطعاً کوئی شک نہیں ہے۔ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت اتاری۔

امام عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ولید بن مغیرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قرآن پڑھ کر سنایا، وہ گویا نرم پڑا۔ یہ بات ابوجہل کو پہنچی، اس نے آ کر کہا: اے چچا! تیری قوم چاہتی ہے کہ تیرے لیے کچھ مال جمع کرے، کہا: کس لیے؟ کہا: اس لیے کہ تو محمد کے پاس جا کر ان کی بات سنتا ہے۔ ولید نے کہا کہ قریش جانتے ہیں کہ میں ان سے زیادہ مالدار ہوں۔ کہا: تو پھر تو ایسی بات کہہ جس سے تیری قوم جان لے کہ تو ان کے قول کا منکر ہے اور ان کو پسند نہیں کرتا۔ کہا: میں ان کے حق میں کیا کہوں؟ واللہ! تم میں کوئی شخص مجھ سے زیادہ شعروں کا عالم نہیں ہے اور نہ رجز کا جاننے والا اور نہ قصیدہ کا شناسا۔ واللہ! ان کا قول ان میں سے کسی شے کے مشابہ نہیں ہے۔ اللہ کی قسم! اس کے کلام میں بہت چاشنی ہے، یہ غالب تو ہو سکتا ہے مگر مغلوب نہیں۔ ابوجہل نے کہا کہ واللہ! تیری قوم راضی نہ ہو گی جب تک کہ تو ان کے حق میں کچھ نہ کہے گا، کہا: اچھا مجھے چھوڑ دو میں سوچتا ہوں، پھر سوچ کر کہا: یہ کلام ایک جادو ہے جسے وہ دوسروں سے نقل کرتا ہے۔ اس پر یہ آیت اتری ﴿ تِسْعَةَ عَشَرَ ﴾ تک۔[1] (رواہ ابن جریر)

اسی کے لگ بھگ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ کا زعم یہ ہے کہ جب وہ لوگ دار الندوہ میں جمع ہوئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اتفاق رائے سے کوئی بات کہیں، اس سے پہلے کہ عرب کے وفود ان کے پاس حج کے موقع پر آئیں، تاکہ ان کو روک دیں۔ بعض نے کہا کہ شاعر ہے۔ بعض نے کہا کہ ساحر ہے۔ بعض نے کہا کہ کاہن ہے۔ بعض نے کہا کہ مجنون ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴾ [الفرقان: ۹] ''خیال تو کیجیے! کہ یہ لوگ آپ کی نسبت کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں پس جس سے خود ہی بہک رہے ہیں اور کسی طرح راہ پر نہیں آ سکتے۔'' ولید نے سوچا اور دل میں ٹھہرایا اور پھر نظر کر کے ترش رو ہوا اور کہا: یہ تو جادو ہے جو چلا آتا ہے، یہ بشر کا قول ہے نہ کہ اللہ کا کلام۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم اس کو سقر میں ڈالیں گے اور ہر طرف سے آگ میں مغمور کر دیں گے، پھر آگ سے ہول دلایا اور فرمایا: تو جانتا ہے کہ وہ کیسی آگ ہے۔ ایسی ہے کہ ان کے گوشت پوست، رگ اور پٹھے اور کھال و بال

[1] تفسير الطبري (٢٤/٢٤، ٢٥)

کو کھا جائے گی کچھ بھی تو باقی نہ چھوڑے گی۔ پھر دوسرا جسم بدلا جائے گا، وہ اس حال میں نہ مریں گے نہ جئیں گے۔ یہی قول امام ابن بریدہ اور ابو سنان رحمۃ اللہ وغیرہما کا ہے۔ امام مجاہد رحمۃ اللہ نے کہا ہے کہ بشر سے مراد کھال ہے، یعنی آگ جلد کو لپٹ مارے گی۔ امام ابن رزین رحمۃ اللہ نے کہا ہے کہ ایک ہی لپٹ سے کالی رات کی طرح ہو جائیں گے۔ امام زید بن اسلم رحمۃ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے بدن اس آگ سے نظر آئیں گے۔ امام قتادہ رحمۃ اللہ نے کہا ہے کہ کھال کو جلا دیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جسم کو جلا دیں گے۔[1]

جہنم کے داروغوں کی تعداد:

انیس (۱۹) سے مراد افسران زبانیہ (فرشتے خازن) ہیں۔ عظیم الخلق غلیظ الخلق (بڑے بڑے اور سخت جثے والے)۔ سیدنا براء رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے بارے میں کہا ہے کہ ایک رہط یہود (یہود کے قبیلے) نے ایک صحابی سے خازنِ جہنم کا حال پوچھا تو اس نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول جانیں۔ اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تو اللہ نے یہ آیت اتاری۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو خبر دی اور کہا کہ ان کو بلا لائیں میں ان سے تربتِ جنت (جنت کی زمین) کا سوال کروں گا، اگر وہ میرے پاس آئیں گے۔ وہ آئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خزنۂ جہنم کا سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو دوبار جھکایا اور دوسری باری میں انگوٹھے کو روک لیا۔ پھر فرمایا: تم مجھ کو جنت کی تربت کے متعلق بتاؤ؟ انھوں نے کہا کہ اے ابن سلام! تم بتاؤ۔ کہا: وہ ایک نان سفید کی طرح ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَمَا إِنَّ الْخُبْزَ إِنَّمَا يَكُونُ مِنَ الدَّرْمَكِ»[2] یعنی جیسے سفید میدے کی روٹی۔

امام ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ نے اس کو اسی طرح سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور مشہور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے ہے۔ حافظ ابو بکر بزار نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے کہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک شخص نے آ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے محمد! آج کے دن تمھارے اصحاب مغلوب ہو گئے۔ کہا: کس چیز سے؟ کہا: یہود نے ان سے پوچھا کہ کیا تمھارے نبی کو اہلِ نار کے خازنان کی گنتی بھی سکھائی ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہم نہیں جانتے۔ ہم اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھیں گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا وہ قوم مغلوب ہوتی ہے جس سے کسی ایسی بات کا سوال کیا جائے جو اسے معلوم نہ ہو اور وہ کہے کہ ہم اپنے نبی سے پوچھ کر بتائیں گے۔ ان اللہ کے دشمنوں کو میرے پاس لاؤ، یہ وہی لوگ تو ہیں جنھوں نے اپنے نبی سے یہ سوال کیا تھا کہ ہم کو کھلم کھلا اللہ کو دکھا دو۔ پھر آدمی بھیج کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلایا۔ انھوں نے کہا کہ اے ابو القاسم! خزنۂ اہلِ نار کتنے ہیں؟ فرمایا: اتنے ہیں۔ پھر دو دفعہ اپنی ہتھیلیوں کو برابر کیا اور ایک دفعہ ایک انگلی کو بند رکھا (یعنی ایک دفعہ دس اور دوسری دفعہ نو کہا)۔ اور اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم سے کہا کہ اگر

---

[1] تفسیر الطبري (۲۸،۲۷/۲٤) تفسیر ابن کثیر (٥٦٩/٤)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳۸٤/۱۰) اس کی سند میں ''حریث بن ابی مطر'' ضعیف راوی ہے۔

تم سے تربتِ جنت کا سوال کریں تو وہ میدہ کی طرح ہے، پھر ان کو خزنہ اہلِ نار کی گنتی بتائی اور نبی اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تربتِ جنت کیا ہے تو ان کے بعض بعض کی طرف دیکھنے لگے اور کہا: اے ابا القاسم! وہ ایک روٹی ہے۔ فرمایا: روٹی میدے اور آٹے کی ہوتی ہے۔[1] (رواه الترمذي عند هذه الآية وقال هو والبزار: لا نعرفه إلا من حديث مجالد ورواه أحمد ينقص الدرمك فقط)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ چھوڑ دے مجھ کو اور اس کو جس کو میں نے تنہا پیدا کیا ہے، یعنی اپنی ماں کا ایک ہی بیٹا ہے۔ یہ ملامت اور وعید کا کلمہ ہے، مطلب یہ کہ میں اس سے تیرا انتقام لے لوں۔ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ ولید بن مغیرہ تھا۔ یا وحید سے مراد یہ ہے کہ اس کا باپ معروف نہیں۔ کہتے تھے کہ وہ دعی ہے، یعنی ولد الزنا۔ مالِ ممدود سے مراد غیر منقطع ہے۔ وہ زراعت، ضرع اور تجارت سب کچھ رکھتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی آمدنی ایک لاکھ دینار تھی، یا چار ہزار دینار تھی یا ایک ہزار دینار تھی۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے متعلق سوال کیا گیا تو کہا کہ "غَلَّةُ شَهْرٍ بِشَهْرٍ"[2] یعنی مراد آمدنی ماہ بہ ماہ ہے۔ اس کا ایک باغ طائف میں تھا، اس کا پھل جاڑے میں منقطع نہ ہوتا تھا اور بہت سے لونڈی غلام تھے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سات بیٹے مکہ میں پیدا ہوئے اور پانچ طائف میں۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تیرہ بیٹے تھے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سات تھے، سب مرد تھے، ان میں سے تین مسلمان ہوئے۔ خالد، ہشام اور ولید بن الولید۔[3] بعض نے کہا کہ عمارہ بھی اسلام لایا تھا مگر اس میں نظر ہے، اس لیے کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اصابہ میں کہا ہے کہ عمارہ کافر مرا۔[4] ﴿تَمْهِيدًا﴾ سے مراد بسطِ عیش ہے اور لمبی عمر اور بڑی عزت اور قریش کی سرداری، یہاں تک کہ اس کو ریحانہ قریش کہتے تھے۔ اہلِ دنیا کے نزدیک بڑا کمال یہی ہے کہ دولت و مال و اولاد ہو۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿تَمْهِيدًا﴾ سے مراد مال کا مال پر ہونا ہے جس طرح کہ فرش پر فرش ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حرص اور طمع اتنا تھا کہ چاہتا تھا کہ مال اور زیادہ ہو، حالاں کہ نعمتوں کا منکر اور اللہ کے شریک ٹھہرانے والا تھا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس پر طرہ یہ تھا کہ جنت میں داخل ہونے کی طمع رکھتا تھا اور کہتا تھا کہ اگر محمد ﷺ سچے ہیں تو بہشت میرے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اللہ نے اس کو ڈانٹا اور دھمکایا اور کہا کہ میں تیرے مال کو زیادہ نہ کروں گا، بلکہ ناقص کر دوں گا۔ چنانچہ اس آیت کے نزول کے بعد ہمیشہ اس کے مال اور اولاد میں کمی ہوتی

---

[1] سنن الترمذي (٣٣٢٧) اس کی سند میں "مجالد بن سعید" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٣٤٨)

[2] تفسير الطبري (٢٠/٢٤) [3] تفسير القرطبي (٧٢/١٩) [4] الإصابة لابن حجر (٢٨٣/٥)

گئی، یہاں تک کہ فقیر ہو کر مرا۔[1] یہ اس لیے ہوا کہ وہ آیاتِ الٰہی کے ساتھ عناد رکھتا تھا، اس کے لیے صعود کا وعدہ کیا۔ کلامِ عرب میں ''اِرْھَاقٌ'' بھاری چیز کے اٹھانے کو کہتے ہیں۔

صعود آگ میں ایک پہاڑ ہے، یا ایک ٹیلہ ہے۔ دوزخ کے پہاڑوں اور طرح طرح کے عذابوں اور کیڑوں اور حشرات الارض اور درندوں وغیرہ کا ذکر اردو زبان میں رسالہ ''النذیر العریان من درکات النیران'' میں کیا گیا ہے۔ ﴿ قُتِلَ ﴾ سے اس جگہ لعنت، عذاب اور سزا مراد ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس پر بد دعا ہے[2] اور اس کو مبالغے اور تاکید کے لیے دہرایا گیا ہے۔ یا پہلا ﴿ فَقُتِلَ ﴾ دنیا میں ہے اور دوسرا موت کے بعد برزخ میں اور ﴿ ثُمَّ ﴾ کے لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسری دعا پہلی دعا سے زیادہ مؤثر ہے۔

﴿ نَظَرَ ﴾ سے مراد تامل ہے، یعنی اس نے سوچا کہ کس چیز سے قرآن کو دفع کرے اور اس میں قادح (عیب لگانے والا) ہو، پھر تیوڑی چڑھائی، یعنی نبی اکرم ﷺ کے سامنے یا مومنین کے سامنے۔ ﴿ عَبَسَ ﴾ ترش رو ہونے کو کہتے ہیں۔ پھر منہ تھتھایا، پھر پیٹھ پھیری، یعنی حق سے روگرداں ہوا اور ایمان لانے سے غرور کیا اور قرآن کو سحر ٹھہرایا کہ دوسرے جادوگروں سے سیکھا ہے، مثلاً: مسیلمہ و اہلِ بابل سے۔ ﴿ سِحْرٌ ﴾ باطل کو کہتے ہیں جسے حق کی صورت میں ظاہر کیا جائے اور کہا کہ یہ اللہ پاک کا کلام نہیں ہے، بلکہ بشر کا کلام ہے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ اس نے یہ بات قوم کو راضی کرنے کے لیے کہی تھی، ورنہ پہلے وہ اس بات کا اعتراف کر چکا تھا کہ اس کلام میں بہت حلاوت ہے اور اس میں بہت زیادہ چمک دمک ہے اور وہ سراسر مفید اور ثمر بار ہے۔ اس پر اللہ نے کہا ہے کہ ہم جلد اس کو سقر کی سیر کرائیں گے۔

سقر دوزخ کا نام ہے اور جہنم کا ایک طبقہ ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ سقر وہ ہے جو کھال اور بال سے کچھ بھی نہ چھوڑے کہ تن پر ظاہر ہو۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دوزخ ان کے لیے ظاہر ہوگی، وہ اس کو آنکھوں سے دیکھیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴾ [النازعات: ۳۶] ''اور (ہر) دیکھنے والے کے سامنے جہنم ظاہر کی جائے گی۔'' یا یہ معنی ہیں کہ جسم کو جلا کر سیاہ کر دے گی۔ یہ معنی پہلے معنی سے زیادہ راجح ہیں۔ جمہور مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ پیاسا کرنے والی ہے ''بشر'' کی۔[3] اس جگہ ''بشر'' سے مراد بدن کی کھال ہے۔ اکثر کا یہی قول ہے، یا اس سے مراد انسِ اہلِ نار ہیں۔ اس آگ پر انیس (۱۹) فرشتے مقرر ہیں، یا انیس قسم کے، یا انیس صفیں ہیں، یا انیس نقیب ہیں ہر نقیب کے ساتھ ایک جماعت ہوگی لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا انکار نہیں ہو سکتا، کیوں کہ جب ایک فرشتہ تمام مخلوق کی روح کو قبض کرتا ہے تو اگر عذاب کرنے پر انیس (۱۹) فرشتے مقرر ہیں تو کیا عجب ہے۔[4]

---

[1] تفسیر القرطبي (۷۲/۱۹) [2] تفسیر القرطبي (۷۵/۱۹) [3] تفسیر القرطبي (۷۸/۱۹)

[4] الکشف والبیان للثعلبي (۷۴/۱۰) فتح البیان (۱۴/ ۴۰۶۔ ۴۱۳)

وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا
فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَا
ذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ
يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿٣١﴾
كَلَّا وَالْقَمَرِ ﴿٣٢﴾ وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ﴿٣٣﴾ وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ﴿٣٤﴾ اِنَّهَا
لَاِحْدَى الْكُبَرِ ﴿٣٥﴾ نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿٣٦﴾ لِمَنْ شَاۗءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ
يَتَاَخَّرَ ﴿٣٧﴾

اور ہم نے فرشتے ہی دوزخ کے نگران بنائے ہیں، اور ہم نے ان کی تعداد ہی کافروں کے لیے آزمائش بنا دی ہے، تا کہ اہلِ کتاب یقین کریں اور ایمان داروں کا ایمان زیادہ ہو، اور اہلِ کتاب اور مومن شک میں نہ پڑیں اور تا کہ دل کے روگی اور کافر کہیں: اس مثال سے اللہ کی کیا مراد ہے؟ اسی طرح اللہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ اور آپ کے رب کے لشکروں کو بس وہی جانتا ہے اور وہ (جہنم) بشر کے لیے نصیحت ہی تو ہے ﴿31﴾ ہرگز نہیں! قسم ہے چاند کی ﴿32﴾ اور رات کی جب وہ ڈھل جائے ﴿33﴾ اور صبح کی جب وہ روشن ہو ﴿34﴾ بلاشبہ وہ (جہنم) بڑی (ہولناک) چیزوں میں سے ایک ہے ﴿35﴾ بشر کے لیے ڈراوا ہے ﴿36﴾ اس کے لیے (ڈراوا) جو تم میں سے آگے (نیکی کی طرف) بڑھنا یا پیچھے ہٹنا چاہے ﴿37﴾

کفار کا جہنم کے انیس (۱۹) داروغوں پر تبصرہ:

یہ جو فرمایا کہ دوزخ پر انیس شخص مقرر ہیں، اس پر کافر ٹھٹھا کرنے لگے کہ ہم ہزاروں ہیں انیس ہمارا کیا کریں گے۔ تب یہ فرمایا کہ وہ نہیں ہیں مگر فرشتے، تم سب کے لیے ایک ہی کافی ہے، مگر یہ گنتی پہلی کتابوں کے مطابق بتائی ہے کہ ان کے سچا ہونے کی دلیل ہو۔ آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے سے مراد یہ ہے کہ آگے بہشت کی طرف بڑھے اور پیچھے دوزخ میں رہے۔ انتھیٰ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے خزنۂ نار صرف فرشتے ہی مقرر کیے ہیں جن کو زبانیہ کہتے ہیں۔ یہ بڑے سخت اور

کرخت ہیں۔ یہ مشرکوں کی تردید ہے۔ ابو جہل نے کہا تھا: اے گروہِ قریش! کیا تم میں دس آدمی اس ایک کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس پر غالب ہو جائے؟ اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی کہ وہ ایسے شدید الخلق غلیظ الطبع اور کرخت مزاج اور تند خو ہیں کہ تم ان کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتے اور نہ ان پر غالب آ سکتے ہو۔ ابو الاشدین جس کا نام کلدہ بن اسید بن خلف تھا۔ اس نے کہا کہ اے قریش کے گروہ! تم ان میں سے دو کو سنبھال لو میں تمھاری طرف سے سترہ کو کافی ہوں گا۔ یہ اس نے اعجاب کے طور پر، یعنی اترانے کے لیے کہا۔ اس کی قوت اتنی تھی کہ وہ گائے کے چمڑے کے اوپر کھڑا ہو جاتا اور دس شخص اس کو کھینچتے، اس کے پاؤں کے نیچے سے چمڑا پھٹ جاتا مگر وہ نہ سرکتا۔ امام سہیلی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اسی شخص نے نبی اکرم ﷺ سے کشتی کرنے کا سوال کیا تھا اور کہا تھا کہ اگر تم مجھ کو پچھاڑ دو گے تو میں تم پر ایمان لے آؤں گا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس کو دے مارا اور کئی بار پچھاڑ دیا، لیکن وہ ایمان نہ لایا۔

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے اس مقابلے کی خبر کو رکانہ بن عبد یزید بن ہاشم بن مطلب سے منسوب کیا،[1] لیکن ان دونوں کے بیان میں کچھ تضاد نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم نے یہ گنتی امتحان کے لیے رکھی ہے، تا کہ اہلِ کتاب یہ بات جان لیں کہ یہ رسول حق ہے اور ان کی کتبِ آسمانی کے مطابق جو انبیاء پر نازل ہوئی ہیں گفتگو کرتا ہے اور جو لوگ ایمان دار ہیں ان کا ایمان زیادہ ہو جائے اور وہ جان لیں کہ نبی اکرم ﷺ سچے ہیں اور کسی طرح کا شک باقی نہ رہے اور منافق اور کافر یہ کہیں کہ اللہ کو اس مثال کے بیان کرنے سے کیا مطلب تھا؟ پس اللہ تعالیٰ اسی طرح کسی کو گمراہ اور کسی کو راہ یاب کرتا ہے، بعض کے دلوں میں ایمان پختہ ہو جاتا ہے اور بعض متزلزل ہو جاتے ہیں۔ وله الحكمة البالغة والحجة الدامغة.

اللہ تعالیٰ کے لشکروں کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے:

پھر فرمایا کہ تیرے رب کے لشکروں کو سوائے رب کے کوئی نہیں جانتا کہ کتنے لشکر ہیں۔ یہ اس لیے فرمایا کہ کسی کو صرف یہی وہم نہ ہو کہ انیس ہی شخص ہیں جس طرح کہ یونان کے فلسفیوں میں سے ایک اہلِ ضلالت و جہالت گروہ نے کہا ہے اور اہلِ باطل نے اس آیت کو سن کر دس عقلوں اور نو نفوس پر منطبق کیا اور ایسا دعویٰ کیا اور جب ان سے اس کی دلیل طلب کی گئی تو عاجز ہو گئے۔

آیت کے شروع کو اپنے خیال میں سمجھ لیا اور آیت کے آخر کا انکار کر کے کفار ہوئے، حالاں کہ حدیثِ اسراء میں، جو صحیحین وغیرہ میں مروی ہے، نبی اکرم ﷺ نے بیت المعمور، جو ساتویں آسمان پر ہے، کی صفت میں فرمایا ہے: «فَإِذَا هُوَ يَدْخُلُهُ فِي كُلِّ يَوْمٍ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ لَا يَعُودُونَ إِلَيْهِ آخِرَ مَا عَلَيْهِمْ»[2] ''ہر روز اس میں ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں، پھر ان کی آخر تک باری نہیں آتی۔'' اور سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ارشاد کیا

---

[1] الروض الأنف للسهيلي (٧٩/٢) [2] صحيح البخاري (٣٠٣٥) صحيح مسلم (١٦٤)

ہے کہ میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ آسمان چرچراتا ہے اور اسے چرچرانا پڑتا ہے، اس میں ایک انگلی کی جگہ بھی نہیں ہے، لیکن وہاں ایک فرشتہ سجدے میں ہے۔ اگر تم وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم تھوڑا ہنسو اور بہت زیادہ روؤ اور عورتوں سے لذت نہ لو بستروں پر اور تم چلاتے ہوئے اللہ کی طرف ٹیلوں کی طرف نکلو۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”لَوَدِدْتُ أَنِّي شَجَرَةٌ تُعْضَدُ“[1] (رواه أحمد) یعنی کاش! میں ایک درخت ہوتا مجھے کاٹ ڈالتے۔ (ورواه أيضا الترمذي و ابن ماجه وحسنه الترمذي ويروى عن أبي ذر موقوفا)

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی روایت مرفوعاً یہ ہے کہ ساتوں آسمانوں میں ایک قدم یا ایک بالشت یا ایک ہتھیلی کی جگہ بھی ایسی نہیں ہے جس پر کوئی فرشتہ قیام، سجدہ یا رکوع کی حالت میں نہ ہو۔ جب قیامت کا دن ہوگا تو سب کے سب کہیں گے: ”سُبْحَانَكَ مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ إِلَّا أَنَّا لَمْ نُشْرِكْ بِكَ شَيْئًا“[2] (رواه أبو القاسم والطبراني) ”تو پاک ہے، ہم نے تو عبادت کا حق ادا نہیں کیا ہے، ہاں ہم نے تیرے ساتھ شرک نہیں کیا۔“ سیدنا حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے درمیان بیٹھے تھے کہ اتنے میں فرمایا: تم سنتے ہو جو میں سنتا ہوں؟ کہا: ہم تو کچھ نہیں سنتے۔ فرمایا: میں آسمان کا چرچرانا سنتا ہوں اور اس چرچرانے پر کچھ ملامت نہیں ہے، آسمان میں ایک بالشت جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ رکوع یا سجدہ نہ کر رہا ہو۔[3] (رواه محمد ابن نصر المروزي في كتابُ الصلاة)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت یہ ہے: نہیں ہے آسمانِ دنیا میں ایک قدم کی جگہ مگر وہاں پر ایک فرشتہ سجدے میں ہے یا قیام کی حالت میں ہے۔ یہ قول ملائکہ کا ہے: ﴿وَمَا مِنَّآ إِلَّا لَهُۥ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ ۝١٦٤ وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّونَ ۝١٦٥ وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُونَ﴾ [الصفت: ١٦٤- ١٦٦] ”ہم میں سے تو ہر ایک کی جگہ مقرر ہے اور ہم تو (بندگیِ الٰہی میں) صف بستہ کھڑے ہیں اور اس کی تسبیح بیان کر رہے ہیں۔“[4] (رواه محمد بن نصر المروزي أيضا وهذا مرفوع غريب جدا)۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ آسمانوں میں سے ایک آسمان ایسا ہے کہ وہاں ایک بالشت کی جگہ نہیں ہے لیکن اس پر کسی فرشتے کی پیشانی یا اس کے پاؤں ہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّونَ﴾[5]

(رواه أيضا المروزي)

علاء بن سعد رضی اللہ عنہ فتح اور فتح کے بعد حاضر ہوئے، وہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن اپنے ہم نشینوں سے فرمایا: کیا تم سنتے ہو جو میں سنتا ہوں؟ کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کیا سنتے ہیں؟ فرمایا: آسمان چرچراتا ہے اور اس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ چرچرائے۔ اس پر ایک قدم کی بھی جگہ نہیں ہے، مگر اس پر ایک فرشتہ قیام یا رکوع یا سجدے کی حالت

---

[1] سنن الترمذي (٢٣١٢) سنن ابن ماجه (٤١٩٠) مسند أحمد (١٧٣/٥) السلسلة الصحيحة (١٧٢٢)

[2] المعجم الكبير (١٨٤/٢) اس کی سند میں ”عروہ بن مروان“ ضعیف راوی ہے۔

[3] تعظيم قدر الصلاة للمروزي (٢٥٨/١، ٢٥٩) السلسلة الصحيحة (١٠٥٩)

[4] تعظيم قدر الصلاة للمروزي (٢٦٠/١) السلسلة الصحيحة (١٠٥٩)

[5] تعظيم قدر الصلاة للمروزي (٢٦٠/١، ٢٦١)

میں ہے۔ فرشتوں نے کہا: ﴿ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۝ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴾[1] (رواه المروزي وهذا إسناد غريب جدا) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہیں ہے یہ آگ جس کا حال بیان کیا گیا مگر تذکرہ بشر کے لیے۔[2] پھر اللہ نے چاند، رات اور سورج کی قسم کھائی اور کہا کہ وہ آگ بڑے بڑے امور میں سے وہ آگ ایک بڑی چیز ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ اور بہت سے سلف کا ہے۔[3] بشر کو ڈراتی ہے جو ڈرنا چاہتا ہے اور راہِ حق کو پانا چاہتا ہے یا پیچھے رہتا ہے اور پیٹھ پھیرتا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے: جب یہ آیت اتری کہ زبانیۂ نار انیس (۱۹) ہیں تو ابو جہل نے کہا کہ کیا محمد ﷺ کے مددگار یہی انیس ہیں۔ محمد ﷺ تم کو انیس کے عدد سے ڈراتا ہے اور تم بہت سے ہو، کیا تم میں سے ہر سو اس بات سے عاجز ہیں کہ ان میں سے ایک کے لیے کافی ہو، پھر وہ آگ سے باہر آئیں۔ تب ابو الاشدین نے کہا اور یہ بنی جمح کا ایک شخص تھا کہ اے قریش کے گروہ! جب قیامت کا دن ہوگا تو میں تمھارے سامنے چلوں گا، دس کو اپنے دائیں کندھے سے ہٹا دوں گا اور نو کو بائیں کندھے سے اور ہم چل کر بہشت میں داخل ہو جائیں گے۔

اس پر اللہ نے یہ آیت بھیجی کہ ہم نے اصحابِ نار، یعنی آگ کے داروغے فرشتے مقرر کیے ہیں نہ کہ آدمی اور کس کو طاقت ہے کہ فرشتوں پر غالب آئے۔ اے کافرو! تم ان سے کس طرح سے مقابلہ کرسکو گے۔ اور یہ گنتی ہم نے آزمایش کے لیے مقرر کی ہے، تاکہ کافروں کا امتحان لیں۔ یا فتنہ سے مراد عذاب ہے، جیسا کہ اللہ کے فرمان میں ہے: ﴿ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ﴾ [الذاریات: ۱۳] "ہاں یہ وہ دن ہے کہ یہ آگ پر تپائے جائیں گے۔" "أَيْ: يُعَذَّبُوْنَ"

حدیث میں خزنۂ جہنم کا یہ وصف آیا ہے کہ ان کی آنکھیں برق کی طرح ہیں اور ان کے دہن صیاصی (قلعے) وہ اپنے بالوں کو کھینچتے ہوں گے، ان کو ثقلین (دو بھاری گروہ، جن اور انسان) کی قوت ہے۔ ان میں سے ایک شخص ایک امت مردم کو ہانکے گا، اس کی گردن پر ایک پہاڑ ہوگا۔ وہ ان کو آگ میں پھینک دے گا۔[4] (أخرجه ابن مردويه)

اہلِ کتاب سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، ان کے نزدیک بھی خزنۂ جہنم کی گنتی یہی انیس شخص ہے۔[5] (قاله الضحاك وقتادة و مجاهد وغيرهم) یعنی اللہ نے یہ گنتی اس لیے ٹھہرائی کہ یہود و نصاریٰ نبی اکرم ﷺ کی نبوت کو قبول کریں، کیوں کہ جو قرآن میں کہا وہ ان کی کتابوں کے مطابق ہے اور جو لوگ اہلِ کتاب میں سے ایمان لائے ہیں، جیسے: عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ۔ یا امتِ اسلام کے مومنین مراد ہیں۔ ان کا ایمان زیادہ ہو، یعنی یہ بات معلوم کر کے کہ اہلِ کتاب بھی اسی کے قائل ہیں اور منافقوں کا مرض بڑھ جائے۔ یہ سورت مکی ہے اور وہاں نفاق نہ تھا، نفاق مدینہ

---

(1) تعظيم قدر الصلاة للمروزي (۱/۲٦۱، ۲٦۲) (2) تفسير الطبري (۲۴/۳۲) (3) تفسير الطبري (۲۴/۳۳)
(4) الدر المنثور (۸/۳۳۳، ۳۳۴) (5) تفسير الطبري (۲۴/۳۰)

میں تھا۔ اس کی خبر پہلے سے دی۔ یہ نبی اکرم ﷺ کا معجزہ ہے کہ جو بات ہجرت کے بعد ہونے والی تھی اس پر پہلے سے مطلع کر دیا۔

مرض سے مراد صرف شک و شبہہ میں پڑنا ہے اور یہ مرض کفار میں ہوتا ہے۔ کفار سے مراد کفارِ مکہ و عرب وغیرہ ہیں۔ کفار کہتے ہیں کہ اللہ کا یہ مثال بیان کرنے سے کیا مطلب ہے؟ اللہ نے کہا کہ اسی طرح اللہ جس کو چاہتا ہے مومنین جیسی ہدایت کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کفار کی طرح گمراہ کر دیتا ہے۔ اس میں خلقِ افعال پر دلیل ہے۔ یا جس کو چاہتا ہے جنت کے راستے سے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بہشت کا راستہ دکھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی گنتی اور ملائکہ وغیرہم کی جمعیت کو وہی جانے، یعنی آگ کے داروغوں کی تعداد کہنے کو اگرچہ انیس ہے، لیکن ان کے مددگاروں اور لشکروں کی گنتی اللہ ہی کو معلوم ہے۔ حدیث میں مروی ہے کہ اس دن دوزخ کو لائیں گے، اس کی ستر ہزار باگیں ہوں گی، ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے کھینچتے ہوں گے۔[1] اور سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ شبِ معراج میں، میں اور جبریل علیہ السلام آسمانِ دنیا پر چڑھے، مجھ کو ایک فرشتہ ملا جس کا نام اسماعیل تھا وہ صاحب سمائے دنیا تھا، اس کے سامنے ستر ہزار فرشتے تھے، ہر فرشتے کے ساتھ ایک ایک لاکھ فرشتوں کا لشکر تھا۔ پھر یہ آیت پڑھی۔[2] (أخرجه الطبراني) ملائکہ کی کثرت سے آسمان کے چرچرانے کے متعلق اور حدیثیں پہلے گزر چکی ہیں۔

سقر کا یہ ذکر بشر کی یاد دہانی کے لیے ہے کہ وہ نصیحت پکڑیں اور اللہ کی کمال قدرت کو معلوم کر لیں اور جان لیں کہ وہ کسی اعانت کرنے والے اور مددگار کا محتاج نہیں ہے۔ یا قرآن کے یہ دلائل اور حجتیں انسان کے لیے نصیحت ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دنیا کی آگ آخرت کی آگ کا تذکرہ ہے،[3] لیکن یہ قول بعید ہے۔ یا مراد جنود (لشکر) ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے چاند کی اور رات کے پیٹھ پھیرنے کی اور صبح کے روشن ہونے کی قسم کھائی کہ وہ آگ ایک بڑی بلا اور عظیم آفت ہے۔ "کُبَر" "کُبرىٰ" کی جمع ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "کُبر" نار کا نام ہے،[4] یا مراد یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی تکذیب ایک بڑی آفت ہے، یا ساعت کا قیام ایک بڑی آفت ہے۔ لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "کُبَر" سے جہنم کے طبقے اور ابواب مراد ہیں[5] اور پیغمبر لوگوں کو ڈرانے والے ہیں۔ یا آگ کو نذیر کہا، یا قرآن کو کہا، اس لیے کہ اس میں وعد اور وعید کا ذکر شامل ہے۔

"تقدم" سے مراد طاعت کی طرف سبقت کرنا اور "تأخر" سے مراد طاعت سے پیچھے ہٹنا ہے۔ یعنی انذار (ڈرانا) ہر مومن اور کافر کو ہو گیا اور فاعل اللہ کی مشیت ہے۔ یا مراد جنت کی طرف تقدم اور بہشت سے تاخر ہے۔

---

[1] صحيح مسلم (٢٨٤٢) [2] المعجم الأوسط (١٣٨/٧) اس کی سند میں "ابو ہارون عمارہ بن جوین" سخت ضعیف راوی ہے۔
[3] معانی القرآن (٢٤٨/٥) [4] تفسير القرطبي (٨٥/١٩) [5] فتح القدير (٤٣٩/٥)

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وعید اور ملامت ہے اگر چہ بہ صورتِ خبر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:
﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ [الکھف: ۲۹] ''اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔''①

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴿٣٨﴾ إِلَّآ أَصْحٰبَ الْيَمِينِ ﴿٣٩﴾ فِي جَنّٰتٍ
يَتَسَآءَلُونَ ﴿٤٠﴾ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ﴿٤١﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ﴿٤٢﴾
قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ﴿٤٣﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ﴿٤٤﴾
وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَآئِضِينَ ﴿٤٥﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٤٦﴾
حَتّٰىٓ أَتٰىنَا الْيَقِينُ ﴿٤٧﴾ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِينَ ﴿٤٨﴾ فَمَا لَهُمْ
عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ﴿٤٩﴾ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾ فَرَّتْ
مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا
مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾ كَلَّا ۖ بَلْ لَّا يَخَافُونَ الْاٰخِرَةَ ﴿٥٣﴾ كَلَّآ إِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿٥٤﴾
فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿٥٥﴾ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۚ هُوَ
أَهْلُ التَّقْوٰى وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿٥٦﴾

ہر نفس نے جو کیا اس کے بدلے وہ گروی ہے (38) دائیں (ہاتھ) والوں کے سوا (39) وہ باغاتِ بہشت
میں ہوں گے، باہم سوال کریں گے (40) مجرموں کے بارے میں (41) (ان سے پوچھیں گے:)
تمھیں کس چیز نے جہنم میں ڈالا؟ (42) وہ کہیں گے: ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے (43) اور ہم مسکین
کو کھانا نہیں کھلاتے تھے (44) اور ہم (باطل میں) مشغول ہونے والوں کے ساتھ مشغول ہوتے
تھے (45) اور ہم روزِ جزا کی تکذیب کرتے تھے (46) حتی کہ ہمیں موت نے آلیا (47) پھر سفارشیوں کی
سفارش انھیں نفع نہ دے گی (48) پھر انھیں کیا ہوا ہے کہ نصیحت سے منہ موڑتے ہیں؟ (49) جیسے وہ
بدکے ہوئے گدھے ہوں (50) جو شیر سے بھاگے ہوں (51) بلکہ ان میں سے ہر آدمی چاہتا ہے کہ
اسے کھلے صحیفے دیے جائیں (52) ہرگز نہیں! بلکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے (53) ہرگز نہیں! یقیناً یہ
(قرآن) ایک نصیحت ہے (54) تو جو کوئی چاہے اسے یاد کرے (55) اور وہ (کفار) اسے یاد نہیں
کریں گے، مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ وہی تقوے کے لائق اور مغفرت کے لائق ہے (56)

① تفسیر القرطبي (۱۹/۸۶) فتح البیان (۱۴/۴۱۳-۴۱۸)

جنتیوں اور جہنمیوں کا باہم بحث وتکرار:

بحث ومباحثہ کرتے تھے، یعنی ایمان کی باتوں کا انکار کرتے تھے سب کے ساتھ مل کر۔ کافر کے حق میں کوئی سفارش نہ کرے گا اور کرے گا تو قبول نہ ہوگی۔ جنگل کے گدھے ذرا سی آواز اور خوف سے بھاگتے ہیں۔ ہر کوئی نبی ہونا چاہتا ہے کہ آسمان سے کھلی کتاب پائے۔ ایک پر اتری تو کیا ہوا کام تو سب کے آتی ہے۔ انتہیٰ.

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ قیامت کے دن ہر کوئی اپنے عمل کا پابند ہوگا۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کا قول ہے[1] مگر اصحابِ یمین وہ بالا خانوں میں ہوں گے اور جہنم والوں کا حال پوچھیں گے اور کہیں گے کہ تم دوزخ میں کس طرح گئے؟ وہ کہیں گے: ہم نے اپنے رب کی عبادت نہیں کی اور نہ مخلوق کے ساتھ احسان کیا اور جو بات ہم نہ جانتے تھے اس میں غور وخوض کرتے تھے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جب کوئی غاوی (سرکش) سرکشی کرتا تو ہم بھی اس کے ساتھ ہوتے تھے[2] اور ہم قیامت کے دن کا انکار کرتے تھے، یہاں تک کہ ہم کو موت آ گئی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴾ [الحجر: ٩٩] ”اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں، یہاں تک کہ آپ کو موت آ جائے۔“ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «أَمَّا هُوَ يَعْنِي عُثْمَانَ بْنَ مَظْعُونٍ فَقَدْ جَاءَهُ الْيَقِيْنُ مِنْ رَّبِّهِ»[3] ”عثمان بن مظعون کے پاس اس کے رب تعالیٰ کی طرف سے یقین آ گیا۔“

اس جگہ یقین سے مراد موت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جو کوئی شخص ان صفات کا حامل ہوگا اس کو کسی کی شفاعت نفع نہ دے گی، کیوں کہ اس شخص کے لیے شفاعت کا اثر ہوتا ہے جو اس کے قابل ہوتا ہے اور جو شخص اللہ کے ساتھ کفر کر کے قیامت کے دن آیا اس کے لیے لامحالہ آگ تیار ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہے گا۔ پھر فرمایا: ان لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ جس حق اور ہدایت کی طرف تو ان کو بلاتا ہے اور اس کی یاددہانی ان کو کراتا ہے، یہ اس سے روگرداں ہوتے ہیں، گویا گدھے ہیں جو شیر سے بھاگتے ہیں جب وہ ان کو شکار کرنا چاہتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام زید بن اسلم اور ان کے بیٹے عبد الرحمان اور جمہور رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ﴿ قَسْوَرَةٍ ﴾ عربی میں ”أَسَدٌ“ کے معنی میں ہے اور فارسی میں شیر اور نبطی میں اویا ہے۔

مشرکین کے ایک غلط موقف کی تردید:

پھر فرمایا کہ ہر مشرک یہ چاہتا ہے کہ اس پر ایک کتاب اللہ کی طرف سے اترے جس طرح کی نبی اکرم ﷺ پر اتری ہے۔[4] (قاله مجاهد وغيره) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى

---

(1) تفسير الطبري (٣٥/٢٤) (2) تفسير الطبري (٣٧/٢٤) (3) صحيح البخاري (١١٨٦)

(4) تفسير الطبري (٤٢/٢٤، ٤٣) تفسير ابن كثير (٥٧٤/٤)

مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ۘؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ [الأنعام: ۱۲۴] ''اور جب ان کو کوئی آیت پہنچتی ہے تو یوں کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ ہم کو بھی ایسی ہی چیز نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی جاتی ہے، اس موقعے کو تو اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کہاں وہ اپنی پیغمبری رکھے۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: چاہتے ہیں کہ بغیر عمل کے ان کی براءت ہو جائے۔ [1] یہ لوگ آخرت سے نہیں ڈرتے۔ عدمِ اطمینان نے ان کو فاسد کر دیا ہے اور یہ قیامت کے واقع ہونے کی تکذیب کرتے ہیں، حالاں کہ اگر اللہ چاہے تو یہ قرآن ان کے لیے تذکرہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ [التکویر: ۲۹] ''اور تم بغیر پروردگارِ عالم کے چاہے کچھ نہیں چاہ سکتے۔''

اللہ تعالیٰ اس کے لائق ہے کہ اس سے ڈرنا چاہیے اور اس کے لائق ہے کہ وہ ڈرنے والوں کی مغفرت کرے۔ گناہ گار جب تائب ہو کر اور رجوع ہو کر آتا ہے تو اللہ اس کو بخش دیتا ہے۔ (قاله قتادة) سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴾ پھر فرمایا: «قَالَ رَبُّكُمْ: أَنَا أَهْلٌ أَنْ أُتَّقَى فَلَا يُجْعَلُ مَعِيَ إِلَهٌ، فَمَنِ اتَّقَى أَنْ يَّجْعَلَ مَعِيَ إِلَهًا كَانَ أَهْلًا أَنْ أَغْفِرَ لَهُ» [2] ''تمھارے رب تعالیٰ نے کہا ہے: میں ہی اس بات کا حق دار ہوں کہ مجھ سے ڈرا جائے اور میرے ساتھ کوئی معبود نہ ٹھہرایا جائے، جو اس بات سے ڈرا کہ میرے ساتھ کسی کو معبود بنائے تو وہ اس لائق ہے کہ میں اسے معاف کر دوں۔'' (رواه أحمد والترمذي وقال: حسن غريب وسهيل ليس بالقوي وابن ماجه ورواه ابن أبي حاتم وأبو يعلى والبزار والبغوي والدارمي والنسائي وابن جرير وابن المنذر وابن أبي حاتم وابن عدي وصححه وابن مردويه وأخرج ابن مردويه عن أبي هريرة وابن عمر وابن عباس مرفوعاً نحوه) معلوم ہوا کہ اس جگہ ڈرنے سے مراد توحید کو اختیار کرنا اور شرک کو ترک کرنا ہے۔ موحد نجات پائے گا اور مشرک ہلاک ہو گا اور فاسق کو عذاب ہو گا اور عمل کرنے والا کامیاب ہو گا۔ والله أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ہر نفس اپنے عمل پر پکڑا جائے گا۔ وہ عمل اس کو رہائی دلائے یا ہلاک کرا دے۔ ''رَهِيْنٌ'' بہ معنی ''رهن'' ہے۔ لفظ ﴿ نَفْسٍ ﴾ میں ہر کافر، مومن، گناہ گار اور غیر گناہ گار شامل ہیں۔ کوئی شخص اپنے کسب (اعمال) سے مفکوک (بچایا گیا) نہ ہو گا مگر داہنے ہاتھ والے کہ وہ اپنے گناہوں میں گرو نہ ہوں گے، بلکہ اپنے اچھے اعمال کے سبب رہائی پائیں گے۔ کفار کے حق میں یہ رہن دائمی ہو گا اور گناہ گار مومنین کے حق میں منقطع ہو گا۔

---

[1] تفسير الطبري (۲۴/۴۳)

[2] مسند أحمد (۳/۱۴۲) سنن الترمذي (۳۳۲۸) سنن النسائي الكبرىٰ (۶/۵۰۱) سنن ابن ماجه (۴۲۹۹) اس کی سند میں ''سہیل بن عبداللہ'' ضعیف راوی ہے۔

اصحاب الیمین کی تعیین میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا کہ ملائکہ ہیں۔ کسی نے کہا کہ مومنین ہیں۔ کسی نے کہا کہ مسلمانوں کی اولاد اور مومنین کے چھوٹے بچے۔ کسی نے کہا کہ وہ لوگ جو آدم علیہ السلام کی دائیں جانب ہیں۔ کسی نے کہا کہ اصحابِ حق۔ کسی نے کہا کہ وہ لوگ جو اللہ کے فضل پر اعتماد کرتے ہیں نہ کہ عمل پر۔ کسی نے کہا کہ وہ لوگ جن کو اللہ نے اپنی خدمت کے لیے پسند کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد مسلمین ہیں۔[1] سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مسلمین کے اطفال ہیں۔[2] کسی نے کہا کہ یہی درست ہونے کے زیادہ مشابہ ہے، اس لیے کہ اطفال نے کوئی گناہ نہیں کیا کہ ان کی پکڑ ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ اصحابِ اعمالِ صالحہ ہیں جن کو داہنے ہاتھ میں اعمال نامہ ملے گا۔ ایک دوسرے سے سوال کرنے کی دلیل سے یہی راجح معلوم ہوتا ہے۔

مجرمین سے مراد کفار ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک جنتی ایک دوزخی سے نام لے کر پوچھے گا کہ اے فلاں! تجھ کو کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟[3] اور کسی نے کہا کہ یہ پوچھنے والے فرشتے ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہم نماز کی فرضیت پر ایمان اور اعتقاد نہیں رکھتے تھے اور مساکین کو خیرات نہیں دیتے تھے۔ یہ فرض نماز اور زکات پر محمول ہے، اس لیے کہ کسی غیر واجب چیز کے نہ کرنے پر عذاب نہ ہوگا۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ شرعی اور فروعی چیزوں کے بارے میں کفار کو خطاب ہے۔

صاحبِ کشاف کا یہ کہنا کہ اس بات کا احتمال ہے کہ بعض لوگ ان تمام امور کے سبب دوزخ میں جائیں گے اور بعض صرف نماز اور مساکین کو کھلانا ترک کر دینے سے دوزخ میں جائیں گے۔[4] ایک خیال ہے جس طرح کہ صاحبِ انتصاف نے کہا ہے کہ نماز کا تارک آگ میں ہمیشہ رہے گا۔ خوض اہلِ باطل کے باطل میں شریک ہونے کو کہتے ہیں۔[5] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں خوض کرتے ہیں، یعنی انھیں کاذب، ساحر، مجنون اور شاعر کہتے ہیں۔[6] امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن کو شعر، سحر اور کہانت وغیرہ بتاتے تھے۔ نہ صحیح عقل کے ساتھ سوچتے اور نہ نقلِ صحیح کی طرف رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں کو ڈر جانا چاہیے جو بغیر تحقیق کے علم کی مختلف انواع میں جلدی سے ہر اس سوال کا جواب دینے میں جلدی کرتے ہیں جو ان سے سوال کیا جاتا ہے۔

"یوم الدین" سے مراد جزا و حساب و کتاب کا دن ہے۔ یہ تعیم کے بعد تخصیص ہے، کیوں کہ باطل میں خوض کرنا اس کی تکذیب وغیرہ کو شامل ہے۔ صحیح یہی ہے کہ یہ آیت کفار کے حق میں ہے۔ یہ طاعات ان سے صحیح نہیں ہیں، لیکن وہ ان کے نہ کرنے کی وجہ سے افسوس اور حسرت کریں گے۔ یقین سے مراد موت ہے، یہ چاروں امور کی انتہا ہے۔ شفاعت کے نفع نہ دینے سے یہ مراد ہے کہ ان کی سفارش کوئی بھی نہ کرے گا۔ اس سے مومنین کے حق میں شفاعت

---

[1] الدر المنثور (٣٣٦/٨) [2] تفسير الطبري (٣٦/٢٤) [3] تفسير القرطبي (٨٧/١٩)
[4] الكشاف (٦٥٦/٤) [5] فتح البيان (٤٢٠/١٤) [6] تفسير القرطبي (٨٧/١٩)

کا ثبوت ہوا۔ حدیث میں مروی ہے کہ « إِنَّ مِنْ أُمَّتِي مَنْ يَدْخُلُ بِشَفَاعَتِهِ أَكْثَرُ مِنْ رَبِيعَةَ وَمُضَرَ »[1]
''میری امت کے ایک شخص کی سفارش سے ربیعہ اور مضر قبیلے کی تعداد سے زیادہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔''
سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ملائکہ، انبیاء، صلحاء، شہداء اور سارے مومنین شفاعت کریں گے اور آگ میں صرف چار قسم کے لوگ باقی رہ جائیں گے، پھر یہ آیت پڑھی۔ سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما نے کہا: « اَلشَّفَاعَةُ نَافِعَةٌ لِكُلِّ أَحَدٍ دُوْنَ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ تَسْمَعُوْنَ »[2] ''شفاعت ہر شخص کے لیے نفع مند ہے سوائے ان کے جن کے بارے میں تم سنتے ہو۔''

''تذکرة'' سے مراد قرآنِ کریم کی نصیحتوں کے ساتھ نصیحت کرنا ہے۔ قرآن میں بڑی بڑی نصیحتیں اور عظیم وعظ ہیں، پھر انھیں قرآن سے دور رہنے پر گدھوں سے مشابہت دی کہ جس طرح گدھے تیر اندازوں سے بھاگتے ہیں اسی طرح یہ قرآن سے گریز کرتے ہیں۔ ''قسور'' تیر چلانے والے کو کہتے ہیں۔ ''قَسْوَرَة'' اس کی جمع ہے۔ امام سعید بن جبیر، عکرمہ، مجاہد، قتادہ اور ابن کیسان رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام عطاء اور کلبی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی شیر ہے۔ امام ابن عرفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''قسر'' بہ معنی قہر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ لوگوں کی آواز ہے۔ عرب کی زبان میں ''قسوَرة'' اسد کو کہتے ہیں اور حبشہ کی زبان میں تیر اندازوں کو کہتے ہیں، اس کا واحد نہیں ہے۔ امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''قسورة'' اول شب ہے، یعنی رات کے اندھیرے سے بدکتے ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں،[3] لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

عرب کے نزدیک ہر شدید ''قسورة'' کہلاتا ہے۔ سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ''قسورہ'' قسی کے تیر انداز لوگ ہیں، یعنی کمان چلانے والے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تیر انداز شکاری۔[4] بعض نے کہا ہے: دامِ صیاد۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: لوگوں کا غل غپاڑہ کرنا۔[5] مفسرین کہتے ہیں کہ کفار نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ ہم میں سے ہر شخص کے پاس صبح کو ایک کھلی کتاب اللہ کے پاس سے آئے کہ تم اللہ کے رسول ہو تو ہم ایمان لائیں، یہ ان کا تعنت (عیب جوئی) تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ﴾ [بني إسرائيل: ٩٣] ''یہاں تک کہ آپ ہم پر کوئی کتاب اتار لائیں جسے ہم خود پڑھ لیں۔'' اللہ تعالیٰ نے کہا: یہ لوگ بڑے بے خوف ہیں، ان کو آخرت کا کچھ ڈر نہیں، جبھی تو ایسی فرمائشیں کرتے ہیں۔[6]

---

[1] تفسير النفسي (٢٩٨/٤) [2] تفسير البغوي (٢٧٣/٨) [3] فتح القدير (٤٤١/٥)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٨٥/١٠) [5] الدر المنثور (٣٣٩/٨) [6] فتح البيان (٤١٨/١٤ـ٤٢٣)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْقِيٰمَةِ

اس کی انتالیس (۳۹) یا چالیس (۴۰) آیات ہیں۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ مکہ میں اتری۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم نے بھی یہی کہا ہے کہ یہ مکی ہے۔[1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴿١﴾ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ﴿٢﴾ اَيَحْسَبُ
الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ﴿٣﴾ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ﴿٤﴾
بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ﴿٥﴾ يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ﴿٦﴾
فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴿٧﴾ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ﴿٨﴾ وَجُمِعَ الشَّمْسُ
وَالْقَمَرُ ﴿٩﴾ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿١٠﴾ كَلَّا لَا وَزَرَ ﴿١١﴾
اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ الْمُسْتَقَرُّ ﴿١٢﴾ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍۢ بِمَا
قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴿١٣﴾ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴿١٤﴾ وَّلَوْ اَلْقٰى
مَعَاذِيْرَهٗ ﴿١٥﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی ① اور قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی ② کیا انسان سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کر پائیں گے؟ ③ کیوں نہیں! بلکہ ہم تو اس کی پور پور ٹھیک کرنے پر قادر ہیں ④ بلکہ انسان تو چاہتا ہے کہ اپنے آگے (آیندہ بھی) فسق و فجور کے کام کرے ⑤ وہ پوچھتا ہے یومِ قیامت کب ہے؟ ⑥ چناں چہ جب آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی ⑦ اور چاند گہنا جائے گا ⑧ اور سورج اور چاند جمع کر دیے جائیں گے ⑨ انسان اس دن کہے گا:

[1] الدر المنثور (۸/۳۴۲)

جائے فرار کہاں ہے؟ ⑩ ہرگز نہیں! (وہاں) کوئی پناہ گاہ نہیں ⑪ اس دن تیرے رب کے سامنے جا ٹھہرنا ہوگا ⑫ اس دن انسان کو بتا دیا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا ⑬ بلکہ انسان خود اپنے نفس پر خوب شاہد ہے ⑭ اگرچہ وہ اپنی (کتنی ہی) معذرتیں پیش کرے ⑮

قیامت کے دن دوبارہ اٹھائے جانے پر اللہ تعالیٰ کا قسم کھانا:

آدمی کا دل اول تو کھیل میں اور مزوں میں غرق ہوتا ہے، ہرگز نیکی کی رغبت نہیں ہوتی۔ ایسے جی کو "أمارة بالسوء" کہتے ہیں۔ پھر ہوش پکڑے اور نیک و بد کو سمجھ کر باز آئے، کبھی اپنے آپ کو کوسنے لگا، ویسا جی "لوّامة" ہے۔ پھر جب پوری طرح سے سنور گیا، دل سے نیکی کی طرف ہی رغبت رہے، بے ہودہ کاموں سے خود ہی بھاگے اور تکلیف اٹھائے، ایسے نفس کا نام "مُطْمَئِنَّة" ہے۔ چکا چوند ہو جائے، یعنی اتنی روشنی ہو کہ آدمی کی آنکھ عاجز ہو جائے، یہ قیامت کا وقت ہے، سورج قریب آ جائے گا۔ آدمی اپنے احوال پر غور کرے تو رب کی وحدانیت جانے اور اگر کہے: میری سمجھ میں نہیں آتا تو یہ بہانے ہیں۔ انتھیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: مقسم علیہ (جس کی قسم اٹھائی جائے) جب منفی ہوتا ہے تو نفی کی تاکید کے لیے قسم سے پہلے حرف "لَا" لانا جائز ہے۔ اس جگہ مقسم علیہ اثباتِ معاد ہے اور جاہلوں پر ان کے اعتقاد کا رد کرنا، کیوں کہ وہ یہ زعم کرتے ہیں کہ جسم نہیں اٹھائے جائیں گے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کی قسم کھائی اور نفسِ لوامہ کی قسم نہ کھائی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: بلکہ دونوں کی قسم کھائی۔ امام حسن اور اعرج رحمہما اللہ کی قراءت "لَأُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ" ہے۔ یہ قراءت حسن کے اس قول کی وجہ سے ہے کہ قیامت کی قسم کھائی اور نفسِ لوامہ کی قسم نہیں کھائی، لیکن صحیح یہی ہے کہ دونوں کی قسم اکٹھے اور ایک ساتھ کھائی ہے جس طرح کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[1]

"یوم القیامة" مشہور ہے۔ رہا نفسِ لوامہ تو امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واللہ! ہم مومن کو نہیں دیکھتے مگر یہ کہ وہ اپنے جی کو ملامت کرتا ہے اور کہتا ہے: اے نفس! تو نے اس کلمے سے کیا ارادہ کیا اور اس لقمے سے کیا چاہا اور حدیثِ نفس سے تیری کیا مراد ہے۔ اور فاجر قدم قدم چلتا ہے اور اپنے نفس کو عتاب نہیں کرتا۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ اہلِ آسمان و زمین میں کوئی شخص نہیں ہے لیکن وہ قیامت کے دن اپنے نفس کو ملامت کرے گا، عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: خیر و شر پر ملامت کرے گا اور کہے گا: "لَوْ فَعَلْتَ كَذَا وَكَذَا" یعنی اگر تو ایسا کرتا تو کیا اچھا ہوتا۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ

---

① تفسیر الطبري (٢٤/٤٧، ٤٨)

نے کہا ہے کہ بھلے برے پر ملامت کرے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ نفسِ لوم ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گزرے ہوئے وقت پر نادم اور لائم ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "لَوَّامَةٌ" "مَذْمُوْمَةٌ" ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ فاجرہ ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ ان سب اقوال کے معنی قریب قریب ہیں اور آیت کے ظاہر سے زیادہ مشابہ یہ ہے کہ مراد وہ نفس ہے جو اپنے صاحب کو خیر وشر پر ملامت کرتا ہے اور گزری ہوئی باتوں پر پشیمان ہوتا ہے۔[1] میں کہتا ہوں حدیث میں مروی ہے: «إِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ»[2] "جب تجھے نیکی اچھی لگے اور گناہ برا لگے تو مومن ہے۔" بلاشبہ مومن اور کافر میں یہ فرق موجود ہوتا ہے کہ مومن خطا اور گناہ ہونے پر نادم ہوتا ہے اور اللہ کے ڈر سے توبہ کرتا ہے اور کافر کو کسی گناہ کی کچھ پروا نہیں ہوتی وہ اپنے نفس کو کیوں سرزنش کرنے لگا! انسان کافر کو یہ گمان ہے کہ اللہ کو یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ متفرق جگہوں سے اس کی ہڈیوں کو جمع کرے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس گمان کو دور کیا اور فرمایا کہ ہمیں طاقت ہے کہ ہم اس کی پور پور کو برابر کریں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی ہم خف (موزہ) و حافر (کھر) بنا سکتے ہیں۔ یہی قول امام مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ، ضحاک اور ابن جریر رحمہم اللہ کا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو موجہ کہا ہے، اس طرح پر کہ اگر اللہ چاہے تو یہ کام اسی دنیا میں کر گزرے۔[3]

ظاہر آیت یہی ہے کہ ہماری قدرتِ صالح جمع ہے۔ ہم اگر چاہیں تو اس سے زیادہ مبعوث کریں اور اطرافِ اصابع (انگلیوں کی اطراف) کو برابر کر دیں۔ امام ابن قتیبہ و امام زجاج رحمہما اللہ کے قول کے یہی معنی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ انسان فجور کرنا چاہتا ہے، یعنی قدم سے چلتا ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ انسان کہتا ہے: عین عمل کرلوں، پھر قیامت کے دن سے پہلے توبہ کرلوں گا۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد کفر ہے حق کے ساتھ قیامت کے سامنے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی خودسری کرتا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: کوئی ابن آدم نہیں ملتا مگر اپنے نفس کو قدم بقدم اللہ کی نافرمانی کی طرف کھینچتا ہے مگر جس کو اللہ بچالے۔ امام عکرمہ، سعید بن جبیر، ضحاک، سدی اور بہت سے سلف رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو گناہ کرنے میں جلدی کرتا ہے اور توبہ کرنے میں دیر لگاتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کافر ہے۔ "یوم الحساب" کی تکذیب کرتا ہے۔ یہی امام ابن زید رحمہ اللہ کا قول بھی ہے[4]: یہی قول مطلب و مراد میں زیادہ ظاہر ہے۔ لہٰذا اس کے بعد فرمایا ہے کہ وہ پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہوگا؟ اس کا یہ سوال قیامت کے واقع ہونے کو بعید اور ناممکن سمجھنے کے طور پر ہے۔ قیامت کے وجود کی تکذیب کرتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٩﴾ قُل لَّكُم مِّيعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْتَقْدِمُونَ﴾ [سبا: ٢٩-٣٠] "پوچھتے ہیں کہ وہ وعدہ ہے

---

[1] تفسير الطبري (٢٤/٤٩، ٥٠) تفسير ابن كثير (٤/٥٧٥) [2] مسند أحمد (٥/٢٥١) صحيح الجامع (٦٠٠)
[3] تفسير الطبري (٢٤/٥٠، ٥١) [4] تفسير الطبري (٢٤/٥٣، ٥٤) تفسير ابن كثير (٥٧٥، ٥٧٦)

کب؟ سچے ہو تو بتاؤ، جواب دیجیے کہ وعدے کا دن ٹھیک معین ہے جس سے ایک ساعت نہ تم پیچھے ہٹ سکتے ہو نہ آگے بڑھ سکتے ہو۔‘‘

اور یہ ارشاد: ﴿ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ﴾ اس آیت کے مشابہ ہے: ﴿ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ﴾ [إبراهيم: ٤٣] ’’خود اپنی طرف بھی ان کی نگاہیں نہ لوٹیں گی۔‘‘ ﴿ بَرِقَ ﴾ کو بہ کسرِ راء پڑھا ہے بہ معنی ’’حَارَ‘‘ یعنی ڈرتے ڈرتے اس طرح پر دیکھیں گے کہ رعب کی شدت سے کسی چیز پر نظر نہ ٹھہرے گی۔ بعض نے ’’بَرَق‘‘ بہ فتح راء پڑھا ہے، یہ بھی معنی میں پہلے معنی کے قریب ہے۔ مقصود یہ ہے کہ آنکھ کو چکا چوند سا لگ جائے گا۔ وہ ہولنا کی کی شدت اور قیامت کے دن کے امور کے مشاہدے سے خاشع (عاجز) اور حیران ہوں گے۔

خسفِ قمر سے یہ مراد ہے کہ چاند کا نور جاتا رہے گا اور سورج اور چاند کو جمع کرنے سے یہ مراد ہے کہ دونوں کو لپیٹ ڈالیں گے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ آیت پڑھی: ﴿ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ﴾ [التكوير: ١-٢] ’’جب سورج لپیٹ لیا جائے گا اور جب ستارے بے نور ہو جائیں گے۔‘‘ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت یہ ہے: ’’وَجُمِعَ بَيْنَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ‘‘[1] ’’سورج و چاند کو جمع کیا جائے گا۔‘‘ بالجملہ بنی آدم جس وقت قیامت کی ہولنا کیوں کا معائنہ کریں گے تو بھاگنا چاہیں گے اور کہیں گے کہ ہم کدھر بھاگ کر جائیں، کوئی ملجا و موکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب سوائے اللہ کے کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام سعید بن جبیر اور بہت سے سلف رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَا وَزَرَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ نجات نہیں ہے[2] اور یہ آیت اللہ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَىِٕذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴾ [الشورىٰ: ٤٧] ’’تمھیں اس روز نہ تو کوئی پناہ کی جگہ ملے گی نہ چھپ کر انجان بن جانے کی۔‘‘ یعنی تمھارے لیے ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں تم صورت بدل کر جاؤ۔ اسی طرح اس جگہ ﴿ لَا وَزَرَ ﴾ فرمایا، یعنی کوئی جگہ بچاؤ کی نہیں ہے جہاں بھاگ کر بچ سکو، لہٰذا فرمایا ہے کہ مرجع و مصیر تیرے رب ہی کی طرف ہے، اس دن انسان اپنے سارے اعمال، پرانے اور نئے، پہلے اور آخری، چھوٹے اور بڑے سب کی خبر معلوم کر لے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾ [الكهف: ٤٩] ’’اور جو کچھ انھوں نے کیا تھا سب موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم و ستم نہ کرے گا۔‘‘

اسی طرح اس جگہ کہا کہ آدمی اپنے نفس پر شاہد اپنے فعل کا عالم ہے اگرچہ عذر لائے، انکار کرے، بہانہ پکڑے اور بات بنائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٤] ’’لے! خود ہی اپنی کتاب آپ پڑھ لے، آج تو تو آپ ہی اپنا خود حساب لینے کو کافی ہے۔‘‘ سیدنا عبداللہ بن عباس

[1] تفسير الطبري (٥٧/٢٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٨٦/١٠)

نے کہا ہے کہ انسان کی اپنی طرف سے نفس پر بصیرت یہی اس کے کان آنکھ ہاتھ پاؤں اور اعضاء ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انسان اپنے نفس کا خود ہی گواہ ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ تو جب چاہے تو واللہ! اس کو لوگوں کے عیبوں اور گناہوں پر نظر رکھنے والا دیکھے گا اور وہ اپنے گناہوں پر غافل ہوتا ہے۔ کہتے ہیں: انجیل میں لکھا ہوا ہے: ''يَا ابْنَ آدَمَ تُبْصِرُ الْقَذَاةَ فِي عَيْنِ أَخِيكَ وَتَتْرُكُ الْجِذْلَ فِي عَيْنِكَ لَا تُبْصِرُهُ''، یعنی تو اپنے بھائی کی آنکھ میں تنکا بھی دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ میں اگر ستون ہو تو نہیں دیکھتا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گو اپنا عذر بیان کرے اور لڑنے لگے، لیکن وہ ضرور اپنے عیوب کا بینا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اگر عذرِ باطل لائے جو قبول نہ ہو۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''معاذیر'' سے مراد حجت ہے۔ یہی امام ابن زید اور حسن رحمہما اللہ وغیرہما کا قول ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد بہتان ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد پردے ہیں۔ اہلِ یمن پردے کو عذار کہتے ہیں[1] لیکن صحیح قول وہی ہے جو مجاہد اور اس کے اصحاب کا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٣] ''پھر ان کے شرک کا انجام اس کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوگا کہ وہ یوں کہیں گے کہ قسم اللہ اپنے پروردگار کی ہم مشرک نہ تھے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ﴿ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴾ [المجادلة: ١٨] ''جس دن اللہ تعالیٰ ان سب کو اٹھا کھڑا کرے گا تو یہ جس طرح تمھارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں (اللہ تعالیٰ) کے سامنے بھی قسمیں کھانے لگیں گے اور سمجھیں گے کہ وہ بھی کسی (دلیل) پر ہیں، یقین مانو کہ بیشک وہی جھوٹے ہیں۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ معاذیر یہی اعتذار ہے، تو نے نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ ﴾ [المؤمن: ٥٢] ''جس دن ظالموں کو ان کی معذرت (عذر) کچھ نفع نہ دے گی۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [النحل: ٢٨] ''اس وقت جھک جاتے ہیں کہ ہم برائی نہیں کرتے تھے، کیوں نہیں! اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے تھے۔'' اور ان کا یہ قول: ﴿ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٢٣] ''قسم اللہ اپنے پروردگار کی! ہم مشرک نہ تھے۔''[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں ہے کہ سمرقندی نے کہا ہے کہ مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ ﴿ لَآ اُقْسِمُ ﴾ میں حرف ﴿ لَآ ﴾

---

[1] تفسیر الطبري (٦٢/٢٤ـ٦٥) تفسیر ابن کثیر (٥٧٦/٤) [2] تفسیر الطبری (٦٣/٢٤، ٦٤) تفسیر ابن کثیر (٥٧٥/٤، ٥٧٧)

زیادہ ہے، کلام کی یہ زیادتی عرب میں جاری و ساری ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ ﴾ أَيْ: أَنْ تَسْجُدَ“ اور ﴿ لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ ﴾ ”أَيْ: لِيَعْلَمَ“ اس کا فائدہ تاکیدِ قسم ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کلام کفار کا رد ہے جو موت کے بعد اٹھائے جانے کے منکر تھے۔ گویا یوں کہا کہ ”لَيْسَ الْأَمْرُ كَمَا ذَكَرْتُمْ، أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ“ امام فراء رحمہ اللہ اور بہت سے اہلِ نحو کا یہی قول ہے، جیسے: ”لَا وَاللّٰهِ“[1] کسی نے کہا ہے کہ یہ ”لا“ نفی کے لیے ہے، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ اللہ کا قیامت کے دن کی قسم کھانا قیامت کی تعظیم اور بڑائی کے لیے ہے۔ اللہ کو حق پہنچتا ہے کہ اپنی مخلوقات میں سے جس چیز کی چاہے قسم کھائے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے متعلق پوچھا، انھوں نے کہا: ”يُقْسِمُ بِمَا شَاءَ مِنْ خَلْقِهِ“[2] ”وہ اپنی مخلوق میں سے جس کی چاہے قسم کھاتا ہے۔“

”لوامة“ وہ نفس ہے جو اپنے صاحب کو غلطی پر ملامت کرے، یا دنیا میں یا قیامت میں سارے نفوس کو ان کی غلطیوں پر ملامت کرے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: وہ نفس ہے جو شر سے نادم ہو کر گلہ کرے کہ تو نے یہ کام کیوں کیا اور اس بات پر ملامت کرے کہ تو نے زیادہ خیر کیوں نہ کی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی نفس بر و فاجر (نیکی کرنے والا اور برائی کرنے والا) نہیں ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے اگر اچھا کام کیا تو کہتا ہے کہ زیادہ کیوں نہ کیا اور اگر برا کام کیا تو کہتا ہے کاش نہ کرتا۔ اس صورت میں یہ کام نفس کی تعریف سے تعلق رکھتا ہے اور اگر ”لوامة“ بہ معنی مذمومہ ہے تو پھر صفت مذمت ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ کافر کا نفس ہے کہ آخرت میں حسرت کرے گا اور اپنی غلطیوں پر ملامت کرے گا۔[3] لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ نفس آدم علیہ السلام کا تھا کہ ہمیشہ اپنے فعل پر جس کی وجہ سے بہشت سے نکلا ملامت کرتا ہے، لیکن یہ بہت بعید ہے۔ اس کی قسم قیامت کی قسم کے ساتھ اس لیے کھائی کہ اقامتِ قیامت کا مقصد نفوس کو جزا دینا ہے۔

﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ ﴾ میں ﴿ اَلْاِنْسَانُ ﴾ سے مراد جنس ہے، یا کافر انسان ہے۔ انسان کا یہ گمان کہ جب ہڈیاں بوسیدہ ہو کر مٹی ہو گئیں اور ہوا اس خاک کو زمین میں دور دور تک اڑا کر لے گئی اب دوبارہ پیدا ہونا بعید ہے، باطل ہے، کیوں کہ اللہ کو تمام اجزاء کو مبعوث کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ ہڈیوں کا ذکر خاص کر اس لیے کیا کہ یہ قالبِ خلق ہے۔ تسویۂ بنان کے یہ معنی ہیں کہ جب ہم کو ایسے چھوٹے اور باریک جز کے اعادے پر طاقت تھی تو پھر بڑے اعضاء کا کیا ذکر ہے۔ بنان سے مراد ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیاں ہیں۔ انسان چاہتا ہے کہ اپنے سامنے فجور کرے۔ امام ابن الانباری رحمہ اللہ نے کہا: یعنی یہ ارادہ کرتا ہے کہ جتنی عمر دراز ہو وہ فسق و فجور کرتا جائے، اس کی نیت میں اس گناہ سے رجوع کرنا نہیں ہوتا جس کا وہ مرتکب ہوتا ہے۔

---

[1] فتح القدير (٥/٤٤٤) [2] تفسير الطبري (٢٤/٤٨) [3] فتح القدير (٥/٤٤٥)

امام مجاہد، حسن، عکرمہ، سدی اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: کہتا ہے اب میں توبہ کرلوں گا اور پھر نہیں کرتا، یہاں تک کہ اس کو موت آ جاتی ہے اور بدترین حالت پر ہوتا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: مراد امل ہے۔ کہتا ہے: ابھی میں جیوں گا اور دنیا حاصل کروں گا اور اس کو اپنا مرنا یاد نہیں آتا۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد انسانِ کافر ہے جو حساب کی تکذیب کرتا ہے۔[2] ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ گناہ کو مقدم کرتا ہے اور توبہ کو مؤخر کرتا ہے۔[3] فجور کا اصل حق سے قولاً وفعلاً مائل ہونا ہے۔ یہ بات بطور استبعاد و استہزاء پوچھتا ہے کہ قیامت کب ہو گی۔ چنانچہ جب نگاہ حیران ہو گی اور چاند کی چمک جاتی رہے گی اور چاند سورج اکٹھے کیے جائیں گے، رات اور دن کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا باقی نہ رہے گا اور ان کو لپیٹ کر دوزخ میں پھینک دیں گے، اللہ کی آگ بڑی ہو جائے گی تب اس دن انسان کہے گا: اب کہاں جاؤں۔ انسان سے مراد کافر ہے یا مومن کہ وہ بھی اس دن کی ہولناکی سے بدحواس ہو جائے گا اور اللہ سے شرما کر جہنم سے ڈر کر جائے فرار ڈھونڈے گا لیکن مفر کہاں!

﴿وَزَرَ﴾ سے مراد ہتھیار، پہاڑ، قلعہ اور جائے پناہ ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دنیا میں جب گھبراتے تھے تو پہاڑوں میں پناہ پکڑتے۔ اب اللہ نے کہا: اس دن تمھارا بچانے والا اور پناہ گاہ کوئی نہیں ہے۔ صحابہ نے ﴿وَزَرَ﴾ کی تفسیر حصن (قلعہ) وملجا (پناہ گاہ) وحرز (پناہ کی جگہ) کی ہے۔ اس دن تو مرجع ومنتہی ومصیر اللہ ہی کی طرف ہے نہ کہ غیر کی طرف۔

"مستقر" سے مراد وہ جگہ ہے جہاں قرار پکڑیں گے، جنت یا نار۔ اس دن انسان کو اس کے اگلے پچھلے عمل کی جزا دی جائے گی، خیر ہو یا شر۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی تقدیم وتاخیرِ طاعت کی جزا دی جائے گی۔ امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مال آگے بھیجنے کی اور جو مال ورثاء کے لیے چھوڑا اس کی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: پہلے اور آخری عمل کی۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: فرض کی تقدیم وتاخیر کی۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا: یہ خبر قیامت کے دن اعمال کے وزن کے وقت دی جائے گی اور ہوسکتا ہے کہ موت کے وقت دی جائے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: پہلی بات زیادہ ظاہر ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود وسیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ جو عمل آگے بھیجا اور جو طریقہ پیچھے چھوڑ گیا جس پر پچھلوں نے خیر یا شر سے عمل کیا،[4] یا جو گناہ آگے بھیجے اور جو طاعت پیچھے ڈالے۔ انسان اپنے نفس کا بصیر ہے، یعنی اس کے اعضاء اس پر گواہی دیں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [النور: ٢٤] "جبکہ ان کے مقابلے میں ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔" اس صورت میں آیت کے معنی یہ ٹھہرے کہ انسان کے جوارح اور

---

[1] تفسير القرطبي (١٩/٩٥) فتح القدير (٥/٤٤٦)
[2] تفسير الطبري (٢٤/٥٤)
[3] شعب الإيمان (٧/٣٨٤)
[4] تفسير القرطبي (١٩/٩٨)

اعضاء اس پر گواہی دیں گے۔ یا بصیرت سے مراد دونوں کاتبِ اعمال ہیں کہ وہ اس کے خیر و شر کے شاہد ہوں گے۔ ظاہر یہ ہے کہ آدمی کو اپنے گناہ، معاصی، آثام اور خطائیں سب معلوم ہوتے ہیں اگرچہ وہ ان کا اقرار نہ کرے اور عذر معذرت سے پیش آئے اور حیلے بہانے ڈھونڈے اور بات بنائے، لیکن یہ عذرِ لنگ اس کے کسی کام نہ آئے گا۔ اگر دنیا میں نفس کا حساب لے کر حال کی اصلاح کر لیتا اور دل درست کر لیتا تو آج ان معاذیر کی حاجت نہ ہوتی۔[1]

خواہی کہ عیبہائے تو بر تو شود عیاں   یکدم منافقانہ نشیں در کمین خویش

"اگر تو چاہتا ہے کہ تیری برائیاں تجھ پر ظاہر ہو جائیں تو تو اپنی گھات میں تھوڑی دیر دو دلی و دو رخی انداز میں بیٹھ جا۔"

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ وَ تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾

(اے نبی!) آپ اس (قرآن) کو جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں ⑯ یقیناً اس کا (آپ کے سینے میں) جمع کرنا اور (آپ سے) اس کا پڑھوا دینا ہمارے ذمے ہے ⑰ پھر جب ہم اسے پڑھوا چکیں تو آپ اس کے پڑھنے کی اتباع کریں ⑱ پھر یقیناً اس کی وضاحت ہمارے ذمے ہے ⑲ ہرگز نہیں! بلکہ تم دنیا کو پسند کرتے ہو ⑳ اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو ㉑ اس دن (کئی) چہرے تر و تازہ ہوں گے ㉒ اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے ㉓ اور اس دن (کئی) چہرے اداس ہوں گے ㉔ وہ سمجھیں گے کہ ان سے کمر توڑ معاملہ کیا جائے گا ㉕

رسول اللہ ﷺ کو حصولِ وحی کے ادب کی تعلیم:

جس وقت جبریل علیہ السلام قرآن لاتے ان کے پڑھنے کے ساتھ نبی اکرم ﷺ بھی جی میں پڑھتے تو جب تک آپ پہلا لفظ کہتے: اگلا لفظ سن نہ سکتے تو گھبراتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس وقت پڑھنے کی ضرورت نہیں صرف سننا ہی چاہیے، پھر جی میں یاد رکھوانا اور لوگوں کے سامنے پڑھوانا اور وقت پر اس بیان کو سمجھانا ہمارا ذمہ ہے۔ جبریل علیہ السلام

[1] فتح البیان (۱۴/۴۳۳-۴۴۰)

کے پڑھنے کو اپنا پڑھنا فرمایا کہ وہ نائب ہے اسی طرح سورۃ النجم میں ﴿ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ﴾ [النجم: ۱۰] کہا۔ یقین ہے کہ آخرت میں اللہ کو دیکھنا ہے، گمراہ لوگ منکر ہیں جو ان کے نصیب میں نہیں ہے۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے اپنے رسول کو تعلیم ہے کہ تم فرشتے سے وحی کو اس طرح سے لو۔ نبی اکرم ﷺ وحی لینے میں جلدی کرتے اور فرشتہ آگے بڑھ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ فرشتہ جب وحی لے کر آئے تو تم فقط سن لیا کرو۔ اس وحی کا تمھارے سینے میں جمع کرنا اور اس کی ادائیگی کو آسان کر دینا جس طرح پر کہ وہ وحی آئی ہے اور اس کو کھول کر تفسیر اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ہمارا ذمہ ہے۔ ہم اس کے کفیل ہیں۔ چنانچہ پہلی حالت سینے میں جمع کرنا، دوسری حالت تلاوت کرنا اور تیسری حالت معنی کی تفسیر اور وضاحت کرنا ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ تو جلدی سیکھنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴾ [طٰہٰ: ۱۱۴] ’’قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کر اس سے پہلے کہ تیری طرف جو وحی کی جاتی ہے، وہ پوری کی جائے، ہاں یہ دعا کر کہ پروردگار! میرا علم بڑھا۔‘‘

پھر فرمایا کہ جب فرشتہ ہماری طرف سے اس کی تلاوت کرے تو تو اس کو سن، پھر پڑھ جس طرح کہ تجھ کو پڑھایا ہے، ہم تجھ کو وحی یاد کرا دیں گے اور اس کی توضیح کر دیں گے، اس کے معنی کا تجھ کو الہام کر دیں گے اپنی مراد اور شرع کے مطابق۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ تنزیل سے شدت اٹھاتے، اپنے لب ہلاتے، پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے ہونٹ ہلا کر بتائے کہ نبی اکرم ﷺ اس طرح کرتے تھے۔ پھر سعید نے ہونٹ ہلا کر بتائے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس طرح لب ہلائے تھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے زبان کو حرکت دینے سے روکا اور وحی کے جمع اور اس کی قراءت اور بیان کرانے کی ذمے داری لی۔

بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ جبریل علیہ السلام آتے تو نبی اکرم ﷺ سر جھکاتے، جب وہ چلے جاتے تو اسی طرح پڑھ دیتے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا۔[1] امام شعبی، حسن بصری، قتادہ، مجاہد اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ یہ آیت اسی بارے میں اتری ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی اکرم ﷺ قرآن سے نہ تھکتے، اس خوف سے کہ کہیں بھول نہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ہمارا ذمہ ہے قرآن کے حلال و حرام کا بیان کرنا تم اتنی مشقت نہ اٹھاؤ۔[3]

آخرت سے غفلت کا سبب دنیا کی محبت ہے:

پھر فرمایا کہ ان لوگوں کی قیامت کی تکذیب اور وحی و قرآنِ عظیم کی مخالفت پر یہی دنیا کی محبت ہی اُکساتی

[1] صحیح البخاري (٥) صحیح مسلم (٤٤٨) مسند أحمد (٣٤٣/١)

[2] تفسیر الطبري (٦٥/٢٤۔٦٧) [3] تفسیر الطبري (٧٠/٢٤)

ہے۔ ان کی ساری ہمت اور محنت اسی خانۂ دنیا میں ہے جو عاجل (جلد فنا ہو جانے والی) ہے۔

ہمہ اندر زمن بہ تو این است کہ تو طفلی و خانہ رنگین ست

”میری طرف سے آپ کے لیے ایک نہایت راز کی بات یہ ہے کہ تو ابھی بچہ ہے اور یہ گھر (دنیا) رنگ برنگی ہے۔“

یہ لوگ آخرت سے بالکل بے پروا اور مشغول ہیں۔

دیدارِ الٰہی:

اس دن کچھ چہرے اپنے رب کی رویت سے تر و تازہ و پر بہار و رونق دار ہوں گے، کیوں کہ اس کو کھلم کھلا دیکھیں گے جس طرح کہ صحیح بخاری میں مروی ہے: «إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ عِيَانًا»[1] ”تم اپنے رب تعالیٰ کو کھلی آنکھوں سے دیکھو گے۔“ مومنین کا دارِ آخرت میں اللہ عزوجل کو دیکھنا ائمۂ حدیث کے نزدیک احادیثِ صحاح سے طرقِ متواترہ سے ثابت ہے۔ اس کا انکار یا تردید ممکن نہیں ہے۔ سیدنا ابو سعید اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے اور یہ حدیث صحیحین وغیرہما میں ہے کہ کچھ لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم قیامت کے دن کیا اپنے رب کو دیکھیں گے؟ کہا: تم کو سورج اور چاند کے دیکھنے میں کچھ شک ہوتا ہے جبکہ بادل کی آڑ نہ ہو؟ کہا: نہیں۔ فرمایا: تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے۔[2] سیدنا جریر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چودھویں رات کے چاند کی طرف نظر کر کے فرمایا: بے شک تم اپنے رب تعالیٰ کو دیکھو گے جس طرح کہ تم اس چاند کو دیکھتے ہو تو اگر تم سے ہو سکے کہ تم قبل طلوعِ شمس اور قبل غروبِ شمس کی نماز پر مغلوب نہ ہو تو کرو۔[3] (رواہ الشیخان)

صحیحین میں سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دو جنتیں سونے کی ہیں اور ان کے برتن اور جو کچھ اُن میں ہے وہ سب سونے کا ہے اور دو جنتیں چاندی کی ہیں اور ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے وہ سب چاندی کا ہے اور نہیں ہے لوگوں کے اور اللہ عزوجل کی طرف نظر کرنے کے درمیان مگر اس کے منہ پر کبریائی کی چادر ہے جنتِ عدن میں۔[4] نعیمِ جنت کا بیان رسالہ ”هادي القلب السليم إلى درجات جنات النعيم“ میں لکھا گیا ہے۔ یہ رسالہ اردو میں ہے اور رویت کے مسئلے میں امام ابن القیم رحمہ اللہ کا کلام نہایت مفصل و مضبوط دیا گیا ہے۔ سیدنا صہیب رضی اللہ عنہ نے رفعاً کہا: جب اہلِ جنت جنت میں جا چکیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم چاہتے ہو کہ میں تم کو کچھ اور زیادہ دوں۔ وہ کہیں گے: کیا تو نے ہمارے چہرے سفید نہیں کیے؟ کیا ہم کو جنت میں داخل نہیں فرمایا؟ آگ سے نجات نہیں دی؟ تب اللہ تعالیٰ حجاب اٹھا دے گا، ان کو کوئی چیز اپنے رب کی طرف نظر کرنے سے زیادہ محبوب نہ ہو گی۔ یہی

---

[1] صحيح البخاري (٦٩٩٨)
[2] صحيح البخاري (٧٠٠١، ٧٠٠٠) صحيح مسلم (١٨٣، ١٨٢)
[3] صحيح البخاري (٥٢٩) صحيح مسلم (٦٣٣)
[4] صحيح البخاري (٤٥٩٧) صحيح مسلم (١٨٠)

زیادت ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ﴾[1] [يونس: ٢٦] ”جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے لیے خوبی ہے اور مزید برآں بھی۔“

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ مومنین کے لیے تجلی فرمائے گا اور ہنسے گا، یعنی عرصاتِ قیامت میں۔[2] (رواہ مسلم) بالجملہ احادیث میں آ چکا ہے کہ مومنین عرصاتِ قیامت میں اور روضاتِ جنات میں اپنے رب کو دیکھیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں: مقام کے لحاظ سے اہلِ جنت کا ادنیٰ شخص وہ ہوگا جو اپنے ملک وعمل داری میں دو ہزار برس تک کی مسافت کو دیکھے گی۔ وہ اپنی مملکت کے سب سے دور والے حصے کو ویسے ہی دیکھے گا جیسے سب سے قریب والے حصے کو دیکھے گا۔ اور اپنی ازواج اور خدام کی طرف نگاہ کرے گا اور ان میں منزلت کے لحاظ سے افضل وہ شخص ہوگا جو ہر دن دو بار اللہ کا دیدار کرے گا۔[3] (رواه أحمد)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ”اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ہم دیدارِ باری تعالیٰ کے متعلق بہت سی احادیث کتبِ صحاح، حسان، مسانید اور سنن سے یہاں درج کرتے، تاہم ان میں سے بہت سی احادیث کو اس تفسیر کے متفرق مقامات پر درج کرنے کی ہم نے سعادت حاصل کی ہے۔ وباللہ التوفیق. بحمد اللہ زیدارِ الٰہی کے مسئلے پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، سلفِ امت، ائمہ اسلام اور ہادیانِ انام رحمہم اللہ کا اتفاق اور اجماع ہے۔[4] جس شخص نے اس کی تاویل کی تو یہ شخص حق سے دور چلا گیا اور اس نے غلط موقف اختیار کیا۔

امام مجاہد اور ابو صالح رحمہما اللہ تاویل کی طرف گئے ہیں اور کہا ہے کہ ”إلیٰ“ مفرد ہے ”آلاء“ کا، یعنی اپنے رب کی طرف سے ثواب کے منتظر ہوں گے۔ اسی تاویل کو ابن کثیر رحمہ اللہ نے باطل کہا ہے اور فرمایا کہ وہ اس آیت سے کدھر چلے گئے! ﴿ كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴾ [المطففين: ١٥] ”ہرگز نہیں یہ لوگ اس دن اپنے رب سے اوٹ میں رکھے جائیں گے۔“ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: محجوبون نہیں کیا فجار کو مگر یہ بات جان کر کہ ابرار اس کو دیکھیں گے۔ پھر آیتِ کریمہ کے سیاق پر دلیل کے طور پر اخبارِ نبویہ متواتر آئے ہیں۔ وهي قوله: ﴿ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾ امام حسن نے کہا ہے کہ وہ اپنے خالق کو دیکھے گا اور اس کا حق بھی یہی ہے کہ وہ اپنے خالق کو دیکھے۔[5]

نافرمان روزِ قیامت روسیاہ ہوں گے:

اور وہ منہ جو اداس ہوں گے وہ کفار اور فجار کے منہ ہوں گے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ بَاسِرَةٌ ﴾ بہ معنی ”كَالِحَةٌ“، یعنی روسیاہ۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ”عَابِسَةٌ“۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ فَاقِرَةٌ ﴾ سے

---

[1] صحيح مسلم (١٨١) [2] صحيح مسلم (١٩١)
[3] مسند أحمد (١٣/٢) اس کی سند میں ”ثُوَیر بن اَبی فاختہ“ سخت ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ٢٤٣/٢)
[4] تفسير ابن كثير (٥٧٨/٤) [5] تفسير الطبري (٧٢/٢٤)

مراد "وَاهِيَةٌ" ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: مراد شر ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: "هَالِكَةٌ". امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: یعنی گمان کرے گا کہ اب نار میں داخل ہوتا ہے۔[1] یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح: ﴿ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ﴾ [آل عمران: ١٠٦] "جس دن بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض سیاہ۔"

نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ﴿ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴾ [عبس: ٣٨- ٤٢] "اس دن بہت سے چہرے روشن ہوں گے (جو) ہنستے ہوئے اور ہشاش بشاش ہوں گے اور بہت سے چہرے اس دن غبار آلود ہوں گے جن پر سیاہی چڑھی ہوئی ہو گی۔ وہ یہی کافر بدکردار لوگ ہوں گے۔" نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح: ﴿ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ﴿٢﴾ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ﴿٣﴾ تَصْلَىٰ نَارًا حَامِيَةً ﴿٤﴾ تُسْقَىٰ مِنْ عَيْنٍ آنِيَةٍ ﴿٥﴾ لَّيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِن ضَرِيعٍ ﴿٦﴾ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِن جُوعٍ ﴿٧﴾ وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿٨﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿٩﴾ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴾ [الغاشية: ٢- ١٠] "اس دن بہت سے چہرے ذلیل ہوں گے (اور) محنت کرنے والے تھکے ہوئے ہوں گے، وہ دہکتی ہوئی آگ میں جائیں گے اور نہایت گرم چشمے کا پانی ان کو پلایا جائے گا۔ ان کے لیے سوائے کانٹے دار درختوں کے اور کچھ کھانا نہ ہوگا جو نہ موٹا کرے گا نہ بھوک مٹائے گا، بہت سے چہرے اس دن تر و تازہ اور (آسودہ حال) ہوں گے۔ اپنی کوشش پر خوش ہوں گے بلند و بالا جنتوں میں ہوں گے۔" اس طرح کی اور بھی آیات اور سیاقات ہیں۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے: تو اپنی زبان کو تیزی سے نہ ہلا کہ قرآن کے لینے میں اس ڈر سے جلدی کرے کہ کہیں وہ ہاتھ سے جاتا نہ رہے۔ وحی کو تیرے سینے میں جمع کرنا اور تیری زبان سے اس کا پڑھوانا اور اس کے معانی کا بیان کرنا ہمارے ذمے ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی یہ بات ہم پر آئی کہ تجھ پر وحی نازل کریں، قرآنِ عربی اتاریں جس میں لوگوں کے لیے بیان ہو،[3] لیکن ابوجہل وغیرہ کفار دنیا کو دوست رکھنے والے اور آخرت کے تارک ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ان کے لیے اچھی بری دنیا ان کو جلد دے دی گئی ہے اور آخرت ان سے گم ہو گئی ہے۔[4]

نضارت: حسنِ نعمت و عیش و بہجت (رونق، تازگی) کو کہتے ہیں۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا: مفسرین نے کہا ہے کہ نضارتِ وجوہ سے مراد اضارت و اسفار و اشراق ہے،[5] یعنی چہرے چمکتے ہوں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نعمتوں کے ساتھ بہت مسرور ہوں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ سفید نورانی ہوں گے۔ پہلی بات زیادہ بہتر

---

[1] تفسير الطبري (٢٤/٧٤) [2] تفسير ابن كثير (٤/٥٧٧_٥٧٩) [3] فتح القدير (٥/٤٤٩)
[4] الدر المنثور (٨/٣٤٩) [5] فتح القدير (٥/٤٤٩)

ہے۔ اللہ کی طرف بغیر حجاب کے دیکھیں گے۔ جمہور اہلِ علم کا یہی قول ہے کہ اس سے مراد احادیثِ صحیحہ اور متواترہ کے مطابق قیامت کے دن اللہ کا دیدار ہے جس طرح کہ چاند کو دیکھتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ خالق کی طرف نظر کریں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ پروردگار کے چہرے کی طرف نظر کریں گے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اپنے رب کی طرف بلا کیفیت و بلا حدِ محدود و بلا صفتِ معلوم نظر کریں گے۔[1] (رواه ابن مردويه)

کتاب وسنت کی اور اجماعِ صحابہ اور ان کے بعد والوں اور سلفِ امت کے اجماع کی دلیلیں رویت کے ثابت ہونے پر بالکل ظاہر ہیں۔ تقریباً بیس صحابی رضی اللہ عنہم رویت کے رفعا راوی ہیں اور اس بارے میں آیاتِ قرآنی مشہور ہیں اور معتزلہ و خارجیوں اور بعض مرجیہ وغیرہ مبتدع کے اعتراضات کا جواب عقائدِ اہلِ سنت کی کتابوں وغیرہ میں تفصیل سے دیا گیا ہے۔ رویت کے متعلق احادیثِ متواترہ اس قدر ہیں کہ اگر جمع کی جائیں تو ایک مستقل تصنیف بن جائے اور جس نے رویت کی نفی کی ہے وہ کوئی ایسی شے نہیں لایا جس کے ساتھ تمسک کیا جا سکے نہ قران سے نہ سنت سے۔

اس مسئلے کی بحث کتاب "حادي الأرواح إلى بلاد الأفراح" میں بہت خوب لکھی ہے اور امام ربانی قاضی محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ نے رسالہ "بغية في مسائل الرؤية" جمع کیا ہے اور اس میں رویت کو ماننے والوں اور اس کا انکار کرنے والوں کی عقلی اور نقلی دلیلیں لکھی ہیں۔ کتب خانہ غریب خانہ میں یہ سب کتب و رسائل موجود ہیں۔ وللّٰه الحمد.

﴿ بَاسِرَةٌ ﴾ سے مراد "متغيرة" ہیں، یا "مصفرة"۔ یہ کفار کے چہرے ہوں گے کہ زرد پڑ جائیں گے۔

﴿ فَاقِرَةٌ ﴾ سے مراد بہت بڑی آفت ہے جس سے فقارِ ظہر (پیٹھ کے مہرے، گردن کے مہرے) شکستہ ہو جائیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد نار میں[2] داخل ہونا ہے، یا رویت سے حجاب ہے۔ پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ اصل ﴿ فَاقِرَةٌ ﴾ وہ داغ ہے جو اونٹ کی ناک پر لوہا گرم کر کے دیتے ہیں اور وہ ہڈی تک پہنچ جاتا ہے۔[3] (قاله الأصمعي) والله أعلم.

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيْلَ مَنْ ٜ رَاقٍ ﴿٢٧﴾ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ ِالْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿٣١﴾ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٣٢﴾ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ﴿٣٣﴾ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٤﴾ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿٣٥﴾ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ﴿٣٦﴾ اَلَمْ يَكُ

[1] فتح القدير (٤٥١/٥) [2] تفسير الطبري (٧٤/٢٤) [3] فتح البيان (١٤/٤٤٠_٤٤٥)

نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ﴿٣٧﴾ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ﴿٣٨﴾
فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿٣٩﴾ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ
عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿٤٠﴾

ہرگز نہیں! جب (جان) ہنسلی تک آ پہنچے گی (26) اور کہا جائے گا: کون ہے جھاڑ پھونک کرنے والا؟ (27) اور وہ سمجھے گا یہ (وقتِ) فراق ہے (28) اور پنڈلی، پنڈلی سے لپٹ جائے گی (29) اس دن آپ کے رب کی طرف چلنا ہوگا (30) نہ تو اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی (31) بلکہ اس نے (حق کو) جھٹلایا اور منہ موڑا (32) پھر اپنے اہل وعیال کے پاس اکڑتا ہوا گیا (33) تیرے لیے ہلاکت پر ہلاکت ہے (34) پھر تیرے لیے ہلاکت پر ہلاکت ہے (35) کیا انسان سمجھتا ہے کہ اسے یوں ہی بے کار (بلا حساب کتاب) چھوڑ دیا جائے گا؟ (36) کیا وہ منی کا ایک نطفہ نہیں تھا جو (رحم میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ (37) پھر وہ لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے پیدا کیا اور اس کی نوک پلک سنواری (38) پھر اس سے مذکر اور مونث کا جوڑا بنایا (39) کیا وہ (اللہ) اس بات پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے؟ (40)

موت کے وقت یقین ہو جاتا ہے مگر بے سود:

اللہ پاک نے اس آیتِ شریف میں موت کا وقت آنے اور اس کی ہولناکیوں کی خبر دی ہے۔ ثَبَّتَنَا اللّٰهُ هُنَالِكَ بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ. ﴿ كَلَّا ﴾ اس جگہ اگر ڈر اور خوف کے لیے ہے تو یہ معنی ہوئے کہ اے ابن آدم! تو اس وقت اس خبر کی تکذیب نہ کرے گا اور یہ بات تجھ پر عیاں ہو جائے گی۔ اور اگر ﴿ كَلَّا ﴾ بہ معنی "حقًّا" ہے تو ظاہر ہے کہ سچ مچ اس وقت تیری روح تیرے بدن سے کھینچی جائے گی اور ترقوہ تک پہنچے گی۔ ترقوہ وہ ہڈیاں ہیں جو کندھوں اور گردن کے درمیان ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿٨٣﴾ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿٨٥﴾ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿٨٦﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [الواقعة: ٨٣- ٨٧] "پس جب کہ روح نرخرے تک پہنچ جائے اور تم اس وقت آنکھوں سے دیکھتے رہو۔ ہم اس شخص سے بہ نسبت تمھارے بہت زیادہ قریب ہوتے ہیں لیکن تم نہیں دیکھ سکتے۔ پس اگر تم کسی کے زیرِ فرمان نہیں اور اس قول میں سچے ہو تو (ذرا) اس روح کو تو لوٹاؤ۔" چنانچہ یہ ترقوہ حلقوم سے نزدیک ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "راقي" منتر کرنے والا ہے یہی ابو قلابہ کا قول ہے۔ یا "راقي" سے مراد طبیبِ شافی ہے۔ امام قتادہ وضحاک وابن زید رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ کون لے چڑھے گا

اس کی روح کو، رحمت کے فرشتے یا عذاب کے فرشتے؟۔ اس صورت میں یہ کلام ملائکہ کا ٹھہرے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ پنڈلی کا پنڈلی سے لپٹنا دنیا و آخرت سے عبارت ہے، یعنی اس وقت یہ دونوں ملتے ہیں۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ دنیا کے دنوں میں سے آخری دن ہے اور ایامِ آخرت میں سے پہلا دن ہے۔ دو سختیاں باہم ملتی ہیں۔ إلا من رحمه الله تعالیٰ۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد امر عظیم کا امرِ عظیم کے ساتھ ملنا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بلا کا بلا سے ملنا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تیری دونوں پنڈلیاں ہیں جو لپٹ جاتی ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں پاؤں مر جاتے ہیں اٹھتے نہیں، حالاں کہ پہلے ان پر جولانی کرتا تھا۔ امام ابو مالک رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفن میں دونوں پنڈلیوں کا ایک دوسرے کو لپٹ جانا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دو امور کا اکٹھا ہونا: ایک لوگوں کا جسم کی تجہیز و تکفین کرنا اور دوسرے فرشتوں کا روح کی تجہیز کرنا۔[1]

"مساق" سے مراد مرجع و مآب ہے، کیوں کہ روح آسمانوں کی طرف اٹھا لی جاتی ہے۔ اللہ پاک فرماتا ہے: لوٹا دو میرے بندے کو زمین کی طرف کہ میں نے ان کو اسی زمین سے پیدا کیا ہے اور اسی میں ان کو لوٹاؤں گا اور پھر اسی سے ان کو دوبارہ نکالوں گا۔ یہ مضمون سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے مروی طویل حدیث میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ۝٦١ ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ﴾ [الأنعام: ٦١- ٦٢] "اور وہی اپنے بندوں کے اوپر غالب ہے برتر ہے اور تم پر نگہداشت رکھنے والے بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچتی ہے، اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے قبض کر لیتے ہیں اور وہ ذرا کوتاہی نہیں کرتے۔ پھر سب اپنے مالکِ حقیقی کے پاس لائے جائیں گے۔ خوب سن لو فیصلہ اللہ ہی کا ہوگا اور وہ جلد حساب لے گا۔"

جھٹلانے والوں کا حال:

پھر اللہ نے تصدیق نہ کرنے اور صلات ادا نہ کرنے کا ذکر کیا۔ یہ کافر کے حال کی خبر دی ہے جو دنیا میں حق کو دل سے جھٹلاتا تھا اور عمل کرنے سے پیٹھ پھیرتا تھا تو اس میں ظاہری طور پر اور باطنی طور پر کسی طرح کی خیر نہیں ہے۔ ﴿يَتَمَطّٰى﴾ سے مراد یہ ہے کہ جذلان، شریر، اترانے والا، سست، کاہل، بے ہمت و بے عمل تھا۔ اتراتا ہوا اکڑتا ہوا اپنے آپ کو کھینچتا ہوا اپنے گھر والوں کے پاس آتا تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ﴾ [المطففین: ٣١] "اور جب اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتے تو دل لگیاں کرتے تھے۔" نیز فرمایا: ﴿اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝١٣ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۝١٤ بَلٰٓى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا﴾ [الانشقاق: ١٣- ١٥] "یہ

[1] تفسير الطبري (٢٤/٧٥_٨٠) تفسير ابن كثير (٥٧٩/٤)

شخص اپنے متعلقین میں (دنیا میں) خوش تھا، اس کا خیال تھا کہ اللہ کی طرف لوٹ کر ہی نہ جائے گا۔ کیوں نہیں، حالاں کہ اس کا رب اسے بخوبی دیکھ رہا تھا۔“

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ يَتَمَطّٰى ﴾ بہ معنی ”يَخْتَالُ“ ہے،[1] یعنی اتراتا چلا۔ امام قتادہ اور زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ناز سے چلا۔[2] اللہ نے ملامت کی اور وعید فرمائی اور مکرر ارشاد کیا کہ اے اترانے والے کافر! تجھ کو خرابی پر خرابی ہے۔ چار دفعہ ”ویل“ کا لفظ کہا، یہ خرابی چار گنا ہوئی۔ عیاذاً باللّٰہ۔ یعنی تجھ کو اسی طرح کی چال چلنا چاہیے، کیوں کہ تو اپنے خالق باری تعالیٰ کا کافر اور منکر ہے۔ ایسی بات بر سبیلِ ملامت اور مذاق کہی جاتی ہے جس طرح فرمایا: ﴿ ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴾ [الدخان: ٤٩] ”چکھتا جا! تو تو بڑا ذی عزت اور بڑے اکرام والا تھا۔“ نیز جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴾ [المرسلٰت: ٤٦] ”(اے جھٹلانے والو! تم دنیا میں) تھوڑا سا کھالو اور فائدہ اٹھالو بے شک تم گناہ گار ہو۔“ نیز جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ ﴾ [الزمر: ١٥] ”تم اس کے سوا جس کی چاہو عبادت کرتے رہو۔“ نیز جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ﴾ [حم السجدة: ٤٠] ”تم جو چاہے کرتے چلے جاؤ۔“ اور اسی طرح کی اور آیات ہیں۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلمہ ﴿ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوجہل سے فرمایا، پھر قرآن میں اترا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وعید کے بعد وعید ہے جس طرح کہ تم سنتے اور زعم کرتے ہو۔ ابوجہل نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے پکڑ کر کھینچا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ اَوْلٰى لَكَ ﴾ وہ بولا کہ محمد تم مجھے وعید سناتے ہو، واللہ! تم اور تمھارا رب میرا کچھ نہیں کر سکتے اور میں ان لوگوں میں سے جو مکہ کے ان دو پہاڑوں کے درمیان چلتے پھرتے ہیں، سب سے زیادہ عزت والا ہوں۔[3]

انسان کو بے کار نہیں چھوڑا جائے گا:

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سُدًى ﴾ سے مراد یہ ہے کہ مبعوث نہ ہوگا۔ امام مجاہد، شافعی اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا: یعنی مامور بہ و منہی عنہ نہ ہوگا۔[4] اس جگہ قیامت کا ثابت کرنا مقصود ہے اور انکار کرنے والوں کی کجی، جہالت اور عناد کا رد کرنا مقصود ہے، لہٰذا دوبارہ پیدا کرنے پر ابتدائی پیدائش سے استدلال کیا اور کہا کہ کیا انسان ایک ضعیف اور ذلیل پانی کا نطفہ نہ تھا جو صلب سے رحم میں پڑتا ہے، پھر علقہ (خون کی پھٹکی) ہوا، پھر مضغہ (گوشت کا لوتھڑا) بنا، پھر شکل پکڑی، پھر اس میں جان پھونکی گئی، پھر ایک اور ہی پیدائش میں صحیح سالم اعضاء کے ساتھ نر یا مادہ ہوگیا۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٨٩)
[2] تفسير الطبري (٨١/٢٤)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٨٩/١٠)
[4] تفسير ابن كثير (٥٨٠/٤)

اللہ کے اذن اور تقدیر سے۔ چنانچہ جس نے اس ہموار مخلوق کو پانی کی ایک کمزور سی بوند سے بنایا ہے، کیا وہ پھر اس کو پہلی بار کی طرح دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا؟!

یہ قدرت دوبارہ پیدا کرنے کی دو حالت کو لیتی ہے یا تو اسی پہلی باری کی طرح پھر بنائے، یا پہلی دفعہ پیدا کرنے کے برابر بنائے۔ یہ دو قول ہیں اس آیت میں: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ﴾ [الروم: ٢٧] ''وہی ہے جو پہلی بار مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ تو اس پر بہت ہی آسان ہے۔'' لیکن پہلی بات زیادہ مشہور ہے جس طرح کہ سورۃ الروم میں گزر چکا ہے۔ (واللّٰه أعلم)۔

سورت قیامہ کے اختتام پر کیا پڑھا جائے:

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی روایت میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اس آیت پر ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ فَبَلٰى'' کہتے تھے۔[1] (و رواه أبو داود عن صحابي ولم يسم ولا يضر ذلك)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے کہ جو کوئی تم میں سورۃ التین پڑھے اور آخر تک پہنچے، یعنی ﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ﴾ تک تو وہ کہے: ''بَلٰى وَنَحْنُ عَلَى ذَٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ'' اور جو کوئی سورت ﴿ لَاۤ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴾ پڑھے اور آخر تک پہنچے، یعنی ﴿ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴾ تک تو وہ ''بَلٰى'' کہے اور جو کوئی ﴿ وَالْمُرْسَلٰتِ ﴾ پڑھے اور ﴿ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴾ تک پہنچے وہ ''آمَنَّا بِاللّٰهِ'' کہے۔[2] (رواه أبو داود وأحمد والترمذي)۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب اس آیت کو پڑھتے، یعنی ﴿ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴾ تو فرماتے: ''سُبْحَانَكَ وَبَلٰى''[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا اس جگہ بیان یہ ہے کہ حرف ﴿ كَلَّا ﴾ زجر ہے، یعنی کافر کا قیامت کے دن پر ایمان لانا بعید ہے۔ پھر کہا کہ موت کے آ جانے پر جب نفس یا روح، وہ مومن کی ہو یا کافر کی، تراقی تک پہنچتی ہے۔ یعنی گلے کی ہڈیوں تک۔ ہر انسان کی دو ترقوہ ہوتی ہیں یہ موت کے وقت کی حالت ہے۔ یا ﴿ كَلَّا ﴾ بہ معنی ''حقًّا'' ہے۔ اس ذکر سے مقصود نزول موت کے وقت شدت حال کا یاد دلانا ہے۔ درید بن الصمہ نے کہا ہے:

وَرُبَّ كَرِيْهَةٍ دَافَعْتُ عَنْهَا وَقَدْ بَلَغَتْ نُفُوْسُهُمُ التَّرَاقِيَ[5]

---

[1] سنن أبي داود (٨٨٤) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٨٩/١٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (صحيح أبي داود: ٤٠/٤)

[2] سنن أبي داود (٨٨٧) مسند أحمد (٢٤٩/٢) سنن الترمذي (٣٣٤٧) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٥٧٨٤)

[3] تفسير الطبري (٨٤/٢٤) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٨٨/١٠) [5] تفسير القرطبي (١١١/١٩)

راقی سے مراد صاحبِ رقیہ ہے، یعنی اب اس وقت کون ہے جو جھاڑ پھونک کرے اور تعویذ گنڈا بنائے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے لیے طبیبوں کو تلاش کیا، کسی طبیب نے بھی اس کو اللہ کی قضا سے نہ بچایا۔ یہی قول ابو قلابہ کا ہے۔[1] شاعر نے کہا:

هَلْ لِلْفَتٰی مِنْ بَنَاتِ الْمَوْتِ مِنْ وَاقِ أَمْ هَلْ لَهٗ مِنْ حُمَامِ الْمَوْتِ مِنْ رَاقِ

اس جگہ یقین کے بجائے ظن فرمایا، کیوں کہ انسان کی روح جب تک بدن سے متعلق رہتی ہے تب تک اس کو زندگی کی محبت کی شدت کی وجہ سے حیات کی طمع ہوتی ہے اور یہ امید ٹوٹتی نہیں۔ بالجملہ موت کے آنے پر دنیا اور اہل ومال و اولاد کی جدائی کا یقین ہو جاتا ہے اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جاتی ہے۔ جمہور مفسرین نے کہا: یعنی لگاتار سختیاں ہوتی ہیں۔ یا ساقِ اول سے مراد نفس کے خارج ہونے کے وقت روح کو عذاب دینا ہے اور ساقِ دوم سے مراد دوبارہ جی اٹھنے اور اس کے بعد کی حالت ہے، یہ حالت شدتِ کرب سے ہوتی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: تو نے نہیں دیکھا کہ جب مرنے لگتا ہے تو ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر مارتا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلا قول احسن ہے۔[2]

"مساق" سے یہ مراد ہے کہ پھر اللہ کی طرف ہانکا جاتا ہے۔ "وَإِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى" اس کہنے میں کہ نہ یقین لایا اور نہ نماز پڑھی، ترکِ عقائد وفروع پر مذمت ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہ کتاب اللہ کی تصدیق کی اور نہ اللہ کے لیے نماز پڑھی۔[3] بعض نے کہا ہے کہ نہ دل سے ایمان لایا اور نہ بدن سے عمل کیا، بلکہ رسول کو جھٹلایا اور طاعت سے منہ موڑا اور اپنے اہل کے پاس اتراتا ہوا اور اکڑتا ہوا نازنخرے سے چلا۔ اس جگہ حرف ﴿ ثُمَّ ﴾ استبعاد کے لیے ہے، اس لیے کہ جس سے ایسا کام ہو اس کو ڈرنا چاہیے کہ اس پر اللہ کا غضب نہ ٹوٹ پڑے۔ لفظ ﴿ أَوْلٰى ﴾ کا استعمال بد دعا میں ہوتا ہے، یا بہ معنی "ویل" ہے، یا وہ اس عذاب کے ساتھ اولیٰ تر ہے یہ قول محی السنۃ کا ہے۔

امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلامِ عرب میں ﴿ أَوْلٰى ﴾ کا معنی ہلاکت کے قریب ہونا ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گویا یہ فرمایا کہ تو ہلاکت کے قریب ہوا اور بربادی کے نزدیک۔ ثعلب نے کہا ہے کہ کسی نے اصمعی رحمہ اللہ کے قول سے زیادہ صحیح اور اچھا قول ﴿ أَوْلٰى ﴾ کے بارے میں نہیں کہا۔ امام سدی رحمہ اللہ کے معنی میں مہمل و بے کار ہونا اور بغیر امر ونہی کے رہنا،[4] یعنی انسان کو یہ گمان ہے کہ وہ دنیا میں محاسب و معاقب و مکلف (حساب کیا گیا، تعاقب کیا گیا اور احکام کا مکلف) اور آخرت میں مبعوث اور مجازی (جزا دیا ہوا) نہ ہوگا۔ کیا وہ ایک پانی کی بوند نہ تھا کہ وہ ایک بے حقیقت شے سے بنا ہے جو نجاست نکلنے والی جگہ سے خارج ہوتی ہے۔

از شکم تا بکنار آمدہ از رہ بول دوبار آمدہ

"پیٹ سے کنارے تک (عورت کی فرج) تو آ گیا ہے اور پیشاب کے راہ سے دوبار گزرا ہے۔"

---

(1) تفسیر الطبري (٢٤/٧٥) (2) تفسیر القرطبي (١٩/١١٢) (3) تفسیر الطبري (٢٤/٨١) (4) فتح القدیر (٥/٤٥٣، ٤٥٤)

پھر نطفہ کے بعد علقہ ہو گیا، یعنی ایک سرخ خون، پھر اللہ پاک نے اس کا اندازہ کیا کہ اس خون کو لوتھڑا کر دیا، پھر باقی پیدائش پوری کی، روح پھونک کر آدمی بنا دیا، پھر اس میں دو قسمیں بنائیں: ایک نر اور ایک مادہ۔ چنانچہ جس کی شان یہ ہو وہ مردوں کو زندہ نہیں کر سکتا، بلکہ یہ دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے بہ نسبت پہلی دفعہ پیدا کرنے کے زیادہ سہل اور آسان ہے۔[1]

نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

''نقاش دوسری تصویر پہلی سے بہتر بناتا ہے۔''

---

[1] فتح البیان (١٤/٤٤٥۔٤٥٠)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الدَّهْرِ

اس کو سورت "هل أتی"، سورت "أمشاج" اور سورۃ "الدهر" بھی کہتے ہیں۔ اس کی اکتیس (۳۱) آیتیں ہیں۔ جمہور نے کہا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے۔ امام مقاتل اور کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکی ہے۔[1] امام بیضاوی اور زمخشری رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔[2] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکی ہے یا مدنی ہے اور جزم نہیں کیا۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مکہ میں اتری ہے۔ سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔[4] بعض نے کہا ہے کہ ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ﴾ سے لے کر آخر تک مکی ہے اور اس سے پہلے مدنی ہے۔ امام حسن اور عکرمہ رحمہ اللہ مدنی ہی بتاتے ہیں سوائے اس ایک آیت کے ﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴾[5]

حکایت:

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حبشہ سے ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: تو سوال کر اور سمجھ لے۔ اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! تم کو ہم پر رنگ اور صورت اور نبوت میں فضیلت ہے، اگر میں ایمان لاؤں جس پر تم ایمان لائے ہو اور عمل کروں جیسا تم عمل کرتے ہو تو کیا میں تمھارے ساتھ جنت میں ہوں گا؟ فرمایا: ہاں قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جنت میں سیاہ مرد کی سفیدی ایک ہزار سال کی راہ سے دکھائی دے گی۔ پھر فرمایا کہ جس نے "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کہا اس کے لیے اللہ کے پاس عہد ہے اور جس نے "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ" کہا اس کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار نیکیاں لکھی گئیں اور یہ سورت تا ﴿ مُلْكًا كَبِيْرًا ﴾ نازل ہوئی۔ حبشی نے کہا کہ میری آنکھ وہ دیکھے گی جو جنت میں تمھاری آنکھیں دیکھیں گی؟ فرمایا: ہاں، وہ اتنا رویا کہ دم نکل گیا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ اپنے ہاتھ سے اس کو قبر میں اتارتے ہیں۔[6] (أخرجه الطبراني و ابن مردويه و ابن عساكر)

محمد بن مطرف رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک ثقہ نے کہا کہ ایک سیاہ مرد نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تسبیح و تہلیل کا

---

[1] تفسير القرطبي (۱۱۸/۱۹) [2] تفسير البيضاوي (۴۲۵/۵) [3] تفسير الجلالين ۷۸۱/۱)
[4] الدر المنثور (۳۶۵/۸) [5] تفيسر البغوي (۲۸۹/۸)
[6] المعجم الكبير (۴۳۶/۱۲) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه أيوب بن عتبة وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ۷۷۷/۱۰)

سوال کیا، عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: تو نے نبی اکرم ﷺ سے بہت سے سوال کر لیے، بس کر۔ آپ ﷺ نے فرمایا: رہو اے عمر! اور یہ سورت نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی، جب آپ جنت کے ذکر پر آئے اور اس سیاہ مرد نے ایک ایسی آہ کی کہ اس کی جان نکل گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَاتَ شَوْقًا إِلَى الْجَنَّةِ» [1] (رواه أحمد في الزهد وأخرج نحوه ابن وهب عن ابن زيد مرفوعا ومرسلا) ''یہ جنت کے شوق میں فوت ہو گیا۔'' ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں نبی اکرم ﷺ نے ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ آخر تک پڑھا۔ پھر فرمایا: «إِنِّي أَرَى مَا لَا تَرَوْنَ وَأَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُوْنَ أَطَّتِ السَّمَاءُ وَحُقَّ لَهَا أَنْ تَئِطَّ مَا فِيْهَا مَوْضِعُ أَرْبَعِ أَصَابِعَ إِلَّا وَمَلَكٌ وَاضِعٌ جَبْهَتَهُ سَاجِدًا لِلّٰهِ وَاللّٰهِ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا وَّلَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا وَمَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَآءِ عَلَى الْفُرُشِ وَلَخَرَجْتُمْ إِلَى الصُّعُدَاتِ تَجْأَرُوْنَ إِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ» [2] (رواه أحمد و الترمذي وحسنه و ابن أبي حاتم) اس حدیث کا ترجمہ اس سے قبل گزر چکا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں صحیح مسلم میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جمعے کے دن صبح کی نماز میں سورۃ السجدہ اور ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ پڑھتے تھے۔ [3] عبداللہ بن وہب کہتے ہیں: مجھ کو ابن زید نے خبر دی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ سورت پڑھی جس وقت آپ ﷺ پر نازل ہوئی، آپ ﷺ کے پاس ایک کالا مرد بیٹھا تھا۔ جب آپ جنان کی صفت تک پہنچے، اس نے ایک آہ بھری اور اس کا دم نکل گیا، فرمایا: تمھارے اس صاحب اور بھائی کی جنت کے شوق میں روح قبض ہو گئی۔ [4] (وهذا مرسل غريب)

مشاق دیدنیم شنیدن ز حد گذشت ۔ تا کے بہ چشم غیر تماشا کند کسے

''ہم تو دیکھنے کا شوق رکھتے ہیں سننا تو حد سے گزر گیا ہے آخر کب تک دوسرے کی آنکھ سے کوئی دیکھا کرے گا۔''

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ﴿۱﴾ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۲﴾ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿۳﴾

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

یقیناً (ہر) انسان پر زمانے سے ایک ایسا وقت گزر چکا ہے جب وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھا ①

---

① الدر المنثور (۳۶۶/۸)

② مسند أحمد (۱۷۳/۵) سنن الترمذي (۲۳۱۲) مستدرك الحاكم (۵۵۴/۲) السلسلة الصحيحة (۱۷۲۲)

③ صحيح مسلم (۸۷۹) ④ تفسیر ابن کثیر (۵۸۲،۵۸۱/۴) بہ روایت مرسل

بے شک ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا، ہم اسے آزمانا چاہتے ہیں، چناں چہ ہم نے اس کو سننے، دیکھنے والا بنا دیا② بے شک ہم نے اسے راستے کی ہدایت دی، خواہ شکر گزار بنے یا ناشکرا③

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عدم سے وجود بخشا:

اللہ تعالیٰ انسان کے حال کی خبر دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو، اس کے بعد کہ وہ حقارت اور ضعف کے سبب سے کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھی، ایجاد کیا اور ایک لچھے سے بنایا۔ ”مشج و مشیج“ ملی جلی شے کو کہتے ہیں جس کا کچھ حصہ دوسرے حصے سے مختلط ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد مرد کا پانی اور عورت کا پانی ہے جب وہ اکٹھے ہو کر مختلط ہو جائیں، پھر وہ ایک طور سے دوسرے طور کی طرف اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف اور ایک کیفیت سے دوسری کیفیت کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ یہی قول امام مجاہد، حسن اور ربیع بن انس رحمہم اللہ کا ہے۔ ﴿ اَمْشَاجٍ ﴾ کہتے ہیں آدمی کے پانی کے عورت کے پانی کے ساتھ مل جانے کو۔[1] ابتلاء سے مراد اختیار ہے، جیسا کہ اللہ جل جلالہ کا فرمان ہے: ﴿ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴾ [الملك: ٢] ”تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے اچھے کام کون کرتا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیے ہیں:

پھر اللہ تعالیٰ نے کان اور آنکھ بنائے، تاکہ طاعت اور معصیت پر متمکن ہو سکے راہ کو روشن واضح کر دیا جس طرح کہ اللہ جل جلالہ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى ﴾ [حم السجدة: ١٧] ”رہے ثمود، سو ہم نے ان کی بھی رہبری کی پھر بھی انھوں نے ہدایت پر اندھے پن کو ترجیح دی۔“ اور جس طرح اللہ عزوجل کا فرمان ہے: ﴿ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴾ [البلد: ١٠] ”ہم نے دکھا دیے اس کو دونوں راستے۔“ یعنی ہم نے اس کے لیے خیر کا اور شر کا طریق واضح کر دیا۔ یہی قول امام عکرمہ، عطیہ، ابن زید اور مجاہد رحمہم اللہ کا مشہور روایت کے طابق اور جمہور کا قول ہے۔ امام مجاہد، ابو صالح، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ ہدایتِ سبیل سے مراد رحم سے نکلنا ہے۔[2] یہ قول غریب ہے اور صحیح اور مشہور وہی قولِ اول ہے۔ اب وہ اس ہدایت اور سبیل کے بعد یا تو شقی (بدبخت) ہے یا سعید (نیک بخت)۔

سیدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ سب لوگ صبح کرتے ہیں اور اپنے نفس کو بیچتے ہیں، یا تو اس کو ہلاک کرتے ہیں یا آزاد کرتے ہیں۔[3] (رواہ مسلم) سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اللہ تجھ کو امارتِ سفہاء سے پناہ دے، کہا: امارتِ سفہاء کیا ہے؟ فرمایا: امراء ہیں جو میرے بعد ہوں گے نہ میری ہدایت پر چلیں گے اور نہ میری سنت پر عمل کریں گے، جو کوئی ان کے کذب کی تصدیق

① تفسیر الطبري (٢٤/٨٩، ٩٠) ② تفسیر ابن کثیر (٤/٥٨٢) ③ صحیح مسلم (٢٢٣)

کرے گا اور اُن کے ظلم کا مددگار ہوگا وہ نہ مجھ سے ہیں اور نہ میں ان سے ہوں اور نہ وہ میرے حوض پر آئیں گے اور جس نے ان کے جھوٹ کو سچا نہ کہا اور ان کے ظلم پر اعانت نہ کی وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں اور وہ میرے حوض پر آئیں گے۔ اے کعب بن عجرہ! روزہ سپر (ڈھال) ہے، یعنی دوزخ کی آگ سے اور صدقہ بجھا دیتا ہے خطا کو اور نماز قربان، یعنی تقرب من اللہ کی برہان ہے۔ اے کعب بن عجرہ! جنت میں وہ گوشت داخل نہ ہوگا جو حرام سے اُگا ہے، اس کے لیے آگ زیادہ لائق ہے۔ اے کعب! لوگ دو طرح پر صبح کرتے ہیں، کوئی اپنے نفس کو خرید کر آزاد کرتا ہے اور کوئی فروخت کر کے ہلاک کر دیتا ہے۔[1] (رواہ أحمد)

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُّوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ حَتّٰى يُعْرِبَ عَنْهُ لِسَانُهٗ فَإِمَّا شَاكِرًا وَّإِمَّا كَفُوْرًا»[2] ”ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کی زبان صاف ہو جائے تو وہ یا شکر گزار بنے یا ناشکرا۔“ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے: نہیں باہر نکلتا کوئی نکلنے والا لیکن اس کے دروازے پر دو نشان ہوتے ہیں، یعنی جھنڈے ہوتے ہیں: ایک نشان فرشتے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور دوسرا نشان شیطان کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اگر وہ ایسے کام کے لیے نکلا ہے جس کو اللہ دوست رکھتا ہے تو فرشتہ اپنا نشان لے کر اس کے پیچھے ہوتا ہے، وہ اپنے گھر واپس آنے تک اس فرشتے کے جھنڈے کے نیچے رہتا ہے اور اگر وہ ایسے کام کے لیے نکلا ہے جس سے اللہ ناراض ہو تو شیطان اپنا جھنڈا لے کر اس کے ساتھ ہوتا ہے، وہ گھر واپس آنے تک اس جھنڈے کے نیچے ہوتا ہے۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿ هَلْ ﴾ کا لفظ اس جگہ ”قَدْ“ کے معنی میں ہے نہ کہ استفہام کے لیے۔ انسان سے اس جگہ مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ یہی قول امام قتادہ، ثوری، عکرمہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے[4] اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہر انسان ہے۔[5] ﴿ حِيْنٌ ﴾ سے مراد زمانے کا ایک محدود حصہ ہے، اس لیے کہ جمہور کے نزدیک دہر کا اطلاق پوری دنیا کی مدت پر آتا ہے اور ہر طویل غیر معین زمانے پر آتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام روح پھونکے جانے سے پہلے چالیس سال تک مکہ و طائف کے درمیان پڑے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ چالیس سال تک ”حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ“ (کھکھناتی مٹی) رہے، پھر چالیس سال تک ”صَلْصَالٍ“ (کالی اور سڑی ہوئی مٹی) رہے۔ غرض یہ کہ ایک سو بیس سال میں جا کر ان کی پیدائش مکمل ہوئی، پھر روح پھونکی گئی۔ کسی نے کہا ہے کہ اس وقت کی مقدار معلوم نہیں ہے۔ امام فراء، قطرب اور ثعلب رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ وہ تراب اور طین (مٹی) سے تیار کیا ہوا ایک جسم

---

[1] مسند أحمد (٣٢١/٣) صحيح الترغيب والترهيب (٢٦٨/٢) [2] مسند أحمد (٣٥٣/٣) [3] مسند أحمد (٣٢٣٢)
[4] تفسير القرطبي (١١٩/١٩) [5] الدر المنثور (٣٦٧/٨)

تھا۔ ان کا ذکر نہ آسمان میں تھا اور نہ زمین میں اور نہ کوئی جانتا تھا کہ ان کا نام ونشان کیا ہے اور ان سے کیا مراد اور مقصود ہے۔ جب روح پھونکی گئی تو ان کا ذکر کیا گیا۔

یحییٰ بن سلام رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خلق میں کوئی مذکور شے نہ تھی، اللہ کے نزدیک شے مذکور تھی۔[1] بعض نے کہا ہے کہ ذکر سے اس جگہ مراد اخبار نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ کا اخبار (خبر رکھنا) کائنات سے قدیم ہے۔ بلکہ اس جگہ ذکر خطر (خیال) اور شرف کے معنی میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ﴾ [الزخرف: ٤٤] ''اور یقیناً یہ (خود) آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے نصیحت ہے۔'' امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خلق کے لیے مذکور نہیں، اگرچہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے مذکور ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انسان شے تو تھا لیکن مذکور نہ تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ بہت سے زمانے گزر گئے، آدم کوئی شے مخلوق اور مذکور نہ تھے۔ خلق میں کوئی ان کو جانتا پہچانتا نہ تھا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلام میں تقدیم وتاخیر ہے، یعنی کیا انسان پر زمانے میں کوئی ایسا وقت آیا ہے کہ وہ کوئی شے مذکور نہ تھا، اس لیے کہ اس کی پیدائش جملہ حیوانات کی پیدائش کے بعد ہوئی، اس کے بعد پھر کوئی اور حیوان مخلوق نہ ہوا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو یہ آیت پڑھتے سنا: ﴿ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ﴾ تو کہا: ''لَيْتَهَا تَمَّتْ'' یعنی کاش اپنی اسی حالت پر باقی رہتا کہ اس کا ذکر نہ ہوتا۔ ابوبکر اور ابو مسعود رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ انسان سے جنسِ انسان مراد ہے۔ اس دلیل سے: ﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ ﴾ گویا اس جگہ انسان سے بنی آدم مراد ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔[2]

﴿ نُّطْفَةٍ ﴾ بوند کے ٹپکنے کو کہتے ہیں۔ مراد منی ہے، یعنی ہم نے انسان کو ایک مادۂ حقیر ویسیر سے پیدا کیا۔ ﴿ نُّطْفَةٍ ﴾ نر و مادہ دونوں کے پانی کو کہتے ہیں۔ نیز صاف پانی کو کہتے ہیں، وہ زیادہ ہو یا تھوڑا۔ ﴿ اَمْشَاجٍ ﴾ بہ معنی اختلاط ہے۔ جمع کو مفرد کی صفت ٹھہرایا، اس لیے کہ یہ مفرد جمع کے معنی میں ہے یا ہر جزو نطفہ کا نطفہ کہلاتا ہے۔ ''ممشوج'' بہ معنی مخلوط ہے۔ اس جگہ نطفہ کا خون سے اختلاط ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ اَمْشَاجٍ ﴾ سرخی ہے سفیدی میں، یا سفیدی ہے سرخی ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی قول کو اکثر اہلِ لغت نے اختیار کیا ہے،[3] کیوں کہ مرد کا پانی سفید گاڑھا ہوتا ہے اور عورت کا پانی زرد پتلا ہوتا ہے، دونوں پانیوں سے مل کر بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ہڈی اور پٹھے مرد کے نطفے سے بنتے ہیں اور گوشت اور خون اور بال عورت کے پانی سے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی عورت کسی عورت سے زنا کرے اور رحم میں دونوں پانی جمع ہو جائیں تو بچہ بغیر ہڈی کے پیدا ہوگا۔

سلطان غیاث الدین کے زمانے میں ایک دفعہ اسی طرح ہوا تھا، بادشاہ کو معلوم نہ ہوا۔ طبیبوں اور علماء کو جمع

---

[1] تفسير القرطبي (١١٩/١٩) [2] تفسير القرطبي (١١٩/١٩، ١٢٠) [3] تفسير القرطبي (١٢٠/١٩)

کیا، کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ علمائے ظفر آباد سے پوچھا، محمد بن الحاج نے کہا کہ یہ بچہ دو عورتوں کے پانی سے پیدا ہوا ہے، سلطان نے جستجو کی معلوم ہوا کہ اسی طرح پر پیدا ہوا تھا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ﴿ اَمْشَاجٍ ﴾ سے مراد عروق (رگیں) ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مرد اور عورت کے پانی کا ملنا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مرد کا نطفہ سفید و سرخ ہوتا ہے اور عورت کا نطفہ سبز و سرخ۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ﴿ اَمْشَاجٍ ﴾ وہ چیز ہے جو پیشاب کے بعد نکلتی ہے تاروں کے ٹکڑوں کی طرح، اسی سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔[1]

ابتلاء سے مراد انسان کا امتحان ہے، خیر و شر و تکالیف سے، اس کے سمیع اور بصیر ہونے کے بعد۔ یعنی ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقلی ہے، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ سمع و بصر سے یہی دو حواس مراد ہیں جو معروف ہیں، ان کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ یہ حواس میں سے اعظم اور اشرف ہیں۔ خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے انسان کو عظیم السمع و البصر والبصیرۃ بنایا ہے، تاکہ بصر سے دلائل کا مشاہدہ کرے اور سمع کو پہلے اس لیے رکھا کہ زبانی بیان کی جانے والی باتوں سے سماعت ہی کے ذریعے سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جاتا ہے اور سنی جانے والی آیات سے نظر آنے والی آیات زیادہ روشن ہوتی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ سمع سے مراد اطاعت ہے جیسا کہ ان کا قول ہے: "سَمْعًا وَّطَاعَةً" اور بصیر سے مراد عالم ہے۔ "يُقَالُ: لِفُلَانٍ بَصَرٌ فِي هٰذَا الْأَمْرِ" لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔

سبیل سے مراد طریقِ ہدایت و ضلالت ہے، یعنی ہم نے اس کے لیے خیر و شر کی راہ سمع و عقل سے کھول دی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی بدبختی اور نیک بختی کی راہ بتا دی،[2] یا ان کے فائدہ اور نقصان کی چیزیں سمجھا دیں، وہ اپنے کمال عقل سے اس طرف کا راستہ اختیار کر سکتا ہے اور چونکہ شکر کی صفت والے لوگ تھوڑے ہوتے ہیں، اس لیے ان کے لیے ﴿ شَاكِرًا ﴾ کہا ہے اور کفر کی صفت رکھنے والے لوگ بہت ہوتے ہیں اس لیے ان کے لیے صیغۂ مبالغہ ﴿ كَفُوْرًا ﴾ استعمال کیا۔ یا یہ معنی ہیں کہ اگر ہم اس کو شاکر پیدا کرتے ہیں تو وہ شکور ہوتا ہے اور اگر کافر پیدا کرتے ہیں تو کفور ہوتا ہے۔[3]

اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِيْرًا ۝۴ اِنَّ الْاَبْرَارَ
يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝۵ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا
عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۝۶ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ يَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ
شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا ۝۷ وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا
وَّ اَسِيْرًا ۝۸ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ۝۹ اِنَّا
نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝۱۰ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ
الْيَوْمِ وَ لَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا ۝۱۱ وَ جَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا ۝۱۲

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳۹۰/۱۰) فتح القدير (۴۶۲/۵) [2] تفسير الطبري (۹۲/۲۴) [3] فتح البيان (۱۴/۴۵۵۔۴۵۸)

بلاشبہ ہم نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے④ بے شک نیک لوگ ایسے جام سے پئیں گے، جس میں کافور کی ملاوٹ ہوگی⑤ (وہ) ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے بندے پئیں گے اور (جدھر چاہیں گے) اس کی شاخیں نکال لے جائیں گے⑥ وہ اپنی نذریں پوری کرتے اور اس دن سے خوف کھاتے ہیں جس کی آفت (ہر طرف) پھیلی ہوگی⑦ اور وہ کھانا، اس کی محبت کے باوجود، مسکینوں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں⑧ (اور کہتے ہیں:) بس ہم تو تمھیں اللہ کی خاطر کھانا کھلاتے ہیں، ہم تم سے جزا اور شکر گزاری نہیں چاہتے⑨ ہم اپنے رب سے چہرے بگاڑ دینے والے نہایت سخت دن کا خوف کھاتے ہیں⑩ پھر اللہ نے انھیں اس دن کے شر (عذاب) سے بچا لیا اور تازگی اور سرور سے نوازا⑪ اور ان کے صبر کے عوض انھیں جنت اور ریشمی لباس کا بدلہ عطا فرمایا⑫

کافروں کی سزا اور نیکوں کی جزا:

ایک تو شراب کی ندیاں ہیں ہر کسی کے گھر میں اور ایک اس میں ملتی ہے تھوڑی سی وہ اعلیٰ قسم ہے۔ کسی کو کافور کی ملونی ہے، ٹھنڈی خوشبو اور کسی کو سونٹھ کی ملونی ہے یہ گرم ہے۔ یہ چشمے خاص ہیں۔ انتھی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے پہلے تو اس چیز کی خبر دی جو کافروں کے لیے تیار کر رکھی ہے۔ وہ زنجیریں، طوق اور سعیر ہے۔ "سعیر" جہنم کی آگ کی لپٹ اور سوزش کو کہتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ يُسْحَبُوْنَ ⑦١ فِي الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ﴾ [المؤمن: ٧١- ٧٢] "جبکہ ان کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور زنجیریں ہوں گی، گھسیٹے جائیں گے کھولتے ہوئے پانی میں اور پھر جہنم کی آگ میں جلائے جائیں گے۔" پھر ان بدبختوں کے ذکر کے بعد نیک لوگوں کا حال بیان کیا کہ وہ ایسے جام نوش کریں گے جن کی آمیزش کافور کی ہے۔ کافور کا ٹھنڈا ہونا اور اچھی خوشبو معلوم ہے، اس کے ساتھ جنت کی اور لذیذ چیزیں بھی ہوں گی۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کافور کی ٹھنڈک زنجبیل کی خوشبو میں ہوگی۔[1] یہ ایک چشمہ ہے جو بغیر ملاوٹ کے خالص ہے۔ نیک لوگ اس میں سے سیر ہو کر پئیں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس شراب میں کافور کی خوشبو آئے گی اور بعض نے کہا ہے کہ خود چشمہ کافور ہوگا۔

"تفجیر" سے یہ مراد ہے کہ اپنے گھروں اور حویلیوں میں جدھر چاہیں اس چشمے کو بہا کر لے جائیں اور اپنی مجلسوں اور محلات میں اس کی نہر جاری کریں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا

[1] تفسیر ابن کثیر (٥٨٣/٤)

﴿مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا﴾ [بني إسرائيل: ٩٠] ''انھوں نے کہا کہ ہم آپ پر ہرگز ایمان لانے کے نہیں، تاوقتیکہ آپ ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کر دیں۔'' نیز فرمایا: ﴿وَفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا﴾ [الكهف: ٣٣] ''اور ہم نے ان باغوں کے درمیان نہر جاری کر رکھی تھی۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اس نہر کو جہاں چاہیں گے کھینچے پھریں گے۔ یہی قول امام عکرمہ و قتادہ رحمہم اللہ کا ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جدھر چاہیں اس کا رخ پھیر دیں۔[1]

نیک لوگوں کے نیک اعمال:

نذر وفا کرنے سے یہ مراد ہے کہ جو طاعات شریعت میں ان پر واجب ہیں، یا خود انھوں نے اپنے نفس پر نذر کے طور پر واجب ٹھہرا لیے ہیں، ان کے ساتھ اللہ کا تعبد کرتے ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جس نے نذر مانی کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے گا اس کو چاہیے کہ اسے بجا لائے اور جس نے نذر مانی کہ وہ اللہ کی معصیت کرے گا وہ اللہ کی معصیت نہ کرے۔[2] (رواه مالك و البخاري من حديث مالك)۔ اور جو محرمات ہیں جن سے منع کیا گیا ہے، ان کو قیامت کے دن کی برائی سے ڈر کر ترک کرتے ہیں، یہ وہ دن ہوگا کہ اس کی برائی تمام لوگوں پر منتشر ہوگی مگر جس پر اللہ رحم کرے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مستطیر ہوگا، یعنی پھیلا ہوا۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: واللہ! اس دن کا شر ایسا پھیلے گا کہ آسمانوں اور زمین کو بھر دے گا۔[4]

﴿حُبِّهٖ﴾ کی ضمیر اللہ کی طرف پھرتی ہے، یعنی اللہ کی محبت سے کھانا کھلاتے ہیں۔ سیاق اسی پر دلیل ہے اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ضمیر طعام کی طرف لوٹے، یعنی باوجود خود طعام کی محبت اور خواہش رکھنے کے اور لوگوں کو کھلاتے پلاتے ہیں۔ یہی امام مجاہد اور مقاتل رحمہما اللہ کا قول ہے، اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[5] جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ﴾ [البقرة: ١٧٧] ''جو مال سے محبت کرنے کے باوجود قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے۔'' نیز جیسا کہ اللہ سبحانہ کا یہ فرمان ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ [آل عمران: ٩٢] ''جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرو گے ہرگز بھلائی نہ پاؤ گے۔'' امام نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیمار ہو گئے، ان کا جی انگور کھانے کو چاہا، جب انگور کی پہلی فصل ہوئی تو ان کی بی بی صفیہ نے ایک درہم سے انگور کا ایک خوشہ خریدا۔ خریدار کے پیچھے پیچھے ایک سائل چلا آیا، جب وہ خوشہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس لایا گیا تو کہا: سائل، سائل۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ اسی کو دے دو۔ بی بی نے دوسری بار پھر آدمی بھیج کر ایک اور خوشہ منگوایا، پھر ایک اور سائل ساتھ ہو لیا، جب وہ خوشہ لے کر آیا، کہا: سائل، سائل۔ کہا: اسی کو دے دو،

---

(1) تفسير الطبري (٢٤/٩٤، ٩٥) (2) صحيح البخاري (٦٣١٨) (3) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٩١)
(4) تفسير الطبري (٢٤/٩٦) (5) تفسير الطبري (٢٤/٩٦، ٩٧)

اسی کو دے دو۔ صفیہ نے سائل کو کہلا بھیجا کہ اگر تو پھر آئے گا تو کبھی خیر نہ پائے گا، پھر ایک آدمی کو بھیج کر ایک اور خوشہ منگوایا۔[1] (رواہ البیهقي)

صحیح میں مروی ہے کہ افضل صدقہ وہ ہے کہ تو ایسی حالت میں صدقہ کرے کہ تو صحیح اور شحیح (بخیل) ہو، تونگری کی امید اور فقر کا ڈر رکھتا ہو،[2] یعنی ایسے وقت صدقہ دے کہ مال کی محبت اور حرص اور حاجت ہو۔ لہٰذا اللہ پاک نے فرمایا کہ مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔ مسکین اور یتیم معلوم ہیں۔ رہا اسیر تو امام سعید بن جبیر، حسن اور ضحاک رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد اہلِ قبلہ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس دن ان کے اسیر مشرکین تھے، اس کا شاہد یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن اپنے اصحاب سے فرمایا کہ تم قیدیوں کا اکرام کرو۔ وہ اپنے نفوس پر ان کو مقدم کرتے، پہلے ان کو کھلاتے، پھر آپ کھاتے۔

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اسیر سے مراد غلام ہیں۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، اس لیے کہ آیت عام ہے جو مسلم اور مشرک کو شامل ہے۔ یہی قول امام سعید بن جبیر، عطا، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ کا ہے۔[3] اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت کی ہے کہ غلاموں کے ساتھ احسان کرو۔ یہ وصیت بہت سی حدیثوں میں آئی ہے، یہاں تک کہ آخری وصیت یہ تھی: «اَلصَّلَاةَ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ»[4] نماز اور غلاموں کا خیال رکھو۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اسیر سے مراد محبوس ہے،[5] یعنی قیدیوں کو باوجود اپنی خواہش اور محبتِ طعام کے کھانا کھلاتے ہیں۔ اللہ سے ثواب اور اس کی رضا مندی کی امید رکھتے ہیں، کچھ ان سے ان کا بدلہ اور عوض طلب نہیں کرتے اور نہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کے سامنے ان کا شکر ادا کریں۔ امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واللہ! انھوں نے یہ بات اپنی زبان سے نہیں کہی، لیکن اللہ نے ان کے دلوں سے اس بات کو معلوم کر لیا اور ان کی تعریف کی، تا کہ رغبت کرنے والا اس کارِ خیر میں رغبت کرے۔[6] یہ اس لیے ان کے دلوں میں کہا کہ شاید اللہ ان پر رحم کرے اور اپنے لطف و کرم سے اس اداس دن میں پیش آئے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ''عبوس'' بہ معنی (تنگ) اور ''قمطریر'' بہ معنی طویل ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ کافر اس دن عبوس ہو گا، یہاں تک کہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان سے پسینے کا سیلاب گندھک کی طرح بہے گا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''عابس'' دونوں لب ہیں ''قمطریر'' منہ کا برا منانا ہے۔ امام سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس دن ہول سے منہ بدرو ہو جائیں گے اور ماتھا اور دونوں آنکھوں

---

[1] سنن البيهقي الكبرىٰ (١٨٥/٤) [2] صحيح البخاري (١٣٥٣) صحيح مسلم (١٠٣٢)
[3] تفسير الطبري (٩٨،٩٧/٢٤) تفسير ابن كثير (٥٨٤/٤)
[4] سنن البيهقي الكبرىٰ (٢٥٨/٤) سنن ابن ماجه (١٦٢٥) صحيح الترغيب والترهيب (٢٧٩/٢)
[5] تفسير الطبري (٩٧/٢٤) [6] تفسير الطبري (٩٨/٢٤)

کے درمیان جگہ سمٹ جائے گی۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "عبوس" سے مراد شر ہے اور "قمطریر" سے مراد شدید ہے، لیکن واضح و اجلیٰ واحلیٰ واعلیٰ واولیٰ وہی عبارت ہے جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہی ہے، یعنی "ضیقا طویلًا"۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "قمطریر" شدید ہے وہ دن بلا اور شدت کے لحاظ سے تمام ایام سے زیادہ شدید اور طویل ہوگا۔

نیکوں کے چہروں کی تازگی اور دل کا سرور:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس دن ان کا رب ان کو خوف سے بچا کر چہرے پر تازگی اور دل میں سرور بخشے گا۔ یہی قول امام حسن بصری، قتادہ، ابو العالیہ اور ربیع رحمہ اللہ کا ہے[1] اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ﴾ [عبس: ۳۸- ۳۹] "اس دن بہت سے چہرے روشن ہوں گے (جو) ہنستے ہوئے اور ہشاش بشاش ہوں گے۔" کیوں کہ دل جب خوش ہوتا ہے تو چہرہ چمک اٹھتا ہے۔ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی طویل حدیث میں آیا ہے: "كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا سُرَّ اسْتَنَارَ وَجْهُهُ حَتّٰى كَأَنَّهُ قِطْعَةُ قَمَرٍ"[2] یعنی جب نبی اکرم ﷺ خوش ہوتے تو آپ ﷺ کا چہرہ چمک اٹھتا، گویا کہ ایک ماہ پارہ ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میرے پاس نبی اکرم ﷺ آئے خوش ہوتے ہوئے، آپ ﷺ کے چہرے کی شکنیں چمک رہی تھیں۔[3] پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے ان کو ان کے صبر کے بدلے میں جنت میں جگہ دی، یعنی منزل کشادہ اور عیش تر وتازہ اور اچھا لباس۔ ابو سلیمان دارانی نے کہا ہے کہ دنیا میں ان کا صبر شہوات کو ترک کرنے پر تھا۔ پھر یہ شعر پڑھا:

كَمْ قَتِيْلٍ لِشَهْوَةٍ وَأَسِيْرٍ　　أُفٍّ مِنْ مُشْتَهٰى خِلَافَ الْجَمِيْلِ
شَهَوَاتُ الْإِنْسَانِ تُوْرِثُهُ الذُّلَّ　　وَتُلْقِيْهِ فِي الْبَلَاءِ الطَّوِيْلِ[4]

"افسوس شہوتِ نفس نے اور بھلائیوں کے خلاف برائیوں کی چاہت نے بہت سوں کا گلا گھونٹ دیا اور کئی ایک کو پا بہ جولاں کر دیا۔ نفسانی خواہشات ہی ہیں جو انسان کو بدترین ذلت ورسوائی اور بلا ومصیبت میں ڈال دیتی ہیں۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿سَلٰسِلَا۟﴾ میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد قیود ہیں یا جو چیز کہ گردن میں ڈالی جاتی ہے۔ بہرحال سلسلے کو باندھ کر آگ میں کھینچیں گے۔ طوق سے ہاتھ گردن میں بندھے ہوں گے۔ "سعیر" دہکتی آگ کو کہتے ہیں۔ کفار کے عذاب کا ذکر کرنے کے بعد ابرار کے ثواب کا ذکر فرمایا۔ ابرار اہلِ طاعت واخلاص وصدق کو

---

[1] تفسیر الطبري (۲۴/۹۹-۱۰۱) تفسیر ابن کثیر (۴/۵۸۴، ۵۸۵)
[2] صحیح البخاري (۳۳۶۳) صحیح مسلم (۲۷۶۹)
[3] صحیح البخاري (۳۳۶۲) صحیح مسلم (۱۴۵۹)
[4] تاریخ دمشق (۱۵/۳۰۶) تفسیر ابن کثیر (۴/۵۸۳-۵۸۵)

کہتے ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "اَلْبَرُّ الَّذِيْ لَا يُؤْذِي الذَّرَّ" یعنی نیکوکار وہ شخص ہے جو ایک چیونٹی کو بھی نہ ستائے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابرار وہ لوگ ہیں جو اللہ کا حق ادا کرتے ہیں اور منت پوری کرتے ہیں،[1] یا وہ لوگ ہیں جو اپنے ایمان میں سچے اور اپنے رب کے مطیع ہیں، ان کی ہمت ناکارہ چیزوں سے بلند ہے، ان کے دلوں میں حکمت کے چشمے جاری ہیں۔ یا ان کا نام ابرار اس لیے ہوا کہ وہ آباء و ابناء کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں۔ سلوک و احسان سے پیش آتے ہیں۔ "کأس" وہ ساغر ہے جس میں شراب ہو۔ اگر شراب نہ ہو گی تو پھر وہ "کأس" نہ کہلائے گا۔ یہ "کأس" کانچ یا بلور کا بھی ہو سکتا ہے اور سونے چاندی کا بھی۔ "کأس" کی زجاج کے ساتھ تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ عرب کے "کأس" کئی قسم کے ہوتے تھے۔ "خمر" کے لفظ پر بھی "کأس" کا اطلاق آتا ہے۔

وَكَأْسٍ شَرِبْتُ عَلَى لَذَّةٍ وَأُخْرَى تَدَاوَيْتُ مِنْهَا بِهَا

"کچھ جام تو میں نے لذت کی خاطر پیے اور کچھ کو بطور دوائی دارو کے نوش کیا۔"

اس "کأس" کا مزاج کافور ہو گا، یعنی اس میں کافور کی آمیزش ہو گی۔ کافور جنت میں ایک چشمے کا نام ہے، یعنی جنت کی شراب اس چشمے سے ملائی جائے گی۔ امام قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مزاج کافور کا اور خاتمہ مسک کا ہو گا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مزاج سے مراد طعم، یعنی مزہ ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ خوشبو کافور کی ہو گی نہ کہ مزا کافور کا۔ یا کافور سے مراد رنگ کی سفیدی اور اچھی خوشبو اور ٹھنڈک ہے، کیوں کہ خود کافور نہیں پی جاتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ﴾ [الكهف: ٩٦] "تاوقتیکہ لوہے کی ان چادروں کو بالکل آگ کر دیا۔"

امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی خوشبو مشک کافور اور زنجبیل کی سی ہو گی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ کچھ تمھاری اس دنیا کی کافور نہیں ہے، لیکن اللہ نے اپنے پاس کی چیز کا وہی نام رکھا ہے جو تمھارے پاس ہے تاکہ دل راہ یاب ہو جائیں۔[3] اس چشمہ کافوری سے اللہ کے بندے، یعنی اولیاء اور مومنین پئیں گے اور جس طرف چاہیں گے اور جو نفع چاہیں گے ادھر کھینچ لے جائیں گے اور حاصل کریں گے۔ اس چشمے کا پانی ان کے ساتھ ساتھ ہر جگہ جائے گا۔ یعنی سہل ہوا نہ کہ ممتنع (منع کیا گیا، روکا گیا)۔ "نذر" لغت میں کسی شے کے واجب کرنے کو کہتے ہیں، یعنی اللہ کے طاعاتِ واجبہ کو پورا کرتے ہیں۔ امام قتادہ اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا: یعنی نماز و حج اور اسی طرح کی عبادات بجا لاتے ہیں۔ اس میں ان کے وصف کا مبالغہ ہے کہ وہ واجبات کے ادا کرنے پر توفیق دیے گئے ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منت پوری کرتے ہیں، یعنی دنیا میں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے عہد و پیمان کو مکمل کرتے ہیں۔[4] اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق: ﴿ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ﴾ [النحل: ٩١] "اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔"

---

[1] تفسیر القرطبي (١٢٥/١٩) [2] تفسیر القرطبي (١٢٥/١٩)

[3] تفسیر القرطبي (١٢٥/١٩، ١٢٦) [4] تفسیر القرطبي (١٢٧/١٩)

اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ [المائدۃ: ۱] ''عہد و پیمان پورے کرو۔'' لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ نذر کو اس چیز پر محمول کریں جو بندے نے اپنی جان پر بغیر تخصیص کے واجب کر لی ہے۔ وہ دن جس کا شر منتشر ہوگا قیامت کا دن ہے۔

استطارت سے مراد انتہا درجے کا انتشار اور نہایت درجے میں خبر کا پھیل جانا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا شر جب آسمان پر پھیل جائے گا تو وہ پھٹ جائیں گے اور تارے بکھر پڑیں گے اور سورج اور چاند لپیٹ دیے جائیں گے اور فرشتے گھبرا جائیں گے اور زمین پہاڑ ریت کی طرح ہو جائیں گے اور پانی سوکھ جائے گا۔[1] آیت میں ان کے حسنِ عقیدہ اور معاصی سے اجتناب کا اشارہ ہے، پھر ان کا یہ وصف بیان کیا کہ وہ ان تین قسم کے لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں، حالاں کہ خود ان کے پاس کھانا کم ہے اور خود کھانا چاہتے ہیں۔ یا ﴿ حُبِّهٖ ﴾ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے، اس کے قول کے مطابق: ﴿ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ ﴾ لیکن پہلی وجہ زیادہ قابلِ تعریف ہے، اس لیے کہ اس میں اپنی جان کے لیے ایثار ہے اور طعام فقراء اور اغنیاء دونوں کو محبوب ہوتا ہے۔

مسکین صاحبِ مسکنت کو کہتے ہیں، یعنی غریب ومفلس آدمی، یا وہ شخص جو فقیر سے بھی زیادہ حاجتمند ہے۔

یتیم سے مراد مسلمانوں کے بن باپ کے بچے ہیں۔ اسیر سے مراد قیدی ہے، یا غلام۔ ابوحمزہ ثمالی نے کہا ہے کہ اسیر عورت ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیتِ صدقات اور آیتِ سیف نے اس آیت کو کافر اسیر کے حق میں منسوخ کر دیا۔[2] بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ آیت محکم ہے اور مسکین ویتیم کا کھلانا تطوع ہے اور اسیر کا کھلانا اس کے نفس کی حفاظت کے لیے ہے، یہاں تک کہ امام اس کے حق میں کوئی فیصلہ کرے۔ سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعا آیا ہے کہ مسکین فقیر ہے اور یتیم بن باپ کے اور اسیر مسجون ہے۔[3] (أخرجه ابن مردويه و أبو نعيم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یہ آیت علی بن ابی طالب اور فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہما کے حق میں اتری ہے۔[4] (أخرجه ابن مردويه) اور بعض نے کہا ہے کہ عام ہے کہ ہر اس شخص کے حق میں جو ان کو کھلائے پلائے اور اپنی جان پر اختیار کرے (ترجیح دے)۔ ان کا یہ کہنا کہ ہم تم کو اللہ کے لیے کھلاتے ہیں زبانِ قال سے ہے یا زبانِ حال سے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم اس کا کچھ بدلہ نہیں چاہتے، نہ مال سے نہ قال سے۔ پہلے اللہ نے ان کی بخشش اور سخاوت کا ذکر کیا، پھر اس کی تکمیل ایسے اخلاص سے فرمائی جس میں ریا نہیں۔ پس جزا اور شکر کا نہ چاہنا اس دن کے ڈر سے بتایا جو دن کہ عبوس وقمطریر (اداسی اور سختی والا) ہوگا، یعنی اس کی ہولناکی اور شدت سے منہ کالے پڑ جائیں گے، چہرے اتر جائیں گے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے کہ عبوس وقمطریر ہوگا، یعنی ''آنکھوں کی درمیانی جگہ میں سکیڑ پیدا ہوگا۔''[5]

---

(1) تفسير البغوي (۲۹٤/۸) (2) فتح القدير (٤٦١/٥) (3) حلية الأولياء (١٠٥/٥) اس کی سند میں ''عطیہ عوفی'' ضعیف راوی ہے۔
(4) الدر المنثور (۳۷۱/۸) (5) الدر المنثور (۳۷۲/۸)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قمطریر وہ شخص ہے جو ناک منہ چڑھائے، آنکھیں بند کر لے۔ ①
چنانچہ اللہ پاک ابرار کو اس دن اس خوف اور کھانا کھلانے کے سبب سے اس دن کے شر سے بچا لے گا اور عبوس و قمطریر ہونے کے بجائے ان کو تازگی و خوش دلی و مسرت عطا فرمائے گا۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”نضرت“ چہروں میں سفیدی اور پاکی ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حسن و بہار ہے۔② کسی نے کہا ہے کہ نعمت کا اثر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ چہرے پر تازگی اور سینے میں سرور ہوگا۔③

یہ دنیا میں تکالیف پر ان کے صبر کرنے کی جزا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ فقر پر صبر کرنے کی جزا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ گرسنگی پر۔ کسی نے کہا ہے کہ روزے پر صبر کی جزا ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ صبر کو ہر طاعت پر صبر کرنے پر محمول کریں۔ وہ جزا یہ ہے کہ رہنے کو جنت ملے گی اور پہننے کو ریشم ملے گا۔ یہ اہلِ جنت کا لباس ہے جو دنیا میں شریعت کے حکم کے مطابق ریشم کو ترک کرنے کے بدلے میں ہوگا۔ جنت سے مراد ایسا باغ ہے جس میں کھانے کے میوے ہوں نہ کہ آگ کے مقابلے میں کرامت کا گھر ہو۔ آیت ظاہری طور پر عام ہے، ہر اس شخص کے لیے جو طائف یوم القیامہ ہو اور اللہ کی خوشنودگی کی خاطر کھانا کھلانے والا ہو اور اللہ کے عذاب سے ڈرنے والا ہو۔ اور سبب اگرچہ خاص ہے، لیکن اعتبار لفظ کی عمومیت کا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ رہا سببِ نزول تو وہ آیت کی عمومیت کے تحت بدرجہ اولیٰ داخل ہے۔④

مُّتَّكِـِٕیْنَ فِیْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ۚ لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا وَّ لَا
زَمْهَرِیْرًا ﴿۱۳﴾ وَ دَانِیَةً عَلَیْهِمْ ظِلٰلُهَا وَ ذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِیْلًا ﴿۱۴﴾
وَ یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِاٰنِیَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِیْرَا۠ ﴿۱۵﴾
قَوَارِیْرَا۠ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِیْرًا ﴿۱۶﴾ وَ یُسْقَوْنَ فِیْهَا كَاْسًا
كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِیْلًا ﴿۱۷﴾ عَیْنًا فِیْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِیْلًا ﴿۱۸﴾ وَ یَطُوْفُ
عَلَیْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَیْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ﴿۱۹﴾ وَ اِذَا
رَاَیْتَ ثَمَّ رَاَیْتَ نَعِیْمًا وَّ مُلْكًا كَبِیْرًا ﴿۲۰﴾ عٰلِیَهُمْ ثِیَابُ سُنْدُسٍ
خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ ۫ وَّ حُلُّوْۤا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا
طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْیُكُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾

وہ جنت میں مسندوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے، وہاں نہ دھوپ دیکھیں گے اور نہ شدید سردی ⑬

① تفسير الطبري (١٠٠/٢٤) ② تفسير القرطبي (١٣٦/١٩) فتح القدير (٤٦٢/٥)
③ الدر المنثور (٣٧٢/٨) ④ فتح البيان (٤٥٩/١٤-٤٦٥)

اور اس (جنت) کے سائے ان پر جھکے ہوں گے، اور اس کے (پھلوں کے) گچھے ان کے تابع فرمان بنا دیے جائیں گے ⑭ اور ان پر چاندی کے برتن اور شیشے کے ساغر پھرائے جائیں گے ⑮ شیشے بھی چاندی (کی قسم) کے، (ساقی) انھیں ٹھیک اندازے سے بھریں گے ⑯ اور وہاں انھیں ایسے جام پلائے جائیں گے جن میں سونٹھ کی ملاوٹ ہوگی ⑰ (یہ) جنت میں ایک چشمہ ہے جسے سلسبیل کا نام دیا گیا ہے ⑱ اور ان کی خدمت میں سدا نوخیز ہی رہنے والے لڑکے پھرتے ہوں گے۔ جب تو انھیں دیکھے گا تو انھیں بکھرے ہوئے موتی سمجھے گا ⑲ اور جب تو وہاں (کسی بھی طرف) دیکھے گا تو نعمتیں اور بہت بڑی سلطنت دیکھے گا ⑳ ان (کے تن) پر باریک، سبز اور دبیز ریشم کے کپڑے (لباس) ہوں گے، اور انھیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور اُن کا رب انھیں شرابِ طہور پلائے گا ㉑ (کہا جائے گا:) بلاشبہہ یہ تمھاری جزا ہے اور تمھاری سعی قابلِ قدر ہے ㉒

اہلِ جنت کے انعامات:

ناپ سے یہ مراد ہے کہ ان کے پاس وہ آبخورے روپے کے برابر ہوں گے اور شیشے کے، یعنی روپا ایسا شفاف ہوگا جیسے شیشہ۔ سلسبیل کے معنی پاک صاف بہتا ہوا۔ انتہیٰ۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کے حال کی خبر دی ہے کہ وہ اس نعیم مقیم میں ہوں گے، ان پر اللہ تعالیٰ کا فضل عام ہوگا۔ تکیہ لگا کر تختوں پر بیٹھنے کا ذکر سورۃ الصافات میں گزر چکا ہے۔[1] اتکاء میں اختلاف ہے کہ اس سے مراد کیا ہے؟ لیٹنا یا چارزانو بیٹھنا یا جلوس میں تمکن۔ "أرائك" سے مراد وہ تخت ہیں جو حجلہ کے نیچے ہوتے ہیں، وہاں نہ گرمی ہے جو ستائے اور نہ سردی جو دکھ پہنچائے، بلکہ ایک ایسا منفرد سرمدی مزہ ہے جس سے وہ منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔ حدیث میں مروی ہے: "إِنَّ هَوَاءَ الْجَنَّةِ سَجْسَجٌ: لَا حَرٌّ وَلَا بَرْدٌ"[2] "بلاشبہہ جنت کی ہوا و موسم معتدل ہے جس میں نہ گرمی ہے نہ سردی۔" درختوں کی پھلدار شاخیں قریب ہوں گی جب چاہیں گے ان سے میوہ چن لیں گے، اونچی شاخ جھک جائے گی، گویا وہ سننے والی اور اطاعت کرنے والی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَجَنَى الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴾ [الرحمٰن: ٥٤] "اور ان دونوں جنتوں کے میوے بالکل قریب ہوں گے۔" فرمایا: ﴿ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ﴾ [الحاقة: ٢٣]

---

① رقم الآية (٤٤)

② تفسیر القرطبي (١٣٨/١٩) ان الفاظ کے ساتھ روایت مرفوعاً کسی اور جگہ نہیں ملی ہے، البتہ مصنف ابن أبي شيبة (٣٠/٧) میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مروی ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے قطوف مذلل ہیں، یعنی اگر کھڑا ہو تو اس کے ہمراہ ہیں اور اگر بیٹھ گیا تو لٹک پڑے اور اگر لیٹ گیا تو جھک گئے کہ جس طرح وہ چاہے توڑے۔ تذلیل سے یہ مراد ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے ہاتھوں کو نہ تو کوئی کانٹا پھیرے اور نہ دوری۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنت کی زمین چاندی کی ہے اور اس کی مٹی مشک اور درختوں کی جڑیں سونا چاندی اور ان کی شاخیں لولؤ اور زبرجد اور یاقوت اور سیم اور ان کے بیچ میں پھل ہو گا۔ جو کوئی ان کو کھڑے ہو کر کھائے گا اس کو ایذا نہ دیں گے اور جو کوئی ان کو بیٹھ کر کھائے گا، اس کو بھی نہ ستائیں گے اور جو کوئی لیٹ کر کھائے گا، اس کو بھی بے آرام نہ کریں گے۔[2] خادم کھانے کے برتن لیے ہوئے ان کے اردگرد پھریں گے۔ یہ برتن چاندی کے ہوں گے اور شراب کے آب خورے بغیر ٹونٹی کے، یہ گویا چاندی کے شیشے ہوں گے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، حسن اور بہت سے سلف رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ چاندی کی سفیدی آبگینے کی صفائی ہو گی اور قواریر نہیں ہوتے مگر شیشے کے۔ سو یہ آبخورے ہوں گے تو چاندی کے اور ایسے صاف ہوں گے کہ ان کا اندر کا حصہ باہر سے نظر آئے گا۔ اس کی نظیر دنیا میں نہیں ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جنت میں کوئی شے نہیں ہے مگر دنیا میں تم اس کے مشابہ چیز دیے گئے ہو، مگر چاندی کے آبخورے کہ اس کی نظیر یہاں نہیں ہے۔[4]

تقدیر سے یہ مراد ہے کہ وہ پیاس بجھانے کے مطابق ہوں گے نہ زیادہ نہ کم۔ بلکہ جتنی پیاس جس کو ہو گی اسی اندازے کے مطابق وہ ساغر ہو گا۔ یہی معنی ہیں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر، ابی صالح، قتادہ، ابن ابزیٰ، ابن عبید، شعبی اور ابن زید رحمہم اللہ کے قول کے اور یہی امام ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے اور یہ مہربانی اور شرف اور کرامت میں زیادہ مؤثر ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "قُدِّرَتْ لِلْكَفِّ" امام ربیع بن انس رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ خادم کے کف کے مطابق ہو گا، سو یہ کچھ پہلے قول کے خلاف نہیں ہے، اس لیے کہ وہ قدر اور سیرابی دونوں میں ایک اندازے پر ہو گا۔[5] ابرار ان آبخوروں میں شراب پییں گے جس کا مزاج زنجبیل کا ہو گا۔ کبھی ان کی شراب کافوری ہو گی یہ سرد ہوتی ہے اور کبھی زنجبیلی ہو گی، یہ گرم ہوتی ہے، تاکہ اعتدال رہے۔ ابرار کے لیے ان دونوں طرح کا مزج (ملانا) ہو گا۔ رہے مقربین تو وہ بادۂ ناب پییں گے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے اسی طرح کہا ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پہلے گزر چکا ہے: ﴿ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ ﴾ اور یہاں ﴿ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ﴾ کہا ہے، یعنی زنجبیل بہشت کے ایک چشمے کا نام ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنت میں ایک چشمے کا نام ہے۔

---

[1] الطبري (٢٤/١٠٣) [2] مصنف ابن أبي شيبة (٢٨/٧) [3] تفسير الطبري (٢٤/١٠٤، ١٠٥) تفسير ابن كثير (٥٨٦/٤)
[4] ابن أبي حاتم (٣٣٩١) [5] تفسير الطبري (٢٤/١٠٦، ١٠٧) تفسير ابن كثير (٥٨٦/٤)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نام بسبب سلاست سیل کے ٹھہرا ہے کہ وہ تنہا بہیں گے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلسبیل ایک بہتا ہوا چشمہ ہے، اس کا پانی نہایت صاف اور ستھرا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض سے نقل کیا ہے کہ وہ حلق میں سلاست (روانگی ہمواری) سے اترے گا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ یہ نام ان سب معانی کو عام ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بات ویسی ہی ہے جیسی انھوں نے کہی ہے۔[1]

موتیوں جیسے خدام:

پھر اہلِ جنت کی خدمت کے لیے ولدان (بچے) جنتی ہوں گے جو ہمیشہ اسی حالت میں بغیر کسی تبدیلی کے رہیں گے۔ ان کی عمر نہ بڑھے گی، ایک ہی سن و سال رہے گا۔ اور جس نے یہ کہا کہ ﴿ مُخَلَّدُوْنَ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ ان کے کانوں میں گوشوارے پڑے ہوں گے، اس نے معنی کی تعبیر اس طرح پر کی ہے، کیوں کہ اس کام کے لائق چھوٹے بچے ہی ہوتے ہیں نہ کہ بڑے۔ کان میں بُندہ چھوٹے بچوں کو ڈالتے ہیں نہ کہ بڑوں کے کان میں۔ ان کا اپنے سادات کی خدمت کے لیے چلنا پھرنا ایسے نظر آئے گا جیسے کہ گوہرِ شاہوار (موتی) بکھیر دیے ہوں۔ وہ خوبصورت چہروں والے حسین وجمیل ہوں گے۔ اسی طرح ان کے کپڑے اور لباس و پوشاک لذت بخش ہوں گے۔ حسن میں اس سے بہتر تشبیہ اور دیکھنے میں بکھرے ہوئے موتیوں سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جنت میں کوئی شخص نہیں ہے مگر اس کے سامنے ہزار خادم دوڑیں گے، ہر خادم ایک کام پر مقرر ہوگا۔[2] پھر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا کہ اے محمد! اگر تم جنت کو اور اس کی نعمتوں، وسعت اور بلندی کو، اس آرائش اور سرور کو دیکھو جو وہاں ہوگا تو ایک مملکتِ عظیم اور سلطنتِ کبیر اور دولتِ باہرہ و ثروتِ ظاہرہ پاؤ۔ صحیح میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اہلِ نار سے جو سب سے آخر میں آگ سے نکلے گا اور اس شخص سے جو سب سے بعد میں جنت میں جائے گا فرمائے گا: « إِنَّ لَكَ مِثْلَ الدُّنْيَا وَعَشَرَةَ أَمْثَالِهَا »[3] یعنی تیرے لیے ہفت اقلیم کی دس گناہ بادشاہت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ مقام کے لحاظ سے جنت کا سب سے کم درجے کا شخص وہ ہوگا جو اپنی بادشاہت میں دو ہزار سال کی راہ تک نظر کرے گا، اس کے آخری حصے کو ویسے ہی دیکھے گا جیسے کہ اس کے قریبی حصے کو دیکھتا ہے۔[4] سو جب کہ ادنیٰ جنتی کے لیے اللہ تعالیٰ کی یہ عطا ٹھہری تو پھر اعلیٰ جنتی کے رتبے کا کیا کہنا، وہ تو اللہ کے نزدیک بڑے ہی نصیب والا اور بختاور ہوگا۔

---

① تفسير الطبري (١٠٨/٢٤، ١١٠) تفسير ابن كثير (٥٨٦/٤) ② تفسير الطبري (١١١/٢٤)

③ صحيح البخاري (٦٢٠٢) صحيح مسلم (١٨٦)

④ مسند أحمد (١٣/٢) اس کی سند میں ''ثویر بن ابی فاختہ'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ١٣٨١)

طبرانی کی روایت سے ایک حبشی مرد کا جنت کا حال سن کر مر جانے کا قصہ پہلے گزر چکا ہے۔[1] یہ حدیث نہایت غریب ہے۔ اہلِ جنت کا لباس حریر ہوگا۔ سندس حریر رفیع کو کہتے ہیں، جیسے: قمصان اور اس طرح کا اور لباس جو بدن سے ملا رہے۔ استبرق وہ حریر ہے جو بریق اور چمکدار ہوتا ہے، یہ ظاہر بدن سے ملا رہتا ہے جس طرح کہ لباس کا مقصد ہے، غرض کہ سندس کا استر نرم و نازک ہوگا اور ابرہ چمکدار اور با فروغ اور دونوں حریر ہی کی جنس سے ہوں گے۔ ریشم کی نرمی اور خوبی معلوم ہے اور چاندی کے کنگن ہاتھوں میں ہوں گے۔ یہ ابرار کی صفت ہے۔ رہے مقربین تو ان کے کنگن سونے اور موتیوں کے ہوں گے اور کپڑا ریشمی۔

حریر کی اس ظاہری زینت اور چمکدار زیور کے بعد یہ فرمایا کہ ان کو شرابِ طہور پلائی جائے گی جو اُن کے باطنوں کو حسد، کینہ، بغض، غل، تکلیف اور تمام ردی اخلاق سے پاک صاف اور مبرا و منزہ کر دے گی جس طرح کہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب جنت والے جنت کے دروازے تک پہنچیں گے، وہاں دو چشمے پائیں گے گویا ان کو اس بات کا الہام ہوا ہے۔ ایک چشمے سے پئیں گے ان کے پیٹ میں جو کچھ اذیٰ کی چیز ہوگی اللہ اس کو دور کر دے گا۔ پھر دوسرے چشمے سے غسل کریں گے ان پر نعیم کی تازگی آ جائے گی۔[2] اللہ تعالیٰ نے اس جگہ ان کے ظاہری حال اور باطنی جمال وخوبصورتی کی خبر دی ہے۔ پھر ان سے یہ بات کہی جائے گی، یعنی ان کی تکریم اور احسان کے لیے کہ یہ تمھارا بدلہ ہے اور تمھاری کوشش ٹھکانے لگی کہ تھوڑے عمل پر تم کو بہت کچھ دیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔۢا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴾ [الحاقة: ٢٤] ”مزے سے کھاؤ، پیو اور اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزشتہ زمانے میں کیے۔“ نیز جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ﴿ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٤٣] ”اور ان سے پکار کر کہا جائے گا کہ اس جنت کے تم وارث بنائے گئے ہو اپنے اعمال کے بدلے۔“

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ”أرائك“ ”أريكة“ کی جمع ہے۔ اریکہ تخت ہے جو حجال کے اندر ہو۔ حجلہ وہ گھر ہے جس کو کپڑے اور پردے اور تخت سے آراستہ کریں۔ اس کی تفسیر سورۃ الکہف میں گزر چکی ہے[3] مراد چھپر کھٹ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ”زمہریر“ سخت سردی ہے۔ ثعلب نے کہا ہے کہ ”زمہریر“ بہ معنی قمر ہے لغتِ طی میں۔[4] اس کی تفسیر سورت مریم میں گزر چکی ہے۔[5] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: دوزخ نے اپنے رب سے گلہ کیا اور کہا: اے رب! میرے بعض نے میرے بعض کو کھا لیا۔ اللہ پاک نے اس

---

(1) المعجم الكبير (٤٣٦/١٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”فيه أيوب بن عقبة وهو ضعيف“ (مجمع الزوائد: ٧٧٧/١٠)

(2) تفسير ابن كثير (٥٨٧/٤) (3) رقم الآية (٣١) (4) تفسير القرطبي (١٣٨/١٩) (5) رقم الآية (٦٢)

کے لیے دو سانسیں لینا مقرر کیا: ایک تابستان میں دوسری زمستان میں۔ یہ شدت سردی کی جو تم پاتے ہو اس کی زمہریر کی ہے اور گرمی کی شدت جو تم پاتے ہو اس کے سموم کی ہے۔[1] (رواه الشيخان)

غرض یہ کہ وہاں نہ گرمی نہ سردی۔ ایک معتدل اور متوسط حالت ہے جو سراپائے راحت و نعمت و آسایش و آرام ہے۔ درختوں کے سائے قریب ہیں، یہ آرام کی افزایش ہے، اگرچہ وہاں سورج نہ ہو گا جس کا سایہ ہو۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جنت کے درخت اہلِ جنت کے قریب ہوں گے اور ان کے پھل اور میوہ جات لٹکے ہوئے اور جھکے ہوئے ہوں گے۔ کھانے والے کے لیے مسخر ہوں گے جس طرح چاہے تناول کر لے، کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے یا تکیہ لگائے ہوئے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "مذلل" بہ معنی قریب متناول،[2] یعنی لینے والے کے قریب۔ بعض نے کہا ہے کہ بہ معنی منقاد ہے کہ جس طرح چاہیں میوہ چن لیں، کوئی ممانعت اور رکاوٹ نہیں۔ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اہلِ جنت، جنت کے پھلوں کو کھڑے کھڑے یا بیٹھے ہوئے یا لیٹے ہوئے ہر طرح پر نوشِ جاں کریں گے۔[3]

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے طعام و لباس و مسکن کے بیان کے بعد ان کی بادہ پیمائی کا ذکر کیا اور فرمایا کہ ان کے گرد چاندی کے باسن اور شیشے کے ساغر جو چاندی کے ہوں گے خدامِ عالی مقام لیے ہوئے پھریں گے۔ کوب کوزِ عظیم کو کہتے ہیں اور ابریق بے گوش اور بغیر ٹونٹی کے آبخورے کو کہتے ہیں۔ اس سے کچھ سونے کے برتن کی ممانعت نہیں نکلتی، بلکہ اس کا ذکر دوسرے پر تنبیہ کرتا ہے، جیسے: ﴿ تَقِيكُمُ الْحَرَّ ﴾ [النحل: ٨١] "جو تمھیں گرمی سے بچائیں۔" وہ تو کبھی چاندی کے ساغر میں پئیں گے اور کبھی سونے کے جام میں۔ اس کی تفسیر سورۃ الزخرف میں گزر چکی ہے۔[4] یہ آبخورے اللہ تعالیٰ کی تکوین سے دو صفت کے حامل ہوں گے اور ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے، دیکھنے میں چاندی اور شفافی میں آبگینہ، رنگ چاندی کا اور صفائی شیشے کی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ دنیا میں جنت کی کوئی شے نہ ہو گی مگر صرف نام،[5] کیوں کہ جنت کی شے اشرف اور اعلیٰ ہو گی۔ ہر نازک اور صاف برتن کو قارورہ کہتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دنیا کے قواریر ریت کے ہوتے ہیں۔ اللہ نے جنت کے قواریر کی فضیلت بیان کی کہ وہ سیم کے ہوں گے، ان کا اندر کا حصہ باہر سے نظر آئے گا۔[6] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تو اگر چاندی لے کر اس کو مکھی کے پر کی طرح پتلا کرے، تب بھی اس کے اندر کا پانی نظر نہ آئے، لیکن جنت کے آبخورے رنگ میں ایسے ہوں گے جیسے چاندی اور صفائی میں ایسے ہوں گے جیسے شیشے۔[7] اہلِ جنت کے خادم ان کا اندازہ پینے والے کی ضرورت کے مطابق کریں گے، نہ زیادہ نہ کم۔

---

(1) صحيح البخاري (٥١٢) صحيح مسلم (٦١٧) (2) فتح القدير (٤٦٤/٥) (3) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٩١/١٠)
(4) رقم الآية (٧١) (5) تفسير الطبري (٣٩٢/١) (6) معاني القرآن (٢٦٠/٥) (7) تفسير الصنعاني (٣٣٨/٣)

یہ شراب بہت لذیذ ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کی مقدار حاجت کے مطابق ہے نہ زیادہ نہ کم۔

امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ اس لیے کہ جنت میں پیاس نہ ہوگی۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بہت لذیذ اور بہت زیادہ چاہی جانے والی ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ اس کا اندازہ ملائکہ نے کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اہلِ جنت نے کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ساقیوں نے کیا ہے۔ وہ شراب جوان آبخوروں میں ہوگی، وہ سونٹھ سے ملی ہوگی۔ عرب شراب کو سونٹھ سے ملا کر پیتے تھے، اس لیے کہ اس کا رائحہ خوشبو دار ہوتا ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ سونٹھ کچھ دنیا کی سونٹھ کی طرح نہیں ہے کہ حلق کو کاٹے اور اس کا حلق سے اتارنا بہت مشکل ہو۔[2]

میں کہتا ہوں کہ یہی حال سارے درختوں، پھلوں، محلوں، عورتوں، حوروں، کھانے اور پینے والی چیزوں، ملبوسات و مناکح اور رہائش گاہوں کا ہے۔ دنیا میں ان کا فقط نام ہے۔ اللہ نے ترغیب کے لیے وہی نام لیے جن کو یہ لوگ دنیا میں زیادہ لذت والے اور زیادہ پاکیزہ اور اچھے جانتے اور پہچانتے ہیں، تاکہ یہ لوگ اس نعیمِ مقیم کے لیے سعی کریں اور جدوجہد بجا لائیں۔

سلسبیل پاکیزہ اور لذیذ شراب کو کہتے ہیں۔ سلاست سے ماخوذ ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلسبیل لغت میں اس پانی کا نام ہے جو نہایت سلسال اور تیز ہو جو حلق میں نہ اٹکے۔[3] ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے سلسبیل کا نام صرف قرآن میں سنا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ نام اعجمی ہے اور نکرہ ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ آبِ رواں منقاد ہے کہ جہاں چاہو لے جاؤ، مگر پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ اسم کے معنی صفت ہیں، اس لیے کہ اکثر علماء اس پر ہیں۔ سلسبیل صفت ہے نہ کہ اسم۔[5] امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلسبیل اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے راہوں اور گھروں میں جاری اور چلنے والا ہے۔ عرش کی جڑ سے نکل کر جنتِ عدن میں سے ہوتے ہوئے اہلِ جنت کی طرف بہہ کر آیا ہے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنت کی شراب ٹھنڈا ہونے میں کافور، مزے میں زنجبیل اور خوشبو میں مشک ہوگی، بغیر لذع کے، یعنی گلے میں جلن نہیں ہوگی۔[6] امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مقربین بادۂ ناب نوش کریں گے اور باقی اہلِ جنت کے لیے ملونی ہوگی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ساقیوں کی صفت بیان کرنے کے بعد غلمان کے طواف کرنے کا ذکر فرمایا۔ یہ سب ایک سن و سال کے ہوں گے، وہ عمر میں ایک دوسرے سے بڑے چھوٹے نہ ہوں گے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت ہی میں پیدا کر کے مومنین کی خدمت میں دے دے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مومنین کے بچے ہوں گے، کیوں کہ ان کی موت فطرت پر، یعنی جبلی توحید پر ہوئی ہے۔ ابن برجان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی جانے کہ اللہ تعالیٰ

---

[1] تفسير القرطبي (١٤١/١٩) [2] فتح القدير (٤٦٥/٥) فتح البيان (٤٧١/١٤) [3] تفسير البغوي (٢٩٧/٨)
[4] اللباب في علوم الكتاب (٣٨/٢٠) [5] تفسير الخازن (١٩٣/٧) [6] تفسير البغوي (٢٩٧/٨)

نے ان کا ایمان معلوم کر لیا ہے۔ یہ کفار کی اولاد ہے جو اہلِ جنت کے خادم ہوں گے جس طرح کہ دنیا میں ہمارے خادم اور اسیر تھے۔

رہی مومنین کی اولاد تو وہ تانس اور سرور کے لیے اپنے آباء کے ساتھ ملحق ہوں گے۔ میں کہتا ہوں: یہی قول حق کے زیادہ مشابہ معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام کی بھی بعض اولاد نابالغ مری ہے اور فطرت پر گزری ہے ان کا اہلِ جنت کا خادم ہونا یا اپنے آباء کا خادم ہونا کیسے ہو سکتا ہے۔[1] واللّٰہ أعلم۔ امام خازن رحمہ اللہ نے سورۃ الواقعہ کی تفسیر میں کہا ہے کہ صحیح قول جس کا انکار نہیں ہو سکتا یا جس کی مخالفت نہیں ہو سکتی، ان شاء اللہ تعالیٰ یہ ہے کہ یہ ولدان جنت میں اہلِ جنت کی خدمت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں حوروں کی طرح اور کسی سے پیدا نہیں ہوئے اور نہ ولادت سے بہم پہنچے۔[2] انتہی۔

میں کہتا ہوں ہم اس جگہ اپنے ظن اور تخمین سے کچھ نہیں کہہ سکتے، اس لیے کہ ان کے متعلق کتابِ عزیز و سنتِ مطہرہ سے کوئی صریح روایت نہیں آئی۔ لہٰذا اس معاملے میں زیادہ بہتر اور اچھی بات یہ ہے کہ توقف کیا جائے۔

﴿ مُخَلَّدُوْنَ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ وہ اپنے شباب، تراوت، نضارت اور بہجت پر باقی رہیں، نہ بوڑھے ہوں نہ ان میں کوئی تبدیلی آئے اور نہ مریں۔ یا تخلید سے مراد تحلیہ ہے کہ کانوں میں بُندے پہنے پھرتے۔ ان کو دیکھو تو ایسے لگیں کہ گویا مزید حسن و جمال کے سبب سے اور رنگ کی صفائی اور چہروں کی تازگی کے سبب سے مجلسوں میں موتی بکھیر دیے گئے ہیں۔

امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اُن کے حسن و رنگ کی سفیدی ہے۔ موتیوں کو جب دھاگے سے نکال کر بساط پر بکھیر دیتے ہیں تو پروئے ہوئے موتیوں سے بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ اہلِ معانی نے کہا ہے کہ ان کے منتشر ہو کر خدمت کرنے کی تشبیہ ہے اور اگر وہ صف باندھ کر کھڑے ہوتے تو منظوم سے تشبیہ دی جاتی، لیکن وہ تو خدمت کے لیے کام کاج کرتے اور دوڑتے پھرتے ہوں گے، اس لیے ان کو منثور کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔ برخلاف حورِ عین کے کہ ان کو لؤلؤ مکنون (چھپے ہوئے موتی) کے مشابہ فرمایا ہے، اس لیے کہ ان سے خدمت لے کر ان کو خوار اور حقیر نہیں کیا جائے گا۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یا ہر جنت میں داخل ہونے والے کو خطاب کیا کہ اگر تو کبھی جنت میں نظر کو دوڑائے اور نعیمِ مقیم کا نظارہ کرے تو ایک ایسی بڑی سلطنت اور مملکت دیکھے کہ جس کا اندازہ نہ کر سکے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ملک کبیر یہ ہے کہ ملائکہ اجازت لے کر داخل ہوں گے، بغیر پروانگی کے نہیں آئیں گے۔ امام مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ملکِ کبیر وسیع ہے جس کی انتہا

[1] نظم الدرر (٢٧٢/٨) فتح البیان (٤٧٣/١٤) [2] تفسیر الخازن (١٦/٧) [3] فتح القدیر (٤٦٥/٥، ٤٦٦)

نہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ان کے سروں پر بادشاہوں جیسے جڑاؤ تاج ہوں گے اور سب سے زیادہ بڑے مرتبے والا وہ شخص ہوگا جو ہر روز اپنے رب کی طرف نظر کرے گا۔ اہلِ جنت پر یا ولدان پر سندسِ سبز کے کپڑے ہوں گے، یہ ابریشم کے لباس کی ایک قسم ہے اور استبرق کی قسم ہے۔ یہ سندس کی ایک قسم ہے۔ سندس باریک کو کہتے ہیں اور استبرق موٹے کو کہتے ہیں۔ ان کی تفسیر سورۃ الکہف میں گزر چکی ہے۔[1] اس جگہ چاندی کے کنگن کا ذکر کیا ہے اور سورۃ الفاطر میں فرمایا ہے: ﴿ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ ﴾ [الفاطر: ۳۳] ''یہ لوگ سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔''

اور سورۃ الحج میں زیورِ گوہر کا بھی اضافی ذکر کیا ہے۔[2] ان آیات میں کچھ تضاد نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان سب قسموں کے کنگن ہوں، تاکہ سب خوبیاں جمع ہو جائیں، یا یہ کہ کبھی سونے کے اور کبھی چاندی کے اور کبھی گوہر کے زیبِ تن کریں گے، جس کا جی جس طرح کے زیور کو جس وقت چاہے گا پہنے گا۔ یا مردوں کا زیور چاندی کا ہوگا اور عورتوں کا سونے کا۔ یا چاندی کے کنگن ولدان کے لیے ہوں گے اور سونے کے عورتوں کے لیے اور لؤلؤ مردوں کے لیے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ زیور اوقات اور اعمال کے حساب سے ہوگا۔ پھر اللہ ان کو شرابِ طہور پلائے گا۔ یہ ایک خاص قسم کی عنایت ہے جو پہلی دونوں اقسام سے بڑھ کر ہوگی۔ لہٰذا اس کے پلانے کو اپنی طرف اضافت کیا۔ یہ شراب اپنے پینے والے کو لذاتِ حسیہ اور حق کے علاوہ کسی دوسری طرف جھکنے سے پاک کر دے گی۔ وہ صرف اللہ کے جمال کا مطالعہ کرنے اور اس کی ملاقات کی لذت حاصل کرنے کے ساتھ منفرد ہو جائیں گے۔ یہ صدیقین کے درجات کی انتہا ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شرابِ طہور ہے نہ کہ نجس جس طرح کہ دنیا میں موصوف بہ نجاست تھے۔[3] یعنی اس کو ہاتھوں نے نہیں چھوا اور نہ پاؤں نے چرکیں کیا۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ جسم میں جا کر بول (پیشاب) نہ بنے گی۔ ﴿ طَهُورًا ﴾ طہارت و نظافت میں مبالغہ کا صیغہ ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جنت کے دروازے پر ایک چشمہ ہے جو کوئی اس کا پانی پیے گا اس کا دل حسد و بدگمانی اور بغض و کینے سے پاک ہو جائے گا۔ امام ابو قلابہ اور ابراہیم نخعی رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ پہلے کھانا لایا جائے گا بعد میں شرابِ طہور پلائی جائے گی۔ ان کے پیٹ خالی ہو جائیں گے۔ ریحِ مسک کی طرح طعام پسینہ ہو کر بہہ جائے گا،[4] پھر اس دخولِ جنت اور نعیم کے مشاہدے کے بعد ان سے کہا جائے گا کہ یہ طرح طرح کی نعمتیں تمھارے اعمال کا بدلہ ہے، یعنی ثواب ہے۔ اللہ کے علم میں جو اس وقت تک تمھارے لیے لگا رکھا ہے تمھاری سعی، یعنی دنیا میں اللہ کی اطاعت پر عمل کرنا مقبول ہوا اور ثواب کے قابل ٹھہرا۔ اللہ کا شکر کرنا بندے کے عمل پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی اطاعت قبول ہوگئی ہے۔[5]

---

(1) رقم الآية (۳۱) (2) رقم الآية (۲۳) (3) فتح القدير (٤٦٧/٥)
(4) فتح القدير (٤٦٧/٥) (5) فتح البيان (٤٦٦/١٤۔٤٦٧)

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا ﴿٢٣﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ
وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ﴿٢٤﴾ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿٢٥﴾
وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ﴿٢٦﴾ إِنَّ هَٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ
الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا ﴿٢٧﴾ نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا
أَسْرَهُمْ وَإِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَا أَمْثَالَهُمْ تَبْدِيلًا ﴿٢٨﴾ إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ
اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ﴿٢٩﴾ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ
كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٣٠﴾ يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ وَالظَّالِمِينَ
أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿٣١﴾

یقیناً ہم ہی نے آپ پر یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے (23) چنانچہ آپ اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کیجیے اور اُن میں سے کسی گناہ گار یا ناشکرے کی اطاعت نہ کیجیے (24) اور صبح و شام اپنے رب کے نام کا ذکر کیجیے (25) اور کچھ (حصہ) رات میں اس کے لیے سجدے کیجیے اور رات گئے تک اس کی تسبیح کیجیے (26) بے شک یہ لوگ دنیا سے محبت رکھتے ہیں اور بھاری دن (قیامت) کو پس پشت ڈالتے ہیں (27) ہم ہی نے انھیں تخلیق کیا اور ان کے جوڑ مضبوط کیے اور جب ہم چاہیں بدل کر ان جیسے (اور لوگ) لے آئیں (28) بے شک یہ ایک نصیحت ہے، پھر جو چاہے اپنے رب کی طرف (پہنچانے والی) راہ اختیار کر لے (29) اور تم نہ چاہو گے، مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بے شک اللہ خوب جاننے والا، خوب حکمت والا ہے (30) وہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب تیار کیا ہے (31)

نزولِ قرآن کا بیان اور صبر و ذکر کرنے کا حکم:

اللہ پاک نے اپنے رسولِ کریم ﷺ پر قرآنِ عظیم نازل کرنے کا احسان رکھا اور فرمایا کہ جس طرح ہم نے تیرا اکرام اس تنزیل سے کیا ہے، اسی طرح تو بھی ہماری تقدیر اور فیصلوں پر صابر وشاکر رہ اور جان لے کہ اللہ تعالیٰ جلد تیری اچھی تدبیر کر دے گا تو کسی کافر یا منافق کے کہنے پر نہ لگ۔ یہ تو یہی چاہتے ہیں کہ تم کو اس تنزیل سے روک دیں، سو تو اپنے رب کا نازل کردہ قرآن ان کو پہنچا دے اور اللہ پر بھروسا کر کہ وہ تجھ کو لوگوں کے ہاتھ سے محفوظ رکھے گا۔ کوئی شخص تیرا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔

اس جگہ ﴿ اٰثِمًا ﴾ سے مراد اپنے افعال میں فاجر ہے اور ﴿ كَفُوْرًا ﴾ سے مراد کافر ہے جس کا دل قرآن کا انکاری ہے۔ تو اپنے رب کا نام دن کے شروع میں اور آخر میں لیا کر اور رات کو سجدہ کیا کر اور بہت لمبی نماز پڑھا کر، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴾ [بني إسرائيل: ٧٩] ''رات کے کچھ حصے میں تہجد کی نماز میں قرآن کی تلاوت کریں یہ زیادتی آپ کے لیے ہے عنقریب آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود میں کھڑا کرے گا۔'' نیز جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ① قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ② نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ③ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴾ [المزمل: ١- ٤] ''اے کپڑے میں لپٹنے والے! رات (کے وقت نماز) میں کھڑے ہو جاؤ مگر کم، آدھی رات یا اس سے بھی کچھ کم کر لے۔ یا اس پر بڑھا دے اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر (صاف) پڑھا کر۔''

دنیا کی محبت کی مذمت اور آخرت کی ترغیب:

پھر اللہ تعالیٰ نے کفار پر اور ان لوگوں پر انکار کیا جو حبِ دنیا اور اقبالِ دنیا میں ترکِ آخرت میں ان کی طرح ہیں، اور فرمایا کہ یہ لوگ جلدی کے فائدے، یعنی دنیا کے فائدے کو پسند کرتے ہیں، بھاری دن کو جو قیامت کا دن ہے اپنے پسِ پشت چھوڑتے ہیں۔ ہم ہی نے ان کو بنایا ہے، ہم جب چاہیں ان کو قیامت کے دن اٹھائیں اور ان کو دوسری دفعہ پیدا کریں۔ یہ پہلی دفعہ کے پیدا کرنے سے دوبارہ پیدا کرنے پر استدلال ہے۔

امام ابن زید اور ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم چاہیں تو اُن کے بدلے میں کوئی اور ہی قوم لے آئیں، اللہ کو یہ قدرت حاصل ہے،[1] جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ⑯ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴾ [الفاطر: ١٦- ١٧] ''اگر وہ چاہے تو تم کو فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق پیدا کر دے اور یہ بات اللہ کو کچھ مشکل نہیں۔'' پھر فرمایا کہ یہ سورت ایک تذکرہ ہے، یعنی نصیحت اب جس کا جی چاہے اس قرآن سے ہدایت حاصل کرے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ [النساء: ٣٩] ''بھلا ان کا کیا نقصان تھا اگر یہ اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لے آتے۔'' لیکن کسی نفس کو یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ ہدایت پر لگے اور ایمان میں داخل ہو اور اپنے لیے کوئی نفع حاصل کرے جس وقت تک اللہ نہ چاہے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت کے مستحق کو جانتا ہے اور اس کے لیے ہدایت کی راہ آسان کر دیتا ہے اور اس کے لیے ہدایت کے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح گمراہی کے مستحق کو جانتا ہے اور اسے ہدایت سے پھیر دیتا ہے۔ لہ الحکمۃ البالغۃ والحجۃ الدامغۃ.

پھر فرمایا کہ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے اور اس نے ظالموں کے لیے عذابِ الیم تیار کر

[1] تفسير الطبري (٢٤/ ١١٨، ١١٩)

رکھا ہے۔ یعنی وہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ جسے وہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔ اے میرے رب! تو نے مجھ کو ہدایت کی ہے اور قرآن سکھایا اور حدیث پڑھائی لیکن میں سخت گناہ گار ہوں مجھ کو میرے برے اعمال اور نفس اور شیطان تیری رحمت اور بخشش سے نا امید کیے دیتے ہیں، تو مجھ کو اپنے فضل اور رحم و کرم سے پکا مسلمان بنا دے اور اعمالِ خیر کی توفیق دے اور استقامت کی ہمت دے اور اپنی مرضی کے خلاف ہر عمل سے مجھ کو بچا، کیوں کہ مشیت تیری ہے نہ کہ میری، میں اپنا سب کچھ بھلا چاہتا ہوں اور برے کام سے بچنے کی نیت رکھتا ہوں، لیکن جب تک تو نہ چاہے گا میں کوئی بھی بھلائی نہیں کر سکتا۔ اب میری عمر اخیر ہے ستاون (۵۷) برس کا ہوا۔ گور و کفن کے کنارے سے جا لگا، میری کوئی آرزو باقی نہیں ہے سوائے اس کے توفني مسلما وألحقني بالصالحين، اللهم آمين.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ یہ قرآن ہم ہی نے تجھ پر اتارا ہے، تو اس کو اپنے پاس سے نہیں لایا جس طرح کہ مشرک بکتے ہیں۔ اس میں نبی اکرم ﷺ کے دل کو قوت اور تسلی دینا ہے اور شرح صدر کرنا ہے، تا کہ کہانت اور سحر کی تہمت سے جو وحشت ہوتی ہے وہ زائل ہو جائے اور اپنے رب کی قضا اور تقدیر پر صابر رہے اور ایک مدتِ معین تک اللہ کی نصرت میں تاخیر ہونے سے پریشان خاطر نہ ہو، اور کسی گناہ کے مرتکب اور کفر میں بہت بڑھ جانے والے کی اطاعت نہ کر۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد ﴿ اٰثِمًا ﴾ سے اس جگہ عتبہ بن ربیعہ ہے اور ﴿ كَفُوْرًا ﴾ سے مراد ولید بن مغیرہ ہے۔ ان دونوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا: تم اس امر سے پھر جاؤ، ہم تم کو مال اور زوجہ سے راضی کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے پیغمبر! تم ان کی بات نہ مانو، تم تو صبح و شام اپنے رب کا نام لیے جاؤ، اس سے مراد تمام اوقات میں دوامِ ذکر ہے یا مراد صبح اور عصر کی نماز ہے۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نمازِ فجر، ظہر اور عصر ہے، اس لیے کہ لفظ میں اصیل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے،[1] مگر شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصیل کا عصر کا وقت ہونا ظاہر ہے اور ظہر کا باعتبار آخر وقت ہے، کیوں کہ زوال اور زوال کے قریب کے وقت کو اصیل نہیں کہتے۔[2] رات میں سجدہ کرنے سے مراد نمازِ مغرب و عشاء ہے، یا صرف نماز جو رات کے کسی وقت میں ہو بغیر تعیین کے۔ اور تسبیح عام ہے نماز میں ہو یا نماز کے علاوہ۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد نفل نماز ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ آیت نمازِ پنج گانہ سے منسوخ ہو گئی ہے۔[3] بعض نے کہا ہے کہ حکم استحباب اور ندب کے لیے ہے، یعنی مستحب اور نفلی عبادت کے لیے ہے اور یہ نبی اکرم ﷺ کے لیے

---

[1] تفسير البيضاوي (٥/٤٣٠) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٨/٢٩٢) [3] فتح القدير (٥/٤٦٩)

خاص ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ کفارِ قریش اور جو لوگ ان کے موافق ہیں وہ دنیا کو پسند کرتے ہیں اور آخرت کو چھوڑتے ہیں، حالاں کہ آخرت کا دن اپنی سختیوں اور ہولنا کیوں کے سبب سے نہایت بھاری ہوگا۔

ترک سے مراد آخرت کے لیے استعداد کا نہ ہونا اور آخرت سے بے پروائی کرنا ہے جس طرح کہ کسی شے کو پسِ پشت ڈال دیں، حالاں کہ ان کو ہم نے خاک سے، پھر نطفہ سے، پھر مضغہ سے، پھر علقہ سے بنا کر پورا کر دیا، کسی غیر کا اس میں کچھ دخل نہ تھا، نہ اشتراک کے طور پر اور نہ مستقل طور پر۔ ''أسرہ'' سے مراد شدتِ خلق ہے، یعنی ہم نے ان کی پیدائش خوب قوی و مضبوط کی، یعنی رگوں اور پٹھوں سے اچھی طرح جکڑ بند کر دیا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد مفاصل (جوڑ) ہیں۔[1] بعض نے کہا ہے کہ وہ عجب الذنب ہے کہ وہ قبر میں ریزہ ریزہ نہیں ہوتا۔

''أسر'' بالضم احتباسِ بول (پیشاب کو روکنا) کو کہتے ہیں، جس طرح کہ غائط کے لیے حصر بولا جاتا ہے۔ ہم چاہیں تو ان سب کو مار کر رکھ دیں اور ایسے لوگ لائیں جو ان سے زیادہ ہمارے مطیع ہوں، یا یہ معنی ہیں کہ ہم ان کو کسی بری صورت میں مسخ کر دیں۔ یہ سورت خلق کے لیے ایک نصیحت اور موعظت ہے، اس کے تصفح (غور کرنے) میں غافل لوگوں کے لیے تنبیہات (آگاہی) ہیں اور طالبین کے لیے اس کے تدبر اور تذکر میں بہت زیادہ فوائد ہیں۔

اب جو چاہے وہ اس راستے سے اپنے رب کی طرف آئے، کیوں کہ ہم نے سب امور کا حال بیان کر دیا اور شک و شبہہ دور کر ڈالا اور فہم میں رکاوٹ بننے والی جتنی چیزیں تھیں وہ اٹھا دیں اب اس راہ پر چلنے سے کوئی مانع نہیں سوائے بندے کی اپنی مرضی کے، لیکن تم اس راہ پر نہیں چل سکتے جب تک کہ اللہ تعالیٰ نہ چاہے، کیوں کہ ہر امر کا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے نہ کہ تمھارے ہاتھ میں۔ اکیلا بندے کا چاہنا نہ خیر کو لا سکتا ہے نہ شر کو دور کر سکتا ہے، اگرچہ وہ نیکی اور بھلائی کے ارادے پر ثواب اور اجر دیا جاتا ہے جس طرح کہ حدیث میں مروی ہے: «اَلْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى»[2] ''اعمال نیتوں کے ساتھ معتبر ہیں، ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جو اس نے نیت کی۔'' یہ آیت معتزلہ اور قدریہ پر حجت ہے۔ اللہ دانا حکمت والا ہے جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے۔ مراد رحمت سے ملتی ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کی نیت سچی ہے اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔[3] رہے ظالم تو ان کے لیے عذابِ الیم تیار ہے۔ ظالم سے مراد مشرک ہے۔[4] اللهم إنا نسئلك العفو و العافية في الدنيا والآخرة، إنك تحب العفو فاعف عنا.

---

[1] تفسير الطبري (١١٨/٢٤) [2] صحيح البخاري (١) صحيح مسلم (١٩٠٧)
[3] فتح القدير (٤٧٠/٥) [4] فتح البيان (٤٧٧/١٤-٤٧١)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْمُرْسَلٰتِ

اس کی پچاس (۵۰) آیتیں ہیں، مکے میں اتری ہے۔ یہی قول امام حسن، عکرمہ، عطاء اور جابر رحمہم اللہ کا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کے سوا جو کہ مدنی ہے باقی سورت مکی ہے: ﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ ﴾[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[2]

شانِ نزول:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں ایک غار میں تھے کہ یہ سورت نازل ہوئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پڑھتے تھے اور میں اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن سے یاد کرتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دہن تر تھا کہ اتنے میں ایک سانپ نے جست کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو قتل کرو۔ ہم جلدی سے دوڑے، وہ بھاگ گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ تمھارے شر سے بچ گیا جس طرح کہ تم اس کے شر سے بچ گئے۔[3] (رواه الشيخان وغيرهما)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس سورت کو پڑھ رہے تھے اور ام الفضل سنتی تھی، کہا: اے بیٹے! تم نے اس سورت کو پڑھ کر مجھے یاد دلا دیا کہ سب سے پیچھے میں نے اسی سورت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مغرب کی نماز میں پڑھتے تھے۔[4] (أخرجه في الصحيحين) امام احمد رحمہ اللہ کی روایت یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان کی ماں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ مغرب میں ﴿ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ﴾ پڑھتے تھے۔[5]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ کہا ہے کہ یہ سورت مکی ہے۔[6]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۝١ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۝٢ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۝٣
فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۝٤ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝٥ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۝٦ اِنَّمَا
تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝٧ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝٨ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۝٩

① تفسير القرطبي (١٩/١٥٣) ② الدر المنثور (٨/٣٨٠) ③ صحيح البخاري (١٧٣٣) صحيح مسلم (٢٢٣٤)
④ صحيح البخاري (٧٢٩) صحيح مسلم (٤٦٢) ⑤ مسند أحمد (٦/٣٣٨) ⑥ تفسير ابن كثير (٨/٢٩٦۔ ط: دار طيبة)

وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝۱۰ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۝۱۱ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ۝۱۲
لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۝۱۳ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۝۱۴ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۵

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

لگاتار بھیجی گئی ہواؤں کی قسم! ① پھر تند و تیز چلتی طوفانی ہواؤں کی ② اور (مینہ برسانے، بادل) پھیلانے والی ہواؤں کی قسم ③ پھر انھیں پھاڑ کر جدا جدا کرنے والی ہواؤں کی ④ پھر ذکر اُتارنے والے فرشتوں کی (قسم) ⑤ عذر (ختم کرنے) یا ڈر سنانے کو ⑥ یقیناً تم سے جس (قیامت) کا وعدہ کیا جاتا ہے، وہ ضرور واقع ہو کر رہے گی ⑦ پھر جب ستارے بے نور کر دیے جائیں گے ⑧ اور جب آسمان پھاڑ دیا جائے گا ⑨ اور جب پہاڑوں کی دھجیاں اُڑا دی جائیں گے ⑩ اور جب رسولوں کو مقرر وقت پر لایا جائے گا ⑪ (کہا جائے گا:) کس دن کے لیے انھیں موخر کیا گیا؟ ⑫ فیصلے کے دن کے لیے ⑬ اور آپ کیا سمجھے فیصلے کا دن کیا ہے؟ ⑭ اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے بربادی ہے ⑮

آخرت کے وقوع پر کئی چیزوں کی قسمیں:

ایک ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں بارش کی علامت۔ ایک تیز وتند آندھی جو دبی ہوئی مٹی کو ابھارتی ہیں۔ ایک وہ جو بادل ملک ملک میں بانٹیں۔ اور فرشتے قرآن اتارتے ہیں جس کا مقصد کافروں سے الزام اتارنا ہے کہ یہ نہ کہیں کہ ہم کو خبر نہ تھی اور جن کی قسمت میں ایمان ہے ان کو ڈرانا منظور ہے، تاکہ ایمان لائیں، یعنی ہر امت کا حساب باری باری لینا ٹھہرے۔ انتہی۔[1]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ﴾ سے مراد ملائکہ ہیں، اسی طرح امام مسروق، ابوالضحیٰ اور مجاہد رحمہم اللہ سے ایک روایت میں مروی ہے اور امام سدی اور ربیع بن انس رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد رسل ہیں۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ملائکہ ہیں۔ یہی قول امام ابو صالح رحمہ اللہ کا عاصفات ناشرات فارقات ملقیات کے بارے میں ہے کہ ان سب الفاظ سے مراد فرشتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مرسلات سے مراد ہوا ہے، اسی طرح عاصفات ناشرات کو ہوا کہا ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما و مجاہد و قتادہ و ابو صالح رحمہم اللہ کا ایک روایت میں ہے۔ ابن جریر نے ﴿ وَالْمُرْسَلٰتِ ﴾ میں توقف کیا ہے کہ آیا یہ ملائکہ ہیں جو عرف کے ساتھ بھیجے گئے یا جیسے عرف فرس کہ بعض کے پیچھے بعض ہوتے ہیں یا مراد ریاح ہیں کہ تھم تھم کر چلتے ہیں او

عاصفات میں قطعی طور پر کہا ہے کہ مراد ملائکہ ہیں۔ یہی قول عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور اُن کے توابع کا ہے۔ امام علی اور سدی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں اور ناشرات میں توقف کیا ہے کہ ملائکہ ہیں یا ریح۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ناشرات سے مراد بادل ہیں، یعنی بینہ۔[1]

زیادہ ظاہر یہ ہے کہ ﴿ اَلْمُرْسَلٰتِ ﴾ ریاح ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ ﴾ [الحجر: ۲۲] ''اور ہم بھیجتے ہیں بوجھل ہوائیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ﴾ [الأعراف: ۵۷] ''اور وہ ایسا ہے کہ اپنی بارانِ رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ خوش کر دیتی ہیں۔'' اسی طرح ﴿ اَلْعٰصِفٰتِ ﴾ ریاح ہیں۔ ہوا جب چلتی ہے اور اس میں آواز ہوتی ہے تو کہتے ہیں: ''عَصَفَتِ الرِّيَاحُ'' اسی طرح ﴿ اَلنّٰشِرٰتِ ﴾ ریاح ہیں جو بادل کو آسمانوں کے کناروں میں پراگندہ کرتی ہیں جس طرح کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ ''فَارِقَات وملقیات'' سے مراد ملائکہ ہیں۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن مسعود، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام مسروق، مجاہد، قتادہ، ربیع، سدی اور ثوری رحمہ اللہ کا ہے۔[2] اس میں کچھ اختلاف نہیں ہے، کیوں کہ فرشتے رسولوں پر اترتے ہیں اور حق و باطل، ہدایت و گمراہی اور حلال و حرام میں فرق ظاہر کرتے ہیں اور رسولوں کے پاس وحی لاتے ہیں اور مخلوق کے عذر کو دور کرنے اور انھیں ڈرانے کا القا کرتے ہیں اور اللہ کے احکام کی مخالفت کی صورت میں عذاب ہونے سے ڈراتے ہیں۔

روزِ قیامت رونما ہونے والی بعض تبدیلیاں:

پھر اللہ تعالیٰ نے اس پر قسم کھائی کہ جس قیامِ ساعت کا اور نفخِ صور کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے اور جسموں کے دوبارہ زندہ ہونے کا اور پہلوں اور پچھلوں کو جمع کرنے کا صعیدِ واحد (ایک ہی مٹی) میں اور ہر عمل کرنے والے کی جزا وسزا کا اس کا عمل خیر کا ہو تو جزائے خیر اور اگر شر ہو تو جزائے شر کا جو تم سے وعدہ کیا گیا ہے یہ سب لا محالہ طور پر ہونے والا ہے، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔ اس دن تاروں کی چمک جاتی رہے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ﴾ [التکویر: ۲] ''اور جب ستارے بے نور ہو جائیں گے۔'' نیز جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴾ [الإنفطار: ۲] ''اور جب ستارے جھڑ جائیں گے۔''

آسمان کی توڑ پھوڑ سے یہ مراد ہے کہ آسمان پھٹ جائیں، شق ہو جائیں۔ ان کے اطراف بدل جائیں، کنارے کمزور ہو جائیں اور پہاڑ اڑ جائیں، یعنی جاتے رہیں۔ نہ وہ خود باقی رہیں نہ ان کا کچھ اثر باقی رہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴾ [طٰہٰ: ۱۰۵] ''وہ آپ سے پہاڑوں

---

(1) تفسير الطبري (۲۴/۱۲۲۔۱۲۷) تفسير ابن كثير (۴/۵۸۹) (2) تفسير الطبري (۲۴/۱۲۷، ۱۲۸) تفسير ابن كثير (۵۸۹، ۵۹۰)

کی نسبت سوال کرتے ہیں تو آپ کہہ دیں کہ انھیں میرا رب ریزہ ریزہ کر کے اڑا دے گا۔" نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ﴾ [الكهف: ٤٧] "اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور زمین کو تو صاف کھلی ہوئی دیکھے گا اور تمام لوگوں کو ہم اکٹھا کریں گے ان میں سے ایک کو بھی باقی نہ چھوڑیں گے۔"

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ أُقِّتَتْ ﴾ بہ معنی "جُمِعَتْ" ہے، یعنی پیغمبر لوگ فراہم کیے جائیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ ﴾ [المائدة: ١٠٩] "جس روز اللہ تعالیٰ تمام پیغمبروں کو جمع کرے گا۔" اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ أُقِّتَتْ ﴾ سے مراد "أُجِّلَتْ" ہے، یعنی ان کے لیے ایک اجل اور مدت مقرر ہوئی۔ امام ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی "أُوْعِدَتْ" ہے،[1] گویا اس آیت کے معنی میں ٹھہرایا ہے: ﴿ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتٰبُ وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾ [الزمر: ٦٩] "اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھے گی، نامۂ اعمال حاضر کیے جائیں گے، نبیوں اور گواہوں کو لایا جائے گا اور لوگوں کے درمیان حق حق فیصلے کر دیے جائیں گے اور وہ ظلم نہ کیے جائیں گے۔"

پھر فرمایا کہ کس دن کے لیے رسولوں کے کام میں تاخیر کی گئی یہاں تک کہ قیامت قائم ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [إبراهيم: ٤٧- ٤٨] "آپ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ اللہ اپنے نبیوں سے وعدہ خلافی کرے گا، اللہ بڑا ہی غالب اور بدلہ لینے والا ہے جس دن زمین اس کے سوا اور ہی بدل دی جائے گی اور آسمان بھی، اور سب کے سب اللہ واحد غلبے والے کے روبرو ہوں گے۔" سو یہ دن یوم الفصل کا ہو گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ﴾ پھر اس دن کی تعظیم شان کے لیے فرمایا تو نے کیا جانا کہ "یوم الفصل" کیا ہے، یہ وہ دن ہو گا کہ اس دن مکذبین کے لیے خرابی ہے اللہ کے عذاب سے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے: جمہور مفسرین کہتے ہیں کہ ﴿ اَلْمُرْسَلٰتِ ﴾ سے مراد ریاح ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ریح ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ملائکہ ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ انبیاء ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد سحاب ہے کہ اس میں انتقام بھی ہوتا ہے اور نعمت بھی ہوتی ہے۔ عُرف نُکر کی ضد ہے۔ یا بہ معنی پے در پے۔

[1] تفسير الطبري (٢٤/١٢٩، ١٣٠) [2] تفسير الطبري (٢٤/١٢٢)

﴿ اَلْعٰصِفٰتِ ﴾ سے مراد تند ہوائیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا بغیر اختلاف کے[1] کسی نے کہا ہے کہ ملائکہ ہیں جو ہوا پر مقرر ہیں، ہوا کو تیز چلاتے ہیں اور کافر کی روح کو تند کرتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ہلاک کرنے والی نشانیاں ہیں، جیسے زلزلے اور اسی طرح کی اور چیزیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود، علی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ مراد ریح ہے۔[2]

﴿ اَلنّٰشِرٰتِ ﴾ وہ ہوائیں ہیں جو پانی لاتی ہیں اور بادل کو تقسیم کرتی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مراد ہوا ہے۔[3] یا بادلوں کے موکل فرشتے ہیں جو ابر کو بانٹ کر جدا کر دیتے ہیں۔ یا اپنے پَر آسمان کی فضا میں نزولِ وحی کے وقت کھولتے ہیں۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا ہے، قیامت میں ارواح منتشر ہوں گی۔ ﴿ اَلْفٰرِقٰتِ ﴾ فرشتے ہیں جو حق و باطل میں فرق کرتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہوا ہے جو بادل کو جدا کرتی ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ آیاتِ قرآن ہیں جو حق و باطل میں فرق کرتی ہیں، یا مراد رسول ہیں جو امر و نہی کے درمیان فرق کرنے والے ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ملائکہ جو حق و باطل میں فرق کرتے ہیں۔ ﴿ اَلْمُلْقِيٰتِ ﴾ ملائکہ ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بالاجماع، یعنی انبیاء کی طرف وحی کا القا کرتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جبریل علیہ السلام مراد ہیں اور جمع کا لفظ تعظیم کے لیے لایا گیا ہے۔ امام قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد رسول ہیں جو اللہ کی نازل کردہ شریعت کو امتوں کی طرف القا کرتے ہیں۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ذکر سے مراد تنزیل ہے۔[5] اللہ نے پانچ صفتوں کی قسم کھائی جن کے موصوف محذوف ہیں۔ بعض نے سب جگہ ریاح کو موصوف ٹھہرایا اور بعض نے ہر جگہ ملائکہ بتائے اور بعض نے مغایرت کی، یعنی کبھی ریاح کہا اور کبھی ملائکہ۔ جلال محلی رحمہ اللہ نے پہلی تین صفتوں کا موصوف ایک ہی بتایا کہ وہ ریاح ہے اور چوتھی کا موصوف آیات کو بتایا اور پانچویں صفت کا موصوف ملائکہ کو ٹھہرایا۔[6] اس راہ پر ان کے سوا اور کوئی مفسر نہیں چلا۔ اس جگہ مفسرین کا اختلاف تمثیل پر محمول ہے نہ کہ تعیین پر۔ راجح یہی ہے کہ پہلی تین صفتیں ریاح کی ہیں اور چوتھی اور پانچویں صفت ملائکہ کی ہے۔ اسی کو امام زجاج اور قاضی رحمہما اللہ وغیرہما نے اختیار کیا ہے۔[7]

﴿ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ملائکہ کا وحی کو القاء کرنا اللہ کی طرف سے اعذار ہے، یا اپنے عذاب سے انذار (ڈرانا) ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[8] بعض نے کہا ہے کہ محققین (حق سمجھنے والے) کے لیے عذر

[1] تفسير القرطبي (١٩/١٥٥)
[2] تفسير الطبري (٢٤/١٢٥)
[3] تفسير الطبري (٢٤/١٢٦)
[4] تفسير القرطبي (١٩/١٥٥، ١٥٦)
[5] الدر المنثور (٨/٣٨٢)
[6] تفسير الجلالين (١/٧٨٤)
[7] معاني القرآن (٥/٢٦٥)
[8] تفسير القرطبي (١٩/١٥٦)

ہے اور مبطلین (باطل سمجھنے والے) کے لیے نذر ہے۔ بہر حال جو وعدہ قیامت کے قیام کا کیا گیا ہے وہ ضرور ہو گا۔ اس کے واقع ہونے میں کوئی دھوکا نہیں ہے۔ پھر اس وعدے کا وقت بتایا کہ یہ اس وقت واقع ہو گا جب تاروں کا نور جاتا رہے، آسمان پھٹ جائیں اور پہاڑ اڑ جائیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی زمین یکساں و برابر ہو جائے، کچھ نشیب و فراز باقی نہ رہے۔ رسولوں کے لیے ان کے اور ان کی امتوں کے درمیان فیصلے اور قضا کا ایک وقت ٹھہرا دیا جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ معاملہ دنیا کا ہے کہ اللہ نے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے لیے عذاب اتارنے کا ایک وقت مقرر کر دیا ہے لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ ابو علی فارسی نے کہا ہے کہ ''یوم الدین'' میں ان کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔[1] بعض نے کہا: ﴿ اُقِّتَتْ ﴾ کے یہ معنی کیے ہیں کہ ''أُرْسِلَتْ لِأَوْقَاتٍ مَعْلُومَةٍ عَلَى مَا عَلِمَ اللّٰهُ بِهِ'' یہ سوالیہ انداز کہ کس دن کی ان کو دیر ہے؟ تعظیم و تعجب کے لیے ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس تاقیت (وقت مقرر کرنے) سے مراد اس وقت کا بیان ہے جس میں رسول اپنی امتوں پر شہادت کے لیے حاضر کیے جائیں گے،[2] پھر اس دن کا بیان کیا ہے کہ وہ ایک عجیب خوفناک امر ہے جس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اس دن ان لوگوں کی خرابی ہے جنھوں نے رسولوں کی تکذیب کی ہے اور وحی اور دوبارہ زندہ ہونے اور ایسے امور کا انکار کیا ہے۔

''ویل'' بہ معنی ہلاکت ہے۔ یا یہ جہنم میں ایک وادی ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس وادی میں اہلِ نار کے زرد پانی کی ندی بہتی ہو گی۔[3] یہ آیت شریف اس سورت مبارکہ میں دس بار دھرائی گئی ہے، اس لیے کہ ''ویل'' کی تقسیم ان کی تکذیب کے مطابق کی گئی ہے۔ ایک چیز کو جھٹلانے والے کے لیے ایک عذاب ہے اور دوسری شے کو جھٹلانے والے کے لیے دوسرا عذاب ہے اور اکثر ایک شے کی تکذیب سے دوسری شے کی تکذیب زیادہ بڑی ہوتی ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رغبت دلانے اور ڈرانے کے مقام میں کسی بات کو دھرانا مستحسن ہے۔ بالخصوص جبکہ سابقہ آیات سابقہ دہرائے جانے کے موقعے پر مختلف ہوں جس طرح کہ اس جگہ اتفاق ہوا ہے۔[4]

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿16﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿17﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ
بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿18﴾ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿19﴾ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ
مَّهِيْنٍ ﴿20﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿21﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿22﴾ فَقَدَرْنَا ۖ
فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿23﴾ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿24﴾ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ
كِفَاتًا ﴿25﴾ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿26﴾ وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ
وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿27﴾ وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿28﴾

---

[1] تفسیر القرطبي (۱۹/۱۵۷) [2] فتح القدير (٥/٤٧٣) [3] الدر المنثور (٨/٣٨٣) [4] فتح البيان (١٥/٩-١٤)

کیا ہم پہلے لوگوں کو ہلاک نہیں کر چکے؟⑯ پھر ہم پچھلوں کو ان کے پیچھے لگائیں گے ⑰ ہم مجرموں سے یہی کچھ کرتے ہیں⑱ اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے تباہی ہے⑲ کیا ہم نے تمھیں حقیر پانی (منی) سے تخلیق نہیں کیا؟⑳ پھر ہم نے اسے ایک محفوظ جگہ رکھا㉑ ایک مقرر اندازے (مدت) تک ㉒ پھر ہم نے اندازہ لگایا تو کیا خوب اندازہ لگانے والے ہیں㉓ اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے ہلاکت ہے㉔ کیا ہم نے نہیں بنائی زمین سمیٹنے والی㉕ زندوں کو اور مردوں کو؟㉖ اور ہم نے اس میں مضبوط (جمے ہوئے) اونچے پہاڑ بنائے اور تمھیں میٹھا پانی پلایا㉗ اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے تباہی ہے㉘

اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کرشمے، عبرت کے نمایاں پہلو:

اولین سے مراد مکذبینِ رسل متقدمین ہیں جنھوں نے اپنے پیغمبروں کی ان کی رسالت کے بارے میں مخالفت کی تھی۔ آخرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان کے مشابہ ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے ہیں۔[1] (قاله ابن جرير)۔ پھر اللہ نے ان کی پیدائش پر اپنا احسان رکھا اور پہلی دفعہ کے پیدا کرنے کو ان کے دوبارہ پیدا کرنے کے لیے حجت ٹھہرایا اور فرمایا کہ ہم نے تم کو ایک ضعیف حقیر پانی سے بنایا ہے جس کی اللہ کی قدرت کے سامنے کچھ قدر نہیں ہے، جس طرح کہ سورت یٰسٓ میں گزر چکا ہے۔[2] بسر بن جحاش رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے «ابْنَ آدَمَ أَنّٰى تُعْجِزُنِيْ وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ مِثْلِ هٰذِهِ»[3] ”اے ابن آدم! تو مجھے کیسے عاجز کر سکتا ہے جب کہ میں نے تجھے اس کی مثل سے پیدا کیا ہے۔“ ﴿قَرَارٍ مَّكِيْنٍ﴾ سے مراد رِحم ہے جس میں مرد اور عورت کا پانی ٹھہرتا ہے اور رحم اس پانی کا نگہبان ہے۔

﴿قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ سے مراد مدتِ معین ہے، چھ مہینے یا نو مہینے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿كِفَاتًا﴾ سے مراد کِن (پردہ) ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زمین مردے کو سمیٹ لیتی ہے، اس میں کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زمین کا پیٹ تمھارے مردوں کے لیے ہے اور اس کی پشت تمھارے زندوں کے لیے، یہی قول امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ کا بھی ہے۔[4] ﴿رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ﴾ سے مراد پہاڑ ہیں جو زمین پر جمے ہیں، تاکہ وہ ممتد (پھیلی ہوئی) اور مضطرب نہ ہو۔ ﴿مَآءً فُرَاتًا﴾ سے میٹھا اور شیریں پانی ہے جو بادلوں سے اترتا ہے، یا زمین کے چشموں سے نکلتا ہے، اب اس کی خرابی ہے جس نے ان مخلوقات میں کہ اپنے خالق کی عظمت کی دلیل ہیں تامل (غور) کیا اور پھر بدستور اپنی تکذیب پر جما رہا۔

---

① تفسير الطبري (٢٤/١٣١، ١٣٢) ② رقم الآية (٧٧) ③ مسند أحمد (٤/٢١٠) ④ تفسير الطبري (٢٤/١٣٤، ١٣٥)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اللہ نے پہلی کفار امتوں کی ہلاکت کی خبر دی، آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین ﷺ تک کی امتوں کی، جیسے قومِ نوح وعاد وثمود کی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد عذاب دینا ہے اور اس سوالیہ انداز سے مراد نفی کے بعد دیے گئے کلمات کا اقرار کرانا ہے۔ آخرین سے مراد مکہ کے کفار اور ان کے موافقین ہیں جو نبی اکرم ﷺ کی تکذیب کرنے والے ہیں۔ یا آخرین سے مراد قومِ شعیب، لوط اور موسیٰ علیہم السلام ہیں اور اولین سے مراد قومِ نوح، عاد اور ثمود ہیں۔ سو ہم اہل شرک سے دنیا اور آخرت میں اسی طرح کرتے ہیں۔ بے قدر پانی سے مراد نطفہ ہے جو نجس، بدبودار، حقیر اور ذلیل وخوار چیز ہے۔ یہ کفار کو خوف دلانے کی ایک دوسری طرز ہے، اس کی نظیر یہ آیت ہے: ﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾ [السجدة: ٨] ”پھر اس کی نسل ایک بے وقعت پانی کے نچوڑ سے چلائی۔“

﴿قَرَارٍ مَّكِيْنٍ﴾ سے مراد مستحکم جگہ ہے، یعنی منی رحم میں آفات مفسدہ سے محفوظ رہتی ہے۔ جیسے ہوا اور اسی طرح کی اور چیزیں۔ ﴿قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ سے مراد مقدار ہے جو اللہ تعالیٰ نے ولادت کے لیے مقدر کی ہے، یعنی حمل کی مدت نو ماہ یا کم وبیش۔ پھر فرمایا: ہم بہت اچھا اندازہ کرنے والے ہیں۔ کسی کی مدت حمل کو چھوٹا اور کسی کو طویل کرتے ہیں۔ ”کفت“ لغت میں بہ معنی ضم وجمع ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو تمام زندوں کو اپنی پشت پر جمع کرنے والی اور مردوں کو اپنے بطن میں ضم کرنے والی بنایا ہے۔

امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”کفات“ بہ معنی آوند ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ جو فضلات انسان سے خارج ہوتے ہیں وہ زمین میں دفن کیے جاتے ہیں، یہ معنی اس کے کفات ہونے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا﴾ زمین کی صفت ہے، یعنی جو زمین پیداوار والی ہے وہ احیاء ہے اور جس میں کچھ نہیں اُگتا وہ اموات ہے۔ ﴿رَوَاسِيَ﴾ کے معنی ہیں طوال (لمبی)۔ ہر عالی شے کو شامخ کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی ”جِبَالًا مُشْرِفَاتٍ“[2] بعض نے ثوابت عالیات (بلند ثوابت)۔ فرات میٹھے پانی کو کہتے ہیں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سب اشیاء دوبارہ زندہ ہونے سے زیادہ عجیب ہیں۔[3] روایت میں مروی ہے کہ زمین میں جنت سے چار دریا ہیں: سیحان وجیحان اور فرات ونیل، یہ سب جنت کی نہریں ہیں۔[4]

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ اِنَّهَا تَرْمِيْ

[1] تفسير القرطبي (١٩/١٦١) [2] تفسير الطبري (٢٤/١٣٥) [3] تفسير البغوي (٨/٣٠٦)
[4] صحيح مسلم (٢٨٣٩) فتح البيان (١٥/١٤-١٧)

بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ﴿٣٢﴾ كَأَنَّهُ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿٣٣﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٣٤﴾
هٰذَا يَوْمُ لَا يَنطِقُونَ ﴿٣٥﴾ وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُونَ ﴿٣٦﴾ وَيْلٌ
يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٣٧﴾ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰكُمْ وَالْأَوَّلِينَ ﴿٣٨﴾
فَإِن كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيدُونِ ﴿٣٩﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ ﴿٤٠﴾

(کہا جائے گا:) چلو اس (عذاب) کی طرف جس کو تم جھٹلاتے تھے (29) چلو تین شاخوں والے سائے (دھوئیں) کی طرف (30) نہ ٹھنڈک پہنچانے والا اور نہ شعلوں سے بچاؤ کرے (31) بے شک جہنم (آگ کے اتنے بڑے) شرارے پھینکے گی جیسے محل (32) گویا وہ زرد اونٹ ہوں (33) اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بربادی ہے (34) یہ (وہ) دن ہے کہ (لوگ) بول نہیں سکیں گے (35) اور نہ انھیں اذن ملے گا کہ وہ معذرت کر سکیں (36) اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے تباہی ہے (37) یہ فیصلے کا دن ہے، ہم تمھیں اور پہلوں کو جمع کریں گے (38) پھر اگر تمھارے پاس کوئی چال ہے تو میرے خلاف چلو (39) اس دن جھٹلانے والوں کے لیے ہلاکت ہے (40)

مجرم روزِ قیامت جہنم رسید ہوں گے:

سائے کی تین شاخیں یعنی پھٹے ہوئے سائے جس میں سے گرمی آتی رہے۔ انتہٰی

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ان کفار کی خبر دی جو قیامت، جزا، جنت اور دوزخ کو جھٹلاتے ہیں کہ ان سے قیامت کے دن یہ بات کہی جائے گی کہ آؤ ایک سائے کے نیچے، یعنی لہبِ نار کے جس کے تین شعبے ہیں۔ آگ کی وہ لپٹ جس وقت اونچی ہو گی اور اس کے ساتھ دھواں بھی ہو گا تو وہ شدت اور قوت سے تین پھانک ہو جائے گی۔ دخان کا یہ سایہ جو لہب کے سامنے ہو گا نہ تو فی نفسہٖ سایہ دار ہے اور نہ اس لہب سے بچاتا ہے، بلکہ اس شعلۂ آتش سے بڑی بڑی چنگاریاں اڑتی ہیں، جیسے کوئی بڑا محل ہو۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جیسے قلعہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ، مالک اور زید بن اسلم رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ مراد درختوں کی جڑیں ہیں، وہ سیاہ اونٹوں کی طرح ہوں گی۔ یہی قول امام مجاہد، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ کا ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ کہتے ہیں: مراد کشتیوں رسیاں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول ہے کہ ﴿صُفْرٌ﴾ تانبے کے ٹکڑے ہیں۔[1] صحیح بخاری میں

(1) تفسیر الطبري (۱۳۷/۲۵-۱۴۱) تفسیر ابن کثیر (۵۹۱/٤)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ ہم تین گز کی یا اس سے زیادہ کی لکڑی لے کر سردی کے لیے کھڑے کرتے۔ اس کا نام قصر رکھتے۔ ﴿ جِمٰلَتٌ صُفۡرٌ ﴾ سے مراد جہال سفن ہیں کہ جمع ہو کر اوساطِ رجال کی طرح ہو جاتیں۔ [1]

قیامت کے دن مجرموں کی عاجزی ودر ماندگی:

اللہ پاک نے کہا ہے کہ اس دن ان کو بات کرنے کی قدرت نہ ہوگی اور نہ ہی عذر پیش کرنے کی اجازت ہو گی، بلکہ خود ان پر حجت قائم ہوگی اور ان کا ظلم ثابت ہو جائے گا، وہ کچھ نہ بول سکیں گے۔ عرصاتِ قیامت میں حالات مختلف ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کبھی ایک حالت کی اور کبھی دوسری حالت کی خبر دیتا ہے، تاکہ اس سے ہولنا کیوں کی شدت اور زلزال کی کثرت پر دلالت ہو۔ لہٰذا اس کالم کے ہر فصل کے بعد یہ فرماتا ہے کہ اس دن مکذبین کی خرابی ہے۔ پھر بندوں کو مخاطب کر کے فرمائے گا کہ یہ دن فیصلے کا دن ہے، آج سب پہلے اور پچھلے جمع ہیں۔ اس دن یہ اجتماع ایک ہموار زمین پر ہوگا۔

پکارنے والے کی آواز کو سنیں گے اور آنکھیں سارا نظارہ کریں گی۔ یہ فرمانا کہ ''اگر تمھارے لیے کوئی چال ہے تو چل لو'' شدید ملامت اور سخت وعید کے طور پر ہے، یعنی اگر تم کو میرے قبضے سے خلاصی پانے کی قدرت ہے اور تم میرے حکم سے نجات پا سکتے ہو تو بہتر ہے تم کر گزرو اور چھوٹ جاؤ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰمَعۡشَرَ الۡجِنِّ وَالۡاِنۡسِ اِنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ اَنۡ تَنۡفُذُوۡا مِنۡ اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ فَانۡفُذُوۡا ؕ لَا تَنۡفُذُوۡنَ اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ ﴾ [الرحمن: ۳۳] ''اے گروہِ جنات وانسان! اگر تم میں آسمانوں اور زمین کے کناروں سے باہر نکل جانے کی طاقت ہے تو نکل بھاگو! بغیر غلبہ اور طاقت کے تم نہیں نکل سکتے۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ وَلَا تَضُرُّوۡنَهٗ شَيۡـًٔا ﴾ [هود: ۵۷] ''اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔'' اور حدیث شریف میں رفعاً آیا ہے: « يَا عِبَادِيْ إِنَّكُمْ لَنْ تَبْلُغُوا نَفْعِي فَتَنْفَعُوْنِي وَلَنْ تَبْلُغُوا ضُرِّيْ فَتَضُرُّوْنِي » [2] ''اے میرے بندو! تم مجھے نفع دینے کی قدرت نہیں رکھتے کہ مجھے نفع پہنچاؤ اور نہ مجھے نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہو کہ مجھے نقصان پہنچاؤ۔''

حکایت:

ابو عبداللہ جدلی کہتے ہیں کہ میں بیت المقدس میں آیا، وہاں سیدنا عبادہ بن صامت، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اور امام کعب احبار رحمہ اللہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ سیدنا عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: جب قیامت کا دن ہوگا، اللہ تعالیٰ اولین اور آخرین کو ایک ہی زمین پر جمع کرے گا، ان کو پکارنے والا انھیں اپنی آواز اچھی طرح سنائے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ہم نے سنا ہے کہ اس دن ایک گردن آگ سے باہر نکلے گی، وہ جب لوگوں کے درمیان پہنچے گی تو پکار

---

[1] صحيح البخاري (٤٩٣٢) [2] صحيح مسلم (٢٥٧٧)

کر کہے گی: اے لوگو! میں تین شخصوں کی طرف اٹھائی گئی ہوں، میں ان کو اس سے بھی زیادہ پہچانتی ہوں جتنا کہ باپ بیٹے کو اور بھائی اپنے بھائی کو پہچانے۔ مجھ سے ان کو نہ کوئی وزر غائب کرے گا اور نہ ان کی خفیہ سے خفیہ چیز مجھ سے پوشیدہ رہے گی۔ ایک وہ شخص ہے جس نے اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود ٹھہرایا۔ دوسرا ہر جبار عنید، یعنی ستم کرنے والا دشمنی رکھنے والا۔ تیسرا ہر شیطان مرید، یعنی سرکش و سرتاب، پھر وہ گردن ان کو لپٹ جائے گی اور حساب سے چالیس برس پہلے آگ میں پھینک دے گی۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے: تم اس کے پاس چلو جس کو تم دنیا میں جھٹلاتے تھے۔ یہ بات جہنم کے داروغے ملامت اور توبیخ کے طور پر کہیں گے۔ مراد عذاب کی طرف لے جانا ہے۔ چلو جہنم کے دھوئیں کے سائے میں جو بلند ہو کر تین حصے ہو گیا ہے۔ پھر جب تک حساب سے فارغ ہوں، تب تک وہ اسی جگہ پر رہیں گے۔ دخانِ عظیم کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ بلند ہو کر شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ ظل سے مراد سرادق ہے، یعنی آگ کی زبان جو اُن کو گھیرے گی، پھر تین پھانکیں ہو کر ان پر سایہ کرے گی، یہاں تک کہ ان کا حساب ہو کر وہ دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد ظلِ یحموم ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ ۝ وَّظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ﴾ [الواقعة: ٤٢- ٤٣] ''گرم ہوا اور گرم پانی میں (ہوں گے) اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں۔'' بعض نے کہا ہے کہ تین شاخوں سے مراد ضریع و زقوم و غسلین ہے یہ دوزخ کے اوصاف ہیں۔

مذاق اور استہزاء کے طور پر اس سایہ کا یہ وصف کیا کہ وہ نہ ظلیل ہے کہ اس دن کی گرمی میں سائے میں رکھے اور نہ آگ کی لپٹ سے بچائے۔ پھر نار کا وصف کیا کہ وہ محل کے برابر شرار اڑاتی ہے، یعنی اس کی ہر چنگاری اتنی بڑی ہے جیسے ایک عظیم محل ہو۔ قصر عظیم عمارت کو کہتے ہیں، شرر وہ ہے جو آگ سے علاحدہ ہو کر اڑے۔ یا قصر سے مراد ہیزم سطیر ہے۔ سعید بن جبیر وضحاک رحمہما اللہ نے کہا کہ بڑے بڑے درختوں کی جڑیں ہیں۔ بعض نے کہا کہ اعناقِ (گردنیں) نار یا اعناقِ نخل ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اونٹوں کی گردنیں ہیں۔[2] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ وہ کچھ درخت و پہاڑ کے برابر نہیں، بلکہ بستیوں اور قلعوں کے مثل ہیں۔ شرر کی تشبیہ رنگ کے اعتبار سے جمالِ صفر (زرد رنگ کے اونٹوں) سے دی۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین کے قول میں صفر کے معنی سود کے ہیں، یعنی سیاہ۔[3]

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد کالے اونٹ ہیں۔ عرب اسود کو اصفر بولتے ہیں۔[4] پھر وہ نار میں داخل ہونے کے وقت کچھ بات نہ کریں گے، اس لیے کہ موقف میں سوال و جواب وحساب ختم ہو چکا ہو گا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حجت کے لیے یہ بات نہ کریں گے اگرچہ وہ بولنے والے ہوں گے۔[5] امام نافع بن ارزق رحمہ اللہ نے

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٩٣) تفسير ابن كثير (٤/٥٩١، ٥٩٢) (2) تفسير القرطبي (١٩/١٦٤)
(3) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٩٣) (4) فتح القدير (٥/٤٧٦) (5) تفسير القرطبي (١٩/١٦٦)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا: ﴿ هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴾، ﴿ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴾ [طٰه: ۱۰۸] ''سوائے کھسر پھسر کے تجھے کچھ بھی سنائی نہ دے گا۔'' ﴿ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴾ [الصّآفات: ۲۷] ''وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر سوال و جواب کرنے لگیں گے۔'' ﴿ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ﴾ [الحاقة: ۱۹] ''لو میرا نامۂ اعمال پڑھو۔'' کہا تو نے یہ سوال مجھ سے پہلے کسی اور شخص سے بھی کیا ہے یا نہیں؟ کہا اگر تو یہ سوال کرتا تو ہلاک ہو جاتا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: ﴿ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ﴾ [الحج: ۴۷] ''ہاں البتہ آپ کے رب کے نزدیک ایک دن تمھاری گنتی کے اعتبار سے ایک ہزار سال کا ہے۔'' کہا: ہاں! کہا: ''فَإِنَّ لِكُلِّ مِقْدَارِ يَوْمٍ مِنْ هَذِهِ الْأَيَّامِ لَوْنًا مِنَ الْأَلْوَانِ''[1] ''یقیناً ان دنوں میں سے ہر ایک دن کی مقدار کا ایک الگ ہی انداز ہے۔''

پھر فرمایا کہ اللہ کی طرف سے ان کو عذر کرنے کا اذن نہ ہوگا۔ وہ دن مخلوقات کے درمیان فیصلے کا دن ہے، اس دن حق اور باطل کا فرق بخوبی ظاہر ہو جائے گا۔ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے کفار کو خطاب ہے اور اولین سے مراد زمانۂ ماضی کی امتیں ہیں۔ پھر فرمایا کہ اگر تمھارے پاس عذاب کو دور کرنے کا کوئی حیلہ ہو تو کر گزرو۔ یہ ان کو ملامت، استہزاء اور توبیخ ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا: اگر تمھارے پاس کوئی حیلہ ہے تو اپنے لیے حیلہ کرو۔[2] بعض نے کہا ہے کہ اگر تم کو حرب (لڑنے)، کی قدرت ہو تو تم حرب کرو۔ بعض نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے جس طرح کہ ہود علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿ فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴾ [هود: ۵۵] ''اچھا تم سب ملکر میرے خلاف چالیں چل لو اور مجھے بالکل مہلت بھی نہ دو۔''[3]

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ۝۴۱ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝۴۲ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۴۳ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝۴۴ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۴۵ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ۝۴۶ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۴۷ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ۝۴۸ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۴۹ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۝۵۰

بے شک متقی لوگ چھاؤں میں اور بہتے چشموں میں ہوں گے (41) اور (لذیذ) میووں میں جس قسم کے وہ چاہیں گے (42) (کہا جائے گا:) مزے سے کھاؤ اور پیو، اس کے بدلے جو تم عمل کرتے رہے (43) بے شک ہم نیکوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں (44) اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بربادی ہے (45) (اے جھٹلانے والو!) تم (دنیا میں) تھوڑا سا کھاؤ اور فائدہ اُٹھاؤ،

[1] مستدرك الحاكم (٦١٧/٤) [2] تفسير البغوي (٣٠٧/٨) [3] فتح البيان (١٥/١٧ـ٢١)

بے شک تم مجرم ہو ⑯ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بربادی ہے ⑰ اور جب ان سے کہا جائے (اللہ کے آگے) رکوع کرو تو وہ رکوع نہیں کرتے ⑱ اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے بربادی ہے ⑲ پھر اس (قرآن) کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ ⑳

پرہیزگاروں کا انجام خیر:

اللہ نے ان لوگوں کے حال کی خبر دی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور واجبات ادا کر کے اور محرمات کو ترک کر کے اس کی عبادت کرتے ہیں کہ وہ قیامت کے دن باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے برعکس ان بدبختوں کے جو گرم سائے اور سیاہ بدبودار دھوئیں کے نیچے ہوں گے۔ "فواکهه مشتهاة" سے مراد ہر قسم کے میوے اور پھل ہیں کہ جس وقت طلب کریں اسی وقت بغیر توقف کے ملیں، ان سے بطور احسان کہا جائے گا کہ تم مزے سے کھاؤ پیو۔ ان اعمالِ صالح کے عوض جو تم نے دنیا میں کیے تھے۔ اچھے عمل کرنے والے کے لیے ہماری جزا ایسی ہی ہوتی ہے اور یوم الدین کے جھٹلانے والوں کو اس طرح خطاب کیا کہ تم کھاؤ اور تھوڑے دن برت لو تم مجرم ہو یہ امر ملامت اور وعید کے لیے ہے۔ قلیل سے مراد قریب کی مدت ہے یہ مدت دنیا کی ہوئی۔

کہ دنیا ہمیں ساعتے بیش نیست "کہ دنیا اسی ایک لمحہ سے زیادہ نہیں ہے"

اور جب مجرم ٹھہرے تو اب نارِ جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴾ [لقمان: ٢٤] "ہم انھیں کچھ یونہی سا فائدہ دے دیں لیکن (بالآخر) ہم انھیں نہایت بیچارگی کی حالت میں سخت عذاب کی طرف ہنکا لے جائیں گے۔" نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴾ [یونس: ٦٩، ٧٠] "جو لوگ اللہ پر جھوٹ افترا کرتے ہیں وہ کامیاب نہ ہوں گے، یہ دنیا میں تھوڑا سا عیش ہے پھر ہمارے پاس ان کو آنا ہے پھر ہم ان کو ان کے کفر کے بدلے سخت عذاب چکھائیں گے۔"

پھر فرمایا کہ جب ان جاہل کافروں سے کہو کہ تم بھی نماز کی جماعت میں شریک ہو جاؤ تو غرور اور تکبر سے رک جاتے ہیں۔ اب یہ اس قرآن کے بعد جس پر ایمان نہیں لائے، کس کلام پر ایمان لائیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٨٥] "پھر قرآن کے بعد کون سی بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے؟" سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب ﴿ وَالْمُرْسَلٰتِ ﴾ پڑھے اور اس آیت پر آئے ﴿ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ ﴾ تو چاہیے کہ یوں کہے: "آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَبِمَا أُنْزِلَ"[1] "میرا اللہ تعالیٰ پر اور جو کچھ نازل کیا گیا اس پر ایمان ہے۔"

[1] سنن أبي داود (٨٨٧) تفسير ابن كثير (٥٩٣،٥٩٢/٤) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٥٧٨٤)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ متقین درختوں اور محلات کے سایوں میں ہوں گے نہ کہ اس قسم کے سایوں میں جن میں کفار ہوں گے، یعنی دخانِ نار کا سایہ۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تکاثفِ اشجار میں۔[1] گازرونی نے کہا ہے کہ زیرِ اشجار۔ امام مقاتل اور کلبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک باللہ سے بچتے ہیں، اس لیے کہ یہ سورت شروع سے آخر تک کفار کی ان کے کفر پر ملامت میں ہے۔[2] ﴿عُيُوْنٍ﴾ سے مراد پانی و شہد و دودھ اور شراب کی نہریں ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ﴾ [محمد: ١٥] ''اس میں پانی کی نہریں ہیں جو بدبو کرنے والا نہیں، اور دودھ کی نہریں ہیں جن کا مزہ نہیں بدلا، اور شراب کی نہریں ہیں جن میں پینے والوں کے لیے بڑی لذت ہے اور نہریں ہیں شہد کی جو بہت صاف ہیں اور ان کے لیے وہاں ہر قسم کے میوے ہیں اور ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے، کیا یہ مثل اس کے ہیں جو ہمیشہ آگ میں رہنے والا ہے؟ اور جنھیں گرم کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا جو ان کی آنتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔''

پھر پھلوں کا ذکر کیا جن کو محفل میں ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کریں گے۔ جنت کے میوے اور پھل وقت کے ساتھ مقید نہ ہوں گے، جس طرح کہ دنیا میں پھل اپنے موسم کے لحاظ سے ہوتے ہیں، بے موسم کے نہیں ہوتے۔ ان سے فرشتے کہیں گے یا اللہ کی طرف سے کہا جائے گا کہ تم کھاؤ خوب مزے لے کر، ان اچھے عملوں کے سبب سے جو تم دنیا میں کرتے تھے۔ ہم ایسے ہی جزائے عظیم دیتے ہیں، ان لوگوں کو جو اپنے عقائد و اعمال میں محسن تھے، یعنی مخلص و موحد تھے اور جھٹلانے والوں کے لیے ویل ہے۔ اور مومنین نعیم مقیم میں ہیں۔

پھر کفار کو خطاب فرمایا کہ کھاؤ اور برتو، یعنی فائدہ اٹھا لو تمھارے لیے بہرحال ویل ثابت ہے۔ یہ دنیا میں ان کے حال کا یاد دلانا ہے۔ یا یہ بات ان سے دنیا میں کہی گئی ہے۔ پھر اس کو قلیل فرمایا، کیوں کہ دنیا کی متاع قلیل ہے اور اس کا زمانہ بھی تھوڑا ہے، یعنی یہاں کی مدت کے مقابلے میں ان کی دنیا کی مہلت کی آخری حد تک مدت بہت کم ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ دنیا کے ساتھ تمتع کرنا کافروں کے اعمال میں سے ہے اور دنیا ہی کے لیے سعی کرنا ظالمین کے افعال میں سے ہے اور دنیا کی طرف مطمئن ہونا کاذبین کے افعال میں سے ہے اور دنیا میں اپنی حاجت کے مطابق لینا اور اسی پر مطمئن ہو جانا عام مومنین کے افعال میں سے ہے اور اس سے اعراض کرنا زاہدین کے افعال

---

(1) تفسیر الجلالین (٧٨٦/١) (2) فتح القدير (٤٧٨/٥)

میں سے ہے۔ رہے اہلِ حقیقت تو ان کا رتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ ان میں دنیا کی یا اس کے کچھ حصے کی محبت اثر کرے اور وہ اس کو جمع کریں یا ترک کریں، یعنی ان کو دنیا کے خیر و شر سے سرے ہی سے کچھ واسطہ اور غرض نہیں۔

پھر فرمایا کہ تم مجرم ہو، یعنی اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے ہو۔ ظاہر میں ﴿ كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا ﴾ حکم ہے، لیکن معنی میں سخت ملامت اور بڑی ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ مکذبین کے لیے ویل ہے، کیوں کہ انھوں نے اپنی جانوں کو اس قلیل فائدے کے سبب سے عذابِ دائم کے لیے پیش کیا ہے۔ ان مکذبین سے جب کوئی کہنے والا یہ بات کہتا تھا کہ تم نماز پڑھنے والوں کے ساتھ مل کر رکوع کرو، یعنی نماز پڑھو تو وہ نماز نہ پڑھتے تھے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ثقیف کے حق میں اتری ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو نماز پڑھنے کا حکم دیا تھا، وہ نماز پڑھنے سے رک گئے اور کہا کہ ہم سر نہیں جھکاتے کہ اس سے ہم پر گالی پڑتی ہے اور عیب لگتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس دین میں کوئی خیر نہیں ہے جس میں رکوع و سجود نہیں ہے،[1] یعنی نماز اور معبود کی عبادت۔ بعض نے کہا: ان سے یہ بات قیامت کے دن کہی جائے گی، جبکہ ان کو سجدہ کرنے کے لیے بلایا جائے گا اور وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ دنیا میں وہ اللہ کے لیے کبھی سجدہ نہ کرتے تھے۔[2] (قالہ ابن عباس رضی اللہ عنہما)

اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ کفار کو فروعِ شریعت کے ساتھ مخاطب کیا گیا۔ نماز کا نام رکوع رکھا۔ یہ نماز کا ایک جز ہے، اس جز کو خاص طور پر اس لیے ذکر کیا کہ یہ رکوع خضوع اور اطاعت کے لیے کیا جاتا ہے، یا مسلمین کی نماز کے ساتھ خاص ہے۔ رہے مکذبین تو ان کے لیے وہی ویل اور ہلاکت ہے، کیوں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کو جھٹلایا ہے۔ اب وہ اس قرآن کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے، جبکہ اس پر ایمان نہ لائے، حالاں کہ یہ قرآن آسمانی کتب کے درمیان ایک آیتِ مبصرہ و معجزۂ باہرہ ہے۔[3]

سورۃ المرسلات کی تفسیر مکمل ہوئی۔ آج نہم صفر ۱۳۰۶ ہجری روز دوشنبہ (سوموار) ہے۔ اس سے پہلے ہم تفسیر پارۂ عم لکھ چکے ہیں۔ تحریر کی ترتیب مختلف اوقات میں آگے پیچھے واقع ہوئی ہے۔ اٹھارہ پارے باقی ہیں، اگر عمر نے وفا کی اور علمِ الٰہی میں مجھ ناتواں سے تفسیرِ قرآن کا مکمل ہونا مقرر ہو چکا ہے تو ان شاء اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً شیئاً فشیئاً بغیر وقت کی تقدیم و تاخیر کے لحاظ کے وہ بھی لکھے جائیں گے۔ اگر باری تعالیٰ کے نزدیک یہ خدمت قبول ہو گی تو مغفرت کا ایک بہانہ ہے، اس لیے کہ اس کی رحمت نکتہ نواز ہے اور اس کی مغفرت غریب پرور۔ ہم اس پر آشوب زمانہ میں دیارِ غربائے اسلام میں ضعفاء ہیں، کوئی ہمارا معاون و مددگار نہیں سوائے اسی کی ذات پاک کے۔ حوادثِ روزگار نے، جو چودھویں صدی کے شروع سے متواتر ہو رہے ہیں، اگر مشغولِ افکار و تشتتِ بال نہ کیا ہوتا تو آج تک یہ تفسیر اللہ چاہتا تو ختم ہو جاتی، لیکن بارہا اس ترجمے کی تحریر میں طفرات پیش آئے اور عذرات و فجرات واقع ہوئے اور زمانے کے عجز بجز

---

[1] تفسير القرطبي (١٢٨) [2] تفسير الطبري (١٤٤/٢٤) [3] فتح البيان (٢١/١٥-٢٤)

نے طبیعت کو شذر مذر کر دیا۔ والحمد لله تعالىٰ على كل حال و بكل حال ومع كل حال.

اللہ تعالیٰ کی غریب پروری و بندہ نوازی کا شکر کس زبان میں بیان و جنان سے ادا ہو جس نے اس طوفان اور لوگوں کو بہتانوں میں مجھ غریب محسود کو دشمنوں کے حسد، سوئے قضاء اور درکِ شقاء سے اپنے حفظ و امان میں رکھا۔ میں امید کرتا ہوں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھے اس دارِ فانی میں ہر بلا اور پریشانی سے بچایا ہے وہ قیامت کے دن میں بھی مجھ کو ہر آفت ناگہانی سے امن بخشے گا اور میرے گناہوں اور معصیتوں کو اپنی ستاری سے مستور و مغفور کر کے اور ابوابِ جہنم و درکاتِ سقر سے بچا کر اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم میں شامل فرمائے گا۔ اس کے نزدیک، ایک مشتِ خاک سے درگزر فرمانا، کچھ بڑی بات نہیں ہے اور ایک بندۂ شرمندہ کو معاف کر دینا اور اس کو دامنِ عفو میں چھپا لینا اس کے نزدیک کچھ بڑا کام نہیں ہے۔ میں اگرچہ یقیناً لائقِ نار ہوں، لیکن وہ قطعاً اہلِ تقویٰ اور اہلِ مغفرت ہے اور میں دل سے شہادتین کا اقرار رکھتا ہوں اور سچے دل سے شرک و کفر سے سخت بے زار ہوں، اگرچہ عملِ صالح میں قاصر ہوں اسی توحیدِ خالص پر مغفرت کی امید ہوتی ہے، ورنہ اعمال تو مہلکات اور موبقات ہیں۔

رب أنت ولي في الدنيا والآخرة، توفني مسلما و ألحقني با الصالحين، وآخر دعوانا أنّ الحمد لله رب العالمين.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ النَّبَا

امام خازن اور خطیب رحمہ اللہ نے سورت "عم" ہی نام لیا ہے۔ اس کو سورت "تساؤل" اور سورت "نبأ" بھی کہتے ہیں۔[1] اس کی چالیس (۴۰) یا اکتالیس (۴۱) آیتیں ہیں۔ سب کے نزدیک مکہ مکرمہ میں اتری ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کا بھی ہے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ سورت مکی ہے۔[3]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝۱ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝۲ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ
مُخْتَلِفُوْنَ ۝۳ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۴ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝۵

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

وہ باہم کس چیز کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟ (1) اس عظیم خبر کے بارے میں (2) جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں (3) ہرگز نہیں! جلد ہی وہ جان لیں گے (4) پھر ہرگز نہیں! جلد ہی وہ جان لیں گے (5)

مشرکوں کی طرف سے آخرت کا انکار اور ان کا رد:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مشرکین پر انکار کیا کہ وہ قیامت کے دن کے آنے کا سوال اس کے انکار کے طور پر کرتے ہیں، حالاں کہ وہ ایک سخت ہولناک خبر ہے۔ امام قتادہ اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "نبائے عظیم" سے مراد موت کے بعد اٹھنا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد قرآنِ کریم ہے۔[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ ظاہر پہلا قول ہی ہے، اس لیے کہ ان لوگوں میں اس کے واقع ہونے اور واقع نہ ہونے کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض تو اس پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض کافر ہیں۔[5] موضح قرآن میں فرمایا ہے کہ کوئی مانتا ہے اور کوئی منکر ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ بدن اٹھے گا۔ کوئی کہتا ہے کہ روح پر خوشی اور غم گزرے گا۔" انتھی

(1) تفسير الخازن (۱۹۹/۷) (2) الدر المنثور (۳۸۹/۸) (3) تفسير ابن كثير (۳۰۲/۸ـ ط: دار طيبة)
(4) تفسير الطبري (۱٤۹/۲٤، ۱۵۰) (5) تفسير ابن كثير (۵۹۳/٤)

پھر اللہ تعالیٰ نے منکروں کو یہ وعید سنائی کہ تم کو یہ بات جلد معلوم ہو جائے گی۔ یہ ایک سخت تہدید (ڈرانا) اور وعیدِ شدید ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لفظ استفہام کا ہے مگر معنی اس کے قصہ کی عظمت کے ہیں۔ اس استفہام میں تہویل (ڈرانا) وتقریر (مقرر کرنا) اور تعجیب (تعجب) ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے اور آپ ﷺ نے لوگوں کو توحید اور موت کے بعد اٹھائے جانے کی طرف دعوت دی اور قرآن پڑھ کر سنایا تو آپس میں ان کا ایک دوسرے سے پوچھنے لگا کہ محمد ﷺ یہ کیا لائے ہیں؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔[1] "تساؤل" ایک دوسرے سے پوچھنے اور آپس میں بات چیت کرنے کو کہتے ہیں گو سوال نہ ہو۔ "نبأ" سے مراد اگر قرآن ہے تو اس کو عظیم اس لیے کہا ہے کہ وہ توحید وتصدیقِ رسول اور وقوعِ بعث اور نشور (اکٹھے ہونے) کی خبر دیتا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد قیامت کا دن ہے۔[2] نصاریٰ کہتے ہیں کہ معاد روحانی ہو گا۔ یہود کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ معاد جسمانی ہو گا، تورات میں عبرانی لغت میں لفظِ جنت کی تصریح آئی ہے، یعنی لفظ "جنعیذا" اور انجیل میں بہت جگہ معاد کی صراحت فرمائی اور کہا ہے کہ اس میں فرمانبرداروں کے لیے آرام ہے اور گناہ گاروں کے لیے عذاب ہے۔

کفارِ عرب کے بعض گروہ معاد کا انکار کرتے تھے جس طرح کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ﴾ [المؤمنون: ٣٧] "(زندگی) تو صرف دنیا کی زندگی ہے ہم مرتے جیتے رہتے ہیں اور یہ نہیں کہ ہم پھر اٹھائے جائیں گے۔" بعض گروہوں کا معاد پر یقین نہ تھا، بلکہ شک میں تھے جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے: ﴿ إِنْ نَظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ ﴾ [الجاثية: ٣٢] "ہمیں کچھ یوں ہی سا خیال ہو جاتا ہے، لیکن ہمیں یقین نہیں۔" غرض یہ کہ اس طرح پر کفر کے گروہوں کے درمیان اختلاف واقع ہوا تھا۔ یا لفظ ﴿ يَتَسَاءَلُونَ ﴾ میں ضمیر کا مرجع مومنوں اور کفار دونوں کی طرف ہے۔ مسلمان یقین رکھتے تھے اس لیے ان کی بصیرت اور دین کی استعداد میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اور کفار کا استہزاء اور ٹھٹھا مذاق بڑھتا جاتا تھا۔

ایک جماعت نے کہا کہ "نبأ عظیم" سے مراد قرآنِ کریم ہے۔ اللہ پاک کا یہ فرمانا کہ وہ اب جان لیں گے ان کے لیے زجر وردع (ڈانٹ ڈپٹ) ہے اور اس جملے کا دوبارہ کہنا تاکید کے لیے اور وعید میں شدت کے لیے، یا وعید بعد وعید کے لیے ہے۔ یا پہلا جاننا نزع کے وقت ہو گا اور دوسرا دوبارہ زندہ ہونے کے وقت ہو گا۔ یا پہلا دوبارہ زندہ ہونے کے وقت اور دوسرا جزا کے وقت ہو گا۔ پھر اللہ پاک نے اپنی عظیم قدرت کا بیان مختلف اشیاء کی پیدائش اور عجیب وغریب امور میں کیا۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ معاد وغیرہ پر بھی اسی طرح قادر ہے جس طرح کہ اس کو ایجاد کرنے پر اسے قدرت حاصل ہے۔ چنانچہ فرمایا:

---

[1] فتح القدير (٤٨٠/٥) [2] فتح القدير (٤٨١/٥)

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ﴿۶﴾ وَّ الْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ﴿۷﴾ وَّ خَلَقْنٰكُمْ
اَزْوَاجًا ۙ﴿۸﴾ وَّ جَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ﴿۹﴾ وَّ جَعَلْنَا الَّيْلَ
لِبَاسًا ۙ﴿۱۰﴾ وَّ جَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ﴿۱۱﴾

کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟⑥ اور پہاڑوں کو میخیں (نہیں بنایا؟)⑦ اور ہم نے تمھیں جوڑا جوڑا پیدا کیا⑧ اور ہم نے تمھاری نیند کو آرام کا ذریعہ بنایا⑨ اور ہم نے رات کو تمھارے لیے لباس بنایا⑩ اور ہم نے دن کو روزی کمانے کا وقت بنایا⑪

حیات بعد از ممات پر الٰہی قدرتوں سے دلیل:

بچھونے سے مراد یہ ہے کہ زمین کو خاکسار کر دیا، ساکن و برقرار رکھا۔ پہاڑوں سے اس کو ساکن کیا، تاکہ جنبش نہ کرے اور جو لوگ اس پر رہتے بستے ہیں وہ مضطرب نہ ہوں۔

زمین از تپ لرزہ آمد ستوہ فرو کوفت بر دامنش میخ کوہ

''زمین بخار اور لڑکھڑاہٹ کی وجہ سے عاجز ہوگئی۔ (اللہ) نے اس کے دامن میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں۔''

ازواج سے مراد نر اور مادہ ہیں، تاکہ ہر ایک دوسرے سے تمتع پائے اور نسل قائم رہے۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ﴾ [الروم: ۲۱] ''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمھاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں، تاکہ ان سے آرام پاؤ، اس نے تمھارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کر دی۔'' ''سبات'' قطعِ حرکت کو کہتے ہیں، تاکہ دن بھر کے کام کاج اور تگ و دو سے آرام اور راحت حاصل کی جائے۔ اس طرح کی آیت سورۃ الفرقان میں گزر چکی ہے۔[1]

بقدر ہر سکون راحت بود بنگر مراتب را دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

''ہر سکون سے خوشی و آسائش ہوتی ہے تم درجات پر نظر رکھو! دوڑنا، جانا، کھڑے ہو جانا، بیٹھنا سونا اور مر جانا۔''

رات کو لباس فرمایا کہ جس طرح کپڑا بدن کو چھپا دیتا ہے، اسی طرح رات کا اندھیرا حال کا ساتر (چھپانے والا) ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ﴾ [الشمس: ٤] ''قسم ہے رات کی جب اسے ڈھانپ لے۔''

اَللَّيْلُ لِلْعَاشِقِيْنَ سِتْرٌ يَا لَيْتَ أَوْقَاتَهُ تَدُوْمُ

''رات عاشقوں کے لیے ایک پردہ ہے، کاش یہ ختم نہ ہو۔''

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لِبَاسًا ﴾ ''أَيْ: سَكَنًا''.[2] معاش سے مراد یہ ہے کہ دن روشن اور چمکدار ہوتا

---

① رقم الآية (٤٧) ② تفسير الطبري (١٥٢/٢٤)

ہے، لوگ اس میں ہر طرح کا تصرف کرتے ہیں، معاش اور روزی کمانے کے لیے چلتے پھرتے، آتے جاتے ہیں، کوئی تجارت کرتا ہے، کوئی زراعت، کوئی کتابت کرتا ہے، کوئی خیاطت (درزی کا کام) وغیرہ ذلک۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے: یعنی ہماری قدرت ان امور پر بڑھ کر ہے بہ نسبت دوبارہ زندہ کر کے اٹھانے کی قدرت سے، پھر تمھارے انکار کی کیا وجہ ہے، کیوں کہ یہ بات مقرر ہے کہ اجسام صفات کو قبول کرنے یا اعراض میں برابر ہوتے ہیں۔ اس جگہ ''جعل'' بہ معنی پیدا کرنا اور ایجاد کرنا ہے مثل پیدا کرنے کی۔ اتنی بات ہے کہ انشاء تکوینی کے ساتھ مختص ہے۔ ''مہاد'' فراش (بچھونے) کو کہتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا ﴾ [البقرۃ: ۲۲] ''جس نے تمھارے لیے زمین کو فرش بنایا۔'' اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے درمیان مذکورہ گفتگو امرِ بعث کے متعلق تھی نہ کہ قرآن کے اور نبوتِ محمد ﷺ کے بارے میں۔

﴿ اَزْوَاجًا ﴾ سے اس جگہ مردوں اور عورتوں کی قسمیں ہیں، یا ان کے رنگ، یا ہر مخلوق کا جوڑا بدصورت و خوبصورت، لمبا اور چھوٹا۔ ﴿ سُبَاتًا ﴾ سے مراد راحت ہے، بدن کے اندر روح کے موجود ہونے کے ساتھ۔ یا مراد موت ہے، کیوں کہ سونا بھی ایک طرح کا مرنا ہوتا ہے۔ اسی لیے خواب کو موت کا بھائی کہتے ہیں، کیوں کہ مسبوت یعنی سویا ہوا شخص میت کے مشابہ ہوتا ہے، فقط اتنی بات ہوتی ہے کہ اس کی جان تن سے جدا نہیں ہوتی، اسی جگہ سے فرمایا ہے: ﴿ اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا ﴾ [الزمر: ۴۲] ''اللہ ہی روحوں کو ان کی موت کے وقت اور جن کی موت نہیں آئی انھیں ان کی نیند کے وقت قبض کر لیتا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّیْلِ ﴾ [الانعام: ۶۰] ''اور وہ ایسا ہے کہ رات میں تمھاری روح کو (ایک گونہ) قبض کر لیتا ہے۔''[1]

﴿ وَّبَنَیْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۝١٢ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۝١٣ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۝١٤ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۝١٥ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۝١٦ ﴾

اور ہم نے تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے (12) اور ہم نے ایک روشن چراغ (سورج) بنایا (13) اور ہم نے بھرے بادلوں سے خوب برسنے والا پانی نازل کیا (14) تاکہ ہم اس کے ذریعے سے اناج اور سبزہ نکالیں (15) اور گھنے باغات (اُگائیں) (16)

[1] فتح البیان (۱۵/۱۰۔۳۱)

رب تعالیٰ کی قدرتیں زندگی بعد از موت کی دلیل ہیں:

”سبع شداد“ سے مراد سات آسمان ہیں اپنی وسعت اور بلندی اور احکام اور اتقان کے ساتھ اور ستاروں کی زینت کے ساتھ جو ایک جگہ ثابت اور سیار ہیں۔ لہٰذا فرمایا کہ ہم نے آفتابِ عالم تاب کو، جس کی چمک ساری زمین پر پڑتی ہے، ایک روشن شمع بنایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْمُعْصِرٰتِ ﴾ سے مراد ہوا ہے، کیوں کہ ہوا پانی کو گھیر کر لاتی ہے۔ یہی قول امام عکرمہ، مجاہد، قتادہ، کلبی اور زید بن اسلم رحمہم اللہ کا ہے کہ اس سے مراد ریاح ہیں۔ ہوائیں بادل سے پانی گراتی ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مراد بادل ہے۔ امام ابو العالیہ، ضحاک، حسن، ربیع بن انس اور ثوری رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”مُعْصِرٰت“ وہ بادل ہیں جو پانی سے بھرے ہوں مگر ابھی برسے نہیں۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْمُعْصِرٰتِ ﴾ سے مراد ”سَمَاوَات“ ہیں۔[1] یہ قول غریب ہے، زیادہ ظاہر یہی ہے کہ اس سے مراد بادل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ﴾ [الروم: ٤٨] ”اللہ تعالیٰ ہوائیں چلاتا ہے وہ ابر کو اٹھاتی ہیں پھر اللہ تعالیٰ اپنی منشا کے مطابق اسے آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے، پھر آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر سے قطرے نکلتے ہیں۔“

امام مجاہد، قتادہ اور ربیعہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ ”ثجاج“ سے مراد آبِ ریزاں ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لگاتار پانی ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد آبِ کثیر ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلامِ عرب میں ”ثج“ کثرت کے معنی میں مشہور نہیں ہے، بلکہ ”ثج“ لگاتار گرنے کو کہتے ہیں۔[2] ”ومنه قول النبي ﷺ « أَفْضَلُ الْحَجِّ الْعَجُّ وَالثَّجُّ »[3] یعنی بدن کا خون بہانا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مگر حدیثِ مستحاضہ میں آیا ہے: ”فَقَالَتْ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ هُوَ أَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ أَنَا أَثُجُّ ثَجًّا“[4] یعنی اس کی تو ایک دھار سی لگ جاتی ہے۔ یہ اس پر دلیل ہے کہ ثج ریزشِ پے در پے پر استعمال ہوتا ہے۔ واللہ أعلم۔ پھر اس آبِ بسیار سے لوگوں کے لیے اناج اور چوپایوں کے لیے اور چرنے والے جانوروں کے لیے اناج اور تازہ سبزہ نکلتا ہے۔ ﴿ جَنّٰتٍ ﴾ سے مراد بساتین و حدائق (باغات) ہیں جن میں طرح طرح کے پھل لگتے ہیں اور رنگا رنگ میوے پیدا ہوتے ہیں جن کی بوئیں اور مزے جداگانہ ہیں، اگرچہ زمین کے ایک ہی ٹکڑے میں کیوں نہ ہوں۔ اس لیے ان کو ﴿ اَلْفَافًا ﴾ فرمایا ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (١٥٤،١٥٣/٢٤) تفسير ابن كثير (٥٩٤/٤)   [2] تفسير الطبري (١٥٥/٢٤)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٢٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٢٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٠٠)

[4] سنن أبي داود (٢٨٧) سنن الترمذي (١٢٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: (إرواء الغليل: ٢٠٢/١)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یعنی مجتمع[1] (اکٹھے) اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہے:
﴿ وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّ جَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾[2] [الرعد: ٤] ''اور زمین میں مختلف ٹکڑے ایک دوسرے سے لگتے لگاتے ہیں اور انگوروں کے باغات ہیں اور کھیت ہیں اور کھجوروں کے درخت ہیں، شاخ دار اور بعض ایسے ہیں جو بے شاخ ہیں سب ایک ہی پانی پلائے جاتے ہیں پھر بھی ہم ایک کو ایک پر پھلوں میں برتری دیتے ہیں اس میں عقلمندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح اس جگہ یوں ہے کہ ''سبع شداد'' سے مراد ساتوں آسمان قوی الخلق اور محکم البنا (پیدائش اور بنیاد میں قوی اور مضبوط) ہیں جن میں زمانے کے گزرنے کا اثر نہیں ہوتا، لہٰذا ان کا وصف شدت کے ساتھ کیا ہے۔ ہر ایک آسمان کی موٹائی پانچ سو برس کی راہ ہے۔ ﴿ سِرَاجًا ﴾ سے مراد سورج ہے۔ ﴿ وَهَّاجًا ﴾ خوب چمکنے والے کو کہتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَهَّاجًا ﴾ بہ معنی وقاد ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں روشنی اور گرمی ہے، وہ نور اور حرارت کا جامع ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''وہاج'' بہ معنی ''مضیء''[4] (روشن کرنے والا) ہے۔ ''معصرات'' سے مراد بادل یا ہوا ہے یا آسمان۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ آسمان پر ہوا چلتی ہے اس سے بادل برستا ہے۔ ﴿ ثَجَّاجًا ﴾ سے مراد موسلا دھار ہے۔ دانہ سے مراد گندم، جو اور اسی طرح کے اور اناج ہیں۔ ﴿ نَبَاتًا ﴾ سے مراد گھاس پھوس خشک و تر ہے جس کو جانور کھاتے ہیں۔ ﴿ اَلْفَافًا ﴾ سے مراد گھنے درخت ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنت وہ ہے جس میں درخت ہوں۔ فردوس وہ ہے جس میں انگور ہوں۔[5] یہ سب نو دلیلیں قدرتِ اثبات پر بیان فرمائیں۔ ہر دلیل معادِ جسمانی کے ثبوت پر ایک حجت ہے۔ وللہ الحمد۔[6]

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيْقَاتًا ۝١٧ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ
فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ۝١٨ وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا ۝١٩
وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝٢٠ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ
مِرْصَادًا ۝٢١ لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۝٢٢ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۝٢٣ لَا
يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۝٢٤ اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۝٢٥

[1] تفسير الطبري (١٥٦/٢٤) [2] تفسير ابن كثير (٥٩٤/٤) [3] تفسير البغوي (٣١٢/٨)
[4] تفسير الطبري (١٥٣/٢٤) [5] تفسير البغوي (٧٣/١) [6] فتح البيان (٣٢/١٥-٣٤)

جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿٢٦﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿٢٧﴾
وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿٢٨﴾ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ
كِتٰبًا ﴿٢٩﴾ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴿٣٠﴾

بے شک فیصلے کا دن ایک مقررہ وقت ہے⑰ جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم گروہ در گروہ چلے آؤ گے⑱ اور آسمان کھول دیا جائے گا تو (اس میں) دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے⑲ اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب (ریت) کی طرح ہو جائیں گے⑳ بے شک دوزخ تاک میں ہے㉑ سرکشوں کا ٹھکانا ہے㉒ وہ اس میں مدتوں پڑے رہیں گے㉓ وہ اس میں کسی ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے نہ کسی مشروب کا㉔ (ہاں) مگر کھولتا پانی اور بہتی پیپ㉕ (یہ ہے) بدلہ پورا㉖ انھیں تو حساب کی اُمید ہی نہ تھی㉗ انھوں نے ہماری آیات کو بے دریغ جھٹلایا㉘ اور ہم نے ہر چیز کو ایک کتاب میں گن رکھا ہے㉙ لہٰذا اب تم (اپنے کیے کا مزہ) چکھو، ہم تمھارا عذاب بڑھاتے ہی رہیں گے㉚

فیصلے کے دن کے حالات وواقعات:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فیصلے کے دن کا ذکر کیا۔ یہ قیامت کا دن ہے، اس کے لیے ایک خاص وقت مقرر ہے کہ نہ بڑھے اور نہ کم ہو اور نہ علی التعیین معلوم ہو سکے، ہاں وہ وقت اللہ پاک کو معلوم ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴾ [هود: ۱۰۴] ''اسے ہم جو ملتوی کرتے ہیں وہ صرف ایک مدتِ معین تک ہے۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَفْوَاجًا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ گروہ کے گروہ آئیں گے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ہر امت اپنے رسول کے ہمراہ آئے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ﴾[1] [بني إسرائيل: ۷۱] ''جس دن ہم ہر جماعت کو اس کے پیشوا سمیت بلائیں گے۔'' سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس کا فاصلہ ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: معلوم نہیں کہ چالیس دن مراد ہیں، یا چالیس مہینے، یا چالیس سال۔

پھر اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسائے گا تو جس طرح ساگ اُگتا ہے اس طرح پر اُگیں گے۔ انسان کی ہر چیز گل جاتی ہے مگر ایک ہڈی جو عجب الذنب ہے۔ اسی سے قیامت کے دن خلق کی ترکیب ہو گی۔[2] ﴿ اَبْوَابًا ﴾ سے

① تفسير الطبري (۲٤/۱۵۸) ② صحيح البخاري (٤٦٥١) صحيح مسلم (۲۹۵۵)

مراد راہیں اور راستے ہیں جدھر سے فرشتے اتریں گے اور یہ ارشاد کہ پہاڑ ریت کی طرح ہو جائیں گے، اس قول کی طرح ہے: ﴿ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ﴾ [النمل: ٨٨] ''اور آپ پہاڑوں کو دیکھ کر اپنی جگہ جمے ہوئے خیال کرتے ہیں، لیکن وہ بھی بادل کی طرح اڑتے پھریں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴾ [القارعة: ٥] ''اور پہاڑ دھنی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے۔''

اس جگہ ﴿ سَرَابًا ﴾ فرمایا، یعنی دیکھنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ وہ کچھ چیز ہیں حالاں کہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ پھر اس کے بعد بالکل جاتے رہیں گے۔ نہ وہ خود رہیں گے نہ ان کا کوئی اثر یا نشان، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۝ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا ﴾ [طٰہٰ: ١٠٥- ١٠٧] ''وہ آپ سے پہاڑوں کی نسبت سوال کرتے ہیں تو آپ کہہ دیں کہ انھیں میرا رب ریزہ ریزہ کر کے اڑا دے گا اور زمین کو بالکل ہموار صاف میدان کر کے چھوڑے گا' جس میں تو نہ کہیں موڑ توڑ دیکھے گا نہ اونچ نیچ۔'' نیز فرمایا ﴿ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْاَرْضَ بَارِزَةً ﴾ [الكهف: ٤٧] ''اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور زمین کو تو صاف کھلی ہوئی دیکھے گا۔''

﴿ مِرْصَادًا ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تیار ہے۔ ''طٰغین'' سے مراد رسولوں کے نافرمان اور مخالف ہیں۔ ﴿ مَاٰبًا ﴾ سے مرجع، منقلب اور مصیر مراد ہے، یعنی بازگشت، انجام اور مہمانی۔ امام حسن اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی کوئی شخص جنت میں داخل نہ ہوگا یہاں تک کہ آگ کے پار ہو جائے۔ اگر اس کے پاس کاغذِ پروانگی (اجازت نامہ) ہے تو نجات پائے گا ورنہ روکا جائے گا۔ [1] امام سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جہنم پر تین پل ہوں گے۔ ''حقب'' زمانے کی ایک مدت کو کہتے ہیں، اس کی مقدار میں اختلاف ہے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ہلال ہجری سے کہا تھا کہ تم حقب کو اللہ کی کتاب میں کیسا پاتے ہو؟ کہا: اسی برس، ہر برس بارہ ماہ کا، ہر مہینہ تیس دن کا، ہر دن ہزار برس کا۔ سیدنا ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام سعید بن جبیر، عمرو بن میمون، حسن، قتادہ، ربیع اور ضحاک رحمہم اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ امام سدی اور حسن رحمہما اللہ نے اسی طرح کے ستر برس بھی کہے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''حقب'' چالیس سال کا ہے اس کا ہر دن تمھاری گنتی کے مطابق ہزار برس کا ہوگا۔ بشیر بن کعب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ ''حقب'' تین سو برس کا ہوتا ہے، ہر برس تین سو ساٹھ دن کا اور ہر دن ایک ہزار سال کے برابر۔ [2] سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے کہ ''حقب'' ہزار مہینے کا ہوتا ہے اور مہینہ تیس روز کا اور سال بارہ مہینے کا جس کے تین سو ساٹھ دن ہوتے ہیں اور ان مہینوں میں سے ہر دن تمھاری گنتی کے حساب سے ہزار برس کا، چنانچہ ایک ''حقب'' تین کروڑ برس کا ٹھہرا۔ لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے

---

[1] تفسیر الطبري (٢٤/١٥٨، ١٥٩) [2] تفسیر الطبري (٢٤/١٦١، ١٦٢) تفسیر ابن کثیر (٤/٥٩٥)

کہا ہے کہ یہ حدیث بطولہ سخت منکر ہے۔ اس کے راوی قاسم اور جعفر متروک ہیں۔[1] ہاں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ واللہ! نہیں نکلے گا کوئی آگ میں سے یہاں تک کہ ٹھہرے اس میں احقاب تک۔ "حقب" اسی (۸۰) سال سے کچھ اوپر ہوتا ہے، ہر سال تمھاری گنتی کے مطابق تین سو ساٹھ دن کا۔[2] (رواہ البزار) سلیمان بن مسلم راوی بصری مشہور ہے۔

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَحْقَابًا ﴾ سے مراد سات سو حقب ہیں، ہر حقب ستر برس کا ہے، ہر برس تین سو ساٹھ دن کا، ہر دن تمھاری گنتی کے حساب سے ہزار برس کا۔ امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے منسوخ ہے: ﴿ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴾ خالد بن معدان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اور اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ﴾ [ھود: ۱۰۷] اہلِ توحید کے حق میں ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ احتمال ہے کہ یہ آیت ﴿ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴾ کے متعلق ہو اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کے لیے کسی اور طرح کا اور دوسری قسم کا عذاب کرے۔ پھر کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ ان کے لیے انقضاء (گزرنا، ختم ہونا) نہیں ہے۔ امام قتادہ اور ربیع بن انس رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[3] اس سے پہلے یہ کہا تھا کہ حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احقاب کے لیے کوئی گنتی نہیں ہے۔ یہی خلود فی النار ہے، لیکن یہ ذکر کرتے ہیں کہ حقب ستر برس کا ہوتا ہے، ہر دن ہزار سال کے برابر۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احقاب کا انقطاع نہیں۔ ایک حقب گزرا دوسرا حقب شروع ہوا۔ اللہ کے سوا احقاب کی گنتی کوئی نہیں جانتا۔ ایک حقب کو اسی (۸۰) برس کا کہتے ہیں، ہر برس تین سو ساٹھ دن کا ہوگا، ہر دن ہزار سال کا۔[4] پھر فرمایا کہ جہنم میں نہ دل کو ٹھنڈک ہوگی نہ آبِ پاکیزہ ہوگا جس کو غذا کریں۔ لہٰذا فرمایا کہ یہی آبِ گرم اور بہتا ہوا پیپ ہوگا۔

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ برد سے حمیم کو اور شراب سے غساق کو مستثنیٰ کیا ہے۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ حمیم اس گرم پانی کو کہتے ہیں جس کی گرمی بے انتہا ہو اور غساق اس زرد پانی کو کہتے ہیں جو اہل نار کے آنسوؤں، پیپ اور زخموں سے نکل کر جمع ہوگا۔ وہ اتنا ٹھنڈا ہوگا کہ جس کو اس کی بدبو اور ٹھنڈا ہونے کے سبب سے پی نہ سکیں گے۔ أجارنا الله من ذلك بمنه وكرمه ولطفه. امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک قول یہ ہے کہ برد سے مراد نیند ہے۔ امام مجاہد، ابو عبیدہ اور کسائی رحمہم اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ پھر اس کو ﴿ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴾ فرمایا، یعنی وہ سزا جس میں وہ مبتلا ہوں گے ان کے ان اعمالِ فاسدہ کے موافق ہوگی جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے۔ ترکی بہ ترکی جواب اسی کو کہتے ہیں۔ یہی قول امام قتادہ اور کئی ایک اہلِ علم کا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٥٩٥/٤) اس کی سند میں "قاسم اور جعفر بن زبیر" ضعیف راوی ہیں۔

[2] مسند البزار (٢٤٠/١٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه سليمان بن مسلم الخشاب وهو ضعيف جدا" (مجمع الزوائد: ٧٢٥/١٠)

[3] تفسیر ابن کثیر (٥٩٦/٤) [4] تفسير الطبري (١٦٢/٢٤)

پھر فرمایا کہ اگرچہ یہ ایسے گھر کے معتقد نہ تھے جہاں پر جزا دی جاتی ہے اور حساب کیا جاتا ہے، بلکہ وہ تو ہماری حجتوں اور دلیلوں کو، جو ہم نے مخلوق پر اپنے رسولوں کی معرفت اتاری ہیں، نہیں مانتے اور ان آیات کا مقابلہ تکذیب سے کرتے ہیں، حالانکہ ہم کو بندوں کے سارے اعمال کی خبر ہے۔ ہم نے ان کے سارے اعمال لکھ رکھے ہیں۔ اب ہم ان کو جزا دیں گے، خیر کی جزا خیر اور شر کی جزا شر۔ پھر دوزخیوں سے یہ بات کہی جائے گی: ''اب تم اس عذاب کا مزا چکھو جس میں گرفتار ہو'' اسی جنس کا عذاب ہم زیادہ کریں گے اور دوسری طرح کا عذاب بھی دیں گے۔ ﴿ وَاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖٓ اَزْوَاجٌ ﴾ [ص: ٥٨] ''اس کے علاوہ اور طرح طرح کے عذاب۔'' سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اہلِ نار پر اس آیت سے زیادہ سخت کوئی آیت نہیں اتری: ﴿ فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ﴾۔ چنانچہ وہ ہمیشہ عذاب زیادتی میں رہیں گے۔[1] امام حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اللہ کی کتاب میں اہلِ نار کے لیے سخت ترین آیت کون سی ہے؟ کہا: میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ اس آیت کو پڑھ کر فرمایا: « هَلَكَ الْقَوْمُ بِمَعَاصِيهِمُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ » یعنی قوم اللہ کی نافرمانی کے سبب سے ہلاک ہوگئی۔[2] اس کی سند میں جسر بن فرقد ضعیف ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ نیک و بد، حق سمجھنے والے اور باطل قرار دینے والے کے درمیان فیصلے کا دن اللہ کے علم و حکم میں ایک وقت معین ہے جس میں سارے پہلے اور پچھلے جمع ہوں گے، یا مراد میقات اور میعاد ہے۔ وقوعِ جزا کے لیے۔ پھر فرمایا کہ اس دن صور پھونکا جائے گا۔ نفخ کا ذکر خوف دلانے کے لیے ہے، اگر فیصلہ نفخ کے بعد ہوگا۔ صور نرسنگے کو کہتے ہیں جس میں اسرافیل علیہ السلام پھونکیں گے۔ اس جگہ نفخ سے مراد نفخِ ثانیہ ہے جو قبروں سے اٹھانے کے لیے ہوگا اس وقت لوگ اپنی اپنی قبروں سے نکل کر موقف کی طرف فوج در فوج اور جماعت در جماعت ہو کر آئیں گے اور آسمان مفتوح کر دیا جائے گا، یعنی پھٹ جائے گا، اس میں نزولِ ملائکہ کے لیے راستے ہو جائیں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ ہر بندے کے لیے آسمان میں دو دروازے ہیں: ایک اس کے رزق کا دوسرا اس کے عمل کا، تو جب قیامت قائم ہوگی وہ دروازے کھل جائیں گے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ہوا میں غبار کی طرح اڑنے لگیں گے، یا ان کی جڑیں اُکھڑ جائیں گی۔ وہ ریت کی طرح نظر آنے لگیں گے، دھوپ میں پانی کی طرح دکھائی دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ لاشے ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کا ذکر کئی طرح پر کیا ہے، حالاں کہ ان کے درمیان جمع ممکن ہے، اس طرح پر کہ ان ک

---

[1] تفسیر الطبري (١٦٩/٢٤) [2] تفسیر ابن کثیر (٥٩٧/٤) اس کی سند میں ''حسن بن دینار اور جسر بن فرقد'' ضعیف راوی ہیں۔

پہلی حالت اندکاک ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴾ [الحاقة: ١٤] ''اور زمین اور پہاڑ اٹھا لیے جائیں گے اور ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔'' دوسری حالت یہ ہے کہ دھنی ہوئی روئی کی طرح ہو جائیں: ﴿ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ﴾ [القارعة: ٥] ''اور پہاڑ دھنے ہوئے رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے۔'' تیسری حالت یہ ہے کہ مثل ''ھباء''، یعنی غبار کی طرح ہوا میں اڑیں گے: ﴿ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ﴾ [الواقعة: ٥-٦] ''اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے، پھر وہ مثل پراگندہ غبار کے ہو جائیں گے۔''

چوتھی حالت یہ ہے کہ خاک ہو جائیں گے، ہوائیں ان کو اڑاتی پھریں گی ﴿ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ﴾ [النمل: ٨٨] ''اور آپ پہاڑوں کو دیکھ کر اپنی جگہ جمے ہوئے خیال کرتے ہیں، لیکن وہ بھی بادل کی طرح اڑتے پھریں گے۔'' پانچویں حالت یہ ہے کہ وہ سراب ہو جائیں یعنی لا شے جس طرح کہ اس جگہ فرمایا ہے۔ ﴿ مِرْصَادًا ﴾ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں بیٹھ کر دشمن کو تاکیں یعنی کمین گاہ۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِرْصَادًا ﴾ سے مراد محبس ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ راستہ اور گزر گاہ۔ یعنی جہنم اللہ تعالیٰ کے حکم اور فیصلے میں تاکنے کی ایک جگہ ہے، جہاں سے آگ کے داروغہ بیٹھ کر کفار کو تاکیں گے، تاکہ ان کو آگ میں عذاب کریں، یا خود جہنم تاکتی ہے کہ کفار مجھ میں آتے ہیں۔ کچھ ہی ہو، یہ جہنم سرکش لوگوں کا انجام ہے، وہ اس میں بہت سے حقب تک رہیں گے۔

''حقب'' دہر، یعنی زمانے کے معنی میں ہے۔ احقاب بہ معنی دہور۔ حقب کی مقدار میں مختلف اقوال ہیں جن کا ذکر ہو چکا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ حقب اس وقت کا نام ہے جس وقت کہ وہ حمیم اور غساق پئیں گے۔ جب وہ وقت گزر جائے گا تو پھر دوسری طرح کا عذاب دیا جائے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت ان گناہ گاروں کے حق میں ہے جو آگ سے باہر نکالے جائیں گے، لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس سے مراد تابید ہے نہ کہ تقیید (ہمیشگی نہ کہ ایک مقررہ وقت)۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے حسن رحمہ اللہ سے نقل کیا: یعنی اب تک ایک حقب کے بعد دوسرا حقب اسی طرح آتا چلا جائے گا۔[2] یہ آیت اہلِ نار کے خلود پر دلیل ہے اور قول نار کے فنا ہونے کا کتاب و سنت کے ظاہر کے خلاف ہے۔ واللہ أعلم.

پھر وہ لوگ جہنم میں یا ان احقاب میں نہ ٹھنڈک چکھیں گے کہ گرمی سے کچھ آرام ملے اور نہ ہی پانی پئیں گے کہ پیاس بجھے، مگر یہی گرم پانی اور دوزخیوں کا دھوون۔ ''برد'' کا اطلاق نوم پر اس لیے ہے کہ سو جانے سے پیاس کی شدت دور ہو جاتی ہے۔ عرب کہتے ہیں: ''أَذْهَبَ الْبَرْدُ النَّوْمَ'' یعنی ٹھنڈک نے نیند کو دور کر دیا۔ حدیث میں مروی

[1] تفسیر القرطبي (١٩/١٧٧) [2] فتح القدير (٥/٤٨٥)

ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے سوال ہوا کہ بہشت میں بھی سونا ہوگا؟ فرمایا: نہیں، نوم برادرِ مرگ ہے اور جنت میں موت نہ ہوگی۔[1] اسی طرح آگ میں۔ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا﴾ [فاطر: ٣٦] ''نہ ان کی قضا ہی آئے گی کہ مر ہی جائیں۔''

امام حسن اور عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''برد'' سے مراد راحت ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ زمہریرِ جہنم ان کے لیے عذاب ہوگا۔[3] جب گرم پانی کا برتن ان کے منہ سے لگے گا تو منہ کا چمڑا گر کر ہڈیاں نکل آئیں گی۔ ''وِفَاق'' جزا کی صفت ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عذاب گناہ کے موافق ہوا۔ کوئی گناہ شرک سے بڑھ کر نہیں ہے۔ امام حسن اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ان کے اعمال برے تھے، اللہ نے بھی ان کو وہ بدلہ دیا جو ان کو برا لگا۔[4] ان کو یہ امید نہ تھی کہ ہم مبعوث ہوں گے اور ہمارا حساب کتاب ہوگا۔ وہ اللہ کی آیات کو خواہ قرآن تھا یا اور کچھ عموماً جھٹلاتے تھے، حالاں کہ ہم نے ہر چیز کو گن کر لکھ رکھا ہے، اب یہ اس عذاب کو چکھیں۔ اب یہ عذاب ان کا روز افزوں ہوگا۔ عذاب کی ایک زیادتی اس طرح ہوگی کہ جب کھال پک جائے گی تو دوسری کھال بدلیں گے اور جب آگ نرم پڑے گی تو اس کی بھڑک زیادہ کر دی جائے گی۔ یہ آیتِ قرآن اہلِ نار پر سب سے زیادہ سخت ہے کہ جب ایک عذاب سے تنگ آ کر استغاثہ کریں گے تو بجائے فریاد رسی کے دوسرا اس سے بھی زیادہ سخت عذاب مقرر کیا جائے گا۔[5]

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴿۳۱﴾ حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ﴿۳۲﴾ وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿۳۳﴾ وَّكَاْسًا دِهَاقًا ﴿۳۴﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿۳۵﴾ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ﴿۳۶﴾

بے شک متقی لوگوں کے لیے کامیابی ہے (31) باغات اور انگور ہیں (32) اور نوجوان ہم عمر عورتیں (ہیں) (33) اور چھلکتے ہوئے جام ہیں (34) وہ جنت میں نہ تو بے ہودہ باتیں سنیں گے اور نہ جھوٹ (35) انھیں آپ کے رب کی طرف سے (نیک اعمال کا یہ) بدلہ ملے گا جو اُن کے لیے کافی انعام ہوگا (36)

پرہیزگاروں کے لیے عظیم کامیابی:

وہاں بے ہودہ اور جھوٹی باتیں نہ سنیں گے، یعنی کوئی کسی سے جھگڑتا نہیں کہ اس کی بات کو رد کرے۔ انتہی.

اللہ تعالیٰ نے ان آیاتِ مبارکہ میں اہلِ سعادت کے حال کی خبر دی ہے کہ ہم نے ان کے لیے یہ کچھ کرامت اور نعیمِ مقیم تیار کر رکھے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿مَفَازًا﴾ سے مراد متنزہ

---

[1] المعجم الأوسط (٢٨٢/١) شعب الإيمان (١٨٣/٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٨٧)

[2] تفسير القرطبي (١٨٠/١٩) [3] الدر المنثور (٣٩٦/٨) [4] تفسير القرطبي (١٨٠/١٩) [5] فتح البيان (٣٤/١٥۔٤٠)

ہے، یعنی سیر گاہ۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا: یعنی وہ کامیاب ہوئے نار سے نجات پائی۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ زیادہ ظاہر وہی معنی ہیں جو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہے ہیں، کیوں کہ اس کے بعد باغات کا ذکر کیا ہے۔ حدائق وہ باغات ہوتے ہیں جن میں کھجوریں وغیرہ ہوں۔

﴿ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴾ سے مراد "حور عین" ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كَوَاعِبَ ﴾ سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کی چھاتیاں اٹھی ہوئی ہوں، لٹکتی نہ ہوں، کیوں کہ وہ دوشیزہ اور کنواری ہوں گی۔ ﴿ اَتْرَابًا ﴾ سے مراد ہم عمر ہیں۔ ایک سن وسال کی ہیں۔[2] سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا کہ اہلِ جنت کی قمیص اللہ کی رضوان سے نمایاں ہوں گی۔ ایک بادل آئے گا، وہ پکار کر کہے گا: اے جنت والو! تم کیا چاہتے ہو کہ میں کس چیز کو تم پر برساؤں۔ پھر ان پر کواعبِ اتراب کو برسائے گا۔[3] (رواه ابن أبي حاتم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ كَاْسًا دِهَاقًا ﴾ سے مراد شرابِ طہور سے بھرا ہوا پیالہ ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بادۂ صافی مراد ہے۔ امام مجاہد، امام حسن اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ چھلکتا ہوا ساغر ہے۔ امام مجاہد اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد لگا تار ہے،[4] پھر اس جنت میں لغو اور جھوٹ باتوں کی نفی فرمائی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ ﴾ [الطور: ٢٣] "نہ اس میں بیہودہ گوئی ہو گی اور نہ گناہ۔" یعنی نہ کوئی لغو اور بے فائدہ بات کہیں گے اور نہ اثم و کذب ہوگا، بلکہ وہ گھر سلامتی کا دولت خانہ ہے، وہاں کی ہر چیز نقص اور بے ہودگی سے صحیح سالم ہوگی۔ یہ جزا جو ان کو ملے گی وہ اللہ کی دی ہوئی ہے جو اس نے اپنے فضل و احسان سے دی ہے۔ یہ عطا کافی وافی سالم اور بہت زیادہ مقدار میں ہے۔ عرب کہتے ہیں: "أَعْطَانِيْ فَأَحْسَبَنِيْ"، یعنی مجھ کو اتنا دیا جو کفایت کر گیا۔ ومنه حسبي الله أيْ: الله كافي.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں بیان کیا ہے کہ پہلے اللہ نے کافروں کے انجام کا حال ذکر کیا تھا۔ اب جو چیز مومنوں کے لیے تیار کر رکھی ہے، اس کا ذکر شروع کیا۔ ﴿ مَفَازًا ﴾ مصدر میمی ہے بہ معنی فوز وظفر بہ مطلوب ونجات از نار۔ جنگل کو مفازہ سی جگہ سے کہتے ہیں بطور فال خلاص یا مراد جنت سے کہتے ہیں فال خلاص یا مراد جنت ہے، یعنی بطور جنت جائے فوز یا بہ معنی حدث۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں معنی مراد لیں۔ عذاب سے نجات پانا فوز ہوتا ہے۔ اسی طرح نعیم کو پہنچنا بھی فوز ہے۔ مختار میں کہا ہے کہ فوز کا لفظ نجات اور ہلاکت دونوں کے معنی میں ہے۔[5] اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] تفسير الطبري (١٦٩/٢٤، ١٧٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٩٥/١٠)

[3] تفسير ابن كثير (٥٩٧/٤) اس کی سند میں "عطیہ بن سلیمان" مجہول راوی ہے۔

[4] تفسير الطبري (١٧١/٢٤-١٧٣) [5] مختار الصحاح (٥١٧/١)

﴿ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ﴾ [آل عمران: ۱۸۵] ”پس جو شخص آگ سے ہٹا لیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے بے شک وہ کامیاب ہو گیا۔“ اس جگہ ”فوز“ کا اطلاق دونوں معنی میں ہوا۔ حدیقہ اس باغ کو کہتے ہیں جس کے گرد چار دیواریں ہوں اور اس میں طرح طرح کے میوہ دار درخت ہوں۔ ”عنب“ انگور کو کہتے ہیں۔ باغ کے بعد انگور کا ذکر انگور کی شان کی عظمت کے لیے ہے۔ ”کاعبہ“ زنِ ناہدہ کو کہتے ہیں جس کے پستان چکنے گول اور اٹھے ہوئے ہوں، یعنی ان کو وہ عورتیں ملیں گی جن کی چھاتیاں گول اور قدرے بلند ہوں گی۔

بروئے سینہ اش سیب دوپارہ علاج قوت ضعف نظارہ

”اس کے سینے پر ایک سیب کے دو ٹکڑے ہیں جو دیکھنے کی طاقت کی کمزوری کا علاج ہیں۔“

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”کواعبا“ سے مراد کنواریاں ہیں اور ﴿ اَتْرَابًا ﴾ سے مراد عمر میں برابر ہیں۔[1] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ دِهَاقًا ﴾ ساغرِ لبریز کو کہتے ہیں۔ امام عکرمہ اور مجاہد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس جام کو کہتے ہیں جو پے در پے لایا جائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ پُر اور لبریز اور لگاتار پیش کیا جانے والا۔[2] مراد یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے غلام سے کہتے: ”اِسْقِنَا وَأَدْهِقْ لَنَا“ یعنی ہمیں پلا اور بھر کر دے۔ جس پیالے میں شراب ہوتی ہے، اس کو ”کأس“ کہتے ہیں اور خالی پیالے کو ”کأس“ نہیں کہتے ہیں۔ جنت میں میخواری و شراب نوشی و بادہ کشی کے وقت نہ تو باطل اور بے فائدہ کلام ہوگا اور نہ کوئی کسی کو جھوٹا کہے گا۔ یہ جزا کچھ اللہ پر واجب نہیں ہے، اس لیے اس کو عطا کہا ہے، یعنی یہ اس کا تفضّل ہے۔

حساب کے معنی کافی ہیں۔ مصدر کو مبالغے کے لیے وصف کے قائم مقام کر دیا ہے۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حسابِ کثیر کے معنی میں ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حساب سے دیا، یعنی ایک نیکی کے بدلے میں دس گنا بخشا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حساب بہ معنی قدر (اندازہ) ہے، یعنی اتنا دیا جتنا کہ اللہ کے وعدے میں دینا چاہیے تھا، کیوں کہ اس نے ایک نیکی پر دس گنا دینے کا وعدہ کیا ہے اور کسی کو سات سو گنا اور کسی کو بے انتہا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾[3] [الزمر: ۱۰] ”صبر کرنے والوں ہی کو ان کا پورا پورا بے شمار اجر دیا جاتا ہے۔“ اور کسی نے حساب بہ تشدیدِ سین بہ معنی کفاف پڑھا ہے۔[4]

---

[1] تفسیر القرطبي (۱۸۳/۱۹) [2] تفسیر الطبري (۱۷۱/۲۴۔۱۷۳)

[3] تفسیر القرطبي (۱۸۵/۱۹) [4] فتح البیان (۴۱/۱۵۔۴۳)

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ
خِطَابًا ﴿۳۷﴾ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙۗ لَا يَتَكَلَّمُوْنَ
اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ الْيَوْمُ
الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿۳۹﴾ اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ
عَذَابًا قَرِيْبًا ۚۖ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَ يَقُوْلُ
الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾

جو آسمانوں اور زمین کا اور اُن کے درمیان تمام اشیاء کا رب ہے، نہایت مہربان ہے، وہ اس سے بات کرنے کا اختیار نہیں رکھیں گے (37) جس دن جبریل اور (سب) فرشتے اس کے حضور صف بستہ کھڑے ہوں گے، اس سے صرف وہی کلام کر سکے گا جسے رحمان اجازت دے گا اور وہ درست بات کہے گا (38) یہ دن برحق ہے، چنانچہ جو چاہے اپنے رب کے پاس ٹھکانا بنا لے (39) بے شک ہم نے تمھیں جلد آنے والے عذاب سے ڈرا دیا ہے، اس دن انسان وہ (سب کچھ) دیکھے گا جو اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا ہوگا اور کافر کہے گا: کاش! میں مٹی ہو جاتا (40)

اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی بلا اجازت بول بھی نہ سکے گا:

عوام لوگ جو اللہ کو نہیں دیکھتے جو چاہیں اس دنیا میں کہہ لیں، آخرت میں اس کا جلال سامنے ہے۔ بغیر اجازت کوئی نہیں بول سکتا۔ روح جانداروں کو کہا، یا جبریل علیہ السلام کا نام ہے۔ جو مسلمان قابلِ سفارش ہیں انہی کے لیے یہ کہا کہ وہ ٹھیک بات بولیں گے۔ کافر کہے گا کہ میں مٹی ہی رہتا آدمی نہ بنتا، تاکہ اس حساب اور عذاب میں گرفتار تو نہ ہوتا۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ان آیات میں اپنی عظمت اور جلال کی خبر دی ہے کہ آسمان و زمین وما فیہما کا رب رحمان ہے جس کی رحمت ہر چیز کو شامل حال ہے۔ پھر کہا کہ کسی کو بات شروع کرنے کی قدرت نہ ہوگی مگر اس کی اجازت سے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرة: ٢٥٥] ”کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے۔“ نیز جیسا کہ اس کا فرمان ہے: ﴿ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [هود: ١٠٥] ”جس دن وہ آجائے گی مجال نہ ہوگی کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی بات بھی کر لے۔“ روح کے متعلق اختلاف ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بنی آدم کی روحیں ہیں۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد بنی آدم ہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما چھپاتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ روح ایک مخلوق ہے جس کو اللہ نے بنی آدم کی شکل پر پیدا کیا ہے، وہ نہ ملائکہ ہیں نہ بشر ہیں، لیکن کھاتے پیتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ابو صالح اور اعمش رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ یہی قول امام شعبی، سعید بن جبیر اور ضحاک رحمہ اللہ کا ہے۔ یہ آیت کریمہ اسی کی شاہد ہے: ﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴾ [الشعراء: ۱۹۳-۱۹۴] ”اسے امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے دل پر اترا ہے کہ آپ آگاہ کر دینے والوں میں سے ہو جائیں۔“ امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ روح تمام فرشتوں سے زیادہ شرف والے اور اللہ کے قریب ہیں، دوسرے ملائکہ اور دوسری تمام مخلوقات کی نسبت۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ روح ایک فرشتہ ہے جو پیدائش کے لحاظ سے دوسرے تمام فرشتوں سے زیادہ بڑا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ روح چوتھے آسمان پر ہے، وہ آسمانوں اور پہاڑوں اور ملائکہ میں سب سے بڑا ہے، ہر دن کو بارہ ہزار مرتبہ تسبیح کرتا ہے۔ ہر تسبیح سے اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے، وہ قیامت کے دن تنہا صف باندھ کر آئے گا۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول سخت غریب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ اللہ کا ایک فرشتہ ہے اگر اس سے کہا جائے کہ تو ساتوں آسمانوں اور زمین کو لقمہ کرے گا تو وہ ایک لقمہ کر جائے۔ اس کی تسبیح یہ ہے: ”سُبْحَانَكَ حَيْثُ كُنْتَ“[2] (رواه الطبراني وهذا حديث غريب جدا وفي رفعه نظر وقد يكون موقوفا على ابن عباس و يكون مما تلقاه من الإسرائيليات) ”خدایا! تو جہاں کہیں بھی ہے پاک ہے۔“ واللّٰه أعلم.

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ان اقوال میں سے کسی ایک قول پر جزم نہیں کیا، بلکہ توقف اختیار کیا۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ۔ واللّٰه أعلم۔ ہمارے نزدیک ایک شبہہ یہ ہے کہ اس سے مراد بنی آدم ہیں۔[4] اور اللہ کا قول: ﴿ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ ﴾ اس قول کی طرح ہے: ﴿ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [هود: ۱۰۵] صحیح میں مروی ہے: ”وَلَا يَتَكَلَّمُ يَوْمَئِذٍ إِلَّا الرُّسُلُ“[5] یعنی اس دن رسولوں کے سوا کوئی بات نہ کر سکے گا۔ ”صواب“ سے مراد حق بات ہے۔ حق میں سے ایک لا الہ الا اللہ ہے۔[6] (قاله أبو صالح و عكرمة)

قیامت کا دن قریب ہے:

اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ وہ دن حق ہے، یعنی ضرور ہونے والا ہے، اس کے ہونے میں کچھ شک و شبہہ نہیں

---

(1) تفسير الطبري (۲۴/۱۷۵-۱۷۷) تفسير ابن كثير (۴/۵۹۸)

(2) المعجم الأوسط (۶/۲۹۰) اس کی سند میں ”وہب اللہ بن رزق“ مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ۳۱۹۹)

(3) تفسير الطبري (۲۴/۱۷۷) (4) تفسير ابن كثير (۴/۵۹۸) (5) صحيح البخاري (۷۰۰۰) صحيح مسلم (۱۸۲)

(6) تفسير الطبري (۲۴/۱۷۸)

ہے۔اب جو کوئی چاہے وہ ایک راستہ بنا لے جس سے اللہ تک جا پہنچے۔ عذابِ قریب سے مراد قیامت کا دن ہے، کیوں کہ وقوع کی تاکید کرنے سے قریب سا ہو گیا ہے۔ ہر آنے والی چیز قریب ہوتی ہے۔ اس دن آدمی کے سامنے اس کے سارے اعمال اچھے اور برے، پرانے اور نئے پیش کیے جائیں گے کہ دیکھو تو نے یہ کام کیے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ﴾ [الکھف: ٤٩] ''اور جو کچھ انھوں نے کیا تھا سب موجود پائیں گے۔'' اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يُنَبَّؤُا الْاِنْسٰنُ يَوْمَىِٕذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴾ [القیامۃ: ١٣] ''آج انسان کو اس کے آگے بھیجے ہوئے اور پیچھے چھوڑے ہوئے سے آگاہ کیا جائے گا۔''

کافر اس دن یہ تمنا کرے گا کہ کاش! میں دنیا میں خاک ہوتا، پیدا نہ ہوتا، ہستی میں نہ آتا۔ یہ بات اللہ کے عذاب اور اپنے اعمالِ فاسدہ کو دیکھ کر کہے گا، حالاں کہ وہ اعمال لکھنے والے فرشتوں کے ہاتھوں سے لکھے ہوئے ہیں، وہ فرشتے جو باعزت اور نیک ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ بات اس وقت کہے گا جبکہ اللہ کے فیصلے کو حیوانات کے درمیان دیکھے گا کہ بغیر سینگ والی بکری کا بدلہ سینگ والی بکری سے لیا جاتا ہے، پھر فیصلے کے بعد فرمائے گا کہ تم مٹی ہو جاؤ۔ وہ سب حیوانات مٹی ہو جائیں گے۔ اس وقت کافر یہ آرزو کرے گا کہ اگر میں بھی ان کی طرح خاک ہو جاتا تو کیا اچھا ہوتا! مشہور حدیثِ صور میں بھی یہ ذکر آیا ہے اور اس کے بارے میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے آثار وارد ہوئے ہیں۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اس دن مخلوق کی یہ مجال نہ ہو گی کہ اللہ سے شفاعت کا کچھ سوال کر سکیں گے، مگر اس کے اذن سے۔ مراد کفار ہیں۔ رہے مومن تو وہ شفاعت کریں گے۔ آیت سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیتِ عامہ اور عظمت اور کبریائی ظاہر ہوتی ہے۔ روح کے متعلق آٹھ اقوال ہیں: ایک یہ ہے کہ اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے جو فرشتوں کے علاوہ ہے، سر اور ہاتھ پاؤں رکھتے ہیں۔ یا اشرافِ ملائکہ مراد ہیں، یا ملائکہ پر نگران ہیں۔ (قاله بن أبي نجيح) یا مراد قرآن شریف ہے۔ (قاله زيد بن أسلم) یا یہ کہ ہر دو نفخہ کے درمیان روحوں کے اپنے جسموں میں واپس کیے جانے سے پہلے لوگوں کی روحیں فرشتوں کے پاس ہیں۔ امام شوکانی نے اس جگہ کسی قول کی ترجیح نہیں کی۔[2] باقی اقوال ذکر ہو چکے۔

بہرحال اس دن مخلوق اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قیامت کی ہولناکیوں کے ڈر سے بات نہ کریں گے اور نہ کسی کی سفارش کے لیے اپنے لب کھولیں گے، مگر جس کو رحمان اجازت دے کہ وہ شفاعت کرے یا صحیح بات بولے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی شخص جنت میں داخل نہ ہو گا مگر روح کے ہمراہ اور نہ دوزخ میں داخل ہو گا مگر اپنے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٥٩٨، ٥٩٩) [2] فتح القدیر (٥/٤٩٠)

عمل کے سبب سے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مومنین اور ملائکہ کو بات کرنے کی اجازت ہو گی جس نے دنیا میں توحید کی گواہی دی تھی۔[1] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو لوگ بولیں گے وہ تمام مخلوق سے افضل اور اللہ کے بہت قریب ہوں گے۔[2] قیامت کا یہ دن سچ مچ ہونے والا ہے۔ اب جس کا جی چاہے وہ عمل خیر کر کے رب کی طرف قرب کا راستہ پکڑے، کیوں کہ عمل شر سے نزدیکی نہیں ہوتی بلکہ دوری نصیب ہوتی ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَاٰبًا ﴾ سے مراد سبیل ہے۔[3] عذابِ قریب سے مراد آخرت کا عذاب ہے، کیوں کہ ہر آنے والا امر قریب ہوتا ہے۔ نیز اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴾ [النازعات: ٤٦] ''جس روز یہ اسے دیکھ لیں گے تو ایسا معلوم ہو گا کہ صرف دن کا آخری حصہ یا اول حصہ ہی (دنیا میں) رہے ہیں۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد عذابِ دنیا ہے، کیوں کہ یہ دونوں عذابوں میں سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بدر کے دن قتلِ قریش کا عذاب ہے،[4] مگر پہلا قول زیادہ بہتر ہے اس آیت کی دلیل سے جو اس کے بعد کی ہے کہ اس دن ہر آدمی خواہ وہ مسلمان تھا یا کافر اپنے آگے بھیجے ہوئے عمل کو دیکھے گا، وہ عمل اچھا تھا یا برا۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق: ﴿ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ ﴾ [آل عمران: ١٨١- ١٨٢] ''جلنے والا عذاب چکھو یہ تمھارے پیش کردہ اعمال کا بدلہ ہے۔''

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ آدمی سے مراد مومن ہے،[5] کیوں کہ وہ اپنے عمل کو پائے گا۔ رہا کافر تو وہ اپنے لیے کوئی عمل نہ پائے گا، اسی لیے وہ تمنا کرے گا کہ خاک ہو جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد عام طور پر کافر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ابی بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط مراد ہے، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد کافر سے اس جگہ ابوجہل ہے، یا ابوسلمہ مخزومی ہے، یا ابلیس ہے کہ یہ مٹی ہو جانے کی تمنا کریں گے۔ مگر لفظ کی عمومیت کے اعتبار سے پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ خصوصِ سبب کچھ اس کے منافی نہیں ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن ساری مخلوق کا حشر ہو گا۔ جانوروں، چوپایوں، پرندوں اور ہر شے پر اللہ کا عذاب یہاں تک پہنچے گا کہ سینگ والی سے بغیر سینگ والی کا بدلہ لیا جائے گا، پھر فرمائے گا کہ خاک ہو جاؤ۔ اس وقت کافر کہے گا: ﴿ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴾[6] (رواه عبد بن حميد وابن جرير وابن المنذر وابن أبي حاتم والبيهقي في البعث) امام ابو الزناد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن بھی مٹی ہو جائیں گے۔ امام عمر بن عبدالعزیز

---

[1] فتح القدير (٤٩٠/٥) [2] تفسير البيضاوي (٤٤٣/٥) [3] تفسير الطبري (١٧٩/٢٤)

[4] تفسير القرطبي (١٨٨/١٩) [5] تفسير الطبري (١٨٠/٢٤)

[6] تفسير الطبري (١٨٠/٢٤) تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٩٦/١٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٩٦٦)

اور مجاہد رحمہ اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ مومن جن جنت کے گرد میدان میں ہوں گے نہ کہ جنت کے اندر،[1] لیکن اکثر اہلِ علم اس بات پر ہیں کہ جن ثواب اور عذاب کیے جائیں گے۔ ان کے ایمان دار جنت میں اور کافر بنی آدم کی طرح آگ میں جائیں گے۔ اس کا ذکر خطیب نے کیا ہے۔ اس آیت کا یہی تقاضا ہے: ﴿ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴾ [الرحمٰن: ١٣] ”پس (اے انسانو اور جنو!) تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔“[2] واللّٰہ أعلم.

---

[1] تفسیر القرطبي (١٨٩/١٩) [2] فتح البیان (٤٣/١٥-٤٧)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ النّٰزِعٰتِ

اس کو سورت "ساھرہ" بھی کہتے ہیں۔ اس کی پینتالیس (۴۵) یا چھیالیس (۴۶) آیتیں ہیں اور یہ سورت بلا اختلاف مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس وعبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "هِيَ مَكِّيَّةٌ"[2]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ﴿۱﴾ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ﴿۲﴾ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ﴿۳﴾
فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ﴿۴﴾ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۘ﴿۵﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے ڈوب کر روح نکالنے والے (فرشتوں) کی ① اور آسانی سے روح نکالنے والوں کی ② اور تیزی سے تیرنے والوں کی ③ پھر دوڑ کر آگے بڑھنے والوں کی ④ پھر کام کی تدبیر کرنے والوں کی ⑤

وقوعِ قیامت پر پانچ قسمیں:

فرشتے کافر کی جان گھسیٹ کر نکالیں اس کی رگوں میں ڈوب کر۔ ایک مسلمان کی جان کو اس طرح نکالیں، جیسے اس کی گرہ کھول دیں اور وہ اپنی خوشی سے عالمِ پاک کو دوڑے، جیسے کسی کا بند کھول دیا، لیکن بدن کی تکلیف اور ہے اس میں دونوں برابر ہیں۔ یہ روح کا ذکر ہے، نیک روح خوشی سے دوڑتی ہے اور بری بھاگتی ہے پھر گھسیٹی جاتی ہے۔ بعض فرشتے ہوا میں تیرتے پھرتے ہیں، ایک سے بڑھ کر ایک درجہ لینا چاہتے ہیں، جب کوئی حکم پہنچا، اس کام کے کرنے کو دوڑے۔

یہ قسمیں کھا کر اگلی بات بتانا مقصود ہوتا ہے اور کبھی ان چیزوں کی خوبی اور ندرت بتانے کے لیے قسم کھاتے ہیں۔ انتہیٰ۔

---

① الدر المنثور (۴۰۳/۸) ② تفسیر ابن کثیر (۳۱۲/۸۔ط: دار طيبة)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام مسروق، سعید بن جبیر، ابو صالح، ابو الضحیٰ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلنّٰزِعٰتِ ﴾ سے مراد فرشتے ہیں، جبکہ وہ بنی آدم کی روحوں کو کھینچتے ہیں۔[1] کسی کی روح کو مشکل سے پکڑتے ہیں، ڈوب کر کھینچتے ہیں، کسی کی روح کو آسانی سے نکالتے ہیں، گویا اس کو ایک بند سے کھول دیا۔ یہی ﴿ اَلنّٰشِطٰتِ ﴾ سے مراد ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ یہ کافروں کی جانیں ہیں جن کو کھینچتے ہیں، پھر وہ کھل کر نکل آتی ہیں۔ پھر آگ میں ڈبو دی جاتی ہیں۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلنّٰزِعٰتِ ﴾ سے مراد موت ہے۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلنّٰزِعٰتِ ﴾ ﴿ اَلنّٰشِطٰتِ ﴾ ستارے ہیں۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تیر ہیں جو جنگ میں چلاتے ہیں۔[3] صحیح بات پہلی والی ہے، اکثر اسی پر ہیں۔

﴿ اَلسّٰبِحٰتِ ﴾ سے مراد ملائکہ ہیں۔ یہی قول ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ، امام مجاہد، سعید بن جبیر اور ابی صالح رحمہم اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موت ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نجوم ہیں۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کشتیاں ہیں۔ ﴿ اَلسّٰبِقٰتِ ﴾ سے مراد فرشتے ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ، امام مسروق، مجاہد، ابی صالح اور حسن بصری رحمہم اللہ نے بھی یہی کہا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب سے پہلے یہی ایمان لائے۔ انہی نے تصدیق کی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد موت ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نجوم ہیں۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گھوڑے ہیں اللہ کی راہ میں۔ ﴿ اَلْمُدَبِّرٰتِ ﴾ سے مراد ملائکہ ہیں۔ یہی قول سیدنا علی رضی اللہ عنہ، امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ مذکورین کا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ آسمان سے زمین تک ہر امرِ رب کی تدبیر کرتے ہیں، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کسی قول پر جزم نہیں کیا، لیکن ﴿ اَلْمُدَبِّرٰتِ ﴾ میں حکایت کیا کہ مراد فرشتے ہیں، لیکن میں نہ اثبات کروں نہ نفی۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اللہ نے ان چیزوں کی قسم کھائی۔ ﴿ اَلنّٰزِعٰتِ ﴾ سے مراد ملائکہ ہیں جو بندوں کی روحیں ان کے جسموں سے کھینچتے ہیں جس طرح کماندار کمان کو کھینچتا ہے اور خوب کھینچتا ہے۔ اسی طرح اس کے بعد سب جگہ فرشتے ہی مراد ہیں، ان کے درمیان عطف باوجود ان کے اتحاد کے ان کی صفتوں کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے۔ یہ صفتیں مؤنث آئی ہیں، حالاں کہ یہ فرشتوں کی صفات ہیں اور وہ کچھ مؤنث نہیں؟ یہ اس لیے کہ مراد طوائفِ ملائکہ ہیں اور طوائف جمع طائفہ ہے اور طائفہ مونث ہے۔ جمہور صحابہ، تابعین اور من بعدھم کا قول یہی ہے۔

"نشط" سے مراد جان کا بدن سے آسانی سے نکالنا جس طرح اونٹ کا بند کھول دینا۔ "نزع" کفار کی

---

[1] تفسير الطبري (١٨٥/٢٤) تفسير ابن كثير (٥٩٩/٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٣٩٨/١٠)

[3] تفسير الطبري (١٨٦/٢٤، ١٨٧) [4] تفسير الطبري (١٨٩/٢٤-١٩٠) تفسير ابن كثير (٥٩٩/٤)

روحوں کے لیے ہے اور "نشط" مومنوں کی روحوں کے لیے۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو لوگوں کو پھاڑ نہ کھا کہ تجھ کو آگ کے کتے پھاڑ کھائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ﴾ تو جانتا ہے کہ یہ کیا ہیں؟ عرض کی: فرمایئے، فرمایا: آگ کے کتے ہیں جو گوشت اور ہڈی کو جھنجھوڑیں گے۔[1] (أخرجه ابن مردويه)۔ ﴿ اَلسّٰبِحٰتِ ﴾ وہ فرشتے ہیں جو غوطہ لگا کر آسانی سے جان نکالتے ہیں، پھر اس کو چھوڑ دیتے ہیں کہ آرام لے لے۔ یا وہ ملائکہ ہیں جو آسمان سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری کے لیے شتابی کرتے ہیں۔ یا مومنین کی روحوں کو جلد بہشت کی طرف لے جاتے ہیں، یا یہ سب ملائکہ سب کام بجالاتے ہیں۔

مدبرات وہ فرشتے ہیں جو ایک سال سے دوسرے سال تک بندوں کے کام کا بندوبست کرتے ہیں۔ یا وہ فرشتے ہیں جو ملک الموت کے ساتھ آدمی کی روح قبض کرنے کے وقت حاضر ہوتے ہیں۔ کوئی روح کو اوپر لے جاتا ہے، کوئی دعا کے وقت آمین کہتا ہے، کوئی مردے کے لیے استغفار کرتا ہے، یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھی جائے اور گڑھے میں اتارا جائے۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ اس سے مراد فرشتے ہیں۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بلکہ اس کے متعلق دو قول ہیں: جمہور نے کہا ہے کہ ملائکہ ہیں۔ ایک قول یہ ہوا۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد سات ستارے ہیں۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا قول یہی ہے۔[2]

تدبیرِ کواکب سے مراد دو امر ہیں: ایک تدبیرِ طلوع وغروب ہے۔ دوسرے ان احوال کی تدبیر کرنا جن کے بارے میں حکم دیا جائے۔ تدبیرِ ملائکہ سے مراد حرام وحلال کو مع تفصیل لے کر نازل ہونا ہے۔ ورنہ حقیقت میں تو تدبیر کا فاعل اللہ وحدہ لا شریک لہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ملائکہ کو حکم ہے کہ ہواؤں اور بارش وغیرہ کا بندوبست رکھا کریں، اس لیے ان کو "مدبرات" کہتے ہیں۔ عبدالرحمان بن سابط نے کہا ہے کہ امرِ دنیا کی تدبیر چار فرشتوں کے حوالے ہے: جبریل، میکائیل، عزرائیل اور اسرافیل علیہم السلام۔ جبریل علیہ السلام ہواؤں اور اللہ کے لشکروں پر موکل ہیں، میکائیل علیہ السلام بارش اور پیداوار پر مقرر ہیں، عزرائیل علیہ السلام روحوں کے قبض کرنے پر تعینات ہیں اور اسرافیل علیہ السلام امر لے کر اترتے ہیں،[3] ان سب قسموں کا جواب یہ ہے کہ تم سب مبعوث ہو گے۔[4]

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ قُلُوْبٌ يَّوْمَىِٕذٍ وَّاجِفَةٌ ۝ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝ يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۝ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝ قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝

[1] الدر المنثور (٨/٤٠٥) [2] تفسير القرطبي (١٩/١٩٤)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٩٧، ٣٣٩٨) [4] فتح البيان (١٥/٥١_٥٥)

جس دن کانپنے والی (زمین) کانپے گی⑥ اس کے پیچھے پیچھے آنے والی (قیامت)⑦
اس دن کئی دل دھڑکتے ہوں گے⑧ ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی⑨ وہ (کافر) کہتے ہیں: کیا
ہم یقیناً پہلی حالت میں لوٹائے جائیں گے؟⑩ کیا جب ہم گلی سڑی ہڈیاں ہو جائیں گے؟⑪
کہتے ہیں کہ اس وقت لوٹنا تو خسارے والا ہے⑫ چنانچہ وہ (قیامت) تو صرف ایک
(خوفناک) ڈانٹ ہوگی⑬ تب لوگ ایک دم کھلے میدان میں (جمع) ہوں گے⑭

قیامت کی ہولناکیوں کا بیان:

کہتے تھے کہ اگر ہم دوبارہ زندہ ہوں گے تو ایک ایک حویلی کے ہزار ہزار مدعی ہوں۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ اَلرَّاجِفَةُ ﴾ اور ﴿ اَلرَّادِفَةُ ﴾ سے مراد نفخۂ اولیٰ اور نفخۂ ثانیہ ہے۔ یہی قول امام مجاہد، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلرَّاجِفَةُ ﴾ اس قول کی طرح ہے: ﴿ يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ ﴾ [المزمل: ١٤] ''جس دن زمین اور پہاڑ تھرتھرا جائیں گے۔'' اور ﴿ اَلرَّادِفَةُ ﴾ اس قول کی طرح ہے: ﴿ وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴾[1] [الحاقة: ١٤] ''اور زمین اور پہاڑ اٹھا لیے جائیں گے اور ایک ہی چوٹ میں ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔'' سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: ﴿ اَلرَّاجِفَةُ ﴾ آیا، اس کے پیچھے ﴿ اَلرَّادِفَةُ ﴾ ہے۔ آئے موت لے کر جو اس میں ہے۔ ایک مرد نے کہا کہ اگر میں پوری دعا اپنے آپ ہی کے لیے کر دوں؟ فرمایا: « إِذًا يَكْفِيكَ اللّٰهُ مَا أَهَمَّكَ مِنْ دُنْيَاكَ وَآخِرَتِكَ »[2] (رواه أحمد) یعنی اب تیری ساری تگ و دو دنیا اور آخرت کے لیے کافی ہو جائے گی۔

امام ترمذی، ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہم اللہ نے سفیان ثوری سے رفعاً روایت کیا ہے کہ جب دو تہائی رات گزر جاتی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر کہتے: اے لوگو! ''اللہ کو یاد کرو'' آیا ﴿ اَلرَّاجِفَةُ ﴾ اس کے پیچھے ''رادفة'' ہے آئے موت لے کر جو کچھ اس میں ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ وَاجِفَةٌ ﴾ بہ معنی ''خائفة'' ہے، یعنی ترساں ولرزاں۔ یہی قول امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ کا ہے۔[4] خشوعِ ابصار سے مرادِ اصحابِ ابصار کا خشوع ہے مراد آخرت کی ہولناکیوں کا مشاہدہ کر کے ذلت اور حقارت ہے۔ مشرکینِ قریش اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے جو دوسرے لوگ تھے وہ قیامت کا انکار کرتے تھے اور دوبارہ زندہ ہو جانے کو بعید جانتے تھے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا

① تفسير الطبري (١٩٠/٢٤-١٩٢) ② مسند أحمد (١٣٦/٥) صحيح الترغيب والترهيب (١٣٧/٢)
③ سنن الترمذي (٢٤٥٧) تفسير الطبري (١٩١/٢٤، ١٩٢) صحيح الجامع (٧٨٦٣) ④ تفسير الطبري (١٩٣/٢٤)

ہے کہ ﴿ اَلْحَافِرَةِ ﴾ سے مراد قبور ہیں، یعنی جب بدن گل سڑ گئے اور ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو گئیں اور پرانی پڑ گئیں تو اب کیا پھر ہم جی اٹھیں گے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ہڈی جب پرانی ہو جاتی ہے اور اس کے اندر ہوا آتی جاتی ہے تو اس کو "نخرة" کہتے ہیں۔ اس کو "ناخرة" بھی پڑھا گیا ہے، یعنی کھوکھلی ہڈی۔ امام محمد بن کعب، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابی مالک، سدی اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ "حافرة" سے مراد موت کے بعد حیات ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد آگ ہے۔ آگ کے بہت سے نام ہیں، ان میں سے ایک یہ نام بھی ہے۔ اس کے سوا "نار، حجیم، سقر، جهنم، حاوية، لظى، حطمة" بھی اس کے نام ہیں۔

امام محمد بن کعب رحمہ اللہ کہتے ہیں: قریش کہتے تھے اگر اللہ ہم کو موت کے بعد زندہ کرے گا تو یہ بڑا ٹوٹا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک ہی جھڑکی سے تم سب اللہ کے حکم سے میدان میں آ کھڑے ہو گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اسرافیل علیہ السلام کو حکم دے گا کہ صور کو پھونک دو، یعنی دوبارہ زندہ کرنے کے لیے نفخ ہوتی ہے، پھر سارے اگلے اور پچھلے رب العالمین کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھتے ہوں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٥٢] "جس دن وہ تمھیں بلائے گا، تم اس کی تعریف کرتے ہوئے تعمیلِ ارشاد کرو گے اور گمان کرو گے کہ تمھارا رہنا بہت ہی تھوڑا ہے۔" نیز فرمایا ہے: ﴿ وَمَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ﴾ [القمر: ٥٠] "اور ہمارا حکم صرف ایک دفعہ (کا ایک کلمہ) ہی ہوتا ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا۔" نیز فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ﴾ [النحل: ٧٧] "اور قیامت کا امر تو ایسا ہی ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا یا اس سے بھی زیادہ قریب۔"

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴾ سے مراد "صيحة واحدة" ہے۔ امام ابراہیم تیمی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق پر سب دنوں سے زیادہ غصہ اس دن ہو گا جس دن ان کو مبعوث کرے گا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ زجر غضب کے طور پر ہو گا۔ امام ابو مالک اور ربیع رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس ﴿ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴾ سے مراد نفخۂ آخرہ ہے۔ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "ساهرة" ساری زمین کا نام ہے۔ یہی قول امام سعید بن جبیر، قتادہ اور ابو صالح رحمہم اللہ کا ہے۔

امام عکرمہ، حسن، ضحاک اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ "ساهرة" روئے زمین کو کہتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زمین کے نیچے تھی، اب زمین کے اوپر آ گئی ہے۔ "ساهرة" برابر جگہ کو کہتے ہیں۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ساهرة" سرزمینِ شام ہے۔ امام ابن ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بیت المقدس کی سرزمین

---

[1] تفسير الطبري (١٩٥،١٩٤/٢٤) تفسير ابن كثير (٦٠٠/٤)

ہے۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قدس کے پاس ایک پہاڑ ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''ساهرة'' جہنم ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں یہ سب اقوال غریب ہیں، صحیح یہ ہے کہ ''ساهرة'' وجہ اعلائے زمین ہے۔ [1] امام سہل بن ساعد ساعدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''ساهرة'' سفید خاک رنگ خالی زمین کو کہتے ہیں، جیسے: صاف روٹی۔ [2]

امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [إبراهيم: ٤٨] ''جس دن زمین اس زمین کے سوا اور ہی بدل جائے گی اور آسمان بھی، اور سب کے سب اللہ واحد غلبے والے کے روبرو ہوں گے۔'' نیز فرماتا ہے: ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ۝ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۝ لَا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا ﴾ [طٰهٰ: ١٠٥- ١٠٧] ''وہ آپ سے پہاڑوں کی نسبت سوال کرتے ہیں، تو آپ کہہ دیں کہ انھیں میرا رب ریزہ ریزہ کر کے اڑا دے گا اور زمین کو بالکل ہموار صاف میدان کر کے چھوڑے گا جس میں تو نہ کہیں موڑ توڑ دیکھے گا نہ اونچ نیچ۔'' نیز فرماتا ہے: ﴿ وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً ﴾ [الكهف: ٤٧] ''اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور زمین کو تو صاف کھلی ہوئی دیکھے گا۔'' اس ارض سے وہ زمین مراد ہے جس پر کوئی گناہ نہیں ہوا نہ خونریزی ہوئی۔ [3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اس جگہ ''رجفة'' سے مراد صیحۂ عظیمہ ہے جس کے اندر تردد اور اضطراب ہو، جیسے: رعد ہوتا ہے۔ یہ پہلا نفخہ ہے جس سے ساری مخلوق مر جائے گی۔ (قاله ابن عباس رضی اللہ عنہما)۔ ''رادفة'' سے مراد نفخۂ ثانیہ ہے جو دوبارہ زندہ ہونے کے وقت پر ہوگا۔ دونوں نفخوں کے درمیان چالیس برس کا فاصلہ ہوگا۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''راجفة'' زمین اور ''رادفة'' ساعت۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''راجفة'' زلزلہ اور ''رادفة'' ''صيحة'' ہے۔ [4] بعض نے کہا ہے کہ ''راجفة'' اضطرابِ ارض ہے اور ''رادفة'' زلزلہ۔ ''واجفة'' دلوں کی صفت ہے، یعنی دل اس دن مضطرب، خوفزدہ، بے قرار و بے چین اور زور زور سے دھڑکتے ہوں گے۔ جمہور مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ متحرک ہوں گے۔ [5] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنی جگہ سے زائل ہوں گے، اس کی نظیر یہ ہے: ﴿ اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ ﴾ [المؤمن: ١٨] ''جبکہ دل حلق تک پہنچ جائیں گے۔'' [6]

مطلب یہ ہوا کہ ان پر قیامت کی ہولناکیوں کے معاینے کے وقت ذلت اور خشوع ظاہر ہوگا۔ امام عطاء رحمہ اللہ

---

[1] تفسير الطبري (٢٤/١٩٦-١٩٩) تفسير ابن كثير (٤/٦٠٠)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٩٨)
[3] تفسير ابن كثير (٤/٦٠١)
[4] تفسير الطبري (٢٤/١٩١، ١٩٢) تفسير القرطبي (١٩/١٩٥)
[5] الدر المنثور (٨/٤٠٦)
[6] تفسير القرطبي (١٩/١٩٦)

نے کہا ہے کہ مراد وہ لوگ ہیں جو غیرِ اسلام پر مرے ہیں،[1] کیوں کہ سیاق منکرینِ بعث پر دلیل ہیں، ان سے جب یہ بات کہی جاتی تھی کہ تم دوبارہ زندہ ہو کر اٹھائے جاؤ گے تو وہ استہزاء کرتے تھے اور کہتے تھے: کیا ہم پہلی حالت پر مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوں گے۔ اگر ایسا ہو تو یہ بڑے نقصان کی بات ہے۔ ہڈیاں گل سڑ گئیں، اب کیا زندہ ہوں گی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مرنے اور دفن ہونے کے بعد ایک ہی جھڑکی سے تم روئے زمین پر اٹھ کھڑے ہو گے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''ساهرة'' روئے زمین کو کہتے ہیں۔[2] بعض نے کہا ہے کہ وہ زمین چاندی کی ہوگی، یا ساتویں زمین جس پر اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا حساب لے گا، یا مکہ کی زمین یا قیامت کی زمین یا جہنم کی۔[3]

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ﴿١٥﴾ اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿١٦﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿١٧﴾ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰى اَنْ تَزَكّٰى ﴿١٨﴾ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ﴿١٩﴾ فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ﴿٢٠﴾ فَكَذَّبَ وَعَصٰى ﴿٢١﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴿٢٢﴾ فَحَشَرَ فَنَادٰى ﴿٢٣﴾ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴿٢٤﴾ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴿٢٥﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ﴿٢٦﴾

کیا آپ کے پاس موسیٰ کی بات آئی ہے؟(15) جب اس کے رب نے مقدس وادیِ طویٰ میں اسے پکارا تھا(16) (کہ) فرعون کی طرف جاؤ، بے شک اس نے سرکشی کی ہے(17) پھر (اسے) کہو: کیا تجھے اس بات کی کوئی رغبت ہے کہ تو پاک ہو جائے؟(18) اور میں تیرے رب کی طرف تیری راہنمائی کروں کہ تو ڈر جائے(19) چناں چہ اس (موسیٰ) نے اسے بڑی نشانی دکھائی(20) تو اس نے (اسے) جھٹلایا اور نافرمانی کی(21) پھر وہ پلٹا (فساد کی) کوشش کرتا ہوا(22) پھر سب کو جمع کر کے اعلان کیا(23) تو کہا: میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں(24) تب اللہ نے اسے پکڑ لیا آخرت اور دنیا کے عذاب میں(25) بے شک اس میں اس کے لیے عبرت ہے جو ڈرتا ہے(26)

موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں ڈرنے والوں کے لیے عبرت:

یعنی آخرت میں بھی عذاب ہوگا اور دنیا میں بھی عذاب پایا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

(1) فتح القدير (٥/٤٩٦) (2) فتح القدير (٥/٤٩٧) (3) فتح البيان (١٥/٥٥-٥٩)

رسول اللہ ﷺ کو خبر دی کہ ہم نے اپنے بندے اور رسول موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا تھا اور معجزات سے اس کی تائید کی تھی، اس کے باوجود فرعون اپنے کفر پر جما رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو پکڑ لیا، اسی طرح اس شخص کا انجام ہوگا جو تمھاری مخالفت کرے گا اور تم کو جھٹلائے گا۔ لہٰذا قصے کے آخر میں یہ فرمایا کہ اس میں ڈرنے والے کے لیے عبرت ہے۔ قولِ صحیح کے مطابق طویٰ ایک وادی کا نام ہے۔ طغیان: تجبر، تمرد اور سرکشی کو کہتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا تھا کہ اگر تو یہ بات چاہتا ہے کہ ایسی راہ پر چلے جس سے تو پاک ہو جائے تو میں تجھ کو تیرے رب کی عبادت کا طریقہ بتا دوں، تیرا دل اللہ کے لیے خشوع کرے، تو اس کا مطیع ہو جائے۔ ابھی تیرا دل سخت اور ناپاک ہے اور خیر سے دور ہے۔

پھر موسیٰ علیہ السلام نے اس دعوت کے ساتھ اس کو ایک بڑی نشانی دکھائی اور اپنے صدق پر ایک مضبوط حجت اور واضح دلیل بتائی۔ اس نے ان کو جھوٹا کہا اور ان کی بات نہ مانی اور اللہ کے حکم کے برخلاف کیا، اس کا دل کافر بنا رہا۔ باطن میں منفعل (پشیمان) نہ ہوا اور نہ ظاہر میں کچھ اثر پذیر ہوا۔ فرعون کا اتنا جاننا کہ جو کچھ موسیٰ علیہ السلام اللہ پاک کی طرف سے لائے ہیں وہ سب حق ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مومن تھا، کیوں کہ معرفت دل کے جاننے کو کہتے ہیں اور ایمان اس معرفت پر عمل کرنا ہے جو حق کی اتباع اور خضوع کا نام ہے، بلکہ فرعون تو پیٹھ پھیر کر حق کا مقابلہ باطل سے کرنے لگا، وہ مقابلہ یہ تھا کہ جادوگر لوگ جمع کیے، تاکہ معجزاتِ باہرات کا مقابلہ سحر سے کرے۔ لوگوں کو جمع کیا اور اپنی قوم سے کہا کہ میں تمھارا اعلیٰ رب ہوں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پہلے فرعون نے یہ کہا تھا: ﴿ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ﴾ [القصص: ۳۸] ''میں نے تو اپنے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں جانا۔'' پھر چالیس برس کے بعد یہ کلمہ کہا: ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾۔[1] اس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا کے عذاب اور آخرت کے عذاب میں پکڑا اور ایسا انتقام لیا جو دوسروں کے لیے موجبِ عبرت ہوا۔ اس جیسے سرکشوں کے لیے دنیا اور قیامت میں عذاب اور وبال ٹھہرا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴾ [القصص: ۴۱] ''اور ہم نے انھیں ایسے امام بنا دیے کہ لوگوں کو جہنم کی طرف بلائیں اور روزِ قیامت بالکل مدد نہ کیے جائیں۔'' اس آیت کے معنی میں یہی قول صحیح ہے کہ ﴿ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ﴾ سے مراد دنیا اور قیامت کا عذاب ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مراد یہ دونوں حکم فرعون کے ہیں یا اس کا کفر و عصیان۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صحیح وہی پہلا قول ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں ہے۔ عبرت سے مراد اتعاظ (نصیحت) اور انزجار (رکنا، باز آنا، دھمکی میں آجانا) ہے۔[2]

---

[1] تفسير الطبري (۲۰۳/۲٤) [2] تفسير ابن كثير (٦٠١/٤، ٦٠٢)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے اس آیت میں نبی کریم ﷺ کی تسلی کی کہ تم قوم کی تکذیب پر رنجیدۂ خاطر نہ ہو، ان کو بھی وہی پہنچے گی جو اُن سے پہلی اُمتوں کو پہنچی ہے، حالاں کہ وہ امت ان کی نسبت زیادہ مضبوط تھی۔ طویٰ کو اس لیے وادیِ مقدس کہا ہے کہ نبوت اور برکاتِ رسالت کا نزول اسی جگہ ہوا تھا، یہ شرف اللہ پاک نے اس وادی کو بخشا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وادی مدینہ اور مصر کے درمیان ہے۔[1] اس کا نام طویٰ اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے شر کو اس جگہ لپیٹا یا اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام اس کو شب میں طے کر کے وادی کی بلندی میں پہنچے۔ یا وہ شام کے ملک میں طور کے نزدیک ایلہ اور مصر کے درمیان ایک وادی ہے۔ یا عبرانی زبان میں ''طویٰ'' کے معنی ''یا رجل'' ہیں۔ یا اس وادی میں دوبارہ برکت دی گئی ہے مگر پہلی بات زیادہ معتبر ہے۔

طغیان حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں، عصیان: فساد، تکبر اور کفر باللہ ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان نہیں کیا کہ اس کا یہ طغیان کس چیز میں تھا۔ اللہ پر کفر کے ساتھ طغیان کیا تھا یا مخلوق پر کیا تھا، اور ان کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔[2] ﴿ تَزَكّٰى ﴾ سے مراد ''تطہر'' ہے، یعنی میں تجھ کو شرک سے پاک کر دوں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''هَلْ لَكَ أَنْ تَقُولَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ''[3] ''کیا تو لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ کہتا ہے۔'' یا یہ مطلب ہے کہ تو یہ بات چاہتا ہے کہ مسلمان ہو کر عمل صالح کرے؟ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ فرعون سے نرم بات کریں اور مدارات سے پیش آئیں، یہ گویا اس قول کی تفصیل ہے: ﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾ [طٰہٰ: ٤٤] ''اسے نرمی سے سمجھاؤ کہ شاید وہ سمجھ لے یا ڈر جائے۔'' پھر کہا: کیا میں تجھ کو تیرے رب کی طرف راہ بتاؤں، شاید تو اس کے عتاب سے ڈرے۔

امام ابن عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خشیت خوف سے اتم ہے، اس لیے کہ یہ علماء کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾ [الفاطر: ٢٨] ''اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔'' واسطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علم کا شروع خشیت ہے، پھر اجلال ہے، پھر ہیبت ہے، پھر فناء۔[4] بعض نے کہا ہے کہ جس کو خوف ہو جائے، وہ ہر خوشی کی چیز سے غافل ہو جاتا ہے، اس کو کمد (اندوہ گین) لازمی طور پر ہوتا ہے، یہاں تک کہ خوف سے امن حاصل ہو۔

آیتِ کبریٰ میں اختلاف ہے کہ کیا چیز تھی؟ کسی نے کہا ہے کہ عصا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ید بیضا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ دریا کا پھٹ جانا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ نو نشانیاں تھیں۔ پہلی بات زیادہ بہتر ہے، پھر ید بیضا۔ اکثر اسی

---

[1] تفسير القرطبي (٢٠١/١٩)، [2] تفسير الرازي (٣٧/٣١) [3] الدر المنثور (٤١٠/٨) [4] تفسير السلمي (١٦٠/٢)

بات پر ہیں کہ اس کو یہ دونوں نشانیاں دکھلائیں تھیں۔ ان دونوں کے اکٹھا ہونے کے سبب سے ان دونوں پر آیتِ کبریٰ کا اطلاق کیا گیا۔ یا مراد صرف عصا ہے کہ یہ دوسری نشانی سے پہلے تھا۔ اور یہ آیت کچھ اس کے منافی نہیں ہے: ﴿ وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا ﴾ [طٰہٰ: ٥٦] ''ہم نے اسے اپنی سب نشانیاں دکھا دیں۔'' اس لیے کہ اس جگہ اس چیز کی خبر دینا مراد ہے جو پہلی ملاقات میں دکھلائی تھی، وہ یہی عصا اور ید بیضا تھا، پھر اس کے بعد وقتاً فوقتاً ساری نشانیاں دکھائیں۔

یہ تمام آیات کا دکھلانا جادوگروں کی مغلوبیت کے بعد بیس برس کی مدت میں تھا جس طرح کہ سورۃ الاعراف سے سمجھا گیا ہے۔ اس قضیہ کا مقصود آیتِ کبریٰ کا دکھلانا تھا۔ جادوگروں کا قصہ اس کے بعد واقع ہوا تھا۔ فرعون نے اس آیتِ کبریٰ کے دیکھنے کے باوجود تکذیب اور عصیان کیا اور اعراض کر کے فساد کرنے کے لیے کوشش کرتا رہا اور چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرے، جنگ اور مقابلے کے لیے اپنا لشکر جمع کیا، یا جادوگروں کو اکٹھا کیا، یا لوگوں کو مشاہدہ کرنے کے لیے بلایا اور پکار کر یہ بات کہی کہ میں تمھارا اعلیٰ رب ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ مجھ کو میرے رب نے تیرے پاس بھیجا ہے۔ اس پر اس لعین نے یہ کلمہ کہا کہ میرے اوپر کوئی اور رب نہیں ہے، سب سے اوپر میں ہی ہوں۔

امام عطاء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ فرعون نے چھوٹے چھوٹے بت بنا کر حکم دیا تھا کہ میں ان بتوں کا رب ہوں،[1] یا رب ہونے سے یہ مراد ہے کہ میں ہی تمھارا قائد اور سردار ہوں، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی دلیل سے ﴿ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ﴾ [القصص: ٣٨] ''میں تو اپنے سوا کسی کو تمھارا معبود نہیں جانتا۔'' اس کہنے پر اللہ نے اس کو پکڑ لیا، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ نکال کہتے ہیں عقوبت کو، یعنی سزا کو۔ نکالِ آخرت سے مراد عذابِ نار ہے اور ''نکالِ أولیٰ'' سے مراد دنیا کا عذاب ہے کہ نیل میں ڈوب گیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اول عمر کا اور آخر عمر کا عذاب مراد ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ الْاٰخِرَةِ ﴾ سے مراد ﴿ رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾ ہے اور ﴿ الْاُوْلٰى ﴾ سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب ہے۔[2] پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرعون کے اس قصے میں اور جو کچھ اس نے کیا، اس میں اس شخص کے لیے عبرتِ عظیم ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔[3]

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۭ بَنٰىهَا ﴿٢٧﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿٢٨﴾ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿٢٩﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿٣٠﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿٣١﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿٣٢﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٣﴾

کیا تمھاری (دوبارہ) پیدائش زیادہ مشکل ہے یا آسمان کی؟ جسے اسی نے بنایا ہے (27) اس نے

[1] تفسیر القرطبي (١٩/٢٠٢) [2] تفسیر القرطبي (١٩/٢٠٢) [3] فتح البیان (١٥/٦٠-٦٤)

آسمان کی چھت بلند کی، پھر اسے ٹھیک ٹھاک کیا (28) اور اس کی رات کو تاریک اور اس کے دن کو روشن بنایا (29) اور اس کے بعد زمین کو بچھایا (30) اس میں سے اس کا پانی اور اس کا چارا نکالا (31) اور پہاڑوں کو مضبوط گاڑ دیا (32) (یہ سب) تمھارے اور تمھارے جانوروں کے فائدے کے لیے ہیں (33)

آسمانوں وزمین کی پیدائش انسان کو دوبارہ پیدا کرنے سے مشکل ہے:

سورت فصلت میں آسمان کا ذکر بعد میں کیا اور یہاں پر زمین کو بعد میں ذکر کیا۔ سو یہاں آسمان کا اونچا بنانا اور دن رات ٹھہرانا ہے۔ یہ شاید زمین سے پہلے ہو اور وہاں ان کو بانٹ کر سات کرنا اور ہر ایک میں الگ دستور چلانا ہے وہ شاید زمین سے پیچھے ہو۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے ان آیات میں دوبارہ زندہ ہو کر اٹھائے جانے کے منکرین پر حجت قائم کی ہے کہ کیا پہلی دفعہ پیدا کرنے کے بعد تمھارا دوبارہ پیدا کرنا مشکل ہے، یا آسمان کا بنانا؟! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ ﴾ [المؤمن: ٥٧] ''آسمان و زمین کی پیدائش یقیناً انسان کی پیدائش سے بہت بڑا کام ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَ لَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ١ؕ بَلٰى وَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴾ [يٰسٓ: ٨١] ''جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے کیا وہ ان جیسوں کے پیدا کرنے پر قادر نہیں، بے شک قادر ہے اور وہی تو پیدا کرنے والا دانا (بینا) ہے۔''

لفظ ﴿ بَنٰىهَا ﴾ کی تفسیر ﴿ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴾ ہے، یعنی آسمان کو بلند بنیاد، دراز صحن، برابر کونوں والا، شبِ تاریک میں ستاروں سے آراستہ بنایا اور رات کو کالا، سیاہ اور تاریک کیا اور دن کو روشن درخشاں چمکنے والا واضح بنایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ اَغْطَشَ لَيْلَهَا ﴾ سے مراد اندھیرا ہے۔ یہی قول امام مجاہد، عکرمہ اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور ایک کثیر جماعت کا ہے۔ ﴿ اَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴾ سے مراد دن کا روشن کرنا ہے۔[1] سورت حم السجدہ میں یہ ذکر گزر چکا ہے[2] کہ زمین آسمان سے پہلے پیدا ہوئی ہے، لیکن اس کی کشادگی آسمان کی پیدائش کے بعد ہوئی ہے، یعنی جو چیز اس کی قوت میں تھی وہ فعل میں لائی گئی۔ یہی معنی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ کے قول کے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ دَحٰوِ ارض سے مراد زمین سے پانی اور چارہ کا نکالنا ہے کہ نہریں جاری کیں اور پہاڑ رکھے اور ریت بنائی اور راستے مقرر کیے اور ٹیلے ٹھہرائے۔ پہاڑوں کو زمین پر جمایا اور خوب مستحکم کیا کہ زمین کو جنبش نہ ہو۔ یہ حکیم، علیم، رؤف، رحیم اللہ کی صفت، یعنی کاری گری ہے۔[4] سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے

---

[1] تفسیر الطبري (٢٠٦/٢٤، ٢٠٧) [2] رقم الآية (٩) [3] تفسیر الطبري (٢٠٨/٢٤، ٢٠٩) [4] تفسیر ابن کثیر (٦٠٢/٤)

رفعاً کہا ہے کہ جب اللہ نے زمین بنائی، وہ دراز ہونے لگی تو پہاڑوں کو پیدا کر کے زمین پر ڈال دیا، وہ ٹھہر گئی۔ فرشتوں کو پہاڑوں کی سختی سے تعجب ہوا۔ کہا: اے رب! تیری مخلوق میں سے ان پہاڑوں سے کوئی چیز سخت ہے؟ فرمایا: لوہا۔ انھوں نے کہا: لوہے سے زیادہ کوئی سخت؟ فرمایا آگ۔ انھوں نے کہا: آگ سے بھی زیادہ سخت کون سی چیز ہے؟ فرمایا: پانی، کہا: پانی سے بڑھ کر کیا چیز ہے؟ فرمایا: ہوا۔ کہا: ہوا سے زیادہ سخت کون ہے؟ کہا: ابن آدم دائیں ہاتھ سے صدقہ دیتا ہے، اس کو بائیں ہاتھ سے چھپاتا ہے۔[1] (رواہ أحمد) پھر اللہ نے فرمایا کہ یہ سب چیزیں تمھارے لیے متاع ہیں اور تمھارے چوپایوں، جانوروں کے لیے پانی کے چشمے بہائے، چھپی ہوئی چیز کو ظاہر کیا۔ کھیتی اور پھل اور درخت پیدا کیے۔ لوگ چوپایوں کا گوشت کھاتے ہیں، ان پر سوار ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ دنیا ختم ہو جائے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ کیا تمھارا پیدا کرنا اور موت کے بعد تمھیں اٹھانا تمھارے خیال میں آسمان پیدا کرنے سے زیادہ سخت ہے؟ یہ خطاب مکہ مکرمہ کے کفار کو ہے، اس سے مقصود ان کی ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش ہے، کیوں کہ جس کو اس عظیم جثہ (جس میں فلکیات شامل ہیں) جس میں عجیب وغریب صنعت کاری ہے، کے پیدا کرنے کی قدرت ہے اور سب دیکھنے والے اس کو دیکھ رہے ہیں، کیا وہ موت کے بعد جسموں کو دوبارہ پیدا کرنے سے عاجز ہے؟! یعنی ہرگز نہیں۔ پھر اس کے (آسمان) پیدا کرنے کی کیفیت بیان فرمائی کہ ہم نے اس کو زمین سے اوپر بنایا، اس کی چوٹی کو ہوا میں اونچا کیا، چنانچہ وہ زمین سے پانچ سو برس کی راہ پر بلند ہے۔

امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا کہ "سمك" سے مراد "سقف" ہے[3] جس طرح آسمان اس دنیا کی چھت ہے، اسی طرح ایک آسمان دوسرے آسمان کی چھت ہے جو اس کے نیچے ہے، پھر ان آسمانوں کو یکساں کیا۔ سب کی پیدائش برابر ہے، سب کی شکلیں معتدل ہیں کچھ فرق نہیں اور نہ کسی طرح کی کجی یا فتور وشگاف وشقوق (دراڑ) ہے۔ غطش سے مراد اندھیرا ہے۔ رات کو آسمان کی طرف مضاف کیا، اس لیے کہ رات سورج ڈوبنے کے بعد آتی ہے اور سورج آسمان پر ہے۔ دن کو ضحی کے لفظ سے تعبیر کیا، اس لیے کہ یہ لفظ دن کے اوقات میں سب سے زیادہ شرف والا اور پاک ہے۔ دن کی اضافت آسمان کی طرف اس لیے کی کہ دن کا ظہور آفتاب سے ہوتا ہے اور آفتاب آسمان کی طرف منسوب ہوتا ہے۔

آسمان کے بعد زمین کو بچھایا۔ کہا ہے کہ آسمان کی پیدائش سے دو ہزار سال بعد زمین کو مکہ معظمہ سے پھیلایا۔ اس آیت میں اور سورت فصلت کی اس آیت میں کچھ تضاد نہیں: ﴿ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ ﴾ [حم السجدة: ١١] ''پھر

---

1. سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٦٩) مسند أحمد (١٢٤/٣)
2. تفسير ابن كثير (٦٠٢/٤) 3. تفسير البغوي (٣٢٩/٨)

آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔'' بلکہ ان آیات میں جمع ممکن ہے کہ پہلے زمین کو بنایا، پھر آسمان کو پیدا کیا، پھر زمین پھیلائی، پھر آسمان برابر کیے۔ یا اس جگہ لفظ ﴿ بَعْدَ ﴾، ''مع'' کے معنی میں ہے یا ''قبل'' کے معنی میں ہے۔ پہلی جمع زیادہ بہتر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔[1] پانی نکالنے سے مراد نہریں، سمندر اور چشمے ہیں۔ ''مرعی'' سے مراد نبات (سبزہ) ہے۔ شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''مرعی'' وہ ہے جو چوپائے کھاتے ہیں انسانوں کے سوا۔[2] کھانے پینے کا ذکر ارسائے جبال سے پہلے اس لیے کیا تاکہ ان کی اہمیت معلوم ہو۔ انعام سے مراد گائے اونٹ اور بکری ہے۔[3]

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿٣٥﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿٣٦﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿٣٧﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٣٩﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٤١﴾

پھر جب بڑی آفت (قیامت) آجائے گی (34) اس دن انسان یاد کرے گا جو اس نے کوشش کی ہو گی (35) اور دوزخ ہر دیکھنے والے شخص کے سامنے (ظاہر) کر دی جائے گی (36) لیکن پھر جس نے سرکشی کی (37) اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی (38) تو بے شک دوزخ ہی (اس کا) ٹھکانا ہے (39) لیکن جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اپنے نفس کو خواہش سے روکا (40) تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے (41)

قیامت اور جنت وجہنم کا ذکر:

''طامۃ کبریٰ'' سے مراد قیامت کا دن ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے،[4] کیوں کہ اس میں ہر امر ہولناک اور دہشت خیز ہو گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴾ [القمر: ٤٦] ''اور قیامت بڑی سخت اور کڑوی چیز ہے۔'' اس وقت ہر آدمی اپنے اچھے اور برے عمل کو یاد کرے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴾ [الفجر: ٢٣] ''اس دن انسان کو سمجھ آئے گی مگر آج اس

(1) تفسیر الطبري (٢٠٩،٢٠٨/٢٤) (2) حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٣١٦/٨)
(3) فتح البيان (٦٧_٦٤/١٥) (4) تفسیر الطبري (٢١١/٢٤)

کے سمجھنے کا فائدہ کہاں؟'' لوگ اس دن دوزخ کو کھلم کھلا دیکھیں گے۔ پھر جس نے تمرد و سرکشی کی ہوگی اور دنیا کی زندگی کو امرِ دین پر اختیار کیا ہوگا اس کا انجام جہنم ہوگا۔ زقوم (تھوہر) کھائے گا، حمیم (کھولتا ہوا پانی) پیے گا اور جس نے اس ڈر سے کہ مجھے اللہ کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا، اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے روکا ہوگا اور اپنے نفس کو گناہ سے روک کر طاعت کی طرف لایا ہوگا، اس کا انجام جنت ہوگا۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ ہیں کہ ''طامة'' اس آفت اور بلا کو کہتے ہیں جو ساری آفتوں اور بلاؤں سے بڑھ کر ہو۔ اس دن کی وہ آفت فرعون کی آفت سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی ہوگی جس نے ﴿ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ﴾ کہا تھا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے معیشتِ دنیا کے بیان کرنے کے بعد آخرت کا حال بیان کیا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ''طامة کبریٰ'' سے مراد نفخہ ثانیہ ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب کے نزدیک طامہ کبریٰ وہ داہیہ عظمیٰ ہے جس کی برداشت کسی کو نہ ہو سکے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ اس دن جنتی جنت کے حوالے کر دیے جائیں گے اور دوزخی دوزخ کے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ قیامت کا ایک نام ہے۔[1] اس دن آدمی اپنے نیک اور بد اعمال کو صحیفوں میں لکھا ہوا پائے گا۔ اور جہنم کو کھول کر رکھ دیں گے، اس کی آتشِ سوزاں کسی پر مخفی نہ رہے گی۔ ساری خلق اس کو دیکھے گی، مومن اس کو دیکھ کر اللہ کی نعمت کی قدر پہچانے گا اور کافر کو غم پر اور غم اور حسرت پر اور زیادہ حسرت ہوگی۔ پھر جس کسی نے دنیا کو آخرت پر مقدم کیا تھا اور شہواتِ محرمات کے پیچھے لگا رہا، وہ دوزخ میں جائے گا اور جو کوئی اللہ پاک کے روبرو پیش ہونے اور حساب دینے سے ڈرا تھا اور دنیا میں گناہ سے باز رہا تھا اور نفسِ امارہ کو خواہشات، معصیت اور حرام کردہ چیزوں سے روکا تھا اس کی منزل بہشت ہوگی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد وہ شخص ہے جس نے کسی گناہ کا ارادہ کیا، پھر اس کو یاد آیا کہ مجھے پروردگار کے سامنے اس کا حساب دینا پڑے گا، اس خیال پر اس نے وہ گناہ نہ کیا تو اس کے لیے گلزارِ جنت ہے۔[2] انتہیٰ۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ﴿42﴾ فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ﴿43﴾ اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ﴿44﴾ اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ﴿45﴾ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ﴿46﴾

(اے نبی!) کافر آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ وہ کب واقع ہوگی؟ ﴿42﴾

---

[1] تفسير القرطبي (۱۹/۲۰۶) [2] تفسير البغوي (۸/۳۳۰) فتح البيان (۱۵/۶۸_۷۰)

آپ کو اس کے بیان کرنے سے کیا غرض؟43 اس (کے علم) کی انتہا تو آپ کے رب ہی کے پاس ہے44 آپ تو صرف ہر اس شخص کو ڈراتے ہیں جو اس سے ڈرے45 جس روز وہ قیامت کو دیکھیں گے (تو سمجھیں گے) کہ گویا وہ دنیا میں بس ایک شام یا صبح ہی ٹھہرے ہیں46

کافروں کا وقوعِ قیامت کا سوال اور اس کا جواب:

یعنی پوچھتے پوچھتے اسی سوال تک پہنچتے ہیں۔ درمیان میں سب بے خبر ہیں۔ قیامت جلدی مانگتے ہیں اس وقت پتا چل جائے گا، جب اچانک آ جائے گی کچھ دیر نہ لگے گی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ لوگ تجھ سے قیامت کا حال پوچھتے ہیں کہ وہ کب آئے گی؟ سو اس کا علم نہ تجھ کو ہے نہ کسی اور مخلوق کو، بلکہ اس کا علم اللہ ہی کو ہے، وہی اس کا معین وقت جانتا ہے: ﴿ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ۭ يَسْــٴَـلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ [الأعراف: ١٨٧] ”وہ آسمانوں اور زمین میں بڑا بھاری (حادثہ) ہو گا وہ تم پر محض اچانک آ پڑے گی وہ آپ سے اس طرح پوچھتے ہیں جیسے گویا آپ اس کی تحقیقات کر چکے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ اس کا علم خاص اللہ ہی کے پاس ہے۔“ اور اس جگہ یوں فرمایا کہ اس کا منتہیٰ اللہ کی طرف ہے۔ جبریل علیہ السلام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ اس گھڑی کا کون سا وقت ہے؟ فرمایا: ”مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ“[1] یعنی نہ مجھے معلوم ہے نہ تم کو معلوم۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء اور ملائکہ کو علم غیب نہیں ہے۔ غیب کا جاننا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے۔ ہاں تیرا یہ کام ہے کہ جو کوئی قیامت کا ڈر رکھتا ہو تو اس کو اللہ کے عذاب سے ڈرا دے۔ پھر جو کوئی اللہ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرے گا اور ترساں ہوں گا اور تیری پیروی کرے گا وہ صحیح راستے پر ہو گا۔

خائب و خاسر وہ ہے جو تجھ کو جھٹلائے گا اور تیری مخالفت کرے گا۔ وہ جب قبروں سے اٹھ کر محشر میں آئیں گے، دنیا کی زندگی کو بہت تھوڑا جانیں گے، جیسے: ایک دن کی شام یا صبح۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ظہر سے سورج ڈوبنے تک کو عشیہ کہتے ہیں اور طلوع سے نصف نہار تک ضحیٰ ہے، یعنی وہ یہ سمجھیں کہ ہم دنیا میں فقط دوپہر ٹھہرے، خواہ دن کا پہلا نصف سمجھو یا دوسرا نصف۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قوم کی آنکھوں میں یہ دنیا کا وقت ہے جب کہ آخرت کا دن دیکھیں گے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اے محمد! تم سے یہ لوگ قیامت کی گھڑی کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ وہ کس گھڑی

---

[1] صحيح البخاري (٥٠) صحيح مسلم (٨) [2] تفسير الطبري (٢١٤/٢٤) تفسير ابن كثير (٦٠٣/٤)

میں ہوگی؟ تمھیں اس ذکر سے کچھ واسطہ نہیں، تم کیا جانو کہ وہ کب ہوگی۔ یہ تو اللہ ہی جانے کہ کب اس کو قائم کرے گا۔ تم آخری نبی ہو اور علاماتِ قیامت میں سے ایک علامت ہو۔ تم سے اس بات کا پوچھنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تمھاری بعثت کو قربِ قیامت کی دلیل جان لیں اور اس دن کے لیے تیار ہو جائیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں، جب یہ آیت اتری تب لوگ قیامت کے دن کے متعلق سوال کرنے سے باز رہے۔[1]

اعراب جب رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے یہی سوال کرتے تو آپ ﷺ کسی انسان نوجوان کی طرف دیکھ کر فرماتے: « إِنْ يَعِشْ هٰذَا قَامَتْ عَلَيْكُمْ سَاعَتُكُمْ »[2] (أخرجه ابن مردويه) یعنی اگر یہ جیتا رہا تو تمھاری قیامت قائم ہو جائے گی۔ یہ اس لیے کہ جو شخص مرتا ہے اس کی قیامت قائم ہو جاتی ہے، کیوں کہ برزخ کے حالات اس پر طاری ہو جاتے ہیں۔ یہ اس عالم میں پہنچنے کا پیش خیمہ ہے۔ پھر فرمایا: اس دن کا منتہیٰ تیرے رب کی طرف ہے، یعنی وہی جانے کہ قیامتِ کبریٰ کتنی مدت کے بعد کس دن اور کس گھڑی میں برپا ہوگی، دوسرا کیا جانے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ [لقمان: ٣٤] ''بے شک اللہ تعالیٰ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔'' اب ان کا تجھ سے پوچھنا بے سود ہے۔ ہاں تیرا کام یہ ہے کہ تو ان کو اس دن سے ڈرائے جس دن یہ کفارِ قریش وغیرہم قیامت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے تو یہ جانیں گے کہ ہم دنیا میں کچھ بھی نہیں رہے۔ صبح یا شام تک رہے، یعنی آخرت کے دن کے طول کے مقابلے میں دنیا کی ساری زندگی نہایت درجہ تھوڑی نظر آئے گی۔ یا قبر میں نہ رہے مگر اس قدر قلیل زمانہ تک، کیوں کہ وہ دن پچاس ہزار برس کا ہوگا۔ اس کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کچھ بھی مدت نہیں ٹھہرتی۔[3] واللّٰه أعلم.

---

[1] تفسير الطبري (٢١٣/٢٤) مستدرك الحاكم (٤٦/١) الدر المنثور (٤١٣/٨)

[2] الدر المنثور (٤١٤،٤١٣/٨) [3] فتح البيان (٧٠/١٥-٧٢)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ عَبَسَ

اس کو سورت ''سفرہ'' وسورت ''اعمیٰ'' بھی کہتے ہیں۔ اس کی اکتالیس (۴۱) یا بیالیس (۴۲) آیتیں ہیں۔ سب کے نزدیک یہ سورت مکہ میں اتری ہے۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مکی ہے۔[2]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤى ﴿۱﴾ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ﴿۲﴾ وَ مَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰۤى ﴿۳﴾ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ﴿۵﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ﴿۶﴾ وَ مَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ﴿۸﴾ وَ هُوَ يَخْشٰى ﴿۹﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ﴿۱۰﴾ كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۱۲﴾ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍۭ ﴿۱۴﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(اس نے) ماتھے پہ شکن ڈالے اور منہ پھیر لیا ① (اس لیے) کہ اس کے پاس ایک نابینا آیا ② اور (اے نبی!) آپ کو کیا خبر شاید کہ وہ پاکیزگی حاصل کرتا ③ یا نصیحت سنتا تو اُسے نصیحت نفع دیتی ④ لیکن جو شخص پروا نہیں کرتا ہے ⑤ تو آپ اس کی فکر میں ہیں ⑥ حالاں کہ اگر وہ نہیں سنورتا تو آپ پر (کوئی گناہ) نہیں ⑦ اور جو شخص آپ کے پاس دوڑتا ہوا آیا ⑧ اور وہ ڈرتا بھی ہے ⑨ تو آپ اس سے بے رخی برتتے ہیں ⑩ ہرگز نہیں! بے شک یہ (صحیفہ) تو ایک نصیحت ہے ⑪ چنانچہ جو چاہے اسے یاد کرے ⑫ (وہ) قابلِ احترام صحیفوں میں (محفوظ) ہے ⑬ جو بلند وبالا اور پاکیزہ ہیں ⑭ ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں ⑮ جو معزز اور نیکوکار ہیں ⑯

---

[1] الدر المنثور (۴۱۵/۸) [2] تفسير ابن كثير (۳۱۹/۸۔ ط: دار طيبة)

ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ سے اعراض کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو تنبیہ:

موضح قرآن میں لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک کافر کو سمجھاتے تھے، اس دوران میں ایک نابینا مسلمان آیا، وہ اپنی طرف متوجہ کرنے لگا کہ فلاں آیت کیسی ہے، اس کے کیا معنیٰ ہیں؟ نبی اکرم ﷺ پر یہ بات گراں گزری یعنی بے وقت کا پوچھنا، اللہ نے یہ آیتیں بھیجیں۔ یہ کلام گویا اَوروں کے پاس رسول کا گلہ ہے۔ آگے رسول کو خطاب فرمایا کہ وہ ڈرتا ہے اللہ سے، یا اسے ڈر لگا ہے کہ تجھ سے ملاقات پائے یا نہ پائے۔ اس "تذکرۃ" کو فرشتے لکھتے ہیں، اس کے مطابق وحی اترتی ہے۔ انتہیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بہت سے مفسروں نے ذکر کیا ہے کہ ایک دن نبی اکرم ﷺ سردارانِ قریش سے مخاطب تھے۔ ان کے اسلام میں طمع رکھتے تھے۔ اتنے میں ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آئے۔ یہ مدت سے پہلے مسلمان ہو چکے تھے۔ نبی مکرم ﷺ سے کچھ پوچھنے لگے اور الحاح (اصرار) کیا۔ آپ ﷺ نے چاہا کہ یہ کچھ دیر ٹھہر جائیں تو اچھا ہے کہ میں ان سے باتیں کر چکوں، کیوں کہ آپ ﷺ کو رغبت تھی کہ وہ سردار ہدایت پائیں، اس لیے ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی طرف سے ترش روئی کر کے اعراض کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں اتاریں کہ تجھے کیا معلوم ہے کہ اس کا جی پاک صاف ہو، یا وہ نصیحت اور وعظ قبول کر کے حرام چیزوں سے بچ جائے۔ دوسرا شخص جو آسودہ حال ہے تو اس سے تعرض کرتا ہے کہ شاید وہ راہ پائے، حالاں کہ اگر وہ راہ یاب نہ ہوا تو اس میں تیرا کیا نقصان ہے۔ کچھ تجھ سے اس کے اسلام نہ لانے اور اپنے آپ کو مزکی اور پاک نہ کرنے کے بارے میں کوئی سوال نہ ہوگا۔ اور یہ غریب بے چارہ جو تیرے پاس دوڑتا آیا ہے، تاکہ تیری بات سن کر راہ پائے تو اس سے غافل اور مشغول ہوا۔

اس جگہ سے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو یہ حکم دیا کہ وہ کسی شخص کو انذار کے ساتھ خاص نہ کریں، بلکہ شریف وضعیف، فقیر و امیر، سردار و غلام، مرد و عورت، چھوٹوں اور بڑوں کو اس بارے میں یکساں اور برابر رکھیں۔ پھر اللہ کو اختیار ہے جس کو چاہے ہدایت دے اور سیدھی راہ پر لگائے، کیوں کہ اس کی حکمت بالغ اور اس کی حجت دافع ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ اس وقت ابی بن خلف سے باتیں کر رہے تھے، اس لیے ان کی طرف، یعنی ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی طرف ملتفت نہ ہوئے۔ اللہ پاک نے یہ آیت بھیجی، اس کے بعد آپ ﷺ ان کی خاطر داری کرنے لگے۔ (رواہ أبو یعلیٰ)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نے ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو قادسیہ کے دن دیکھا کہ ایک زرہ پہنے ہوئے سیاہ جھنڈا ہاتھ میں لیے ہوئے تھے۔[1] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت یہ ہے کہ ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى﴾ سیدنا ابن ام مکتوم اعمیٰ رضی اللہ عنہ

[1] مسند أبي يعلىٰ (٥/٤٣١)

کے مقدمے میں اتاری گئی ہے، وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: مجھے ہدایت اور ارشاد کرو۔ اس وقت آپ ﷺ کے پاس مشرکین کا ایک سردار بیٹھا تھا۔ آپ ﷺ ان کی طرف سے منہ پھیر کر اس سردار سے باتیں کرنے لگے اور کہا: بھلا کیا تو میری اس بات میں کچھ کھٹکا پاتا ہے، وہ کہتا تھا: نہیں اس پر یہ آیت اتری۔[1] (رواه أبو يعلىٰ وابن جرير بطوله والترمذي مختصرا)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ عتبہ بن ابی ربیعہ، ابوجہل بن ہشام، عباس بن مطلب سے سرگوشی کر رہے تھے اور ان کی طرف بہت متوجہ تھے، دل سے چاہتے تھے کہ وہ ایمان قبول کریں، اتنے میں ایک اندھا آدمی آیا، اس کو عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کہتے تھے۔ نبی کریم ﷺ تو باتوں میں لگے تھے، اس نے آپ ﷺ سے کہا کہ قرآن کی فلاں آیات پڑھ کر سناؤ اور جو کچھ اللہ نے تمھیں سکھایا ہے، وہ مجھے سکھاؤ۔ آپ ﷺ نے اس کی طرف سے منہ موڑا اور ترش روئی فرمائی اور اس حالت میں اس کی بات کو پسند نہ کیا اور دوسروں کی طرف مخاطب رہے۔ جب آپ ﷺ ان کی بات چیت سے فارغ ہو کر گھر کی طرف پھرنے لگے تو کچھ آنکھ میں اندھیرا سا ہوا اور سر کو چکر آنے لگا، اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی۔ اس آیت کے نزول کے بعد نبی اکرم ﷺ اس کی عزت کرتے اور گفتگو فرماتے اور کہتے: کہو تمھارا کچھ کام ہے تم کچھ چاہتے ہو؟ اسی طرح جب وہ آپ ﷺ کے پاس سے اٹھ کر جانے لگتا تو آپ ﷺ فرماتے کہ تمھارا کچھ کام ہو تو کہو۔[2] (رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم و فيه غرابة ونكارة)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بلال رات سے اذان کہہ دیتا ہے، تم کھاؤ پیو، یہاں تک کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ اذان دیں، یہ اندھے تھے اور بلال کے ہمراہ اذان دیتے تھے۔ سالم کہتے ہیں کہ جب تک لوگ ان سے یہ بات نہ کہتے کہ اب صبح ہو گئی ہے، تب تک یہ اذان نہ دیتے۔ (رواه ابن أبي حاتم) اس کا ذکر عروہ بن زبیر، مجاہد، قتادہ، ابو مالک، ضحاک، ابن زید اور بہت سے سلف و خلف رحمہم اللہ نے کیا ہے کہ اس آیت کا نزول ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے حق میں ہوا ہے۔ مشہور یہ ہے کہ ان کا نام عبداللہ تھا اور کسی نے کہا: عمرو تھا۔[3] واللّٰه أعلم.

قرآنِ کریم ایک نصیحت ہے جو چاہے اس سے مستفید ہو:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سورت یا یہ وصیت شریف اور وضیع (کمینے) کے درمیان مساوات کی بنیاد پر علم کی تبلیغ کے لیے ایک نصیحت ہے۔ جو کوئی یہ چاہے کہ اللہ کو اپنے سب کاموں میں یاد کرلے وہ اس قرآن کو پڑھے، کیوں کہ یہ سورت یا یہ نصیحت ایسے صحیفوں میں ہے جو بہت اعلیٰ اور بلند مرتبہ کے ہیں، بلکہ سارا قرآن میل کچیل اور کمی بیشی سے

---

[1] مسند أبي يعلىٰ (٨/٢٦١) تفسير الطبري (٢٤/٢١٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٣١) مستدرك الحاكم (٢/٥٥٨) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] تفسير الطبري (٢٤/٢١٧، ٢١٨) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٣٩٩) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [3] تفسير ابن كثير (٤/٦٠٥)

بلند مرتبہ اور پاک ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ضحاک اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "سفرة" سے مراد ملائکہ ہیں۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصحابِ محمد ﷺ ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قراء ہیں، یعنی علماء۔ اس لفظ کے یہ معنی نبطی زبان میں ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ "سفرة" ملائکہ ہیں یہ اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان سفیر ہیں۔ جو شخص صلح و خیر میں دوڑتا ہے، اس کو سفیر کہتے ہیں۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "سفرة" ملائکہ ہیں۔ "سفرة" کا واحد "سافر" ہے۔ "سَفَرْتُ" بہ معنی "أَصْلَحْتُ" ہے، چونکہ فرشتے اللہ کی وحی لے کر اس کے پہنچانے کے لیے نزول کرتے ہیں، اس لیے سفیر کے مثل ٹھہرائے گئے جو قوم میں اصلاح کرتا ہے۔[2] "کرام" سے یہ مراد ہے کہ اللہ نے ان کو کریم، حسن اور شریف پیدا کیا ہے، ان کے اخلاق و افعال نیک و پاک و کامل ہیں۔ اس جگہ سے یہ بات چاہی کہ جو کوئی حاملِ قرآن ہو اس کے سارے افعال اور اقوال طریقۂ سداد اور رشاد پر ہوں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے، فرمایا کہ جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور وہ اس کے ساتھ ماہر ہے، وہ "سفرة كرام بررة" کے ہمراہ ہوگا اور جو کوئی اس کو پڑھتا ہے اور یہ پڑھنا اس پر شاق ہے، اس کے لیے دو اجر ہیں۔[3] (أخرجه الجماعة)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ان لفظوں میں غائب کی ضمیر ارشاد کی، اس میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اجلال اور لطف (نرمی) ہے اور تاء خطاب کے ساتھ روبرو ہونے میں جو بات ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے حق میں اتری ہے۔ امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے بعد جب وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آتے تو آپ ﷺ فرماتے: "مَرْحَبًا بِمَنْ عَاتَبَنِي فِيهِ رَبِّي" "مرحبا ہو اس کو جس کی وجہ سے مجھے میرے رب نے تنبیہ کی، پھر اپنی چادر ان کے لیے بچھا دیتے۔[4] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے غزوات میں تیرہ دفعہ ان کو مدینہ میں خلیفہ کیا۔ یہ مہاجرین اولین میں سے تھے، قادسیہ میں شہید ہو کر مارے گئے۔[5] امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں کہا ہے کہ ان کا نام عبداللہ بن عمرو تھا، ام مکتوم زوجہ عمرو تھیں، تو یہ عبداللہ کی ماں ٹھہریں[6] اور بخاری میں خود ان کا نام عمرو بتایا ہے۔[7] امام قسطلانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا نام عبداللہ یا عمرو تھا اور ان کے باپ کا نام زائدہ تھا۔ واللہ أعلم.

---

① تفسیر الطبري (۲۴/۲۲۱) تفسیر ابن کثیر (۴/۶۰۵) ② صحیح البخاري، رقم الحدیث (۴/۱۸۸۱)

③ صحیح البخاري (۴۶۵۳) صحیح مسلم (۷۹۸) سنن أبي داود (۱۴۵۴) سنن الترمذي (۲۹۰۴) سنن النسائي الکبریٰ (۵/۲۱) سنن ابن ماجه (۳۷۷۹) تفسیر ابن کثیر (۴/۶۰۴، ۶۰۵)

④ تفسیر الجلالین (۱/۷۹۱) ⑤ تفسیر الخازن (۷/۲۰۸) تفسیر خازن میں "تیرہ دفعہ" کے بجائے "دو دفعہ" کے الفاظ ذکر ہیں۔

⑥ المنهاج - شرح النووي (۱۸/۸۰) ⑦ صحیح البخاري، رقم الحدیث (۴۷۰۴)

پھر اللہ تعالیٰ نے صیغۂ غائب سے صیغۂ خطاب کی طرف التفات کیا، کیوں کہ مشافہہ کو عتاب میں زیادہ دخل ہے اس کہنے میں کہ تو کیا جانتا ہے، شاید وہ سنورتا اس امر کا بیان ہے کہ اس (رسول) کی شان کے خلاف ہے کہ وہ کسی سے اعراض کرے یا منہ موڑے۔ سنورنے سے یہ مراد ہے کہ گناہوں سے پاک ہو کر عملِ صالح بجا لاتا نہ کہ شرک سے پاکی حاصل کرتا، اس لیے کہ وہ (ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ) پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے اور ایسا ہی اللہ تعالیٰ کا قول سورۃ الانعام میں ہے: ﴿ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ ﴾ [الأنعام: ٥٢] ''اور ان لوگوں کو نہ نکالیے جو صبح و شام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں۔'' اور ایسا ہی اس کا فرمان سورۃ الکہف میں ہے: ﴿ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ [الكهف: ٢٨] ''خبردار! تیری نگاہیں ان سے نہ ہٹنے پائیں کہ دنیوی زندگی کے ٹھاٹھ کے ارادے میں لگ جا۔''

یا وہ وعظ سن کر نفع اٹھاتا، سو تو نے اس سے تو منہ موڑا اور جو شخص کہ آسودہ حال اور ایمان سے بے نیاز ہے اور قرآن کے علم کی کچھ پروا نہیں رکھتا ہے، اس کی بات سننے میں لگا، مانا کہ وہ ایمان نہ لائے گا، اچھا نہ لائے پھر تیرا کیا نقصان ہے، کیوں کہ تجھ کو صرف اتنا ہی واجب ہے کہ تو پہنچا دے۔ تجھ کو ایسے کافروں کے بارے میں کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ نابینا شخص جو رشد و ہدایت کی طلب میں تیرے پاس دوڑتا آیا اور تیرے وعظ کو سنتا ہے اور اللہ سے اور کفار کی ایذا سے ڈرتا ہے، اس سے تو نے غفلت کی اور اس کو چھوڑ کر دوسرے کی بات میں مشغول ہو گیا، غرضیکہ اس بات کو چھوڑنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ شایانِ شان تھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کوئی نہیں، یہ آیات اور سورتیں نصیحت ہیں ان کی شان یہ ہے کہ جو کوئی ان کو سنے وہ ان پر چلے اور نصیحت پکڑ کر عمل میں لائے اور جو کوئی اس سے مستغنی ہو تجھ کو اس کے کام کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ یادداشت ایسے ورقوں میں لکھی ہے جو اللہ کے نزدیک مکرم ہیں۔ یا لوحِ محفوظ سے اترتے ہیں۔ صحف سے مراد انبیاء علیہم السلام کی کتابیں ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ﴾ [الأعلى: ١٨-١٩] ''یہ باتیں پہلی کتابوں میں بھی ہیں (یعنی) ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کی کتابوں میں۔'' ان کی قدر و منزلت اللہ کے نزدیک بہت بلند ہے یا ساتویں آسمان کے اوپر ہیں، یہ شبہے اور تضاد سے بلند درجہ ہیں، پاک ہیں ان کو سوائے پاک لوگوں کے کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: ہر میل کچیل سے پاک صاف ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کفار سے محفوظ ہیں۔[1] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شیطان کے چھونے سے محفوظ ہیں۔[2] یہ اس بات پر دلیل ہے کہ صحف آسمان پر ملائکہ کے ہاتھوں میں ہیں۔ شیاطین وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔

① تفسیر القرطبي (١٩/٢١٦) ② تفسیر الجلالین (١/٧٩٢)

﴿ سَفَرَةٍ ﴾ جمع ہے "سافر" کی بہ معنی کاتب، یعنی فرشتے اس کو لوحِ محفوظ سے نقل اور کتابت کرتے ہیں۔ یا مراد "سفراء" ہیں بہ معنی سفیر۔ ان کو اللہ نے "کرام" کہا، یہ گناہوں سے پاک ہیں، یا یہ مرد کے بیوی کے ساتھ خلوت کے وقت میں علاحدہ ہو جاتے ہیں۔ یا دوسرے کے فائدے کو اپنے فائدے پر مقدم رکھتے ہیں، یا مومنوں کے لیے استغفار کیا کرتے ہیں۔ "بررہ"، "بار" کی جمع ہے۔ "بار" نیکوکار کو کہتے ہیں۔[1]

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴿١٧﴾ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ ﴿١٨﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ ۭ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ﴿١٩﴾ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ﴿٢١﴾ ثُمَّ اِذَا شَاۗءَ اَنْشَرَهٗ ﴿٢٢﴾ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿٢٣﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿٢٤﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَاۗءَ صَبًّا ﴿٢٥﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿٢٦﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿٢٧﴾ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿٢٨﴾ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿٢٩﴾ وَّحَدَاۗىِٕقَ غُلْبًا ﴿٣٠﴾ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿٣١﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿٣٢﴾

ہلاک کیا جائے انسان، کس قدر ناشکرا ہے!⑰ (اللہ نے) اسے کس چیز سے پیدا کیا؟⑱ ایک (حقیر) نطفے سے، اسے پیدا کیا، پھر اس کا اس نے اندازہ لگایا⑲ پھر اس کے لیے راہ آسان کر دی⑳ پھر اسے موت دی اور قبر میں پہنچایا㉑ پھر وہ جب چاہے گا اسے (دوبارہ) زندہ کرے گا㉒ ہرگز نہیں! اس نے اب تک اللہ کے حکم کی بجا آوری نہیں کی㉓ چنانچہ انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف دیکھے㉔ بے شک ہم نے خوب مینہ برسایا㉕ پھر ہم نے زمین کو اچھی طرح پھاڑا㉖ پھر ہم نے اس میں سے اناج اُگایا㉗ اور انگور اور سبزیاں㉘ اور زیتون اور کھجوریں㉙ اور گھنے باغات㉚ اور میوے اور چارا㉛ (جو) تمھارے اور تمھارے جانوروں کے لیے سامانِ زندگی (ہے)㉜

منکرینِ آخرت کا ردّ:

اندازہ پر رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھ پاؤں اسلوب پر رکھے نہ اس طرح کہ ایک بہت بڑا ایک بہت چھوٹا۔ راہ آسان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایمان اور کفر کی سمجھ دی یا پیٹ میں سے آسانی سے نکالا۔ انتہیٰ۔

[1] فتح البیان (۱۵/۷۵۔۸۱)

اللہ تعالیٰ نے بعد کے منکروں کی مذمت کی اور کہا: انسان بڑا منکر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ﴿ قُتِلَ ﴾ بہ معنی "لُعِنَ" ہے۔ یہی قول ابو مالک کا بھی ہے، یہ لعنت اس جنسِ انسان کے حق میں ہے جو مکذب ہے اور بہت زیادہ جھٹلانے کی وجہ سے ملعون ٹھہرا، کیوں کہ وہ صرف اور صرف استبعاد اور بے علمی کی وجہ سے بلا مستند جھٹلانے لگتا ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَآ اَكْفَرَهٗ ﴾ بہ معنی "ما أشد كفره" ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی کس چیز نے اس کو کافر بنا دیا اور آخرت کے جھٹلانے پر آمادہ کیا۔[1] اس کو امام بغوی رحمہ اللہ نے امام مقاتل اور کلبی رحمہما اللہ سے بھی نقل کیا ہے۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی "مَا أَلْعَنَهُ"

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا کہ ہم نے اس کو ایک حقیر چیز سے بنایا ہے اور ہم اس بات پر قادر ہیں کہ جس طرح پہلے بنایا، اسی طرح دوسری بار اٹھا کھڑا کریں۔ تقدیر سے مراد اجل و رزق و عمل و شقاوت و سعادت (بدبختی و نیک بختی) کا اندازہ کرنا ہے۔ راہ کا آسان کرنا یہ ہے کہ ماں کے پیٹ سے باہر نکالا۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، ضحاک، ابو صالح، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ کا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴾ [الدهر: ٣] "ہم نے اسے راہ دکھائی اب خواہ وہ شکر گزار بنے خواہ ناشکرا۔" یعنی ہم نے اس پر اس کے علم کا راستہ سہل کر دیا اور کھول کر جتا دیا اب چاہے شکر کرے چاہے کفر۔ امام حسن اور ابن زید رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی زیادہ راجح ہے۔[3] پھر پیدا کرنے کے بعد مار کر صاحبِ قبر کیا، پھر قبر سے جب چاہے گا اٹھا کھڑا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴾ [الروم: ٢٠] "اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر اب انسان بن کر (چلتے پھرتے) پھیل رہے ہو۔" نیز فرمایا: ﴿ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ﴾ [البقرة: ٢٥٩] "تو دیکھ کہ ہم ہڈیوں کو کس طرح اٹھاتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔" سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ مٹی انسان کی ہر چیز کو کھا جاتی ہے مگر عجب الذہب کو۔ پوچھا: وہ کیا چیز ہے؟ فرمایا: رائی کے ایک دانے کے برابر ہے، اسی سے تم بنتے ہو۔[4] (رواه ابن أبي حاتم) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیحین میں بھی آئی ہے مگر بغیر اس اضافے کے اس کے الفاظ یہ ہیں: « كُلُّ ابْنِ آدَمَ يَبْلَى إِلَّا عَجْبُ الذَّنَبِ مِنْهُ خُلِقَ وَفِيهِ يُرَكَّبُ »[5] یعنی سارا آدمی گل کر مٹی ہو جاتا ہے مگر دم کی ہڈی کہ اسی سے پیدا ہوا ہے اور اسی کے اندر مرکب ہوگا۔

---

(1) تفسير الطبري (٢٢٢/٢٤) تفسير ابن كثير (٦٠٦/٤) (2) تفسير البغوي (٣٣٧/٨)

(3) تفسير الطبري (٢٢٣/٢٤، ٢٢٤) تفسير ابن كثير (٦٠٦/٤)

(4) مستدرك الحاكم (٦٥١/٤) اس کی سند میں "دراج عن ابی الہیثم" ضعیف راوی ہے۔

(5) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٥٥)

پھر اللہ پاک نے فرمایا کہ انسان کافر جو یہ بات کہتا ہے کہ اللہ کا مجھ پر جو حق تھا وہ میں نے ادا کر دیا، نفس میں اور مال میں سو یہ بات نہیں ہے، بلکہ اس پر جو اللہ کے حقوق اور فرائض تھے، وہ اس نے ہرگز ادا نہیں کیے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی شخص ہرگز وہ فرض ادا نہیں کرتا جو اس پر ہے۔[1] امام بغوی رحمہ اللہ نے یہی بات امام حسن بصری رحمہ اللہ سے بھی نقل کی ہے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اس آیت میں متقدمین کا کلام نہیں پایا، سوائے اس کے جو اس جگہ ذکر کیا ہے اور میری سمجھ میں یہ معنی آتے ہیں۔ واللّٰہ أعلم۔ کہ جب اللہ چاہے گا اس کو قبر سے اٹھا کھڑا کرے گا، وہ اس وقت حکم کو بجا نہ لائے گا، یہاں تک کہ مدت گزر جائے اور تقدیر بنی آدم سے فارغ ہو جو اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ اتنے آدمی ہوں گے اور دنیا میں آئیں گے اللہ نے کون و قدر کا حکم دے دیا ہے جب یہ امر اللہ کے نزدیک اپنی انتہا کو پہنچ جائے گا تو اللہ نشرِ خلائق کرے گا اور جس طرح ہدایت کی تھی اسی طرح پر اعادہ کرے گا۔[3]

امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عزیر علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ ایک فرشتے نے میرے پاس آ کر کہا کہ قبریں زمین کا پیٹ ہیں اور زمین مخلوق کی ماں ہے، پس جب اللہ اپنے ارادے کے مطابق پیدا کر چکے گا اور یہ قبریں، جن کو اللہ نے مخلوق کے لیے بنایا ہے، پُر ہو چکیں گی، تب دنیا منقطع ہو جائے گی اور جو لوگ زمین کے اوپر ہیں وہ مر جائیں گے اور جو کچھ زمین کے اندر ہے اسے زمین اُگل دے گی اور جو کچھ قبروں کے اندر ہے قبریں ان کو نکال کر باہر ڈال دیں گی۔[4] یہ اسی معنی کے مشابہ ہے جو ہم نے ذکر کیے ہیں۔ واللّٰہ أعلم۔ یہ کہتے ہیں کہ آدمی اپنے طعام کی طرف دیکھے، احسان جتلاتا ہے اور مردہ زمین سے نباتات کا پیدا ہونا دلیل ہے اس بات کی کہ موت کے بعد جبکہ ہڈیاں گل سڑ کے خاک ہو گئیں تو اجسام کو زندہ کیا جائے گا۔ ہم نے آسمان سے پانی اتارا، پھر زمین کو چیرا پھاڑا، یعنی وہ پانی زمین کی تہہ میں جا گھسا اور اس نے اناج کے اجزاء کو پھاڑا، وہ دانہ جو زمین کے اندر امانت رکھا گیا تھا اُگا اور اونچا ہوا اور روئے زمین پر نکلا، اس میں اناج و انگور و ترکاری نکلی۔

لفظ "حَب" سب دانوں کو اور انگور کو شامل ہے، سب پہچانتے ہیں۔ ترکاری وہ سبزہ ہے جس کو چوپائے کھاتے ہیں، اس کو "فصفصه" اور "قت" بھی کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام قتادہ، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قضب سے مراد چارہ ہے۔[5] زیتون سالن ہے اور اس کے تیل سے چراغ جلاتے ہیں اور تدھین کرتے (چکنا کرتے) ہیں اور کھجور کو تر و خشک کھاتے ہیں اور کچی اور پکی استعمال میں لاتے ہیں اور اس کا ست نکالتے ہیں اور سرکہ بناتے ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿حَدَآئِقَ﴾ سے مراد باغات ہیں۔ ﴿غُلْبًا﴾ سے مراد گاڑھی وعمدہ کھجوریں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ

[1] تفسیر الطبري (۲۲۵/۲٤) [2] تفسیر البغوي (۳۳۸/۸) [3] تفسیر ابن کثیر (٦٠٧،٦٠٦/٤)
[4] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۳۹۹/۱۱) [5] تفسیر الطبري (۲۲۷،۲۲٦/۲٤)

حدیقہ وہ باغ ہے جو گھنا ہو اور اس کے درخت اکٹھے ہوں یا مراد سایہ دار درخت ہیں، یا اونچے درخت ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد وہ درخت ہیں جو خوب موٹے اور بھاری ہیں۔ ایک روایت میں غلیظ گردن کہا ہے۔ ﴿ فَٰكِهَةً ﴾ سے مراد میوہ ہے جس سے مزہ لیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میوۂ تر کو "فاکھۃ" کہتے ہیں اور ﴿ أَبًّا ﴾ وہ چیز ہے جو زمین اُگاتی ہے اور چوپائے اس کو کھاتے ہیں نہ کہ آدمی۔

ایک روایت میں ہے کہ مراد حشیش ہے جو چار پایوں کے لیے ہے اور فاکہہ بنی آدم کے لیے ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو چیز روئے زمین پر اُگتی ہے وہ "أَبّ" ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر شے جس کو زمین نے اُگایا فاکہہ کے سوا وہ "أَبّ" ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "اب" زمین کی روئیدگی ہے جس کو چار پائے کھاتے ہیں نہ کہ آدمی۔ ابن ادریس رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ "اب" وہ جس کو زمین نے چارپایوں کے لیے اُگایا ہے۔ امام ابوالسائب رحمہ اللہ نے کہا "أَبّ" زمین کی روئیدگی کو کہتے ہیں جس کو آدمی اور چوپائے کھاتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "أَبّ"، "کلاء" اور "مرعی" کے معنی میں ہے۔ یہی قول امام مجاہد، حسن، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔[1]

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے "أَبّ" کے معنی پوچھے گئے تو فرمایا: "أَيُّ سَمَاءٍ تُظِلُّنِي وَأَيُّ أَرْضٍ تُقِلُّنِي إِنْ قُلْتُ فِي كِتَابِ اللّٰهِ مَا لَا أَعْلَمُ" ان کی سند منقطع ہے، یعنی کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا، اور کون سی زمین مجھ کو اٹھائے گی، اگر میں اللہ کی کتاب میں بے جانے بوجھے کچھ کہوں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار یہ سورت پڑھی جب ﴿ وَفَٰكِهَةً وَأَبًّا ﴾ کے الفاظ پر آئے تو کہا: ﴿ فَٰكِهَةً ﴾ کو ہم پہچانتے ہیں "أَبّ" کیا چیز ہے؟ قسم ہے اے ابن خطاب! کہ یہ تو تکلف ہے۔ اس کی اسناد صحیح ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اس بات پر محمول ہے کہ میں اس کی شکل وجنس وعین کو نہیں جانتا، ورنہ جس کسی نے اس آیت کو پڑھا ہے، وہ جانتا ہے کہ "أَبّ" نباتِ ارض کو کہتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ فَأَنۢبَتۡنَا فِيهَا حَبًّا ﴿27﴾ وَعِنَبًا وَقَضۡبًا ﴿28﴾ وَزَيۡتُونًا وَنَخۡلًا ﴿29﴾ وَحَدَآئِقَ غُلۡبًا ﴿30﴾ وَفَٰكِهَةً وَأَبًّا ﴾ پھر فرمایا کہ یہ تمہاری معیشت ہے اور تمہارے چوپایوں کی معیشت ہے اس گھر (دنیا) میں قیامت تک کے لیے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ لعنت ہو کافر انسان پر اس کا کفر کس قدر سخت ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس پر سخت ترین کلمات کے ساتھ بد دعا ہے۔ یہ اسلوب کلامِ عرب میں اس بات کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ وہ انسان کافر سب سے بڑے عتاب کا مستحق ہے۔ اسی لیے اس جگہ اعظم قبائح کا ذکر کیا جس طرح کہتے ہیں:

---

[1] تفسیر الطبري (٢٤/٢٢٧، ٢٣١) تفسیر ابن کثیر (٤/٦٠٧، ٦٠٨) [2] تفسیر ابن کثیر (٤/٦٠٨)

قَاتَلَهُ اللّٰهُ مَا أَخْبَثَهُ أَخْزَاهُ اللّٰهُ مَا أَظْلَمَهُ

''اللہ اسے ہلاک ورسوا کرے وہ کس قدر خبیث وظالم ہے!''

شاعر نے کہا ہے:

يَتَمَنَّى الْمَرْءُ فِي الصَّيْفِ الشِّتَا فَإِذَا جَاءَ الشِّتَاءُ أَنْكَرَهُ

لَا بِذَا يَرْضَى وَلَا يَرْضَى بِذَا قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ

''انسان گرمی میں سردی کی تمنا کرتا ہے جب سردی آتی ہے تو اسے برا جانتا ہے۔ نہ اس سے راضی ہے نہ اس سے خوش، انسان ہلاک ہو وہ کتنا ناشکرا ہے۔''

یا یہ معنی ہیں کہ کس چیز نے اس کو کافر بنا دیا۔ گویا استفہامِ توبیخ ہے، مگر پہلے معنی زیادہ ظاہر ہیں۔ اس انسان سے مراد عتبہ بن ابی لہب ہے، اس کے افراطِ کفر سے تعجب دلایا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی تم تعجب کرو اس کے کفر سے،[1] یا مراد جنس ہے، یہی زیادہ مناسب ہے۔ ہر کافر شدید الکفر اس کے نیچے داخل ہے اور جس کے حق میں یہ آیت اتری ہے، وہ بدرجہ اولیٰ اس میں داخل ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس کافر انسان کی اس چیز کا ذکر کیا جس میں اس کو نظر کرنا چاہیے، تاکہ اپنے کفر سے باز آ جائے اور سرکشی سے رک جائے۔ فرمایا: اللہ پاک نے اس کو کس چیز سے پیدا کیا ہے۔ یہ سوالیہ انداز تقریر و تحقیر کے لیے ہے، مگر پہلی بات زیادہ ظاہر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ تقریر و تحقیر کے لیے ہے۔ امام شہاب رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں کہ اس سے دونوں امر ظاہر ہوتے ہیں۔[2] نطفہ سے مراد حقیر پانی ہے، یہ کامل تحقیر ہوئی۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بھلا جو پیشاب کے راستے سے دو بار نکلا ہے، وہ کیسے تکبر کرے گا۔[3] ناپاک پانی کے ایک قطرے سے بنا کر برابر کیا اور مصالحِ نفس کے لیے تیار کیا، دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھیں اور تمام آلات اور حواس پیدا کیے یا یہ کہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف الٹا پلٹا، پھر اس کے لیے خیر و شر کا راستہ آسان کر دیا۔

امام سدی، مقاتل، عطاء اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ماں کے پیٹ سے نکلنے کو آسان کر دیا۔[4] بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچے کا سر اوپر کی جانب ہوتا ہے اور پاؤں نیچے کی طرف ہوتے ہیں، غرضیکہ پیٹ میں سیدھا رہتا ہے۔ جب نکلنے کا وقت ہے تو اللہ کے الہام سے منقلب ہو جاتا ہے (پھر جاتا ہے، یعنی سر نیچے کی طرف اور پاؤں اوپر کی طرف)۔ اس کو امام رازی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے[5] لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَهَدَيْنَٰهُ ٱلنَّجْدَيْنِ﴾ [البلد: ١٠] ''ہم نے اس کو دونوں راستے دکھا دیے۔'' پھر جب آدمی مر جاتا ہے تو صاحبِ قبر ہو جاتا ہے۔ اس کو قبر کے اندر چھپا دینا ایک طرح کا اس کے لیے اکرام ہے، کیوں کہ اگر اس کو روئے زمین پر رکھ دیا جاتا تو درندے پرندے اس کو کھا جاتے۔[6] (قاله الفراء)

[1] معاني القرآن (٥/٢٨٥) [2] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٣٢٢/٨) [3] تفسير القرطبي (٢١٨/١٩)
[4] تفسير الطبري (٢٢٣/٢٤) تفسير القرطبي (٢١٨/١٩) [5] تفسير الرازي (٥٥/٣١) [6] فتح القدير (٥١٠/٥)

پھر جب اللہ کو اس کی موت کے بعد اس کا زندہ کرنا منظور ہو گا تو اس کو اٹھا کھڑا کرے گا۔ انشاء کو مشیت کے ساتھ معلق رکھا ہے۔ اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ وقتِ مذکور معین نہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ باقی احوال جو اس سے پہلے ہوتے ہیں، ان کے اوقات بعض وجوہ سے معلوم ہو جاتے ہیں، اس لیے ان کو مشیت کے سپرد نہیں کیا، کیوں کہ پھر فرمایا کہ اس شخص نے نہ طاعت پر عمل کیا اور نہ گناہوں سے بچا۔ اس سے مراد کافر انسان ہے یا عام طور پر ہر انسان ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس نے سچ مچ اللہ کے حکم کی بجا آوری نہیں کی،[1] بلکہ ہر فردِ بشر نے اس چیز میں خلل ڈالا جس کا اسے حکم دیا گیا تھا، کسی نے کفر سے کسی نے نافرمانی سے۔ ایسے لوگ تھوڑے ہیں جو فرائض پر عمل کرنے والے اور انھیں ادا کرنے والے ہوئے۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے: "مَا لِابْنِ آدَمَ وَالْفَخْرِ أَوَّلُهُ نُطْفَةٌ مَذِرَةٌ وَآخِرُهُ جِيفَةٌ قَذِرَةٌ وَهُوَ بَيْنَهُمَا حَامِلٌ عَذِرَةٌ" یعنی آدمی کو فخر کرنا کب زیب دیتا ہے! اول وہ ایک قطرہ خوار تھا اور انجام میں ایک مردار نجس اور بیچ میں چرکیں بردار۔ اب انسان اپنے کھانے پر غور کرے کہ اللہ نے کس طرح اس کو زندگی کا سبب ٹھہرایا ہے اور وسیلۂ معاش بنایا جس کی وجہ سے اس میں طاقت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اخروی نیک بختی کے لیے مستعد ہو سکتا ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد طعام کے داخل ہونے اور خارج ہونے کی جگہ پر نظر کرنا ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما کا ہے، مگر پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اپنے براز کو دیکھے۔[2] ہم نے پانی حصولِ طعام کے لیے اتارا، گویا پانی کے اندر رزق رکھا گیا ہے، پھر زمین کو پھاڑا اس سے اپنی اپنی شکل وصورت کا چھوٹا بڑا اناج اور دانا نکلتا ہے، پھر زمین سے حبوب (دانے) نکالے جو غذا ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نبات نشو ونما پکڑتے پکڑتے دانہ ہو جاتی ہے۔ پھر انگور، پھر ترکاری پیدا کی جو چوپایوں کا چارہ ہے۔ تر چارے کو قصقصہ کہتے ہیں اور خشک کو "قت" کہتے ہیں۔ زیتون سے تیل نکالا، کھجور کے درخت بنائے، گھنے باغ لگائے۔ فاکہہ میں تر کھجور، انگور، انار، اترج، خشک کھجور، کشمش وغیرہ میوہ جات سب کے سب شامل ہیں۔ فاکہہ وہ چیز ہے جس کو آدمی کھاتا ہے، جیسے: انگور، انجیر، خوخ وغیرہ۔ یہ سب درختوں کے پھل ہیں۔ "أبّ" وہ گھاس اور چارہ ہے جس کو آدمی نہیں بوتا اور نہ کھاتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "أبّ" تازہ میوہ ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انجیر ہے۔[3] پہلا قول زیادہ مناسب ہے، یہ سب تمام حیوانات کے لیے متاع ہے۔[4]

---

[1] فتح القدير (٥/٥١٠) [2] الدر المنثور (٨/٤٢٠)

[3] تفسير القرطبي (١٩/٢٢٣) [4] فتح البيان (١٥/٨١_٨٧)

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿٣٣﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿٣٤﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿٣٥﴾
وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿٣٦﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿٣٧﴾
وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿٣٩﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا
غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾

پھر جب کان بہرے کر دینے والی سخت آواز (قیامت) آئے گی 33 اس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا 34 اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے 35 اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے (بھی) 36 ان میں سے ہر شخص کا اس دن ایسا حال ہوگا جو اسے دوسروں سے بے پروا کر دے گا 37 اس دن کئی چہرے چمکتے ہوں گے 38 ہنستے مسکراتے، ہشاش بشاش 39 اور کئی چہروں پر اس دن خاک اُڑ رہی ہوگی 40 ان پر سیاہی چھائی ہوگی 41 یہی لوگ کافر و فاجر ہیں 42

قیامت کے دن انسان کا قریبیوں سے فرار:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ”صاخۃ“ قیامت کا ایک نام ہے۔ اللہ نے وہ دن عظیم بنایا ہے، اس سے اپنے بندوں کو ڈرایا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شاید یہ نام صور پھونکنے کا ہے۔[1] امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ”صاخۃ وصیخۃ“ روزِ قیامت ہے، کان اس کے سننے سے بہرے ہو جائیں گے، اس لیے اس کو ”صاخۃ“ کہا۔[2] آدمی اپنے ان اعزہ سے بھاگے گا اور نفرت کرے گا، کیوں کہ ایک بڑی ہولناکی اور خطب جلیل ہو گا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مرد اپنی بیوی سے مل کر کہے گا: اے بی بی! میں تیرا کیسا شوہر تھا؟ وہ کہے گی: تو بہت اچھا خاوند تھا اور اس کی تعریف کرے گی، یہ کہے گا: آج تو مجھے ایک نیکی دے دے، شاید میں بچ جاؤں اور اس عذاب سے جو تو دیکھ رہی ہے نجات پاؤں، وہ جواب دے گی کہ تو نے بہت ذرا سی چیز مانگی ہے، لیکن میں تجھ کو کچھ بھی نہیں دے سکتی، مجھ کو بھی وہی ڈر ہے جو تجھ کو ہے۔ پھر وہ اپنے بیٹے سے مل کر کہے گا کہ اے بیٹے! میں تیرا کیسا باپ تھا؟ وہ تعریف کرے گا، یہ کہے گا: مجھ کو آج ایک ذرا برابر نیکی کی ضرورت ہے تو مجھ کو اپنی نیکیوں میں سے دے دے، شاید میں اس عذاب سے جو تو دیکھ رہا ہے نجات پاؤں۔ وہ کہے گا: یہ تو سچ ہے کہ تو نے بہت ذرا سی چیز مانگی ہے، لیکن مجھے بھی اسی چیز کا ڈر ہے جس سے تو ڈرتا ہے میں تو تجھ کو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ اسی پر اللہ پاک نے یہ بات بیان کی کہ آدمی اس دن اپنے عزیزوں سے گریز کرے گا، یعنی ہر کسی کو اپنی جان اور نجات کی پڑی ہو گی دوسرے کی خبر نہ لے گا، گو ماں باپ بھائی بہن بیوی بچے کیوں نہ ہوں۔[3] حدیثِ صحیح میں شفاعت کے بارے میں آیا

[1] تفسیر الطبري (٢٣١،٢٣٢/٢٤) [2] تفسیر البغوي (٣٣٩/٨) [3] تفسیر ابن کثیر (٦٠٨/٤)

ہے کہ جب لوگ اولوالعزم انبیاء سے شفاعت کے طالب ہوں گے تو ہر شخص یہی کہے گا ''نَفْسِيْ نَفْسِيْ لَا أَسْأَلُكَ الْيَوْمَ إِلَّا نَفْسِيْ''[1] یہاں تک کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام بھی یہ کلمہ کہیں گے کہ آج کے دن اپنی ہی جان کا سوال کرتا ہوں۔ مریم علیہا السلام جس نے مجھے جنا تھا، اس کے لیے بھی کچھ نہیں کہتا۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت سے مراد ''أحب فالأحب أقرب فالأقرب'' ہے۔ یہ بات اس دن کی ہولناکی کے سبب سے ہوگی۔

درآں دم کہ از فعل پرسند و قول — اولوا العزم را تن بلرزد ز ہول

''انسان کے اعمال و اقوال کے متعلق جب سوال ہوگا تو اس وقت عالی ہمت لوگ بھی خوف کی وجہ سے کانپنے لگیں گے۔''

غرض یہ کہ ہر نفس ایک شغلِ شاغل میں ہوگا (یعنی اسے اپنی ہی پڑی ہوگی) غیر سے غافل بنے گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: لوگ قیامت کے دن برہنہ پا، برہنہ تن، پیادہ اور بے ختنہ اٹھائے جائیں گے۔ آپ کی ایک بی بی نے کہا: بعض بعض کا ستر دیکھیں گے۔ فرمایا: اس دن ہر آدمی کو اپنی پڑی ہوگی، کوئی کسی کو نہ دیکھے گا۔[3] (رواه ابن أبي حاتم والنسائي والترمذي وقال: هذا حديث حسن صحيح) یہ مضمون کئی حدیثوں میں کئی طریقوں سے مروی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ اس دن کچھ منہ بحال ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ وہاں دو طرح کے فریق جمع ہوں گے: ایک وہ لوگ جو خوش ہیں، صاحبِ مسرت ہیں، ان کے دل کی خوشی ان کے چہروں سے ظاہر ہوگی۔ یہ اہلِ جنت ہیں۔ دوسرا فریق سیاہ رو ہوگا، یہ اہلِ نار ہیں۔ حدیث میں مروی ہے کہ کافر کو پسینے کی لگام لگے گی، پھر ان کے چہروں پر سیاہی اڑے گی۔[4] (رواه ابن أبي حاتم)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان کو چہرے کی سیاہی ڈھانپ لے گی۔[5] یہ لوگ اپنے دلوں سے کافر اور اپنے عملوں سے فاجر تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴾ [نوح: ٢٧] ''اور یہ فاجروں اور ڈھیٹ کافروں ہی کو جنم دیں گے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ''صاخة'' روزِ قیامت کا صیحہ ہے۔ جس دن یہ پکار ہوگی، جس کے غل سے کان پھوٹنے لگیں گے، اس دن ہر شخص اپنے ناتے والوں سے بھاگنے لگے گا۔ یہ لوگ بہت خاص قرابت دار ہیں سب سے زیادہ مہربانی اور نرمی و محبت انہیں پر ہوتی ہے۔ ان سے بھاگنا قیامت کی ہولناکی اور خطبِ قطیع (جو تمام تعلقات کو

---

[1] حلية الأولياء (٣٧٢/٥، ٣٧٣) البتہ اس کی اصل صحيح البخاري (٣٦٦٢) اور صحيح مسلم (١٩٤) میں مروی ہے۔
[2] تفسير الطبري (٦٠٦/٢٤) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٠/١٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٥٠٦/١) سنن الترمذي (٣٣٣٢)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٠٠/١٠) اس کی سند میں ''ابوعلی محمد'' مجہول راوی ہے۔ [5] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٠١/١٠)

قطع کر دے) کی دلیل ہے۔ بھاگنے سے مراد یہ ہے کہ آدمی الگ الگ اور دور دور رہے گا، کوئی اس وجہ سے کسی کی طرف توجہ نہ کرے گا کہ اسے اپنی پڑی ہوگی۔ سب سے پہلے جو اپنے بھائی سے بھاگے گا وہ ہابیل ہوگا اور ماں باپ سے جو سب سے پہلے بھاگے گا وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں اور اپنی بیویوں سے سب سے پہلے نوح اور لوط علیہما السلام بھاگیں گے اور بیٹے سے بھی نوح علیہ السلام بھاگیں گے، لیکن اس بھاگنے کا عام ہونا زیادہ مناسب ہے۔ یہ بھاگنا اس لیے ہوگا کہ وہ لوگ کہیں اپنے معاملات کا مطالبہ اس سے نہ کریں، یا اس کے عذاب اور سختی کو نہ دیکھیں جس میں کہ وہ گرفتار ہے۔ یا اس لیے کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ وہ عزیز و اقارب میرے کچھ کام نہیں آ سکتے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا ﴾ [الدخان: ٤١] ''اس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔''

ابن طاہر ابہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کی عاجزی وقلت وحیلہ دیکھ کر بھاگے گا کہ ان کی اللہ کے سامنے کچھ نہیں چلتی اور اگر یہ بات آج دنیا میں اس پر ظاہر ہو جائے تو اپنے رب کے سوا کسی پر کچھ اعتماد نہ کرے۔[1] قیامت کا وہ دن ایسا ہوگا کہ ہر شخص کو اپنی پڑی ہوگی۔ کہاں کے ماں باپ، بھائی، بیوی، بیٹے۔ اس کے بعد اللہ نے بدبختوں اور نیک بختوں کا انجام بیان کیا کہ اس بڑی آفت میں گرفتار ہونے کے بعد کچھ لوگ تو ہشاش بشاش خوش اور مسرور ہوں گے۔ یہ مومنین کے چہرے ہیں ان کو اپنی نعمتوں اور عزت کا حال معلوم ہو جائے گا۔ جب حساب سے فارغ ہو جائیں گے تو ہنسیں گے اور جب بہت بڑا ثواب پائیں گے اور اللہ کی کرامت اور رضوان کو دیکھیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چہرے کی چمک وضو کے آثار سے ظاہر ہوگی۔[2] یا قیامِ لیل سے، یا اللہ کی راہ کے غبار سے۔ اور کچھ لوگوں کے چہروں پر غبار اور کدورت ہوگا، اس پر ہر طرف سے سیاہی اور مرجھاہٹ چھائی ہوگی، کوئی چیز غبار اور سیاہی سے بڑھ کر وحشت ناک نہیں ہے۔ جو گرد آسمان کی طرف جائے وہ قترت ہے اور جو زمین پر آئے وہ غبرت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد ذلت اور شدت ہے۔[3] تو ایسے لوگ جن کی یہ حالت ہے کافر فاجر ہوں گے۔ یہ جامع تھے درمیان کفر و فجور کے، یعنی انھوں نے کفر اور فجور کو اختیار کیا ہوا تھا۔ لہٰذا چہرے کی سیاہی اور غبار بھی ان پر اکٹھا ہو گیا۔ فاجر صاحبِ فسق اور کذب کو کہتے ہیں۔[4] واللّٰه أعلم.

---

(1) تفسير القرطبي (١٩/٢٢٥)
(2) تفسير القرطبي (١٩/٢٢٦)
(3) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٠١)
(4) فتح البيان (١٥/٨٧-٩٠)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ التَّكْوِيْرِ

اس کی انتیس (۲۹) آیتیں ہیں۔ یہ بلا اختلاف مکی ہے۔ اس کو ''سورت کورت'' بھی کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس، عائشہ اور عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ یہ مکہ میں اتری ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جس کو یہ بات اچھی لگے کہ وہ قیامت کے دن کو دیکھ لے، گویا اسی وقت آنکھ سے نظر آتی ہے تو وہ اس سورت کو اور ﴿ إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴾ اور ﴿ إِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴾ کو پڑھے۔[2] (أخرجه أحمد والترمذي وحسنه وابن المنذر والطبراني والحاكم وصححه وابن مردويه)۔ ''سورت عبس'' میں احوالِ قیامت کا کچھ ذرا سا ذکر کیا تھا۔ ان سورتوں میں بعض دوسرے احوال بیان فرمائے، یہی اس کے اور ماقبل کے درمیان مناسبت ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ﴿۱﴾ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ﴿۲﴾ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ﴿۳﴾
وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ﴿۴﴾ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ﴿۵﴾ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴿۶﴾
وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ﴿۷﴾ وَإِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ﴿۸﴾ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ﴿۹﴾
وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿۱۰﴾ وَإِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ﴿۱۱﴾ وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ ﴿۱۲﴾
وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ﴿۱۳﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ أَحْضَرَتْ ﴿۱۴﴾

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا ① اور جب تارے بے نور ہو جائیں گے ② اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے ③ اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں بیکار چھوڑ دی جائیں گے ④ اور جب وحشی جانور اکٹھے کیے جائیں گے ⑤ اور جب سمندر بھڑکا دیے جائیں گے ⑥ اور جب روحیں (جسموں سے) ملا دی جائیں گی ⑦ اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا: ⑧

[1] الدر المنثور (۴۲۵/۸) [2] مسند أحمد (۲۷/۲) سنن الترمذي (۳۳۳۳) مستدرك الحاكم (۶۲۰/۴) صحيح الجامع (۶۲۹۳)

کس گناہ کی وجہ سے وہ قتل کی گئی؟⑨ اور جب اعمال نامے کھولے جائیں گے⑩ اور جب آسمان کی کھال اُتار دی جائے گی⑪ اور جب دوزخ بھڑکائی جائے گی⑫ اور جب جنت قریب لائی جائے گی⑬ اس وقت ہر شخص جان لے گا جو کچھ وہ لے کر آیا⑭

روزِ قیامت سورج لپیٹ دیا جائے گا اور ستارے بے نور ہو جائیں گے:

اونٹنی جب بچہ جننے کے قریب ہو تو بہت عزیز ہوتی ہے۔ بچے کی توقع اور دودھ کی اُمید سے پیاری لگتی ہے۔ تنور جھونکنے سے اُبلتا ہے۔ قسم قسم کے گنہگار اکٹھے ہوں گے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ﴿كُوِّرَتْ﴾ سے سورج کا تاریک ہو جانا اور دور ہو جانا مراد ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مضمحل ہو جانا اور چلے جانا۔ یہی قول امام ضحاک رحمہ اللہ کا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سورج کی چمک جاتی رہے گی۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پست ہو جائے گا۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پھینک دیا جائے گا۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ڈال دیا جائے گا یا اوندھا کر دیا جائے گا۔ امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زمین پر گرا دیا جائے گا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمارے نزدیک ٹھیک بات یہ ہے کہ تہہ کر دیا جائے گا جس طرح کہ پگڑی کے پیچ ایک دوسرے پر لپیٹ دیتے ہیں، پھر اس کو اٹھا کر پھینک دیں گے، اس وقت اس کی روشنی جاتی رہے گی۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ چاند سورج اور تاروں کو قیامت کے دن تہہ کر کے دریا میں ڈال دے گا، پھر اوتر کی طرف سے ہوا چلے گی، وہ اس دریا کے پانی کو آگ کی طرح سلگا دے گی۔[2] یہی قول عامر شعبی رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ امام ابن ابی مریم رحمہ اللہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «كُدِّرَتْ فِيْ جَهَنَّمَ»[3] (رواه ابن أبي حاتم) سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ چاند سورج آگ میں دو ثور عقیر ہیں۔[4] (رواه أبو يعلى بسند ضعيف)

امام بخاری رحمہ اللہ کی روایت صحیح میں یوں ہے: «اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يُكَوَّرَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[5] یعنی اس دن چاند سورج تہہ کر کے رکھے جائیں گے، کچھ کار آمد نہ ہوں گے، تارے گر پڑیں گے۔

پہاڑ گر پڑیں گے، اونٹنیوں کو بے کار چھوڑ دیا جائے گا:

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قیامت سے پہلے چھ نشانیاں ہیں: لوگ اپنے بازاروں میں ہوں گے کہ

---

① تفسير الطبري (٢٣٨،٢٣٧/٢٤) ② تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٠٢/١٠)

③ تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٠٢/١٠) یہ روایت مرسل ہے۔

④ مسند أبي يعلىٰ (١٤٨/٧) اس کی سند میں "یزید رقاشی اور درست بن زیاد" ضعیف راوی ہیں۔

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٢٨)

سورج کی روشنی جاتی رہے گی، اسی دوران تارے بکھر جائیں گے، اتنے میں پہاڑ زمین پر گر پڑیں گے، زمین میں حرکت بے چینی اور اختلاط پیدا ہو گا جن گھبرا کر انسانوں کی طرف اور انسان جنوں کی طرف آئیں گے۔ چوپائے، پرندے اور وحشی جانور خلط ملط ہو جائیں گے، ایک دوسرے میں گھس پڑیں گے، غرض یہ کہ جنگلی جانوروں میں رول پڑے گی، یعنی مارے مارے پھریں گے، اونٹنیوں کو اونٹ والے بے کار چھوڑ دیں گے، دریا سلگ اٹھیں گے، اس وقت جن کہیں گے کہ ہم جا کر خبر لاتے ہیں، وہ دریا کی طرف آئیں گے، دیکھیں گے کہ وہ آگ سے بھڑک رہے ہیں، اتنے میں زمین ساتویں زمین تک پھٹ جائے گی اور آسمان ساتویں آسمان تک پھٹ جائیں گے اور ایک زور کی ہوا چلے گی جو ان کو مار کر رکھ دے گی۔ [1] (روه ابن جرير و هذا لفظه وابن أبي حاتم ببعضه)

یہی قول امام مجاہد، ربیع بن خثیم، حسن بصری، ابو صالح، حماد بن ابی سلیمان اور ضحاک رحمہم اللہ کا بھی ہے کہ مراد ستاروں کا بکھر جانا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ متغیر ہو جانا۔ [2] اور حدیث میں فرمایا ہے کہ تارے جہنم میں گر جائیں گے، اسی طرح وہ شخص جو اللہ کے سوا معبود تھا جہنم میں جائے گا مگر عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی ماں وہ بھی اگر معبود ہونے پر راضی ہو جاتے تو جہنم میں جاتے۔ [3] (رواه ابن أبي حاتم عن يزيد بن أبي مريم) پہاڑ اپنی جگہ سے ہل کر ریت کی طرح ہو جائیں گے، زمین ایک چٹیل میدان ہو جائے گی۔ ”عِشَار“ سے مراد اونٹنیاں ہیں جو عمدہ اور حاملہ ہوتی ہیں اور بعض نے کہا مراد بادل ہے، جو آسمان اور زمین کے درمیان ہوتا ہے، وہ بے کار ہو جائے گا، اس لیے دنیا ویران ہو جائے گی یا مراد زمین کا عشر ہے۔ یا گھر رہنے بسنے کے کہ وہ اپنے لوگوں سے خالی رہ جائیں گے۔ یہ سب اقوال امام قرطبی نے اپنی کتاب ”التذكرة“ میں نقل کیے ہیں اور کہا کہ یہی راجح ہے کہ مراد ”عشار“ سے شتر ہیں، اکثر لوگوں کا قول یہی ہے۔ [4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سلف سے اس کے سوا اور کچھ معنی معروف نہیں ہیں۔ [5] واللہ أعلم.

قیامت کے دن وحشی جانور جمع کر دیے جائیں گے:

حشرِ وحوش سے مراد صحرا کے حیوانات کا جمع ہونا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓىِٕرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴾ [الأنعام: ٣٨]

”اور جتنے قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں اور جتنے قسم کے پرند جانور ہیں کہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں ان میں کوئی قسم ایسی نہیں جو تمھاری طرح کے گروہ نہ ہوں، ہم نے دفتر میں کوئی چیز نہیں چھوڑی، پھر

---

[1] تفسير الطبري (٢٣٧/٢٤) تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٠٢/١٠، ٣٤٠٣) [2] تفسير الطبري (٢٣٩/٢٤_٢٤٠)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٠٥/١٠) یہ روایت مرسل ہے۔ [4] التذكرة للقرطبي (٢٤٠/١) [5] تفسير ابن كثير (٦١١/٤_٦١٢)

سب اپنے پروردگار کے پاس جمع کیے جائیں گے۔" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہر شے محشور ہو گی، یہاں تک کہ شہد کی مکھی بھی۔①

یہ قول امام ربیع بن خثیم رحمہ اللہ اور بہت سے لوگوں کا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ساری خلائق میں جو چاہے گا وہ حکم کرے گا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے حشر سے مراد موت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ حشر سے مراد موت ہوتی ہے مگر جن و انس کہ وہ قیامت کے دن کھڑے کیے جائیں گے۔ امام ربیع بن خثیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حشرِ وحوش یہ ہے کہ ان پر اللہ کا حکم صادر ہو گا۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ حشر سے مراد اختلاط ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ مراد اس سے جمع ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ﴾ [ص: ١٩] "اور پرندے بھی جمع ہوں گے۔" "أَيْ: مَجْمُوْعَةً" سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی سے کہا تھا، جہنم کہاں ہے؟ کہا: یہی بحر ہے۔ فرمایا: میں اس کو سچا سمجھتا ہوں۔ ﴿ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ﴾ [الطور: ٦]

سمندر بھڑکا دیے جائیں گے:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ بادِ دبور کو بھیجے گا، وہ دریا کو سلگا دے گی، دریا آگ ہو جائے گا۔② معاویہ بن سعید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بحرِ برکت ہے، یعنی بحرِ روم جو زمین کے وسط میں ہے اور ساری نہریں اسی میں آ کر گرتی ہیں اور بحرِ کبیر کے نیچے کنوئیں ہیں جو تانبے سے بند ہیں، قیامت کے دن سلگ اٹھیں گے۔③ یہ اثر عجیب و غریب ہے۔ سنن ابی داود میں مروی ہے کہ دریا پر سوار نہ ہو مگر حاجی یا عمرہ کرنے والا یا غازی، کیوں کہ دریا کے نیچے آگ ہے۔④ امام مجاہد اور حسن بن مسلم رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ "سُجِّرَتْ" سے مراد "أُوْقِدَتْ" ہے، یعنی دریا سلگا دیے جائیں گے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: سوکھ جائیں گے۔ امام ضحاک اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ پانی ان کی تہہ میں چلا جائے گا، ایک قطرہ بھی باقی نہ رہے گا۔ پھر امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ بہہ نکلیں گے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفتوح ہو جائیں گے۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا: فائض ہوں گے۔

روحوں کو جسموں سے ملا دیا جائے گا:

تزویجِ نفوس سے یہ مراد ہے کہ ہر شکل اپنی نظیر کے ساتھ جمع کی جائے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ ﴾⑤ [الصافات: ٢٢] "ظالموں کو اور ان کے ہمراہیوں کو جمع کرو۔"

---

① تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٠٥) ② تفسير الطبري (٢٤/٢٤١، ٢٤٢) ③ تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٠٥، ٣٤٠٦)

④ سنن أبي داود (٢٤٨٩) اس کی سند میں "بشیر بن مسلم اور بشر ابو عبداللہ" مجہول راوی ہیں۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٤٧٨)

⑤ تفسير الطبري (٢٤/٢٤٣) تفسير ابن كثير (٤/٦١٢)

سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ ہر آدمی اسی قوم کے ہمراہ ہوگا جن کی طرح عمل کرتا تھا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴾ [الواقعة: ۷- ۱۰] ''اور تم تین جماعتوں میں ہو جاؤ گے، پس داہنے ہاتھ والے کیسے اچھے ہیں داہنے ہاتھ والے! اور بائیں ہاتھ والے کیا حال ہے بائیں ہاتھ والوں کا! اور جو آگے والے ہیں وہ تو آگے والے ہی ہیں!'' یہ لوگ ایک قسم کے ہوں گے۔[1] (رواه ابن أبي حاتم)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے خطبے میں اس آیت کو پڑھ کر کہا تھا کہ تزویجِ نفوس یہ ہے کہ ہر گروہ اپنے گروہ کی طرف جمع کیا جائے گا۔ دوسری روایت ہے کہ مراد وہ دو آدمی ہیں جو ایک سا عمل کرتے تھے وہ جنت میں جائیں گے یا جہنم میں۔ تیسری روایت یہ ہے کہ صالح آدمی کو صالح کے ساتھ اور بد آدمی کو بد کے ساتھ بہشت میں یا آگ میں اکٹھا کریں گے۔ چوتھی روایت یہ ہے کہ لوگوں سے کہا: تم اس آیت کی کیا تفسیر کرتے ہو؟ سب خاموش رہے۔ کہا: میں جانتا ہوں کہ ہر آدمی کا جوڑ اس کی نظیر کے ساتھ ملایا جائے گا، اہلِ جنت کے ساتھ یا اہلِ نار کے ساتھ، پھر یہ آیت پڑھی ﴿ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ ﴾[2] [الصافات: ۲۲]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس سے مراد تزویجِ ثلاثہ ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: امثال ہیں جن کو یکجا کریں گے۔ یہی قول امام ربیع بن خثیم، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ کا ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے[3] اور یہی صحیح بھی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ دونوں صیحوں کے درمیانی وقفے میں پانی کا ایک جنگل عرش کی جڑ سے بہے گا اور دونوں صیحوں کے درمیان مدت کی مقدار چالیس سال ہے۔ ہر چیز جو انسان، پرندوں اور چوپایوں سے بوسیدہ ہوگئی ہے وہ اُگے گی۔ اگر کوئی گزرنے والا جوان کو پہلے سے پہچانتا تھا، ان پر گزرے تو اب بھی روئے زمین پر ان کو پہچان لے گا کہ وہ پھر اُگے ہیں، پھر ہوائیں چلیں گی اور اجساد کے جوڑے مل جائیں گے۔ یہ مطلب ہے اس آیت کا ﴿ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ﴾ امام ابو العالیہ، عکرمہ، سعید بن جبیر، شعبی اور حسن رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ مراد تزویجِ ابدان ہے۔[4] بعض نے کہا ہے کہ مراد مومنین کی حورِ عین کے ساتھ تزویج ہے اور کفار کی تزویج شیاطین کے ساتھ۔

قیامت کے دن زندہ درگور کی ہوئی بیٹی سے سوال کیا جائے گا:

اس کو امام قرطبی رحمہ اللہ نے تذکرہ میں بیان کیا ہے۔[5] ''موؤدة'' وہ بیٹی ہے جس کو اہلِ جاہلیت مٹی میں دفن کر

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳٤۰۷/۱۰) اس کی سند میں ''ولید بن ابی ثور'' ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۳٤۰٦/۱۰)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۲٤٦،۲٤٥/۲٤) [4] تفسیر ابن أبي حاتم (۳٤۰٦/۱۰) تفسیر ابن کثیر (٦۱۳)

[5] التذكرة للقرطبي (۲٤۰/۱)

دیتے تھے، وہ قیامت کے دن کھڑی کی جائے گی اور اس سے پوچھا جائے گا کہ تو کس بات پر ماری گئی تھی؟ اس میں قاتل کے لیے سخت سرزنش ہے اور دھمکی ہے، کیوں کہ جب مظلوم سے پوچھا گیا تو پھر قاتل کا کیا ٹھکانا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بجائے ﴿ سُىِٕلَتْ ﴾ کے "سَأَلَتْ" پڑھا ہے، یعنی وہ اپنے خون کا دعویٰ کرے گی۔ امام ابو الضحیٰ، سدی اور قتادہ رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[1] "مَوْؤُدَةُ" کے متعلق بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ جذامہ بنت وہب رضی اللہ عنہا سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے "عزل" کا سوال کیا گیا۔ فرمایا: یہ وادِ خفی ہے، یعنی خفیہ طور پر زمین میں گاڑنا۔[2] (رواه أحمد ومسلم وأهل السنن)

سلمہ بن یزید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «اَلْوَائِدَةُ وَالْمَوْؤُدَةُ فِي النَّارِ إِلَّا أَنْ يُدْرِكَ الْوَائِدَةَ الْإِسْلَامَ فَيَعْفُو اللّٰهُ عَنْهَا »[3] (رواه أحمد والنسائي) یعنی وہ عورت جس نے کسی بیٹی کو زندہ درگور کیا وہ اور بیٹی دونوں آگ میں جائیں گی مگر یہ کہ زندہ درگور کرنے والی مسلمان ہو جائے اور اللہ اس سے درگزر فرمائے۔ حسناء دختر معاویہ نے اپنے چچا سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ "اَلْمَوْؤُدَةُ فِي الْجَنَّةِ"[4] (رواه أحمد) امام حسن رحمہ اللہ سے مروی حدیث میں بھی رفعاً اسی طرح آیا ہے۔[5] (رواه ابن أبي حاتم مرسلا) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ مشرکین کے اطفال جنت میں ہوں گے جس نے یہ زعم کیا کہ وہ آگ میں جائیں گے اس نے اللہ کے قول کی تکذیب کی:

﴿ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ﴾[6]

زندہ درگور کی ہوئی بچیوں کا کفارہ:

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قیس بن عاصم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہا کہ میں نے جاہلیت میں اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کیا ہے۔ فرمایا: ہر ایک کے عوض ایک گردن آزاد کر۔ کہا: اے اللہ کے رسول! میں اونٹوں والا ہوں، فرمایا: ہر ایک کی طرف سے ایک اونٹ نحر کر۔[7] (رواه عبدالرزاق)۔ دوسری روایت میں ہے کہ اس نے آٹھ لڑکیاں جاہلیت میں زندہ درگور کی تھیں۔ اس کو فرمایا کہ ہر ایک کی طرف سے ایک اونٹ کی قربانی کر۔[8] تیسری روایت یہ ہے کہ جاہلیت میں بارہ یا تیرہ بیٹیاں ماری تھیں۔ فرمایا: اتنی ہی جانیں آزاد کر، اس نے ایسا ہی کیا۔

پھر آئندہ سال سو (۱۰۰) ناقے (اونٹ) لے کر آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! یہ میری قوم کا صدقہ ہے اس

---

[1] تفسیر الطبري (٢٤٦/٢٤) تفسیر ابن کثیر (٦١٣/٤) [2] صحیح مسلم (١٤٤٢) مسند أحمد (٤٣٤/٦)

[3] مسند أحمد (٤٧٨/٣) سنن النسائي الکبریٰ (٥٠٧/١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحیح" (مجمع الزوائد: ٣٦٧/١)

[4] سنن أبي داود (٢٥٢١) مسند أحمد (٥٨/٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (صحیح أبي داود: ٢٨٠/٧)

[5] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٤٠٦/١٠) یہ روایت مرسل ہے۔ [6] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٤٠٦/١٠)

[7] مسند البزار (٦٠/١) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٣٢٩٨) [8] المعجم الکبیر (٣٣٧/١٨)

کے بعد کہ جو کچھ میں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا۔ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے ان ناقوں کا نام قیسیہ رکھا تھا، ہم ان کو پالتے تھے۔ [1]

جب اعمال نامے کھولے جائیں گے، آسمان کی کھال اتاری جائے گی، جب جہنم بھڑکائی اور جنت قریب کی جائے گی:

امام ضحاک رحمہ اللہ نے نشرِ صحف کے بارے میں کہا ہے کہ ہر انسان کو اس کا نامۂ اعمال دائیں یا بائیں ہاتھ میں ملے گا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اے ابن آدم! تیرا نامۂ اعمال صحیفے میں لکھ کر تہہ کر دیا جاتا ہے، پھر قیامت کے دن تجھ پر کھولا جائے گا، اب ہر آدمی دیکھے کہ اس کے نامۂ اعمال میں کیا لکھا جاتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كُشِطَتْ ﴾ بہ معنی ''أُجْتُذِبَتْ'' ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی ''كُشِفَتْ'' ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا چھلکا اتارا جائے گا تو وہ باقی نہ رہے گا۔ تسعیرِ جحیم سے مراد گرم کرنا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دوزخ سلگائی جائے گی اس کا سلگنا اللہ کے غضب سے اور بندوں کی خطاؤں سے ہوگا۔

﴿ أُزْلِفَتْ ﴾ کے معنی قریب ہونے کے ہیں۔ امام ضحاک، ابو مالک، قتادہ اور ربیع بن خثیم رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یعنی بہشت کو اس کے اہل کے نزدیک کر دیا جائے گا۔ [2] غرضیکہ جب یہ سب امور واقع ہوں گے تو اس وقت ہر نفس جان لے گا کہ اس نے کیا کام کیا تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا ﴾ [آلِ عمران: ۳۰] ''جس دن ہر نفس (شخص) اپنی کی ہوئی نیکیوں کو اور اپنی کی ہوئی برائیوں کو موجود پالے گا، آرزو کرے گا کہ کاش! اس کے اور برائیوں کے درمیان بہت ہی دوری ہوتی۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴾ [القیامة: ۱۳] ''آج انسان کو اس کے آگے بھیجے ہوئے اور پیچھے چھوڑے ہوئے سے آگاہ کیا جائے گا۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے اس آیت پر پہنچ کر کہا، ''لِهٰذَا أُجْرِيَ الْحَدِيثُ'' [3] یعنی یہ سب کام اسی مطلب کے لیے ہوئے کہ ہر جی اپنے کیے کو جان لے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ كُوِّرَتْ ﴾ بہ معنی ''أُظْلِمَتْ'' ہے۔ [4] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پگڑی کی طرح لپیٹا جائے گا۔ [5] غرضیکہ تکویر سے مراد جھڑ پڑنا اور ٹوٹ جانا ہے۔ ''انکدار'' کے اصل معنی اوپر سے پیچھے کو کرنا ہے۔ پہاڑ ہوا میں اڑنے لگیں گے، اپنی جگہ سے دور جا پڑیں گے۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٠٧) [2] تفسير الطبري (٢٤/٢٤٩_٢٥٠) تفسير ابن كثير (٦١٤/٤، ٦١٥)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٦٠٤/١٠) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٦٠٢/١٠) [5] معاني القرآن (٢٨٩/٥)

حاملہ اونٹنیاں بے کار ہو جائیں گی، ان کا راعی (چرواہا) یا حالب (دودھ دوہنے والا) کوئی نہ ہو گا۔ وحوش (وحشی جانور) بدلہ لینے کے لیے محشور ہوں گے، پھر مٹی ہو جائیں گے، یہی حق ہے اگرچہ اشعریہ اس کے قائل نہیں ہیں۔ دریا بھڑکتی آگ بن جائیں گے یا آبِ شور آبِ شیریں سے مل کر ایک ہو جائے گا۔ یا سب دریا اور سمندر ایک ہو جائیں گے یا سوکھ جائیں گے۔ یا پانی کی ایک بوند باقی نہ رہے گی، یا پانی خون کے رنگ کا ہو جائے گا۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چھے نشانیاں دنیا میں اس صورت میں ظاہر ہوں گی کہ لوگ ان کو دیکھیں گے۔ تکویر سے تسجیر تک اور چھے نشانیاں آخرت میں ہوں گی تزویج سے ازلاف تک۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تسجیر سے مراد یہ ہے کہ دریا آگ ہو جائیں گے۔[2] تزویج یہ ہے کہ روحیں بدن سے جا ملیں، یا ہر نفس اپنے جیسے اعمال والے شخص کے نزدیک کر دیا جائے گا، یا ہر گروہ اپنے گروہ میں ملا دیا جائے، جیسے: یہود، یہود کے ساتھ۔ نصاریٰ، نصاریٰ کے ساتھ۔ مجوس، مجوس کے ساتھ۔ اسی طرح ہر عابد غیر اللہ اپنے ہم جنس کے ساتھ۔ منافق، منافق کے ساتھ، مومن، مومن کے ساتھ، یا ہر گمراہ اپنے شیطان کے ہمراہ۔ یا اصحابِ یمین ایک زوج اور اصحابِ شمال ایک زوج اور سابقین ایک زوج کر دیے جائیں گے۔ عرب میں جب کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو عار کے ڈر سے یا محتاجی اور مفلسی کے ڈر سے یا اس کو کنیز بنا لیے جانے کے خوف سے زندہ درگور کر دیتے، ایک گڑھے میں پھینک کر مٹی سے بھر دیتے اس کو واد کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس سے سوال کیا جائے گا۔ اس میں قاتل پر کمال غیظ و غضب کا اظہار ہے، گویا وہ خطاب کے لائق نہیں ہے کہ اس قصورِ عظیم کی وجہ سے اس سے بات کی جائے، لہٰذا مقتولہ ہی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس قصور میں ماری گئی ہے؟ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ قاتل کو جھڑکے کہ وہ بے چاری بے گناہ ماری گئی ہے، یا وہ اپنے قاتل کا پتا بتائے، یا یہ کہے کہ مجھے بے قصور قتل کیا گیا ہے۔ اس بنیاد پر یہ سوال تلطف ہو گا۔ سیدنا اُبی رضی اللہ عنہ کے مصحف میں "سُئِلَتْ" کے بجائے "سَأَلَتْ" آیا ہے،[3] یعنی وہ یہ کہے گی کہ تو نے مجھ کو کس گناہ پر قتل کیا ہے۔ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ مشرکین کے اطفال (جو بچے چھوٹی عمر میں فوت ہو جاتے ہیں) کو عذاب نہ ہو گا اور اس بات پر بھی دلیل ہے کہ بے گناہ کو عذاب نہیں ہوتا۔

شاہ عبد العزیز دہلوی رحمہ اللہ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ نفخِ روح کے بعد اسقاطِ حمل حکمِ وأد میں ہے۔ یہ استدلال صحیح ہے، اس لیے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے عزل کو وادِ خفی فرمایا ہے،[4] حالاں کہ ابھی نہ حمل تھا نہ روح تو چار ماہ کے بعد جبکہ بچے میں جان پڑ گئی تو حمل کا گرانا قتل کرنے کی طرح ہے، گو اس جگہ اس پر قصاص جاری

[1] الدر المنثور (٤٢٧/٨)
[2] الدر المنثور (٤٢٩/٨)
[3] تفسير القرطبي (٢٣٣/١٩، ٢٣٤)
[4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

نہ ہو، لیکن وہ اس دن کہہ سکتا ہے کہ "بِأَيِّ ذَنْبٍ قَتَلْتَنِي" نامۂ اعمال کا پھیلانا حساب لینے کے لیے ہوگا، کیوں کہ موت کے وقت وہ صحائف لپیٹ کر رکھ دیے جاتے ہیں جب حشر کا دن ہوگا، تب وہ صحیفے کھولے جائیں گے، تاکہ ہر انسان اپنے عمل کو جان لے۔ اس وقت وہ یہ کہے گا: ﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا﴾ [الکھف: ٤٩] "یہ کیسی کتاب ہے جس نے کوئی چھوٹا بڑا بغیر گھیرے کے باقی ہی نہیں چھوڑا۔"

آسمان اپنی جگہ سے سرک جائیں گے یا بالکل معدوم ہو جائیں گے جس طرح بکری کی کھال ادھیڑتے ہیں، یا چھت توڑتے ہیں، اسی طرح آسمانوں کا حال ہوگا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لپیٹ کر رکھ دیے جائیں گے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو ان کے اندر ہے وہ مکشوف ہو جائے گا۔[1] جہنم کو گرم کریں گے، وہ اللہ کے دشمنوں کے لیے معمول سے زیادہ بھڑک اٹھے گی۔ جنت کو متقیوں کے قریب کر دیں گے، تاکہ با آسانی اس میں داخل ہوں دور چل کر جانا نہ پڑے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آراستہ کی جائے گی،[2] لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ "زلفی" کے معنی قریب ہیں، اس وقت ہر شخص اپنے عمل کو معلوم کر لے گا کہ اس نے دنیا کی زندگی میں کیا کیا کیا تھا، یہ جاننا صحیفوں کے نشر کے وقت، یا موقفِ حساب کے وقت، یا میزان کے نزدیک ہوگا۔ ہر عمل خواہ وہ اچھا ہو یا برا آنکھوں کے سامنے آ جائے گا۔[3]

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ﴿١٥﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿١٦﴾ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿١٧﴾ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴿١٨﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿١٩﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿٢٠﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿٢١﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿٢٢﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿٢٣﴾ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿٢٤﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿٢٥﴾ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿٢٦﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٧﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿٢٨﴾ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٩﴾

چنانچہ میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے ⑮ چلنے والے، چھپ جانے والے تاروں کی ⑯ اور رات کی جب وہ چلی جاتی ہے ⑰ اور صبح کی جب وہ روشن ہوتی ہے ⑱ بے شک یہ (قرآن) رسولِ کریم (جبریل) کا قول ہے ⑲ جو بڑی قوت والا عرش والے کے نزدیک بلند مرتبہ ہے ⑳

① تفسیر البغوي (٨/٣٤٨)　② فتح القدير (٥/٥١٨)　③ فتح البيان (١٥/٩٣_١٠٢)

وہاں (آسمانوں میں) اس کی اطاعت کی جاتی ہے، امین ہے ㉑ اور (اے اہلِ مکہ!) تمھارا ساتھی (محمد) دیوانہ نہیں ㉒ یہ (نبی) تو اس (جبریل) کو روشن اُفق پر دیکھ چکا ہے ㉓ اور وہ غیب (کی باتوں) پر بخیل نہیں ہے ㉔ اور یہ (قرآن) کسی مردود شیطان کا قول نہیں ㉕ پھر تم کدھر چلے جا رہے ہو ㉖ یہ تو سب جہانوں کے لیے نصیحت ہے ㉗ تم میں سے اس کے لیے جو بھی سیدھی راہ پر چلنا چاہے ㉘ اور اللہ رب العالمین کے چاہے بغیر تم (کچھ بھی) نہیں چاہ سکتے ㉙

خنس وکنس کا مفہوم:

آسمان سے سات تارے جدی چال چلتے ہیں، ان میں سورج اور چاند کے سوا پانچ جو ہیں، یعنی زحل، مشتری، مریخ، زہرہ، عطارد، ان کی چال اس طرح سے ہے کہ کبھی مغرب سے مشرق کو چلیں، یہ سیدھی راہ ہوئی، کبھی ٹھٹھک کر الٹے پھریں، کبھی سورج کے پاس آ کر کتنے دنوں تک غائب رہیں۔ پھر جبریل علیہ السلام کی صفت بیان کی۔ انتہیٰ.

سیدنا عمرو بن حریث رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صبح کی نماز پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں یہ سورت تلاوت کی۔[1] (رواه مسلم والنسائي)۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ خنس وکنس وہ ستارے ہیں جو رات کو پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور دن کو نکلتے ہیں۔ دوسرا قول اس کے برعکس ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم کا قول یہ ہے کہ ان سے مراد نجوم ہیں۔ بکر بن عبداللہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نجوم دراری ہیں جو مشرق کی طرف چلتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ تارے جب چھٹکتے ہیں تو ان کو خنس کہتے ہیں، یہ اپنے فلک میں چلتے پھرتے ہیں اور جب ڈوبتے ہیں تو ان کا نام خنس ہوتا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ''خنس وکنس'' سے مراد وحشی گائے ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ہرن ہیں۔ امام سعید، مجاہد اور ضحاک رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا جابر بن زید رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مراد ہرن اور گائے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے توقف کیا ہے کہ مراد نجوم ہیں یا ضیاء یا وحشی گائے۔ پھر کہا: احتمال ہے کہ یہ سب مراد ہوں۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿عَسْعَسَ﴾ سے مراد رات کا اندھیرا ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبکہ اس (رات) کا آغاز ہو۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبکہ وہ لوگوں کو ڈھانپ لے۔ یہی قول امام عطیہ رحمہ اللہ کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب پشت پھیرے، یہی قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا ہے۔ امام قتادہ، ضحاک، زید بن اسلم اور ان کے فرزند عبدالرحمان رحمہم اللہ

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٥٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٥٠٧/٦)

② تفسير الطبري (٢٤/٢٥١_٢٥٥) تفسير ابن كثير (٦١٥/٤، ٦١٦)

بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک ﴿عَسْعَسَ﴾ سے مراد اقبالِ لیل (رات کا شروع حصہ) ہے، اگرچہ اس کا استعمال ادبار (آخری حصے) میں بھی ہو، لیکن اس جگہ یہی اقبال زیادہ مناسب ہے،[1] گویا اللہ نے رات کی اور رات کے اندھیرے کی قسم کھائی ہے، جبکہ رات آئے اور فجر کی اور فجر کی روشنی کی قسم کھائی ہے، جبکہ صبح چمکے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَالَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى ۝ وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلّٰى﴾ [الليل: ١- ٢] ''قسم ہے رات کی جب چھا جائے اور قسم ہے دن کی جب روشن ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿وَالضُّحٰى ۝ وَالَّيْلِ إِذَا سَجٰى﴾ [الضحیٰ: ١- ٢] ''قسم ہے چاشت کے وقت کی اور قسم ہے رات کی جب چھا جائے۔'' نیز فرمایا: ﴿فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا﴾ [الأنعام: ٩٦] ''وہ صبح کا نکالنے والا ہے اور اس نے رات کو راحت کی چیز بنایا ہے۔'' اس کے سوا اور آیتیں بھی ہیں۔

علمائے اصول کہتے ہیں کہ لفظِ ﴿عَسْعَسَ﴾ اقبال و ادبار دونوں میں مشترک ہونے کی وجہ سے مستعمل ہوتے ہیں، اس بنیاد پر اس سے دونوں کا مراد ہونا بھی صحیح ہے۔ واللہ أعلم. امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تنفسِ صبح سے مراد طلوعِ فجر ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: جبکہ سامنے آئے اور روشن ہو جائے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: جبکہ اٹھان پر ہو، سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ضوئے نہار (دن کی روشنی) ہے جبکہ روبرو آئے اور ظاہر ہو جائے۔

قرآنِ کریم جبریل علیہ السلام کے ذریعے نازل ہوا:

پھر فرمایا کہ یہ قرآن رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ ہے، یعنی اس کو ایک شریف ذات، اچھے اخلاق والے اور خوبصورت فرشتے نے پہنچایا ہے، وہ جبریل علیہ السلام ہیں۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، میمون بن مہران، حسن، قتادہ، ربیع بن انس اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔[2]

ان کو صاحبِ قوت فرمایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى﴾ [النجم: ٥-٦] ''اسے پوری طاقت والے فرشتے نے سکھایا جو زور آور ہے۔'' یعنی وہ شدید الخلق، شدید البطش اور شدید الفعل ہے۔ پھر کہا: وہ صاحبِ عرش کے نزدیک عزت و مکانت و رفیع منزلت والے ہیں۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبریل علیہ السلام نور کے ستر (٧٠) پردوں کے اندر بغیر اذن چلے جاتے ہیں، ان کو صدر پروانگی ہے، وہ مطاع ہیں، یعنی صاحب وجاہت ہیں، ان کی بات ملائے اعلیٰ میں سنی جاتی ہے، سب فرشتے اس کو قبول کرتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آسمانوں میں مطاع ہیں،[3] یعنی وہ کچھ ادنیٰ ملائکہ میں سے نہیں ہیں، بلکہ سادات اور

---

[1] تفسير الطبري (٢٤/٢٥٥_٢٥٧) تفسير ابن كثير (٤/٦١٦) [2] تفسير الطبري (٢٤/٢٥٧_٢٥٩) تفسير ابن كثير (٤/٦١٦)
[3] تفسير الطبري (٢٤/٢٥٩)

اشراف میں سے ہیں ان کو رسالتِ عظیمہ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ امانت دار باوقار ہیں۔ یہ ایک دوسرا عظیم رتبہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو رسولِ ملکی (فرشتوں میں رسول) ٹھہرایا جس طرح کہ محمد ﷺ کو رسولِ بشری بنایا ہے۔ ''صاحب'' سے اس جگہ اللہ کے رسول ﷺ مراد ہیں۔

اللہ پاک نے ان سے جنون کی نفی فرمائی کہ یہی قول امام شعبی، میمون اور ابو صالح رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔[1]

نبی اکرم ﷺ نے ان کو آسمان کے کنارے پر ان کی اصلی صورت پر دیکھا تھا، ان کے چھ سو پر تھے۔ یہ دیکھنا پہلی بار بطحاء میں تھا، جس کا ذکر اس آیت میں آیا: ﴿ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ﴾ [النجم: ٥-١٠] ''اسے پوری طاقت والے فرشتے نے سکھایا ہے جو زور آور ہے پھر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اور وہ بلند آسمان کے کناروں پر تھا۔ پھر نزدیک ہوا اور اتر آیا۔ چنانچہ وہ دو کمانوں کے بقدر فاصلے پر رہ گیا، بلکہ اس سے بھی کم۔ چنانچہ اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو بھی پہنچائی۔''

اس بات پر کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں دلیل یہ ہے کہ اس سورت کا نزول شبِ معراج سے پہلے ہوا ہے، کیوں کہ اس میں فقط اسی روایت کا ذکر ہے۔ پس یہ پہلی بار کا دیکھنا تھا اور دوسری بار کا دیکھنا یہ تھا: ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴾ [النجم: ١٣-١٦] ''اسے تو ایک مرتبہ اور بھی دیکھا تھا، سدرۃ المنتہیٰ کے پاس، اسی کے پاس جنت الماویٰ ہے، جبکہ سدرہ کو چھپائے لیتی تھی، وہ چیز جو اس پر چھا رہی تھی۔'' یہ سورۃ النجم میں آیا ہے، نجم سورت بنی اسرائیل کے بعد نازل ہوئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ وحی کی تعلیم میں بخیل نہیں ہیں:

پھر فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ اس تنزیل میں متہم نہیں ہیں، بلکہ یہ سچ مچ ان پر اتری ہے، یہ معنی ہیں لفظ ''ظنین'' کے ظائے معجمہ سے اور بعض نے اس کو ضاد سے پڑھا ہے، اس کے معنی بخیل ہیں، یعنی وہ یہ ہر کسی کو عطا کر دیتے ہیں۔ امام ابن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظاء اور ضاد برابر ہیں، یعنی وہ دروغ گو اور فاجر نہیں ہیں، بلکہ صادق و صالح ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن غیب تھا، اللہ نے اس کو محمد ﷺ پر اتارا، آپ ﷺ نے اس میں ذرا بخل نہ کیا، بلکہ اس کو نشر کیا جس کسی نے اس کو لینا چاہا اس کو پہنچا دیا۔ یہی قول امام عکرمہ، ابن زید رحمہما اللہ اور کئی ایک اہلِ علم کا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے قراءتِ ضاد کو اختیار کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں قراءتیں متواتر ہیں اور دونوں کے معنی صحیح ہیں۔[2]

---

[1] تفسير الطبري (٢٥٩/٢٤) تفسير ابن كثير (٦١٧/٤) [2] تفسير الطبري (٢٦١/٢٤، ٢٦٢) تفسير ابن كثير (٦١٧/٤)

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ قرآن کسی شیطان رجیم کا قول نہیں ہے، شیطان میں اس کو اٹھانے کی اور ارادے کی قوت کہاں سے آ سکتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ﴾ [الشعراء: ۲۱۰- ۲۱۲] ''نہ وہ اس کے قابل ہیں نہ انھیں اس کی طاقت ہے، بلکہ وہ تو سننے سے بھی محروم کر دیے گئے ہیں۔'' پھر فرمایا: تمھاری عقل کدھر گئی جو تم اس قرآن کو جھٹلاتے ہو حالاں کہ یہ نہایت ظاہر اور واضح ہے اور سچ مچ اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس جب قوم بنی حنیفہ کے ایلچی مسلمان ہو کر آئے تو کہا: مسیلمہ کذاب کے قرآن کو پڑھو، وہ غایت ہذیان و رکاکت (انتہائی بکواس اور کمینگی) سے بھرا تھا، سن کر کہا: "وَيحَكُمْ أَيْنَ تَذْهَبُ عُقُوْلُكُمْ وَاللّٰهِ إِنَّ هٰذَا الْكَلَامَ لَمْ يَخْرُجْ مِنْ عَالٍ، أَيْ: مِنْ إِلٰهٍ" یعنی تمھاری عقل کہاں گئی، واللہ! یہ کلام اللہ کی طرف سے نہیں نکلا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم کتاب اور اللہ کی طاعت سے کدھر جاتے ہو۔[1]

قرآنِ کریم جہانوں کے لیے نصیحت ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ قرآن ذکر ہے، سب لوگوں کے لیے جس سے وہ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ جو کوئی یہ چاہے کہ ہدایت کی راہ پر آئے، اس پر اس قرآن کا پڑھنا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے، کیوں کہ یہ نجات اور ہدایت کا خزانہ ہے۔ اس کے سوا کسی اور چیز میں ہدایت نہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ چاہنا کچھ تمھارے بس میں نہیں ہے کہ جو شخص چاہے وہ ہدایت یاب ہو یا گمراہ ہو جائے، بلکہ یہ سب رب العالمین کی مشیت کے تابع ہے، وہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ سلیمان بن موسیٰ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴾ تو ابوجہل نے کہا کہ یہ امر ہمارے اختیار کا ٹھہرا کہ اگر ہم چاہیں مستقیم ہوں اور اگر چاہیں مستقیم نہ ہوں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی: ﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ "خنس" سے مراد کواکب ہیں جو دن کو چھپ جاتے ہیں، جیسے: زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد۔ ان کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ سب ستاروں میں سے یہی سورج کا استقبال کرتے ہیں اور کہکشاں کو کاٹتے ہیں۔ صحاح میں کہا ہے کہ یہی سیارے ہیں جس طرح ہرن اپنی غار میں چھپا ہوتا ہے، اسی طرح یہ پانچوں کواکب دن کو چھپ جاتے ہیں۔[3] بعض نے کہا ہے کہ یہ کواکبِ متحیرہ ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بجائے مریخ کے بہرام کا نام لیا ہے اور کہا کہ ان کے سوا اور کوئی قاطع مجرہ (کہکشاں) نہیں ہوتا ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (۲٦٢/۲٤، ۲٦۳) [2] تفسير الطبري (۲٦٤/۲٤) [3] الصحاح للجوهري (٦۳/٤)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ سات ستارے ہیں اور سورج اور چاند کو زیادہ کیا۔ ان کے خنوس سے مراد رجوع ہے اور کنوس سے مراد دن کو غائب ہونا۔[1] ان کو جواری فرمایا، یعنی رات کو ظاہر ہوتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ''خنس'' گائے ہے اور ''کنس'' ہرن، اور کسی نے کہا ہے کہ ان سے مراد فرشتے ہیں، مگر پہلی بات زیادہ مناسب ہے، اس لیے کہ ان کے بعد شب اور صبح کا ذکر آیا ہے۔ مفسرین نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ ﴿عَسْعَسَ﴾ سے مراد ''أدبر'' ہے، اگرچہ اصل میں یہ لفظ اقبال اور ادبار کے درمیان مشترک ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لفظ اضداد لغات میں سے ہے اور دونوں معنی کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی رات کے شروع میں جب اندھیرے کی ابتدا ہوتی ہے اور رات کے آخر میں جب اندھیرا رخصت ہوتا ہے۔[2] تنفسِ صبح سے یہ مراد ہے کہ صبح دراز ہو کر دن روشن ہو جائے۔

یہ قرآن رسولِ کریم ﷺ، یعنی جبریل علیہ السلام کا قول ہے۔ اس کی اضافت جبریل علیہ السلام کی طرف اس لیے کی کہ ان کی معرفت اترا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کلام ان کو دے کر نبی اکرم ﷺ کے پاس بھیجا۔ ان کو صاحبِ قوت فرمایا، ان کو ایک قوت یہ تھی کہ انھوں نے قومِ لوط علیہ السلام کے چار گاؤں آبِ سیاہ سے اکھیڑ کر ایک بازو پر آسمان تک اٹھا کر پلٹ مارے۔ ہر بستی میں ایک لاکھ آدمی تھے۔ قومِ ثمود پر ایک ایسی چیخ ماری کہ سب کے سب گھٹنوں کے بل مر کر رہ گئے۔ ایک پل مارنے میں آسمان سے زمین پر آ کر پھر چلے جاتے ہیں۔ صاحبِ عرش کے نزدیک ان کی بڑی عزت ہے، سب فرشتے ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس اطاعت میں سے ایک بات یہ تھی کہ شبِ معراج میں جب حکم دیا جاتا تو آسمان کے دروازے کھول دیے اور جنت کے خزنہ (دربانوں) نے جنت کے دروازے کھول دیے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان والوں پر جبرائیل علیہ السلام کی اطاعت کو فرض کر دیا ہے جس طرح کہ اہلِ ارض پر نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کو فرض کر دیا ہے،[3] پھر انِ کو وحی پر امین ٹھہرایا۔ بعض نے کہا ہے کہ ''رسول'' سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں کہ وہ تبلیغ رسالت میں صاحبِ قوت اور مطاع اور اللہ کے امین ہیں، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ پھر اہلِ مکہ کو خطاب کیا کہ تمھارا صاحب، یعنی محمد ﷺ مجنون نہیں ہیں۔ لفظِ صاحب اس لیے ذکر کیا کہ وہ آپ ﷺ کے حال سے واقف تھے اور کسی نے اس سے پہلے ان پر دیوانگی کی تہمت نہیں لگائی تھی۔ اب قرآن کے اترنے پر ان کو مجنون کہنے لگے، حالاں کہ خوب جانتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ عقلمند اور کامل ہیں اور کچھ اپنی طرف سے اس کتاب کو بنا کر نہیں لائے، غرض یہ کہ مطلب ان کے افتراء اور جھوٹ کا رد کرنا ہے۔ غور کرنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جبریل علیہ السلام کی اس تعریف میں رسول اللہ ﷺ کی تعظیم مندمج (شامل، ٹھسی ہوئی) ہے۔ گویا ان کا درجہ اس حد تک بلند ہے کہ جبریل علیہ السلام جیسا شخص ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان سفیر قرار پایا۔

---

[1] الدر المنثور (٤٣١/٨) [2] تفسير القرطبي (٢٣٨/١٩) [3] فتح البيان (١٠٦/١٥)

پھر فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو مطلعِ شمس پر مشرق کی جانب دیکھا، کیوں کہ جس افق سے سورج نکلتا ہے وہ افقِ مبین ہے، اسی طرف سے سب چیزیں نظر آتی ہیں۔ یا افقِ مبین سے مراد آسمان کے سارے کنارے اور اطراف ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو بارہا دیکھا تھا، لیکن اس مرتبہ ان کو اصلی صورت میں دیکھا، ان کے چھے سو پر تھے۔ امام سفیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آسمان کے مشرقی افق پر دیکھا جہاں سے سورج نکلتا ہے۔ امام ابن جریر نے کہا ہے کہ افق عربی آسمان میں دیکھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اجیاد کی طرف دیکھا۔ اجیاد مکہ معظّمہ کے مشرق کی طرف ہے۔[1] مبین، افق کی صفت ہے یا مرئی کی صفت ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا۔ اس کی تحقیق سورۃ النجم میں گزر چکی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ غیب وسماء پر جو اہلِ مکہ سے غائب تھے، متہم نہیں ہیں، بلکہ جو کچھ اللہ کی طرف سے پہنچاتے ہیں اس میں ثقہ اور معتمد ہیں۔ یا وحی کے پہنچانے میں بخیل نہیں ہیں۔ جس نے ظائے معجمہ سے پڑھا اس نے کہا ہے کہ متہم نہیں، جس نے ضادِ معجمہ سے پڑھا اس نے کہا ہے کہ بخیل نہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ صفت بھی جبریل علیہ السلام کی ہے، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ نبی ﷺ اس لفظ کو ظائے معجمہ سے پڑھتے تھے۔[2] (أخرجه الدارقطني والحاكم وصححه) کیوں کہ بخل کا تعدیہ بہ حرفِ باء آتا ہے نہ کہ بہ حرفِ ''علی''۔

پھر اس بات کی نفی کی کہ یہ قرآن کسی شیطان مسترق السمع (چوری چھپے سننے والے) مرجوم بالشہب (شہاب کے ساتھ رجم کیے گئے) کا کلام نہیں ہے، یعنی نہ شعر ہے نہ کہانت جس طرح کہ قریش گپ لگاتے ہیں۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شیطان سے مراد شیطان ابیض ہے جو نبی اکرم ﷺ کے پاس جبریل علیہ السلام کی صورت میں آ کر فتنے میں ڈالنا چاہتا تھا۔[3] تم لوگ کدھر جاتے ہو، تمھاری عقل کھو گئی ہے جو یہ خیالِ فاسد کرتے ہو، یہ قرآن تو سارے جہان کے لیے ایک ذکر ہے، یعنی نصیحت اور تذکیر ہے، اس شخص کے لیے جو حق وایمان پر استقامت اور طاعت کا ارادہ رکھتا ہے، لیکن یہ بات اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف صرف تمھارے چاہنے سے نہیں ہوسکتی۔ ہدایت کی توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ [يونس: ١٠٠] ''کسی شخص کا ایمان لانا اللہ کے حکم کے بغیر ممکن نہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١١١] ''اور اگر ہم ان کے پاس فرشتوں کو بھیج دیتے اور ان سے مردے باتیں کرنے لگتے اور ہم تمام موجودات

---

[1] تفسير القرطبي (١٩/٢٤١)

[2] مستدرك الحاكم (٢/٢٧٦) اس کی سند میں ''اسحاق بن عبداللہ بن ابی فروہ'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسير القرطبي (١٩/٢٤٢، ٢٤٣)

کو ان کے پاس ان کی آنکھوں کے روبرو لا کر جمع کر دیتے تب بھی یہ لوگ ہرگز ایمان نہ لاتے ہاں اگر اللہ ہی چاہے تو اور بات ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ﴾ [القصص: ٥٦] ''آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی جسے چاہے ہدایت کرتا ہے۔'' اس بارے میں آیاتِ قرآنیہ بہت ہیں، مراد یہ ہے کہ وہ ساری خلق کا مالک ہے۔[1]

[1] فتح البیان (١٥/١٠٢_١٠٩)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

سُوْرَةُ الْاِنْفِطَارِ

اس سورت کی انیس (۱۹) آیتیں ہیں، یہ مکہ میں اتری ہے۔ اس کو "سورت انفطرت" بھی کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کا قول یہی ہے کہ یہ مکی ہے۔[1] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ عشاء کی نماز بہت لمبی پڑھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَ فَتَّانٌ أَنْتَ يَا مُعَاذُ: أَيْنَ عَنْ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ وَالضُّحَى وَإِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ» (رواه النسائي) "اے معاذ! تو فتنہ برپا کرنا چاہتا ہے، ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾، ﴿وَالضُّحٰى﴾ اور ﴿إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ﴾ کیوں نہیں پڑھتے؟" اس حدیث کی اصل صحیحین میں ہے، لیکن بغیر ذکر ﴿إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ﴾ کے۔[2] پہلے یہ حدیث عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے رفعاً گزر چکی ہے: جس کو یہ بات پسند ہو کہ قیامت کے دن کو آنکھوں سے دیکھے اسے چاہیے کہ پڑھے ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾، ﴿إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ﴾ اور ﴿إِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ﴾[3]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ﴿١﴾ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ﴿٢﴾ وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿٣﴾
وَإِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ﴿٤﴾ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ ﴿٥﴾
يَآ أَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ﴿٦﴾ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ
فَعَدَلَكَ ﴿٧﴾ فِيْٓ أَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ﴿٨﴾ كَلَّا بَلْ
تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ﴿٩﴾ وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ﴿١٠﴾ كِرَامًا
كَاتِبِيْنَ ﴿١١﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿١٢﴾

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

جب آسمان پھٹ جائے گا ① اور جب تارے جھڑ جائیں گے ② اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے ③ اور جب قبریں اُکھیڑ دی جائیں گی ④ تو ہر شخص کو اس کا اگلا پچھلا کیا دھرا سب

---

[1] الدر المنثور (٨/٤٣٧) [2] صحيح البخاري (٥٧٥٥) صحيح مسلم (٤٦٥) سنن النسائي (٩٩٧)

[3] سنن الترمذي (٣٣٣٣) صحيح الجامع (٦٢٩٣)

معلوم ہو جائے گا⑤ اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے ربِ کریم کی بابت دھوکے میں ڈال رکھا ہے؟⑥ جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تجھے درست کیا اور تجھے معتدل بنایا⑦ اس نے جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا⑧ ہرگز نہیں! بلکہ تم لوگ جزا و سزا کو جھٹلاتے ہو⑨ حالاں کہ تم پر نگران (فرشتے) مقرر ہیں⑩ معزز لکھنے والے⑪ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو⑫

منظرِ آخرت:

سمندر کے بہہ نکلنے سے مراد یہ ہے کہ سمندر کا پانی زمین پر زور کرے۔ اللہ نے انسان کو ٹھیک کیا بدن میں اور خصلت میں برابر کیا۔ انتھیٰ.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے فرمایا: آسمان پھٹ جائے گا، جیسا کہ اس کا فرمان ہے: ﴿ اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ﴾ [المزمل: ١٨] ''جس (کی شدت) سے آسمان پھٹ جائے گا۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یعنی بعض دریا بعض میں مل جائیں گے اور بہہ نکلیں گے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک دوسرے میں مل کر پانی جاتا رہے گا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کھارا اور میٹھا مل جائے گا۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب لبریز ہو جائیں گے۔ قبریں کریدی جائیں گی۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنبش کریں گی جو لوگ ان کے اندر ہوں گے وہ باہر نکل پڑیں گے۔ جس وقت یہ حال ہوگا اس وقت ہر شخص اپنے عمل کو جان لے گا کہ کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔[1]

انسان اپنے ربِ کریم کے بارے میں کسی دھوکے میں مبتلا نہ ہو:

یہ ارشاد کہ اے انسان! تجھے اپنے ربِ کریم سے کس نے بہکایا، دھمکانا ہے نہ کہ جواب کی طرف ارشاد (راہنمائی) ہے جس طرح کہ بعض لوگوں نے وہم کیا ہے کہ کریم اس استفہام کا جواب ہے، یہاں تک کہ قائل یہ کہے کہ ''غَرَّهُ كَرَمُهُ'' بلکہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ اے ابن آدم! تجھ کو تیرے ربِ عظیم پر کس نے یہ جرأت دلائی کہ تو نے اس کی معصیت پر اقدام کیا اور جو بات اللہ کریم کے لائق نہ تھی تو نے اس کے ساتھ رب کا مقابلہ کیا۔ حدیث میں مروی ہے کہ اللہ قیامت کے دن فرمائے گا: «يَا ابْنَ آدَمَ مَا غَرَّكَ بِي، ابْنَ آدَمَ مَا ذَا أَجَبْتَ الْمُرْسَلِيْنَ»[2]

''ابن آدم! میرے بارے تجھے کس نے دھوکے میں مبتلا کیا، ابن آدم! تو نے رسولوں کو کیا جواب دیا؟''

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا، فرمایا: جہالت نے بہکایا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''وَاللّٰهِ غَرَّهُ جَهْلُهُ'' یعنی قسم ہے اللہ کی کہ جہل نے انسان کو دھوکا دیا۔ یہی بات سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ربیع بن خثیم اور حسن رحمہما اللہ نے بھی کہی ہے۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن آدم کو سوائے اس دشمن شیطان کے

---

[1] تفسير الطبري (٢٤/٢٦٧، ٢٦٨) تفسير ابن كثير (٤/٦١٨) [2] المعجم الأوسط (١/١٤٢)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٠٨) تفسير ابن كثير (٤/٦١٩)

کسی شے نے دھوکا نہ دیا۔[1] فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر مجھ سے کہا جائے کہ تجھ کو کس نے دھوکا دیا تو میں یہ کہوں کہ ان پردوں نے جو لٹکائے اور چھوڑے گئے ہیں۔ ابو بکر وراق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر مجھ سے یہ بات کہی جائے تو میں یہی کہوں گا کہ "غَرَّنِيْ كَرَمُ الْكَرِيْمِ" یعنی "کرمہائے تو ما را کرد گستاخ" "تیری بخششوں نے ہم کو گستاخ کر دیا۔"

امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ بعض اہلِ اشارہ نے کہا ہے کہ اس جگہ لفظ کریم فرمایا اور دوسرا کوئی نام وصفت نہ فرمایا، گویا اجابت کی تلقین ہے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس قائل کا یہ خیال لاطائل (بے فائدہ) ہے، اس لیے کہ کریم کا لفظ اس لیے لایا گیا، تاکہ اس بات پر تنبیہ کی جائے کہ کریم کا مقابلہ ان افعالِ قبیحہ و اعمالِ فجور سے کرنا کب زیبا (مناسب) تھا۔[3] امام کلبی اور مقاتل رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اسود بن شریک کے حق میں اتری ہے۔[4] ٹھیک اور برابر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو قد و قامت میں معتدل، منتصب (قائم ہونے والا) احسن ہیئات و اشکال (بہترین شکل وصورت) میں بنایا۔

بشر بن جحاش رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن نبی اکرم نے ہتھیلی پر تھوک کر اور اس پر انگلی رکھ کر فرمایا: اللہ تعالیٰ کہتا ہے: اے ابن آدم! تو کب مجھ کو عاجز کر سکتا ہے، حالاں کہ میں نے تجھ کو اس جیسی چیز سے پیدا کیا ہے، یہاں تک کہ جب تجھ کو برابر اور ٹھیک کیا اور تو دو چادروں کے درمیان چلا اور زمین کو تجھ سے وئید ہوئی۔ (قال في الجمع في معنى الوئيد هو صوت شدة الوطي على الأرض يسمع كالدوي من بعد)[5] تو تو نے جمع کیا اور منع کیا، پھر جب تیری جان گلے تک پہنچی تو تو کہنے لگا کہ اب میں صدقہ کروں، اب صدقہ کا وقت کہاں ہے؟[6] (رواه أحمد وابن ماجه) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس صورت میں چاہا ترکیب دینے سے مراد یہ ہے کہ ماں باپ خال (ماموں) وعم (چچا) میں سے جس کے مشابہ چاہتا ہے کرتا ہے۔[7]

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرد نے کہا: اے اللہ کے رسول! میری بیوی نے کالا بچہ جنا ہے۔ فرمایا: تیرے پاس اونٹ ہیں؟ کہا: ہاں! فرمایا: ان کے کیا رنگ ہیں؟ کہا: لال، فرمایا: ان میں کوئی خاکی رنگ کا بھی ہے؟ کہا: ہاں! فرمایا: یہ رنگ اس میں کہاں سے آیا؟ کہا: شاید کسی رگ نے اس کو کھینچا ہو، فرمایا: اسی طرح اس کو بھی کسی رگ نے کھینچا ہو۔[8] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اگر چاہے بندر کی صورت بنائے اور چاہے سور کی شکل

---

① تفسير الطبري (٢٦٩/٢٤) ② تفسير البغوي (٣٥٦/٨) ③ تفسير ابن كثير (٦١٩/٤)

④ تفسير البغوي (٣٥٦/٨) ⑤ مجمع بحار الأنوار (٢/٥)

⑥ مسند أحمد (٢١٠/٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٠٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٩٩)

⑦ تفسير الطبري (٢٧٠/٢٤) ⑧ صحيح البخاري (٤٩٩٩) صحيح مسلم (١٥٠٠)

میں پیدا کرے۔ یہی قول امام ابو صالح رحمہ اللہ کا ہے کہ چاہے کتے کی صورت میں بنائے، چاہے گدھے کی شکل میں یا سور کی صورت میں۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واللہ! میرا رب اس بات پر قادر ہے کہ نطفے کو بدصورت حیوانوں اور ایسی مخلوق جو بہت ناپسندیدہ ہو اس کی شکل پر ترکیب دے، لیکن وہ اپنے لطف و کرم اور حلم سے شکل کو بہت خوب و صحیح اور پوری طرح اعتدال پر اور دیکھنے میں اچھی اور خوبصورت ہیئت پر بناتا ہے۔[2]

فرشتے انسانوں کے اعمال احاطۂ تحریر میں لا رہے ہیں:

پھر فرمایا کہ تم دین کی تکذیب کرتے ہو، یعنی چونکہ تمھارے دل میں قیامت اور جزا و حساب کا انکار ہے، اس لیے اس تکذیب کی وجہ سے تم اللہ کریم کی نافرمانیاں اختیار کرتے ہو، حالاں کہ تم پر فرشتے نگہبان مقرر ہیں تو ان کے ساتھ قبائح (برے اعمال) سے مقابلہ نہ کرو، وہ تو تمھارے سارے کرتوت لکھتے رہتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے رفعاً کہا ہے تم ﴿ كِرَامًا كٰتِبِيْنَ ﴾ کا اکرام کرو جو تم سے جدا نہیں ہوتے مگر دو حالتوں کے وقت: ایک جنابت دوسری غائط۔ تم میں جب کوئی نہائے تو کسی دیوار یا اونٹ کے پیچھے چھپ جائے یا اس کا بھائی اس کو اوٹ کر لے۔[3] (رواہ البراز و وصله بلفظ آخر عنه عن ابن عباس رضی اللہ عنہما)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تم کو تعری (عریاں ہونے) سے منع کرتا ہے۔ تم فرشتوں سے شرماؤ جو تمھارے ساتھ رہتے ہیں، ﴿ كِرَامًا كٰتِبِيْنَ ﴾ ہیں، تم کو کسی حالت میں نہیں چھوڑتے مگر تین حالتوں میں: غائط (قضائے حاجت کے وقت) جنابت اور غسل میں۔ تم میں سے جب کوئی میدان میں نہائے تو کپڑے یا درخت یا دیوار یا اونٹ سے اوٹ کر لے۔[4] امام حسن بصری رحمہ اللہ انس رضی اللہ عنہ سے رفعاً راوی ہیں کہ جو کچھ دو نگہبان دن میں لکھ کر اللہ کے پاس لے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس صحیفے کے شروع اور آخر میں استغفار دیکھ کر فرماتا ہے کہ اس کے درمیانی اعمال کو میں نے بخش دیا۔[5] (رواہ البزار وسنده ضعیف) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت رفعاً یہ ہے کہ اللہ کے فرشتے ہیں، وہ بنی آدم اور ان کے اعمال کو پہچانتے ہیں، جب کسی بندے کو دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ کی اطاعت بجا لاتا ہے تو آپس میں اس کا چرچا کرتے ہیں اور کچھ نام رکھ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج کی رات میں فلاں رستگار ہوا، آج کی شب میں فلاں نے نجات پائی اور جب کسی ایسے بندے کو دیکھتے ہیں جو معصیت کرتا ہے تو آپس میں اس کا چرچا کر کے اس کا کچھ نام مقرر کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج کی رات فلاں شخص ہلاک ہوا۔ (رواہ البزار) اس کی سند میں سلام مداینی لین الحدیث ہے۔[6]

---

[1] تفسیر الطبري (٢٤/٢٨٠) [2] تفسیر ابن کثیر (٤/٦٢٠) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٠٨) یہ روایت مرسل ہے۔
[4] مسند البزار (١١/٨٩) اس کی سند میں ''حفص بن سلیمان'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعیفة: ٢٢٤٣)
[5] سنن الترمذي (٩٨١) مسند البزار (١٣/٢١٨) اس کی سند میں ''تمام بن نجیح'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعیفة: ٢٢٣٩)
[6] کشف الأستار عن زوائد البزار (٤/٦٧) اس کی سند میں ''سلام مدائنی'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعیفة: ٦٧٦٦)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ انفطارِ سماء سے مراد آسمان کا پھٹ جانا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ﴾ [الفرقان: ٢٥] ''اور جس دن آسمان بادل سمیت پھٹ جائے گا اور فرشتے لگاتار اتارے جائیں گے۔'' بعض نے کہا ہے کہ یہ شگاف نزولِ ملائکہ کے لیے ہوگا، تارے بکھر جائیں گے یعنی اپنی جگہ پر باقی نہ رہیں گے۔ دریا اعلیٰ یا اسفل (اونچائی یا نیچائی) کی طرف سے بہہ کر ایک دوسرے میں مل کر ایک سمندر ہو جائیں گے۔ اب کھارا اور میٹھا پانی مل جائے گا، جو پردہ میٹھے اور کھارے پانی کے درمیان ہے وہ زائل ہو جائے گا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ پانی سوکھ جائے گا۔[1]

قبروں کی مٹی جو دفن کے وقت ڈالی گئی تھی، وہ الگ کر دی جائے گی۔ مردے اپنی اپنی قبروں سے باہر نکل پڑیں گے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو سونا چاندی زمین کے اندر ہے وہ باہر آ جائے گا، کیوں کہ قیامت کی علامات اور شرطوں میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ زمین اپنا سونا اور چاندی اگل دے گی۔[2] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان آیتوں سے مراد یہ ہے کہ جب یہ امور واقع ہوں گے تو یہ اشراطِ قیامت ہیں۔ اس وقت حشر و نشر حاصل ہوگا یہ چار چیزیں ہیں: دو تو عالمِ علوی سے متعلق ہیں اور دو عالمِ سفلی کے متعلق ہیں۔[3] ان نشانیوں سے مراد جہاں کی ویرانی اور دنیا کا فنا ہونا اور تکالیف کا منقطع ہونا ہے۔

آسمان چھت کی طرح ہے اور زمین گھر کی طرح ہے، جب کسی گھر کو ویران کرنا اور گرا دینا چاہتے ہیں تو پہلے اس کی چھت کو توڑتے ہیں، اس لیے جب آسمان خراب ہوا تو تارے بھی بکھر جائیں گے، پھر آسمان اور تاروں کے برباد ہونے سے جو چیز کہ روئے زمین پر ہے، جیسے: دریا پہاڑ وغیرہ وہ بھی خراب ہو جائیں گے، زمین پر ویرانی آ جانے کی وجہ سے اس کے اندر جو مردے تھے، وہ باہر آ جائیں گے۔ اس وقت ہر شخص اپنے کیے ہوئے اعمال کو جان لے گا کہ اچھا کیا تھا یا برا، یہ بات صحیفوں کے نشر کرنے کے وقت ہوگی، نہ کہ بعث کے وقت، اس لیے کہ بعث سے لے کر جنت و نار میں داخل ہونے تک ایک ہی وقت ہوگا۔ تقدیم و تاخیر کے یہ معنی ہیں کہ یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ عملِ خیر کیا تھا یا شر۔ کس نیکی اور برائی کو پیچھے چھوڑا ہے اور کس کو آگے بھیجا ہے۔ اس لیے کہ جو کوئی اچھا یا برا طریقہ ایجاد کر جاتا ہے تو اس کو اس کا اجر یا بوجھ ملتا رہتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی کون سی معصیت آگے بھیجی اور کون سے طاعت پیچھے چھوڑی[4] اور کس کو موخر کیا۔ یا یہ کہ پہلے اور آخری عمل کا علم حاصل ہو جائے گا۔ یہ علم بعث کے وقت اجمالاً ہوگا۔ مطیع تو نیک بختی کے آثار اور گناہ گار بدبختی کے آثار دیکھے گا۔

---

[1] تفسير القرطبي (١٩/٢٤٤) [2] تفسير القرطبي (١٩/٢٤٤، ٢٤٥) [3] تفسير الرازي (٣١/٧٠) [4] فتح القدير (٥/٥٢٦)

سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

''جو سال عمدہ ہوتا ہے وہ اپنی بہار ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔''

رہا تفصیلی علم تو وہ اس وقت میسر آئے گا جب اعمال نامے نشر کیے جائیں گے۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جس نے کسی خیر کی راہ نکالی اور لوگ اس پر چلے تو اس کو ان لوگوں کے برابر اجر ملے گا جو اس کی پیروی کریں گے اس کے بغیر کہ ان کا اجر کچھ کم ہو۔ اور جس نے شر کی راہ نکالی اور لوگ اس پر چلے تو اس کو ان لوگوں کے برابر گناہ ملے گا جو اس کی پیروی کریں گے اس کے بغیر کہ ان کا گناہ کچھ کم ہو۔ پھر حذیفہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ﴾[1] (رواه الحاكم و صححه) ''اے انسان! تجھ کو تیرے ربِ کریم کے ساتھ کس نے فریب دیا۔''

یہ کفار کو خطاب ہے۔ یا ہر مومن، عاصی اور کافر کو علم دیا گیا ہے۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی راجح ہے[2] جس طرح کہ کتابِ کشف وغیرہ میں کہا ہے، یعنی جس اللہ نے دنیا میں تجھ پر یہ فضل و کرم کیا کہ پورا آدمی بنایا، حواس بخشے، عقل و شعور دیا، رزق عطا کیا، نعمت پر نعمت دی، جس کا تو ہرگز انکار نہیں کر سکتا تو اب کس بات پر تو کفرانِ نعمت کر رہا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے شیطان نے جو اس پر مسلط ہے اس کو دھوکا دیا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شیطان خبیث نے فریب میں لیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کی حماقت اور جہالت نے دھوکا دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ کے عفو اور حلم نے دھوکا دیا کہ جلدی سے پہلی ہی بار عقوبت نہ کی۔ یہی قول امام مقاتل رحمہ اللہ کا ہے۔[3]

''کریم'' کا ذکر دھوکا دینے کی ممانعت میں مبالغے کے لیے ہے، اس لیے کہ محض کرم اس بات کا مقتضی نہیں ہوتا کہ ظالم کو یونہی چھوڑ دیا جائے اور دوست و دشمن کو برابر سمجھا جائے اور مطیع اور عاصی کو مساوی رکھا جائے۔ پھر جب کہ اس کے ساتھ قہر اور انتقام کی صفت بھی آ گئی اور یہ جتلا دیا کہ دیکھو شیطان بڑا دغا باز اور فریب کار ہے تو اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ تو جو چاہے کر تیرا رب کرم کرنے والا ہے، وہ کسی کو نہیں ستاتا اور نہ کسی کو جلدی سے سزا دیتا ہے تو یہی اغترار (دھوکا دینا) اس کے کرم پر دلیل ہے، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اس کے کرم کی کثرت یہ چاہتی ہے کہ اس کی اطاعت میں بہت سی کشش اور کوشش کرنا چاہیے نہ یہ کہ اس کی نافرمانی میں منہمک اور غرقاب ہو جائے۔ پھر فرمایا کہ ہم نے تجھ کو ایک بوند سے پیدا کیا۔ اس سے پہلے تو کچھ چیز بھی نہ تھا، یہاں تک کہ آنکھ کان دے کر تجھے ٹھیک ٹھاک کر دیا اور برابر معتدل بنایا کہ سیدھا ہو کر چلتا ہے، خوبصورت ہے۔

---

(1) مستدرك الحاكم (٥٦١/٢) صحيح الترغيب والترهيب (١٤/١) (2) حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (٣٣١/٨)

(3) تفسير القرطبي (٢٤٥/١٩) فتح القدير (٥٢٦/٥)

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تعدیل دونوں آنکھوں اور کانوں اور ہاتھوں اور پاؤں میں ہے کہ اعضاء کو برابر رکھا،[1] جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴾ [التين: ٤] ''یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔'' پھر جس صورت میں چاہا حسین، قبیح، طویل، قصیر (اچھی، بری، لمبی، چھوٹی) جوڑ کر کھڑا کر دیا، اس کے ساتھ تم دین کو جھٹلاتے ہو اور خالق سے ڈرتے نہیں ہو، حالاں کہ تم پر نگہبان مقرر ہیں جو تمھاری تکذیب کو دور کرتے ہیں اور تمھارے اعمال ورقوں میں لکھتے جاتے ہیں گویا تمھارے احوال و افعال کے روزنامچہ نگار ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ابن آدم پر رات دن میں دو نگہبان مقرر کیے ہیں جو اس کے عمل کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کے اثر کو لکھتے ہیں۔[2] یہ خطاب اگرچہ روبرو ہے، لیکن اس پر امت کا اجماع ہے کہ یہ سارے مکلفین کے حق میں عام ہے۔

لفظ ﴿ لَحٰفِظِيْنَ ﴾ سے یہ احتمال ہے کہ اس سے تمام بنی آدم کی حفاظت مراد ہو نہ کہ ہر آدمی کے ساتھ ایک نگہبان لگا رہتا ہو، یا یہ کہ ہر شخص کے ساتھ الگ الگ ایک حافظ مقرر ہو، یا یہ کہ ایک شخص پر کئی محافظ ہوں نہ کہ ایک جس طرح کہ کہا ہے کہ دو رات کو رہتے ہیں اور دو دن کو۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک ایک پر پانچ پانچ فرشتے مقرر ہیں۔ رہے کفار کہ ان پر بھی کوئی محافظ مقرر ہے یا نہیں؟ چنانچہ ان پر کوئی مقرر نہیں، اس لیے کہ ان کا حال ظاہر ہے اور ان کا عمل ایک جیسا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ ﴾ [الرحمٰن: ٤١] ''گناہ گار صرف حلیے سے ہی پہچان لیے جائیں گے۔'' اور بعض نے کہا ہے کہ مقرر ہیں۔ ظاہرِ آیت باب یہی ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ﴾ [الانشقاق: ١٠] ''ہاں جس شخص کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ان کے لیے بھی نامۂ اعمال ہے اور ان پر بھی نگہبان مقرر ہیں جو کچھ بندہ عمل کرتا ہے، وہ اس کو نہایت امانت و دیانت سے لکھتے ہیں اور ان کے اعمال میں جو کچھ استقرار (مستقل عمل) اور تجدد (نیا عمل) ہوتا ہے اس کا ان کو علم رہتا ہے۔ آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ گواہ کی گواہی علم کے بعد ہوتی ہے، کیوں کہ جب فرشتوں کی یہ صفت ہے کہ وہ بندوں کے افعال کے حافظ اور عالم ہیں تو لکھنے کی وجہ سے وہ عالم ٹھہرے اسی علم کی بنا پر وہ شہادت ادا کریں گے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں ان کے حال سے تعجب ہے کہ وہ تو یوم الدین کو جھٹلانے والے ہیں اور ملائکہ موکل ان کے اعمال لکھتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ قیامت کے دن ان سے ان اعمال کا حساب لیا جائے گا اور اسی طرح کا اللہ کا یہ فرمان ہے: ﴿ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ

[1] فتح القدير (٥/٥٢٦) [2] تفسير الطبري (٢٢/٣٤٤)

﴿رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾[1] [ق: ۱۷-۱۸] ”ایک دائیں طرف اور ایک بائیں طرف بیٹھا ہوا ہے (انسان) منہ سے کوئی لفظ نکال نہیں پاتا مگر کہ اس کے پاس نگہبان تیار ہے۔“ ملائکہ پر ثنا کرنے میں اللہ کے نزدیک جزا کے معاملے کی تعظیم ہے۔ یہ جزا بہت بڑے امور میں سے ہے۔ چنانچہ اس آیت میں مجرمین کے لیے انذار اور ڈراوا ہے اور متقین کے لیے لطف و کرم کا اظہار ہے۔ فضیل رحمہ اللہ جب اس آیت کو پڑھتے تو کہتے: ”مَا أَشَدَّهَا مِنْ آيَةٍ عَلَى الْغَافِلِيْنَ“[2] یعنی یہ آیت اہلِ غفلت کے حق میں بہت ہی سخت اور درشت ہے۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿١٣﴾ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ﴿١٤﴾ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ﴿١٥﴾ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ﴿١٦﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ﴿١٧﴾ ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ﴿١٨﴾ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ ﴿١٩﴾

یقیناً نیک لوگ ضرور نعمتوں میں ہوں گے ⑬ اور یقیناً بدکار لوگ ضرور دوزخ میں ہوں گے ⑭ وہ روزِ جزا کو اس میں داخل ہوں گے ⑮ اور وہ اس سے غائب (دور) نہ ہو سکیں گے ⑯ اور آپ کو کیا خبر کہ روزِ جزا کیا ہے؟ ⑰ پھر آپ کو کیا خبر کہ روزِ جزا کیا ہے؟ ⑱ اس دن کوئی شخص کسی کے لیے کچھ بھی اختیار نہ رکھے گا اور اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا ⑲

نیکوں اور بدوں کی جزا وسزا:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خبر دی ہے کہ نیک لوگوں کا انجام نعیم ہوگا، یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی اطاعت کرتے ہیں اور معاصی سے اس کا مقابلہ نہیں کرتے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا نام ابرار رکھا ہے، اس لیے کہ انھوں نے آباء اور ابناء سے نیکی کی ہے۔[3] (رواہ ابن عساکر)۔ پھر فرمایا کہ فاجروں اور فاسقوں کا انجام دوزخ کی آگ اور عذابِ مقیم ہوگا، لہٰذا وہ اس دن آگ کے اندر گھسیں گے اور ایک لمحے کے لیے بھی اس عذابِ الیم سے دور نہ ہوں گے، نہ ہی ان کے عذاب میں کچھ کمی کی جائے گی اور نہ ہی موت کے متعلق ان کا سوال قبول ہوگا، ایک دن بھی آرام نہ پائیں گے۔ یہ ارشاد کرنے میں کہ تجھے اس دن کی کیا

① تفسير الرازي (۳۱/۷۵) ② تفسير النسفي (۳۲۲/٤) فتح البيان (۱۵/۱۱۳-۱۱۸)

③ تاريخ دمشق (٦١/١٩٩) اس کی سند میں ”عبیداللہ بن ولید صافی“ ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ۳۲۲۱)

خبر ہے، قیامت کے دن کی شان کی عظمت ہے، اسی لیے دوبارہ تاکید کے لیے یہ بات فرمائی ہے۔ وہ ایسا دن ہوگا کہ کسی کو یہ قدرت نہ ہوگی کہ کسی کو کچھ فائدہ پہنچا سکے، یا رہائی دلوا سکے مگر اللہ کے اذن سے جس کے لیے اللہ کی مرضی ہوگی۔

حدیث میں فرمایا ہے: اے بنی ہاشم! اپنی جانوں کو آگ کے عذاب سے بچاؤ، میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمھارے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں۔ [1] لہٰذا فرمایا کہ اس دن حکم اللہ ہی کا ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴾ [المؤمن: ١٦] ''آج کس کی بادشاہی ہے؟ فقط اللہ واحد وقہار کی۔'' نیز جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ﴾ [الفرقان: ٢٦] ''اس دن صحیح طور پر ملک صرف رحمان کا ہی ہوگا۔'' نیز جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ [الفاتحة: ٣] ''بدلے کے دن (یعنی قیامت) کا مالک ہے۔'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واللہ! اس دن اختیار اللہ کا ہوگا، اس میں کوئی جھگڑا نہ کر سکے گا۔ [2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ نعیم سے مراد جنت ہے اور جحیم سے مراد آگ۔ یہ اس آیت کی تقریر ہے: ﴿ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ﴾ [الشوریٰ: ٧] ''ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ جہنم میں۔'' ''فجار'' کا لفظ کفار پر عائد ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا۔ گناہ گار مومن اس میں داخل نہیں ہیں، اس لیے کہ مومن کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے، وہ علی الاطلاق فاجر نہیں ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ وہ جحیم میں داخل ہو کر پھر اس سے غائب نہ ہوں گے کہ اس کی شان اور قدر کی عظمت کے لیے فرمایا کہ تو جزا و حساب کے دن کو کیا جانے کہ وہ کیسا دن ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ﴾ [القارعة: ١-٣] ''کھڑکھڑا دینے والی، کیا ہے وہ کھڑکھڑا دینے والی؟ تجھے کیا خبر کہ وہ کھڑکھڑا دینے والی کیا ہے؟'' نیز یہ فرمان ہے: ﴿ اَلْحَآقَّةُ ۝ مَا الْحَآقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ﴾ [الحاقة: ١-٣] ''ثابت ہونے والی۔ ثابت ہونے والی کیا ہے؟ اور تجھے کیا معلوم کہ وہ ثابت شدہ کیا ہے؟''

امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ کافر انسان کو خطاب ہے۔ [3] اس دن کوئی نفس کسی نفس کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ ہی شفاعت اور نفع کا مالک ہوگا: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ [البقرة: ٢٥٥] ''کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے۔'' یہ اذن اس کے لیے ہوگا جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہے، یا اس کو بخشنا چاہتا ہے نہ کہ ہر کسی کے لیے جس کو دوسرا چاہے۔ لہٰذا فرمایا ہے کہ اس دن حکم اللہ ہی کا ہوگا۔ غیر کوئی ہو کہیں

---

[1] صحيح مسلم (٢٠٤) [2] تفسير الطبري (٢٧٣/٢٤) [3] فتح القدير (٥٢٨/٥)

ہو ہرگز کسی شے کا مالک یا مختار نہ ہوگا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہاں کوئی شخص کچھ نہیں کر سکتا مگر رب العالمین۔[1]
امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کافر شخص کے لیے کچھ نہ ہوگا،[2] یعنی دنیا جیسا حال نہیں ہے کہ کوشش اور سفارش سے کسی کا کچھ بھلا یا برا ہو سکے، بلکہ یہ اختیار صرف اسی واحد وقہار کو ہوگا کہ جو چاہے سو کرے کسی کا مقدور نہیں ہے کہ دم مار سکے۔[3]

[1] تفسیر الطبري (٢٧٣/٢٤) [2] تفسیر البغوي (٣٥٨/٨) [3] فتح البیان (١١٨/١٥-١٢٠)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْمُطَفِّفِيْنَ

اس سورت کی چھبیس (۲۶) آیتیں ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام ضحاک اور مقاتل رحمہم اللہ کے قول کے مطابق مکی ہے۔ امام حسن اور عکرمہ رحمہم اللہ کے قول کے مطابق مدنی ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ یہ پہلی سورت ہے جو مدینے میں نازل ہوئی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مدنی ہے سوائے ان آٹھ آیتوں کے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ﴾ سے آخر تک۔ امام کلبی اور جابر بن زید رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ مکہ اور مدینہ کے درمیان اتری ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور مکہ میں سب سے آخر میں یہی سورت آئی۔[2] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے میں آئے تو یہاں کے لوگ سب لوگوں سے تول میں بدتر تھے، اس میں یہ سورت نازل ہوئی۔ وہ لوگ پیمانے (ناپ تول) میں اچھے ہو گئے۔[3] (رواه النسائي وابن ماجة وابن مردويه عن سيدنا عبدالله بن عباس رضي الله عنهما والبيهقي في شعب الإيمان وقال السيوطي بسند صحيح)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝۲
وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝۳ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ
اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ۝۶

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

ڈنڈی مارنے والوں کے لیے تباہی ہے ① وہ کہ جب وہ لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیتے ہیں ② اور جب وہ انھیں ناپ کر یا تول کر دیں تو کم دیتے ہیں ③ کیا یہ لوگ یقین نہیں رکھتے

① تفسير القرطبي (۱۹/۲۵۰) ② الدر المنثور (۸/۴۴۱)

③ سنن النسائي الكبرىٰ (۶/۵۰۸) سنن ابن ماجه (۲۲۲۳) شعب الإيمان (۴/۳۲۷) صحيح الترغيب والترهيب (۲/۱۵۷)

کہ بے شک وہ (قبروں سے) اُٹھائے جائیں گے ④ ایک عظیم دن کے لیے ⑤ جس دن لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے ⑥

ڈنڈی ماروں کے لیے تباہی ہے:

ہلال بن طلق کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ چلا جاتا تھا۔ میں نے کہا: کون سے لوگ خوبصورت ہیں اور ناپ میں پورے ہیں مکہ والے یا مدینہ والے؟ کہا: ان کو یہی زیبا ہے تو نے اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں سنا: ﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ﴾[1] (رواه ابن أبي حاتم)۔ کسی نے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کہا: اے ابو عبدالرحمان! مدینے والے پورا ناپتے ہیں؟ کہا ان کو پورا ناپنے سے کون مانع ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ... إلىٰ قوله ... لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾[2] (رواہ ابن جریر)۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس جگہ تطفیف سے مراد ناپ اور تول میں کم کرنا ہے اس طرح کہ لوگوں سے زیادہ لے یا ان کو کم دے۔[3] لہٰذا اللہ نے ان کو خسارے اور ہلاکت کا وعدہ دیا ہے اور حکم کیا ہے کہ ناپ و تول کو پورا کریں، چنانچہ فرمایا: ﴿ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ٣٥] ''اور جب ناپنے لگو تو بھر پور پیمانے سے ناپو اور سیدھی ترازو سے تولا کرو۔ یہی بہتر ہے۔ اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت اچھا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [الأنعام: ١٥٢] ''اور ناپ تول پوری پوری کرو، انصاف کے ساتھ، ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴾ [الرحمٰن: ٩] ''انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور تول میں کم نہ دو۔'' اور اسی وجہ سے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو تباہ کر دیا اور ستیا ناس کر دیا، کیوں کہ وہ ناپ تول میں کمی کرتے تھے۔

ماپ اور تول میں کمی بیشی کرنے والوں کو رب تعالیٰ کی پیشی سے ڈرانا:

پھر اللہ پاک نے یہ وعید سنائی کہ کیا یہ لوگ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے اور اس معبود عالم پناہ اور زبردست کے سامنے اس ہولناک دن میں کھڑے ہونے سے نہیں ڈرتے، وہ دن جو بہت زیادہ پریشانی والا اور جلیل الخطب ہوگا۔ جو کوئی اس دن خاسر ہوا وہ نارِ حامیہ (بھڑکتی ہوئی آگ) میں جائے گا۔ اس دن لوگ رب العالمین کے سامنے ننگے پاؤں، ننگے جسم بے ختنہ ایک سخت مقام میں کھڑے ہوں گے، وہ جگہ نہایت تنگ عیش ہوگی۔ اللہ کا حکم ہر طرف سے ان کو اس طرح ڈھانپ لے گا کہ ان کے قویٰ اور حواس عاجز ہو جائیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رفعاً کہتے ہیں:

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٠٩/١٠) [2] تفسير الطبري (٢٧٧/٢٤) [3] تفسير ابن كثير (٦٢٢/٤)

اس دن جب کہ لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے، ہر ایک اپنے پسینے میں کانوں کے درمیانی حصے تک ڈوب جائے گا۔[1] (رواه البخاري و مسلم)

امام احمد رحمہ اللہ کی روایت یہ ہے کہ پسینہ لوگوں کو ان کے نصف کانوں تک لگام ڈالے گا۔[2] اسود کندی رحمہ اللہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ جس دن قیامت ہوگی سورج بندوں کے نزدیک ہو جائے گا، یہاں تک کہ ایک یا دو میل کے فاصلے پر ہوگا، دھوپ کی مار سے لوگ اپنے اعمال کے مطابق پسینے میں ہوں گے کسی کی ایڑی تک پسینہ ہوگا، کسی کے زانوں تک، کسی کی کمر تک، کسی کو لگام سی لگ جائے گی۔[3] (رواه مسلم و الترمذي) سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت رفعاً یہ ہے کہ سورج قیامت کے دن ایک میل تک نزدیک ہو جائے گا اور اس کی گرمی زیادہ کی جائے گی۔ چنیں وچناں ہوام (جانداروں) کو جوش ہوگا جس طرح کہ دیگ جوش مارتی ہے۔ خطاؤں کے مطابق پسینے پسینے ہو جائیں گے۔ پسینہ کسی کی ایڑی تک پہنچے گا اور کسی کی پنڈلی تک اور کسی کی کمر تک اور کسی کو لگام لگ جائے گی۔[4] (رواه أحمد وانفرد به)

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ رفعاً کہتے ہیں کہ سورج زمین کے قریب ہو جائے گا۔ لوگوں کو پسینہ آئے گا۔ کسی کا پسینہ عقبین (ایڑیوں) تک اور کسی کا نصف پنڈلی تک اور کسی کا رکبتین (گھٹنوں) تک اور کسی کا عجز، یعنی سرین تک اور کسی کا خاصرہ، یعنی کمر تک اور کسی کا منکب (کندھوں) تک اور کسی کا وسطِ فم (منہ کے وسط) تک پہنچے گا، پھر ہاتھ کو منہ میں لگام کے طور پر ڈال کر بتایا اور کسی کو اس کا پسینہ بالکل چھپا لے گا۔[5] (انفرد به أحمد)۔ ایک حدیث میں مروی ہے کہ وہ ستر برس تک کھڑے رہیں گے بات نہ کریں گے۔[6] بعض نے کہا: تین سو برس تک۔ بعض نے کہا ہے کہ چار ہزار برس تک اور دس ہزار سال کی مقدار میں ان کے درمیان آخری حکم دیا جائے گا۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے: ﴿فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِيْنَ أَلْفَ سَنَةٍ﴾[7] (رواه مسلم) یعنی وہ دن پچاس ہزار برس کا ہوگا۔ مترجم کہتا ہے کہ میں نے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ خلائق کی تقدیروں کو اللہ نے مخلوق سے پچاس ہزار سال پہلے مقدر کیا تھا اور خلق کی مدت بھی پچاس ہزار برس ہے۔ ﴿تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ [المعارج: ٤] ”جس کی طرف فرشتے اور روح چڑھتے ہیں ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہے۔“ اور قیامت کا دن بھی پچاس ہزار سال کا ہوگا۔ یہ سب ڈیڑھ لاکھ سال ہوئے اللہ تعالیٰ کا ہر دن ہماری گنتی سے ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔ ﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ

---

(1) صحيح البخاري (٤٦٥٤) صحيح مسلم (٢٨٦٢) (2) مسند أحمد (٣١/٢)

(3) صحيح مسلم (٢٨٦٤) سنن الترمذي (٢٤٢١) (4) مسند أحمد (٢٥٤/٥) (5) مسند أحمد (١٥٧/٤)

(6) ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے، البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ الفاظ اسی طرح ذکر کیے ہیں۔ دیکھیں: (تفسير ابن كثير: ٦٢٣/٤)

(7) صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٨٧)

كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ﴾ [الحج: ٤٧] ''ایک دن تمھاری گنتی کے اعتبار سے ایک ہزار سال کا ہے۔'' تو یہ ایک نہایت طویل مدت ہوئی۔ واللّٰہ أعلم.

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بشیر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تو اس دن کیا کرے گا جس دن کہ لوگ رب العالمین کے سامنے تین سو برس تک دنیا کے دنوں کے حساب سے کھڑے ہوں گے، ان کے پاس نہ کوئی خبر آسمان سے آئے گی اور نہ کوئی حکم صادر ہوگا۔ بشیر نے کہا: اللہ مستعان ہے۔ فرمایا: جب تو اپنے بستر پر آیا کرے تو یومِ قیامت کے کرب و بے چینی اور برے حساب سے پناہ مانگا کر۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم وابن جریر)۔ سنن ابی داود میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن کھڑے ہونے کی تنگی سے پناہ مانگا کرتے تھے۔[2] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: چالیس برس تک آسمان کی طرف سر اٹھائے ہوئے کھڑے رہیں گے، کوئی ان سے بات نہ کرے گا۔ پسینے کی لگام ہر نیک و بد کو لگ جائے گی۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ سو برس تک کھڑے رہیں گے۔[3] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیامِ لیل کو اس طرح شروع کرتے کہ دس دس بار تکبیر، تحمید اور تسبیح کرتے، کہتے: «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَاهْدِنِيْ وَارْزُقْنِيْ وَعَافِنِيْ» ''اے اللہ! مجھے بخش دے، مجھے ہدایت دے، مجھے رزق دے اور مجھے عافیت دے۔'' اور ضیقِ مقام یومِ قیامت سے پناہ مانگتے تھے۔[4] (رواہ أبو داود والنسائي وابن ماجه)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ مطفف: منقص (کم کرنے والے) کو کہتے ہیں اور حقیقت اس کی کیل اور وزن میں شے طفیف، یعنی حقیر، خفیف و قلیل لینا ہے۔ اس جگہ ویل سے مراد عذاب یا شدتِ عذاب یا شرِ شدید ہے، یا جہنم میں ایک وادی ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں آئے، وہاں کے لوگ برے ناپ تول کرتے تھے، دوسروں کو کم دیتے اور خود بھرپور لیتے تھے، اس پر یہ آیت اتری۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آئے، وہاں ایک آدمی تھا اس کو ابو جہینہ کہتے تھے، اس کے دو صاع تھے: ایک سے دیتا تھا اور دوسرے سے لیتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد لوگ ناپ تول میں آج تک اچھے خاصے ہو گئے۔[5]

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (۳۴۱۰/۱۰) تفسیر الطبري (۲۸۰/۲۴) اس کی سند میں ''عبدالسلام بن عجلان'' متکلم فیہ راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ۴۱۴۹)

② سنن أبي داود: (۷۶۶) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (صحیح أبي داود: ۳۵۲/۳، ۳۵۳)

③ تفسیر الطبري (۲۸۰/۲۴، ۲۸۱) ④ سنن أبي داود (۷۶۶) سنن النسائي (۱۶۱۷) سنن ابن ماجه (۱۳۵۶)

⑤ فتح القدیر (۵۳۰/۵)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: جب کوئی قوم عہد شکنی کرتی ہے تو اللہ ان پر دشمن کو مسلط کر دیتا ہے اور جب ناپ تول میں کمی کرتی ہے تو رزق پیدا نہیں ہوتا، قحط سالی میں پکڑے جاتے ہیں۔[1] (أخرجه ابن مردويه)۔ وعید ہے ہر اس شخص کے لیے جو خود زیادہ لے اور دوسرے کو کم دے، تھوڑا ہو یا بہت، لیکن جب کہ توبہ نہ کرے اور اگر توبہ کرے گا تو اس کی توبہ قبول ہوگی اور جو شخص اس کام پر جما رہا، اس نے کبیرہ پر اصرار کیا، اس لیے کہ عام لوگ معاملات کے محتاج ہوتے ہیں اور ان معاملات کی بنیاد اسی زراعت اور ناپ تول پر ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس کو امرِ عظیم ٹھہرایا ہے یعنی اس وجہ سے کہ حقوق العباد سے متعلق ہے۔

پھر فرمایا کہ یہ لوگ جو لوگوں سے خود کچھ سودا سلف کرتے ہیں تو بھرپور لیتے ہیں، ایک دانہ بھی نہیں چھوڑتے اور جب ان کو غلہ اور اناج وغیرہ تول کر دیتے ہیں تو ترازو کی ڈنڈی مار کر کم دیتے ہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ایسا کرتے ہیں۔ کیا ان کو یہ گمان نہیں ہے کہ وہ مبعوث ہوں گے اور ان کے اس کرتوت کا مواخذہ ان سے ہوگا۔ اس جگہ ظن بہ معنی یقین ہے۔ ﴿لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ﴾ سے مراد قیامت کا دن ہے، کیونکہ وہ زمانہ عظیم امور کا ہوگا۔ بعث و حساب و کتاب و عقاب اور جنت اور جہنم میں داخلہ پیش آئے گا۔

حکایت:

ایک گنوار نے عبدالملک بن مروان سے کہا تھا: تو نے سنا ہے کہ اللہ نے مطففین کے حق میں کیا کہا ہے؟ یعنی مطفف پر وعیدِ عظیم ہے۔ یہ تو تُو سن چکا، پھر تجھ کو اپنے نفس کے متعلق کیا گمان ہے، حالاں کہ تو مسلمانوں کے مال کو بغیر ناپ تول کے لیتا ہے۔[2] میں کہتا ہوں: میرے والد مرحوم۔ غفر الله لي وله۔ نے اس آیت کی تفسیر مستقل لکھی ہے۔ اس بابِ تطفیف کی جتنی قسمیں تمام اعمالِ قلبی و قالبی میں ہو سکتی تھیں، ان سب کا ذکر کیا ہے، یعنی یہ تطفیف کچھ ناپ تول ہی میں نہیں ہوتی، بلکہ ہر عمل میں پائی جاتی ہے، چنانچہ جس کسی معاملے میں زیادتی ہو یا کمی اس پر تطفیف کی یہ وعیدِ شدید متوجہ ہے۔ اللهم غفرا وتوفيقا.

لوگوں کا دونوں جہانوں کے مالک کے سامنے کھڑا ہونا یوں ہوگا کہ اللہ کے حکم سے جزا و حساب و حکم و قضا کے حصول کے لیے قبروں سے نکل کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس دن کو عظیم فرمایا، لوگ اس دن میں جھکنے والے عاجزی کرنے والے ہوں گے۔ اپنے نفسِ مقدس کو رب العالمین کہا۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ تطفیف کا گناہ عظیم ہے اور بیان ہے مزید اثم اور سزا کی سختی کا۔ یہی حال ہر اس شخص کا ہوگا جس میں ظلم و ستم ہو اور جو انصاف وعدل قائم کرنے کو چھوڑ دے، ہر لین دین کے معاملے میں، بلکہ ہر قول، عمل و حال میں برابری کے اصول کو چھوڑ

[1] الدر المنثور (٨/٤٤٢) [2] تفسير القرطبي (١٩/٢٥٥)

دے، یا اس سے مراد پسینے میں قیام ہے، یا حقوقِ عباد کے ساتھ قیام ہے۔ یا ذوالجلال والاکرام کے سامنے رسولوں کا قضا اور فیصلے کے لیے قیام ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ تمھارا کیا حال ہوگا، جبکہ اللہ تم کو جمع کرے گا جس طرح کہ تیروں کو ترکش میں جمع کرتے ہیں، پچاس ہزار برس تک پھر تمھاری طرف نگاہ نہ کرے گا۔[1] (أخرجه الطبراني و أبو الشيخ و الحاكم و صححه و ابن مردويه و البيهقي في البعث)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت رفعاً یہ ہے کھڑے ہوں گے لوگ اس دن رب العالمین کے واسطے نصف دن کی مقدار کے مطابق پچاس ہزار سال سے۔ مومن پر یہ دن ایسے ہلکا ہو جائے گا جیسے کہ سورج ڈوبنے کے وقت تک کہ غروب ہو جائے۔[2] (أخرجه أبو يعلىٰ وابن حبان وابن مردويه)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا: لوگ کب تک قیام کے دن کے لیے رب العالمین کے سامنے کھڑے رہیں گے؟ فرمایا: ہزار برس ان کو اذن نہ ہوگا۔[3] (أخرجه الطبراني) میں کہتا ہوں اس برس کا ہر دن دنیا کے ایک ہزار سال کے برابر ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک بار اس سورت کو پڑھا جب اس آیت پر پہنچے تو خوب روئے اور آیت کے بعد والی آیتوں کو نہ پڑھ سکے۔[4]

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝7 وَمَآ اَدْرٰىكَ
مَا سِجِّيْنٌ ۝8 كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝9 وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝10 الَّذِيْنَ
يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝11 وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ
اَثِيْمٍ ۝12 اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝13
كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝14 كَلَّآ
اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝15 ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا
الْجَحِيْمِ ۝16 ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝17

ہرگز نہیں! بے شک بدکاروں کا اعمال نامہ سجّین میں ہے ⑦ اور تمھیں کیا معلوم وہ سجّین کیا ہے؟ ⑧ ایک کتاب ہے لکھی ہوئی ⑨ ہلاکت ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے ⑩ وہ جو روزِ جزا کو جھٹلاتے ہیں ⑪ اور اسے صرف ہر حد سے بڑھا گناہ گار جھٹلاتا ہے ⑫ جب اس پر

---

① مستدرك الحاكم (٤/٦١٦) السلسلة الصحيحة (٢٨١٧)
② مسند أبي يعلىٰ (١٠/٤١٥) صحيح ابن حبان (١٦/٣٢٨) صحيح الترغيب والترهيب (٣/٢٢٦)
③ الدر المنثور (٨/٤٤٢) ④ تفسير النسفي (٤/٣٢٣) فتح البيان (١٥/١٢٣-١٢٧)

ہماری آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو کہتا ہے: یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں ⑬ ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے (بُرے) اعمال نے زنگ لگا دیا ہے ⑭ ہرگز نہیں! بے شک اس روز وہ (کافر) اپنے رب (کے دیدار) سے یقیناً پردے میں رکھے جائیں گے ⑮ پھر بے شک وہ ضرور دوزخ میں داخل ہوں گے ⑯ پھر ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی چیز ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے ⑰

بدوں کا بدانجام:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فجار کی کتاب سچ مچ سجین میں ہے، یعنی یہ بات مقرر ہو چکی ہے کہ ان کا ٹھکانا سجین ہے۔ یہ مشتق ہے سجن سے بہ معنی ضیق (قید خانہ) جس طرح فسیق وشریب وخمیر وسکیر اور اسی طرح کے اور الفاظ بولتے ہیں۔ لہٰذا اس کو ایک بڑی چیز ٹھہرا کر ارشاد کیا ہے کہ تو کیا جانے کہ سجین کیا چیز ہے، یعنی وہ ایک امرِ عظیم و سجنِ مقیم اور عذابِ علیم ہے۔ پھر بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ سجین ساتویں زمین کے نیچے ہے حدیث براء بن عازب رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے: اللہ تعالیٰ کافر کی روح کے متعلق کہتا ہے کہ اس کو کتاب سجین میں لکھو۔[1] یہ سجین ساتویں زمین کے نیچے ہے اور بعض نے کہا کہ ایک سبز بھاری پتھر ہے یا جہنم میں ایک سیاہ کنواں ہے۔ صحیح یہی ہے کہ سجین سجن سے ماخوذ ہے، بہ معنی ضیق۔ مخلوقات میں سے جو مخلوق سافل (نیچے درجے والی) ہے، وہ اسی قدر تنگ و تاریک ہے اور مخلوق جتنی عالی (بلند درجے والی) ہے، وہ اسی قدر وسیع ہے۔

ساتوں آسمانوں میں سے ہر ایک آسمان اپنے سے نیچے والے آسمان سے زیادہ بلند اور وسیع ہے، اسی طرح زمینوں میں ہر زمین اپنے سے نچلی زمین سے زیادہ وسیع ہے، یہاں تک کہ سب سے آخر میں اسفل سافلین اور محلِ اضیق تک منتہی ہو اور مرکز تک پہنچے جو ساتویں زمین کے وسط میں ہے اور چونکہ فجار کا انجام اور بازگشت جہنم کی طرف ہوگا جو اسفل سافلین ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ [التین: ٥-٦] ''پھر اسے نیچوں سے نیچا کر دیا لیکن جو لوگ ایمان لائے اور (پھر) نیک عمل کیے۔'' اس لیے اس جگہ یہ فرمایا: ﴿ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ﴾ یہ لفظ ضیق وسفول کا جامع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ﴾ [الفرقان: ١٣] ''اور جب یہ جہنم کی کسی تنگ جگہ میں مشکیں کس کر پھینک دیے جائیں گے تو وہاں اپنے لیے موت ہی موت پکاریں گے۔''

اللہ کے یہ الفاظ: ﴿ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴾ کچھ اس جملے کی تفسیر نہیں ہیں: ﴿ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ﴾ بلکہ یہ اس کتاب کی تفسیر ہے جس کا انجام سجین ہے، یعنی وہ کتاب لکھی جا چکی ہے، اس سے فراغت حاصل ہو چکی، اب اس میں

---

[1] مسند أحمد (٢٨٧/٤) صحیح الجامع (١٦٧٦)

نہ کوئی اضافہ کیا جا سکتا ہے نہ کمی۔ یہی قول محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ کا ہے۔ پھر فرمایا: جب قیامت کے دن لوگ سجین اور عذابِ مہین میں اللہ کی وعید کے مطابق جا پہنچیں گے تو اس دن ان جھٹلانے والوں کے لیے خرابی و تباہی و بربادی و دمار و عذاب و ہلاکت ہے۔ عرب کہتے ہیں: ”وَيْلٌ لِفُلَانٍ“۔ معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: ”وَيْلٌ لِلَّذِي يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ لِيُضْحِكَ النَّاسَ وَيْلٌ لَهُ وَيْلٌ لَهُ“[1] یعنی ہلاکت اور بربادی ہے اس کے لیے جو جھوٹی بات کر کے لوگوں کو ہنساتا ہے۔

جھٹلانے والوں کے لیے ہلاکت ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے مکذبین کا بیان کیا کہ ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو قیامت کے دن کی تصدیق نہیں کرتے اور یومِ جزا کو بعید جان کر اس کے واقع ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتے۔ یہ تکذیب وہی شخص کرتا ہے جو اپنے کاروبار میں حرام کا لین دین کرنے والا اور جائز کی گئی چیزوں کو لینے میں حد سے تجاوز کرتا ہے اور اپنے اقوال میں گناہ گار ہے۔ جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، جب وعدہ کرتا ہے تو خلاف کرتا ہے، جب جھگڑتا ہے تو گالی بکتا ہے اور جب اللہ کا کلام اس کے رسول کی زبان سے سنتا ہے تو اسے جھٹلاتا ہے اور گمانِ بد کر کے یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ یہ کلام پہلی کتابوں میں سے لیا گیا اور جمع کیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴾ [النحل: ٢٤] ”ان سے جب دریافت کیا جاتا ہے کہ تمھارے پروردگار نے کیا نازل فرمایا ہے؟ تو جواب دیتے ہیں کہ اگلوں کی کہانیاں ہیں۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴾ [الفرقان: ٥] ”اور یہ بھی کہا کہ یہ تو اگلوں کے افسانے ہیں جو اس نے لکھا رکھے ہیں، بس وہی صبح و شام اس کے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔“

گناہوں سے دلوں کا زنگ آلود ہو جانا:

یہ بات یوں نہیں ہے جس طرح کہ انھوں نے خیال کیا اور اعتقاد کیا ہے اور جس طرح کہ اس قرآن کو پہلوں کی نقل بتائی ہے، بلکہ وہ اللہ کا کلام اور اس کی وحی اور تنزیل ہے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ ان کے دل جو اس پر ایمان لانے سے محجوب ہوئے (پردے میں ہوئے یا ایمان نہیں لائے) تو اس لیے کہ گناہوں میں خطاؤں کی کثرت کے سبب سے ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔ کافروں کے دلوں کو رین لگتا ہے (گناہوں کا چھا جانا) اور نیکوکاروں کے دلوں کو غیم لگتا ہے (بادل) اور مقربین کے دلوں میں غین لگتا ہے (وہ بادل جو چھا جائے)۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے، بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے، اگر توبہ کر

[1] سنن أبي داود (٤٩٩٠) سنن الترمذي (٢٣١٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٥٠٩) صحيح الجامع (٧١٣٦)

لے تو دل صاف ہو گیا اور اگر اور زیادہ گناہ کیا تو وہ نکتہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ فذلک قول اللہ تعالیٰ: ﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (رواه ابن جرير و الترمذي و النسائي و ابن ماجه وقال الترمذي: حسن صحيح)

امام نسائی رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ بندہ نے جب کوئی خطا کی تو اس کے دل میں ایک کالا نکتہ ہو گیا، پھر اگر وہ اس گناہ سے باز رہا اور استغفار کی اور توبہ بجا لایا تو دل کو صیقل ہو گئی (یعنی اس توبہ نے دل کو صاف کر دیا)۔ پھر اگر دوبارہ وہی کام کیا تو نکتہ بڑھ کر دل کو ڈبو لیتا ہے، یہی وہ "رَین" ہے جس کا ذکر اللہ نے کیا ہے۔ یہی مضمون احمد کے نزدیک بھی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے۔[1] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رین سے مراد گناہ پر گناہ کرنا ہے، یہاں تک کہ دل اندھا ہو کر مر جاتا ہے۔ یہی قول امام مجاہد، ابن جبیر، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم کا بھی ہے۔[2]

مومنوں کا روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنا اور کافروں کا اس سے محروم رہنا:

پھر فرمایا کہ ان کے لیے سجین کی مہمانی اور مقام کے علاوہ ایک یہ بات ہوگی کہ وہ اپنے رب کی رویت سے اوٹ (پردے) میں ہوں گے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ اس دن مومنین اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام صاحب کا یہ قول انتہائی حسین و جمیل ہے، یہ آیت کے مفہوم کے ساتھ استدلال ہے جس طرح کہ یہ آیتِ کریمہ بھی اس پر دلیل ہے: ﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَىٕذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿22﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴾ [القیامۃ: ۲۲- ۲۳] "اس روز بہت سے چہرے تروتازہ اور بارونق ہوں گے اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔"

احادیثِ صحیحہ اور متواترہ آخرت کے گھر میں مومنین کے اللہ رب العزت کا اپنی آنکھوں سے دیدار کرنے کے بارے میں ثابت ہیں۔ اہلِ ایمان رب العالمین کو عرصاتِ قیامت میں اور جنت کے اعلیٰ باغات میں انہیں آنکھوں سے دیکھیں گے۔[3] وللہ الحمد۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پردہ اٹھا دیا جائے گا، مومن اور کافر سب کے سب اللہ کو دیکھیں گے۔ پھر کافر محجوب (پردے میں) ہو جائیں گے اور مومن صبح و شام اس کو دیکھا کریں گے۔[4] اور کفار باوجود اس رؤیتِ رحمان کے اہلِ نیران (جہنم والے) میں ہوں گے اور ان سے یہ بات کہی جائے گی کہ دیکھو یہ وہی دن ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے، یہ کہنا ملامت و سرزنش اور حقارت کے طور پر ہوگا۔[5] اللهم أجرنا من النار.

---

[1] تفسير الطبري (٢٤/٢٨٧) سنن الترمذي (٣٣٣٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٥٠٩) سنن ابن ماجه (٤٢٤٤) مسند أحمد (٦/٢٩٧) صحيح الجامع (١٦٧٠)

[2] تفسير الطبري (٢٤/٢٨٧_٢٨٩)

[3] تفسير ابن كثير (٤/٦٢٥)

[4] تفسير الطبري (٢٤/٢٨٩، ٢٩٠)

[5] تفسير ابن كثير (٤/٦٢٣، ٦٢٥)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اس جگہ حرف ﴿ كَلَّا ﴾ سرزنش کے لیے ہے۔ مطففین کو جھڑکا ہے اور ڈرایا ہے کہ کفار کے اعمال نامے سجین میں ہوں گے۔ ﴿ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴾ اسی ﴿ سِجِّيْنٍ ﴾ کی تفسیر ہے۔ ﴿ مَّرْقُوْمٌ ﴾ بہ معنی مسطور ہے۔ اس کتاب میں تمام برے اعمال جمع کیے ہوئے ہیں جو شیاطین، کفار اور فجار سے صادر ہوئے۔ ﴿ سِجِّيْنٍ ﴾ اس کتاب کا نام ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ سِجِّيْنٍ ﴾ محلِ کتاب ہے۔ ساتویں زمین کے نیچے ایک پتھر کے نیچے یہ کتاب رکھی جاتی ہے۔ امام ابوعبیدہ، اخفش اور مبرد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سِجِّيْنٍ ﴾ سے مراد حبس وضیقِ شدید ہے۔ گویا یہ قید اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا ٹھکانا نہایت خسیس اور خواری والا ہوگا۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کتاب کو ﴿ سِجِّيْنٍ ﴾ ٹھہرانا بعید ہے، کجا سجین اور کجا کتاب جس طرح کہ ہم نے مفسرین سے اس کو نقل کیا ہے۔

﴿ مَّرْقُوْمٌ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اس کے لفظ صاف صاف لکھے گئے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَّرْقُوْمٌ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ ان کے شر کی رقم لکھی گئی ہے، گویا کہ ایک علامت کر دی ہے جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ کافر ہے۔ یہی قول امام مقاتل رحمہ اللہ کا بھی ہے۔[1] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَّرْقُوْمٌ ﴾ بہ معنی "مختوم" ہے۔ لغتِ حمیر میں اور اصل میں رقم بہ معنی کتابت ہے۔[2] امام کعب احبار رحمہ اللہ نے آیتِ باب کی تفسیر میں کہا ہے کہ فاجر کی روح کو آسمان پر لے جاتے ہیں، آسمان اس کو قبول نہیں کرتا، پھر زمین پر پھینک دیتے ہیں۔ زمین بھی اس کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ پھر ساتویں زمین کے نیچے لے جاتے ہیں یہاں تک کہ سجین تک پہنچتے ہیں۔ ابلیس کی ایک حد ہے، پھر اس حد کے نیچے سے ایک کتاب نکال کر اور مہر لگا کر زیرِ حد مذکور رکھ دیتے ہیں۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ سِجِّيْنٍ ﴾ تمام زمینوں میں سب سے نیچے والی۔[4] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے رفعاً ایک روایت کی ہے کہ فلق ایک چاہ مغطی ہے جہنم میں، سجین مفتوح ہے۔ لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث منکر اور غیر صحیح ہے۔[5] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت مرفوعاً اس طرح ہے کہ سجین ساتویں زمین کے نیچے ہے۔ (رواہ ابن مردویہ)۔ اسی طرح سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے بھی رفعاً مروی ہے۔[6] عبداللہ بن کعب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب کعب بن مالک کو موت آئی تو ام بشر بنت البراء نے آ کر کہا: اگر تیری اور میرے فرزند کی ملاقات ہو تو میرا سلام کہہ دینا۔ کہا: اے ام بشر! اللہ تجھ کو بخشے ہم تو مشغول ہوں گے، یعنی اپنے حال میں گرفتار، سلام

---

(1) فتح القدير (٥/٥٣١، ٥٣٢) (2) تفسير القرطبي (١٩/٢٥٨) (3) تفسير الطبري (٢٤/٢٨٣)

(4) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٠٩)

(5) تفسير الطبري (٢٤/٢٨٤) تفسير ابن كثير (٤/٦٢٣، ٦٢٤) اس کی سند میں "شعیب بن صفوان" ضعیف راوی ہے۔

(6) الدر المنثور (٨/٤٤٤، ٤٤٥)

پہنچانا کیسے ہوگا؟! کہا: کیا تو نے نبی اکرم ﷺ کو یہ کہتے نہیں سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ مومن کی جان جنت میں چرتی ہے جہاں چاہے اور کافر کی جان سجین میں ہے؟ کہا: ہاں۔ کہا: بس یہی بات ہے۔[1] (أخرجه ابن ماجه والطبراني والبيهقي في البعث وعبد بن حميد)

﴿ اَسَاطِيْرُ ﴾ "أسطورة" یا "أسطارة" کی جمع ہے۔ مکذبین قرآنِ مبین کو سابقین کی حکایات کہتے تھے، اسے اللہ کا کلام منزل علی الرسول نہیں جانتے تھے، یہی ان کی تکذیب تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کا یہ کہنا اس لیے ہے کہ ان کے دلوں پر زنگ آ لگا ہے، یعنی معصیت اور گناہوں کی کثرت نے ان کے دلوں کو گھیر لیا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دل ہتھیلی کی طرح ہے۔ پھر اپنا کفِ دست اٹھا کر بتایا کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو دل منقبض ہو جاتا ہے (سمٹ جاتا ہے)، پھر ایک انگلی بند کی، پھر جب دوبارہ گناہ کرتا ہے تو اور منقبض ہو جاتا ہے اور دوسری انگلی بند کر لی، یہاں تک کہ ساری انگلیاں بند کر لیں، پھر دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ سلف اسی خالت کو "رین" کہتے تھے۔ پھر آیتِ باب پڑھی۔[2] ابو معاذ نحوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "رین" یہ ہے کہ دل گناہوں کے سبب سے سیاہ پڑ جائے اور طبع یہ ہے کہ دل پر مہر لگ جائے۔ یہ "رین" سے بھی زیادہ سخت ہے، اقفال (تالا لگنا) طبع (مہر) سے بڑھ کر ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "رین" زنگ کی طرح ہے، دل کو چھپا لیتی ہے، جیسے: پتلا بادل، اسی کی مثل "غین" ہے۔ پھر فرمایا کہ کافر اس دن اللہ کے دیدار سے حجاب میں ہوں گے، ہرگز اس کو نہ دیکھ سکیں گے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی حساب کے پیش ہونے کے بعد رب کی طرف نظر نہ کریں گے جس طرح کہ مومن اس کو دیکھیں گے۔ حسین بن فضل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے دنیا میں ان کو توحید سے حجاب میں رکھا، آخرت میں اپنی رویت سے حجاب میں رکھے گا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن دکھائی دے گا۔ اگر یہ بات نہ ہو تو پھر اس آیت کا فائدہ کیا ہے۔[3] اور آیت ﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ﴾ سے یہ بتایا کہ مومن اس کو دیکھیں گے اور کفار محجوب رہیں گے اور کسی نے کہا ہے کہ یہ تمثیل توہین کے طور پر ہے، لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ پھر اس حجاب کے ساتھ آگ میں داخل رہیں گے اور عذاب میں مبتلا رہیں گے، جہنم سے باہر آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر ان کو یہ بات کہی جائے گی کہ یہ وہی دن ہے جس کی تم تکذیب کرتے تھے۔ یہ بات ان سے جہنم کے خزنہ (داروغہ) کہیں گے۔ یہ کہنا سرزنش اور ملامت کے طور پر ہوگا کہ اب تم نے دیکھا کہ جس کا تم دنیا میں انکار کرتے تھے، وہ روزِ سیاہ تمھارے سامنے آیا، اب تم اپنے انکار کا مزہ چکھو۔[4]

---

[1] سنن ابن ماجه (١٤٤٩) المعجم الكبير (١٠٤/٢٥) مسند عبد بن حميد (٤٥٤/١) [2] تفسير الطبري (٢٨٧/٢٤، ٢٨٨)
[3] فتح القدير (٥٣٣/٥) [4] فتح البيان (١٥/١٢٧-١٣٢)

كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا
عِلِّيُّوْنَ ﴿۱۹﴾ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ﴿۲۰﴾ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ اِنَّ الْاَبْرَارَ
لَفِيْ نَعِيْمٍ ﴿۲۲﴾ عَلَى الْاَرَآىِٕكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ
نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ﴿۲۴﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿۲۵﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ
وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَمِزَاجُهٗ مِنْ
تَسْنِيْمٍ ﴿۲۷﴾ عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۲۸﴾

ہرگز نہیں! بے شک نیک لوگوں کا اعمال نامہ یقیناً علّیین میں ہے (18) اور تمھیں کیا معلوم کہ وہ علّیین کیا ہے؟ (19) ایک کتاب ہے لکھی ہوئی (20) اس کے پاس مقرب فرشتے حاضر رہتے ہیں (21) بے شک نیک لوگ ضرور نعمتوں میں ہوں گے (22) مسہریوں پر (بیٹھے) دیکھ رہے ہوں گے (23) ان کے چہروں پر آپ نعمتوں کی تازگی محسوس کریں گے (24) انھیں مہر لگی خالص شراب پلائی جائے گی (25) اس پر کستوری کی مہر لگی ہوگی، لہٰذا شائقین کو اسی کا شوق کرنا چاہیے (26) اس میں تسنیم کی آمیزش ہوگی (27) (وہ) ایک چشمہ ہے جس سے (اللہ کے) مقرب بندے پئیں گے (28)

نیک لوگوں کے اعمال نامے اور ان کا بدلہ:

شراب کی نہریں ہر کسی کے گھر میں ہیں، لیکن یہ شراب نادر ہے جو زیرِ مہر ہے اور اس کی قدر کے مطابق مشک پر مہر جمتی ہے۔ انتھی۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ سچ ہے کہ کتابِ فجار کے برعکس ابرار کی کتاب علیین میں ہے، یعنی یہ لوگ جنت میں جائیں گے جس طرح کہ فجار جہنم میں داخل ہوں گے۔ اللهم إنا نسألك الجنة ونعوذبك من النار۔ ہلال بن یساف رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کعب سے پوچھا اور میں وہاں حاضر تھا کہ سجین کیا ہے؟ کہا: ساتویں زمین ہے، اس میں کافروں کی روحیں ہیں۔ کہا: علیین کیا ہے؟ کہا: ساتواں آسمان، اس میں مومنوں کی روحیں ہیں۔ اہلِ علم میں سے کئی اہلِ علم کا یہی قول ہے کہ علیین ساتواں آسمان ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ علیین سے مراد جنت ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ ان کے اعمال آسمان میں اللہ کے نزدیک ہیں۔ یہی قول امام ضحاک رحمہ اللہ کا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علیین عرش کے دائیں جانب ایک ساق ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ کے

پاس ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ "علو" سے ماخوذ ہے۔ ہر شے جتنی عالی اور بلند ہوتی ہے اتنی ہی عظیم اور فراخ ہوتی ہے۔ لہٰذا اللہ نے اس کی شان کو عظیم ٹھہرا کر یہ فرمایا کہ تو کیا جانے کہ وہ کیا چیز ہے؟ پھر کہا کہ ایک کتاب مرقوم ہے جس کے نزدیک فرشتے حاضر رہتے ہیں، یہی قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہر آسمان کے مقرب فرشتے وہاں موجود ہوتے ہیں۔[1] الغرض یہ نیکوکار لوگ قیامت کے دن نعیم مقیم اور جناتِ فضل عظیم میں تختوں پر ہوں گے۔ تختوں سے مراد چھپر کھٹ ہیں، وہیں سے بیٹھے بیٹھے اپنے ملک کو دیکھیں گے۔ یہ خیر اور فضل جو اللہ ان کو دے گا وہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ یا یہ کہ ان تختوں پر سے اللہ کا دیدار کریں گے۔ ان کا یہ وصف کفار کے وصف کے مقابلے میں ہوگا کہ وہ تو محجوب ہوں گے اور یہ دیکھ رہے ہوں گے، ان کو اپنے گھر اور فرش اور تخت پر سے اپنے رب کی طرف سے نظر کرنا مباح ہوگا۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ اہلِ جنت میں ادنیٰ درجے کا وہ شخص ہوگا جو دو ہزار سال کی راہ تک اپنی عمل داری کو دیکھے گا جس طرح کہ قریب کی جگہ اس کو دکھائی دے گی، اسی طرح دور کی جگہ نظر آئے گی اور اعلیٰ درجے کا وہ شخص ہوگا جو ہر دن اللہ تعالیٰ کو دوبار دیکھے گا۔[2] ان کے چہروں پر آسودگی وحشمت وسرور وراحت وریاست کی تازگی معلوم ہوگی، کیوں کہ وہ نعیمِ مقیم میں ہوں گے۔ جنت کی سر بہ مہر شراب پئیں گے۔ ﴿رَحِیْقٍ﴾ خمر کا نام ہے۔ یہی قول عبداللہ بن مسعود، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام مجاہد، حسن، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ کا ہے۔[3] سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے جو مومن کسی مومن کو پیاس پر پانی پلاتا ہے اللہ قیامت کے دن اس کو بادۂ سر بہ مہر پلائے گا۔ اور جو مومن کسی مومن کو بھوک پر کھانا کھلاتا ہے، اللہ اس کو جنت کے پھل کھلائے گا اور جو مومن کسی مومن کو برہنگی پر کپڑا پہناتا ہے، اللہ اس کو خضرِ جنت سے لباس پہنائے گا۔[4] (رواہ أحمد)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ﴿خِتٰمُهٗ مِسْكٌ﴾ سے یہ مراد ہے کہ اس میں مشک ملا ہوا ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے اس کی شراب کو مطیب، یعنی خوشبودار کیا ہے، گویا سب کے آخر میں اس میں مشک ملایا گیا ہے۔ یہی قول امام قتادہ اور ضحاک رحمہما اللہ کا ہے۔ امام ابراہیم اور حسن رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ختامِ مسک سے مراد عاقبت ہے۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ وہ شراب چاندی کی طرح سفید ہوگی۔ اس کا خاتمہ (مہر) مشک ہوگا۔ اگر دنیا کا ایک آدمی اس میں اپنی انگلی ڈال کر نکالے تو کوئی جاندار ایسا نہ رہے جو اس کی خوشبو نہ پائے۔ (رواہ ابن حمید)

[1] تفسیر الطبري (٢٤/٢٩١-٢٩٤) تفسیر ابن کثیر (٤/٦٢٥، ٦٢٦)
[2] مسند أحمد (٢/١٣) اس کی سند میں "ثویر بن ابی فاختہ" ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ١٣٨١)
[3] تفسیر الطبري (٢٤/٢٩٥، ٢٩٦) [4] مسند أحمد (٣/١٣) اس کی سند میں "عطیہ عوفی" ضعیف راوی ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿خِتٰمُهٗ مِسْكٌ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اس کی خوشبو مسک کی سی ہو گی۔[1] پھر فرمایا کہ اس جیسے حال میں فخر کرنے والے لوگ فخر کریں اور مباہات کریں اور دوسروں پر اپنی کثرت اور فوقیت جتلائیں جس طرح کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ﴾ [الصافات: ٦١] ''ایسی (کامیابی) کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔'' پھر کہا کہ اس رحیق کا مزاج تسنیم سے ہے، یعنی اس شراب ناب خوشگوار سے، جس کو تسنیم کہتے ہیں اور وہ اہلِ جنت کی سب سے زیادہ شرف والی اور اعلیٰ شراب ہے۔ لہٰذا یہ فرمایا کہ یہ ایک ایسا چشمہ ہے جس سے نزدیک والے یا وہ صرف پیتے ہیں اور اصحابِ یمین کے لیے اس میں ملونی کی جاتی ہے، یہی قول عبداللہ بن مسعود، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام مسروق اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿كَلَّآ﴾ کا لفظ بہ معنی ''حقا'' ہے اور ابرار سے مراد مطیعین ہیں اور ان کی کتاب سے مراد ان کے اعمال کے صحیفے ہیں۔ علیین دیوانِ خیر کا نام ہے جس میں صلحاء کا عمل لکھا جاتا ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے مفسرین سے نقل کیا ہے کہ یہ کچہری ساتویں آسمان کے اوپر ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ ارواحِ مومنین کی قرار گاہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جنت میں ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ملائکہ کی صفت ہے جو ملائے اعلیٰ کہلاتے ہیں یا سبز رنگ کے زبرجد کی ایک تختی ہے جو عرش کے نیچے لٹکتی ہے، اس میں صالحین کے اعمال لکھے جاتے ہیں۔ یا عرش کا پائیہ راست ہے، یا مراتبِ عالیہ سے عبارت ہے جو جلالت کے ساتھ محفوظ ہیں۔ اللہ نے ان کو اعلیٰ اور اعظم بنایا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کعب احبار رحمہ اللہ سے پوچھا تھا کہ اس آیت کے کیا معنی ہیں؟ کہا: مومن کی روح قبض کر کے آسمان پر لے جاتے ہیں، اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ فرشتے بشارت لے کر ملاقات کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ روح عرش تک جاتی ہے اور فرشتے بھی اوپر کو چڑھتے ہیں۔ پھر عرش کے نیچے سے ایک کاغذ نکال کر اور لکھ کر اور مہر لگا کر زیرِ عرش رکھ دیتے ہیں، اس سے جزا کے دن نجات کی شناخت ہو گی۔[4] (رواہ ابن المبارک وغیرہ)۔ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت رفعاً یہ ہے: ''صَلَاةٌ عَلَى أَثَرِ صَلَاةٍ لَا لَغْوَ بَيْنَهُمَا كِتَابٌ فِي عِلِّيِّيْنَ''[5] (أخرجه أحمد وأبو داود والطبراني وابن مردويه) ''نماز کے بعد نماز کہ ان دونوں کے درمیان کوئی لغو بات نہ کہی ہو یہ علیین میں تحریر ہونے کے مترادف ہے۔'' ﴿مَّرْقُوْمٌ﴾ بہ معنی ''مسطور'' ہے، یعنی اس میں ابرار کے اعمال اور جو کرامت ان کو آخرت میں ملے گی وہ سب کچھ لکھا ہے، یہ تفسیرِ الٰہی ساری تفاسیرِ خلق سے بے نیاز کرتی ہے۔ امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں یہ لکھا ہے کہ ''إِنَّ فُلَانًا أَمِنَ مِنَ النَّارِ رَقْمًا يَا لَهُ مِنْ رَقْمٍ مَّا أَبْهَاهُ وَأَجْمَلَهُ'' بلاشبہ

---

[1] تفسير الطبري (٢٩٧/٢٤، ٢٩٨)
[2] تفسير الطبري (٣٠٠/٢٤، ٣٠١) تفسير ابن كثير (٦٢٥/٤، ٦٢٦)
[3] فتح القدير (٥٣٥/٥)
[4] تفسير الطبري (٢٩١/٢٤، ٢٩٢) الدر المنثور (٤٤٣/٨)
[5] مسند أحمد (٢٦٨/٥) سنن أبي داود (٥٥٨) المعجم الأوسط (٣١٤/٣) صحيح الجامع (٦٢٢٨)

فلاں جہنم سے بچ گیا، کتنا خوش نصیب ہے!''

شہود مقربین یہ کتاب کی دوسری صفت ہے، یعنی فرشتے اس کتاب کی حفاظت کے لیے حاضر رہتے ہیں، یا قیامت کے دن گواہی دیں گے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے، وہ صحیح ہے۔ یہ بات کتاب کی اور کتاب والے کی تعظیم کے لیے ہوگی۔ پہلی بات شہود سے ماخوذ ہے اور دوسری شہادت سے ماخوذ ہے۔ امام وہب اور ابن اسحاق ؒ کہتے ہیں کہ اس جگہ مقربین سے مراد اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ مومن جب کوئی نیک کام کرتا ہے تو فرشتے اس کے نامۂ اعمال کو اوپر لے جاتے ہیں۔ اس کتاب کا نور آسمان میں ایسے چمکتا ہے، جیسے زمین میں سورج کی چمک ہوتی ہے، یہاں تک کہ اسرافیل علیہ السلام کے پاس بھیجتے ہیں، وہ اس صحیفے پر مہر لگا دیتے ہیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مقربین آسمان والے ہیں۔[2]

پھر اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا کہ ابرار، یعنی طاعت والے عظیم نعمتوں میں ہوں گے جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا، وہ چھپر کھٹوں میں بیٹھے ہوئے جو جو کرامات اللہ نے ان کے لیے تیار کی ہیں، انھیں دیکھیں گے۔ یہی قول امام عکرمہ اور مجاہد ؒ کا ہے۔ امام مقاتل ؒ نے کہا ہے کہ اہل نار کو دیکھیں گے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ اللہ کے جلال و جمال کا ملاحظہ کریں گے ان کے چہروں سے تازگی اور آسودگی پہچانی جائے گی، کیوں کہ ان کے چہرے نورِ حسن اور سفیدی اور تازگی اور تنعم سے پر رونق ہوں گے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جنت میں ایک چشمہ ہے، اس سے وضو و غسل کریں گے، ان پر نعمت کی تازگی، یعنی نعمتوں کی طراوت اور راحت کی تر و تازگی ظاہر ہوگی۔[4] یہ ہر صالح کو خطاب ہے۔ امام عطاء ؒ نے کہا ہے کہ اللہ ان کے جمال اور رنگ کو اتنا بڑھا دے گا جو کسی صفت کرنے والے کے بیان سے باہر ہے۔ ان کو وہاں مہر لگائی گئی شراب کا پیالہ ملے گا جس کی مہر سوا ان کے کوئی نہ کھولے گا۔ امام ابو عبید، اخفش، مبرد اور زجاج ؒ نے کہا ہے کہ ﴿ رَحِيْقٍ ﴾ شرابِ ناب کو کہتے ہیں جس میں کوئی مفسد چیز نہ ہو۔ امام خلیل ؒ نے کہا ہے کہ ﴿ رَحِيْقٍ ﴾ سب سے عمدہ شراب ہے۔ صحاح میں کہا ہے کہ صفوۂ خمر ہے۔ امام مجاہد ؒ نے کہا ہے کہ بادۂ سفید صاف کہنہ ہے۔[5]

شراب کہنہ کہ روشنگر رواں منست مصاحب من و پیر من و جوان من ست

''پرانی شراب جو میری روح کو روشن کرنے والی ہے وہی میری ساتھی، عمر رسیدہ اور جوان ہے۔''

ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ مَّخْتُوْمٍ ﴾ بہ معنی مطین ہے[6] یعنی اس کو گلِ حکمت کر رکھا ہے کہ کوئی اس کو ہاتھ نہ لگائے، یہاں تک کہ ابرار اس کی مہر توڑیں۔ سورت محمد میں فرمایا ہے: ﴿ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ ﴾ [محمد: ١٥] ''اور شراب کی نہریں ہیں۔'' حالاں کہ نہر پر مہر نہیں لگائی جاتی۔ معلوم ہوا کہ اس جگہ مراد یہ ہے کہ یہ شراب بوتلوں میں بھر

---

① تفسير القرطبي (١٩/٢٦٤) ② تفسير الطبري (٢٤/٢٩٤) ③ تفسير القرطبي (١٩/٢٦٤)
④ الدر المنثور (٨/٤٥١) ⑤ فتح القدير (٥/٥٣٥، ٥٣٦) ⑥ تفسير البغوي (٨/٣٦٧)

کر مہر لگا کر رکھی گئی ہے، کیوں کہ نہایت شریف و نفیس ہے۔ وہ خمر اور ہے جو نہروں میں بہتی ہے۔ اس شراب کا آخر میں مزہ رائحۂ مشک ہے، پینے والا جب اس شراب کو پی چکے گا اور پیالے کو منہ سے الگ کرے گا تو اس کو مشک کی خوشبو آئے گی۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے بر آہوئے چنیں بستہ اند

''یہ تیری زلف کی کارستانی ہے کہ تو مشک بکھیرتا ہے مگر عاشق لوگ مصلحتاً یہ تہمت ہرن پر لگاتے ہیں۔''

یا یہ مدعا ہے کہ اکواب و اباریق (آبخورے اور گڑویاں) اس رحیقِ انیق کے بجائے خاک مختوم بہ مشک ہوں گے۔ گویا کمال نفاست اور خوشبو کی پاکیزگی کی ایک مثال ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس میں کافور اور مسک کی خوشبو شامل ہو گی۔ صحاح میں کہا ہے: ''اَلْخِتَامُ الطِّيْنُ الَّذِيْ يُخْتَمُ بِهٖ'' ''ختام وہ مٹی ہے جس سے مہر لگائی جاتی ہے۔'' یہی قول امام ابن زید رحمہ اللہ کا بھی ہے۔[1] اب چاہیے کہ جو لوگ راغبِ تنعم ہیں، وہ اس خوشبو والے بادہ میں تنافس کے لیے جھگڑتے ہیں اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ یہ چیز صرف مجھے ملے دوسرے کے ہاتھ نہ لگے۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصل میں نفیس شے کے معنی میں ہے جس پر نفوس حرص کریں اور ہر کوئی اس کے متعلق اپنے غیر پر بخیل ہو۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اب چاہیے کہ جلدی کریں جلدی کرنے والے۔

امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اب چاہیے کہ جھگڑیں جھگڑنے والے۔[2] اور یہ بات اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی کہ بھلائی کے کاموں کی طرف جلدی کریں اور برائیوں سے باز رہیں۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی انتظار کرنے والے منتظر ہوں۔[3] یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ ﴿ رَحِيْقٍ ﴾ مذکور کی دوسری صفت یہ فرمائی کہ اس شراب کا مزاج تسنیم ہے، یعنی اس شراب سے مزاج پکڑا ہے جو اُن پر اوپر سے گرائی جاتی ہے۔ لغت میں ﴿ تَسْنِيْمٍ ﴾ کے اصل معنی ارتفاع کے ہیں۔ ﴿ تَسْنِيْمٍ ﴾ پانی کا ایک چشمہ ہے جو اوپر سے نیچے کو بہتا ہے۔ یہ شراب اہلِ جنت کی سب سے اچھی شراب ہے جو خاص طور پر صرف متقین کو ملے گی۔ باقی سارے بہشت والوں کو جیسے کہ اصحابِ یمین ہیں، یہ شراب ملا کر دی جائے گی۔ کسی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے: ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ﴾[4] [السجدة: ١٧] ''کوئی نفس نہیں جانتا جو کچھ ہم نے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لیے پوشیدہ کر رکھی ہے۔'' سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ جنت میں ایک چشمہ ہے جو اصحابِ یمین کو ملا کر پلایا جائے گا اور اسے خالص صرف مقرب لوگ پئیں گے۔[5] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ شراب کا یہ چشمہ زیرِ عرش سے جاری ہے۔[6]

---

[1] تفسير القرطبي (١٩/٢٦٥) [2] تفسير البغوي (٨/٣٦٨) [3] الكشاف (٤/٧٢٤)
[4] الدر المنثور (٨/٤٥٢) [5] تفسير الطبري (٢٤/٣٠٠) [6] تفسير القرطبي (١٩/٢٦٦) فتح البيان (١٩/١٣٢-١٣٧)

إِنَّ الَّذِيْنَ أَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ﴿٢٩﴾
وَإِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ﴿٣٠﴾ وَإِذَا انْقَلَبُوْا إِلَى أَهْلِهِمُ
انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ﴿٣١﴾ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوْا إِنَّ هٰؤُلَاءِ لَضَالُّوْنَ ﴿٣٢﴾
وَمَا أُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ﴿٣٣﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنَ
الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ﴿٣٤﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنْظُرُوْنَ ﴿٣٥﴾ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ
مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٣٦﴾

بلاشبہہ مجرم لوگ (دنیا میں) مومنوں پر ہنستے تھے (29) اور جب وہ ان (مسلمانوں) کے پاس
سے گزرتے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے۔ (30) اور جب وہ اپنے اہل وعیال
کی طرف لوٹتے تو دل لگی کرتے لوٹتے (31) اور جب وہ (کافر) ان (مسلمانوں) کو دیکھتے تو
کہتے تھے بلاشبہہ یہ یقیناً گمراہ لوگ ہیں (32) حالانکہ وہ (کافر) ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے
تھے (33) چنانچہ آج مومن لوگ، کافروں پر ہنس رہے ہوں گے (34) مسہریوں پر بیٹھے انھیں دیکھ
رہے ہوں گے (35) (اور کہیں گے:) کیا کافروں کو ان حرکتوں کا بدلہ مل گیا جو وہ کرتے تھے؟ (36)

دنیا میں مجرموں کا مومنوں سے استہزاء کرنا:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مجرموں کا حال بیان فرمایا کہ وہ دنیا میں ایمان دار لوگوں سے ہنسی دل لگی کرتے تھے۔ ان کو حقیر، فقیر، ذلیل اور قلیل جانتے تھے۔ ان کا سامنا ہونے کے وقت حقارت کرتے اور ٹھٹھے لگاتے تھے، پھر اپنے گھروں کو خوشی خوشی آتے، جو مانگتے وہی پاتے تھے۔ اس کے باوجود اللہ کی نعمت کا کچھ شکر ادا نہیں کرتے تھے، بلکہ مومنین کی تحقیر اور حسد میں مشغول رہتے اور کہتے کہ یہ لوگ تو گمراہ ہیں جو ہمارے دین پر نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ ہنسنے والے، طنز کرنے والے، گمراہ بتانے والے، کچھ ان مومنوں پر نگہبان مقرر نہیں ہوئے ہیں کہ ان کے اعمال واقوال کی حفاظت کیا کریں۔ یہ تکلیف ہرگز ان کو نہیں دی گئی، پھر کس لیے یہ ایمان والوں سے چھیڑ چھاڑ رکھتے ہیں اور ان کو اپنے ضحک (تمسخر) کا نشانہ مقرر کر رکھا ہے۔

مباش در صد و بیشمار خندیدن — کہ صبح باخت نفس در دو بار خندیدن

”مال کو روکنے اور زیادہ ہنسنے والا نہ بن کہ صبح روح دوبار ہنسنے ہی میں اپنی جان ہار گئی۔“

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴿١٠٨﴾ إِنَّهُ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْ عِبَادِيْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا آمَنَّا

فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا حَتّٰۤى اَنْسَوْكُمْ ذِكْرِيْ وَكُنْتُمْ مِّنْهُمْ تَضْحَكُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ اِنِّيْ جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوْۤا اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ [المؤمنون: ۱۰۸-۱۱۱] ”اللہ تعالیٰ فرمائے گا پھٹکارے ہوئے یہیں پڑے رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو، میرے بندوں کی ایک جماعت تھی جو برابر یہی کہتی رہی کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لا چکے ہیں تو ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما تو سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (لیکن) تم انھیں مذاق میں ہی اڑاتے رہے یہاں تک کہ (اس مشغلے نے) تم کو میری یاد (بھی) بھلا دی اور تم ان سے مذاق ہی کرتے رہے۔ میں نے آج انھیں ان کے صبر کا بدلہ دے دیا ہے کہ وہ خاطر خواہ اپنی مراد کو پہنچ چکے ہیں۔“

لہٰذا اس جگہ یوں فرمایا کہ آج کے دن، یعنی قیامت کے روز وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں کفار سے مضحکہ کریں گے، ان کے اس ضحک کے مقابلے میں جو دنیا میں ان سے کرتے تھے اور اپنے تختوں پر جلوہ گر رہ کر اللہ پاک کے دیدار کا مشاہدہ کریں گے۔ یہ نظر کرنا اس قول کے مقابلے میں ہے کہ وہ ان کو گمراہ بتاتے تھے، اب جان لیں گے کہ وہ گمراہ تھے یا یہ گمراہ ہیں، بلکہ وہ تو اللہ کے مقرب اولیاء ٹھہرے اور عزت والے گھر میں مشرف بدیدار ہوئے۔ ولله الحمد، اللھم اجعلنا منھم. اب کافر لوگ دیکھیں گے کہ اس ہنسی اور ٹھٹھے بازی کے مقابلے میں جو وہ مومنوں کے ساتھ کیا کرتے تھے، آج کے دن اس کا بدلہ انھیں ملا یا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بدلہ ملا اور خوب بھرپور جزا ملی کہ یاد ہی کریں گے۔ اللھم احفظنا و اغفرلنا و ارحمنا و ما ذلك عليك يا عزيز بعزيز.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اس جگہ مجرمین سے کفارِ قریش مراد ہیں، جیسے: ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل اور ان کے یار اہلِ مکہ اور وہ لوگ جو کفر میں ان کے ہم آواز تھے۔ اللہ نے اس جگہ ان کی چار قبیح خصلتوں کا ذکر کیا: ایک یہ کہ وہ مومنین سے استہزاء کرتے تھے، جیسے: عمار، بلال، صہیب رضی اللہ عنہم اور فقراء مومنین میں سے ان کے ساتھی کہ ان سے مسخرا پن کرتے اور پچھلا قول یہ تھا کہ یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں۔ دوسری خصلت یہ کہ جب ان کفار کا گزر ان مومنین کی مجالس میں ہوتا تو آنکھ یا ابرو سے غمزہ اور اشارہ کرتے کہ یہی لوگ ہیں جو مسلمان بنے ہیں۔ تیسری خصلت یہ تھی کہ جب اس مجلس سے اپنے گھر پر آتے تو اترا کر مسلمانوں پر طعن کرتے اور ان پر عیب لگانے سے مزہ اٹھاتے۔ اور چوتھی خصلت یہ تھی کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو دیکھتے کہ انھوں نے موجودہ نعمتوں کو چھوڑ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمسک کیا ہے (اس کو مضبوط تھام لیا ہے) تو کہتے کہ یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فریب دیا ہے، یہ لوگ نقد چھوڑ کر ادھار کی امید پر بیٹھے ہیں، سخت بے وقوف ہیں کہ حقیقت کو چھوڑ کر خیال کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور یہ عین گمراہی ہے، حالاں کہ یہ کوئی ان بے چاروں پر موکل نہیں کیے گئے کہ رات دن اُن کے احوال و اعمال

کے نگران اور متلاشی رہیں اور ان کی ہدایت اور گمراہی کے شاہد بنیں، بلکہ ان کو تو یہ حکم ہے کہ اپنے نفس کی اصلاح کریں کہ یہ شغل ان کے دوسرے شغل سے ان کے لیے کہیں بہتر ہے کہ لوگوں کی عیب جوئی کرتے پھریں اور سب کو بے وقوف ٹھہرائیں۔

چنانچہ اب آخرت کے دن وہی مومن کافروں پر ہنسیں گے جب ان کو ذلیل و خوار اور مغلوب دیکھیں گے، جیسا کہ وہ دنیا میں ان پر ہنستے تھے اور اپنے تختوں پر سے ان کی دوری، توہین، صغار اور ذلت کا مشاہدہ اس عزت و تکبر کے بعد کریں گے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین نے کہا ہے کہ جنت والے جب چاہیں گے اہلِ نار کے منازل کی طرف نظر کریں گے، وہ آگ میں عذاب دیے جا رہے ہوں گے، یہ دیکھ کر ہنسیں گے جس طرح کہ وہ ان پر ہنستے تھے۔ امام ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ نار سے کہا جائے گا کہ باہر نکلو اور دروازے کھول دیے جائیں گے جب نکلنا چاہیں گے اور دروازوں تک پہنچیں گے تو وہ دروازے بند کر دیے جائیں گے۔ مومنین اس حال کو دیکھ رہے ہوں گے۔[1] یہ مطلب ہے اس آیت کا۔ یہ سوال کہ آیا کفار نے اپنے فعل کی جزا پائی یا نہیں بطور تقریر ہے، یا بعض مومن بعض سے یہ بات کہیں گے۔ ثواب جزا کو کہتے ہیں، وہ جزائے خیر ہو یا جزائے شر۔[2]

---

[1] فتح القدیر (۵/۵۳۷) [2] فتح البیان (۱۵/۱۳۷۔۱۴۰)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْاِنْشِقَاقِ

اس میں تیئس (۲۳) یا پچیس (۲۵) آیتیں ہیں۔ یہ سورت بلا اختلاف مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ مکہ مکرمہ میں اتری ہے۔[1] امام ابو رافع رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ نمازِ عشاء پڑھی، انھوں نے ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴾ میں سجدہ کیا۔ میں نے کہا کہ تم نے سجدہ کیا؟ کہا: میں نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سجدہ کیا، اس لیے میں ہمیشہ اس میں سجدہ کروں گا، یہاں تک کہ ان سے جا ملوں۔[2] (أخرجه الشيخان وغيرهما) اہلِ سنن وغیرہم کی روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ ہے کہ ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴾ میں اور ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ﴾ میں سجدہ کیا۔[3] سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر میں ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴾ اور اس جیسی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔[4] (أخرجه ابن خزيمة والروياني في مسنده والضياء المقدسي في المختارة)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ۙ﴿۱﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۙ﴿۲﴾ وَ اِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۙ﴿۳﴾
وَ اَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَ تَخَلَّتْ ۙ﴿۴﴾ وَ اَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ؕ﴿۵﴾ يٰۤاَيُّهَا
الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۚ﴿۶﴾ فَاَمَّا مَنْ
اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ﴿۷﴾ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۙ﴿۸﴾ وَّ يَنْقَلِبُ اِلٰۤى
اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ﴿۹﴾ وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ ۙ﴿۱۰﴾ فَسَوْفَ
يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۙ﴿۱۱﴾ وَّ يَصْلٰى سَعِيْرًا ؕ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ؕ﴿۱۳﴾
اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ ۚ﴿۱۴﴾ بَلٰۤى ۚ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا ؕ﴿۱۵﴾

[1] الدر المنثور (۴٥٤/۸) [2] صحيح البخاري (۷۳۲) صحيح مسلم (٥۷۸)

[3] صحيح مسلم (٥۷۸) سنن أبي داود (۱۴۰۷) سنن الترمذي (٥۷۳) سنن النسائي (۹٦۳) سنن ابن ماجه (۱۰٥۸)

[4] صحيح ابن خزيمة (۲٥۷/۱) الدر المنثور (۴٥٥/۸)

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

جب آسمان پھٹ جائے گا ① اور وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گا اور اس کے لائق یہی ہے ② اور جب زمین پھیلا دی جائے گی ③ اور اس کے اندر جو کچھ ہے، وہ اُسے پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی ④ اور وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی، اور اس کے لائق یہی ہے ⑤ اے انسان! بے شک تو اپنے رب کی طرف (جانے کے لیے) سخت محنت کر رہا ہے، بالآخر تو اس سے ملنے والا ہے ⑥ پھر جس شخص کو اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا ⑦ تو جلد ہی اس سے آسان حساب لیا جائے گا ⑧ اور وہ اپنے اہل کی طرف ہنسی خوشی لوٹے گا ⑨ اور جس شخص کو اس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ پیچھے دیا گیا ⑩ تو وہ عن قریب تباہی کو دعوت دے گا ⑪ اور وہ بھڑکتی آگ میں جا پڑے گا ⑫ بے شک وہ (دنیا میں) اپنے اہل و عیال میں بڑا خوش تھا ⑬ بے شک اس نے سمجھا تھا کہ وہ ہرگز (اللہ کی طرف) لوٹ کر نہیں جائے گا ⑭ کیوں نہیں! بے شک اس کا رب اسے دیکھ رہا تھا ⑮

روزِ قیامت آسمان پھٹ جائے گا اور زمین پھیلا دی جائے گی:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے رب کے حکم کی اطاعت کرے گا۔ یہ پھٹنا قیامت کے دن ہوگا اس کو یہی زیبا اور واجب ہے کہ اپنے رب کے حکم کی اطاعت بجا لائے، کیوں کہ اس کا رب وہ عظیم القدرت ہے کہ کوئی اس کا مانع یا اس پر غالب نہیں ہے، بلکہ وہ ہر چیز پر قاہر ہے اور ہر چیز اس کے لیے ذلیل ہے اور زمین بھی اس دن مبسوط و مفروش و وسیع ہو جائے گی۔ علی بن حسین رحمہ اللہ رفعاً کہتے ہیں کہ جب قیامت کا دن ہوگا اللہ تعالیٰ زمین کو ادیم (کمایا ہوا چمڑا) کی طرح کر دے گا یہاں تک کہ لوگوں میں سے کسی بشر کے لیے جگہ نہ ہوگی مگر دو قدم کی جگہ۔ سب سے پہلے میں ہی بلایا جاؤں گا اور جبریل علیہ السلام رحمان کی دائیں جانب پر ہوں گے؛ واللہ! جبریل علیہ السلام نے اس سے پہلے اس کو نہیں دیکھا۔ میں کہوں گا: اے رب! اس شخص نے مجھے خبر دی تھی کہ تو نے اس کو میرے پاس بھیجا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اس نے سچ کہا۔ پھر میں شفاعت کروں گا اور کہوں گا: اے رب! تیرے بندوں نے زمین کی اطراف میں تیری عبادت کی ہے۔ فرمایا: یہی مقامِ محمود ہے۔[1] (رواہ ابن جریر)

امام مجاہد، سعید اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ زمین کے اندر جتنے مردے ہیں زمین ان کو نکال کر باہر ڈال دے

[1] تفسیر الطبري (٢٤/٣١٠، ٣١١) یہ روایت مرسل ہے۔

گی اور خالی ہو جائے گی، [1] اس کو یہی لائق ہے۔ پھر انسان کو خطاب فرمایا کہ تو اپنے رب کی طرف سعی کرتا ہے، خوب کوشش کر کے عمل بجا لاتا ہے، چنانچہ تو جب اس سے ملے گا تو اپنے اچھے اور برے عمل کو پائے گا۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جبریل علیہ السلام نے کہا ہے کہ اے محمد! ''عِشْ مَا شِئْتَ فَإِنَّكَ مَيِّتٌ وَأَحْبِبْ مَنْ شِئْتَ فَإِنَّكَ مُفَارِقُهُ وَاعْمَلْ مَا شِئْتَ فَإِنَّكَ مُلَاقِيهِ'' [2] (رواه أبو داود الطيالسي) یعنی زندہ رہ جتنا تو چاہے تو ایک دن مرے گا اور چاہ جس کو تو چاہے ایک دن اس کو چھوڑے گا اور عمل کر جو تو چاہے تو اپنے عمل سے ملے گا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ضمیر رب کی طرف پھرتی ہے، یعنی تو اپنے رب سے ملے گا، وہ تجھ کو تیرے عمل کا بدلہ دے گا اور تیری سعی کا عوض کرے گا، اس بنا پر دونوں قول متلازم ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تو جو عمل کرتا ہے اچھا یا برا اسی عمل کے ساتھ تیری اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوگی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اے ابن آدم! تیری کدح، یعنی سعی و کوشش ضعیف ہے سو جس کسی سے ہو سکے کہ اس کی سعی اللہ کی طاعت میں ہو تو وہ کام کرے۔ ولا قوة إلا بالله. [3]

قیامت کے دن حساب:

حسابِ یسیر سے مراد آسان حساب ہے جس میں کوئی مشکل نہ ہو، یعنی سارے دقائقِ اعمال (چھوٹے چھوٹے اعمال) کی تحقیق نہ کی جائے، کیوں کہ جس کا حساب اس طرح پر ہوا وہ لامحالہ طور پر ہلاک ہوگا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «مَنْ نُوقِشَ الْحِسَابَ عُذِّبَ» یعنی جس سے حساب میں اینچ کھینچ ہوئی وہ عذاب کیا جائے گا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے کہا: کیا اللہ نے نہیں فرمایا: ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا﴾؟ فرمایا یہ کچھ حساب نہیں ہے، لیکن پیش کیا جانا ہے اور جس کے ساتھ حسابِ قیامت کے دن میں مناقشہ کیا گیا (باریکی نکالی گئی) اسے عذاب کیا جائے گا۔ [4] (رواه أحمد وهكذا رواه الشيخان والترمذي و النسائي و ابن جرير)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری روایت یہ ہے کہ ''نہیں کوئی شخص جس کا قیامت کے دن حساب لیا جائے گا، لیکن اسے عذاب کیا جائے گا۔'' میں نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے: ﴿فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا﴾؟ کہا: «ذَاكَ الْعَرْضُ، إِنَّهُ مَنْ نُوقِشَ الْحِسَابَ عُذِّبَ» ''یہ تو سرسری سی پیشی ہے، جس سے پڑتال ہوئی وہ عذاب کیا جائے گا۔'' اور اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا گویا زمین کھودنے لگے۔ [5] (رواه ابن جرير) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی تیسری روایت یہ ہے: «مَنْ نُوقِشَ الْحِسَابَ أَوْ مَنْ حُوسِبَ عُذِّبَ» ''جس سے پڑتال ومحاسب ہوا وہ عذاب دیا جائے گا۔'' پھر کہا کہ ﴿حِسَابًا يَسِيرًا﴾ اللہ پر پیش کیا جانا ہے اللہ ان کو دیکھے گا۔ [6] (رواه ابن جرير)۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی چوتھی

---

[1] تفسير الطبري (٣١١/٢٤) [2] مسند الطيالسي (٢٤٢/١) صحيح الجامع (٤٣٥٥) [3] تفسير الطبري (٣١٢/٢٤، ٣١٣)

[4] صحيح البخاري (١٠٣) صحيح مسلم (٢٨٧٦) مسند أحمد (٤٧/٦) سنن الترمذي (٢٤٢٦)

[5] تفسير الطبري (٣١٤/٢٤) [6] تفسير الطبري (٣١٣/٢٤)

روایت یہ ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو سنا، بعض نماز میں کہتے تھے: «اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِي حِسَابًا يَّسِيْرًا» ''اے اللہ! مجھ سے آسان حساب لے۔'' جب نماز پڑھ چکے۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ''یسیر'' کیا ہے؟ فرمایا: یہ ہے کہ اس کے نامۂ اعمال میں نظر فرما کر تجاوز کرے گا اور جس سے حساب میں مناقشہ ہوا، وہ عذاب میں پھنسا ہلاک ہوا۔[1] (رواه أحمد صحيح على شرط مسلم)

پھر وہ اپنے گھر والوں کے پاس جو جنت میں ہوں گے خوش باخوش پھر کر آئے گا۔ یہ قول امام قتادہ اور ضحاک رحمہ اللہ کا ہے۔ ''مسرور'' بہ معنی شادمان ہے، وہ اللہ کی عطا پر خوش دل ہو گا۔ سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: تم ایسے عمل کرتے ہو جو پہچانتے نہیں ہو اور قریب ہے کہ عارف پھر کر اپنے گھر کی طرف آئے مسرور ہو کر یا مکظوم (غمگین، غصے میں بھرا ہوا) ہو کر۔[2] پھر جس کو اس کی کتاب پسِ پشت سے ملے گی، یعنی اس کا ہاتھ پیٹھ کی طرف پھیرا جائے گا، وہ نزدیک ہے کہ خسارے اور ہلاکت کو پکارے گا اور جلانے والی آگ میں گھسے گا، کیوں کہ وہ اپنے گھر میں خوش تھا، اس کو کچھ امور کے انجام کی فکر نہ تھی اور نہ ہی کچھ اس دن کا خوف تھا جو اس کے سامنے تھا۔ اس لیے اس ذرا سی خوشی کا انجام ایک طویل رنج و غم ہو گا۔ اس کو تو یہ گمان تھا کہ وہ اللہ کی طرف لوٹ کر نہ آئے گا یا موت کے بعد پھر وہ زندہ نہ ہو گا۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ وغیرہما کا ہے۔[3] ''حور'' کے معنی رجوع کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہاں! اللہ اس کو دیکھتا اور جانتا تھا کہ اس کو دوبارہ زندہ کرے گا جس طرح کہ اس کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا اور اس کو اس کے عمل کی جزا دے گا، وہ عمل خیر تھا تو جزائے خیر اور اگر شر تھا تو جزائے شر، وہ علیم و خبیر ہے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے کہا ہے کہ آسمان کا پھٹ جانا قیامت کی علامات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ﴾[5] [الفرقان: ٢٥] ''جس دن آسمان بادل سمیت پھٹ جائے گا۔'' یعنی ابر سفید ہو جائے گا یا کہکشاں سے انشقاق ہو گا۔ یہ قول سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا ہے۔ کہکشان آسمان کا دروازہ ہے۔[6] اہلِ ہیئت کہتے ہیں کہ یہ چھوٹے چھوٹے تارے ہیں، آپس میں ملے جلے ہوئے، ایک دوسرے سے متمیز نہیں ہیں، اس میں آسمان اس پھٹنے میں اپنے رب کا مطیع ہے، انکار نہ کرے گا اور زمین دراز ہو جائے گی، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، اس میں کوئی ٹیلہ اور اونچی جگہ باقی نہ رہے گی، بلکہ ایک صاف

---

(1) مسند أحمد (٦/٤٨) مستدرك الحاكم (١/٣٨٥) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔
(2) المعجم الكبير (٢/٩٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فيه يحيى بن عبد الحميد الحماني وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد: ١٠/٤٠٠)
(3) تفسير الطبري (٢٤/٣١٧)
(4) تفسير ابن كثير (٤/٦٢٨، ٦٢٩)
(5) فتح القدير (٥/٥٣٩)
(6) تفسير القرطبي (١٩/٢٦٩)

میدان کی طرح ہو جائیں گے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زمین برابر یکساں ہو جائے گی، جیسے دستر خوان بچھاتے ہیں۔ نہ کوئی بنا ہوگی، یعنی کوئی عمارت نہ ہوگی اور نہ پہاڑ ہوں گے، سب زمین کے اندر گھس جائیں گے،[1] یا زیادہ ہو جائیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قیامت کے دن زمین دراز کر دی جائے گی۔[2]

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: ''تُمَدُّ الْاَرْضُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَدَّ الْاَدِيْمِ ثُمَّ لَا يَكُوْنُ لِابْنِ آدَمَ فِيْهَا إِلَّا مَوْضِعُ قَدَمَيْهِ''[3] (أخرجه الحاكم قال السيوطي بسند جيد) ''قیامت کے دن زمین چمڑے کی طرح پھیلا دی جائے گی، ابن آدم کو بس دو قدم رکھنے کی جگہ ملے گی۔'' یہ بات کہ کسی آدمی کو زمین پر اپنے پاؤں رکھنے کے سوا جگہ نہیں ملے گی، اس بات پر دلیل ہیں کہ آدمی بہت کثیر تعداد میں ہوں گے۔ جتنے مردے اور زمین کے خزانے ہیں وہ سب زمین کے اوپر آ جائیں گے، زمین خالی رہ جائے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴾ [الزلزال: ۲] ''اور جب زمین اپنے بوجھ باہر نکال پھینکے گی۔'' یعنی بالکل خالی ہو جائے گی اور کوئی چیز بھی اس کے اندر باقی نہ رہے گی، گویا خالی ہونے کے لیے پوری پوری جدوجہد کرے گی اور بہ تکلف خالی ہو جائے گی۔ ان اشیاء کو نکالنے والا اللہ تعالیٰ ہوگا۔ اس خالی کرنے کے عمل میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری کرے گی اور اپنے رب تعالیٰ کا حکم مانے گی اور اس کو ایسی ہی فرمانبرداری کرنا لازم ہے۔ اس جگہ ''انسان'' سے مراد جنسِ انسان ہے جس میں مومن اور کافر شامل ہیں۔ یا کافر انسان مراد ہے، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔

''کدح'' پوری محنت کے ساتھ سعی و کوشش کرنے کو کہتے ہیں، خواہ وہ شے خیر ہو یا شر، مطلب یہ ہے کہ اے انسان! تو اپنے عمل میں یا رب سے ملاقات کرنے میں سعی کرنے والا ہے۔ مختار میں کہا ہے کہ ''کدح'' سعی، اور ''کد'' کسب کو کہتے ہیں۔[4] آدمی اس دن اپنے عمل سے ملے گا، پھر جس کی کتاب داہنے ہاتھ میں آئی وہ ایمان والا ہے، اس کا حساب بہت سہل اور آسان ہوگا، اس سے کچھ پوچھ گچھ نہ کی جائے گی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس لیے کہ اس کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ مفسرین کہتے ہیں کہ سیئات کو اس پر پیش کر کے اللہ بخش دے گا۔ یہ حسابِ یسیر ہوا۔[5] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: جس شخص میں تین خصلتیں ہوں گی، اس کا حساب آسان ہوگا اور اللہ اس کو اپنی رحمت سے جنت میں داخل کرے گا: ایک یہ کہ جو اس کو محروم رکھے اسے دے۔ دوسرے یہ کہ جو اس پر ظلم کرے اس کو معاف کرے، تیسرے یہ کہ جو اس سے قطع کرے یہ اس سے وصل کرے (قطع تعلق کرنے والے سے رشتہ جوڑے)۔[6] (أخرجه البزار و الطبراني و البيهقي و الحاكم)

---

[1] فتح القدير (۵/۵۴۰) [2] مستدرك الحاكم (۲/۵۶۳) [3] مستدرك الحاكم (۴/۶۱۴) الدر المنثور (۸/۴۵۶)
[4] مختار الصحاح (۱/۵۸۶) [5] فتح القدير (۵/۵۴۱)
[6] مسند البزار (۱۵/۲۱۹) المعجم الأوسط (۱/۲۷۹) سنن البيهقي الكبرىٰ (۱۰/۲۳۵) مستدرك الحاكم (۲/۵۶۳) اس کی سند میں ''سلیمان بن داود'' سخت ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۱۵۳۵)

ایسا شخص اپنے گھر والوں کے پاس خوش ہو کر آئے گا، وہ گھر والے جو اس کو جنت میں ملیں گے، یا جو دنیا میں تھے، جیسے: بیویاں اور اولاد، وہ اس سے پہلے جنت میں پہنچ چکے ہوں گے، یا ان دونوں کے پاس آئے گا یہ خوشی خیر اور عزت کی ہوگی جو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی۔ اور جس کو کتاب بائیں ہاتھ میں، یا پسِ پشت سے ملے گی وہ اپنی ہلاکت کی تمنا کرے گا۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس لیے کہ اس کا سیدھا ہاتھ اس کی گردن سے بندھا ہو گا اور بایاں ہاتھ پسِ پشت ہوگا۔[1] وہ کتاب کو پڑھ کر "یَا وَیْلَاهُ یَا ثُبُوْرَاهُ" کہے گا۔ "ثبور" بہ معنی ہلاکت ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بہ معنی ویل ہے۔[2] پھر دوزخ میں جا کر وہاں کی شدت اور تیز گرمی کو اٹھائے گا، کیوں کہ وہ دنیا میں اپنے گھر والوں میں خوش باش تھا، خواہشِ نفس کی پیروی کرتا تھا، اتراتا تھا، اس کو آخرت کا کوئی خطرہ (خیال) نہ تھا، بلکہ وہ نفس اور خواہش کا تابع تھا۔ وہ اس بات کا یقین رکھتا تھا کہ وہ حساب کتاب، عقاب اور ثواب کے لیے مبعوث نہ ہوگا، اس لیے کہ وہ آخرت کا منکر تھا۔ امام راغب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "حور" کے معنی کسی امر میں تردد کرنا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿يَحُوْرَ﴾ کلمہ حبشیہ ہے بہ معنی "یرجع"[3] اور اسی طرح کا قول نبی اکرم ﷺ کا ہے: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْكَوْرِ»[4] "یعنی میں زیادتی کے بعد نقصان سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔" پھر فرمایا کہ ہاں اس کا رب اس کو اور اس کے عمل کو جاننے والا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اس کی پیدائش سے پہلے ہی جانتا تھا کہ اس کا مرجع اللہ ہی کی طرف ہوگا۔[5]

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ﴿16﴾ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ﴿17﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ﴿18﴾ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ﴿19﴾ فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿20﴾ وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا يَسْجُدُوْنَ ﴿21﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ ﴿22﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ ﴿23﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿24﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿25﴾

پس میں قسم کھاتا ہوں شفق کی (16) اور رات کی اور اس کی جو کچھ وہ سمیٹتی ہے (17) اور چاند کی جبکہ وہ پورا ہو جاتا ہے (18) تم ضرور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کو پہنچو گے (19) پھر ان (کافروں) کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے؟ (20) اور جب ان پر قرآن پڑھا جائے تو

[1] فتح القدير (٥٤١/٥) [2] الدر المنثور (٤٥٧/٨) [3] فتح القدير (٥٤١/٥، ٥٤٢)

[4] صحيح مسلم (١٣٤٣) سنن النسائي (٥٤٩٨) [5] معاني القرآن (٣٠٥/٥) فتح البيان (١٤٣/١٥-١٤٤)

سجدہ نہیں کرتے ﴿21﴾ بلکہ کافر تو (الٹا) جھٹلاتے ہیں ﴿22﴾ اور جو کچھ وہ (سینوں میں) محفوظ رکھتے ہیں، اللہ اسے خوب جانتا ہے ﴿23﴾ تو آپ انھیں دردناک عذاب کی خبر دے دیجیے ﴿24﴾ مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کے لیے بے انتہا اجر ہے ﴿25﴾

شفق کا معنی ومفہوم:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ شفق سرخی کو کہتے ہیں اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ سفیدی کو کہتے ہیں۔[1] غرضیکہ سورج نکلنے سے پہلے آسمان کے کنارے پر جو سرخی ہوتی ہے جس طرح کہ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[2] یا غروب کے بعد جو سرخی ہوتی ہے، جس طرح کہ اہلِ لغت کے نزدیک مشہور ہے، اس کو شفق کہتے ہیں۔ خلیل بن احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شفق غروبِ آفتاب کی سرخی ہے، عشاء کے وقت تک جب وہ جاتی رہتی ہے تو کہتے ہیں کہ شفق غائب ہو گیا۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شفق بقیہ ضوئے آفتاب ہے اور وہ سرخی ہے جو اول شب سے عشاء تک ہوتی ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شفق مغرب اور عشاء کے درمیان ہوتا ہے۔[3]

صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے رفعاً مروی ہے کہ مغرب کا وقت اس وقت تک ہے کہ شفق غائب نہیں ہوا۔[4] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امام جوہری اور خلیل رحمہما اللہ کے قول کے مطابق شفق سرخی کو کہتے ہیں، لیکن صحیح امام مجاہد رحمہ اللہ سے اس آیت میں یہ ہے کہ اس جگہ شفق سے مراد سارا دن ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مراد سورج ہے،[5] یہ اس لیے کہ اس کے ساتھ ہی شب کی قسم کا ذکر ہے، گویا اجالے اور اندھیرے دونوں کی قسم اٹھائی ہے۔ ﴿ وَسَقَ ﴾ بہ معنی جمع ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے دن کے پشت پھیرنے کی اور رات کے آنے کی قسم اٹھائی ہے۔ اور دوسروں نے کہا ہے کہ شفق سرخی اور سفیدی کو کہتے ہیں۔ یہ من جملہ ان الفاظ میں سے ہیں جن کے معانی ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔[6]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، امام حسن اور قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَسَقَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ رات نجم اور دآبہ (جانوروں) کی جامع ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی قسم ہے رات کی اور اس چیز کی جو رات کو سمٹ آتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "اتّساق" سے مراد اجتماع ہے، جبکہ چاند برابر ہو جائے۔ یہی قول امام عکرمہ، مجاہد، سعید بن جبیر، مسروق، ابو صالح، ضحاک اور ابن زید رحمہم اللہ کا ہے کہ ﴿ اِتَّسَقَ ﴾ بہ معنی "استوِی" ہے۔ حسن نے کہا: یعنی جبکہ چاند بھرپور ہو جائے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبکہ گول ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا نور کامل ہو کر بدر بن جائے۔[7]

---

(1) تفسير الصنعاني (٣/٣٥٩) (2) تفسير الطبري (٢٤/٣١٨) (3) تفسير ابن كثير (٤/٦٢٩، ٦٣٠)
(4) صحيح مسلم (٦١٢) (5) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤١١) (6) تفسير الطبري (٢٤/٣١٨)
(7) تفسير الطبري (٢٤/٣١٩-٣٢٢) تفسير ابن كثير (٤/٦٣٠)

انسان ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف بڑھ رہا ہے:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ رکوبِ طبق عن طبق سے مراد حال بعد حال ہے۔ ”قَالَ هٰذَا نَبِيُّكُمْ ﷺ“ [1] (هكذا رواه البخاري بهذا اللفظ) شاید مراد یہ ہے کہ میں نے یہ بات نبی اکرم ﷺ سے سنی ہے مراد حال بعد حال کی ہے۔ یہی قول امام عکرمہ، حسن اور مجاہد رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ [2] اس سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں، لہٰذا لفظ ﴿لَتَرْكَبُنَّ﴾ کو بہ فتحِ تاء و باء پڑھا ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اے محمد! تم ایک آسمان پر بعد دوسرے آسمان کے چڑھو گے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام مسروق اور ابو العالیہ رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے کہ سماء بعد سماء۔ [3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد شبِ معراج ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی دوسری روایت یہ ہے کہ منزل بعد منزل۔ تیسرا قول یہ ہے کہ امر بعد امر۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی اگلے لوگوں کے اعمال [4] گویا اس صحیح حدیث کے معنی کا ارادہ کیا ہے: ”لَتَرْكَبُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ حَذْوَ الْقُذَّةِ بِالْقُذَّةِ حَتّٰى لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمُوْهُ، قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَلْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى؟ قَالَ: فَمَنْ؟“ [5] ”تم بالکل پہلے لوگوں کی ڈگر پر چل پڑو گے حتی کہ اگر ان میں سے کوئی سانڈھے کی بل میں داخل ہوا تو تم بھی اس میں داخل ہو گے۔ انھوں نے فرمایا: کیا اس سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو اور کون؟“

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ احتمال ہے۔ [6] امام مکحول رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم ہر بیس برس میں ایسی بات نکالو گے جو پہلے نہ تھی۔ [7] امام ابراہیم رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ آسمان پھٹ جائے گا، پھر سرخ ہو جائے گا، پھر رنگ بعد رنگ کے بدلے گا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ آسمان دھان (تلچھٹ، تری) کی طرح ہو جائے گا، پھر منشق ہو گا۔ [8] دوسرا قول یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا حال بعد حال کے بدلے گا۔ [9] امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک قوم دنیا میں خسیس تھی، وہ آخرت میں وضیع (کمینہ) ہو جائے گی۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلے بچہ شیر خوار تھا، پھر دودھ چھوڑا، پھر جوان ہوا، پھر بوڑھا بنا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رخا (نرمی، فراخی) بعد شدت کے اور شدت بعد رخا کے اور غنا بعد فقر کے اور فقر بعد غنا کے اور صحت بعد بیماری کے اور بیماری بعد صحت کے ہے۔ [10]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے مفسرین کے یہ اقوال بیان کرنے کے بعد یہ بات کہی کہ صحیح تاویل یہ ہے کہ اے محمد! کہ تم ایک حال کے بعد دوسرے حال پر اور ایک امر کے بعد دوسرے امر پر ہو جاؤ گے۔ یہ خطاب اگرچہ نبی اکرم ﷺ

---

(1) صحيح البخاري (٤٩٤٠) (2) تفسير الطبري (٢٤/٣٢٣) (3) تفسير الطبري (٢٤/٣٢٤)

(4) تفسير الطبري (٢٤/٣٢٢، ٣٢٣) تفسير ابن كثير (٦٣٠) (5) صحيح البخاري (٦٨٨٩) صحيح مسلم (٢٦٦٩)

(6) تفسير ابن كثير (٢٤/٦٣١) (7) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤١٢) (8) تفسير الطبري (٢٤/٣٢٥)

(9) مسند البزار (٥/٤٠) (10) تفسير ابن كثير (٤/٦٣١)

کو ہے، لیکن یہ سب لوگوں کی طرف متوجہ ہے کہ وہ قیامت کی سختیوں اور ہولناکیوں کو دیکھیں گے کہ ہول پر ہول آئے گا۔[1] سو جب بات اس طرح ہے تو اب کون سی چیز ان کو اللہ پر اور رسول پر اور یومِ آخرت پر ایمان لانے سے مانع ہے اور وہ آیات اور کلامِ الٰہی کی تلاوت کے وقت کس لیے سجدہ نہیں کرتے۔ ان کو تو لازم ہے کہ اس قرآن کا اعظام، اکرام اور احترام کریں، بلکہ ان کی عادت یہ ہے کہ یہ حق کی تکذیب اور مخالفت کیا کرتے ہیں اور اس سے عناد رکھتے ہیں[2] اور اللہ جانتا ہے جو کچھ ان کے دل میں بھرا ہوا ہے۔ امام مجاہد اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اپنے جی میں پوشیدہ رکھتے ہیں، تو ان کو عذابِ الیم کی خوش خبری سنا دے اور کہہ دے کہ اللہ نے تمھارے لیے عذابِ مقیم تیار کر رکھا ہے۔ ہاں جو لوگ ایماندار اور صالح عمل والے ہیں، ان کو وہاں بے حساب اجر ملے گا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ مَمْنُوْنٍ ﴾ بہ معنی منقوص ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی محسوب ہے۔[3] دونوں اقوال کا حاصل یہ ہے کہ مقطوع نہ ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴾ [هود: ۱۰۸] ''یہ بے انتہا بخشش ہے۔'' بعض نے کہا ہے کہ یعنی ان پر اس اجر کا کچھ احسان نہ رکھا جائے گا، لیکن بہت سے لوگوں نے اس معنی کا انکار کیا ہے، اس لیے کہ اہلِ جنت پر ہر حال ہر آن ہر لحظہ اور ہر لحہ میں اللہ کا احسان ہے، وہ جو جنت میں گئے تو اس کے فضل اور رحمت سے گئے ہیں نہ کہ اپنے اعمال کی وجہ سے تو اللہ کا احسان ان پر بہر حال ثابت ہے۔ یہ احسان ان پر دائمی اور مستقل رہے گا۔ والحمد لله وحده أبدا. لہٰذا ان کو تسبیح اور تحمید کا الہام ہوگا جس طرح کہ سانس کا الہام ہوگا۔ ﴿ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [يونس: ۱۰] ''اور ان کی آخری بات یہ ہوگی کہ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے جہان کا رب ہے۔''

فتح البیان کا بیان:

اس آیتِ شریف کی وضاحت کرنے کے لیے فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شفق اس سرخی کو کہتے ہیں جو غروبِ آفتاب کے بعد عشاء تک رہتی ہے۔ سارے مفسرین اور اہلِ لغت کا یہی قول ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اسی کو اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین اور فقہاء رحمہم اللہ سے روایت کیا ہے۔ اسد بن عمر اور ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا کہ شفق سفیدی ہے۔ اس قول کی کوئی وجہ نہیں اور نہ ہی اس پر لغتِ عرب اور شرع سے کوئی دلیل قائم ہے، بلکہ لغت کی کتابیں اسی سرخی پر متفق ہیں۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ شفق سرخی ہے۔[4] یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس، عباد بن صامت، ابو ہریرہ، شداد بن اوس، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم، امام محمد بن علی بن حسین، مکحول، بکر بن عبداللہ مزنی و بکیر بن الاشج، مالک بن ابی ذئب اور عبدالعزیز بن ابی سلمہ ماجشون کا ہے۔ یہ سب اسی کے قائل ہیں کہ شفق سرخی سے عبارت ہے۔[5] اہلِ لغت کے نزدیک وسق بعض شے کا بعض کی طرف ملانا ہے۔ رات کو سب دواب (جانور)

---

① تفسیر الطبري (۳۲٦/۲٤) ② تفسیر الطبري (۳۲۷/۲٤) ③ تفسیر الطبري (۳۲۷/۲٤)

④ فتح القدیر (٥٤٢/٥) ⑤ تفسیر ابن کثیر (٦۲۹/٤)

وغیرہ اکٹھے ہو جاتے ہیں جو دن میں منتشر تھے۔ رات کا اندھیرا سب چیز کو سمیٹ لیتا ہے۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رات کو تہجد و استغفار بالاسحار ہوتا ہے،[1] لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ اتساقِ قمر سے یہ مراد ہے کہ "ممتلئ و مجتمع و مستوی" ہو جائے۔ یہ بات ۱۳، ۱۴، ۱۵ سے ۱۶ تاریخ تک ہوتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ۱۳ تاریخ مراد ہے۔[2] ﴿طَبَقٍ﴾ سے مراد حال ہے۔ یہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ یا ہر اس شخص کو جو خطاب کا اہل ہے اگر بہ فتح موحدہ پڑھا جائے اور بہ صورتِ ضمِ موحدہ تمام لوگوں کو خطاب ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا: "أَيْ: سَمَاءٌ بَعْدَ سَمَاءٍ"۔[3] امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی تم ایک ایک آسمان پر چڑھو گے۔ کسی نے کہا ہے کہ درجہ بدرجہ اللہ کے قرب اور بلندی اور منزلت میں بڑھو گے۔ یا ایک شدت سے دوسری شدت میں اس کے مثل بڑھو گے۔ یا یہ انسان کے حال کا بیان ہے کہ پہلے نطفہ تھا، پھر علقہ ہوا، پھر مضغہ، پھر زندہ اور پھر مردہ ہوا۔

امام ابو حاتم اور ابو عبیدہ رحمہما اللہ نے قراءتِ ضم کو اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہ نسبت لوگوں کو خطاب کرنا اشبہ ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طبق عن طبق سے مراد حیات و موت ہے،[4] یا آخرت کی سختیاں اور ہولناکیاں ہیں، جیسے: موت، پھر بعث اور پھر عرض۔ پھر فرمایا کہ ان لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ باوجود ایمان کے موجبات کے رسول و قرآن پر ایمان نہیں لاتے۔ وہ موجبات یہی تغیراتِ علوی و سفلی ہیں جو خالقِ جلیل کی قدرتِ عظیم پر دلیل ہیں۔ اور جب ان کو قرآن پڑھ کر سناؤ تو یہ سجدہ تک بھی نہیں کرتے۔ امام حسن، عطاء اور کلبی رحمہم اللہ نے کہا: یعنی نماز نہیں پڑھتے۔ ابو مسلم نے کہا ہے کہ مراد خضوع و استکانت[5] (عاجزی) ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ مراد صرف سجود ہے جس کو سجدۂ تلاوت کہتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کے نزدیک یہ سجدہ قرآنِ کریم کے سجدات میں سے آخری ہے۔ پھر فرمایا: ایمان اور سجدہ تو کجا یہ تو رسول اور قرآن کے جھٹلانے والے ہیں۔ توحید، بعث، ثواب اور عقاب کا اعتقاد نہیں رکھتے۔ جو تکذیب ان کے ضمیر میں چھپی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے وہ افعالِ پوشیدہ کا علیم ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ان کے اعمالِ صالحہ اور سیئہ سب ہیں۔[6] ان کے لیے دردناک عذاب کی بشارت ہے۔ رہا اجرِ غیر مقطوع تو وہ ان کے لیے ہوگا جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کیے ہیں۔[7] اللهم غفرا.

---

① تفسير القرطبي (۲۷۷/۱۹) ② الدر المنثور (۴۵۹/۸) ③ تفسير الطبري (۳۲۴/۲۴)
④ فتح القدير (۵۴۳/۵) ⑤ فتح القدير (۵۴۴/۵) ⑥ تفسير القرطبي (۲۸۲/۱۹)
⑦ فتح البيان (۱۴۹/۱۵۔۱۵۳)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

سُوْرَةُ الْبُرُوْج

اس میں بائیس (۲۲) آیتیں ہیں۔ یہ بلا اختلاف مکہ میں اتری ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مکی ہے۔[1] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو عشاء میں ﴿ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴾ کے ساتھ پڑھتے تھے۔[2] (أخرجه أحمد) سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کو نمازِ ظہر اور عصر میں پڑھا کرتے تھے۔[3] (رواه أحمد و الدارمي و أبو داود و الترمذي و حسنه والنسائي وغيرهم)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۙ﴿۱﴾ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۙ﴿۲﴾ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ؕ﴿۳﴾ قُتِلَ
اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۙ﴿۵﴾ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۙ﴿۶﴾
وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ؕ﴿۷﴾ وَمَا نَقَمُوْا
مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۸﴾ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ؕ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ
جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ؕ﴿۱۰﴾

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

برجوں والے آسمان کی قسم! ① اور اس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے ② اور حاضر ہونے والے کی اور حاضر کیے گئے کی ③ ہلاک کر دیے گئے خندقوں والے ④ (ان خندقوں میں)

① الدر المنثور (۸/۴٦۱)

② مسند أحمد (۲/۳۲٦) اس کی سند میں ''ابوالمہزم'' ضعیف راوی ہے۔

③ مسند أحمد (۵/۱۰۳) سنن الدارمي (۱/۳۳۵) سنن أبي داود (۸۰۵) سنن الترمذي (۳۰۷) سنن النسائي (۹۷۹) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: (صحيح أبي داود: ۳/۳۹۰)

آگ تھی ایندھن والی⑤ جبکہ وہ ان خندقوں (کے کناروں) پر بیٹھے تھے⑥ اور جو کچھ وہ مومنوں کے ساتھ کر رہے تھے، اسے دیکھ رہے تھے⑦ اور انھیں ان (مومنوں) کا یہی کام برا معلوم ہوا کہ وہ اللہ، غالب، قابلِ تعریف پر ایمان لائے تھے⑧ وہ ذات کہ اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہر چیز پر شاہد ہے⑨ بے شک جنھوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ستایا، پھر توبہ نہ کی، تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلانے والا عذاب ہے⑩

بروج کیا ہیں:

سب شہروں میں حاضر ہوتا ہے جمعہ کا دن اور سب حاضر ہوتے ہیں حج کے دوران عرفات کے دن۔ انتھی.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان کی اور اس کے برجوں کی قسم کھائی ہے۔ بروج سے مراد نجومِ عظام ہیں۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ضحاک، حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ کا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے اتنا اور کہا ہے کہ ان برجوں میں چوکیدار رہتے ہیں۔ یحییٰ بن رافع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بروج آسمان میں محل ہیں۔ منہال بن عمرو رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد خلقِ حسن ہے۔ ابن خیثمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ چاند سورج کی منزلیں ہیں۔ یہ بارہ برج ہیں جن میں سورج ہر مہینے میں ایک بار اور چاند دو دن اور ایک تہائی دن ٹھہرتا ہے۔ اس حساب سے یہ ۲۸ منزلیں ہوئیں۔ پھر دو دن چاند چھپا رہتا ہے۔[1]

یوم موعود، شاہد اور مشہود کی تفسیر:

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ یومِ موعود قیامت کا دن ہے۔ ﴿شَاهِدٍ﴾ جمعہ کا دن ہے۔ سورج کسی دن پر نہیں نکلا اور نہ ڈوبا جو جمعہ کے دن سے افضل ہو۔ اس دن میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ جب کوئی بندہ اس کو پا لیتا ہے تو اس وقت اللہ سے جو بھی خیر مانگتا ہے وہ اس کو عطا کرتا ہے اور جس شر سے پناہ مانگتا ہے اس سے اس کو پناہ دیتا ہے۔ ﴿مَشْهُوْدٍ﴾ عرفہ کا دن ہے۔[2] (رواه ابن أبي حاتم وابن خزيمة وفيه ضعف وقد روی موقوفا علی أبي هريرة رضي الله عنه و هو أشبه)۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت رفعاً یہ ہے کہ ﴿شَاهِدٍ﴾ یومِ جمعہ اور ﴿مَشْهُوْدٍ﴾ یوم قیامت ہے۔[3] (رواه أحمد)۔ تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ﴿شَاهِدٍ﴾ جمعہ کا دن اور

---

① تفسیر ابن کثیر (٦٣٢، ٦٣٣)

② تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٤١٣) تفسیر ابن کثیر (٤/٦٣٣) اس کی سند میں ''موسیٰ بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔

③ مسند أحمد (٢/٢٩٨) اس میں ﴿مَشْهُوْدٍ﴾ کے بجائے ﴿اَلْمَوْعُوْد﴾ کے الفاظ ہیں، نیز سند میں ''علی بن زید بن جدعان'' ضعیف راوی ہے۔

﴿ مَشْهُوْدٍ ﴾ عرفہ کا دن ہے اور موعود قیامت کا دن ہے۔[1] یہی قول امام قتادہ، حسن اور ابن زید رحمہم اللہ کا بھی ہے۔[2] اس میں ان کا کچھ اختلاف نہیں ہے۔ وللّٰه الحمد.

امام ابو مالک اشعری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یومِ موعود قیامت کا دن ہے، ﴿ شَاهِدٍ ﴾ یومِ جمعہ ہے اور ﴿ مَشْهُوْدٍ ﴾ یومِ عرفہ ہے۔ اللہ پاک نے جمعہ کے دن کو ہمارے لیے ذخیرہ کر رکھا ہے۔[3] (رواہ ابن جریر)۔ امام سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے رفعاً کہا ہے: تمام ایام کا سردار یومِ جمعہ ہے، یہی ﴿ مَشْهُوْدٍ ﴾ ہے۔ ﴿ مَشْهُوْدٍ ﴾ یومِ عرفہ ہے۔[4] (هذا مرسل) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ شَاهِدٍ ﴾ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ﴿ مَشْهُوْدٍ ﴾ قیامت کا دن ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴾[5] [هود: ۱۰۳] ''وہ، وہ دن ہے جس میں سب لوگ جمع کیے جائیں گے اور وہ، وہ دن ہے جس میں سب حاضر کیے جائیں گے۔'' ایک آدمی نے حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ ﴿ شَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ﴾ کیا ہے؟ کہا: تو نے مجھ سے پہلے بھی کسی اور سے پوچھا ہے؟ کہا: ہاں! عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم سے، انھوں نے کہا کہ ذبح کا دن اور جمعہ کا دن۔ ذبح سے مراد عرفہ ہے۔ فرمایا: نہیں، ﴿ شَاهِدٍ ﴾ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴾ [النساء: ۴۱] ''پھر ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس امت پر گواہ بنائیں گے؟'' اور ﴿ مَشْهُوْدٍ ﴾ قیامت کا دن ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴾ [هود: ۱۰۳] امام حسن بصری رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

امام سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَشْهُوْدٍ ﴾ قیامت کا دن ہے۔ امام مجاہد، عکرمہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ شَاهِدٍ ﴾ ابن آدم ہے اور ﴿ مَشْهُوْدٍ ﴾ یومِ قیامت ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ شَاهِدٍ ﴾ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ﴿ مَشْهُوْدٍ ﴾ جمعہ کا دن ہے۔[6] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ شَاهِدٍ ﴾ عرفہ کا دن ہے اور ﴿ مَشْهُوْدٍ ﴾ قیامت کا دن ہے۔ امام ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ذبح کا دن اور عرفہ کا دن ہے۔[7] اور لوگوں نے کہا ہے کہ ﴿ مَشْهُوْدٍ ﴾ جمعہ کا دن ہے، اس لیے کہ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «أَكْثِرُوْا عَلَيَّ مِنَ الصَّلَاةِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَإِنَّهُ يَوْمٌ مَشْهُوْدٌ تَشْهَدُهُ الْمَلَائِكَةُ»[8] (رواہ ابن جریر) ''جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود پڑھو، یہ یومِ مشہود ہے، اس میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔'' امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ

---

[1] مسند أحمد (۲۹۸/۲) [2] تفسير الطبري (۳۳۲/۲۴_۳۳۴) [3] تفسير الطبري (۳۳۴/۲۴، ۳۳۵)
[4] تفسير الطبري (۳۳۴/۲۴) یہ روایت مرسل ہے۔ [5] تفسير الطبري (۳۳۵/۲۴)
[6] تفسير الطبري (۳۳۵/۲۴_۳۳۷) [7] تفسير ابن كثير (۶۳۴/۴)
[8] تفسير الطبري (۶۳۷/۲۴)

کی روایت یہ ہے کہ ﴿ شَاهِدٍ ﴾ اللہ ہے؛ ﴿ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴾ [النساء: ٧٩] ''اور اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہے۔''
اس کو بغوی رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے۔[1] اکثر کا قول یہ ہے کہ ﴿ شَاهِدٍ ﴾ یوم جمعہ ہے اور ﴿ مَشْهُودٍ ﴾ یوم عرفہ۔

اصحاب الأخدود کے مسلمانوں پر کیے گئے ظلم:

﴿ قُتِلَ ﴾ بہ معنی "لُعِنَ" ہے۔ "أُخْدُوْدٌ" مغاک (خندق) کو کہتے ہیں، جو زمین میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی ایک قوم کے حال کی خبر دی ہے کہ انھوں نے مومنوں کے ساتھ یہ کام کیا کہ ایک کھدائی کھودی اور اس میں آگ جلائی اور اس کو خوب دھکایا، پھر اہلِ ایمان سے کہا کہ تم اپنے دین سے پھرو، جب وہ نہ مانے تو ان کو پکڑ کر اس آگ میں ڈال دیا اور خود وہاں موجود رہے۔ ان کا کوئی قصور نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ اللہ غالب پر ایمان لائے تھے جو کوئی اللہ کو اپنا ملاذ (جائے پناہ، قلعہ) بنا لیتا ہے اور اپنے سارے اقوال و افعال کو اس کی مرضی پر چھوڑتا ہے، اگرچہ اس نے اپنے بندوں پر کفار کے ہاتھوں تکلیف کو مقدر کیا ہو اور لوگوں کو اس سببِ خفی پر آگاہی نہ ہو تو اللہ عزیز حمید ہے، آسمان و زمین کا مالک ہے، ہر چیز پر شہید ہے، کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ کافر میرے ان ایمان دار بندوں کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔

اصحابِ اخدود کے بارے میں اختلاف ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ فارس کے لوگ تھے، ان کے بادشاہ نے جب حرام کردہ چیزوں کو حلال کرنا چاہا تو علماء نے منع کیا، بادشاہ کے حکم سے گڑھے کھودے گئے، اس میں آگ جلائی گئی جس نے انکار کیا تھا، اس کو پکڑ کر اس آگ میں ڈال دیا اور آج تک ان میں حرام کردہ چیزوں کو حلال کرنے کا دستور جاری ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ یہ یمن میں ایک قوم تھی، وہاں ان کے اور مومنین کے درمیان مقاتلہ ہوا، مومنین غالب آئے، پھر دوبارہ جنگ ہوئی تو کفار نے غلبہ پایا، تب مومنین کو کھائی میں ڈال کر آگ سے جلا دیا۔[2] ان کا تیسرا قول یہ ہے کہ وہ اہلِ حبشہ تھے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ بنی اسرائیل کے کچھ لوگ تھے، انھوں نے گڑھے کھود کر آگ جلا کر کچھ مردوں اور عورتوں کو وہاں پر جمع کیا اور کہا کہ تم ایمان سے باز آ جاؤ ورنہ اس آگ مین جلا دیے جاؤ گے۔ ان کا یہ اعتقاد ہے کہ وہ مومنین دانیال علیہ السلام کے ساتھی تھے۔ یہی قول امام ضحاک رحمہ اللہ کا ہے، اس کے سوا اور اقوال بھی ہیں۔[4]

قصہ ایک ساحر، راہب بچے اور خندقوں میں پھینکے جانے کا:

صہیب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ہے کہ تم سے پہلے ایک بادشاہ تھا، اس کے پاس ایک جادوگر رہتا تھا، جب وہ بوڑھا ہو گیا تو اس نے بادشاہ سے کہا کہ اب میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور میری اجل

---

(1) تفسير البغوي (٣٨٢/٨) (2) تفسير الطبري (٣٣٧/٢٤، ٣٣٨) تفسير ابن كثير (٦٣٤/٤)
(3) تفسير ابن أبي حاتم (٣٤١٣/١٠) (4) تفسير الطبري (٣٣٨/٢٤، ٣٣٩)

قریب آ گئی ہے، ایک لڑکا میرے سپرد کرو تاکہ میں اس کو سحر کا علم سکھاؤں۔ بادشاہ نے ایک لڑکا اس کے حوالے کیا، وہ اس کو سحر سکھاتا تھا۔ ساحر اور بادشاہ کے درمیان راستے میں ایک راہب تھا۔ لڑکا اس کے پاس گیا اور اس کی بات سنی، اس کی بات لڑکے کو پسند آ گئی اور اس کے جی میں لگ گئی۔ وہ لڑکا جب ساحر کے پاس آتا تو وہ اس کو مارتا اور کہتا کہ تجھے کس چیز نے روکا جو تو اتنی دیر میں آیا اور جب وہ گھر والوں کے پاس آتا تو گھر والے الگ اس کو مارتے اور کہتے کہ تو کہاں تھا۔

لڑکے نے اس بات کی شکایت اس راہب سے کی، راہب نے کہا کہ جب ساحر تجھ کو مارنا چاہے تو تو کہہ دیا کر کہ مجھ کو میرے گھر والوں نے روکا تھا اور جب گھر والے مارنا چاہیں تو اُن سے یہ کہا کر کہ مجھے ساحر نے روک رکھا تھا۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ راستے میں ایک دابہ (جانور) ملا جو بہت قطیع اور عظیم (کاٹنے والا اور بہت بڑا) تھا، اس نے لوگوں کا راستہ بند کر رکھا تھا، وہ راہ نہ چل سکتے تھے۔ لڑکے نے کہا ہے کہ آج میں یہ معلوم کروں گا کہ اللہ کو یہ راہب زیادہ پیارا ہے یا یہ ساحر۔ پھر ایک پتھر اٹھا کر اس دابہ کی طرف پھینکا اور اسے مارا اور کہا: اے اللہ! اگر تیرے نزدیک اس راہب کا کام زیادہ پسندیدہ اور محبوب ہے ساحر کے کام کی نسبت تو تُو اس دابہ کو مار ڈال کہ لوگ اس راستے سے گزریں۔

وہ دابہ اس کے پتھر سے مر گیا اور لوگ چلنے لگے۔ اس نے یہ خبر راہب کو دی۔ اس نے کہا ہے کہ اے بیٹے! تو مجھ سے زیادہ افضل ہے اور تو عن قریب کسی بلا میں گرفتار ہو گا، اگر ایسا ہو تو میرا نام نہ لینا۔ پھر وہ بچہ اندھے اور برص والے کو اچھا کرنے لگا اور سب بیماریوں سے صحت ہونے لگی۔ بادشاہ کا ایک مصاحب اندھا تھا، وہ بہت سا ہدیہ اور تحفہ لے کر اس لڑکے کے پاس آیا اور کہا: مجھے شفا دے، یہ سب مال تیرا ہے۔ لڑکے نے کہا کہ میں کسی کو شفا نہیں دیتا، شفا دینے والا تو اللہ عزوجل ہے۔ تو اگر اللہ پر ایمان لائے تو میں البتہ تیرے لیے دعا کروں گا، وہ تجھ کو شفا دے گا، وہ ایمان لے آیا۔ اس نے دعا کی، اللہ تعالیٰ نے اس کو شفا بخشی۔ پھر بادشاہ کے پاس آ کر اپنی جگہ پر جہاں بیٹھا کرتا تھا آ کر بیٹھ گیا۔

بادشاہ نے کہا کہ اے فلاں! تیری آنکھ کس نے درست کی؟ کہا: میرے رب نے۔ بادشاہ نے کہا کہ میں نے؟ کہا: نہیں، بلکہ میرا رب اور تیرا رب اللہ ہے۔ کہا: میرے سوا تیرا کوئی رب ہے؟ کہا: ہاں، میرا اور تیرا پالنے والا اللہ ہے۔ بادشاہ نے اس کو تکلیف دینا شروع کی، یہاں تک کہ اس نے لڑکے کا نام لے دیا۔ بادشاہ نے اس لڑکے کو بلا کر کہا: اے فرزند! تیرا جادو یہاں تک پہنچا ہے کہ تو اندھے اور برص والے کو اچھا کرتا ہے اور سب بیماروں کو صحت دیتا ہے؟ اس نے کہا: میں کسی کو اچھا نہیں کرتا۔ اللہ عزوجل سب کو شفا بخشتا ہے۔ کہا: میں؟ کہا: نہیں۔ پوچھا: کیا تیرا کوئی اور رب ہے؟ کہا: ہاں، اللہ تعالیٰ میرا اور تیرا رب ہے۔ بادشاہ نے اس کو بھی عذاب دینا شروع کیا،

یہاں تک کہ اس نے راہب کا نام لے دیا۔ اس راہب کو بلا کر کہا: تو اپنے دین کو چھوڑ دے، اس نے نہ مانا، تب اس کے سر پر آرا رکھ کر اسے دو ٹکڑے کر ڈالا۔ اندھے سے کہا: تو اپنے دین سے پھر جا، اس نے بھی نہ مانا، اس کو بھی آرے سے چیر ڈالا۔ پھر لڑکے سے کہا کہ تو اپنے دین کو چھوڑ دے، اس نے انکار کیا، تب اس کو کچھ لوگوں کے ساتھ ایک پہاڑ پر بھیج کر کہا کہ اگر یہ اپنے دین سے نہ پھرے تو اس کو پہاڑ کی چوٹی پر سے نیچے لڑھکا دینا۔ اس کو پہاڑ کے اوپر لے گئے۔ اس نے کہا: "اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْهِمْ بِمَا شِئْتَ" پہاڑ کو زلزلہ آیا، سب کے سب نیچے لڑھک گئے۔ لڑکا وہاں سے چل کر بادشاہ کے پاس آیا۔ پوچھا: تیرے ساتھ والے لوگ کدھر گئے؟ کہا: اللہ نے ان کو مجھ سے کفایت کیا۔ بادشاہ نے اس کو چند لوگوں کے ساتھ کشتی میں بٹھا کر حکم دیا کہ جب تم دریا کے بیچ میں پہنچ جاؤ تو اس سے کہو کہ اپنے دین سے رجوع کرو اگر یہ نہ کرے تو اسے دریا میں غرق کر دو۔ جب وہ دریا کے بیچ پہنچے تو لڑکے نے کہا: "اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْهِمْ بِمَا شِئْتَ" وہ سب ڈوب گئے۔ لڑکا بادشاہ کے پاس آیا، کہا: تیرے ہمراہیوں نے کیا کیا؟ کہا: اللہ نے مجھ کو ان سے کفایت کی۔

پھر اس لڑکے نے بادشاہ سے کہا کہ تو مجھ کو مار نہ سکے گا جب تک تو وہ کام نہ کرے جو میں تجھ کو بتاؤں۔ اگر تو ویسے کرے گا تو مجھ کو قتل کر سکے گا، ورنہ تجھ کو ہرگز میرے قتل کی استطاعت نہ ہو گی۔ کہا: وہ کیا کام ہے؟ کہا: لوگوں کو ایک جگہ میں اکٹھا کر اور مجھ کو سولی پر چڑھا اور ایک تیر میرے ترکش سے نکال کر چلا اور یوں کہہ: "بِسْمِ اللّٰهِ رَبِّ الْغُلَامِ" جب تو ایسا کرے گا تو مجھ کو قتل کر پائے گا۔ بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ تیر کو کمان کے بیچ میں رکھ کر "بِسْمِ اللّٰهِ رَبِّ الْغُلَامِ" کہہ کر چلایا تو وہ تیر اس کی کنپٹی پر جا لگا، لڑکے نے اپنا ہاتھ تیر کی جگہ پر رکھا اور مر گیا۔ لوگوں نے کہا: "آمَنَّا بِرَبِّ الْغُلَامِ" یعنی ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لائے۔

بادشاہ سے کہا گیا تو نے دیکھا کہ جس بات سے تو ڈرتا تھا وہی ہوئی، سب لوگ ایمان لے آئے۔ اس نے حکم دیا کہ گلی کوچوں میں کھائیاں کھودو اور آگ جلاؤ جو کوئی اپنے دین سے نہ پھرے، اس کو اس آگ میں ڈال دو۔ لوگ اس کے اندر جانے لگے اور آگ کو دور کرتے تھے۔ اتنے میں ایک عورت ایک شیر خوار بچہ لے کر آئی اور آگ میں گرنے سے جھجکی۔ بچے نے کہا: اے ماں! صبر کر تو حق پر ہے۔[1] (رواه أحمد و هكذا رواه مسلم في آخر الصحيح نحوه و رواه النسائي فقد جوّده الترمذي فرواه في تفسير هذه السورة)

صہیب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نمازِ عصر پڑھ چکتے تو ہمس کرتے، یعنی اپنے دونوں لب ہلاتے، گویا کچھ بات کرتے ہیں۔ کہا: اے اللہ کے رسول! آپ نمازِ عصر کے بعد ہونٹ کیوں ہلاتے ہیں؟ کہا: ایک نبی نے

[1] صحيح مسلم (٣٠٠٥) مسند أحمد (١٦/٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٥١٠/٦)

اپنی امت پر عجب کیا اور کہا: ان کا کون مقابلہ کر سکتا ہے، اللہ نے وحی بھیجی کہ تو ان کو اختیار دے کہ میں ان سے انتقام لوں یا ان پر کسی دشمن کو مسلط کر دوں۔ انھوں نے انتقام کو اختیار کیا، اللہ نے ان پر موت کو مسلط کیا، ایک دن میں ستر ہزار آدمی مارے گئے۔

نبی کریم ﷺ جب یہ حدیث بیان فرماتے تو دوسری حدیث کا بھی ذکر کرتے کہ ایک بادشاہ کے پاس ایک کاہن تھا، اس نے کہا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ﴾۔ اس لڑکے کو دفن کر دیا تھا، کہتے ہیں: وہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قبر سے نکالا گیا، اس کی انگلی اس کی کنپٹی پر اسی طرح رکھی تھی جس طرح کہ اس نے قتل کے وقت رکھی تھی۔[1] ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اس سیاق میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ سیاق اس قصے کا رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے۔ ہمارے شیخ حافظ ابو الحجاج مزی نے کہا ہے کہ احتمال ہے کہ صہیب رومی رضی اللہ عنہ کا کلام ہو، کیوں کہ ان کے پاس اخبارِ نصاریٰ کا علم تھا۔[2] واللّٰه أعلم.

محمد بن اسحاق نے اس قصے کا ذکر سیرت میں اور ہی سیاق سے کیا ہے جو پہلے بیان کیے گئے قصے سے کسی قدر مخالف ہے۔ کہا: بعض اہلِ نجران نے کہا ہے کہ نجران والے مشرک تھے، بتوں کو پوجتے تھے۔ نجران بڑا قصبہ تھا اس کے ایک گاؤں میں ایک جادوگر رہتا تھا۔ وہ وہاں کے لڑکوں کو جادو سکھاتا تھا، جب خیموں کا گزر اس جگہ ہوا تو کہا کہ یہاں ایک شخص آیا ہے جس نے نجران اور اس گاؤں کے درمیان ایک خیمہ کھڑا کیا ہے جس میں وہ ساحر تھا۔ نجران والوں نے اپنے لڑکوں کو اس ساحر کے پاس سحر سیکھنے کے لیے بھیجا۔

تامر نے اپنا بیٹا جس کا نام عبداللہ تھا اور لڑکوں کے ساتھ روانہ کیا، وہ لڑکا جب اس خیمہ والے کے پاس سے گزرتا تو اس کی عبادت اور نماز کو دیکھ کر خوش ہوتا، اس کے پاس رک کر اس کی بات چیت سنتا، یہاں تک کہ مسلمان ہو گیا۔ موحد بن کر اللہ پاک کا عابد بن گیا اور استاد سے اسلام کے احکام سیکھ سیکھ کر فقیہ بن گیا۔ پھر کہا: مجھے اسمِ اعظم سکھا دو، استاد نے اس کو مخفی رکھا، اگرچہ اس کو سکھا دیا تھا اور کہا: اے برادر زادے! تو اسمِ اعظم کا متحمل نہ ہوگا، مجھے ڈر ہے کہ تو کمزور نکلے گا۔ لڑکے کا باپ تامر اسی خیال میں تھا کہ وہ ساحر کے پاس جاتا ہے جس طرح کہ دوسرے لڑکے جاتے ہیں۔

عبداللہ نے جب دیکھا کہ استاد اسمِ اعظم کی تعلیم دینے میں بخل کرتا ہے اور اس کو میرے ضعف کا ڈر ہے تو کچھ پیالے جمع کیے، پھر اس نے اللہ کے سارے نام الگ الگ ایک ایک پیالے پر لکھے، جب سب نام لکھ چکا تو آگ جلائی، پھر اس میں ایک ایک پیالہ ڈالنا شروع کیا، جب وہ پیالہ ڈالا جس پر اسمِ اعظم لکھا تھا تو وہ پیالہ کود کر باہر نکل آیا، اس کو آگ سے کچھ نقصان نہ پہنچا۔ لڑکا وہ پیالہ لے کر استاد کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے وہ اسمِ اعظم جو تو نے

[1] سنن الترمذي (٣٣٤٠) [2] تفسير ابن كثير (٦٣٦/٤)

مجھ سے مخفی رکھا تھا معلوم ہو گیا ہے۔ کہا: وہ کون سا نام ہے؟ کہا: کذا و کذا ہے۔ پوچھا: تو نے کس طرح معلوم کیا تو اس نے اپنا قصہ بیان کیا۔ استاد نے کہا ہے کہ اے بھتیجے! اب جو تو نے اس نام کو پا لیا ہے تو اپنے جی میں رکھ، لیکن مجھ کو گمان نہیں ہے کہ تو ایسا کرے۔

تب سے عبداللہ جب نجران کو آتا تو جو کوئی دکھی شخص اس کو راستے میں ملتا اور اس سے کہتا کہ اے اللہ کے بندے! تو اللہ کی توحید اختیار کر کے میرے دین میں آ جا، میں تیرے لیے اللہ سے دعا کروں گا، وہ تجھ کو تندرست کر دے گا، یہ بلا جو تیرے اندر ہے یہ جاتی رہے گی، وہ کہتا: اچھا اور موحد ہو کر مسلمان ہو جاتا۔ یہ اللہ سے دعا کرتا تو وہ اچھا بلا بن جاتا، یہاں تک کہ نجران میں کوئی دکھ والا باقی نہ رکھا، مگر اس کی دعا سے اچھا ہو گیا۔ یہ خبر بادشاہ کو پہنچی اس نے اس لڑکے کو بلا کر کہا: تو نے میرے شہر کے لوگوں کو بگاڑ دیا اور انھیں میرے اور میرے آباء کے دین کے خلاف کر ڈالا میں تجھ کو مثلہ (ہاتھ پاؤں اور اعضاء کاٹ کر قتل کر دوں گا) اس نے کہا کہ تجھ کو مجھ پر ہرگز قدرت نہ ہو گی۔

بادشاہ نے کہا کہ اس کو لے جا کر پہاڑ کے اوپر سے گرا کر مار ڈالو، جب ایسا کیا تو اس کو کچھ صدمہ نہ پہنچا، پھر اس کو نجران کے دریاؤں میں ڈالا گیا جس میں گر کر ہر کوئی ہلاک ہو جاتا ہے، وہ ان میں سے بھی صحیح سلامت بغیر کسی نقصان کے باہر نکل آیا۔ جب بادشاہ مغلوب ہوا تو عبداللہ نے اس سے کہا کہ تجھ کو میرے قتل پر ہرگز دسترس نہ ہو گی، یہاں تک کہ جس پر میں ایمان لایا ہوں تو بھی اس پر ایمان لے آئے اور اللہ کو ایک جانے تو اگر ایسا کرے گا تو مجھ پر مسلط ہو سکے گا اور مجھے قتل کر سکے گا، اس پر بادشاہ نے موحد ہو کر اور شہادت دے کر ایک لاٹھی جو اس کے ہاتھ میں تھی عبداللہ کے سر پر ماری اسے تھوڑی سی چوٹ آئی مگر عبداللہ مر گیا، پھر اسی جگہ بادشاہ بھی ہلاک ہو گیا اور نجران کے لوگ عبداللہ کے دین پر مجتمع ہو گئے۔

عبداللہ دینِ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پر تھا، انجیل کے حکم پر چلتا تھا، پھر ان لوگوں میں بدعات نکلیں جس طرح کہ ان کے اہلِ دین میں احداث (نئی باتیں) آ لگی تھیں۔ اسی جگہ سے نجران میں دینِ نصرانیت کی اصل جمی۔ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ سے مروی ہے اس کو اہلِ نجران نے عبداللہ بن تامر سے نقل کیا ہے، اللہ ہی جانے کہ کون سا قصہ واقع ہوا تھا۔ پھر ذونواس اپنا لشکر لے کر ان پر گیا اور ان کو دینِ یہودیت کی طرف بلایا اور اختیار دیا کہ یہود ہو جاؤ یا قتل ہونا منظور کرو۔ انھوں نے قتل ہونا منظور کیا، اس پر اس نے گڑھے کھود کر آگ میں جلا دیا اور بعض کو قتل کیا اور بعض کو مثلہ کیا۔ یہ سب تقریباً بیس ہزار آدمی تھے۔ اللہ نے آیتِ باب ذونواس کے حق میں اتاری۔[1] (هكذا ذكره ابن إسحاق في السيرة) یعنی اصحابِ اخدود کا قاتل ذونواس تھا، اس کا نام زرعہ ہے، اپنے زمانۂ مملکت میں یوسف کے نام سے مشہور تھا وہ اسعد بن کرب کا بیٹا تھا۔ یہ اسعد وہی تبع ہے جو مدینہ پر لڑا تھا

---

[1] السيرة النبوية لابن هشام (١/١٤٩-١٥١)

اور کعبہ کو اس نے کپڑا پہنایا تھا اور اپنے ساتھ ایک یہودی عالم کو لے گیا تھا۔ اس وجہ سے یمن کے بعض لوگ اس کے ہاتھ پر یہودی ہو گئے تھے۔

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے اس داستان کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور کہا ہے کہ ذونواس نے ایک دن میں بیس ہزار لوگوں کو اخدود میں قتل کیا، ان میں سے سوائے ایک شخص کے کوئی نہ بچا۔ اس شخص کو ذوثعلبان کہتے تھے، وہ گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلا اس کا تعاقب کیا، مگر وہ ہاتھ نہ آیا۔ قیصر ملک روم کے پاس جا کر نجاشی کی طرف ایک سفارشی تحریر لایا۔ حبشہ کے بادشاہ نے ایک لشکرِ نصاریٰ اس کے ہمراہ کر دیا، اس لشکر کے سالار ارباط وابرہہ تھے، انھوں نے یمن کو یہود کے ہاتھ سے نکالا ذونواس وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا، دریا کے اندر گھس پڑا، پھر ڈوب گیا۔ وہ ملک ستر برس تک نصاریٰ کے ہاتھ میں رہا، پھر سیف بن ذی یزن حمیری نے نصاریٰ کے ہاتھ سے نکال لیا۔ یہ اس وقت ہوا جب کہ کسریٰ فارس کے بادشاہ نے لشکر کشی کی اور سیف کے ہمراہ قریباً سات سو قیدی بھیجے ان کے ذریعے سے سیف نے یمن کو مفتوح کیا اور ملک حمیر کے ہاتھ میں آیا۔ اس کا کچھ ذکر سورۃ الفیل کی تفسیر میں آئے گا۔[1]

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک نجرانی شخص نے نجران کی ایک ویران جگہ کو کھودا کسی کام کے لیے تو اس جگہ عبداللہ بن تامر کو مدفون پایا، وہ اپنا ہاتھ اپنے سر پر، جہاں زخم لگا تھا، رکھے ہوئے تھا اور اسے ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھا۔ جب ہاتھ کو ہٹایا تو زخم سے خون ابلنے لگا جب ہاتھ چھوڑ دیا تو وہ پھر اپنی جگہ پر جا لگا اور خون تھم گیا، اس کے ہاتھ میں ایک انگشتری تھی اس پر "رَبِّيَ اللّٰهُ" لکھا تھا۔ یہ حال عمر رضی اللہ عنہ کو لکھ کر بھیجا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جواب لکھا کہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور اسی طرح مٹی میں دفن کر دو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔[2]

امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے ابراہیم بن محمد رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ بعض اہلِ علم نے ذکر کیا کہ جب ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اصبہان کو فتح کیا تو شہر کی ایک دیوار کو گرا ہو پا کر بنایا، وہ پھر گر پڑی، پھر دوبارہ بنیاد کیا، پھر گر پڑی، پھر تیسری بار بنایا، پھر ساقط ہو گئی، آخر لوگوں نے کہا کہ اس کے نیچے ایک مردِ صالح کی قبر ہے، جب بنیاد کھودی تو ایک شخص کو تلوار لیے ہوئے کھڑا پایا، اس میں لکھا تھا: "میں حارث بن مضاض ہوں، میں نے اصحاب الاخدود پر قسمت کی۔" سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے اس کو نکال کر دیوار بنائی تب وہ قائم ہوئی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ شخص ملوکِ جرہم میں سے ایک بادشاہ تھا جو ثابت بن اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام کے بعد امورِ کعبہ کے والی ہوئے تھے۔ عمرو بن حارث بن مضاض ملوکِ جرہم میں سے آخری بادشاہ ہے۔ خزاعہ نے اس کو مکہ سے یمن کی طرف جلا وطن کر دیا تھا۔ یہ شعر جس کی نسبت ابن ہشام یہ بات کہتے ہیں کہ سب سے پہلے عرب نے یہی شعر کہا ہے: ؎

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٦٣٧/٤، ٦٣٨) [2] السيرة النبوية لابن هشام (١٥٢/١)

كَأَنْ لَمْ يَكُنْ بَيْنَ الْحَجُوْنِ إِلَى الصَّفَا أَنِيْسٌ وَلَمْ يَسْمُرْ بِمَكَّةَ سَامِرٌ
بَلٰى نَحْنُ كُنَّا أَهْلَهَا فَأَبَادَنَا صُرُوْفُ اللَّيَالِيْ وَالْجُدُوْدُ الْعَوَاثِرُ

اسی عمرو بن حارث کا شعر ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ ایک پرانی کہانی ہے۔ زمانہ اسماعیل علیہ السلام کے تقریباً پانچ سو برس بعد اور محمد بن اسحاق کی روایت اس امر کی مقتضی ہے کہ یہ قصہ عیسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان زمانہ فترت کا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اشبہ ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ایسا حال جہاں میں بہت ہو چکا ہو۔ [1]

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ عبد الرحمان بن جبیر رحمہ اللہ سے راوی ہیں کہ اخدود یمن میں تبع کے زمانے میں تھے اور قسطنطنیہ میں قسطنطین کے زمانے میں تھے، جبکہ نصاریٰ نے اپنا قبلہ مسیح علیہ السلام کے دین اور توحید سے پھیر ڈالا تھا۔ اس پر ایک اتون یعنی پہاڑ بنا کر نصاریٰ کو، جو دینِ مسیح اور توحید پر تھے، ڈال دیا اور عراق میں بخت نصر کے زمانے میں بابل کی سرزمین کے اندر تھا۔ بختِ نصر نے ایک صنم بنا کر لوگوں کو حکم دیا کہ اس کو سجدہ کریں۔ دانیال علیہ السلام اور ان کے ہر دو صاحب عزریا و میشائیل نے منع کیا۔ بخت نصر نے ایک اتون (گڑھا) تیار کر کے اور آگ میں لکڑیاں ڈال کر ان دونوں کو اس میں جھونک دیا، اللہ نے اس آگ کو ان پر برد اور سلام کر دیا، یہ صحیح سلامت نکل آئے اور نو رہط (قبیلے)، جنھوں نے اس پر بغاوت کی تھی، ان کو آگ کھا گئی۔ [2]

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اخدود تین جگہ تھے: ایک عراق میں، دوسرا شام میں اور تیسرا یمن میں۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک نجران کا خدتھا جو یمن میں تھا، دوسرا شام میں تھا اور تیسرا فارس میں۔ شام والے کا نام انطنانوس رومی تھا، فارس والے کا نام بخت نصر تھا، عرب والے کا نام یوسف ذونواس تھا۔ سو اخدود فارس و شام کے حق میں اللہ نے کچھ قرآن نہیں اتارا۔ نجران کے اخدود کے بارے میں آیتِ باب آئی۔ [3] امام ربیع بن انس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا ہے کہ یہ زمانہ فترت میں ایک قوم تھی جب لوگوں میں فتنہ اور شر واقع ہوا اور الگ الگ حزب ہو گئے ﴿ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴾ [الروم: ۳۲] ''ہر گروہ اس چیز پر جو اس کے پاس ہے مگن ہے۔'' تو کنارہ کش ہو کر الگ ایک گاؤں بسا کر اللہ کی اخلاص اور دینِ حنیف کے ساتھ عبادت کرنے لگے۔ وہ لوگ نماز پڑھتے، روزے رکھتے، زکات ادا کرتے تھے اسی حال پر جمے تھے یہاں تک کہ ایک ستمگر بادشاہ نے ان کا حال سنا اور ماجرا معلوم کیا۔ آدمی بھیج کر کہلا بھیجا کہ تم بت پوجو جن کو ہم پوجتے ہیں۔ انھوں نے نہ مانا اور کہا کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ ہم اللہ کے سوا کسی کو پوجیں، وہی ہمارا معبود لاشریک لہ ہے۔

بادشاہ نے کہا ہے کہ اگر تم ہمارے ان معبودوں کی عبادت نہیں کرتے ہو تو میں تم کو قتل کر دوں گا، اس پر بھی انھوں نے نہ مانا۔ آگ کی کھائیاں تیار کر کے اور خود ان اخدود کے کنارے پر کھڑے ہو کر کہا کہ تم اس آگ کو اختیار

[1] تفسیر ابن کثیر (٦٣٨/٤)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٤١٣/١٠)
[3] تفسیر ابن کثیر (٦٣٨/٤، ٦٣٩)

کرو یا ہمارے دین کو؟ انھوں نے کہا ہے کہ ہمارے لیے یہی آگ بہتر ہے، ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے، بچے گھبرا گئے، ان کے باپوں نے کہا کہ آج کے بعد پھر آگ نہیں ہوگی اور کود پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے ان روحوں کو اس سے قبل کہ انھیں آگ چھوتی قبض کر لیا۔ آگ نے اپنی جگہ سے نکل کر سب جبارین کو گھیر لیا، وہ اسی آگ میں جل کر خاک سیاہ ہو گئے۔ ''چاہ کندہ را چاہ در پیش۔'' ''جو کسی کے لیے کنواں کھودے خود اس میں گر مرتا ہے۔'' یہ آیت انھیں کے حق میں اتری ہے۔[1] (رواه ابن جرير نحوه) میں کہتا ہوں کہ جب کوئی اللہ کی توحید میں صادق قدم اور پختہ دم ہو جاتا ہے تو غیب سے اس کی حمایت و حفاظت ہوتی ہے، یہ توحید کا صدقہ اور دینِ خالص کا طفیل ہے۔ موحد مومن کی شان یہی چاہیے کہ اس کے سر پر اگر جلانے، غرق کرنے، قتل کرنے اور اس جیسی ہزار آفات اس کے سر پر نازل ہوں، وہ ہرگز اپنی توحید اور ایمان سے گریز نہ کرے۔

موحد کہ درپائے ریزی زرش   وگر تیغ ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد ز کس   ہمیں ست بنیاد توحید وبس

''توحید پرست درحقیقت وہ ہے کہ اگر تو اس کے سامنے سونا ڈھیر کر دے اور اگر اس کے سر پر ہندی تلوار رکھ دے تو وہ (اللہ کے سوا) نہ تو کسی سے امیدیں وابستہ کرے گا اور نہ کسی سے خوف کھائے گا۔ اور توحید کی اصل بنیاد یہی ہے۔''

اے ہمارے رب! تو ہم کو وہ یقینِ صادق و توحیدِ خالص عطا فرما کہ اگر ہم پر سلطنتِ ہفت اقلیم پیش کی جائے تو ہم اس کو سفالِ شکستہ کے برابر بھی وزن نہ رکھیں، بلکہ ایک پر پشہ کے برابر نہ سمجھیں اور اگر ہمارے لیے دنیا بھر کا عذاب اور عقاب تیار کرایا جائے تو ہم اس کو ایک نعیم مقیم سمجھ کر بسر وچشم قبول کر لیں، کیوں کہ وہ سلطنتِ آخرت میں چاروں طرف سے آگ کے گھیرے میں ہے اور یہ عقوبت چاروں طرف سے نعیم جنت سے گھری ہوئی ہے۔ « حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ »[2] ''جنت تکلیفوں اور جہنم خواہشات میں گھری ہوئی ہے۔'' ہم سے تو ہمارے رسول مقبول ﷺ نے پہلے کہہ دیا ہے: « اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ »[3] ''دنیا مومن کے لیے قید اور کافر کی جنت ہے۔''

اب ہم اگر متزلزل ہوں تو یہ ہمارے ضعفِ ایمان کی دلیل ہے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق شاملِ حال ہوگی اور دل میں توحیدِ صادق اور دینِ واثق کی شہادت قائم و دائم رہے گی تو پھر۔ إن شاء الله تعالى۔ اللہ بھی قولِ ثابت کے ساتھ اُس جگہ اور اس جگہ ثابت رکھے گا۔ ﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۚ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴾ [إبراهيم: ٢٧] ''ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ پکی بات کے ساتھ مضبوط رکھتا ہے، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی، ہاں نا انصاف لوگوں کو اللہ بہکا دیتا ہے اور اللہ جو چاہے کر گزرے۔'' اللهم توفيقا و استقامة.

[1] تفسير الطبري (٣٤٠/٢٤) [2] صحيح مسلم (٢٨٢٢) [3] صحيح مسلم (٢٩٥٦)

اصحاب الاخدود کی سزا کا ذکر:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن لوگوں نے ایمان دار مرد و عورت کو فتنے میں ڈالا، یعنی انھیں آگ میں جلایا، پھر انھوں نے توبہ نہ کی اور اپنے فعلِ گذشتہ پر نادم نہ ہوئے تو اُن کے لیے عذابِ جہنم اور عذابِ حریق ہے، کیوں کہ جزا جنسِ عمل سے ہوتی ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ، ضحاک اور ابن ابزی رحمہم اللہ کا ہے۔[1]

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: ''اس کے اس کرم وسخاوت کا تو ذرا مشاہدہ کرو کہ انھوں نے اس کے اولیاء کو قتل کیا اور وہ پھر بھی ان کو توبہ ومغفرت کی طرف بلا رہا ہے۔''[2] معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کا ایمان لانا سب چیزوں سے زیادہ محبوب ومطلوب ہے، لیکن بندے نفس اور شیطان کے ہاتھ میں ایسے پھنس گئے ہیں کہ ان کو اس لازوال نعمت و دولت کی کچھ قدر و قیمت سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک طرف اَللہ پاک کا یہ رحم وکرم اور دوسری طرف ان کی یہ سرکشی، عناد اور انکار وجھگڑنا۔ اس نے ایسے بڑے گناہ اور بھاری تقصیر پر بھی توبہ کی ہدایت کی اور مغفرت کا وعدہ دیا، زہے نصیب!

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ ‏ ‏ ‏ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست ‏ ‏ ‏ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

''توبہ کرلے، توبہ کرلے، جو کچھ بھی تو نے کیا توبہ کرلے، اگرچہ تو کافر ہے، آتش پرست ہے، بت پرست ہے، توبہ کرلے، یہ بارگاہ جو ہماری بارگاہ ہے یہاں کسی کو مایوسی نہیں ہوتی، اگر تو نے سو بار یہ توڑی ہے، پھر توبہ کرلے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ بروج سے مراد نجوم ہیں۔ آسمان صاحبِ نجوم ہے، یا بروج سے مراد آسمان میں قصور (محلات) ہیں۔ یا ﴿ذَاتِ الْبُرُوْجِ﴾ بہ معنی ذات الخلق الحسن ہے۔ یا بروج سے مراد سات کواکب کی منازل ہیں اور یہ بارہ منازل ہیں۔ کلامِ عرب میں بروج محل کو کہتے ہیں اور ایسا ہی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ظاہر ہے: ﴿وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ﴾ [النساء: ٧٨] ''گو تم مضبوط قلعوں میں ہو۔'' تاروں کی منزلوں کا نام برج اس لیے رکھا کہ وہ ان گھروں میں نزول کرتے ہیں، یہ ان کے محلات ہیں، یا ان سے مراد آسمانوں کے دروازے ہیں، یا منازلِ قمر ہیں۔ برج کے اصل معنی ظہور ہیں۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بروج کو کواکب فرمایا۔[3] (أخرجه ابن مردویه)

امام واحدی رحمہ اللہ کے بہ قول تمام مفسرین کے قول کے مطابق یومِ موعود بہ معنی یوم القیامۃ ہے۔[4] سیدنا

---

[1] تفسیر الطبري (٢٤/٣٤٣، ٣٤٤) [2] تفسیر ابن کثیر (٤/٦٣٩)

[3] الدر المنثور (٨/٤٦٢) [4] فتح القدیر (٥/٥٤٨)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔[1] ﴿شَاهِدٍ﴾ سے مراد خلائق ہے جو اس دن وہاں حاضر ہو گی۔ ﴿مَشْهُودٍ﴾ وہ عجیب دغریب ہولناکیاں ہیں جو اس جگہ مشاہدہ ہوں گی۔ یا ﴿شَاهِدٍ﴾ جمعہ کا دن اور ﴿مَشْهُودٍ﴾ یوم النحر ہے۔ یا ﴿شَاهِدٍ﴾ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ اور سارے انبیاء اور عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور ﴿مَشْهُودٍ﴾ امتِ اسلام ہے۔ یا انبیائے کرام کی امتیں یا عیسیٰ علیہ السلام کی امت ہیں۔ یا ﴿شَاهِدٍ﴾ آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد ہے۔ یا اعضائے بنی آدم ہیں۔ یا ﴿شَاهِدٍ﴾ یہ امت اور ﴿مَشْهُودٍ﴾ ساری امتیں ہیں۔ یا ﴿شَاهِدٍ﴾ نگہبان فرشتے ہیں اور ﴿مَشْهُودٍ﴾ بنی آدم، یا ایام ولیالی (راتیں) ہیں۔ بالجملہ اقوال یہاں بہت ہیں۔

راجح یہ ہے کہ ﴿شَاهِدٍ﴾ یوم جمعہ ہے اور ﴿مَشْهُودٍ﴾ یومِ عرفہ اور ''موعود'' یومِ قیامت ہے۔ اس آخری قول پر اجماع ہے، اصحابِ اخدود کے متعلق وہی صہیب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس کو امام عبد الرزاق، ابن ابی شیبہ، احمد، عبد بن حمید، مسلم، ترمذی، نسائی اور طبرانی رحمہم اللہ نے نقل کیا ہے۔[2] اللہ نے اس آگ کو ﴿ذَاتِ الْوَقُودِ﴾ فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ بہت بڑی آگ تھی۔ اس کے پاس کرسیاں ڈال کر عرضِ کفر کے لیے بیٹھے تھے یا آگ کے کنارے پر بیٹھے تھے کہ جس کو چاہیں اس کو آگ میں ڈالیں اور جس کو چاہیں چھوڑ دیں، اس میں مومنین کو اہلِ کفر و عناد کی ایذا دہی پر صبر وتحمل کی رغبت دلانا ہے۔ اللہ نے قوم کے صبر اور حقیقتِ ایمان کا قصہ بیان کیا کہ انھوں نے اتنا صبر کیا کہ آگ میں جل گئے مگر توحید سے نہ پھرے۔

مروی ہے کہ اللہ نے ان مومنوں کو، جو آگ میں ڈالے گئے، نجات دی وہ ستتر (۷۷) آدمی تھے۔ یہ لوگ اپنے دین سے نہیں پھرے۔ دس یا گیارہ آدمیوں نے دین سے رجوع کیا۔ اصحابِ اخدود کی تعیین میں کوئی نص نہیں آئی کہ وہ کتنے شخص تھے، مگر ایک جماعت تھی ان پر بادشاہ نے انکار نہیں کیا مگر اسی ایمان لانے پر اور یہی اللہ تعالیٰ کے فرمان سے ظاہر ہوتا ہے: ﴿هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ [المائدۃ: ۵۹] ''تم ہم سے صرف اس وجہ سے دشمنیاں کر رہے ہو کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہیں۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اس پر ایمان لائے تھے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے، سو جس کی بلند شان ایسی ہو وہ اسی لائق ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور اس کی توحید کی جائے۔ اس پر وہ حال مخفی نہیں ہے کہ جو مومنین کے ساتھ کیا گیا ہے، اس میں اصحابِ اخدود کو وعیدِ شدید ہے اور جن لوگوں نے اپنے دین پر صبر کیا اور اس پر جمے رہے ان کے لیے وعدِ سدید ہے۔

پھر فرمایا کہ جن لوگوں نے مومنوں کو فتنے میں ڈالا اور آگ میں جلایا اور اپنے کفر سے رجوع نہ کیا، ان کو اپنے کفر کے سبب سے آخرت میں اندیشہ ہے اور عذابِ کفر کے علاوہ ایک دوسرا عذاب علاحدہ ہو گا۔ بعض نے کہا ہے کہ ''حریق'' دوزخ کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ پہلے جہنم میں عذابِ زمہریر ہو گا، پھر دوبارہ عذابِ حریق ہو

[1] الدر المنثور (۸/۴۶۳) [2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

گا۔ پہلا عذاب سردی کا ہوا دوسرا عذاب گرمی کا۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عذابِ حریق دنیا میں ہوا کہ آگ نے خود انہیں کو جلا دیا۔ بادشاہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ جل بھن کر خاکستر ہو گیا۔ امام کلبی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[1] آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ توبہ کر لیتے تو اس وعید سے بچ جاتے، اس لیے غرغرہ سے پہلے کی توبہ قبول کی جاتی ہے، اگرچہ طولِ زمان ہو، یعنی گناہوں کا زمانہ بہت لمبا ہو۔[2]

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِیْرُ ﴿۱۱﴾ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ ﴿۱۲﴾ اِنَّهٗ هُوَ یُبْدِئُ وَ یُعِیْدُ ﴿۱۳﴾ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ﴿۱۴﴾ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ ﴿۱۵﴾ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ﴿۱۶﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ ﴿۱۸﴾ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ تَكْذِیْبٍ ﴿۱۹﴾ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِیْطٌ ﴿۲۰﴾ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ ﴿۲۱﴾ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کے لیے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، یہی بہت بڑی کامیابی ہے (11) بے شک آپ کے رب کی پکڑ نہایت سخت ہے (12) بے شک وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور وہی دوبارہ پیدا کرے گا (13) اور وہ بڑا بخشنے والا، بہت محبت کرنے والا ہے (14) وہ عرش کا مالک، اونچی شان والا ہے (15) جو چاہے کر گزرتا ہے (16) کیا آپ کے پاس لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟ (17) (یعنی) فرعون اور ثمود کی (18) بلکہ کافر تو جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں (19) اور اللہ ہر طرف سے انھیں گھیرے ہوئے ہے (20) بلکہ یہ قرآن اونچی شان والا ہے (21) لوحِ محفوظ میں (لکھا ہوا) ہے (22)

نیکوں کی جزا اور بدوں کی سزا:

موضح قرآن میں فرمایا ہے کہ ایک بادشاہ کا لے پالک بیٹا تھا۔ بادشاہ اس کو ایک ساحر کے پاس بھیجتا تھا، تاکہ اس سے سحر سیکھے۔ وہ ایک راہب کے پاس جا کر بیٹھ جاتا، تاکہ انجیل سیکھے۔ اللہ نے اس کو کمال دیا کہ شیر اور سانپ اس کا کہا مانیں اور اس کے چھونے سے کوڑھے اور اندھے اچھے ہو جائیں۔ اس کے ہاتھ پر بہت سی خلق اللہ پر اور

[1] تفسیر الطبری (۳۴۰/۲۴) فتح القدیر (۵۵۰/۵)
[2] فتح البیان (۱۵/۱۵۷۔۱۶۷)

عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائی۔ بادشاہ بت پرست تھا، یہ بات سن کر اس نے لے پالک کو مار ڈالا، پھر شہر میں ہر محلہ کے آگے کھائی کھدوائی اور اس کو آگ سے بھرا۔ محلے میں سے مرد اور عورتوں کو پکڑ کر منگواتا جو بت کو سجدہ نہ کرتا، اس کو آگ میں ڈال دیتا۔ ہزروں لوگ شہید کیے۔ جب اللہ پاک کا غضب آیا تو وہی آگ پھیل پڑی بادشاہ اور اس کے سرداروں کے گھر جلا دیے۔ انتھیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ مومنوں کے لیے ایسے باغات ہیں کہ ان کے نیچے نہریں جاری ہیں، ان دشمنوں کے برعکس کہ ان کے لیے عذابِ حریق اور جحیم ہے، لہٰذا مومنوں کے اجر کو بڑی کامیابی فرمایا۔ پھر فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے جو رسولوں کو جھٹلانے والے ہیں اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والے ہیں، ہماری پکڑ بڑی سخت، درشت، مضبوط اور عظیم ہے، کیوں کہ اللہ صاحبِ قوتِ متین ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے، ایک پلک مارنے میں بلکہ اس سے بھی زیادہ جلدی کر سکتا ہے۔ اس کی ایک قوت اور قدرت یہ ہے کہ اس نے مخلوق کو بنایا، پھر اس کا اعادہ کرے گا، کوئی اس کو روکنے والا اور دفاع کرنے والا نہیں ہے۔ وہ توبہ کرنے والوں کو بخشتا ہے گو گناہ کسی طرح کا ہو۔ وہ خضوع کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے، خاکساروں پر مہربان ہے، اس کا عرش بہت بڑا ہے ساری خلائق کے اوپر ہے جو چاہے سو کر ڈالے، کس کی مجال ہے کہ اس کے حکم کو پیچھے ڈالے یا اس کے فعل کے بارے میں کوئی سوال کرے، کیوں کہ وہ صاحبِ عظمت وقہر وحکمت وعدل ہے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مرض الموت میں کہا تھا کہ طبیب نے بھی تم کو دیکھا یا نہیں؟ کہا: ہاں دیکھا ہے، کہا: پھر کیا کہا؟ کہا: یہ کہا: ”إِنِّي فَعَّالٌ لِمَا أُرِيدُ“[1] ”بے شک میں جو چاہتا ہوں کر گزرتا ہوں۔“

پھر اللہ تعالیٰ نے فرعون اور ثمود کا قصہ یاد دلایا کہ جو آفت ان پر پہنچی، اس کی کچھ خبر تم کو بھی ہے کہ جو انتقامی کارروائی ان کے خلاف کی گئی، کوئی اس کو اُن سے دور نہ کر سکا۔ یہ گویا: ﴿ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴾ کی تقریر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جب کسی کو پکڑ لیتا ہے تو سخت پکڑتا ہے، پھر نہیں چھوڑتا۔ عمرو بن میمون رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک عورت پر ہوا، وہ یہ آیت پڑھ رہی تھی: ﴿ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر سننے لگے پھر فرمایا: ”نَعَمْ قَدْ جَاءَنِي“[2] (رواه ابن أبي حاتم) ”ہاں، یقیناً میرے پاس آ گئی ہے۔“

﴿ تَكْذِيْبٍ ﴾ سے مراد شک وریب اور کفر وعناد ہے۔ ﴿ مُحِيْطٌ ﴾ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ ان پر قادر ہے، اس کے قہر سے بچ نہیں سکتے اور نہ اس کو عاجز کر سکتے ہیں۔ یہ قرآنِ عظیم ملائے اعلیٰ میں کسی قسم کی زیادتی، کمی، تحریف اور تبدیلی سے محفوظ ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ لوحِ محفوظ اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی میں ہے۔[3] (رواه ابن جرير) عبدالرحمان بن سلمان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حکم دیا ہے اس کا ماقبل اور مابعد لوحِ محفوظ میں ہے۔

---

(1) تفسیر ابن کثیر (٤/٦٣٩، ٦٤٠) (2) تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٤١٤) یہ روایت مرسل ہے۔ (3) تفسیر الطبري (٢٤/٣٤٨)

لوحِ محفوظ اسرافیل علیہ السلام کی دونوں آنکھوں کے سامنے ہے اور اس میں دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔[1] حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا یہ قرآنِ مجید لوحِ محفوظ ہے اس میں سے جو چاہتا ہے جس پر چاہتا ہے اپنی مخلوق میں سے اس پر اتارتا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ لوحِ محفوظ کے شروع میں یہ لکھا ہے: ''لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ دِيْنُهُ الْإِسْلَامُ وَمُحَمَّدٌ عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ فَمَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَصَدَّقَ بِوَعْدِهِ وَاتَّبَعَ رُسُلَهُ أَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ'' ''اللہ تعالیٰ اکیلا معبود ہے، دین اس کا اسلام ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے و رسول ہیں، جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا اور اس کے وعدے کو سچا جانا اور اس کے رسولوں کا اتباع کیا، وہ اسے جنت میں داخل کرے گا۔''

پھر کہا کہ یہ لوح ایک سفید موتی ہے اور آسمان اور زمین کے درمیانی فاصلے جتنی لمبائی ہے اور مشرق اور مغرب کے درمیانی فاصلے کے مطابق چوڑائی ہے، اس کے کنارے دُر و یاقوت کے ہیں اور دفتی (پہلو) سرخ یاقوت کی ہیں اور قلم نور کا اور کلام عرش کے ساتھ وابستہ اور اس کی جڑ ایک فرشتے کی گود میں ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوح یمینِ عرش پر ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے، اللہ نے ایک لوحِ محفوظ بنائی ہے، سفید موتی سے، اس کے صفحات سرخ یاقوت کے ہیں اور قلم نور کی اور کتابت اللہ کے نور کی۔ ہر دن ایک لحظہ میں تین سو ساٹھ بار پیدا کرتا، رزق دیتا، مارتا اور زندہ کرتا، عزت دیتا اور ذلیل کرتا ہے جو چاہے سو کرے۔[3] وللّٰہ الحمد.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اللہ نے مجرمین کی وعید کے ذکر کے بعد مومنین کے اجر کا ذکر کیا اور فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور اچھے کام کیے، ان کے لیے ایمان اور عملِ صالح کے سبب سے جنات ہیں۔ آیت کا ظاہر عام ہے، اس میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو ایمان لانے کی وجہ سے اخدود میں جلا دیے گئے۔ نہر کا ذکر اس لیے ہے کہ دنیا میں گرمی پر صبر کیا تھا، اب برد سے لذت حاصل کریں۔ یہ ایمان اور عملِ صالح کو جمع کرنے والوں کے لیے ایک بڑا فضل اور شرف ہے۔ رہے کفار تو اُن کے لیے بطشِ شدید، یعنی سخت پکڑ ہے۔ اللہ ظالموں اور جابروں کو سخت پکڑتا ہے، اسی نے پہلے اس دنیا میں پیدا کیا، پھر موت کے بعد آخرت میں زندہ کر دے گا۔ جمہور کا قول یہی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ دنیا میں عذابِ حریق کو ظاہر کیا، آخرت میں پھر اس کا اعادہ کرے گا، یعنی دوبارہ وہی عذاب دے گا۔ اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے،[4] لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد ابتدائی عذاب اور دوبارہ دیا جانے والا عذاب ہے،[5] کیوں کہ جس کو ایجاد کی عادت ہے، وہ اعادہ بھی کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مومنین کے لیے ''بالغ المغفرة'' ہے۔ ان

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٤١٤) [2] تفسیر البغوي (٨/٣٨٩)

[3] المعجم الکبیر (١٢/٧٢) تفسیر ابن کثیر (٤/٦٣٩، ٦٤٠) اس کی سند میں ''لیث بن ابی سلیم اور محمد بن عثمان بن ابی شیبہ'' ضعیف راوی ہیں۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ١٦٠٨)

[4] تفسیر الطبري (٢٤/٣٤٥) [5] تفسیر الطبري (٢٤/٣٤٥)

کو رسوا نہیں کرتا۔ مطیعین کے ساتھ "بالغ الحبة" ہے، ان کو دوست رکھتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے اولیاء کا ودود (دوست) ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ودود بہ معنی رحیم ہے۔ قاضی اسماعیل نے کہا ہے کہ ودود وہ ہے جس کا کوئی بیٹا نہ ہو۔[1] بعض نے کہا ہے کہ مودود کے معنی میں ہے، یعنی جس کو صلحاء دوست رکھتے ہیں۔ غرض یہ کہ دونوں صفاتِ مدح ہیں، اگر اللہ نے مطیعین کو دوست رکھا تو یہ اس کا فضل ہے اور اگر عباد عارفین نے اس کو دوست رکھا تو وہ اس کو کریم الاحسان جانتے ہیں۔ معتزلہ نے کہا ہے کہ تائب کے لیے غفور ہے۔

اہلِ سنت نے کہا ہے کہ نہیں، بلکہ وہ تائب اور غیر تائب کے لیے بخشنے والا ہے، اس لیے کہ یہ آیت معرضِ تمدح میں آئی ہے۔ تمدح اس میں ہے کہ وہ مطلقاً غفور ہو، لہٰذا اس کو اسی پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے، کیوں کہ غفور صیغۂ مبالغہ ہے تو یہی مناسب ہے کہ اس کو عمومیت پر محمول کیا جائے۔ (قالہ زادہ) یعنی اگر کبیرہ کے مرتکب نے توبہ کی توفیق نہ پائی تو بھی ایمان کے وجود کے سبب سے اس کے لیے مغفرت کی امید ہے۔ مجد سے انتہائی درجے کا فضل وکرم ظاہر ہوتا ہے، یہ اللہ کی صفت اور تعریف ہے یا عرش کی تعریف ہے۔

سورۃ المومنین میں اللہ نے عرش کی صفت کرم کے ساتھ کی ہے۔[2] مجید بہ معنی کریم۔[3] (قالہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما) ﴿ذُو الْعَرْشِ﴾ سے مراد صاحبِ ملک وسلطان ہے۔ پھر کہا کہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ﴾ ہے۔ وہ چاہے ابداء کرے چاہے اعادہ۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی شے جس کا وہ ارادہ کرے، اسے عاجز نہیں کر سکتی اور نہ ممتنع ہو سکتی ہے،[4] جب ہر کام اس کے ارادے پر ٹھہرا تو ثابت ہوا کہ کوئی شے اس پر واجب نہیں ہے۔ جنودِ فرعون اور ثمود کے واقعات کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے کیا ہے۔ ﴿حَدِيثُ﴾ سے مراد ان کا کفر وعناد اور گمراہی ہے جس کی وجہ سے ان پر سزا، عذاب اور وبال آیا۔ یہ قصہ قرآن پاک میں کئی جگہ آ چکا ہے۔ صرف ان دو فریق کے ذکر پر اکتفا اس لیے کیا کہ ان کا حال عرب کے اہلِ کتاب اور مشرکین کے نزدیک مشہور تھا۔

پھر فرمایا کہ یہ کفار اپنی تکذیب میں گرفتار ہیں، پہلے کافروں کے حال سے عبرت نہیں پکڑتے اور اللہ ان کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ ہر طرف سے گھرے ہوئے ہیں اور یہ قرآن اپنے کرم اور برکت میں انتہا کو پہنچنے والا ہے اور اپنے نظم وضبط میں ایک معجزہ ہے۔ اعلیٰ طبقۂ کتب میں واقع ہوا ہے اس میں بندوں کے لیے دونوں جہانوں کے احکام موجود ہیں۔ یہ کچھ شعر وکہانت وسحر نہیں ہے، جیسا کہ یہ کفار گمان کرتے ہیں بلکہ یہ تو لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ لوح ام الکتاب ہے، شیاطین اس تک نہیں پہنچ سکتے، کیوں کہ یہ اللہ کے نزدیک محفوظ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ لوح بالضم سے مراد ساتویں آسمان پر ہوا وفضا ہے۔ یہی قول ابو الفضل وابن خالویہ کا ہے۔[5] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] تفسير القرطبي (١٩/٢٩٦) [2] رقم الآية (١١٦) [3] تفسير الطبري (٢٤/٣٤٦)
[4] فتح القدير (٥/٥٥١) [5] فتح القدير (٥/٥٥٢)

نے کہا ہے کہ لوح ذکر ایک ہے، تین سو برس کی راہ تک اور وہ ایک نور ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ نے لوح کو سو برس کی راہ تک پیدا کیا ہے۔ خلق کی پیدائش سے پہلے قلم کو حکم دیا کہ میرے علم کو میری خلق میں لکھ جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے۔ قلم نے اس کو لکھا۔ اس کی سند جید ہے۔ [1]

---

[1] در المنثور (٨/٤٧١) فتح البیان (١٥/١٦٧۔١٧١)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوۡرَةُ الطَّارِقِ

اس سورت میں سترہ (۱۷) آیتیں ہیں۔ یہ بلا اختلاف مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مکے میں اتری ہے۔ خالد عدوانی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بازارِ ثقیف میں ایک کمان یا عصا پر ٹیک لگائے کھڑا ہوا دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس مدد طلب کرنے کے لیے آئے تھے۔ میں نے سنا کہ ﴿ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴾ پڑھتے ہیں، یہاں تک کہ اس سورت کو ختم کیا۔ میں نے جاہلیت میں اس کو یاد کر لیا اسلام میں اس کو پڑھا۔ ثقیف نے مجھے بلا کر کہا: تو نے اس شخص سے کیا سنا، یہ کیا پڑھ رہا تھا؟ میں نے ساری سورت پڑھ کر سنائی۔ قریش جو ثقیف کے ہمراہ تھے، انھوں نے کہا کہ ہم کو اپنے صاحب کا حال خوب معلوم ہے، اگر ہم اس کی بات کو سچ جانتے تو اس کی پیروی کرتے۔[1] (أخرجه أحمد والبخاري في التاريخ و الطبراني و ابن مردويه)۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے نمازِ مغرب میں سورۃ البقرہ یا سورۃ النساء پڑھی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے معاذ! تو کیسا فتنہ انگیز ہے؟ کیا تجھ کو ﴿ وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴾ اور ﴿ وَالشَّمۡسِ وَضُحٰهَا ﴾ پڑھنا کافی نہیں تھا۔[2] (رواه النسائي)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴿۱﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ﴿۲﴾ النَّجۡمُ الثَّاقِبُ ﴿۳﴾ اِنۡ كُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَیۡهَا حَافِظٌ ﴿۴﴾ فَلۡیَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ مِمَّ خُلِقَ ﴿۵﴾ خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ ﴿۶﴾ یَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَیۡنِ الصُّلۡبِ وَالتَّرَآىِٕبِ ﴿۷﴾ اِنَّهٗ عَلٰی رَجۡعِهٖ لَقَادِرٌ ﴿۸﴾ یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآىِٕرُ ﴿۹﴾ فَمَا لَهٗ مِنۡ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴿۱۰﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے آسمان کی اور رات کو آنے والے کی ① اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ رات کو آنے والا کیا

① مسند أحمد (۳۳۵/۴) التاريخ الكبير (۱۳۸/۳) المعجم الكبير (۱۹۷/۴) اس کی سند میں ''عبدالرحمان بن خالد عدوانی'' مجہول راوی ہے۔

② سنن النسائي الكبرىٰ (۵۱۲/۶)

ہے؟② وہ چمکتا ہوا ستارہ ہے③ کوئی جان ایسی نہیں جس پر کوئی نگہبان نہ ہو④ چنانچہ انسان کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے⑤ وہ اُچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے⑥ جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے⑦ بے شک وہ (اللہ) اسے دوبارہ پیدا کرنے پر یقیناً قادر ہے⑧ جس دن راز ظاہر کر دیے جائیں گے⑨ تو انسان کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ کوئی اس کا مددگار ہوگا⑩

انسان نظام الٰہی میں گھرا ہوا ہے:

فرشتے آدمی کے ساتھ رہتے ہیں، اس کو بلاؤں سے بچاتے ہیں یا اس کے اعمال کو لکھتے ہیں۔ مرد کی منی اس کی پیٹھ سے آتی ہے اور عورت کی منی اس کے سینے سے آتی ہے۔ اللہ مرنے کے بعد پھیر لائے گا۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے آسمان کی اور تاروں کی قسم کھائی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تارے کا نام طارق رکھا، اس لیے کہ وہ رات کو دکھائی دیتا ہے اور دن کو چھپ جاتا ہے۔[1] حدیثِ صحیح میں طروق سے نہی آئی ہے، یعنی آدمی سفر سے اچانک رات کے وقت لوٹے اور اپنے گھر والوں کے پاس آئے۔[2] دوسری حدیث میں یہ دعا کی ہے: "أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ طَوَارِقِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِلَّا طَارِقًا يَطْرُقُ بِخَيْرٍ يَا رَحْمَانُ"[3] "اے رحمان! میں دن رات کے طوارق کے شر سے تیری پناہ پکڑتا ہوں سوائے اس طارق کے جو خیر لائے۔" ثاقب سے مراد درخشاں ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب وہ شیاطین پر مارا جاتا ہے تو ان میں سوراخ کر دیتا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی شیاطین کو جلانے والا ہے۔[4] ہر شخص پر اللہ کی طرف سے ایک حارس مقرر ہے جو اس کو آفات سے بچاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ [الرعد: ١١] "اس کے پہرے دار انسان کے آگے پیچھے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کی نگہبانی کرتے ہیں۔"

انسان کی پیدائش، قدرتِ الٰہی کی ایک دلیل:

پھر انسان کو اس کے اصل کی کمزوری پر آگاہ کیا اور ارشاد کیا کہ وہ معاد کا اقرار کرے، کیوں کہ جس کو پہلی دفعہ پیدا کرنے کی قدرت ہے وہ دوبارہ پیدا کرنے پر ہی بدرجہ اولیٰ قادر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ﴾ [الروم: ٢٧] "وہی ہے جو اول بار مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا۔" منی آدمی میں سے کود کر نکلتی ہے، اسی طرح عورت کی منی، پھر دونوں منی مل کر اللہ کے حکم سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مرد کی منی پشت سے نکلتی ہے، عورت کی منی زرد اور پتلی ہوتی ہے۔ بچہ پیدا نہیں

[1] تفسير الطبري (٣٥١/٢٤)
[2] صحيح البخاري (١٧٠٧) صحيح مسلم (٧١٥)
[3] مسند أحمد (٤١٩/٣) صحيح الجامع (٧٤)
[4] تفسير ابن كثير (٦٤١/٤)

ہوتا مگر انہیں دونوں منیوں سے۔ یہی قول امام سعید بن جبیر، عکرمہ، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر کہا: ''ترائب'' یہ ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ ترائب زن موضعِ قلادہ ہے (پٹکا باندھنے جگہ)۔ امام عکرمہ اور ابن جبیر رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں، مراد دونوں پستانوں کی درمیانی جگہ۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''ترائب''دونوں کندھوں کے درمیان سینے تک کو کہتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ''أسفل تراقي''(ہنسلی کے نیچے کے حصے) کو بولتے ہیں۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پستان کے اوپر کی جگہ کو کہتے ہیں۔ امام ابن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''ترائب'' نیچے کی جانب سے چار اضلاع ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''ترائب''دونوں پستانوں، دونوں پاؤں اور دونوں آنکھوں کے درمیان کی جگہ ہے۔ معمر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''ما بین صلب و ترائب'' سے مراد عصارۂ قلب ہے، وہیں سے بچہ مکون ہوتا ہے (ترتیب پاتا ہے)۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مابین صلب (پیٹھ) اور نحر (سینہ) ہے۔[1]

قیامت کے دن انسان کی بے بسی:

رجوع سے مراد یا تو یہ ہے کہ جو پانی کود کر نکلتا ہے اللہ اس کو پھر اس کی جگہ میں پھیر دے۔ یہ امام عکرمہ اور مجاہد رحمہما اللہ وغیرہما کا قول ہے۔ یہ کہ آخرت میں پھر اس کا اعادہ فرمائے، کیوں کہ جس کو پہلی دفعہ پیدا کرنے پر قدرت ہے اس کو اعادے پر بھی قدرت ہے۔ اللہ نے اس دلیل کو قرآن پاک میں کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ اسی قول کے قائل ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے،[2] لہٰذا فرمایا ہے کہ جس دن رازِ دل کا امتحان ہوگا اس دن اس کو نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ کوئی مددگار ہوگا۔ یعنی اس کے پوشیدہ اور ظاہر اور چھپے ہوئے عمل سب مشہور ہو جائیں گے، کوئی شے مخفی و پوشیدہ نہ رہے گی، بلکہ دلوں کے راز کھل پڑیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے رفعاً کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر غادر (بے وفا) کے لیے اس کی پیٹھ کے نزدیک ایک جھنڈا بلند کرے گا، کہیں گے کہ یہ غدر ہے فلاں بن فلاں کا، یعنی اس کی عہد شکنی ہے۔[3] (رواہ الشیخان)۔ اب انسان کو نہ اپنی ذات سے کچھ طاقت ہوگی اور نہ باہر سے اس کا کوئی مددگار ہوگا جو اس کو اللہ کے عذاب سے چھڑائے۔ کس میں قدرت ہے کہ وہ یہ کام کر سکے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتابِ عزیز میں جابجا آسمان و سورج و چاند ستاروں کا ذکر کیا ہے، اس لیے کہ ان کے حالات ان کی شکلوں اور چلنے اور طلوع و غروب ہونے کی جگہوں میں عجیب و غریب ہیں۔ طارق سے

---

① تفسير الطبري (٢٤/٣٥٤_٣٥٥) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤١٥) تفسير ابن كثير (٤/٦٤١،٦٤٢)

② تفسير الطبري (٢٤/٣٥٧،٣٥٨) ③ صحيح البخاري (٥٨٢٣) صحيح مسلم (١٧٣٥)

④ تفسير ابن كثير (٦٤١،٦٤٢)

مراد روشن ستارہ ہے جس طرح کہ خود قرآن نے اس کی صراحت فرمائی ہے۔ امام فراء، زجاج اور مبرد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ جو رات کو نکلے اور رات کو تیرے پاس آئے وہ طارق ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مخصوص ستارہ ہے زحل یا ثریا، یا وہ جس سے شیاطین کو مارتے ہیں۔ یا نجم کی جنس ہے۔ صحاح میں کہا ہے کہ طارق صبح کا ستارہ ہے۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ثاقب بہ معنی متوہج ہے یعنی بہت چمکنے والا۔ بعض نے کہا ہے کہ بہ معنی مرتفع عالی، یعنی بہت بلند ہے۔

امام سفیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں ﴿ مَاۤ اَدْرٰىكَ ﴾ آیا ہے اس کی خبر نبی اکرم ﷺ کو دی ہے اور جس جگہ ﴿ مَا يُدْرِيْكَ ﴾ فرمایا ہے، اس کی خبر نہیں دی۔[2] کسی نے کہا ہے کہ یہ تارہ ساتویں آسمان پر ہے جس کو زحل کہتے ہیں، وہاں اس کے سوا اور کوئی تارہ نہیں ہے۔ جب تارے آسمان پر اپنی اپنی جگہ پکڑتے ہیں اس وقت یہ بھی اتر کر ان کے ساتھ ہو جاتا ہے، پھر ساتویں آسمان میں اپنی جگہ پر چلا جاتا ہے، اس لیے اس کو طارق کہتے ہیں کہ نازل (نیچے اترنے والا) اور صاعد (اوپر چڑھنے والا) ہوتا ہے۔ اللہ نے صرف ﴿ اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ ﴾ نہیں کہا، حالاں کہ یہ مختصر تھا، بلکہ عدول کیا، تاکہ طارق کی شان کو مفخم کرے (بڑھائے)۔ پہلے طارق کی قسم کھائی جس میں غیر بھی شریک ہے، پھر نجم کے ساتھ اس کی تفسیر فرمائی، تاکہ جو ابہام سوالیہ انداز سے حاصل ہوا تھا وہ دور ہو جائے۔

﴿ حَافِظٌ ﴾ سے مراد نگہبان فرشتے ہیں جو عمل وقول وفعل کی حفاظت کرتے ہیں اور ہر خیر وشر کے عمل کو لکھتے ہیں۔ یا مراد خود حق تعالیٰ ہے یا عقل ہے جو اعمالِ صالح کی طرف راہنما ہوتی ہے اور مفاسد سے روکتی ہے، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ اس کی دلیل اللہ کے یہ اقوال ہیں: ﴿ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ﴾ [الانفطار: ١٠] ''یقیناً تم پر نگہبان مقرر ہیں۔'' ﴿ يُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ﴾ [الأنعام ٦١] ''تم پر نگہداشت رکھنے والے بھیجتا ہے۔'' ﴿ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ ﴾ [الرعد: ١١] اگرچہ حقیقت میں نگہبان اللہ ہی ہے جیسا کہ اس کے فرمان میں ہے: ﴿ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ﴾ [یوسف: ٦٤] ''بس اللہ ہی بہتر حافظ ہے۔'' اور اس کے اس فرمان میں ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ﴾ [النساء: ١] ''بے شک اللہ تعالیٰ تم پر نگہبان ہے۔'' یہ اس لیے کہ جس طرح ممکنات اپنے وجود میں آنے کے لیے ایک واجب بالذات کی محتاج ہیں، اسی طرح اپنی بقا کے لیے بھی اس کی حاجت رکھتی ہیں۔ ملائکہ کا حفظ اسی کے حفظ سے ہے، کیوں کہ وہ اسی کے حکم سے نگہبانی کرتے ہیں۔

اب انسان اپنی پیدائش کے شروع ہونے کی طرف ذرا غور وفکر کرے اور اللہ کی قدرت دیکھے کہ اس کو اس نے کس بے حقیقت چیز سے بنایا ہے کہ ایک نطفہ قذرہ (پلید)، قلیلہ، حقیرہ سے اس کو پیدا کیا۔ کیا وہ پھر اس کا اعادہ نہیں کر سکتا۔ ''دفق'' بہ معنی ریختن ہے یا بہ معنی دفع، یعنی پے بہ پے بوندوں کا گرنا ایسا ہے جیسے ایک قطرہ دوسرے قطرے کو دفع کرتا ہو۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔[3] اس جگہ اس اُچھلتے پانی سے مراد

[1] فتح القدير (٥/٥٥٧) [2] تفسير القرطبي (٢٠/٣) [3] اللباب في علوم الكتاب (٢٠/٢٦٢)

مرد و عورت کی منی ہے، کیوں کہ انہیں دونوں کے ملنے سے بچہ بنتا ہے۔ امام ابن عادل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بچے میں ہڈی اور پٹھے مرد کے پانی کے ہوتے ہیں اور گوشت اور خون عورت کے پانی کا ہوتا ہے۔[1] سو جس کو اس بات کی قدرت ہے، وہ اس پر بھی قادر ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد پھر اٹھا کھڑا کرے۔ ایک جماعت مفسرین کا یہی قول ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ وہ چاہے تو منی کو پھر احلیل میں پھیر دے۔ امام عکرمہ اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ صلب میں واپس کرے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اگر میں چاہوں تو بڑھاپے سے جوانی کی طرف اور جوانی سے بچپن کی طرف اور بچپن سے نطفہ کی طرف پھیر دوں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اللہ اس بات پر قادر ہے کہ نطفے کو روک رکھے، نکلنے نہ دے۔ پہلی بات زیادہ ظاہر ہے اور اسی کو امام ابن جریر، ثعلبی اور قرطبی رحمہم اللہ نے اختیار کیا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ چاہے تو بوڑھے کو جوان اور جوان کو بوڑھا کر دے۔[3] بھیدوں کو جانچنے سے مراد یہ ہے کہ جو دین کے بارے میں عقائد و خیالات دلوں میں چھپے ہوئے ہیں وہ اس دن مکشوف (ظاہر) ہو جائیں گے۔ کسی کے لیے زین (سجاوٹ، خوبی) ہوں گے اور کسی کے لیے شین (برائی، عیب، خرابی) ہوں گے۔ اس سے مراد اعمال کا پیش کرنا اور اعمال ناموں کا نشر کرنا ہے، اس دن اچھائیاں برائیوں سے علاحدہ اور غث (دبلے) سمین (موٹے تازے) سے الگ ہو جائیں گے۔

بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت — کہ با کہ باختہ عشق در شب دیجور

”صبح کے وقت دن کی طرح تجھ کو (یا تیرے متعلق) علم ہو جائے گا کہ تاریک رات میں تو نے کس کے ساتھ عشق لڑایا ہے۔“

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان ملوک کے لیے وہاں نہ کچھ قوت ہوگی اور نہ کوئی نصرت۔ سفیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قوت سے مراد عشیرہ (خاندان) ہے اور ناصر سے مراد حلیف ہیں،[4] لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ نہ خود کچھ طاقت رکھیں گے کہ عذاب سے بچیں اور نہ کوئی دوسرا مددگار ہوگا جو اُن کو عذاب سے بچائے۔[5]

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿١١﴾ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿١٢﴾ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ﴿١٣﴾ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ﴿١٤﴾ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿١٥﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿١٦﴾ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ﴿١٧﴾

قسم ہے بار بار بارش برسانے والے آسمان کی (11) اور پھٹنے والی زمین کی (12) بے شک یہ (قرآن) یقیناً قولِ فیصل ہے (13) اور یہ ہنسی مذاق نہیں ہے (14) بے شک وہ (کافر) کچھ چالیں

---

(1) اللباب في علوم الكتاب (٢٠/٢٦٤) (2) تفسير الطبري (٢٤/٣٥٧، ٣٥٨) تفسير القرطبي (٢٠/٧)
(3) الدر المنثور (٨/٤٧٦) (4) تفسير القرطبي (٢٠/١٠) (5) فتح البيان (١٥/١٧٥-١٨٠)

چلتے ہیں⑮ اور میں بھی ایک چال چلتا ہوں⑯ تو (اے نبی!) آپ ان کافروں کو (ان کے حال پر) چھوڑ دیں، انھیں تھوڑی سی مہلت دیں⑰

﴿ الرَّجْعِ ﴾ اور ﴿ الصَّدْعِ ﴾ کا مطلب ومفہوم:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "رجع" سے مراد باران ہے یا بادل ہے جس میں پانی ہوتا ہے، یعنی آسمان بار بار بارش برساتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بندوں کا رزق ہر سال پھر کر آتا ہے، اگر یہ نہ ہوتو وہ ہلاک ہو جائیں اور ان کے مویشی مر جائیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد تاروں اور سورج اور چاند کا پھرنا ہے کہ وہ یہاں سے وہاں تک چکر مارا کرتے ہیں۔ "صدع" سے مراد زمین کا روئیدگی سے پھٹنا ہے، یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سعید بن جبیر، عکرمہ، ابو مالک، ضحاک، حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔ قولِ فصل سے مراد قولِ حق ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1] کسی نے کہا ہے کہ حکم عدل ہے۔ "ھزل" سے مراد خلافِ جد ہے، یعنی یہ بات کچھ بے تحقیق نہیں ہے، بلکہ حق اور ثابت ہے، پھر یہ خبر دی کہ کفار اس حق کی تکذیب کرتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے باز رکھتے ہیں۔ اپنے مکر سے خلافِ قرآن کی طرف بلاتے ہیں۔ پس تو اے رسول! ان کو مہلت دے، جلدی نہ کر، ذرا سی ڈھیل دے کر دیکھ کہ ان پر کیسا عذاب اور نکال (سزا) آتی ہے اور یہ کس عقوبت اور ہلاکت میں گرفتار ہوتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ إِلَىٰ عَذَابٍ غَلِيظٍ ﴾ [لقمان: ٢٤] ''ہم انھیں کچھ یونہی سا فائدہ دے دیں لیکن (بالآخر) ہم انھیں نہایت بے چارگی کی حالت میں سخت عذاب کی طرف ہنکا لے جائیں گے۔''

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ "رجع" سے مراد یہ ہے کہ آسمان جس جگہ سے حرکت کرتا ہے، پھر اسی جگہ چکر مار کر آ جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ "رجع" سے مراد ملائکہ ہیں کہ بندوں کے اعمال لے کر آتے جاتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ "رجع" سے مراد نفع ہے۔ رہی زمین جو اس میں سے گھاس پھوس، پھل، میوہ، درخت، نہر، چشمے اور ایسی اور چیزیں نکلتی ہیں۔ "صدع" بہ معنی شق ہے یا "صدع" سے مراد راستے ہیں جو پانی بہنے سے نمودار ہوتے ہیں، یا مردے مراد ہیں کہ زمین پھٹ کر نکل پڑیں گے، یا مراد جنگل ہیں۔

فخر الدین رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح جانداروں کے پیدا کرنے کو اس بات کی دلیل

---

[1] تفسیر الطبري (٣٦٠/٢٤-٣٦٢)

ٹھہرایا کہ اس سے مبدء (پہلی دفعہ پیدا کرنے) اور معاد (موت کے بعد زندہ کرنے) کی معرفت ہو سکے اسی طرح نبات کے پیدا کرنے کی کیفیت کو اس کی معرفت حاصل کرنے کے لیے دلیل ٹھہرایا۔ آسمان باپ کی طرح صاحبِ رجع ہے اور زمین ماں کی طرح صاحبِ صدع ہے، یہ دونوں باتیں اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ہیں، کیوں کہ دنیا کی نعمتیں اس چیز پر موقوف ہیں جو آسمان سے بار بار اترے اور زمین سے بار ہا اُگے۔[1]

پھر فرمایا کہ یہ قرآن حق اور باطل کے درمیان ایک قولِ فاصل ہے۔ ہر ایک کا حال الگ الگ بتاتا ہے، اسی لیے اس کو فرقان بھی کہتے ہیں۔ قطعی اور حتمی حکم کا نام فیصلہ ہوتا ہے، یعنی یہ کلامِ پاک شر اور جھگڑے کو ختم کرنے والا ہے، کچھ لہو ولعب نہیں ہے، بلکہ صدور میں مہیب (سینوں میں ہیبت طاری کرنے والا) اور قلوب میں معظم (دلوں میں عظمت پیدا کرنے والا) ہے، اس کا قاری اور سننے والا بلند درجہ ہو جاتا ہے۔ ہزل اور تفکر و مزاح سے دور رہتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''ھزل'' سے مراد باطل ہے،[2] یہ لوگ اس چیز کے باطل کرنے میں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں مکر و فریب کرتے ہیں۔

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب وہ لوگ دار الندوہ میں جمع ہو کر مشورہ کیا کرتے تھے۔ یا ''کید'' سے مراد شبہات ڈالنا ہے، جیسا کہ ان کا قول اللہ تعالیٰ نے نقل کیا ہے: ﴿ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا ﴾ [المؤمنون: ٣٧] ''(زندگی) تو صرف دنیا کی زندگی ہے۔'' اور ان کا یہ قول: ﴿ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴾ [یٰسٓ: ٧٨] ''ان گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے؟'' اور ان کا یہ قول: ﴿ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ﴾ [ص: ٥] ''کیا اس نے اتنے سارے معبودوں کا ایک ہی معبود کر دیا۔'' سو ہم بھی ان سے وہی ان کی چال چلتے ہیں اور اس طرح استدراج کرتے ہیں کہ ان کو معلوم بھی نہیں ہوتا، یعنی ان کو ان کے کید کی جزا دیں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس جزا سے مراد وہ قتل اور کید ہے جو بدر کے دن واقع ہوئے تھے۔ یا اللہ کا کید یہ ہے کہ اس نے پیغمبر کی مدد کی اور ان کا درجہ بڑھایا۔ سو تو بھی ان کو مہلت دے اور اللہ سے ان کا جلد ہلاک ہونا نہ مانگ اور ان پر بد دعا نہ کر، کیوں کہ ہم بھی تو جلدی نہیں کرتے ہیں۔ تو ان کو کچھ قلیل مدت کے لیے چھوڑ دے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو پکڑ لیا اور آیتِ سیف سے مہلت دینے کو منسوخ کر کے قتال کا حکم دیا۔[3]

---

[1] تفسیر الرازي (١٢١/٣١) [2] تفسیر الطبري (٣٦٢/٢٤) [3] فتح البیان (١٨٠/٥-١٨٢)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْاَعْلٰى

سورة الاعلیٰ کی فضیلت:

اس کو سورت ''سبح'' بھی کہتے ہیں۔ اس کی انیس (۱۹) آیتیں ہیں۔ جمہور کے قول کے مطابق یہ مکی ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مدنی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مکے میں اتری ہے۔ یہی قول سیدہ عائشہ اور سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کا بھی ہے۔[2] سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ہمارے پاس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آئے، وہ ہم کو قرآن پڑھاتے تھے۔ پھر عمار، بلال اور سعد رضی اللہ عنہم آئے، پھر سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیس آدمی لے کر آئے، پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آئے۔ ہم نے نہیں دیکھا کہ اہلِ مدینہ کسی شے سے اتنا خوش ہوئے ہوں، جتنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر شادمان ہوئے، یہاں تک کہ لڑکے بچے بھی کہتے تھے: ''هٰذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَدْ جَآءَ'' ''یہ دیکھو! اللہ کے رسول آ گئے ہیں۔'' سو وہ نہیں آئے یہاں تک کہ ہم سورت ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى﴾ اور ایک اور اس جیسی سورت پڑھ چکے تھے۔[3] (رواه البخاري وغيره)۔ سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سورت کو دوست رکھتے تھے۔[4] (أخرجه أحمد والبزار وابن مردويه)

یعنی بہ سبب اس کے کہ یہ سورت علوم و خیراتِ حسان پر مشتمل ہے۔ سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیدین اور جمعہ میں یہ سورت اور ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ﴾ پڑھتے تھے اور اگر عید جمعہ کے دن پڑتی، تب بھی انہی دونوں سورتوں کو پڑھتے تھے۔[5] (أخرجه أحمد و مسلم و أهل السنن) سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر میں ﴿سَبِّحِ اسْمَ﴾ پڑھتے۔[6] (أخرجه مسلم وغيره)۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وتر کرتے اس کے ساتھ اور ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ کے ساتھ۔[7] (أخرجه أهل السنن والدار قطني و الحاكم و البيهقي) یعنی وتر کی ہر ایک رکعت میں ایک سورت

---

① تفسير القرطبي (۱۳/۲۰) ② الدر المنثور (۴۷۹/۸) ③ صحيح البخاري (۴۶۵۷)

④ مسند أحمد (۹۶/۱) اس کی سند میں ''ثویر بن ابی فاختہ'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۴۲۶۶)

⑤ صحيح مسلم (۸۷۸) مسند أحمد (۲۷۳/۴) سنن أبي داود (۱۱۲۲) سنن الترمذي (۵۳۳) سنن النسائي (۱۵۶۸) سنن ابن ماجه (۱۲۸۱)

⑥ صحيح مسلم، رقم الحديث (۴۶۰)

⑦ سنن النسائي، رقم الحديث (۱۶۹۹) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۱۷۱) سنن الدارقطني (۳۱/۲) مستدرك الحاكم (۲۸۲/۲) سنن البيهقي الكبرىٰ (۳۸/۳)

پڑھتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ اس وتر میں درمیانی تشہد نہ ہوتا تھا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت یہ ہے کہ پہلی رکعت میں ﴿ سَبِّحِ ﴾ دوسری میں ﴿ اَلْكٰفِرُوْنَ ﴾ اور تیسری رکعت میں ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ معوذتین کے ساتھ۔[1] (رواہ أهل السنن و صححه الحاكم)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ﴿1﴾ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ﴿2﴾ وَالَّذِيْ قَدَّرَ
فَهَدٰى ﴿3﴾ وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ﴿4﴾ فَجَعَلَهٗ غُثَاۗءً اَحْوٰى ﴿5﴾
سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ﴿6﴾ اِلَّا مَا شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا
يَخْفٰى ﴿7﴾ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ﴿8﴾ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ﴿9﴾
سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ﴿10﴾ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ﴿11﴾ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ
الْكُبْرٰى ﴿12﴾ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿13﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

آپ اپنے سب سے بلند رب کے نام کی تسبیح کریں ① جس نے پیدا کیا پھر ٹھیک ٹھاک بنایا ② اور جس نے اندازہ کیا، پھر ہدایت دی ③ اور جس نے (زمین سے) چارا نکالا ④ پھر اسے خشک سیاہ کوڑا کرکٹ بنا دیا ⑤ ہم جلد آپ کو پڑھائیں گے، پھر آپ نہ بھولیں گے ⑥ مگر جو اللہ چاہے، بے شک وہ ظاہر کو جانتا ہے اور مخفی کو بھی ⑦ اور ہم آپ کو آسان راستے کی توفیق دیں گے ⑧ پھر آپ نصیحت کیجیے اگر نصیحت نفع دے ⑨ جو ڈرتا ہے وہ ضرور نصیحت قبول کرے گا ⑩ اور انتہائی بدبخت ہی اس سے دور رہے گا ⑪ جو بہت بڑی آگ میں جائے گا ⑫ پھر اس میں نہ وہ مرے گا اور نہ جیے گا ⑬

تسبیح کا حکم اور اس کا جواب:

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴾ [الواقعة: ٧٤] ''پس اپنے بہت بڑے رب کے نام کی تسبیح کیا کرو۔'' تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کہا کہ تم اس کو اپنے رکوع میں

[1] سنن الترمذي (٤٦٣) سنن ابن ماجه (١١٧٣) مستدرك الحاكم (٤٤٧/١)

رکھو۔ جب یہ آیت آئی ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ﴾ تو فرمایا کہ تم اس کو اپنے سجود میں رکھو۔[1] (رواہ أحمد وأبو داود وابن ماجه)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس آیت کو پڑھتے تو ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى'' کہتے۔[2] (رواہ أحمد وھکذا أبو داود موقوفا)۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس کو پڑھ کر ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى'' کہا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اسی طرح کیا تھا اور جب سورت قیامت کی آخری آیت پر آتے: ﴿ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤى اَنْ يُّحْـِۧىَ الْمَوْتٰى ﴾ تو کہتے: ''سُبْحَانَكَ وَبَلَى''[3]

نباتات وغیرہ کا اگانا:

اللہ نے مخلوق کو بنایا ہر مخلوق کو احسن ہیئات میں برابر کیا۔ انسان کو بدبختی اور نیک بختی کی راہ دکھائی، چوپایوں کو چراگاہ کا راستہ بتایا۔ یہ آیت ویسی ہے، جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا: ﴿ رَبُّنَا الَّذِيْۤ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴾ [طٰهٰ: ٥٠] ''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر ایک کو اس کی خاص صورت وشکل عنایت فرمائی پھر راہ سجھا دی۔'' سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ نے آسمان اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال قبل تمام مخلوق کی تقدیروں کا اندازہ کیا ہے۔ اس کا عرش پانی پر تھا۔[4] (رواہ مسلم)

''مرعیٰ'' سے مراد تمام قسم کی نباتات اور کھیتوں کی پیداوار ہیں، ان کو پیدا کر کے پھر انھیں کوڑا متغیر صورت کر ڈالا۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ کا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض اہل علم نے، جو عرب کے کلام کو سمجھتے ہیں، نے کہا ہے کہ یہ مؤخر معنی کے لحاظ سے مقدم ہے، یعنی پہلے چارے کو سبز پیدا کیا جو سیاہی مائل ہے، پھر اس کو کوڑا کر ڈالا، پھر کہا کہ اگرچہ یہ محتمل ہے، لیکن کچھ ٹھیک بات نہیں ہے، اس لیے کہ اہلِ تاویل کے اقوال یعنی اہلِ تفسیر کے خلاف ہے۔[5]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کو نہیں بھولتے:

پھر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ وعدہ کیا کہ ہم تم کو ایسا پڑھائیں گے جو فراموش نہ ہوگا سوائے اس کے کہ جس کو ہم بھلا دینا چاہیں، تم اس کو البتہ بھول جاؤ گے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی شے کو نہ بھولتے مگر جو اللہ چاہتا۔[6] بعض نے کہا ہے کہ عدم فراموشی سے مراد

---

① مسند أحمد (١٥٥/٤) سنن ابن ماجه (٨٦٩) سنن ابن ماجه (٨٨٧) اس کی سند میں ''ایاس بن عامر'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (ضعیف أبي داود: ٣٣٧/١)

② مسند أحمد (٢٣٢/١) سنن أبي داود (٨٨٣) ③ تفسیر ابن کثیر (٨/ ٣٧٩)

④ صحیح مسلم (٢٦٥٣) ⑤ تفسیر الطبري (٣٧٠/٢٤) ⑥ تفسیر الطبري (٣٧١/٢٤)

نسخ ہے کہ اس کے بھولنے میں کچھ الزام نہیں۔

پھر فرمایا کہ بندوں کی کھلی اور چھپی بات سب ہم کو معلوم ہے ہم تجھ پر خیر کے اقوال و افعال کو آسان کر دیں گے اور ایک سہل، سیدھی آسان راہ نکال دیں گے جس میں کچھ کجی و تنگی و خرابی نہ ہوگی، تو سمجھا جہاں سمجھانا نفع دے۔ اس جگہ سے علم کو پھیلانے کا ادب معلوم ہوا کہ علم کو ایسے لوگوں کے سامنے نہ رکھے جو اس کے اہل نہیں۔ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: ”مَا أَنْتَ بِمُحَدِّثٍ قَوْمًا حَدِيثًا لَا تَبْلُغُهُ عُقُولُهُمْ إِلَّا كَانَ فِتْنَةً لِبَعْضِهِمْ“[1] ”یعنی جب تو کسی قوم سے ایسی بات کہے گا جو اُن کی سمجھ سے باہر ہے تو ضرور ان کے بعض لوگ فتنے میں پڑیں گے اور کہا ہے: ”حَدِّثِ النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُونَ أَتُحِبُّونَ أَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ“[2] یعنی تو لوگوں سے ایسی بات کر جو وہ پہچانتے ہیں، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ اور رسول کو جھٹلایا جائے۔

نصیحت کرنے کا حکم اور اسے قبول کرنے والے خوش نصیب لوگ:

پھر فرمایا: جس کو اللہ کا ڈر ہے اور جانتا ہے کہ مجھے اللہ سے ملنا ہے، وہ اس تذکیر سے نصیحت حاصل کرے گا اور جس کو بڑی آگ میں جانا ہے، وہ اس فہمائش اور فہمید سے بچتا ہے، حالانکہ آگ میں جا کر اس کی یہ گت ہوگی کہ نہ مرے گا نہ جیے گا۔ اگر مر جاتا تو راحت پاتا۔ اگر جیتا ہے تو برے حال میں ہے۔ اس جینے سے مرنا ہی اچھا تھا۔ عذابِ الیم اور طرح طرح کی سزاؤں کے سبب سے یہ حیات اس پر وبال ہوگئی ہے۔ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ دوزخ والے جو اہلِ نار ہیں، وہ نہ زندوں میں ہوں گے نہ مروں میں اور وہ لوگ جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ رحمت کا ارادہ کرے گا ان کو آگ میں مار رکھے گا۔ ان پر شفعاء داخل ہوں گے۔ ایک آدمی (شفاعت کرنے والا) ایک جماعت کو لے گا، وہ نہرِ حیات میں یا حیا میں یا حیوان میں یا نہرِ جنت میں ایسے اُگیں گے جیسے دانہ پانی کی راہ گزر میں اُگتا ہے۔

پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم نے درخت کو نہیں دیکھا کہ سبز ہوتا ہے، پھر زرد ہوتا ہے، پھر ہرا ہو جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنگل میں رہے تھے۔[3] (رواہ أحمد) سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اہلِ نار نہ مریں گے نہ جئیں گے، لیکن کچھ لوگوں کو ان کے گناہوں کے سبب سے آگ لگے گی، یا یوں فرمایا کہ ان کی خطاؤں کے سبب سے آگ پہنچے گی اور ان کو مردہ کر دے گی، جب وہ کوئلہ ہو جائیں گے تب شفاعت کا اذن ہوگا ان کو جماعت جماعت کر کے لائیں گے اور جنت کی نہروں میں بکھیر دیں گے اور یہ بات

---

[1] صحیح مسلم (۱/۱۰) صحیح مسلم میں یہ الفاظ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، البتہ تفسیر ابن کثیر (۴/۶۴۵) میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ہی نقل ہے۔

[2] صحیح البخاري (۱۲۸)۔ [3] مسند أحمد (۳/۵)

کہی جائے گی کہ اے اہلِ جنت! ان پر پانی بہاؤ، وہ اس دانہ کی طرح اُگیں گے جو سیلاب کے راستے میں ہوتا ہے۔ ایک شخص نے اس وقت کہا کہ گویا نبی اکرم ﷺ بادیہ (جنگل، صحرا) میں تھے۔[1] (رواه أحمد و مسلم مثله)

ان کی تیسری روایت یہ ہے کہ دوزخ والے وہ ہیں جن کا نکالنا اللہ نہیں چاہتا، وہ آگ میں نہ مریں گے نہ جئیں گے۔ اور جن کا نکالنا اللہ کو منظور ہے ان کو مردہ کر دے گا، یہاں تک کہ وہ کوئلہ ہو جائیں گے، پھر جھنڈ کے جھنڈ باہر نکلیں گے اور جنت کی نہروں پر ڈال دیے جائیں گے، ان پر جنت کی نہروں کا پانی چھڑکا جائے گا، تب وہ اس طرح اُگیں گے جس طرح کہ دانہ سیلاب کے راستے میں اُگتا ہے۔[2] (رواه أحمد)۔ اللہ نے اہلِ نار کے حال کی خبر دی ہے: ﴿ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٧٧] ''اور پکار پکار کر کہیں گے کہ اے مالک! تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے، وہ کہے گا کہ تمھیں تو (ہمیشہ) رہنا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ ﴾ [الفاطر: ٣٦] ''نہ تو ان کی قضا ہی آئے گی کہ مر ہی جائیں اور نہ دوزخ کا عذاب ہی ان سے ہلکا کیا جائے گا۔'' اس بارے میں اور بہت سی آیتیں آئی ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اپنے رب کی ہر اس چیز سے پاکی بیان کر جو ذات، صفات، اسماء، افعال اور احکام میں اس کے لائق نہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی بڑائی بیان کر۔[3] صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت نے کہا ہے: یعنی ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَی'' کہہ اور جو صفت ملحدین نے بیان کی ہے، اس سے اللہ کی تنزیہ (پاکی) بیان کر۔ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ایک دن نماز میں ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ﴾ پڑھ کر ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَی'' کہا۔ کسی نے کہا: تم قرآن میں زیادہ کرتے ہو۔ انھوں نے جواب دیا کہ زیادتی نہیں کی، بلکہ جس بات کا ہم کو حکم ہے، ہم نے وہ کیا۔ اسی طرح سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے جمعہ میں یہ سورت پڑھی اور کہا: ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَی''۔[4] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت بھی اسی طور پر تھی۔[5] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جب اس آیت کو پڑھتے تو ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَی'' کہتے۔

سیدنا عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما بھی یہی کرتے، یعنی نماز کے اندر ہی ایسا کرتے۔[6] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدمی کی پیدائش کو برابر کیا،[7] یعنی سیدھا قد خوبصورت بنایا، جسم بنا کر فہم عطا کیا، یا جسم کو تکلیف و قیام کے لیے تیار کیا، تاکہ عبادات کو ادا کر سکے۔ یا باپ کی پشت میں تیار کیا اور ماں کے رحم میں برابر بنایا، ہر شے کی پیدائش کو ایک

---

1. صحيح مسلم (١٨٥) مسند أحمد (١١/٣) 2. مسند أحمد (٢٠/٣) 3. فتح القدير (٥٦٤/٥)
4. مصنف ابن أبي شيبة (٢٤٧/٢) الدر المنثور (٤٨٢/٨) 5. تفسير الطبري (٣٦٧/٢٤)
6. مصنف ابن أبي شيبة (٢٤٨) الدر المنثور (٤٨٢/٨) 7. معاني القرآن (٣١٥/٥)

دوسرے سے ملا ہوا احکام اور اتساق کے ساتھ غیر متفاوت رکھا، یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اس خلق کا وجود میں آنا عالم، حکیم، قادر اور علیم ذات سے ہوا ہے، یا اس میں منفعت و مصلحت کو رکھا ہے، یا ہر جاندار کے لیے ہاتھ پاؤں آنکھیں بنائیں، پھر اندازہ مقرر کر کے اسے ہدایت کی۔ مفسرین نے کہا ہے کہ چوپایوں میں نر اور مادہ پیدا کیے، نر کو مادہ کے پاس آنے کا طریقہ بتایا۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انسان کو خیر وشر و سعادت و شقاوت کا راستہ بتایا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ سعادت و شقاوت کو مقدر اور رشد و ضلالت کی راہ دکھائی۔ چوپایوں کو چراگاہ کی سمجھ دی۔[1] یا رزق اور روزیوں کو مقدر کیا۔ معایش کا راستہ سمجھایا۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر دابہ (جانور) کو اس کی مصلحت بتائی، یا اشیاء میں منافع پیدا کیے اور انسان کو ان کے استخراج (نکالنے) کا طریقہ سکھایا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رحم میں جنین کی مدت نو ماہ یا کم یا زیادہ رکھی، پھر رحم سے نکلنے کی راہ بتائی۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں بہت سے اقوال ہیں۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس کا کسی خاص کام پر تعین نہ کیا جائے۔ فرداً یا فرداً لیکن جبکہ کوئی دلیل دلالت کرے تو تعین ہو سکتی ہے اور اگر دلیل نہیں ہے تو جس پر یہ دونوں فعل صادق آئیں بدلاً یا شمولاً اسی پر محمول کرنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اجناس، انواع، صفات، افعال، اقوال اور اشیاء کی اجلوں کو مقرر کیا، پھر ہر ایک کو اس چیز کی طرف الہام کیا اور راہ بتائی جو اس سے صادر ہوتی ہے اور اس کے لائق ہے اور اس کے لیے سہل اور آسان ہے۔[2]

پھر انسان کے ذکر کے بعد اس چیز کا ذکر فرمایا جو حیوان کے ساتھ خاص ہے، یعنی مرعیٰ۔ اس سے مراد حیوانات کا چارہ ہے، جیسے: سبز گھاس۔ پھر اس چارے کو سبز ہونے کے بعد خشک کر ڈالا اور وہ کوڑے کی طرح ہو گیا، جیسے: ندی نالے اور دریا کا جھاگ۔ ساگ اور گھاس سوکھ کر سیاہ پڑ جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ سبزہ مائل بہ سیاہی ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک مثال ہے جو اللہ نے دنیا کی تازگی کے بعد دنیا کے ختم ہو جانے کی کفار کے لیے بیان کی ہے۔[3]

پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم وحی کو تمھیں پڑھا دیں گے تم اس کو نہ بھولو گے۔ یہ قرآن کو حفظ کرا دینے کا وعدہ ہے اور ہدایتِ عامہ کے بعد ایک ہدایتِ خاصہ کا بیان ہے۔ امام مجاہد اور کلبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ جبریل علیہ السلام جب وحی لاتے تو وہ ابھی آخری آیت تک نہ پہنچتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلی آیت کو پڑھنے لگے، اس ڈر سے کہ کہیں بھول نہ جائیں۔ جب یہ آیت اتری تو اس کے بعد کبھی نہیں بھولے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھولنے کے ڈر سے قرآن کا استذکار کرتے (بار بار تیز تیز دھراتے)۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہم تم کو کفایت کریں گے

---

[1] تفسير البغوي (٨/٤٠٠) [2] تفسير القرطبي (٢٠/١٥)
[3] تفسير القرطبي (٢٠/١٨) [4] تفسير القرطبى (٢٠/١٨)

اور یہ آیت اتری۔ اسی طرح سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کہا ہے۔[1] یہ آیت دو طرح سے معجزہ ہے: ایک یہ کہ نبی کریم ﷺ امی تھے، ان کا اس مطول کتاب کو بغیر کسی کے پڑھائے اور بغیر اس کے دہرانے کے یاد کر لینا ایک خارقِ عادت (عام عادت کو توڑنے والا) امر تھا تو یہ معجزہ ٹھہرا۔ دوسرے یہ کہ یہ سورت سب سے پہلے مکہ میں اتری تھی، اس میں ایک عجیب خلافِ عادت امر کی خبر دی ہے جو آیندہ زمانے میں پیش آنے والا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا تو یہ معجزہ ٹھہرا۔

پھر استثناء کیا کہ جس چیز کو اللہ بھلا دینا چاہے گا اس کو تم بھول جاؤ گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''إِلَّا مَا شِئْتُ فَأُنْسِيكَ''[2] ''مگر میں چاہوں گا اس کو بھلا دوں گا۔'' مگر امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہیں چاہا کہ نبی اکرم ﷺ کچھ بھول جائیں۔ یہ استثناء ویسا ہی ہے جیسے اس آیت میں ہے: ﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ﴾[3] [هود: ۱۰۷] ''وہ وہیں ہمیشہ رہنے والے ہیں جب تک آسمان و زمین برقرار ہیں سوائے اس وقت کے جو تمھارا رب چاہے۔'' یا مراد یہ ہے کہ نسیان کلی نہ ہوگا بلکہ اگر بھول جاؤ گے تو پھر یاد آ جائے گا۔ یا مراد نسخ ہے کہ جس چیز کی تلاوت یا حکم منسوخ ہوگا اس کو فراموش کرو گے۔ اللہ ہر ظاہر، باطن، اسرار، اعلان کو جانتا ہے ظاہر اس کا عموم ہے۔ ''یُسریٰ'' سے مراد عملِ جنت ہے، یا سب سے آسان اور سہل طریقے کی، یا شریعتِ حنیفیہ سمحہ سہلہ بیضاء کی، جس کی رات مثل دن کے ہے، توفیق ہے یا وحی کی حفاظت ہے، زیادہ بہتر یہ ہے کہ آیت کو عموم پر محمول کریں۔ مراد وہ طریقہ ہے جو دین و دنیا کے ہر معاملے میں آسان ہے، اس لیے ﴿ نُيَسِّرُكَ ﴾ کہا نہ کہ ''نُيَسِّرُ لَكَ'' تاکہ یہ ظاہر ہو کہ ہم تم کو اس کام کی توفیق دیں گے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''یُسریٰ'' خیر ہے اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جنت ہے۔[4] تم اے پیغمبر! لوگوں کو وعظ کرو، وحی پہنچاؤ، راہِ خیر پر لگاؤ، دین کا راستہ سجھاؤ۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مومنین کے لیے تذکرہ ہے اور کافر پر حجت ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خواہ یہ وعظ نفع کرے یا نہ کرے اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ تبلیغ و احذار و انذار (اللہ کی شریعت پہنچانے اور اس کی مخالفت کے وبال سے ڈرانے) کے لیے مبعوث ہوئے ہیں، ان پر وعظ و تذکیر کرنا ہر حال میں واجب ہے، خواہ اس کا فائدہ ہو یا نہ ہو۔[5] بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک خاص قوم کے ساتھ مخصوص ہے، پھر جس کسی کو اللہ کا ڈر ہے وہ اس وعظ سے نصیحت پذیر ہوگا اور جس کو بڑی آگ کے عذاب میں جانا ہے، وہ اس نصیحت سے بھاگے گا۔ جس نے کہا ہے کہ مراد نارِ جہنم ہے، کیوں کہ دنیا کی آگ صغریٰ ہے اور وہ کبریٰ ہے۔ یا مراد وہ آگ ہے جو جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوگی، اس میں نہ موت

---

[1] الدر المنثور (۴۸۳/۸)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (۳۴۱۶/۱۰)
[3] تفسير القرطبي (۱۸/۲۰)
[4] تفسير القرطبى (۱۹/۲۰)
[5] فتح القدير (۵۶۶/۵)

آئے گی کہ عذاب سے چین ملے نہ ایسی حیات ہو گی کہ اس سے کچھ نفع حاصل ہو۔ حرف ﴿ ثُمَّ ﴾ تراخی (دیر کرنے) کے لیے ہے مراتبِ شدت میں، کیوں کہ موت وحیات کے درمیان کشمکش صرف آگ میں جانے سے زیادہ سخت اور برا ہے۔[1]

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿١٤﴾ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴿١٥﴾ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿١٦﴾ وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿١٧﴾ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿١٨﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى ﴿١٩﴾

یقیناً فلاح پا گیا، جو پاک ہوا ⑭ اور اپنے رب کا نام یاد کیا، پھر نماز پڑھی ⑮ بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو ⑯ حالاں کہ آخرت بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے ⑰ بے شک یہ (بات) پہلے صحیفوں میں بھی (کہی گئی) تھی ⑱ (یعنی) ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں ⑲

کامیاب لوگوں کا تذکرہ:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ تَزَكّٰى ﴾ سے مراد طہارتِ نفس ہے اخلاقِ رذیلہ سے اور اتباعِ وحی ہے۔ اور نماز سے مراد اس کا اوقاتِ معینہ میں ادا کرنا ہے، اللہ کی رضا کی جستجو میں اور اللہ کے حکم کا بجا لانا اور اللہ کی شرع کی فرمانبرداری کرنا ہے۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں، اس آیت کی تفسیر رفعاً یوں آئی ہے، یعنی جس نے گواہی دی اس بات کی کہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" اور انداد کو ترک کر دیا اور اس بات کی گواہی دی کہ میں اللہ کا رسول ہوں پھر پنج گانہ نماز پڑھی اور اُن کی محافظت رکھی اور ان کا اہتمام کیا۔[2] (رواہ البزار)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے کہ اس سے پنج گانہ نماز مراد ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تَزَكّٰى ﴾ سے مراد صدقۂ فطر ہے۔ پھر کہا کہ اہلِ مدینہ اس سے اور پانی پلانے سے بہتر کسی صدقے کو نہیں جانتے تھے۔ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ لوگوں کو صدقۂ فطر ادا کرنے کا حکم کرتے تو یہ آیت پڑھتے۔ امام ابو الاحوص رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم میں سے کسی کے پاس جب کوئی سائل آئے اور وہ نماز پڑھنے کا ارادہ کرتا ہو تو پہلے زکات دے، پھر نماز کے لیے کھڑا ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ﴿١٤﴾ وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴾۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مال کی زکات دے، خالق کو راضی کرے۔[3]

---

① فتح البیان (۱۵/۱۸۵۔۱۹۲)

② کشف الأستار (عن زوائد البزار (۳/۸۰) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه البزار عن شيخه عباد بن أحمد العرزمي وهو متروك" (مجمع الزوائد: ۷/۲۸۹)

③ تفسير الطبري (۲۴/۳۷۵، ۳۷۴) تفسير ابن كثير (۴/۶۴۶)

آخرت بہتر اور پائیدار اور دنیا فانی ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم دنیا کو امرِ آخرت پر مقدم کرتے ہو اور اختیار کرتے ہو اور اسی میں اپنا نفع اور بہتری اور معاش سمجھتے ہو، حالاں کہ آخرت یعنی اللہ کا ثواب دارِ آخرت میں بہتر اور پائندہ تر، یعنی زیادہ پائیدار ہے اس دارِ فانی سے، کیوں کہ آخرت شریف اور باقی رہنے والی ہے۔ پھر عقلمند آدمی ایک فانی چیز کو باقی چیز پر کیسے اختیار کرے گا اور اس چیز کے اہتمام میں لگے گا جو عن قریب زوال پذیر ہے اور دارِ بقا اور ہمیشہ والے گھر کا اہتمام چھوڑ دے گا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کے لیے گھر نہیں ہے اور اس شخص کا مال ہے جس کے لیے مال نہیں ہے۔ اس گھر کے لیے وہی جمع کرتا ہے جس کو عقل نہیں ہے۔[1] (رواه أحمد) امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو پڑھ کر کہا کہ ہم نے دنیا کو آخرت پر اختیار کیا ہے، لوگ چپ رہے۔ کہا: ہم نے اس لیے اس کو اختیار کیا۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کا یہ کہنا بطور تواضع اور ہضمِ نفس (کسرِ نفسی) تھا، یا اس قسم کے نفس سے متعلق تھا جو ایسا کرتا ہے۔[3] سیدنا ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: جس نے دوست رکھا اپنی دنیا کو، اس نے اپنی آخرت کو نقصان پہنچایا اور جس نے اپنی آخرت کو دوست رکھا، اس نے اپنی دنیا کو نقصان پہنچایا، پس تم باقی رہنے والی چیز کو فانی پر اختیار کرو۔[4] (تفرد به أحمد)

ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفے:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ إِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولٰى ﴾ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «كَانَ كُلُّ هٰذَا وَكَانَ فِي صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى»[5] (رواه البزار) ان کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب سورت ﴿ سَبِّحِ ﴾ اتری۔ فرمایا: «كُلُّهَا فِي صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى» اور جب یہ آیت اتری: ﴿ وَإِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى ﴾ [النجم: ٣٧] ''اور ابراہیم علیہ السلام اور وفادار کے صحیفوں میں تھا۔'' تو فرمایا: ''وَفّٰى أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى'' یعنی یہ آیت سورۃ النجم کی ان آیات کی طرح ہے: ﴿ أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿٣٦﴾ وَإِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى ﴿٣٧﴾ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى ﴿٣٨﴾ وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى ﴿٣٩﴾

---

① مسند أحمد (٧١/٦) شعب الإيمان (٣٧٥/٧) اس کی سند میں ''روید بن نافع'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٩٣٣)

② تفسير الطبري (٣٧٥/٢٤) ③ تفسير ابن كثير (٦٤٦/٤)

④ مسند أحمد (٤١٢/٤) اس کی سند میں انقطاع ہے ''مطلب بن عبداللہ'' کا سماع سیدنا ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٥٣٤٠)

⑤ كشف الأستار عن زوائد البزار (٨٠/٣) اس کی سند میں ''عطاء بن سائب'' ضعیف راوی ہے۔

﴿وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝۴۰ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۝۴۱ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى﴾ [النجم: ٣٦- ٤٢] ”کیا اسے اس چیز کی خبر نہیں دی گئی جو موسیٰ (علیہ السلام) کے اور وفادار ابراہیم (علیہ السلام) کے صحیفوں میں تھا کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور یہ کہ ہر انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی کوشش خود اس نے کی، اور یہ کہ بے شک اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔ پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور یہ کہ آپ کے رب ہی کی طرف پہنچنا ہے۔“ (رواه النسائي)[1]

یہی قول امام عکرمہ رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اس سورت کا قصہ اگلے صحیفوں میں ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار یہ ہے کہ ﴿اِنَّ هٰذَا﴾ ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى﴾ کی طرف اشارہ ہے۔ پھر کہا: اس کلام کا یہ مضمون صحفِ ابراہیم اور موسیٰ میں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات جس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا حسن قوی ہے۔ امام قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ واللّٰہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ مراد ﴿تَزَكّٰى﴾ سے شرک سے پاکی ہے۔ یعنی صرف اللہ پر ایمان لایا، شرائعِ حق پر عمل کیا۔ عطاء اور ربیع رحمہما اللہ نے کہا: مراد وہ شخص ہے جس کا عمل پاک ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ﴿تَزَكّٰى﴾ سے مراد عملِ صالح ہے۔ ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا صدقۂ فطر ہے۔[2] بعض نے کہا مراد جملہ اموال کی زکاۃ ہے۔ کسی نے کہا مراد اعمال کی زکاۃ ہے اموال کی زکاۃ نہیں ہے، کیوں کہ اکثر مال میں لفظ ”زکی“ کہتے ہیں ”تزکی“ نہیں، عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عید سے پہلے زکاۃِ فطر کا حکم دیتے اور یہ آیت پڑھتے۔[3] (رواه البزار وغيره) لیکن یہ سورت مکہ میں اتری ہے، وہاں زکاۃِ فطر اور نمازِ عید نہ تھی۔ مراد ذکر اسم رب سے تکبیرِ افتتاح ہے، یعنی اللہ اکبر کہنا یا طریقِ مصلی میں ذکر اسم رب کے کرنا۔ پھر فرمایا تم یہ کام نہیں کرتے ہو بلکہ دنیا کی فانی اور عاجلہ لذات کو آخرت باقی رہنے والی لذات پر اختیار کرتے ہو۔ مراد آیت سے کفار ہیں کہ اختیار کرنا محبتِ دنیا کا اور اس کے ساتھ راضی ہونا اور اس پر مطمئن ہونا اور آخرت سے بالکل اعراض کرنا انہی کا شیوہ ہے۔ یا سب لوگ مراد ہیں کیا کافر اور کیا مومن۔ اور ایثار سے مراد زیادہ عام ہے اس لیے کہ غالب لوگ ایثار ایک جانبِ دنیا سے جانبِ آخرت پر خالی نہیں ہوتی، کچھ نہ کچھ اہتمام دنیا کے فائدے حاصل کرنے کا رکھتے ہیں جو طاعات سے زیادہ اہتمام ہوتا ہے حالاں کہ دارِ آخرت، یعنی دوبارہ اٹھائے جانا دنیا سے افضل اور ادوم ہے، کیوں کہ جسمانی اور روحانی سعادت پر مشتمل ہے اور دنیا اس طرح پر نہیں ہے، کیوں کہ دنیا کی لذت مخلوط بآلام ہیں، بہ خلاف آخرت کے کہ وہاں کوئی الم (درد) نہ ہوگا۔ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی ہے اور باقی چیز فانی سے بہتر ہوتی ہے۔ مالک بن دینار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر دنیا زرِ خالص ہوتی اور فنا

---

[1] سنن النسائي الكبرى (٦/٥١٣) [2] تفسير القرطبي (٢٠/٢١)

[3] مسند البزار (٨/٣١٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”فيه كثير بن عبدالله وهو ضعيف“ (مجمع الزوائد: ٣/٢٢٩)

ہوتی اور آخرت ایک ٹھیکرا ہوتی اور باقی رہتی تو واجب یہ تھا کہ اس خزف (ٹھیکری) باقی کو اس فانی سونے پر اختیار کیا جاتا، حالاں کہ آخرت ذہب باقی اور دنیا سفالِ فانی ہے۔[1] یہ ذکر فلاح زکات کا تا آخر صحفِ اولیٰ میں ثابت ہے۔
نسفی رحمہ اللہ نے کہا: یہ دلیل ہے اس بات کی کہ نماز میں قرآن مجید فارسی میں پڑھنا جائز ہے۔ اس لیے کہ یہ مضمون ان صحف میں مذکور ہے، حالاں کہ یہ نظم اس زبان میں نہ تھی۔[2] انتھیٰ۔ میں کہتا ہوں گویا یہ نظم بعینہ ان صحف میں موجود نہ ہو، لیکن جب قرآن مجید میں قرآن مجید کی لغت میں منقول ہو کر آئے تو اب اس کی قراءت اسی لغتِ قرآن میں چاہیے نہ کہ کسی اور زبان میں۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا وصف عربیت کے ساتھ کیا ہے۔

تو اس بنا پر بھی یہ استدلال صحیح نہیں ٹھہرا۔ خطیب نے کہا: اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ نہیں کیا کہ بعینہ یہ الفاظ ان صحف میں تھے، بلکہ اس کلام کے معنی تھے۔ اس کے ساتھ اب یہ نسفی رحمہ اللہ کا استدلال یوں بھی بعید عن الصواب ہے کہ غرض تو اس استدلال سے اپنے امام کے قول کی مدد کرنا ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اس قول سے رجوع کیا ہے اور یہی حنفیہ کے نزدیک معتمد ہے اور اسی پر ان کا فتویٰ ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کتبِ الٰہیہ متتابع ہیں اس بات پر کہ دنیا سے آخرت بہتر اور پائندہ تر ہے۔[3] واللّٰہ أعلم۔

---

(1) تفسير القرطبي (٢٠/٢٤) (2) تفسير النسفي (٣٣٣/٤) (3) تفسير الطبري (٣٧٦/٢٤) فتح البيان (١٩٢/١٥-١٩٥)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

سُوْرَةُ الْغَاشِيَة

اس سورت کی چھبیس (۲۶) آیتیں ہیں۔ یہ بلا اختلاف مکہ میں اتری ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم اسی کے قائل ہیں۔[1]

نمازِ جمعہ وعیدین میں سورۃ الاعلیٰ و غاشیہ کی قراءت:

نبی اکرم ﷺ اس سورت کو اور ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ ﴾ کو عیدین اور جمعہ میں پڑھتے تھے۔ امام ضحاک بن قیس نے نعمان بن بشیر سے پوچھا کہ نبی مکرم ﷺ جمعہ میں سورۃ الجمعہ کے ساتھ کون سی سورت پڑھا کرتے تھے؟ کہا: ﴿ هَلْ أَتٰكَ حَدِيْثُ الْغٰشِيَةِ ﴾[2] (رواه النسائي ومسلم وابن ماجه) معلوم ہوا کہ سورت کی کسی نمازِ معین کے لیے تعیین درست ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ۝۱ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ خَاشِعَةٌ ۝۲ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝۳ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝۴ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝۵ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ۝۶ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ۝۷

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

کیا آپ کو چھا جانے والی (قیامت) کی خبر پہنچی ہے؟ ① اس دن کئی چہرے ذلیل ہوں گے ② سخت محنت کرنے والے تھکے ماندے ہوں گے ③ دہکتی آگ میں داخل ہوں گے ④ انھیں گرم کھولتے چشمے کا پانی پلایا جائے گا ⑤ ان کا طعام صرف خاردار جھاڑیاں ہو گا ⑥ جو نہ موٹا کرے گا نہ بھوک مٹائے گا ⑦

---

[1] الدر المنثور (۴۹۰/۸) [2] صحيح مسلم (۸۷۸) سنن النسائي (۱۴۲۳) سنن ابن ماجه (۱۱۱۹)

قیامت اور اہلِ نار کے حالات:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ غاشیہ قیامت کے دن کا نام ہے۔ یہی قول امام قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ کا بھی ہے، کیوں کہ وہ دن سب کو ڈھانپ لے گا عام ہو گا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس دن چہرے خاشع ہوں گے، یعنی ذلیل ہوں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان کو ان کا عمل کچھ نفع نہ دے گا، وہ عمل کر کے تھکیں ہوں گے، وہ تو آگ گرم میں جائیں گے۔[1] عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا گزر ایک راہب پر ہوا اس کو پکارا، وہ آیا اس کی طرف دیکھ کر رونے لگے۔ اس نے کہا: اے امیر المومنین! کیوں روتے ہو؟ کہا مجھ کو قرآن کی یہ آیت یاد آئی ﴿ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ﴾۔ اس آیت نے مجھ کو رلایا۔[2]

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد نصاریٰ ہیں۔[3] امام عکرمہ اور سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ دنیا میں معاصی کے ساتھ عامل ہیں۔ آگ میں عذاب اور اغلال کے ساتھ ناصب ہوں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام حسن، اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد دہکتی ہوئی نہایت گرم آگ ہو گی۔ چشمہ انتہا درجے کا گرم اور کھولتا ہو گا۔ امام حسن، سدی، مجاہد رحمہم اللہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اسی کے قائل ہیں۔ ﴿ ضَرِيعٍ ﴾ آگ میں ایک درخت ہے۔ (قاله سیدنا عبدالله بن عباس رضی اللہ عنہما) امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زقوم ہے اور وہ ایک پتھر کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، ابن الجوزاء اور قتادہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ شبرق (تھوہر) ہے، قریش اس کو موسمِ ربیع میں شبرق اور موسم صیف میں ضریع کہتے ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک خار دار جھاڑ ہے جو زمین سے لگا ہوا ہے۔[4] صحیح بخاری میں امام مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ﴿ ضَرِيعٍ ﴾ ایک روئیدگی ہے جس کو شبرق کہتے ہیں اور اہلِ حجاز ضریع کہتے ہیں۔ وہ سوکھ کر سم (زہریلا) ہو جاتا ہے۔[5] شبرقِ خشک کو ضریع کہتے ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ایسا کھانا ہے جو ناپاک ہے، اشبع اور شر ہے،[6] اس طعام سے نہ کوئی مقصود حاصل ہو گا اور نہ ہی کوئی ایسی چیز دور ہو گی جس سے ڈر ہوتا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ اس جگہ ﴿ هَلْ ﴾ کا حرف "قد" کے معنی میں ہے۔ قطرب رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ ﴿ حَدِيْثُ الْغٰشِيَةِ ﴾ سے مراد قیامت ہے، کیوں کہ اس کی ہولناکیاں سب کو ڈھانپ لیں گی۔ اکثر مفسرین نے یہی کہا ہے۔ امام محمد بن کعب اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ

---

[1] تفسیر الطبري (٢٤/٣٨١، ٣٨٢) تفسیر ابن کثیر (٤/٦٤٨) [2] مستدرك الحاكم (٢/٥٦٧)
[3] صحیح البخاري (٤/١٨٨٦) [4] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٢٠، ٣٤٢١) تفسیر ابن کثیر (٤/٦٤٨)
[5] صحیح البخاري (٤/١٨٨٦) [6] تفسیر الطبري (٢٤/٣٨٤)

آگ کافروں کے چہروں کو ڈھانپ لے گی،[1] جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴾ [إبراهيم: ٥٠] ''اور آگ ان کے چہروں پر بھی چڑھی ہوگی۔'' بعض نے کہا ہے کہ غاشیہ سے مراد اہلِ نار ہیں، اس لیے کہ وہ اس میں گھسیں گے لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ غاشیہ سے مراد ساعت ہے۔ مصباح میں کہا ہے کہ ''غشاء'' بہ معنی ''غطاء'' ہے یا ''غشیٰ'' سے مراد اغماء ہے۔ باطنِ دماغ جب بلغم بارد اور غلیظ سے پر ہو جاتا ہے تو بے ہوشی گھیر لیتی ہے اور غشی سے حرکت کرنے والے قویٰ اور حساس آنتیں شدتِ تکلیف یا سردی یا بھوک کی سختی سے دل کمزور ہونے کے سبب سے بے کار ہو جاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اغماء سہو (بھول) ہے جو اعضاء کے فتور سے انسان کو لاحق ہوتا ہے کسی علت کے سبب سے۔[2] اس جگہ وجوہ سے مراد اصحابِ وجوہ ہیں۔ انسان میں سب اعضاء سے زیادہ شرف والا یہی چہرہ ہوتا ہے، اس پر سب سے پہلے ذلت ظاہر ہوتی ہے۔ ان سے مراد کفار ہیں جو اللہ کی عبادت سے تکبر کرتے تھے۔ امام قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ آگ میں خوار ہوں گے۔[3] بعض نے کہا ہے کہ مراد یہود و نصاریٰ کے وجوہ ہیں علی الخصوص، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔

﴿ عَامِلَةٌ ﴾ سے مراد عملِ شاق ہے، یہ عمل اس دن زنجیروں اور طوقوں کا کھینچنا اور آگ میں گھسنا اور اس کے ٹیلوں پر چڑھنا اور اترنا ہوگا۔ اس میں اِن کو سخت تھکاوٹ لاحق ہوگی یا مراد دنیا کا عمل ہے کہ دنیا میں کفر و معاصی بجا لانے میں بڑی مشقت کرتے تھے، اب آخرت میں اس کو بھگتیں گے لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دنیا میں اللہ کی اطاعت سے تکبر کیا تھا، اب آگ میں بھاری زنجیروں کو کھینچیں گے اور طوق اٹھائیں گے۔ عرصاتِ قیامت میں ننگے بدن کھڑے ہوں گے، وہ دن پچاس ہزار برس کا ہوگا۔

امام حسن اور سعید بن جبیر رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ دنیا میں اللہ کے لیے کوئی عمل نہیں کیا اور نہ محنت اٹھائی، اب اس کے عوض جہنم میں محنت اٹھائیں گے اور تکلیف دہ عمل کریں گے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منہ کے بل کھینچ کر جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ ایک لوہے کا پہاڑ ہوگا بیڑیاں اور طوق پہنے ہوئے اس پر چڑھنے کا حکم ہوگا اس پر بڑی مشقت اور محنت سے چڑھنا ہوگا۔ آگ میں اس طرح پھنس جائیں گے جس طرح اونٹ دلدل میں پھنس جاتا ہے،[4] وہ آگ تنور کی طرح دہکتی ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ حدیث میں فرمایا ہے کہ ہزار برس اس کو دھکایا تب وہ لال ہوئی، پھر ہزار برس جلایا تو سفید ہوئی، پھر ہزار برس سلگایا تو سیاہ ہوئی، اب یہ کالی بہری ہے۔[5]

---

① تفسير القرطبي (٢٥/٢٠) ② المصباح المنير (٢٣٢/١)

③ تفسير الطبري (٣٨٢/٢٤) تفسير القرطبي (٢٦/٢٠) ④ تفسير القرطبي (٢٧/٢٠)

⑤ سنن الترمذي (٢٥٩١) سنن ابن ماجه (٤٣٢٠) اس کی سند میں ''شریک بن عبداللہ'' ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٣٠٥)

﴿ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ﴾ سے مراد شدتِ حرارت سے ابلتا ہوا چشمہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ اٰنٍ ﴾ [الرحمٰن: ٤٤] ''اس کے اور کھولتے گرم پانی کے درمیان چکر کھائیں گے۔'' مفسرین کہتے ہیں کہ اگر اس چشمے کا ایک قطرہ دنیا کے پہاڑوں پر گرے تو وہ گل جائیں۔ ضریع خار دار درخت کی ایک قسم ہے جس کو کوئی جاندار نہیں چرتا، یا وہ کچرا کوڑا ہے جو نالے ندی میں بہہ کر آتا ہے جو نہ چوپایوں کی خوراک ہوتی ہے نہ انسانوں کی۔ اونٹ جب اس کو کھاتا ہے تو اس کا پیٹ نہیں بھرتا اور وہ سخت لاغر ہو جاتا ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ ضریع ایک بدبو دار چارہ ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عذابِ مخفی ہے۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک کھانا ہے جس کو کھا کر اللہ کی طرف تضرع کریں گے اور رہائی چاہیں گے اس کی کراہت اور خشونت (سختی، کھردرے پن) کے سبب سے۔[1] یا جہنم میں ایک وادی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴾ [الحاقة: ٣٦] ''اور نہ سوائے پیپ کے اس کی کوئی غذا ہے۔''

ان آیات کے درمیان جمع اس طرح سے ہے کہ نار میں طبقات ہیں اور الوانِ عذاب کے طبقات ہیں۔ کسی جگہ کا طعام ضریع ہوگا اور کسی جگہ کا غسلین اور کسی جگہ کا زقوم۔ اللہ نے ضریع کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ نہ تو موٹا کرے اور نہ بھوک کو دور کرے۔ امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ نار کی بھوک پیاس کچھ دنیا جیسی نہ ہوگی کہ بھوک میں جو ملا، وہ ہی مزے دار معلوم ہوتا ہے، بلکہ آگ کے بھڑکنے کے وقت انتڑیوں میں ایک اضطرار ہوگا کہ کوئی کثیف (غلیظ، موٹی) چیز ہی مل جائے جس سے پیٹ بھرے، وہ بھوک کے تسلط کی وجہ سے ضریع کھائیں گے اور گرم پانی پئیں گے جس سے منہ کا چمڑا نکل آئے گا اور آنتیں کٹ کر گریں گی۔[2]

وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاعِمَةٌ ﴿٨﴾ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ﴿٩﴾ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ﴿١٠﴾ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ﴿١١﴾ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ﴿١٢﴾ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ﴿١٣﴾ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ﴿١٤﴾ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ﴿١٥﴾ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ﴿١٦﴾

اس دن کئی چہرے تروتازہ ہوں گے ⑧ اپنی کوشش پر خوش ہوں گے ⑨ بہشتِ بریں میں ہوں گے ⑩ وہ اس میں کوئی لغو بات نہ سنیں گے ⑪ اس میں ایک چشمہ جاری ہوگا ⑫ اس میں اونچے تخت ہوں گے ⑬ اور جام رکھے ہوں گے ⑭ اور قطاروں میں گاؤ تکیے لگے ہوں گے ⑮ اور عمدہ غالیچے بچھے ہوں گے ⑯

[1] تفسير القرطبي (٣٠/٢٠) [2] تفسير أبي السعود (١٤٩/٩) فتح البيان (١٩٩/١٥-٢٠٤)

قیامت کے دن نیک بختوں کا حال:

اللہ نے اشقیاء (بدبختوں) کے ذکر کے بعد نیک بختوں کا حال بیان کیا اور فرمایا کہ ان کے چہروں پر نعیم پہچانی جائے گی، یہ نعمت ان کو ان کی سعی کے سبب سے ملے گی۔ سفیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنے عمل سے راضی ہوں گے۔ ان کی بہشت اونچی اور خوشنما ہوگی وہ اس کے جھروکوں میں ہوں گے، کوئی لغو کلمہ نہ سنیں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا﴾ [مریم: ٦٢] ”وہ لوگ وہاں کوئی لغو بات نہ سنیں گے صرف سلام ہی سلام سنیں گے۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ﴾ [الطور: ٢٣] ”نہ کوئی بیہودہ گوئی ہوگی نہ گناہ۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ﴿٢٥﴾ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا﴾ [الواقعة: ٢٥-٢٦] ”نہ وہاں بکواس سنیں گے اور نہ گناہ کی بات، صرف سلام ہی سلام کی آواز ہوگی۔“

چشمۂ جاری سے مراد کوئی معین چشمہ نہیں ہے بلکہ جنس مراد ہے، یعنی اس جنت میں جاری چشمے ہوں گے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جنت کی نہریں مشک کے ٹیلوں یا پہاڑوں کے نیچے سے بہتی ہیں،[1] وہاں نرم نرم تخت بچھے ہوں گے۔ بہت سے فرش ہوں گے جن پر حورِ عین جلوہ گر ہوں گی، جب کوئی اللہ کا دوست ان پر بیٹھنا چاہے گا تو وہ تخت اس کے لیے جھک جائیں گے۔ شرابِ طہور سے بھرے ہوئے برتن پینے والے کے انتظار میں رکھے ہوں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿نَمَارِقُ﴾ بہ معنی ”وسائد“ ہے، یعنی گدیلے قطار در قطار مہیا ہوں گے۔ یہی قول امام عکرمہ، قتادہ، ضحاک، سدی اور ثوری رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿زَرَابِيُّ﴾ سے مراد بسط (بچھونے) ہیں۔ امام ضحاک اور کئی ایک اہلِ علم بھی اسی کے قائل ہیں۔[2] ﴿مَبْثُوْثَةٌ﴾ سے یہ مراد ہے کہ جگہ جگہ نہالچوں اور قالینوں کا فرش بچھا ہوگا جس کا جی چاہے ان پر بیٹھ جائے۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «أَلَا هَلْ مُشَمِّرٌ لِلْجَنَّةِ؟ فَإِنَّ الْجَنَّةَ لَا خَطَرَ لَهَا، هِيَ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ نُوْرٌ يَتَلَأْلَأُ، وَرَيْحَانَةٌ تَهْتَزُّ، وَقَصْرٌ مَشِيْدٌ، وَنَهْرٌ مُطَّرِدٌ، وَثَمَرٌ نَضِيْجَةٌ، وَزَوْجَةٌ حَسْنَاءُ جَمِيْلَةٌ، وَحُلَلٌ كَثِيْرَةٌ وَمَقَامٌ فِيْ أَبَدٍ فِيْ دَارٍ سَلِيْمَةٍ وَفَاكِهَةٍ وَخُضْرَةٍ وَحِبْرَةٍ وَنِعْمَةٍ فِيْ مَحِلَّةٍ عَالِيَةٍ بَهِيَّةٍ» قَالُوْا: نَعَمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! نَحْنُ الْمُشَمِّرُوْنَ لَهَا، قَالَ: «قُوْلُوْا إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى»[3] (رواه أبو بكر بن داود و ابن ماجه) یعنی ہے کوئی کمر باندھنے والا، جنت کے لیے تیار ہونے والا، کیوں کہ جنت کے لیے حد نہیں، قسم ہے ربِ کعبہ کی! جنت ایک چمکتا ہوا نور ہے، ایک لہراتا ہوا پھول ہے، ایک گچ کیا ہوا محل ہے، ایک بہتی ہوئی نہر ہے، ایک پکا ہوا پھل ہے اور حسین و جمیل بی بی ہے، بہت سے کپڑے ہیں،

---

[1] صحیح ابن حبان (١٦/٤٢٣) صحیح الترغیب والترہیب (٣/٢٦١)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٢١) تفسیر ابن کثیر (٤/٦٤٩)

[3] سنن ابن ماجه (٤٣٣٢) اس کی سند میں ”ضحاک معافري“ ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٣٣٥٨)

ایک سلامتی کے گھر میں ہیشگی کا رہنا ہے، میوہ ہے، سبزہ ہے، رونق ہے، نعمت ہے، ایک اونچی خوشنما حویلی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ ہم اس کے لیے کمر باندھنے والے ہیں۔ فرمایا: ان شاء اللہ تعالیٰ کہو۔

میں کہتا ہوں کہ نعیمِ جنت کے بیان میں ایک بے مثل ومثال ابن القیم کی تالیف کردہ کتاب "حادي الأرواح إلی بلاد الأفراح" ہے اور اس کا خلاصہ "مثیر ساکن الغرام إلی روضات دار السلام" ملتِ اسلام میں باعتبار احوالِ جنت اور استیعابِ اقسامِ نعمت بے مثل ومثال ہے جس طرح کہ نار اور اہلِ نار کے بیان میں کتاب "یقظه اولی الاعتبار" بے نظیر ہے۔ اللهم إني أعوذبك من النار و أسألك الجنة، یا غفار! ؎

فَحَيَّ عَلَى جَنَّاتِ عَدْنٍ ۔۔۔ فَإِنَّهَا مَنَازِلُكَ الْأُولَى وَفِيهَا الْمُخَيَّمُ
وَلَكِنَّنَا سَبْيُ الْعَدُوِّ فَهَلْ تُرَى ۔۔۔ نَعُودُ إِلَى أَوْطَانِنَا وَنَسْلَمُ

"آؤ ہیشگی والی جنت کی طرف وہی تیری منزلیں ہے اور وہاں موتیوں کے خیمے ہیں، مگر ہم دشمن (شیطان) کے قیدی بن گئے، کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم صحیح سلامت اپنے وطنوں (جنتوں) کی طرف لوٹ پائیں گے۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں بیان کیا ہے کہ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاعِمَةٌ﴾ سے مراد لینِ عیش میں صاحبِ نعمت وبہجت ہیں۔ یہ مومنین کے وجوہ، یعنی چہرے ہوں گے۔ اچھا انجام اور جنت کی نعیم مقیم کو دیکھ کر ان کے چہروں میں ان کی اصلیت سے زیادہ رونق اور تازگی آجائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ﴾ [المطففین: ٢٤] "تو ان کے چہروں سے ہی نعمتوں کی تروتازگی پہچان لے گا۔" وہ اپنے ان خالص اعمالِ صالح سے، جو دنیا میں اللہ کے لیے کیے تھے، نہایت خوش دل اور خوش وقت ہوں گے۔ ان اعمال کا اجرِ جزیل اور ثوابِ جمیل پا کر اُن کی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو چین آئے گا۔ ان کی جنت ایک اونچا یا عالی قدر محل ہوگا، نفس جس کی خواہش کرے گا اور آنکھ اس سے لذت حاصل کرے گی، وہاں نکمی باتیں اور گپ شپ سننے میں نہ آئیں گے۔

لغو کلامِ ساقط کو کہتے ہیں یہی ﴿لَاغِيَةً﴾ ہے، اس سے مراد جھوٹ و بہتان وکفر ہے۔ (قاله قتادہ) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گالی گلوچ ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جھوٹی قسم ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ جنت لغو بات نہ کریں گے ان کا کلام حکمت اور اللہ تعالیٰ کی حمد ہوگا جس اللہ نے ان کو یہ دائمی نعمت عطا کی ہے۔[1] یہی قول تمام اقوال سے زیادہ راجح ہے، کیوں کہ جب نکرہ سیاقِ نفی میں آتا ہے تو عام صیغوں میں سے ہوتا ہے اور اس کو کسی مخصوص نوع کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت نہیں ہے، مگر صرف اس وقت کہ اس کو خاص کرنے کی کوئی صحیح وجہ موجود ہو۔ اگر کوئی وجہ نہ ہو تو پھر خاص نہیں ہو سکتا۔

---

[1] فتح القدیر (٥/٥٧٤)

﴿ لَاغِيَةً ﴾ یا تو صفتِ کلمہ ہے، یا صفتِ جماعت ہے، یا صفتِ نفس۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہاں کسی اذا دینے والی چیز یا باطل کو سنا نہیں جائے گا۔[1] ﴿ عَيْنٌ ﴾ سے مراد جنس ہے نہ کہ کوئی خاص چشمہ، یہ چشمے روئے زمین پر بہتے ہوں گے زمین کی پستی کے بغیر۔ اس میں سے طرح طرح کے لذیذ مشروب بہہ کر نکلیں گے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معلوم نہیں کہ پانی کے ہوں گے یا کسی اور چیز کے۔[2] رہے تخت تو وہ بھی اونچے یا بلند مرتبہ یا شریف الذات ہوں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایک پر ایک ہوگا۔[3]

"کوب" اس آبخورے کو کہتے ہیں جس کی ٹونٹی نہ ہو، وہ اہلِ جنت کے سامنے رکھے ہوں گے، جب چاہیں ان سے نوش کریں، نہ بہت بڑے ہوں گے نہ بہت چھوٹے، بلکہ متوسط ہوں گے۔ وہ نہروں کے کناروں پر رکھے ہوئے ملیں گے۔ وسادہ (تکیے، گدے) کو نمرقہ کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ نَمَارِقُ ﴾ سے مراد مجالس ہیں یا مرافق[4] یا مساند و مطارح، جہاں چاہے وہاں اٹھے بیٹھے اور تکیہ لگا کر جے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بالائے طنافس مصفوف ہوں گے، یعنی جس طرح کسی مکان میں پہلے عام فرش بچھاتے ہیں، پھر اس پر مسندیں گدیلے لگاتے ہیں، تکیے جماتے ہیں، اسی طرح بہشت میں چوڑے چوڑے عمدہ بساط ہوں گے۔

﴿ زَرَابِيُّ ﴾ سے مراد طنافس ہیں۔ طنافس وہ فرش ہیں جن میں باریک جھالریں لگی ہوں۔ قاموس میں کہا ہے ﴿ زَرَابِيُّ ﴾ بہ معنی نمارق و بسط ہے، یا ہر وہ چیز جس کو بچھا کر اس پر تکیہ لگا کر بیٹھیں۔[5] ﴿ مَبْثُوثَةٌ ﴾ سے مراد مبسوط ہے۔[6] (قاله قتادة)۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جائز ہے کہ یہ معنی ہوں کہ وہ مجالس میں جابجا مفرق و مفروش ہیں۔ امام قتیبی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ "بث" سے مراد کثرت ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ بث سے مراد تفریقِ کثرت ہے۔ اسی طرح اللہ کا قول ہے ﴿ وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ ﴾ [البقرة: ١٦٤] قرطبی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ زیادہ صحیح ہے۔[7]

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ
رُفِعَتْ ﴿١٨﴾ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ
سُطِحَتْ ﴿٢٠﴾ فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ﴿٢١﴾ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴿٢٢﴾
إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ ﴿٢٣﴾ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ﴿٢٤﴾
إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ﴿٢٥﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ﴿٢٦﴾

کیا وہ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کیے گئے ہیں؟⑰ اور آسمان کی طرف کہ

---

① تفسير الطبري (٣٨٦/٢٤) ② فتح القدير (٥٧٤/٥) ③ تفسير الطبري (٣٨٧/٢٤)
④ تفسير الطبري (٣٨٧/٢٤) ⑤ القاموس المحيط (١٢٠/١) ⑥ تفسير الطبري (٣٨٨/٢٤)
⑦ تفسير القرطبي (٣٤/٢٠) فتح القدير (٥٧٤/٥) فتح البيان (٢٠٤/١٥-٢٠٦)

کیسے بلند کیا گیا ہے؟⑱ اور پہاڑوں کی طرف کہ کیسے گاڑے گئے ہیں؟⑲ زمین کی طرف کہ کیسے بچھائی گئی ہے؟⑳ چنانچہ آپ نصیحت کیجیے، آپ تو صرف نصیحت کرنے والے ہیں㉑ آپ ان پر کوئی فوج دار نہیں㉒ مگر جس نے منہ موڑا اور کفر کیا㉓ تو اسے اللہ بہت بڑا عذاب دے گا㉔ بے شک ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے㉕ پھر بے شک ان کا حساب لینا ہمارے ہی ذمے ہے㉖

اونٹ، آسمان، پہاڑ اور زمین کی طرف عبرت کی نگاہ ڈالنے کی ترغیب:

اللہ پاک نے اپنے بندوں کو حکم کیا کہ وہ اس کی مخلوقات میں نظر کریں اور اللہ کی عظمت کو پہچانیں۔ اس کی ایک مخلوق اونٹ ہے جس کی خلقت اور ترکیب عجیب وغریب ہے، وہ انتہا درجے کی قوت اور شدت میں واقع ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہت بھاری وزن اٹھانے کے لیے نرم اور مطیع ہے۔ ایک کمزور آدمی جدھر چاہے اس کو لے جائے، فرمانبردار ہے۔ اس کا گوشت کھانے میں آتا ہے اور اس کے صوف سے فائدہ حاصل کرتے ہیں، اس کا دودھ پیا جاتا ہے، اس کے گوشت اور خون اور ہڈیوں میں سے کوئی شے بیکار اور بے فائدہ نہیں ہے۔ اس جگہ اونٹ کا ذکر اس لیے کیا کہ عرب میں تمام چوپایوں پر غالب یہی اونٹ ہے۔

قاضی شریح رحمہ اللہ کہا کرتے تھے کہ ہمارے ساتھ چلو، اونٹ کو جا کر دیکھیں کیسا پیدا ہوا ہے۔[1] اس کے بعد آسمان کی بلندی کا ذکر کیا کہ یہ آسمان تمھارے سر پر چھت کی طرح ہے، ہم نے اس کو زینت دی، اس میں کوئی سوراخ نہیں ہے۔ پہاڑوں کو دیکھو کہ کس طرح کے مضبوط جمے ہوئے کھڑے ہیں جن کی وجہ سے زمین ہل نہیں سکتی۔ ان میں طرح طرح کے منافع اور معدنیات رکھی ہیں۔ زمین کو دیکھو کہ ایک بچھونے کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ بدوی کو اونٹ کے ساتھ استدلال کر کے تنبیہ کی جس پر وہ سوار ہوتا ہے اور اس کے سر پر آسمان ہے اور اس کے سامنے پہاڑ ہوتا ہے اور پاؤں کے نیچے زمین ہے، یہ سب خالقِ کائنات کی قدرت اور کاریگری پر دلائل ہیں۔

قصہ ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ کا:

اس سے معلوم ہوا کہ رب عظیم ہے، مالک ومتصرف ہے، وہی ایک معبودِ برحق ہے اور عبادت اسی کا حق ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اسی بات کے پیچھے ضمام نے اپنے سوال میں رسول اللہ ﷺ کو قسم دی تھی۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم منع کیے گئے تھے کہ نبی اکرم ﷺ سے کچھ سوال کریں۔ ہم کو یہ بات اچھی لگتی تھی کہ کوئی یہاتی جنگلی شخص آئے، جو عقل رکھتا ہو، وہ نبی اکرم ﷺ سے کچھ پوچھے اور ہم سنیں۔ ایک شخص جنگل والوں میں سے

---

[1] تفسير الطبري (٣٨٨/٢٤)

آیا اور کہا: اے محمد! تمھارا قاصد ہمارے پاس آیا اور کہا: تم کو یہ اعتقاد ہے کہ تمھیں اللہ نے بھیجا ہے؟ کہا: اس نے سچ کہا، پوچھا: آسمان کو کس نے بنایا؟ فرمایا: اللہ نے۔ کہا: زمین کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا: اللہ نے۔ کہا: ان پہاڑوں کو کس نے کھڑا کیا اور ان میں یہ چیزیں کس نے رکھی ہیں؟ فرمایا: اللہ نے۔ کہا: تم کو قسم ہے اس کی جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا اور پہاڑوں کو کھڑا کیا! کیا اللہ پاک نے تم کو بھیجا ہے؟ فرمایا: ہاں! کہا: تمھارا قاصد کہتا ہے کہ ہم پر رات دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔ فرمایا: اس نے سچ کہا۔ کہا: تم کو قسم ہے اس کی جس نے تم کو بھیجا ہے! کیا اللہ نے تم کو اس بات کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ہاں! کہا: تمھارا قاصد کہتا ہے کہ ہم پر ہمارے مال پر زکات ہے۔ فرمایا: سچ کہا۔ پوچھا: کیا اللہ نے تم کو اس بات کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ہاں! کہا: تمھارا قاصد کہتا ہے کہ ہم پر اس گھر کا حج کرنا واجب ہے جس کو مقدور ہو؟ فرمایا: سچ کہا، جب وہ پشت پھیر کر چلا تو کہنے لگا: قسم ہے اس شخص کی جس نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے! میں اس پر نہ کچھ زیادہ کروں گا اور نہ اس سے کم۔ تب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «إِنْ صَدَقَ لَيَدْخُلَنَّ الْجَنَّةَ»[1] "اگر یہ سچا ہے تو ضرور جنت میں جائے گا۔" (رواه مسلم وعلقه البخاري ورواه الترمذي والنسائي وأحمد والبخاري وأبو داود والنسائي وابن ماجه بطوله)

اس طریق کے آخر میں یہ ہے کہ اس نے یہ بات کہی: "وَأَنَا ضِمَامُ بْنُ ثَعْلَبَةَ أَخُو بَنِي سَعْدِ بْنِ بَكْرٍ"[2] "میں بنو سعد بن بکر کا ایک فرد ضمام بن ثعلبہ ہوں۔" سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اکثر جاہلیت کی ایک عورت کی حکایت کیا کرتے تھے کہ وہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر اپنے ایک چھوٹے بچے کے ساتھ رہا کرتی تھی، بکریاں چراتی تھی، اس کے بیٹے نے اس سے کہا: اے ماں! تجھ کو کس نے پیدا کیا؟ اس نے کہا کہ اللہ نے۔ کہا: میرے باپ کو کس نے پیدا کیا؟ کہا: اللہ نے۔ کہا: مجھے کس نے پیدا کیا؟ کہا: اللہ نے۔ کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ کہا: اللہ نے۔ کہا: زمین کو کس نے پیدا کیا؟ کہا: اللہ نے۔ کہا: پہاڑ کو کس نے پیدا کیا؟ کہا: اللہ نے۔ کہا: ان بکریوں کو کس نے پیدا کیا ہے؟ کہا: اللہ نے۔ کہا: میں اللہ پاک کے لیے ایک شان سنتا ہوں، پھر اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرا دیا اور پارہ پارہ ہو گیا۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے یہ حدیث ہم سب بہت بار بیان کیا کرتے تھے۔ عبداللہ بن دینار نے کہا ہے کہ "كَانَ ابْنُ عُمَرَ رضي الله عنهما كَثِيرًا مَّا يُحَدِّثُنَا هٰذَا"[3] (رواه أبو يعلىٰ) "ابن عمر رضی اللہ عنہما اکثر ہمیں یہ حدیث بیان کرتے تھے۔" لیکن اس کے اسناد میں ضعف ہے۔ عبداللہ بن جعفر مدینی کو ان کے بیٹے امام علی بن مدینی نے ضعیف کہا ہے۔

---

[1] صحيح مسلم (١٢) سنن الترمذي (٦١٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦١/٢) مسند أحمد ١٤٣/٣)

[2] صحيح البخاري (٦٣) سنن أبي داود (٤٨٦) سنن النسائي (٢٠٩٢) سنن ابن ماجه (٢٠٩٢)

[3] الكامل لابن عدي (١٧٨/٤) اس کی سند میں "عبداللہ بن جعفر مدینی" ضعیف راوی ہے۔

رسول ﷺ کے ذمے صرف پیغام پہنچانا ہے منانا نہیں:

پھر رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ تم لوگوں کو وعظ کرو، تم پر پہنچانا ہے اور ہم پر حساب لینا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا فرض تم کو مار مار کر ایمان پر لانا نہیں ہے۔[1] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا: «أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُوْلُوْا لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ فَإِذَا قَالُوْهَا عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَ هُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ» ''مجھے لوگوں سے ان کے کلمہ پڑھنے تک لڑائی کا حکم ہے۔ جب وہ کلمہ پڑھ لیں گے تو مجھ سے اپنے خون اور مال بچالیں گے سوائے ان کے حق کے اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔'' پھر یہ آیت پڑھی: ﴿فَذَكِّرْ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ﴾[2] (رواه أحمد ومسلم والترمذي والنسائي) یہ حدیث صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[3]

حق سے منہ موڑنے والے کی وعید:

پھر کہا: جو کوئی عمل بالا رکان سے منہ موڑے اور حق کا دل اور زبان سے انکار کرے اس کو بڑا عذاب ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّىٰ ۝ وَلَٰكِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ﴾ [القيامة: ٣١- ٣٢] ''اس نے نہ تو تصدیق کی، نہ نماز ادا کی، بلکہ جھٹلایا اور روگردانی کی۔'' سیدنا ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ کا گزر خالد بن یزید بن معاویہ پر ہوا کہ نبی اکرم ﷺ سے جو بہت نرم بات سنی ہو، وہ بتاؤ۔ کہا: میں نے سنا، فرماتے تھے: «أَلَا كُلُّكُمْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ شَرَدَ عَلَى اللّٰهِ شِرَادَ الْبَعِيْرِ عَلَى أَهْلِهِ»[4] (رواه أحمد و تفرد به) یعنی تم سب بہشت میں جاؤ گے مگر وہ شخص جو اللہ سے بھاگا مثل بھاگنے اونٹ کے اپنے صاحب سے۔ پھر فرمایا کہ تمھارا مرجع اور منقلب اور حساب لینا ہماری طرف ہے، اعمال کا حساب لے کر بدلہ دیں گے، اچھے اعمال کا اچھا بدلہ اور برے عمل کا برا بدلہ۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ یہ استفہام کہ کیا وہ اونٹ کی طرف نگاہ نہیں کرتے سرزنش اور ملامت کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر امر بعث کی تقریر کے لیے کیا ہے، تاکہ لوگ اسی سے مبعوث ہونے پر استدلال کریں۔ اونٹ کو دیکھو جو عرب کے مویشیوں میں سے بڑا ہے اور اکثر وہ نظر آتا رہتا ہے کہ کس طرح تمام حیوانات سے ایک نئی طرز پر پیدا ہوا ہے۔ جثہ میں عظیم ہے، قوت میں زیادہ ہے، اس کے سارے صفات منفرد ہیں۔ امام ابن العلاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ چارپاؤں والا ہے، اس کو بٹھا کر لادتے ہیں، چارپاؤں میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کو بٹھا کر اس پر وزن لادا جائے، بلکہ سب کو کھڑا کر کے لادتے ہیں۔

[1] تفسير الطبري (٣٩٠/٢٤) [2] صحيح مسلم (٢١) مسند أحمد (٣٠٠/٣) سنن الترمذي (٣٣٤١) سنن النسائي الكبرىٰ (٥١٤/٦)
[3] صحيح البخاري (٢٧٨٦) صحيح مسلم (٢١) [4] مسند أحمد (٢٥٨/٥) السلسلة الصحيحة (٢٠٤٣)

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ باوجود اس عظم خلقت (بڑے جثے کے) ایک لڑکا اس کو جدھر چاہے نکیل پکڑ کر لے جائے، اس کو اٹھائے، بٹھائے، بوجھ لادے۔ وہ سارا بوجھ لے کر بیٹھے ہوئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ بات کسی اور بار بردار جانور میں نہیں ہے۔[1] اس خلقِ عظیم کا دکھانا توحید پر دلیل ہے۔ کسی نے حسن رحمہ اللہ سے اس آیت کے متعلق سوال کیا تھا اور کہا تھا کہ ہاتھی اس سے بھی زیادہ عجیب مخلوق ہے۔ کہا: اول تو ہاتھی عرب میں ہوتا نہیں ہے، دوسرے وہ ایک خوک ہے، اس کی پشت پر سواری نہیں کی جاتی اور نہ اس کا گوشت کھایا جاتا ہے اور نہ اس کا دودھ دھویا جائے۔ اور اونٹ عرب کے اموال میں سب سے زیادہ عزت والا اور انفس ہے۔ گٹھلی کھاتا ہے اور دودھ دیتا ہے،[2] ایک بچہ اس کی باگ پکڑ کر جدھر چاہے لے جائے وہ چلا جائے گا، باوجود اس بات کے کہ عظیم الجثہ ہے۔ غرض یہ کہ عجیب مخلوق ہے۔ خاری خورد و باری برد، یعنی کانٹے کھائے اور وزن اٹھائے۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دس روز بلکہ اور زیادہ دیر تک پیاسا رہ سکتا ہے، بڑے بڑے دور دراز شہروں تک سامان لاد کر لے جاتا ہے۔ کانٹے اور درخت کے پتے کھاتا ہے اور آواز خوب اس میں اثر کرتی ہے، حالاں کہ اس کا جگر موٹا ہے۔ یہ باتیں اس حیوان کے سوا کسی اور حیوان میں جمع نہیں ہیں۔[3] امام مبرد رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ اس جگہ لفظ "إبل" معنی سحاب ہے۔[4] اہلِ تفسیر کے خلاف ہے۔ فتح العزیز میں اس آیت کے نیچے بیان کیا ہے کہ اونٹ میں جنت اور دوزخ کا نمونہ ہے۔ پھر اس کی تفصیل لکھی ہے اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ آسمان کو دیکھو کہ زمین کے اوپر کس طرح ستون کے بغیر کھڑا کر دیا ہے، بھلا کسی کی بھی عقل میں آ سکتا ہے یا کسی کا فہم اس کو پا سکتا ہے۔ کوئی چیز اس کی بلندی تک نہیں پہنچتی بے شک ہوا میں اڑ دیا غبارے میں جاؤ۔

پہاڑوں کو اس طرح نصب کیا ہے کہ زمین جنبش نہیں کر سکتی، اس کو سخت جکڑ بند کیا ہے۔ زمین کو دیکھو کہ ایک فرش کی طرح بچھا دیا ہے۔ محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے زمین کا سطح ہونا ظاہر ہے۔ اسی پر علمائے شرع ہیں۔ کُرہ (گول) نہیں ہے جس طرح کہ ہیئت والے کہتے ہیں گو اس سے کوئی رکنِ شرع شکستہ نہ ہو۔[5] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زمین اپنی حقیقت وطبیعت میں کرہ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس کو طبیعت سے خارج کر کے بعض کو مسطح کر دیا ہے، تاکہ حیوانات اس پر بود و باش کریں۔

شیخ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے رسالہ تکمیل میں لکھا ہے کہ اہلِ شرائع اللہ کے فرمان: ﴿الْاَرْضَ فِرٰشًا﴾، ﴿دَحٰىهَا﴾، ﴿سُطِحَتْ﴾ اور اسی طرح کے اور قول سے یہ بات سمجھتے ہیں کہ زمین سطح مستوی ہے اور حکماء نے صحیح دلائل سے اس کا کروی (گول) ہونا ثابت کیا ہے، اس سے مخالفت کا وہم ہوتا ہے۔ اس

---

[1] فتح القدير (٥/٥٧٥) [2] تفسير البغوي (٨/٤١٠) [3] تفسير أبي السعود (٩/١٥١) فتح البيان (١٥/٢٠٧)
[4] تفسير القرطبي (٢٠/٣٥) [5] تفسير الجلالين (١/٨٠٥)

وہم کو اس طرح سے دور کیا جا سکتا ہے کہ اس کا قدرِ محسوس ہر بقعہ میں ایک سطح مستوی ہے، اس لیے کہ جب دائرہ بڑا ہوتا ہے تو اس کے اجزاء کا انحداب (کُبڑا ہونا) کم ہو جاتا ہے، اس لیے اس کا مستوی ہونا اجزاء کی محسوسیت کے اعتبار سے ہے اور اس کا کروی ہونا جملہ ارض کی معقولیت کے اعتبار سے ہے۔ انتھی[1]۔

پھر اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم ان لوگوں کو نصیحت و وعظ و تذکیر کرو کہ تمھارا کام یہی ہے، تم کچھ ان پر داروغہ نہیں ہو کہ زبردستی مومن بناؤ۔ ''مسیطر'' سین اور صاد دونوں سے آتا ہے، اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی شے کے حال کا خبر گیری کرنے والا ہو۔ لیکن پھر یہ حکم آیت: ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ [التوبة: ٥] ''مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو۔'' سے منسوخ ہو گیا۔ ہاں جو شخص تمھارا وعظ نہ سنے گا اور انکار کرے گا، وہ بڑے عذاب میں گرفتار ہو گا، اس سے مراد عذابِ جہنم ہے یا عذابِ دنیا، جیسے: بھوک، قتل، قحط اور قید۔ پھر سنا دیا کہ موت کے بعد تم ہماری ہی طرف پھر کر آؤ گے نہ کہ کسی اور کی طرف جاؤ گے۔ تب ہم تمھارا حساب لیں گے اور اعمال کے حساب سے سزا دیں گے۔ عبارت کی یہ ترکیب انتہائی سخت ہے اور انتہائی عذاب کی خبر دیتی ہے۔[1] ونعوذ باللّٰه من سخط اللّٰه وغضبه.

---

[1] فتح البیان (١٥/٢٠٦۔٢٤٩)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْفَجْرِ

اس سورت کی تیس (۳۰) یا انتیس (۲۹) آیتیں ہیں۔ جمہور کے قول کے مطابق بلا اختلاف مکہ میں نازل ہوئی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔ علی ابن ابی طلحہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ سورت مدنی ہے۔[1]

نماز میں سورۃ الفجر کی قراءت:

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی۔ ایک آدمی نے ان کے ساتھ آ کر نماز پڑھی۔ انھوں نے نماز میں طول کیا، اس شخص نے مسجد کے کونے میں الگ نماز پڑھ لی۔ جب سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نماز پڑھ چکے اور یہ حال معلوم ہوا تو کہا کہ یہ منافق ہے۔ یہ خبر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی۔ اس نے کہا کہ میں آیا تھا کہ ان کے ساتھ نماز پڑھوں، انھوں نے نماز بہت لمبی کی، مجبوراً میں نے مسجد کے ایک کونے میں علاحدہ نماز پڑھ لی، مجھے اپنے اونٹ کو چارہ کھلانا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَفَتَّانٌ أَنْتَ يَا مُعَاذُ! أَيْنَ أَنْتَ مِنْ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى، وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا، وَالْفَجْرِ، وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَى»[2] (أخرجه النسائي) یعنی تو نے ان سورتوں کو پڑھا ہوتا، کیا تو فتنہ انگیز ہے جو ایسی لمبی نماز پڑھتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَالْفَجْرِ ﴿۱﴾ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ﴿۲﴾ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿۳﴾ وَالَّيْلِ اِذَا يَسْرِ ﴿۴﴾
هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ﴿۵﴾ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ
بِعَادٍ ﴿۶﴾ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴿۷﴾ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي
الْبِلَادِ ﴿۸﴾ وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ﴿۹﴾ وَفِرْعَوْنَ ذِي
الْاَوْتَادِ ﴿۱۰﴾ الَّذِيْنَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۱﴾ فَاَكْثَرُوْا فِيْهَا الْفَسَادَ ﴿۱۲﴾ فَصَبَّ
عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾

[1] الدر المنثور (۸/۴۹۷) [2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٥١٥)

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے فجر کی ① اور دس راتوں کی ② اور جفت اور طاق کی ③ اور رات کی جبکہ وہ چل (بیت) رہی ہو ④ یقیناً ان (چیزوں) میں صاحبِ عقل کے لیے معتبر قسم ہے ⑤ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے رب نے عاد کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا؟ ⑥ (عادِ) ارم جو اونچے ستونوں والے تھے ⑦ جن کے مانند کوئی قوم ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی ⑧ اور ثمود کے ساتھ جو وادی میں چٹانیں تراشتے تھے ⑨ اور فرعون میخوں والے کے ساتھ ⑩ وہ جنھوں نے شہروں میں سرکشی کی ⑪ اور ان میں بہت زیادہ فساد پھیلایا ⑫ تب آپ کے رب نے ان پر عذاب کا کوڑا برسایا ⑬ بے شک آپ کا رب (مجرموں کی) گھات میں ہے ⑭

﴿ اَلْفَجْرِ ﴾ اور مابعد کی تفسیر

عیدِ قربان کی فجر کو بڑا حج ادا ہوتا ہے اور دس رات اس سے پہلے اور جفت اور طاق جو رمضان کی آخری دہائی میں ہیں اور جب رات کو نبی اکرم ﷺ معراج پر گئے ان سب کی قسم کھائی ہے۔ عاد ایک قوم تھی۔ ارم اس قوم کا ایک قبیلہ تھا، وہ ایک سلطنت تھی، ان میں بڑی اونچی اونچی عمارتیں بناتے تھے۔ وادی ثمود کے مکان کا نام ہے۔ پہاڑ کو کرید کر گھر بناتے تھے۔ فرعون لشکر کے گھوڑوں کے لیے سونے کی میخیں رکھتا تھا۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ فجر معروف ہے صبح کو کہتے ہیں۔ یہی قول سیدنا علی، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام عکرمہ، مجاہد اور سدی رحمہم اللہ کا ہے۔ امام مسروق اور محمد بن کعب رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد یوم النحر کی فجر ہے۔ خاص طور پر یہ دس راتوں کا اخیر ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فجر سے مراد صبح کی نماز ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سارا دن مراد ہے۔ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہا ہے۔ دس راتوں سے مراد ذوالحجہ کا عشرہ ہے سلف وخلف میں سے سیدنا عبداللہ بن عباس، زبیر رضی اللہ عنہم اور امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کے قول کے مطابق۔[1]

صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ ان دنوں، یعنی عشر ذی الحجہ میں کیے گئے عملِ صالح کے برابر کسی اور دن میں کیا گیا عملِ صالح اللہ کے نزدیک نہیں ہے۔ کہا: کیا جہاد بھی نہیں؟ فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد بھی نہیں، مگر یہ کہ کوئی شخص اپنی جان اور مال لے کر نکلے، پھر کچھ لے کر واپس نہ آئے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ محرم کا پہلا عشرہ ہے۔ اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے حکایت کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ

① تفسير الطبري (٢٤/٣٩٥، ٣٩٦)
② صحيح البخاري (٩٢٦)

رمضان کا عشرِ اول مراد ہے، لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے۔[1] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے کہ ''عشر'' عشرِ اضحیٰ ہے اور ''وتر'' یومِ عرفہ ہے اور ''شفع'' یوم النحر ہے۔[2] (رواه أحمد والنسائي وابن جرير وابن أبي حاتم) اس کی سند ''لا بأس به'' ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میرے نزدیک اس روایت کے مرفوع ہونے میں نکارت ہے۔[3] ''وتر'' سے مراد یوم عرفہ ہے، کیوں کہ وہ نو تاریخ کو ہوتا ہے اور ''شفع'' سے مراد یوم النحر ہے، اس لیے کہ یہ دس تاریخ کو ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ اور ضحاک رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[4] امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''شفع'' یومِ عرفہ ہے اور ''وتر'' شبِ اضحیٰ۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''شفع'' یہ قول ہے: ﴿ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ﴾ [البقرة: ٢٠٣] ''دو دن کی جلدی کرنے والے پر کوئی گناہ نہیں۔'' ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ شفع ایامِ تشریق کا اوسط ہے اور وتر آخر ایامِ تشریق۔[5]

صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے رفعاً مروی ہے کہ اللہ کے ننانوے نام ہیں سو عدد مگر ایک، جس نے ان کو یاد کیا وہ جنت میں جائے گا۔ اللہ وتر ہے وتر کو دوست رکھتا ہے۔[6] امام حسن اور زید بن اسلم رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ساری خلق شفع و وتر ہے۔ اللہ نے اپنی خلق کی قسم کھائی ہے۔ یہ ایک روایت امام مجاہد رحمہ اللہ سے بھی ہے، لیکن ان سے مشہور وہی قولِ اول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ وتر ہے اور تم شفع ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ شفع صبح کی نماز ہے اور وتر مغرب کی نماز۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شفع زوج ہے اور وتر اللہ،[7] یعنی اللہ طاق ہے اور خلق جفت ہے، نر اور مادہ۔

اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو جفت بنایا ہے، آسمان و زمین اور بر و بحر اور جن و انس اور آفتاب و ماہتاب اور اسی طرح کی اور مخلوق، گویا اس قول کی طرف جھکے: ﴿ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ [الذاريات: ٤٩] ''اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔'' یعنی تاکہ تم یہ بات جان لو کہ خالقِ ازواج ایک ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد عدد ہے کہ کوئی شفع ہے اور کوئی وتر۔[8] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے کہ شفع دو دن ہیں اور وتر تیسرا دن۔[9] (رواه ابن أبي حاتم)

---

[1] صحيح البخاري (٣٩٦/٢٤) تفسير ابن كثير (٦٥١/٤)

[2] مسند أحمد (٣٢٧/٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٥١٤/٦) تفسير الطبري (٣٩٧/٢٤) اس کی سند میں ''ابو الزبیر'' مدلس راوی اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣١٧٨)

[3] تفسير ابن كثير (٦٥١/٤)

[4] تفسير الطبري (٣٩٧/٢٤، ٣٩٨)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٢٤/١٠)

[6] صحيح البخاري (٢٥٨٥) صحيح مسلم (٢٦٧٧)

[7] تفسير الطبري (٣٩٨/٢٤، ٣٩٩)

[8] تفسير الطبري (٤٠٠/٢٤) تفسير ابن كثير (٦٥٢/٤)

[9] تفسير الطبري (٤٠٠/٢٤)

امام ابو العالیہ اور ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شفع نماز چار رکعت ہے اور دو رکعت ہے اور وتر نماز مغرب اور نمازِ وتر ہے جو تہجد کے آخر میں ہوتی ہے۔ سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد نمازِ فرض ہے، کوئی اس میں شفع ہے اور کوئی وتر ہے۔[1] یہ قول رفعاً بھی مروی ہے۔[2] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ان اقوال میں سے کسی قول کے ساتھ جزم نہیں کیا۔

﴿ وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ ﴾ کی تفسیر:

﴿ وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ ﴾ سے مراد رات کا جانا ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یعنی ''یُذْهِبُ بَعْضُهُ بَعْضًا'' ''اس کا بعض بعض کو لے جاتا ہے۔'' امام مجاہد، ابو العالیہ اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی ''إِذَا سار'' ہے۔[3] احتمال ہے کہ ''إِذَا سَارَ'' بہ معنی ''أَقْبَلَ'' ہو بلکہ یہی زیادہ مناسب ہے اس لیے کہ فجر کے مقابلے میں ہے۔

فجر اقبالِ نہار و ادبارِ لیل کو کہتے ہیں اور اس کے برعکس۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَالَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ﴾ [التکویر: ۱۷-۱۸] ''اور رات کی (قسم) جب جانے لگے اور صبح کی جب چمکنے لگے۔'' یہی امام ضحاک رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ﴿ یَسْرِ ﴾ بہ معنی ''یَجْرِيْ'' ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد جمع ہونے کی شب، یعنی لیلِ مزدلفہ ہے۔ امام قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی چل اے چلنے والے اور رات بسر نہ کر مگر مزدلفہ میں۔[4] ﴿ حِجْرٍ ﴾ سے مراد عقل ولب وحجی ہے، عقل کو حجر اس لیے کہتے ہیں کہ عقل افعال و اقوالِ نالائق سے مانع ہوتی ہے۔ یہ قسم ہے عبادت کے اوقات کی یا نفسِ عبادت کی، جیسے: حج و نماز وغیرہ انواعِ قرب۔

قوم عاد کی تباہی و بربادی:

اس کے بعد عاد کا ذکر کیا، یہ لوگ بڑے متمرد و سرکش و سرتاب تھے، اللہ کی اطاعت سے خارج اور رسول کو جھٹلانے والے اور کتبِ الٰہی کا انکار کرنے والے تھے۔ اللہ نے کہا کہ ہم نے ان کو تباہ و برباد کر دیا اور ایک داستان ٹھہرا دیا، تاکہ لوگ عزت حاصل کریں۔ یہ عاد صاحبِ ارم عادِ اولیٰ تھے۔ عاد بن ارم بن عوص بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد۔[5] (قاله ابن إسحاق)

انہیں میں اللہ نے حضرت ہود علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا تھا۔ عاد نے ان کو جھٹلایا اور مخالفت کی، اللہ تعالیٰ نے ہود علیہ السلام کو اور مومنین کو ان کے درمیان میں سے نکال کر بچا دیا اور عاد کو تیز ہوا سے ہلاک کر دیا۔ یہ ہوا ان پر مسلسل

---

[1] تفسیر الطبري (۲۴/۳۹۹) [2] تفسیر الطبري (۲۴/۴۰۰) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔
[3] تفسیر الطبري (۲۴/۴۰۱) [4] تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۴۳۵) [5] تفسیر الطبري (۲۴/۴۰۴)

سات رات آٹھ دن تک چلتی رہی، ان میں سے کوئی باقی نہ رہا، سب درختوں کی طرح جڑ سے اکھڑ کر گر پڑے۔ ان کا قصہ قرآن شریف میں کئی جگہ آیا ہے، تا کہ اہلِ ایمان ان کے بچھڑنے سے عبرت حاصل کریں۔

﴿ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴾ سے یہ مراد ہے کہ وہ بالوں کے گھیر میں رہتے تھے، سخت ستونوں پر ان کو اونچا کرتے۔ یہ اپنے وقت میں پکڑنے اور قوت میں سب خلق سے بڑھ کر تھے، اس لیے ہود علیہ السلام نے ان کو اس نعمت کی یاد دہی فرمائی اور کہا کہ تم اپنی اس طاقت اور قوت کو اللہ کی اطاعت میں صَرف کرو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ زَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ [الأعراف: ٦٩] ''اور تم یہ حالت یاد کرو کہ اللہ نے تم کو قومِ نوح کے بعد جانشین بنایا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاؤ زیادہ دیا، سو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تا کہ تم کو فلاح ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ؕ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ﴾ [حم السجدة: ١٥] ''اب عاد نے تو بے وجہ زمین میں سرکشی شروع کر دی اور کہنے لگے کہ ہم سے زور آور کون ہے؟ کیا انھیں یہ نظر نہیں آیا کہ جس نے انھیں پیدا کیا ہے وہ ان سے (بہت ہی) زیادہ زور آور ہے۔''

اس جگہ یہ فرمایا کہ ایسا قبیلہ جو اتنا قوی البطش، عظیم الترکیب اور شدید القوۃ ہو، دوسرے شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِرَمَ ﴾ کی امت قدیم ہے یعنی عادِ اولیٰ۔ امام قتادہ اور سدی رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ ﴿ اِرَمَ ﴾ دار الملک عاد تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول حسن جید قوی ہے۔[1] پھر امام مجاہد، قتادہ اور کلبی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ اہلِ عمود تھے، ایک جگہ قیام نہ کرتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان کو ﴿ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴾ اس لیے کہا کہ وہ دراز قد تھے، لیکن امام ابن جریر رحمہ اللہ نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے اور دوسرے قول کو رد کیا ہے، یہی ٹھیک ہے۔[2]

انھوں نے احقاف میں ایسی بستیاں بنائیں کہ ان جیسی بلاد میں نہ تھیں۔ یا ایسا قبیلہ دوسرا نہ تھا۔ یہی قول صحیح ہے اور ابن زید رحمہ اللہ کا یہ قول کہ سونے کے ستون بنائے تھے، ضعیف ہے، کیوں کہ اگر یہ مطلب ہوتا تو اللہ تعالیٰ یوں فرماتے: ''اَلَّتِيْ لَمْ يُعْمَلْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ'' حالاں کہ ﴿ لَمْ يُخْلَقْ ﴾ کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مراد قبیلہ ہے نہ کہ مکان۔ سیدنا مقدام رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے کہ عاد کا ایک آدمی ایک بڑے پتھر کو اٹھا کر قوم میں لے آتا، پھر ان کو ہلاک کر ڈالتا۔[3] (رواه ابن أبي حاتم)

ثور بن ابی زید دیلی کہتے ہیں کہ میں نے ایک کتبہ پڑھا، اس میں لکھا تھا: ''أَنَا شَدَّادُ بْنُ عَادٍ وَأَنَا الَّذِي

[1] تفسیر الطبري (٢٤/٤٠٤) تفسیر ابن کثیر (٤/٦٥٤) [2] تفسیر الطبري (٢٤/٤٠٥۔٤٠٧)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٤٢٥) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔

رَفَعْتُ الْعِمَادَ وَأَنَا الَّذِي شَدَدْتُ بِذِرَاعِي نَظَرٌ وَاحِدٌ وَأَنَا الَّذِي كَنَزْتُ كَنْزًا عَلَى سَبْعَةِ أَذْرُعٍ لَا يُخْرِجُهُ إِلَّا أُمَّةُ مُحَمَّدٍ ﷺ". [1] "میں شداد بن عاد ہوں، میں نے ستون بلند کیے ہیں، میں نے ہاتھ مضبوط کیے ہیں، میں نے سات ذراع کے خزانے جمع کیے ہیں جو امتِ محمد ﷺ نکالے گی۔" الحاصل عماد خواہ ابنیہ ہوں یا اعمدۂ بیوت یا سلاحِ جنگ یا طولِ قامت، وہ ایک قبیلہ اور ایک امت تھی جن کا ذکر قرآنِ مجید میں کئی جگہ آیا ہے ثمود کے ذکر کے ساتھ، جس طرح کہ اس جگہ بھی ثمود کے ذکر کے ساتھ ہی آیا ہے۔ بعض کا یہ خیال کہ ارم شہر کا نام ہے، اس میں نظر ہے۔ سعید بن مسیب اور عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد دمشق ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسکندریہ ہے [2] اس بنا پر التیامِ کلام نہیں ہوتا (کلام نہیں ملتا) بلکہ مراد قبیلہ عاد کے ہلاک ہونے کی خبر دینا ہے کہ اللہ نے ان پر اپنا عذاب اتارا اور یہ منظور نہیں کہ ان کے شہر اور سلطنت کا حال بیان کیا جائے۔ ہم نے اس بات سے اس لیے آگاہ کیا، تاکہ مفسرین کی ایک جماعت کے بیان پر دھوکا نہ ہو، کیوں کہ انھوں نے ارم کو ایک شہر ٹھہرا کر اس کی بہت کچھ تعریف لکھی ہے اور کہا ہے کہ اس کی ایک اینٹ سونے کی اور ایک چاندی کی تھی اور سنگریزے جواہر کے اور مٹی مشک کی تھی اور گھر اور باغات اس اس طرح کے تھے اور نہریں اور پھل ایسے ایسے تھے، لیکن وہاں کوئی رہتا نہیں تھا۔ فصل اور شہر کے دروازے خالی تھے، نہ کوئی پکارنے والا اور نہ کوئی جواب دینے والا تھا۔ یہ شہر چلتا پھرتا رہتا ہے، کبھی شام میں اور کبھی یمن میں اور کبھی عراق میں اور کبھی کہیں۔ سو یہ سب خرافات ہے۔ بنی اسرائیل کے بعض زنادقہ نے بنائی ہے، تاکہ جاہلوں کی عقل کا امتحان کریں اور دیکھیں کہ ہماری تصدیق کرتے ہیں یا نہیں۔

پھر ثعلبی رحمہ اللہ وغیرہ نے ایک اعرابی کا قصہ لکھا ہے کہ اس کا نام عبداللہ ابن قلابہ تھا اور وہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اپنے اونٹ کی تلاش میں نکلا، اتنے میں اس کو جنگل میں ایک شہر ملا جس کے فصیل اور دروازے تھے، اس میں جا کر قریب قریب وہی حال دیکھا جو اوپر بیان ہوا ہے، پھر اس نے آ کر لوگوں سے اس کا حال بیان کیا جب لوگ اس کے ساتھ گئے تو کچھ نہ دیکھا۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ارم کا قصہ مطول ذکر کیا ہے۔ سو اعرابی کی یہ حکایت بالکل صحیح نہیں ہے اور اگر صحت کو پہنچے تو اس کی بنائی ہوئی ہو گی یا اس کو کچھ جنون ہو گا کہ اس نے اس کا خارج میں اس کا اعتقاد کر لیا۔ یہ بات ایسی ہے کہ اس روایت کے غلط ہونے پر یقین کرنا ضروری ہے اور یہ اس داستان کے قریب ہے جس کا ذکر بہت سے جاہل، طامع متخیل (خیالی گھوڑے دوڑانے والے) کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زمین کے نیچے سونے چاندی اور ہیرے جواہرات، یاقوت اور موتیوں کے پہاڑ اور بڑے بڑے ذخیرے ہیں لیکن بہت سے موانع اس تک پہنچنے میں مانع ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٤٢٥/١٠) [2] تفسیر الطبري (٤٠٤/٢٤)

اس حیلے بہانے سے اغنیاء اور کم عقل اور کم فہم لوگوں کا بہت سا مال ناحق اور ناجائز طریقے سے کھا جاتے ہیں اور ان سے بہت سے بخورات (وہ چیزیں جن کے جلانے سے خوشبو نکلتی ہے) اور عقاقیر (جڑی بوٹیاں) خرچ کرا دیتے ہیں۔ اس طرح کے ہذیانات (بے ہودہ چیزیں) دنیا میں بہت ہیں، ہاں اتنی بات ہے کہ زمین میں جاہلیت اور اسلام کے زمانے کے بہت سے خزانے موجود ہیں۔ یعنی دفینے ہیں جس کے ہاتھ وہ لگیں، وہ ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکتا ہے، لیکن اس صفت پر جس کا کہ یہ لوگ اعتقاد کرتے ہیں بالکل دروغ و بندش، بہتان و افترا ہے، اس میں سے کچھ بھی صحیح اور ثابت نہیں ہے، فقط ایک کہانی اور قصہ ہے جس کی کچھ اصل اور حقیقت نہیں ہے۔ والله الهادي إلى الصواب.[1]

قوم ثمود اور فرعون کا ذکر:

امام ابن جریر رحمہ اللہ کا یہ قول کہ ارم قبیلہ ہے یا شہر جس میں عاد رہتے اور بستے تھے منظور فیہ ہے۔ یعنی اس میں نظر ہے، اس لیے کہ یہ اخبارِ قبیلہ سے ہے نہ مدینہ سے۔ لہٰذا اللہ نے اس کے بعد ثمود کا ذکر کیا کہ وہ وادی میں سنگ تراشی کرتے تھے، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ پتھروں کو تراشتے تھے، ان میں خرق کرتے (پھاڑتے) تھے۔ یہی قول امام ابن زید، مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ کا بھی ہے۔[2] اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فٰرِهِيْنَ ﴾ [الشعراء: ١٤٩] ''اور تم پہاڑوں کو تراش تراش کر پرتکلف مکانات بنا رہے ہو۔'' امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لوگ عرب تھے، ان کے گھر وادیِ قریٰ میں تھے۔ عاد کا قصہ استقصاء کے طور پر (مکمل طور پر) سورۃ الاعراف کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے،[3] اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ الْاَوْتَادِ ﴾ سے مراد لشکر ہے جو اس کے کام کو مضبوط کرتے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ فرعون ان کے ہاتھوں اور پاؤں میں لوہے کی میخیں ٹھونکتا تھا۔ یہی قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا ہے۔ امام سعید بن جبیر، حسن اور سدی رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[4] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدمی کے ہر ایک ہاتھ پاؤں میں ایک میخ ٹھونکتا، پھر اس پر ایک بہت بڑا پتھر پھینک مارتا جس سے اس کا سر پھٹ جاتا۔[5] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ فرعون کے پاس مطال و ملاعب تھے جن سے وہ کھیلتا تھا، ان کے نیچے میخیں اور رسیاں تھیں۔ امام ابو رافع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرعون کو صاحبِ اوتاد اس لیے کہا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو چار میخیں ٹھونکی تھیں، پھر اُن کے اوپر ایک بڑی چکی رکھی تھی جس سے وہ مر گئی۔[6]

طغیان سے مراد سرکشی و سرتابی ہے۔ فساد سے مراد لوگوں کو کوڑے سے ایذا دینا ہے، عذاب کا آسمان سے

---

[1] تفسير ابن كثير (٤/٦٥٥) [2] تفسير الطبري (٢٤/٤٠٨) [3] رقم الآية (٦٥)
[4] تفسير الطبري (٢٤/٤٠٩) تفسير ابن كثير (٤/٦٥٦) [5] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٢٦) [6] تفسير ابن كثير (٤/٦٥١_٦٥٧)

اتارنا ہے اور سزا دینا ہے۔ اللہ کا تاک میں ہونا یہ ہے کہ وہ خلق کے عمل دیکھتا ہے، ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا۔ ساری مخلوق اس پر پیش کی جائے گی، ان کے انصاف کی راہ سے حکم دے گا جو شخص جس بات کا مستحق ہے وہی اس کے سامنے آئے گی۔ اللہ تعالیٰ ظلم اور جور وستم سے پاک ہے۔ اس جگہ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ایک حدیث غریب ذکر کی ہے لیکن اس کی اسناد میں نظر اور صحت میں کلام کیا گیا ہے،[1] اس لیے اس کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی قسم کھائی ہے جس طرح کہ مخلوقات کی قسم کھائی ہے۔ فجر میں اختلاف ہے کہ اس سے وقتِ معروف مراد ہے یا پہلی محرم کی فجر یا یومِ نحر کی فجر یا ذی الحجہ کی فجر مراد ہے۔ لیالی عشر سے مراد ذی الحجہ کا عشرۂ اول ہے، یا محرم کے پہلے دس دن ہیں، کیوں کہ وہ سال کی صبح ہے۔ محرم میں صوم کی فضیلت کے بارے میں حدیثیں آئی ہیں، لیکن ان میں اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ مہینہ محرم کا مراد ہو۔ اسی طرح ذی الحجہ کے عشرے کی فضیلت کے بارے میں احادیث ہیں اور عشرۂ اخیرۂ رمضان کے بارے میں مگر کسی میں اس کی دلیل نہیں کہ مراد یہ عشرات ہیں۔

لفظ شفع و وتر تمام اشیاء کو شامل ہے، جیسے: کفر ‑ ایمان، طاعت وعصیان، ہدایت و گمراہی، نیک بختی و بدبختی، رات اور دن یا مراد جفت اور طاق راتیں ہیں۔ یا آدم وحوا ہیں، کیوں کہ آدم علیہ السلام وتر تھے، پھر حوا علیہا السلام سے شفع ہو گئے۔ یہ شفع درجاتِ جنت ہیں، کیوں کہ جنات آٹھ ہیں اور وتر آگ کے طبقات ہیں، کیوں کہ دوزخ سات ہیں یا شفع صفا ومروہ ہے اور وتر کعبہ مکرمہ ہے یا شفع ایام لیالی ہیں اور وتر وہ دن جس کی رات نہیں ہے، یعنی قیامت کا دن یا شفع و وتر اللہ پاک ہے شفع اس طرح پر کہ اس نے فرمایا ہے: ﴿مَا يَكُونُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ﴾ [المجادلۃ: ۷] ”تین لوگوں کی سرگوشی نہیں ہوتی مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے۔“

یا شفع مسجدِ مکہ و مدینہ ہے اور وتر بیت المقدس یا شفع حجِ قِران اور وتر حجِ مفرد یا شفع حیوان ہے کہ نر اور مادہ ہوتا ہے اور وتر جماد۔ لیکن ان اقوال میں سقوط ہیں اور ضعف ظاہر ہے اور صرف رائے زائف اور خاطی (خطا کار) کے خیالات پر گویا بھروسا کرنا ہے۔ اعتماد کے لائق یہ بات ہے کہ جس چیز پر عرب زبان میں شفع اور وتر کا اطلاق ہوتا ہے وہی معنی متعین ہیں۔ عرب کے نزدیک شفع جفت کو اور وتر طاق کو کہتے ہیں۔ آیت سے مراد یا تو صرف عدد مراد ہے یا جس پر معدود صادق آئے۔ جب اس آیت کی تفسیر میں کسی معدود کی تعیین پر دلیل قائم ہو تو پھر وہی مراد ہو گا اور اگر دلیل تناول پر ہے تو پھر کوئی تناول غیر سے بھی مانع نہیں ہے۔ سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٦٥١۔٦٥٧)

ہے کہ شفع و وتر نماز ہے کوئی جفت ہے کوئی طاق۔[1] (رواه أحمد والترمذي واستغفر به) لیکن وقف اس کا اشبہ ہے۔

"یسیر" کے معنی یہ ہیں کہ رات کو راہ چلتے ہیں۔ مراد رات کا آنا ہے۔ کیا ان قسموں میں عقل مند کے لیے مقنع نہیں ہے، یعنی تسلی نہیں ہے؟ یعنی یہ اشیاء قسم کھانے کے لائق ہیں اور اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴾ [الواقعة: ٧٦] "اور اگر تمھیں علم ہو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔" امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ حِجْرٍ ﴾ بہ معنی حلم ہے۔ امام ابو مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی "ستر من الناس" ہے۔[2] جمہور نے کہا ہے کہ بہ معنی عقل ہے۔ ان سب معانی کا مرجع ایک ہی طرف ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے عاد کا ذکر کیا۔ عاد سے مراد اُن کے باپ کا نام ہے اور ارم قبیلے کا نام ہے۔ یہ عادِ اولیٰ تھے۔ ان کے بعد عادِ اخریٰ ہوئے۔ اس جگہ رویت سے مراد رویتِ قلب ہے اور خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے، یا ہر اس شخص کو جس کے لیے خطاب مناسب ہے۔

عاد و ثمود کا قصہ عرب میں مشہور تھا، اس لیے کہ ان کے دیار عرب کے دیار سے متصل تھے اور اہلِ کتاب سے فرعون کا حال سنا تھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اِرَمَ ﴾ ایک امت تھی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قومِ عاد کا ایک قبیلہ تھا[3] یا وہ دو عاد تھے: ایک عادِ اولیٰ ان کو ﴿ اِرَمَ ﴾ کہتے تھے۔ دوسرا عاد و ثمود یہ دونوں ﴿ اِرَمَ ﴾ کی طرف منسوب ہیں۔ ﴿ ذَاتِ الْعِمَادِ ﴾ سے مراد صاحبِ قوت و شوکت و شدت ہے۔ وہ لوگ ربیع میں سیر کرتے۔ جب روئیدگی ہوتی تو اپنے گھروں میں آ جاتے یا عماد سے مراد طول ہے، کیوں کہ ان میں سے ہر شخص بارہ گز لمبا ہوتا ہے، دراز قد مرد کو طویل العماد کہتے ہیں۔ یا بہ معنی سید ہے۔ قوم کے سید (سردار) کو عمید و عمودِ قوم بولتے ہیں۔ یا مراد یہ ہے کہ ان کے گھر محکم ستون کے تھے یا مراد بلند عمارت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ دمشق تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ اسکندریہ۔ کچھ بھی ہو اللہ تعالیٰ نے تو یہ فرمایا کہ اس جیسا بلاد میں کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ یہ عاد کی صفت ہے طول اور شدت اور قوت میں۔ یا یہ اس شہر کی صفت ہے لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت بھی اسی پر دلیل ہے یعنی "لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهُمْ فِي الْبِلَادِ"۔ یا لفظ ﴿ اِرَمَ ﴾ بہ معنی ہلاکت ہے، یعنی اللہ نے ان کو ہلاک کر کے "رمیم" (گلی سڑی ہڈیوں) کی طرح کر دیا۔ شہر بن حوشب رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت نے ﴿ اِرَمَ ﴾ کو ایک عجیب و غریب شہر ٹھہرایا ہے اور عبداللہ بن قلابہ کا قصہ ذکر کیا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ خالص جھوٹ ہے جس کو ذرا سی بھی تمیز (پہچان) ہو گی اس پر یہ فقرہ ہرگز نہیں چلے گا اور قصۂ مذکور ایک دوسرا کذب بالائے کذب اور افترا بر افترا ہے۔ ان وضاعین (اپنی طرف سے باتیں گھڑنے والے)، کذابین اور دجالین کے ہاتھ سے اسلام اور اہلِ اسلام پر عجیب طرح کی مصیبتِ عظمیٰ اور فاقرہ (کمر توڑنے والی) اور کبریٰ (بڑی) آئی۔ کبھی بنی اسرائیل کے نام سے کوئی بات بنائی، کبھی انبیاء کی طرف کچھ

---

[1] سنن الترمذي (٣٣٤٢) مسند أحمد (٤/٤٣٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٢٥) [3] تفسير الطبري (٢٤/٤٠٤)

منسوب کر لیا، کبھی صلحاء پر افترا کیا اور کبھی خود رب العالمین پر کچھ بہتان باندھا۔

اس مصیبت پر ایک دوسری مصیبت یہ آئی کہ ایک بے علم جماعت نے جس کو صحیح اور ضعیف بلکہ موضوع روایت کے درمیان فرق کرنے کی تمیز نہیں ہے، اس نے ایسے ہذیانات اور خرافات کو تفسیر اور تصنیف میں ذکر کرنا شروع کر دیا اور یہ نہ جانا کہ ایسے تراشے ہوئے اور گھڑے ہوئے قصوں اور بناوٹی کہانیوں کو کتاب اللہ کی تفسیر میں لانا ایک طرح کی تبدیل و تحریف کرنا ہے۔ جس کو یہ منظور ہو کہ ایسے امور سے واقفیت حاصل کرے، وہ امام شوکانی رحمہ اللہ کی کتاب ''فوائد مجموعہ'' کی طرف رجوع کرے۔[1] ابن خلدون نے ''تاریخ عبر'' میں قصہ ارم کو مفسرین و مورخین کے اوہام اور اغلاط میں سے قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ امام طبری، ثعالبی اور زمخشری رحمہم اللہ اس قصے کو بیان کرنے والے ہیں۔ پھر اس ہذیان کی انتہا یہاں تک پہنچی کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس شہر کے بارے میں ہر کسی کو اطلاع نہیں ہوتی ہے، صرف اہلِ ریاضت اور سحر ہی اس پر مطلع ہوتے ہیں۔ وَهَذِهِ مَزَاعِمُ كُلُّهَا أَشْبَهُ بِالْخُرَافَاتِ.[2] انتھی.

میں کہتا ہوں کہ یہ قصہ مختلفہ ویسا ہی ہے، جیسے کہ اہلِ قصہ نے کتبِ مقدس میں عجیب و غریب طلسمات کا حال لکھا ہے۔ قصہ امیر حمزہ و بوستانِ خیال اس مقال کے شاہد ہیں۔ ونحوها من الحكايات الواهية التي ينزه كتاب الله تعالىٰ عن مثلها.

اس قصے کو صاحبِ تفسیر فتح العزیز نے بھی مفسرین کی تقلید کرتے ہوئے بروایت ابن قلابہ نقل کیا ہے۔ دل کو اس ذکر سے قلق ہے، اس لیے کہ ہمارے ذہن ناقص ہیں ان کا مرتبہ اس سے زیادہ ہے کہ وہ اس طرح کی بے اصل بات کو اپنی کتاب میں نقل کریں اور ان کو اس کے موضوع اور لا اصل لہ ہونے کا علم حاصل نہ ہو اور اگر حاصل ہوتا تو اور بھی زیادہ ملال کا مقام ہے۔

فَإِنْ كُنتَ لَا تَدْرِيْ فَتِلْكَ مُصِيبَةٌ وَإِنْ كُنتَ تَدْرِيْ فَالْمُصِيبَةُ أَعْظَمُ

ثمود صالح علیہ السلام کی قوم کا نام ہے، وہ اپنے دادا ثمود بن عامر بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام کے نام پر نامزد ہوئے۔ یہ لوگ ایسے زبردست کاریگر تھے کہ پہاڑوں میں پتھر تراش کر گھر بناتے تھے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ انھوں نے اسی طرح پتھر سے ایک ہزار سات سو شہر بنائے تھے۔ پہاڑوں کو اندر سے خالی کر کے محل و حویلی تیار کرتے اور ان میں رہتے بستے۔ وادی سے مراد وادی القریٰ ہے۔ یہ جگہ شام کی طرف سے مدینے کے نزدیک ہے۔ یا پہاڑوں کے درمیان ہے۔ فرعون کا لشکر صاحبِ خیام تھا، وہ ان کو میخوں سے کھڑا کرتے، یا میخوں سے لوگوں کو عذاب دیتا۔ یہ لشکر والے سخت سرکش تھے۔ یعنی شہروں میں اپنے کفر و معاصی سے فساد کرتے پھرتے تھے، اللہ نے ان کو عذاب کا کوڑا مارا۔ عاد تیز ہوا سے ہلاک ہوئے اور ثمود صیحہ سے اور فرعون اور اس کی قوم غرق ہونے سے ہلاک ہوئے۔ ہر کسی کو

[1] فتح القدير (٥/٥٨١). [2] فتح البيان (١٥/٢٢٢، ٢٢٣)

اس کے گناہ میں پکڑ لیا۔ ﴿ سَوْطَ ﴾ کا ذکر یعنی کوڑے کا ذکر اس لیے کیا کہ دنیا کا یہ عذاب آخرت کے عذاب کے مقابلے میں اتنا ذرا سا ہے، جیسا ایک بڑے عذاب کے مقابلے کوڑا ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور تاویل بھی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہم ہر انسان کے عمل کو تاکتے ہیں، اسے خیر اور شر کی خبر دیں گے۔[1]

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ۬ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ ۙ۬ فَيَقُوْلُ رَبِّيْۤ اَهَانَنِ ﴿۱۶﴾ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ﴿۱۷﴾ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۱۸﴾ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ﴿۲۰﴾

لیکن انسان جو ہے، جب اس کا رب اسے آزمائے اور اسے عزت اور نعمت دے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت بخشی (15) مگر جب وہ اسے آزمائے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا (16) ہرگز نہیں! بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے (17) اور باہم مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے (18) اور تم میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو (19) اور تم مال سے جی بھر کر پیار کرتے ہو (20)

مال ودولت اور فقر وفاقہ ایک آزمائش:

اللہ تعالیٰ نے انسان پر اس کے اعتقاد کا انکار کیا ہے کہ جب اللہ اس پر رزق کی توسیع کرتا ہے، تاکہ اس کا امتحان لے تو وہ اعتقاد کرتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے اس کا اکرام (عزت) ہے، حالاں کہ یہ بات نہیں بلکہ آزمائش اور امتحان ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۵۵﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ٥٥- ٥٦] ”کیا یہ (یوں) سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم جو بھی ان کے مال واولاد بڑھا رہے ہیں وہ ان کے لیے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں (نہیں نہیں) بلکہ یہ سمجھتے ہی نہیں۔“ اسی طرح دوسری جانب کا حال ہے کہ جب اللہ انسان کو مبتلا کرتا ہے (آزمائش میں ڈالتا ہے) اور امتحان فرماتا ہے تو وہ اعتقاد رکھتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے اس کی اہانت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے جس طرح کہ اس نے اعتقاد کیا، بلکہ اللہ مال اس کو دیتا ہے جس کو دوست رکھتا ہے اور جس کو دوست نہیں رکھتا۔ اسی طرح رزق کی تنگی بھی دوست اور غیر دوست پر کرتا ہے۔ اس جگہ امر کا دار و مدار اللہ کی اطاعت پر ہے، دونوں حالتوں میں اگر غنی ہو تو اللہ کا شکر بجا لائے اور اگر فقیر ہو تو صبر کرے۔

---

[1] فتح البیان (١٥/ ٢١٣_٢٢٦)

پھر اکرام یتیم کی طرف اشارہ کیا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ مسلمان کا بہتر گھر وہ ہے جس میں کوئی یتیم ہو جس کے ساتھ احسان کیا جائے اور مسلمانوں کا بدتر گھر وہ ہے جس میں یتیم کے ساتھ برائی کی جائے۔ پھر انگلی سے اشارہ کر کے فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح پر ہوں گے۔[1] (رواه عبد الله بن المبارك)۔ سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہما رفعاً کہتے ہیں کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح ہوں گے اور وسطیٰ اور ابہام (درمیانی انگلی اور انگوٹھے) کو ملایا۔[2] (رواه أبو داود) پھر فقراء اور مساکین کے ساتھ احسان نہیں کرتے اور نہ ایک دوسرے کو اس بات کی تاکید کرتے ہیں، بلکہ میراث کے کھانے پر جھکے ہوئے ہیں، کسی طرح سے بھی ہاتھ آئے وہ ذریعہ حلال ہو یا حرام اور مال کے بڑے دوست ہیں۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ جب اللہ پاک کسی آدمی کا امتحان لیتا ہے اور اس کو بہت زیادہ مال اور وسیع رزق دیتا ہے تو وہ بہت خوش ہو جاتا ہے اور اللہ کا شکر بجا نہیں لاتا اور اس کے دل میں یہ خیال تک بھی نہیں گزرتا کہ یہ مال اور رزق میرے استحقاق کے سبب سے ملا ہے، میں اسی لائق تھا کہ مجھ کو یہ نعمت ملتی۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد کافر انسان ہے، یعنی ابی بن خلف۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اُمیہ بن خلف کے بارے میں اتری ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت عتبہ بن ربیعہ اور ابو حذیفہ بن مغیرہ کے حق میں اتری ہے۔[3] لیکن اعتبار عمومیتِ لفظ کا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ اسی طرح جب اللہ کسی شخص کا امتحان فقر و فاقہ سے لیتا ہے اور اس پر رزق اور مال کی فراوانی نہیں کرتا تو وہ سمجھتا ہے کہ میں اللہ کے نزدیک ذلیل و خوار ہوں جبھی تو اس نے مجھ کو اس حال میں گرفتار کر رکھا ہے۔ حالاں کہ یہ امتحان ہے نہ کہ اہانت۔

یہ صفت بھی کافر کی ہے جو بعث پر ایمان نہیں لایا، کیوں کہ اس کے نزدیک دنیا کے سوا اور کوئی کرامت نہیں ہے، اسی مال و متاع کی فراوانی کو وہ عزت سمجھتا ہے اور مال و رزق کی تنگی کو اہانت سمجھتا ہے اور دنیا کی زینت کے حاصل نہ ہونے کو اپنی بے عزتی خیال کرتا ہے۔ برخلاف مومن کے کہ اس کے نزدیک ساری عزت یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت اور آخرت کے لیے عمل کی توفیق ملی اور احتمال ہے کہ انسان سے مراد علی العموم ہو، اس لیے کہ اس کو اس بات کا تیقظ (اس کی آنکھیں کھلی) نہیں کہ دنیا میں اس خیر و شر کا لاحق ہونا کچھ عزت اور بے عزتی سے متعلق نہیں

[1] سنن ابن ماجه (٣٦٧٩) الأدب المفرد (٦١/١) الزهد لابن المبارك (٢٣٠/١) اس کی سند میں "يحيى بن سليمان" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٦٣٧) البتہ حدیث کا آخری جملہ (میں اور یتیم کی کفالت .... ہوں گے۔) صحیح ہے جیسا کہ اگلی روایت میں ہے۔

[2] صحيح البخاري (٥٦٥٩) صحيح مسلم (٢٩٨٣) سنن أبي داود (٥١٥٠) [3] فتح القدير (٥٨٦/٥)

ہے، بلکہ اللہ کی طرف سے امتحان اور اختبار ہے، کیوں کہ اگر دنیا اللہ کے نزدیک مچھر کے ایک پر کے برابر بھی وقعت رکھتی تو اللہ تعالیٰ دنیا میں کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا، بلکہ یہ تو اس کی طرف سے ایک آزمائش ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ﴾ [الأنبياء: ٣٥] ''ہم بہ طریقِ امتحان تم میں سے ہر ایک کو برائی بھلائی میں مبتلا کرتے ہیں۔''

پھر یتیم کے اکرام اور مساکین کو کھانا کھلانے کا حکم دیا، پھر میراث کا ذکر کیا، اس سے مراد قریبی یتیموں کا مال ہے، اسی طرح عورتوں کا مال ہے، کیوں کہ وہ لوگ عورتوں اور بچوں کا مال کھا جاتے تھے۔ وارثوں کو اس میں سے کچھ نہ دیتے تھے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اپنا اور یتیم کا حصہ کھا لیتے ہیں۔ یہی قول امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ کا ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اپنا مال کھا چکتے تو دوسرے کے مال پر جھکتے۔ خبیث وطیب کی کچھ فکر نہ کرتے،[1] حالاں کہ ان کے نزدیک وراثت کا حکم اسماعیل علیہ السلام کی شریعت کے باقی ماندہ احکام میں موجودہ تھا یا انھیں بہ طریقِ عادت معلوم تھا۔ تو اب یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ یہ سورت مکی ہے اور وراثت کے بارے میں آیت مدنی ہے اور حلال و حرام کا علم شرع ہی سے معلوم ہو سکتا تھا۔ پھر فرمایا کہ ان کو مال کی محبت بے حد ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ مال کے ساتھ شدید الحب ہیں۔[2]

كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ
صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾ وَجِايْٓءَ يَوْمَئِذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَئِذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ
وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ﴿٢٣﴾ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴿٢٤﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا
يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٢٥﴾ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ ﴿٢٦﴾ يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ
الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ
عِبٰدِيْ ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿٣٠﴾

ہرگز نہیں! جب زمین خوب کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی (21) اور آپ کا رب اور فرشتے صف در صف آئیں گے (22) اور اس دن جہنم (سامنے) لائی جائے گی، اس دن انسان (اپنے کرتوت) یاد کرے گا اور یہ یاد کرنا اس کے لیے کیونکر (مفید) ہو گا (23) وہ کہے گا: کاش! میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ آگے بھیجا ہوتا (24) چنانچہ اس دن اس جیسا عذاب دینے والا اور

[1] تفسير القرطبي (٢٠/٥٣) [2] تفسير الطبري (٢٤/٤١٦) فتح البيان (١٥/٢٢٦-٢٢٩)

کوئی نہیں ہو گا㉕ اور اس جیسا جکڑنے والا بھی اور کوئی نہیں ہو گا㉖ اے مطمئن روح!㉗ تو اپنے رب کی طرف چل اس حال میں کہ تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی㉘ پھر تو میرے بندوں میں داخل ہو جا㉙ اور میری جنت میں داخل ہو جا㉚

روزِ قیامت ہر ایک کو پوری جزا وسزا ملے گی:

اللہ تعالیٰ نے اس جگہ قیامت کے واقعات اور عظیم ہولناکیوں کی خبر دی ہے کہ اس دن زمین پامال کر دی جائے گی اور کوٹ کوٹ کر برابر کر دی جائے گی۔ پہاڑ وغیرہ کچھ نہ ہوں گے۔ تمام مخلوق اپنی قبروں سے نکل کر رب تعالیٰ کے سامنے جائے گی، تمام معاملوں کے فیصلے کے لیے اللہ تعالیٰ مخلوق کے درمیان آئے گا۔ اللہ کا یہ آنا اس کے بعد ہو گا کہ لوگ بنی آدم کے سردار محمد ﷺ سے شفاعت کرنے کے لیے کہیں گے اور سارے انبیائے اولوا العزم سے یکے بعد دیگرے سفارش کا سوال کر چکے ہوں گے اور ہر ایک نے یہ جواب دے دیا ہو گا: «لَسْتُ بِصَاحِبِ ذَاكُمْ» یہاں تک کہ نوبت سید الانبیاء کی آئے گی اور آپ ﷺ فرمائیں گے کہ «أَنَا لَهَا أَنَا لَهَا» پھر اس وقت رب العالمین کے پاس جا کر شفاعت فرمائیں گے، تب اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے گا معاملات کا فیصلہ کرنے کے لیے آئے گا اور فرشتے اس کے سامنے صف باندھ باندھ کر آئیں گے اور جہنم لا کر حاضر کریں گے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اس دن جہنم لائی جائے گی اس کی ستر ہزار باگیں ہوں گی، ہر باگ کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے جو اس کو کھینچتے ہوں گے۔[1] (رواہ مسلم والترمذي وعبد بن حميد وابن جرير بطرق وأسانيد)۔ اس وقت انسان اپنے عمل کو یاد کرے گا جو زمانۂ قدیم و جدید میں کر چکا ہے، لیکن یہ یاد کرنا کسی کام نہ آئے گا۔ اپنے معاصی پر نادم ہو گا اور تمنا کرے گا کہ کاش میں نے اپنی اس زندگی کے لیے کچھ آگے بھیجا ہوتا۔ گناہ گار کو گناہوں پر پشیمانی ہو گی اور اطاعت گزار کو اس بات پر پشیمانی ہو گی کہ زیادہ طاعات کی ہوتیں۔ محمد بن ابی عمیرہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی بندہ اپنے پیدا ہونے کے دن سے مرنے تک اپنے منہ کے بل اللہ کی طاعت پر پڑا رہے تو بھی قیامت کے دن وہ اس طاعت کو حقیر جانے گا اور تمنا کرے گا کہ کاش! میں پھر دنیا میں واپس جاؤں تا کہ اجر و ثواب زیادہ پاؤں۔ (رواہ أحمد)

پھر فرمایا: کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے گناہ گاروں سے زیادہ عذاب اور قید و بند میں گرفتار نہیں ہو گا۔ عذاب سے مراد آگ ہے یہ انجام ہے مجرمین کا جو ظالم و فاجر تھے۔ رہا نفسِ زکیہ مطمئنہ اور یہ وہ نفس ہے کہ حق کے ساتھ ساکن قائم اور ثابت رہتا ہے۔ چنانچہ اس سے یہ بات کہی جائے گی کہ اے اطمینان والے نفس! تو اپنے رب کی ہمسائیگی

---

① صحيح مسلم (٢٨٤٢) سنن الترمذي (٢٥٧٣)

اور ثواب میں آ جا اور جو کچھ تیرے لیے جنت میں تیار کر رکھا ہے اس کو لے لے۔ تو اللہ سے خوش ہے اور اللہ تجھ سے راضی ہے تو میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری بہشت میں آسایش کر۔ یہ بات اس سے موت کے وقت کہی جاتی ہے اور قیامت میں بھی کہی جائے گی۔ جس طرح فرشتے مومن کو موت کے وقت اور قبر سے اٹھنے کے وقت یہ بشارت دیتے ہیں، اسی طرح اس جگہ بھی دیں گے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں اتری ہے۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کے حق میں اتری ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ رجوع الی الرب سے مراد بدن کی طرف رجوع ہے جس کو دنیا میں طاعت سے آباد رکھتا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ فِيْ عِبٰدِيْ ﴾ کے بجائے "فِيْ عَبْدِيْ" پڑھا ہے۔ امام عکرمہ اور کلبی رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔[2] لیکن یہ قراءت غریب ہے اور زیادہ ظاہر وہی پہلا قول ہے، اللہ تعالیٰ کے اس قول کی دلیل سے: ﴿ ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ﴾ [الأنعام: ٦٢] "پھر سب اپنے مالکِ حقیقی کے پاس لائے جائیں گے۔" اور اس قول کی دلیل سے: ﴿ وَاَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [المؤمن: ٤٣] "اور یہ (بھی یقینی بات ہے) کہ ہم سب کا لوٹنا اللہ کی طرف ہے۔" یعنی ہمارا انجام اللہ کے حکم کی طرف ہے، ہم کو اس کے سامنے کھڑا ہونا ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں جب یہ آیت باب اتری تو ابو بکر رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! "مَا أَحْسَنَ هٰذَا؟" "یہ کتنی اچھی ہے۔" فرمایا: « أَمَا إِنَّهُ سَيُقَالُ لَكَ هٰذَا عِنْدَ الْمَوْتِ »[3] (رواه بن أبي حاتم۔ وهذا مرسل حسن) "خبردار! موت کے وقت تجھے یہ کہا جائے گا۔" امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا انتقال طائف میں ہوا، کچھ پرندے آئے کہ ان سے زیادہ اعلیٰ پیدایش میں کبھی نہ دیکھے گئے تھے، ایک پرندہ ان کی نعش میں گھس گیا، پھر باہر نہ نکلا، جب ان کو دفن کیا تو یہ آیت قبر کے کنارے پر پڑھی گئی اور اس کا پڑھنے والا معلوم نہ ہوا۔[4] (رواه ابن أبي حاتم والطبراني)

حکایت:

حافظ محمد بن منذر ہروی معروف بہ شکر نے اپنی کتاب "عجائب" میں اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ قباث ابن رزین ابو ہاشم نے کہا ہے کہ میں بلادِ روم میں قید ہو گیا۔ بادشاہ نے ہم کو جمع کر کے اپنا دین پیش کیا اور یہ کہا کہ جو میرے دین سے باز رہے گا اس کی گردن ماری جائے گی۔ تین شخص مرتد ہو گئے، چوتھے نے انکار کیا، اس کی گردن مار کر سر کو اس نہر میں ڈال دیا جو اس جگہ بہتی تھی، وہ پانی میں تھم کر زمین پر آ گیا اور ان تینوں آدمیوں کا نام لے لے کر پکار کر کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے: ﴿ يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ﴿۲۷﴾ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٣٠) [2] تفسیر الطبري (٢٤/٤٣٦)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٢٩، ٣٤٣٠) [4] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٣١) المعجم الكبير (١٠/٢٣٦)

مَّرْضِيَّةً ﴿28﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿29﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴾ پھر پانی میں غوطہ لگایا۔ قریب تھا کہ نصاریٰ ایمان لے آئیں بادشاہ کا تخت اٹھالیا اور وہ تینوں شخص پھر مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد خلیفہ ابو جعفر منصور کی طرف سے فدیہ آیا اس پر ہم کو چھوڑ دیا۔[1] سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو کہا: کہہ! "اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ نَفْسًا بِكَ مُطْمَئِنَّةً تُؤْمِنُ بِلِقَائِكَ وَتَرْضَى بِقَضَائِكَ وَتَقْنَعُ بِعَطَائِكَ"[2] (رواه ابن عساكر) "اے اللہ! میں تجھ سے مطمئن دل کا سوال کرتا ہوں جو تیری ملاقات پر ایمان لائے، تیرے فیصلے پر راضی ہو اور تیری عنایت پر قناعت کرے۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ "دک" و "دق" کے ایک معنی ہیں۔ مراد زمین کا تزلزل و تحرک ہے تحریک کے بعد۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہاڑوں کو ٹھونک ٹھانک کر برابر کر دیں گے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی اونچائی جاتی رہے گی۔[3] مطلب یہ ٹھہرا کہ زمین بار بار مدکوک ہوگی اور اللہ تعالیٰ آئے گا، یعنی اس کا حکم اور فیصلہ صادر ہوگا، یا آیات ظاہر ہوں گے یا شبہہ دور ہو کر ساری پہچاننے کی چیزیں ظاہر ہو جائیں گی جس طرح کسی مشکوک چیز کے آنے سے شک زائل ہو جاتا ہے، کسی طرح کا دھوکا باقی نہیں رہتا۔ "لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ" "خبر معائنے کی طرح نہیں ہوتی۔" یا اللہ کا قہر و سلطان اور انفراد بالامر (یعنی اکیلے اسی کا حکم) آئے گا۔ تدبیر میں کسی بندے کو کچھ دخل نہ ہوگا، یا مراد حساب اور جزا کا آنا ہے۔

حق یہ ہے کہ یہ آیت من جملہ آیاتِ صفات کے ہے جس کی کیفیت کے بیان سے سلفِ امت و ائمہ ملت اور راسخینِ خلف خاموش ہیں۔ کسی نے اس میں کچھ کلام نہیں کیا، بلکہ جس طرح پر یہ صفت آئی ہے، اسی طرح بغیر کیفیت و تشبیہ و تاویل و تحریف و تعطیل کے اس کو جاری رکھا اور یہ کہا کہ ہم کو اس صفت پر ایمان لانا اور اس کو جوں کا توں جاری رکھنا واجب اور لازم ہے۔ تاویل کرنا اہلِ کلام اور بعد والے لوگوں کی عادت ہے۔ یہ طریقہ جمہور سلف صالحین کے شیوے کے خلاف ہے۔ اس دن فرشتوں کی صفتیں بندھیں گی ہر آسمان کے ملائکہ علاحدہ علاحدہ ایک ایک صف ہوں گے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر آسمان والے قیامت کے دن صفیں باندھ کر اتریں گے، زمین کو ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ یہ سب سات صفیں ہوں گی۔[4] جہنم لائی جائے گی اور عرش کے بائیں جانب رکھی جائے گی۔ اس وقت کوئی فرشتہ مقرب اور نبی مرسل نہ ہوگا مگر گھٹنوں کے بل ہو کر "نفسي نفسي" کہے گا۔ اس کو مفسرین کی ایک جماعت نے نقل کیا ہے اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی اوپر گزر چکا ہے۔[5] اس بنیاد پر آیت

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٦٥٩/٤)

[2] المعجم الکبیر (٩٩/٨) تاریخ دمشق (٨١/٣٥) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٠٦٠)

[3] فتح القدیر (٥٨٧/٥) [4] تفسیر البغوي (٤٢٢/٨) [5] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

اپنے ظاہر پر جاری وساری ہے، یعنی سچ مچ دوزخ اہلِ دوزخ کے لیے ظاہر سامنے موجود ہو گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغَاوِيْنَ ﴾ [الشعراء: ٩١] ''اور گمراہ لوگوں کے لیے جہنم ظاہر کر دی جائے گی۔'' لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے اس دن انسان اپنے کیے کو یاد کرے گا جو کچھ دنیا میں کفر اور نافرمانیاں کی تھیں، اس پر پشیمان ہو گا، لیکن اس وقت کا نادم ہونا کچھ کام نہ آئے گا۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ توبہ کرنے لگے گا لیکن وہاں توبہ کہاں![1] جو توبہ کرنے کی جگہ تھی وہاں تو توبہ کی نہیں، یا اگر کی تو اسے توڑ ڈالا اور انجام کار کا خیال نہ کیا اور اس دن سے کچھ ڈر نہ کیا۔ اب دیکھ بھال کر یہ کہے گا کہ کاش! میں اپنی اس زندگی کے لیے کوئی خیر اور عملِ صالح آگے بھیجتا تو آج کے دن کام آتا۔ اس جگہ حیات سے مراد حیاتِ آخرت ہے، کیوں کہ حقیقی حیات تو وہیں کی زندگی ہے نہ کہ اس جگہ کی۔ اس لیے کہ وہ دائمی نہ ختم ہونے والی ہے اور یہ فانی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد حیاتِ دنیاوی ہے، یعنی میں نے اس زندگانی میں آج کے لیے کوئی عملِ صالح کر لیا ہوتا تو کیا خوب بات ہوتی۔ لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ جس نے کہا واللہ! اس نے جان لیا کہ اب ایک ایسی لمبی زندگی ملی ہے کہ جس میں مرنا نہیں ہے۔

پھر اس دن جبکہ ایسا حال اور ہولناکی ہو گی، اس جیسا عذاب کوئی نہ کر سکے گا اور نہ اس کی طرح کوئی جکڑ بند کر سکے۔ یہ اس لیے کہ اللہ کے سوا کسی کا کچھ اختیار نہ رہے گا۔ اس جگہ انسان سے مراد کافر انسان ہے۔ یا ابلیس ہے۔ یا ابی بن خلف ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ اس کافر معین کی طرح کا عذاب کسی کو نہ ہو گا اور نہ ہی کوئی اس کی طرح زنجیروں میں جکڑا جائے گا اور اسے طوق پہنائے جائیں گے، اس لیے کہ وہ بھی کفر میں حد درجہ کو پہنچ گیا تھا۔[2] یا یہ مراد ہے کہ اس کی جگہ پر کسی اور کو عذاب نہ کریں گے اور نہ قید کریں گے کہ وہ فدیہ دے کر رہائی پائے اور چھوٹ جائے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ [الأنعام: ١٦٤] ''اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔''

عذاب بہ معنی تعذیب ہے اور وثاق بہ معنی توثیق۔ یہ تو بدبخت لوگوں کا ذکر تھا، اس کے بعد تقویٰ والے لوگوں کا ذکر کیا ہے کہ نفسِ مطمئنہ سے یہ بات کہی جائے گی کہ تو اپنے رب کے پاس راضی ہو کر آ۔ وہ بھی تجھ سے راضی ہے۔ یہ بات خود اللہ تعالیٰ کہے گا۔ اس میں مومن کا اکرام ہے جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام سے بات کی تھی۔ یا کہنے والا اس کو فرشتہ ہو گا اور یہ بات موت کے وقت یا بعث کے وقت یا جنت میں داخل ہونے کے وقت کہے گا۔ نفسِ مطمئنہ وہ ہے جو ایمان اور اللہ تعالیٰ کی توحید کے ساتھ ساکن اور یقین کرنے والا ہو اور ثلج (اطمینان) یقین تک پہنچ جائے، شک وشبہہ کا لگاؤ اور اس میں خلط ملط نہ ہو۔ حسن نے کہا ہے کہ ''هِيَ الْمُؤْمِنَةُ الْمُوْقِنَةُ''

---

[1] معاني القرآن (٥/٣٢٤) [2] تفسير القرطبي (٢٠/٥٦)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اللہ کے فیصلے پر راضی ہے، اس کو معلوم ہے کہ جو چیز اس سے چوک گئی، وہ اس کے نصیب میں نہ تھی اور جو آزمائش اسے پہنچی وہ ٹلنے والی نہ تھی۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد "آمنة مطمئنة" ہے۔ امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اللہ کے ذکر سے مطمئن ہے۔[1] کسی نے کہا ہے کہ رب کے ساتھ مخلص ہے۔ اس جگہ رب سے مراد اللہ ہے یا وعدے کا وقت یا اللہ کا امر یا جسد لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ قفال نے کہا ہے کہ یہ آیت اگرچہ ظاہر میں امر ہے، لیکن معنی میں خبر ہے۔ تقدیرِ عبارت یوں ہے کہ نفس جب مطمئن ہوتا ہے تو اس طمانیت کے سبب سے قیامت میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ نفس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نفس تھا۔[2] دوسرا قول یہ ہے کہ مطمئنہ سے مراد مصدقہ (تصدیق کرنے والا) ہے۔[3] تیسرا قول یہ ہے کہ اس کو جو ثواب ملا اس خوش ہے اور اپنے عمل پر راضی ہے۔[4] عباد سے مراد اہلِ ایمان ہیں، یعنی تو مومنین صالحین کے زمرے میں داخل ہو جا اور ان کی لڑی میں پرو دیا جا۔ اس سے ثابت ہوا کہ نفس بہ معنی ذات ہے اور روح کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے۔ جب دنیا میں جان جسم سے نکلنے کے قریب ہوتی ہے تو یہ بات اس وقت کہی جاتی ہے کہ میرے بندوں میں مل جا اور قیامت کو میری بہشت میں جانا۔ اس آیت سے مراد ہر وہ نفس ہے جو مطمئن ہوتا ہے علی العموم، کیوں کہ یہ سورت مکہ میں اتری ہے، اس کا کسی نفسِ معین کے حق میں نازل ہونا، کچھ عموم کے خلاف نہیں ہے، اس لیے کہ اعتبار عمومِ لفظ کا ہے نہ کہ سببِ خاص کا۔[5] وللہ الحمد.

---

[1] فتح القدير (٥/٥٨٩) [2] الدر المنثور (٨/٥١٤) [3] تفسير الطبري (٢٤/٤٢٣)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٣٠) [5] فتح البيان (١٥/٢٢٩_٢٣٣)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْبَلَدِ

اس سورت کو سورت لَآ أُقْسِمُ بھی کہتے ہیں۔ اس کی بیس (۲۰) آیتیں ہیں اور یہ بلا اختلاف مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم نے بھی یہی کہا ہے۔[1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ أُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۱ وَأَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝۲ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ۝۳ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ۝۴ أَيَحْسَبُ أَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ ۝۵ يَقُوْلُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا ۝۶ أَيَحْسَبُ أَنْ لَّمْ يَرَهٗ أَحَدٌ ۝۷ أَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۝۸ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ۝۹ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ۝۱۰

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر (مکہ) کی ① اور آپ کے لیے اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے ② اور قسم ہے والد (آدم) کی اور اس کی اولاد کی ③ بلاشبہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے ④ کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس پر کوئی بھی قابو نہ پا سکے گا؟ ⑤ وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال لٹا دیا ⑥ کیا وہ سمجھتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا؟ ⑦ کیا ہم نے اسے دو آنکھیں نہیں دیں؟ ⑧ اور زبان اور دو ہونٹ؟ ⑨ اور ہم نے اسے دونوں راستے سمجھا دیے ⑩

حرمتِ مکہ اور دیگر چیزوں کی قسم:

مکہ میں لڑائی کی ممانعت ہے ہر شخص کو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کے دن اس کی اجازت دی گئی تھی، جو کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑا آپ نے اس کو مارا۔ فتح کے بعد پھر وہی ممانعت کا حکم قیامت تک قائم ہے۔ پھر فرمایا کہ شادیوں اور

[1] الدر المنثور (٥١٦/٨)

ماتموں سے اور نام ونمود کی جگہوں میں مال خرچ کرنے کو بڑائی گنتا ہے حالاں کہ خرچ کرنے کی جگہ اور ہے۔ انتہی۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے مکہ کی قسم کھائی۔ مکہ ام القریٰ ہے، تاکہ جو کوئی اس میں ساکن ہے یا آیا ہوا ہے، وہ مکہ کی عظمت کی وجہ سے حالتِ احرام میں آگاہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مجھے قسم ہے اس مکہ کی! اور اے محمد! تجھ کو وہاں مقاتلہ کرنا حلال ہے۔ یہی قول امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ، ابو صالح، عطیہ، ضحاک، قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ کا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی جو کچھ وہاں تیرے ہاتھ آئے وہ تجھ کو حلال ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تجھ کو وہاں پر کچھ حرج اور گناہ نہیں ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دن ایک ساعت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وہاں جائز کر دیا تھا۔[1]

یہی مضمون متفق علیہ صحیح حدیث میں بھی رفعاً مروی ہے کہ اس شہر کو اللہ پاک نے اس وقت سے حرام کیا ہے جب سے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اس لیے وہ اللہ پاک کے حرام کرنے کے وقت سے لے کر قیامت تک کے لیے حرام ہے نہ وہاں کا درخت کاٹا جائے نہ کانٹا توڑا جائے۔ میرے لیے دن کی ایک ساعت کے لیے حلال کیا گیا، اس کے بعد اس کی حرمت بدستور پھر آئی، جیسے کہ اس ساعت سے پہلے تھی۔ اب چاہیے کہ حاضر آدمی یہ بات غائب آدمی کو پہنچا دے۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتال کرنے کو اپنے لیے رخصت پکڑے تو تم یہ کہو کہ اللہ نے اپنے رسول کو یہ حکم دیا تھا تم کو یہ حکم نہیں دیا ہے کہ تم اس میں جنگ کرو۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ وَالِدٍ ﴾ سے مراد وہ ہے جو جنتا ہے اور ﴿ وَمَا وَلَدَ ﴾ سے مراد وہ ہے جو نہیں جنتا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَالِدٍ ﴾ سے مراد عاقر (بانجھ) ہے اور ﴿ مَا وَلَدَ ﴾ سے جننے والا۔ امام مجاہد، ابو صالح، قتادہ، ضحاک، سفیان ثوری، سعید بن جبیر، سدی، حسن بصری، خصیف اور شرجیل رحمہم اللہ وغیرہم کہتے ہیں کہ ﴿ وَالِدٍ ﴾ آدم ہیں اور ﴿ مَا وَلَدَ ﴾ ان کی اولاد۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول حسن قوی ہے، اس لیے کہ جب اللہ پاک نے ام القریٰ کی قسم کھائی اور یہ ام مساکن ہے تو بعد اس کے مساکن کی قسم کھائی، وہ آدم علیہ السلام ابو البشر اور ان کی اولاد ہے۔[3] ابو عمران جونی کہتے ہیں کہ مراد ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ بات اختیار کی ہے کہ یہ کلمہ ہر والد اور ولد کے حق میں عام ہے، سو اس کا بھی احتمال ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام عکرمہ، مجاہد، ابراہیم نخعی، خثیمہ اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم کا قول یہ ہے کہ ﴿ كَبَدٍ ﴾ سے مراد سیدھا کھڑا آدمی ہے۔[4] یعنی ماں کے پیٹ میں منتصب (قائم ہونے والا) ہوتا ہے۔

﴿ كَبَدٍ ﴾ استوا و استقامت کو کہتے ہیں، گویا یہ معنی ہوئے کہ "لَقَدْ خَلَقْنَا سَوِيًّا مُنْتَصِبًا" جیسا کہ

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٣٢) تفسير الطبري (٢٤/٤٣٠، ٤٣١) (2) صحيح البخاري (١٠٤) صحيح مسلم (١٣٥٤)

(3) تفسير الطبري (٢٤/٤٣١_٤٣٣) تفسير ابن كثير (٤/٦٦٠) (4) تفسير الطبري (٢٤/٤٣٣_٤٣٥)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ الَّذِىْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِىْٓ اَىِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ﴾ [الانفطار: ۷- ۸] ’’جس (رب نے) تجھے پیدا کیا، پھر ٹھیک ٹھاک کیا، پھر (درست اور) برابر بنایا جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔‘‘ نیز جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴾ [التين: ٤] ’’یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا۔‘‘ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ ﴿ كَبَدٍ ﴾ سے مراد شدتِ خلق ہے، جیسے: پیدا ہونا، دانت نکلنا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلے نطفہ تھا، پھر علقہ ہوا، پھر مضغہ، محنت اٹھاتا ہے پیدا ہونے میں اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق ہے: ﴿ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا ﴾ [الأحقاف: ١٥] ’’اس کی ماں نے اسے تکلیف جھیل کر پیٹ میں رکھا اور تکلیف برداشت کر کے اسے جنا۔‘‘ ’’وَأَرْضَعَتْهُ كُرْهًا وَمَعِيْشَتُهُ كُرْهٌ‘‘ غرضیکہ وہ یہ مشقتیں اٹھاتا ہے۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: یعنی شدت اور طلبِ معیشت میں رہتا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شدت وطول میں پیدا ہوا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشقت میں پیدا ہوا ہے۔ ایک انصاری سے پوچھا تھا کہ ﴿ كَبَدٍ ﴾ سے کیا مراد ہے؟ کہا: قیام واعتدال۔ امام باقر رحمہ اللہ نے سن کر انکار نہ کیا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دنیا اور آخرت کے لیے مشقت کرتا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ دنیا کی تنگیاں اور آخرت کی سختیاں اٹھاتا ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام آسمان پر پیدا ہوئے تھے، اس لیے اس کا نام کبد ہوا۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ اختیار کیا ہے کہ اس سے مراد مکابدت ومشاق امور ہیں،[2] یعنی کاموں کی محنت ومشقت میں لگا رہتا ہے، کبھی تکلیف سے خالی نہیں ہوتا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی کو اس کا مال لینے پر قدرت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں انسان کو گھیرے ہوئے ہیں:

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کیا یہ گمان کرتا ہے کہ اس سے اس مال کا سوال نہ ہوگا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اللہ ہے کہ وہ اس پر قادر ہے۔ مالِ لبد سے مراد مالِ بسیار ہے۔ امام مجاہد، حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ کیا وہ اس خیال میں ہے کہ کوئی اس کو دیکھتا نہیں، یعنی اللہ عزوجل۔ یہی قول سلف رحمہم اللہ کا بھی ہے۔[3] پھر فرمایا: کیا میں نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں جن سے وہ ہر چیز دیکھتا ہے اور زبان نہیں دی جس سے دل کی بات بیان کر سکتا ہے اور ہونٹ نہیں دیے جن سے بات کرنے پر قدرت رکھتا ہے اور کھانا کھا سکتا ہے اور چہرے کا جمال اور منہ کا جلال ہے۔

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳٤۳۳) تفسیر ابن کثیر (٤/٦٦٠، ٦٦١) (2) تفسیر الطبري (۲٤/٤٣٥)
(3) تفسیر ابن کثیر (٤/٦٦١)

امام مکحول رحمہ اللہ رفعاً کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے ابن آدم! میں نے تجھ پر بڑے بڑے انعام کیے جن کا شمار نہیں ہوسکتا اور نہ تجھے ان کا شکر ادا کرنے کی طاقت ہے، میرا ایک انعام تجھ پر یہ ہے کہ میں نے تجھ کو دو آنکھیں دی ہیں جن سے تو دیکھتا ہے اور ان کے لیے پردہ رکھا ہے، تاکہ تو آنکھوں سے اس چیز کو دیکھے جو تیرے لیے حلال ہے اور جو چیز حرام ہے اس پر وہ پردہ ڈال۔ اور تجھ کو ایک زبان دی ہے اور اس کے لیے ایک پردہ رکھا ہے سو جس چیز کا میں نے تجھ کو حکم دیا ہے وہ زبان سے نکال اور جائز بات کہہ اور جو بات کہنا تجھ پر حرام ہے اس سے زبان کو بند رکھ اور تجھ کو ایک فرج (شرمگاہ) دی ہے اور ایک پردہ رکھا ہے۔ سو شرم گاہ سے حلال کو پہنچ اور اگر حرام سامنے آئے تو اس پر پردہ ڈال۔ اے ابن آدم! تو میرے غصے کو نہیں اٹھا سکتا اور نہ میرے انتقام کی طاقت رکھتا ہے۔[1] (رواہ ابن عساکر)

خیر وشر میں تمیز کر لینا بھی انسان کے لیے ایک نعمت ہے:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَلنَّجْدَيْنِ ﴾ سے مراد خیر اور شر ہے۔ یہی قول سیدنا علی، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام مجاہد، عکرمہ، ابی وائل، ابی صالح، محمد بن کعب، ضحاک اور عطا خراسانی رحمہ اللہ وغیرہم کا ہے۔[2] سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: یہ دو نجد ہیں: ایک نجدِ شر، سو یہی تم کو نجدِ خیر سے زیادہ پیارا ہے۔[3] (رواہ عبد اللہ بن وهب) لیکن اس کی سند ٹھیک نہیں ہے۔ یہ امام حسن بصری رحمہ اللہ سے بھی مرسلاً مروی ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد ہر دو پستان ہیں۔[5] امام ربیع، قتادہ اور ابی حازم رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں، لیکن صحیح پہلا قول ہے۔ اس آیت کی نظیر یہ ہے: ﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴾[6] [الدھر: ۲-۳] "بے شک ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے امتحان کے لیے پیدا کیا اور اس کو سنتا دیکھتا بنایا۔ ہم نے اسے راہ دکھائی اب خواہ وہ شکر گزار بنے خواہ ناشکرا۔"

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ آیتِ کریمہ ﴿ لَاۤ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴾ میں حرفِ "لا" زائد ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین کا اجماع ہے کہ اس "بلد" سے مراد مکہ ہے[7] اور امام واسطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد مدینہ منورہ ہے۔[8] قطع نظر اس کے کہ یہ قول اجماعِ مفسرین کے خلاف ہے۔ یوں بھی مسترد ہے، کیوں کہ یہ سورت مکی ہے نہ کہ مدنی۔

---

① تاریخ دمشق (٦٦/٢٢٩) یہ روایت مرسل ہے۔ ② تفسیر الطبري (٢٤/٤٣٧_٤٣٩)
③ تفسیر ابن کثیر (٤/٦٦١) اس کی سند میں "سنان بن سعد اور ابن لھیعہ" ضعیف راوی ہیں۔
④ تفسیر الطبري (٢٤/٤٣٩) یہ روایت مرسل ہے۔ ⑤ تفسیر الطبري (٢٤/٤٣٩) ⑥ تفسیر ابن کثیر (٤/٦٦٠_٦٦٢)
⑦ فتح القدیر (٥/٥٩١) ⑧ تفسیر القرطبي (٢٠/٦٠)

اللہ نے مکہ معظمہ کو حرم یا امن اور لوگوں کے لیے ثواب کی جگہ بنایا ہے اور مسجد الحرام میں اہلِ مشرق و مغرب کا قبلہ ہے اور اس کو مقامِ ابراہیم سے شرفِ عظیم بخشا ہے اور وہاں شکار کھیلنا حرام کر دیا اور بیت المعمور کو اس کے مقابلے میں رکھا ہے اور کعبے کے نیچے سے ساری زمین پھیلائی جب یہ سب فضیلتیں اس جگہ فراہم ہیں تو اس کے ساتھ قسم کھائی اور فرمایا کہ تجھ کو اس میں قتال کرنا حلال ہے اگرچہ ایک ساعت ہی سہی۔

یہ آیندہ کی خبر دی ہے جس طرح کہ فرمایا تھا: ﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴾ [الزمر: ۳۰] ''یقیناً خود آپ کو بھی موت آئے گی اور یہ سب بھی مرنے والے ہیں۔'' علامہ نسفی رحمہ اللہ نے اسی کو راجح کہا ہے۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم جو کچھ اس کے اندر کرو، وہ تم کو درست ہے فتح اور قتال سے۔[2] یا یہ مراد ہے کہ چونکہ تم اس شہر میں مقیم ہو، اس لیے تمھارے شرف اور تعظیم کے لیے ہم یہ قسم کھاتے ہیں اس لیے کہ تمھارا وہاں ہونا مکہ کے لیے ایک دوسرا شرف ہے۔ اس کے پہلے شرف اور عظمت کے علاوہ۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مکہ میں داخل ہونے کے دن اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قتل کرنا اور چھوڑ دینا حلال کر دیا تھا، چنانچہ ابن خطل کو جو کعبہ میں چھپا ہوا تھا صبراً قتل کیا، یعنی بھوکا پیاسا مارا۔ اب نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کے لیے حلال نہیں کہ وہاں ایسا کام کرے جو اللہ پاک نے حرام کر دیا ہے۔[3] سیدنا ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ آیت میرے حق میں اتری ہے۔ میں گھر سے باہر نکلا، میں نے عبداللہ بن خطل کو کعبے کا پردہ پکڑے ہوئے پایا، اس کی گردن رکنِ یمانی اور مقامِ ابراہیم کے درمیان ماری گئی۔[4] (أخرجه ابن مردويه)

﴿ وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ ﴾ سے مراد آدم اور ابن آدم ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اسی طرح کہا ہے۔[5] اللہ نے ان کی قسم کھائی ہے، اس لیے کہ روئے زمین پر سب سے عجیب مخلوق ہیں۔ ان میں بیان و عقل و تدبیر و استخراجِ علوم ہے۔ ان میں انبیاء، اولیاء، صلحاء، اصفیاء اللہ کی طرف دعوت دینے والے اور دین کی مدد کرنے والے ہیں اور زمین میں جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ انھیں کے لیے ہے۔ فرشتوں سے آدم علیہ السلام کو سجدہ کروایا، سب چیزوں کے نام سکھائے، اس لیے ان کی قسم کھائی۔ ان میں سب اچھے برے آ گئے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد صلحاء ہیں۔ رہے طلحاء (یعنی بدکردار) وہ اولاد نہیں ہیں گویا چوپائے ہیں۔ ﴿ وَالِدٍ ﴾ کو نکرہ جو رکھا اس سے اس کی تعریف ہے اور تعجب ہے۔[6] (قاله الرازي)۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ وَالِدٍ ﴾ ابراہیم علیہ السلام ہیں اور ﴿ وَمَا وَلَدَ ﴾ اسماعیل علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا عاقر و غیر عاقر ہیں، لیکن اس میں بعد ہے۔ یا یہ تمام حیوانات کے لیے عام ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا مختار یہی ہے۔[7] بعض

---

(1) تفسير النسفي (٣٤٠/٤) (2) تفسير الطبري (٤٣٠/٢٤)
(3) تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٣٢/١٠) فتح البيان (٢٣٨/١٥، ٢٣٩) (4) الدر المنثور (٥١٧/٨)
(5) مستدرك الحاكم (٥٦٩/٢) (6) تفسير الرازي (١٦٤/٣١) (7) تفسير الطبري (٤٣٣/٢٤)

جاہلوں اور کم عقلوں نے اس سے مولدِ نبوی ﷺ پر احتفال (محفل لگانا) کے جائز ہونے پر استدلال کیا ہے۔ یہ درحقیقت اللہ پاک کی کتاب کی تحریف ہے جس کی طرف سلف اور خلف میں سے کوئی مفسر نہیں گیا، بلکہ اجماعِ مسلمین کے خلاف ہے اور تفسیر بالرائے پر سخت وعید آ چکی ہے۔

﴿ كَبَدٍ ﴾ سے مراد شدت و مشقت ہے، یعنی انسان پیدا ہونے کے دن سے مرنے کے دن تک محنت اور سختی میں بسر کرتا ہے۔ ذوالنون نے کہا ہے کہ آدمی ہمیشہ قضا کی رسی میں بندھا ہوا ہے امر و نہی کی طرف بلایا گیا ہے۔[1] "سَرَّاء" (خوشی) پر اسے شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور "ضَرَّاء" پر صبر کرنے کا۔ ان دو حالتوں سے کبھی خالی نہیں ہوتا۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنی جمح کی قوم کا ایک شخص تھا، اس کو ابو الاشدین کہتے تھے، ایک چمڑا بچھا کر بیٹھتا اور کہتا: بھلا کوئی اس کو میرے نیچے سے نکال تو لے۔ دس آدمی کھینچتے وہ نہ سرکتا، نہ ہی اس کے پاؤں کو جنبش ہوتی، وہ نبی اکرم ﷺ کا دشمن تھا۔ اس کے متعلق یہ آیت اتری:[2] "کیا اس کو یہ گمان ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا۔" یمانی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق انسان سے زیادہ جفاکش نہیں بنائی، اس کے باوجود وہ اضعف الخلق (تمام مخلوق سے زیادہ کمزور) ہے۔

علماء نے کہا ہے کہ پہلے ناف کاٹی جاتی ہے، پھر کپڑے میں تنگ لپیٹا جاتا ہے، پھر شیر خواری کی مشقت میں پڑتا ہے، پھر دانت نکلنے کی تکلیف میں پھر دودھ چھڑانے کی محنت میں، پھر فتنے کی ایذا، پھر درد و رنج کا دکھ، پھر معلم کی صولت (سرزنش)، پھر مؤدب کی سیاست، پھر استاد کی ہیبت، پھر شادی کی مشکل، پھر اولاد کا شغل اور خدمت، پھر گرہستی اور گھر بنانے کا بکھیڑا، پھر بڑھاپے کا ہنگامہ، غرض یہ کہ اس طرح کے سیکڑوں مصائب اور تکالیف اور آفات ہیں جن کا ذکر کرنا مشکل ہے، مثلاً: دردِ سر، دردِ دندان، دردِ چشم، کان کی تکلیف، قراقرِ شکم، پیٹ کی ہوا اور دوسرے تمام امراض جن کی تفصیل طب کی کتابوں میں ہے، پھر جان اور مال کی تکالیف، جیسے: مار پیٹ، قید اور جرمانہ۔ حاصل یہ کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ اس میں جفاکشی و مشقت برادری پیش نہ آئے۔ پھر سب کے بعد موت ہے یہ سب سے زیادہ سخت ہے، پھر منکر نکیر کے سوالات ہیں، پھر قبر کا بھینچنا اور اس کا اندھیرا، پھر اٹھایا جانا، پھر اللہ کے سامنے پیش کیا جانا، یہاں تک کہ جنت میں جائے یا آگ میں۔[3] اگر انسان کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ ہرگز ان سختیوں کو اختیار نہ کرتا۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ خالق، مدبر اور قاضی الامور کوئی اور ہی ہے اور وہ اللہ وحدہ لاشریک لہ ہے تو اس کے حکم کو بجا لانا چاہیے اور کسی غیر کا دھیان تک نہ ہونا چاہیے۔

دلآرامے کہ داری دل درو بند   وگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

---

(1) تفسير النسفي (٣٤٠/٤) (2) تفسير القرطبي (٦٣/٢٠) (3) تفسير القرطبي (٦٢/٢٠، ٦٣)

"تو جو ایسا محبوب رکھتا ہے تو پھر اپنے دل کی توجہ اسی کی طرف پھیر دے اور اپنی آنکھ کو دوسرے تمام جہان سے بند کر لے۔"

کیا ابن آدم کو یہ خیال ہے کہ کسی کو اس پر قدرت نہ ہوگی کہ اس سے انتقام لے سکے، لہٰذا بہ طور فخر یہ کہتا ہے کہ میں نے بہت سا مال خرچ کر ڈالا، ڈھیر کے ڈھیر اڑا دیے۔ لیث نے کہا ہے کہ مالِ لُبد وہ ہے جس کے فنا ہونے کا ڈر نہ ہو اس کی کثرت کے سبب سے۔ امام کلبی اور مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی میں نے یہ مال عداوتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں صَرف کیا ہے، یا مراد طریقۂ جاہلیت پر بہت مال خرچ کرنا ہے، وہ اس کو مکارم و معالی و مفاخر (عزت اور بلندی اور فخر) میں شمار کرتے تھے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت حارث بن عامر بن نوفل کے حق میں اتری ہے۔ اس نے ایک گناہ کیا تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کفارہ دے۔ کہا: جب سے میں دینِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہوا ہوں میرا سارا مال انہی کفارات اور نفقات میں خرچ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا وہ اس خیال میں ہے کہ کوئی اس کو دیکھتا نہیں ہے اور کوئی اس سے یہ نہ پوچھے گا کہ تو نے یہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں اڑایا۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ جھوٹا تھا، اس نے کچھ بھی خرچ نہیں کیا تھا۔[1] پھر اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنی نعمت کا ذکر کیا اور فرمایا کہ ہم نے اس کو آنکھیں نہیں دیں جس سے وہ مرئیات کو دیکھتا ہے۔ تین اندھیروں کے اندر رحم میں ان کو پھاڑا، پھر انھیں مناسب اندازے پر رکھا کہ ایک آنکھ دوسرے سے بڑھنے نہ پائے اور نہ گھٹے، پھر اس کی سفیدی، سیاہی، سمرت اور زرقت کو مقدار کیا۔ یہ وہ کیفیت ہے کہ ساری مخلوق اس کے سمجھنے سے قاصر ہے، پھر بولنے کے لیے ایک زبان دی۔

حکیمے سخن بر زبان آفرین

"وہ ایک ایسا حکیم ہے جو زبان پر گفتگو (کلام) پیدا کرتا ہے۔"

جو دل میں ہوتا ہے اس کو زبان سے بیان کرتا ہے، دو لب دیے جس سے دانتوں پر پردہ ہے، بات کرنے پر قدرت ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے۔ کیا یہ سب امور بعث پر قدرت رکھنے کی دلیل نہیں ہیں۔ "نجد" اونچی راہ کو کہتے ہیں۔ اس جگہ خیر کا راستہ اور شر کا راستہ مراد ہے، یا دو پستانوں کے سر ہیں کہ اولاد کی زندگی اور رزق کا ذریعہ ہیں، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مراد خیر اور شر کا راستہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد ہدایت اور گمراہی ہے،[2] یعنی ہم نے بیان کر دیا کہ پہلے راستے پر چلنا نجات کا باعث ہے اور دوسرے راستے پر چلنا ہلاکت کا باعث ہے۔ اور پہلا طریقہ تعریف کیا گیا ہے اور دوسرا طریقہ مذمت کیا گیا ہے۔[3]

[1] فتح القدیر (۵/۵۹۳) [2] تفسیر الطبري (۲۴/۴۳۷، ۴۳۸) [3] فتح البیان (۱۵/۲۳۷_۲۴۴)

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ﴿11﴾ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ﴿12﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿13﴾
اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ﴿14﴾ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿15﴾ اَوْ
مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿16﴾ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَوَاصَوْا
بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ﴿17﴾ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿18﴾
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا هُمْ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿19﴾ عَلَيْهِمْ
نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ﴿20﴾

پھر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہیں گزرا ⑪ اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ دشوار گھاٹی کیا ہے؟ ⑫ وہ ہے کسی انسان کو غلامی سے چھڑانا ⑬ یا بھوک والے دن کھانا کھلانا ⑭ کسی رشتہ دار یتیم کو ⑮ یا کسی خاک نشین مسکین کو ⑯ پھر وہ ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور انھوں نے باہم صبر کی وصیت کی اور باہم رحم کرنے کی وصیت کی ⑰ وہی لوگ دائیں ہاتھ والے ہیں ⑱ اور جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے، وہی بائیں ہاتھ والے ہیں ⑲ ان پر (ہر طرف سے) بند کی ہوئی آگ ہوگی ⑳

نیکی کی راہوں پر چلنے کی ترغیب:

یتیم کا ایک حق، ناتے دار کا ایک حق اور اگر دونوں ہوئے تو دو حق۔ انتہی

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عقبہ دوزخ میں ایک پہاڑ ہے۔ کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جہنم میں ستر درجے ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جہنم کی گھاٹی مراد ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک سخت گھاٹی ہے، اس میں اللہ کی اطاعت کر کے گھسنا چاہیے۔ پھر اللہ نے گھسنے کا راستہ بتایا کہ ایک تو گردن چھڑانا ہے۔ دوسرے کھانا کھلانا۔[1] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے، جس نے ایک رقبہ مومنہ (مومن غلام یا لونڈی) آزاد کی اللہ اس کے ہر عضو کے بدلے میں اس کا عضو جہنم کی آگ سے آزاد کرے گا، یہاں تک کہ ہاتھ کو ہاتھ کے بدلے آزاد کرے گا اور پاؤں کو پاؤں کے بدلے اور شرم گاہ کو شرم گاہ کے بدلے۔ (رواه أحمد)

علی بن حسین رحمہ اللہ نے اس حدیث کو سن کر اپنے ایک عمدہ غلام کو اسی وقت آزاد کر دیا اور کہا: "إِذْهَبْ فَأَنْتَ حُرٌّ لِوَجْهِ اللّٰهِ" "جاؤ تم اللہ کے چہرے کے لیے آزاد ہو۔" شیخین، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے کہ یہ غلام

[1] تفسير الطبري (٢٤/٤٤٠، ٤٤١)

جس کو زین العابدین نے آزاد کیا، اس کے دس ہزار درہم ملتے تھے۔[1] ابو نجیح عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ رفعاً یہ ہیں: جس کسی مسلمان نے کسی مسلمان کو آزاد کیا، اللہ پاک ہر ہڈی کے عوض اس کی ایک ہڈی دوزخ کی آگ سے آزاد کرے گا۔ اسی طرح مسلمان عورت کے حق میں فرمایا کہ جو کوئی مسلمان عورت کسی مسلمان عورت کو آزاد کرے گی، اس کی ہر ہڈی کے عوض اس کی ہڈی آگ سے آزاد ہوگی۔[2] (رواه ابن جرير)۔ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جس نے کوئی مسجد بنائی کہ اس میں اللہ کا ذکر کیا جائے تو اللہ اس کا ایک گھر جنت میں بنائے گا اور جس نے کوئی مسلمان جان آزاد کی تو وہ جہنم سے آزادی کے لیے اس کا فدیہ ہوگی اور جو اسلام میں بوڑھا ہوا تو یہ اس کے لیے قیامت کے دن نور ہوگا۔[3] (رواه أحمد)

ان کی دوسری روایت یہ ہے کہ جس نے ایک بردہ (غلام) مومن آزاد کیا اللہ اس کے ہر عضو کے بدلے اس کا عضو آگ سے آزاد کرے گا۔ اور جس نے اللہ کی راہ میں کسی چیز کا جوڑا خرچ کیا تو جنت کے آٹھ دروازوں میں سے جس میں سے چاہے داخل ہو۔ (رواه أحمد)۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سند میں عمدہ اور مضبوط ہیں۔ وللّٰہ الحمد۔[4] سغب بھوک کو کہتے ہیں۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، مجاہد، ضحاک اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔[5] امام نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ایسے دن میں کھلائے کہ اس دن کھانا کم یاب ہو۔[6] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ایسے دن میں کہ طعام کی خواہش ہو۔[7]

﴿ذَا مَقْرَبَةٍ﴾ کے معنی قرابت دار ہیں۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، حسن، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ کا ہے۔[8] سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ مسکین پر صدقہ کرنا ایک صدقہ ہے اور ذی رحم پر صدقہ کرنا دو صدقے ہیں۔ یعنی ایک تو صدقہ اور دوسرے صلہ رحمی۔[9] (رواه أحمد و الترمذي والنسائي وهذا إسناد صحيح) مسکین سے مراد گدائے خاکسار ہے جو خاک میں پڑا رہتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی وہ جو راستہ میں مٹی پر پڑا ہوا ہے نہ گھر ہے نہ در، کوئی شے اس کو خاک سے نہیں بچاتی۔ روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ خاک سے چسپیدہ (ملا ہوا) ہے۔ فقر و فاقہ اور حاجت کے سبب سے۔ اس کے پاس کوئی شے نہیں ہے۔ روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ مراد مسافر ہے۔ یعنی خاکِ وطن سے دور پڑا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد

---

1. صحيح البخاري (٢٣٨١) صحيح مسلم (١٥٠٩) مسند أحمد (٤٢٠/٢) سنن الترمذي (١٥٤١) سنن النسائي الكبرىٰ (١٦٨/٣)
2. تفسير الطبري (٤٤١/٢٤) سنن أبي داود (٣٩٦٥) صحيح الجامع (٢٧٢٦)
3. مسند أحمد (٣٨٦/٤)
4. مسند أحمد (٣٨٦/٤) تفسير ابن كثير (٦٦٣/٤)
5. تفسير الطبري (٤٤٢/٢٤، ٤٤٣)
6. تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٣٥/١٠)
7. تفسير الطبري (٤٤٣/٢٤)
8. تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٢٥) تفسير ابن كثير (٦٦٤/٤)
9. مسند أحمد (١٧/٤) سنن الترمذي (٦٥٨) سنن النسائي (٢٥٨٢) صحيح الجامع (٣٨٥٨)

فقیر وقرضدار وحاجت مند ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد وہ شخص ہے جس کا کوئی نہیں ہے۔ امام سعید، قتادہ اور امام مقاتل رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مراد صاحب عیال ہے۔[1] یہ سب الفاظ قریب المعنی ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ باوجود ان اوصاف جمیلہ کے دل سے مومن بھی ہے، اللہ کے نزدیک اجر کی امید رکھتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُم مَّشْكُورًا ﴾ [بني إسرائيل: ١٩] ”اور جس کا ارادہ آخرت کا ہو اور جیسی کوشش اس کے لیے ہونی چاہیے وہ کرتا بھی ہو اور وہ باایمان بھی وہ، پس یہی لوگ ہیں جن کی کوشش کی اللہ کے ہاں پوری قدر دانی کی جائے گی۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ [النحل: ٩٧] ”جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت، لیکن باایمان ہو تو ہم اسے یقیناً نہایت بہتر زندگی عطا فرمائیں گے اور ان کے نیک اعمال کا بہتر بدلہ بھی انھیں ضرور ضرور دیں گے۔“

پھر اس میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ اس نے صبر اور رحم کی وصیت کی جس طرح حدیث میں مروی ہے: « اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ، اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ »[2] ”رحم کرنے والوں پر رحمان رحم کرے گا، تم زمین پر رحم کرو، تم پر عرش والا رحم کرے گا۔“ دوسری حدیث میں ہے: « لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ »[3] ”جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ اس پر رحم نہیں کرے گا۔“ تیسری حدیث میں ہے: « مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيَعْرِفْ حَقَّ كَبِيْرِنَا فَلَيْسَ مِنَّا »[4] ”جس نے ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کیا اور ہمارے بڑے کا حق نہ پہچانا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ اس صفت کے لوگ اصحاب یمین میں ہوں گے جن کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا اور جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہیں وہ صاحب شمال ہوں گے ان کا نامۂ اعمال ان کے پس پشت سے ملے گا وہ آگ کے اندر بند ہوں گے ان کو کوئی راستہ نہ ملے گا جس سے گزر کر وہ باہر نکل بھاگیں۔

سیدنا ابوہریرہ، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام عکرمہ، سعید بن جبیر، مجاہد، محمد بن کعب قرظی، عطیہ عوفی، حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مُّؤْصَدَةٌ ﴾ بہ معنی مطبقہ (تہ بہ تہ بند کی ہوئی) ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یعنی اس کے دروازے بند ہوں گے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قریش کی لغت میں دروازے کے بند کرنے کو ایصاد کہتے ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی وہ آگ گھیرنے والی ہوگی اس کا کوئی دروازہ نہ ہوگا۔

---

① تفسير الطبري (٢٤/٤٤٣، ٤٤٥) تفسير ابن كثير (٦٦٤/٤)

② سنن أبي داود (٤٩٤١) سنن الترمذي (١٩٢٤) صحيح الجامع (٣٥٢٢)

③ صحيح البخاري (٦٩٤١) صحيح مسلم (٢٣١٩) ④ سنن أبي داود (٤٩٤٣) صحيح الجامع (٦٥٤٠)

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آگ میں روشنی نہ ہوگی اور نہ شگاف اور نہ نکلنے کا کوئی راستہ۔[1] ابو عمران جونی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ حکم کرے گا تو ہر جبار شیطان اور وہ شخص جس کے شر سے لوگ ڈرتے تھے لوہے میں جکڑ بند کر کے جہنم میں ڈالے جائیں گے، پھر جہنم کو ان پر منطق کر دیں گے، واللہ! ان کے پاؤں ہرگز نہ جمیں گے اور نہ وہ آسمان کو دیکھیں گے اور نہ ان کی آنکھ نیند سے جھپکے گی اور نہ ٹھنڈا پانی نصیب ہوگا۔[2] (رواہ ابن أبي حاتم)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے اقتحام کہتے ہیں اپنی جان کو کسی چیز میں جھونک دینے کو اور عقبہ کہتے ہیں درے کو جس سے گزرنا دشوار ہو۔ اللہ پاک نے یہ ایک مثال بیان کی ہے نیک کام یا عمل کرنے کے لیے نفس کی مشقت، خواہشات اور شیطان کے راستے پر چلنا رکاوٹ ہوتے ہیں۔ نیک کام کرنا ایسا مشکل پڑتا ہے، جیسے: گھاٹی پار کرنا ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عقبہ نار ہے[3] یا جنت اور نار کے درمیان ایک گھاٹی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ خلاص ہے ہولِ عرض سے۔ امام کلبی اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ پل صراط جو پشتِ جہنم پر ہوگا، تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک۔[4]

﴿ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴾ سے مراد گردن کی رہائی میں خرچ کرنا ہے۔ بہت سی احادیث میں گردنوں کو آزاد کرنے کی فضیلت آئی ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رفعاً کہا ہے: «مَنْ أَعْتَقَ رَقَبَةً مُؤْمِنَةً أَعْتَقَ اللّٰهُ لِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهَا عُضْوًا مِنَ النَّارِ حَتَّى الْفَرْجَ بِالْفَرْجِ »[5] (رواه الشيخان) ''جو شخص کسی مومن غلام کو آزاد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے آزاد کرنے والے کے عضو کو حتی کہ شرم گاہ تک کو آگ سے آزاد کر دے گا۔'' طعام میں قید بھوک کے دن کی لگائی ہے، اس لیے کہ ایسے دن میں مال کا نکالنا نفس پر بہت بھاری ہوتا ہے اور اجر کو واجب کر دیتا ہے۔ پھر اس خرچ کرنے کا مصرف (جگہ) بیان کیا کہ وہ اطعام کسی یتیم رشتہ دار کو ہو یا کسی مسکین نادار کو ہو۔ اہلِ لغت کے نزدیک یتیم وہ ہے جس کا باپ نہ ہو، یا ماں باپ دونوں نہ ہوں۔

﴿ مَتْرَبَةٍ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ دائم المرض ہو یا فقر و فاقہ سے زمین میں لگ گیا ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے: « هُوَ الَّذِي مَأْوَاهُ الْمَزَابِلُ »[6] (أخرجه ابن مردويه) یعنی وہ گدا جو اپنے بچھونے پر پڑا رہتا ہو، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان قربات (خرچ کرنا) کا فائدہ جب ہے کہ ایمان بھی رکھتے ہوں اور آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کی اطاعت پر ثابت قدم رہنے کی اور اللہ کی معصیت سے بچنے کی وصیت

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٦٦٤)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٣٥) تفسیر ابن کثیر (٤/٦٦٢، ٦٦٤)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٣٤)

[4] تفسير القرطبي (٢٠/٦٧)

[5] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[6] الدر المنثور (٨/٥٢٦)

کرتے ہوں اور مصیبتوں اور سختیوں اور تکالیف پر صبر کی وصیت کرتے ہوں اور اللہ کے بندوں پر رحم کرنے کے لیے کہتے ہوں تو ایسے ہی لوگ صاحبِ یمین ہوں گے بہ خلاف ان لوگوں کے جنھوں نے ہماری آیتوں کو نہ مانا، خواہ وہ آیتیں نازل شدہ تھیں یا تکوینی تھیں اور توحیدِ ربوبیت والوہیت پر دلیل تھیں۔ ایسے لوگ صاحبِ شمال ہوں گے ان پر جہنم کی آگ مسلط کر دی گئی ہے۔ یہ آیات اس بات پر دلیل ہے کہ گردن چھڑانے والا اور جس کی گردن چھڑائی گئی ہے اور یتیم و مسکین کا پرورش کرنے والا اور وہ یتیم و مسکین جن کو کھانا کھلایا ہے، مومنین ہوں تب کہیں یہ اجر، جس کا وعدہ کیا گیا ہے، حاصل ہوگا۔[1] واللّٰہ أعلم.

[1] فتح البیان (۱۵/۲۴۴۔۲۴۸)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

سُوۡرَةُ الشَّمۡسِ

اس سورت کی پچیس (۲۵) آیتیں ہیں اور یہ بلا اختلاف مکہ میں اتری ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہم اسی کے قائل ہیں۔[1]

نمازِ عشاء میں سورۃ الشمس کی قراءت:

سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اس کو اور اس جیسی سورتوں کو نمازِ عشاء میں پڑھتے تھے۔[2] (أخرجه أحمد و الترمذي وحسنه) اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا کہ صبح کی نماز میں ﴿ وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰى ﴾ کو اور اس سورت کو پڑھا کرو۔[3] (أخرجه الطبراني)۔ عقبہ بن عامر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم کو نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ ہم چاشت کی دو رکعت میں اس کو اور ﴿ وَالضُّحٰى ﴾ کو پڑھا کریں۔[4] (أخرجه البيهقي) اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں گزر چکا ہے کہ معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ تو نے ﴿ سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّكَ الۡاَعۡلَى ﴾ اور ﴿ وَالشَّمۡسِ وَضُحٰهَا ﴾ اور ﴿ وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰى ﴾ کیوں نہ پڑھیں۔[5]

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وَالشَّمۡسِ وَضُحٰهَا ۝۱ وَالۡقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا ۝۲ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ۝۳
وَالَّيۡلِ اِذَا يَغۡشٰىهَا ۝۴ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰىهَا ۝۵ وَالۡاَرۡضِ وَمَا طَحٰىهَا ۝۶
وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۝۸ قَدۡ اَفۡلَحَ
مَنۡ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا ۝۱۰

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

سورج اور اس کی دھوپ چڑھنے کی قسم! ① اور چاند کی جب وہ اس کے پیچھے آتا ہے ② اور

---

① الدر المنثور (٥٢٧/٨) ② مسند أحمد (٣٥٤/٥) سنن الترمذي (٣٠٩)

③ المعجم الكبير (١٣٤/١١) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ ④ الدر المنثور (٥٢٧/٨)

⑤ صحيح البخاري (٦٧٣) صحيح مسلم (٤٦٥)

دن کی جب وہ سورج کا جلوہ دکھاتا ہے③ اور رات کی جب وہ اسے ڈھانپ لیتی ہے④ اور آسمان کی اور جس نے اسے بنایا⑤ اور زمین کی اور جس نے اسے بچھایا⑥ اور (انسانی) نفس کی اور جس نے اسے ٹھیک بنایا⑦ پھر اس کی بدی اور اس کا تقویٰ اس پر الہام کیا⑧ یقیناً فلاح پا گیا جس نے نفس کا تزکیہ کیا⑨ اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اسے آلودہ کیا⑩

اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوقات کی قسم کھانا:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضحیٰ سے مراد ضوء ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضحیٰ سارا دن ہی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ اللہ نے سورج اور دن کی قسم کھائی ہے، اس لیے کہا ہے کہ ظاہر ضوء آفتاب یہی دن ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چاند اس کے پیچھے رہتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ دن کے پیچھے چاند آتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد شبِ ہلال ہے جب سورج گر جاتا ہے تو ہلال نظر آتا ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چاند مہینے کے پہلے نصف میں سورج کے پیچھے لگا رہتا ہے، پھر سورج چاند کے پیچھے رہتا ہے اور چاند مہینے کے دوسرے نصف کے آخر تک سورج کے آگے رہتا ہے۔

امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ﴾ مراد ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ جَلّٰىهَا ﴾ سے مراد دن کا اجالا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دن اس کو ڈھانپ لیتا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض اہلِ عربیت نے یہ تاویل کی ہے کہ دن اندھیرے کو اجالا کر دیتا ہے،[1] لیکن اگر یہ قائل یوں کہتا کہ دن روئے زمین کو چمکا دیتا ہے تو زیادہ بہتر ہوتا اور اس کی تاویل صحیح ہوتی۔ اس آیت میں ﴿ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰىهَا ﴾ اور یہ تاویل زیادہ عمدہ اور قوی ٹھہرتی۔ والله أعلم۔ لہٰذا امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰىهَا ﴾ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ﴾ [الليل: ٢] "اور قسم ہے دن کی جب روشن ہو۔"

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سب جگہ ضمیر کا عود سورج کی طرف اختیار کیا ہے، اس لیے کہ سورج ہی کا ذکر ہے۔ پھر رات سورج کو ڈھانپ لیتی ہے سورج غائب ہو جاتا ہے، آسمان کے کناروں میں اندھیرا آ جاتا ہے۔ یزید بن ذی حمایہ نے کہا ہے کہ جب رات ہوتی ہے تو اللہ جل جلالہ فرماتا ہے میری ایک خلق عظیم نے میرے بندوں کو چھپا لیا وہ رات سے ہیبت رکھتے ہیں، لیکن جس نے رات کو بنایا ہے وہ ہیبت کا زیادہ مستحق ہے،[2] پھر آسمان کی اور اس کے بنانے کی قسم کھائی، یہ امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ یا اس کے بانی کی قسم کھائی، وہ اللہ ہے۔ یہ قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا ہے۔[3] دونوں قول ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ "بناء" سے مراد "رفع" ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَالسَّمَآءَ

---

① تفسير الطبري (٢٤/٤٥١، ٤٥٢) ② تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٦٣) ③ تفسير الطبري (٢٤/٤٥٣)

﴿وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ﴾ [الذاريات: ٤٧-٤٨] ''آسمان کو ہم نے (اپنے) ہاتھوں سے بنایا ہے اور یقیناً ہم کشادگی کرنے والے ہیں، اور زمین کو ہم نے فرش بنایا دیا پس ہم بہت ہی اچھا بچھانے والے ہیں۔''

''أید'' سے مراد قوت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿طَحٰهَا﴾ بہ معنی ''دَحَاهَا'' ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد ''خَلَقَ'' ہے۔ زمین کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ زمین کو تقسیم کیا۔ امام مجاہد، قتادہ، ضحاک، سدی، ثوری، ابو صالح اور امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زمین کو بچھایا۔[1] یہ قول تمام اقوال سے زیادہ مشہور ہے اسی پر اکثر مفسرین ہیں۔ یہی اہلِ لغت کے نزدیک معروف ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''طَحَوْتُهُ''، مثل ''دَحَوْتُهُ'' بہ معنی ''بَسَطْتُهُ'' ہے۔[2] پھر جان کی اور اس کے برابر کرنے کی قسم کھائی۔

ہر بچے کی فطرتِ اسلام پر پیدائش:

''تسوية'' سے مراد فطرتِ قویمہ پر استقامت ہے، جیسے: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾ [الروم: ٣٠] ''پس آپ یکسو ہو کر اپنا منہ دین کی طرف متوجہ کر دیں، اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے کو بدلنا نہیں۔'' نیز حدیث میں فرمایا ہے: «كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ كَمَا تُوْلَدُ الْبَهِيْمَةُ بَهِيْمَةً جَمْعَاءَ هَلْ تُحِسُّوْنَ فِيْهَا مِنْ جَدْعَاءَ»[3] (أخرجاه من رواية أبي هريرة رضی اللہ عنہ) ''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا لیتے ہیں جس طرح چار پایہ صحیح سلامت بچہ پیدا کرتا ہے کیا اس میں کوئی کان کٹا ہوتا ہے؟!''

عیاض مجاشعی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے: میں نے اپنے بندوں کو یکسو پیدا کیا ہے، یعنی توحیدِ اسلام پر، شیاطین نے آ کر ان کو ان کے دین سے اچک لیا۔[4] (رواہ مسلم)۔ پھر نفس کو فجور اور تقویٰ کی طرف راہ دکھائی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ان کے لیے خیر اور شر کو بیان کر دیا۔ یہی قول امام مجاہد، قتادہ، ضحاک اور ثوری رحمہم اللہ کا ہے۔ امامِ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد خیر و شر کا الہام ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ نفس کے اندر فجور اور تقویٰ کو رکھا ہے، کوئی فاجر ہوتا ہے اور کوئی متقی۔[5] سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما نے ابو الاسود دئلی سے کہا تھا کہ بھلا یہ کام جو لوگ کرتے ہیں اور اس میں سعی کرتے ہیں، یہ کیا کوئی ایسی چیز ہے جو اُن پر لکھ دی گئی ہے اور ہو چکی ہے، یعنی قضا اور قدر پہلے سے مقرر ہے یا آیندہ میں یہ لوگ اس کو کرتے رہتے ہیں جو اُن کے نبی لائے ہیں اور جس کی حجت ان پر موکد ہو چکی ہے؟

---

[1] تفسير الطبري (٢٤/٤٥٣، ٤٥٤) [2] الصحاح للجوهري (٧/٢٦١) [3] صحيح البخاري (١٢٩٢) صحيح مسلم (٢٦٥٨)
[4] صحيح مسلم (٢٨٦٥) [5] تفسير الطبري (٢٤/٣٥٣، ٤٥٥)

ابو الاسود رحمہ اللہ نے کہا کہ بلکہ یہ ایسی شے ہے جس کا حکم ہو چکا ہے۔ کہا: پھر بھلا یہ ظلم ہو گا یا نہیں؟ ابو الاسود رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں اس بات سے سخت گھبرایا اور میں نے کہا کہ کوئی شے نہیں ہے بلکہ وہ اللہ ہی کی بنائی ہوئی ہے اور اسی کی مملوک ہے۔ ﴿ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٢٣] ''وہ اپنے کاموں کے لیے (کسی کے آگے) جواب دہ نہیں اور سب (اس کے آگے) جواب دہ ہیں۔'' کہا: اللہ تجھ کو سیدھا رکھے، میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ تیری عقل کا امتحان لوں۔ مزینہ یا جہینہ کے ایک مرد نے یہی بات نبی کریم ﷺ سے پوچھی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا: یہ شے مقضیٰ علیھم ہے۔ اس نے کہا کہ پھر عمل کرنا کس لیے ہے؟ فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ نے ان دو منزلوں میں سے کسی ایک منزل کے لیے پیدا کیا ہے، اس کے لیے وہ منزلت آسان کر دیتا ہے، اس کی تصدیق اللہ کی کتاب میں موجود ہے: ﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ﴾ (رواه ابن جرير وأحمد ومسلم)

تزکیہ نفس اور اس کے حصول کی دعا:

پھر فرمایا جس نے اپنے نفس کا تزکیہ اللہ کی اطاعت سے کیا، وہ مراد کو پہنچا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جی کو برے اخلاق اور رزیل عادات سے پاک کیا، یہی قول امام مجاہد، عکرمہ اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ کا ہے۔[1] جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ﴾ [الأعلیٰ: ١٤۔ ١٥] ''بے شک اس نے فلاح پالی جو پاک ہو گیا اور جس نے اپنے رب کا نام یاد رکھا اور نماز پڑھتا رہا۔'' اور جس نے اپنے جی کو خامل (گمنام) کیا اور ہدایت سے مخذول (دور) رکھا وہ معاصی کا ارتکاب کرتا رہا اور طاعات کو چھوڑے رکھا، وہ نقصان اور زیان میں پڑا۔ یہ مطلب ہے کہ جس جی کو اللہ پاک نے پاک کیا وہ اچھا رہا اور جس کے جی کو خاک میں ملایا وہ زیاں کار ہوا۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[2] ان سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے: « أَفْلَحَتْ نَفْسٌ زَكَّاهَا اللّٰهُ وَخَابَتْ نَفْسٌ خَيَّبَهَا اللّٰهُ مِنْ كُلِّ خَيْرٍ »[3] (رواه ابن أبي حاتم وغيره) ''کامیاب ہوا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے پاک کیا اور زیاں کار ہوا وہ جسے اللہ تعالیٰ نے ہر خیر سے محروم کر دیا۔'' لیکن اس کی سند ٹھیک نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ اس آیت پر گزرتے تو ٹھہر کر یوں کہتے: « اَللّٰهُمَّ آتِ نَفْسِيْ تَقْوٰهَا أَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا وَزَكِّهَا أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكَّاهَا »[4] (رواه الطبراني) یہ حدیث کئی طرق سے مختصراً و مطولاً آئی ہے۔[5] ''اے اللہ! مجھے تقوے سے نواز، تو ہی میرا دوست اور ولی ہے تو میرے نفس کا تزکیہ کر دے تو ہی بہتر تزکیہ کرنے والا ہے۔''

---

(1) تفسیر الطبري (٢٤/٤٥٦) (2) تفسیر الطبري (٢٤/٤٥٦، ٤٥٧)

(3) تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٣٨) اس کی سند میں انقطاع ہے، ضحاک رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔

(4) المعجم الکبیر (١١/١٠٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده حسن" (مجمع الزوائد: ٧/٢٩١)

(5) تفسیر ابن کثیر (٤/٦٦٥۔٦٦٧)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اللہ نے ان چیزوں کی قسم کھائی اور اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی مخلوقات کی قسم کھائے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ قسمیں حذفِ مضاف پر ہیں، اس جگہ میں اور سب جگہ میں یعنی اصل میں ''وَرَبِّ الشَّمْسِ'' وغیرہ ہے۔ اللہ کے قسم کھانے سے ان چیزوں کی دل میں وقعت پیدا ہوتی ہے۔ ان مخلوقات میں بہت عظیم فوائد ہیں۔ مکلف (انسان) کو ان میں غور کرنا چاہیے اور اللہ کا شکر بجا لانا چاہیے۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے سات چیزوں کی قسم کھائی: سورج کی اور اس کے ضحیٰ کی، کیوں کہ دنیا والے رات کو مردوں کی طرح ہوتے ہیں، جب صبح کا اثر ظاہر ہوتا ہے تو مردے زندوں کی طرح ہو جاتے ہیں، چاشت کے وقت زندگی کامل ہو جاتی ہے، یہ حالت احوالِ قیامت کے مشابہ ہے اور چاشت کا وقت اہلِ جنت کے جنت میں قرار پذیر ہو جانے کے مشابہ ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضحیٰ سے مراد اشراق کی روشنی ہے، یعنی دھوپ۔ یہی قول امام کلبی رحمہ اللہ کا بھی ہے یا مراد سارا دن یا خود دن ہے۔ امام مبرد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ضحیٰ کی اصل صبح ہے، یعنی نورِ آفتاب یا ارتفاعِ نہار۔ پھر چاند کی قسم کھائی کہ وہ سورج کے پیچھے رہتا ہے۔ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ بات مہینے کے نصف اول میں ہوتی ہے، جبکہ سورج ڈوب جاتا ہے تو روشنی دینے میں چاند اس کا خلیفہ ہوتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چاند جب گول ہو جاتا ہے تو روشنی دینے میں سورج کا تابع رہتا ہے، یہ بات چاندنی والی راتوں میں ہوتی ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿تَلٰىهَا﴾ کے معنی یہ ہیں کہ چاند سورج سے روشنی لیتا ہے۔[1]

زجام مہر بود ہمچو ماہ مستی ما بقدر وصل شود محو بار ہستی ما

''ہماری مستی کا وجود چاند کی طرح سورج کے جام سے تعلق رکھتا ہے۔ ہماری ہستی کا بوجھ وصل کے مطابق مٹ سکتا ہے۔''

زیادہ بہتر یہ تفسیر ہے کہ چاند کی روشنی سورج کی روشنی کے بعد ہوتی ہے۔ جب سورج ڈوب جاتا ہے، تب چاند نکلتا ہے، خواہ جلدی ہو یا دیر۔ مہینے کے نصف اول میں بغیر تاخیر کے نکلتا ہے اور دوسرے نصف میں ذرا دیر سے نکلتا ہے۔

پھر دن کے اجالا کرنے کی قسم کھائی، کیوں کہ سورج انبساطِ نہار کے وقت پوری تجلی کرتا ہے، گویا دن نے اس کو خوب چمکا دیا ہے یا ضمیر ظلمت کی طرف ہے کہ وہاں تاریکی کو روشنی بنا دیتا ہے، اگرچہ ظلمت کا ذکر اوپر نہیں ہوا یا یہ مراد ہے کہ جتنے حیوانات وغیرہ اور اشیاء زمین میں ہیں، وہ سب دن ہونے سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ دن سے پہلے رات کے اندر چھپے ہوئے تھے یا ساری دنیا اور ساری زمین کو درخشاں کر دیتا ہے۔ پھر رات کی قسم کھائی، رات سورج کو ڈھانپ لیتی ہے، سورج ڈوب جاتا ہے، آفاق تاریک ہو جاتا ہے، یہ چاروں گویا آفتاب ہی کی قسمیں کھائیں چار

---

[1] تفسير القرطبي (٧٣/٢٠)

اوصاف کے اعتبار سے۔ جو شخص سورج کی عظمت میں ذرا سا بھی غور و فکر کرے گا، اس کا ذہن خالقِ شمس کی عظمت کی طرف ضرور منتقل ہو گا، پھر آسمان اور اس کی بنا کی قسم کھائی۔

امام ابو البقاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قسم قادر عظیم الشان اور بانیِ آسمان کی ہے، لیکن امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے پہلی بات ہی کو راجح کہا ہے اور امام ابن جریر رحمہ اللہ نے دوسری بات کو راجح ٹھہرایا۔[1] پھر زمین اور اس کے بسط (کشادگی) کی قسم کھائی۔ عام مفسرین کا یہی قول ہے کیوں کہ طحو بسط کو کہتے ہیں۔ اللہ نے ہر طرف سے زمین کو مبسوط کیا ہے۔ یا طحو سے مراد تقسیم کرنا اور پیدا کرنا ہے، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ طحو کے ایک معنی ذہاب ہیں، یعنی قسم ہے زمین کی اور جہاں تک وہ چلی گئی ہے اور قسم ہے نفس کی اور اس کے برابر کرنے کی، یعنی اس کا ڈیل ڈول ٹھیک ٹھاک بنایا۔ اعضاء کو اعتدال پر رکھا۔ نفس سے مراد سارے جن اور انسان ہیں یا خاص آدم علیہ السلام ہیں، لیکن اس کو عام رکھنا زیادہ مناسب ہے۔ پھر اس نفس کو نیک و بد کی سمجھ دی۔ اچھائی اور برائی کی پہچان دی۔

الہام کہتے ہیں کہ فیض کے طور پر کسی چیز کے دل میں ڈالنے کو جس سے دل کھل جائے۔ اس صورت میں الہام کا فجور پر اطلاع کرنا تسامح (جرأت) کے طور پر ہے، یعنی بہ طریقِ سہل انگاری اور کبھی اس کا اطلاق مطلق بیان پر بھی آتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے نفس کو طاعت اور معصیت کے راستے کا شناسا کر دیا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خیر کی راہ اور شر کی راہ دکھائی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴾ [البلد: ١٠] ''اور ہم نے اس کو دونوں راستے دکھا دیے۔''

محمد بن کعب کہتے ہیں اللہ جب کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو خیر کا الہام کرتا ہے، وہ عملِ خیر بجا لاتا ہے اور جس کے ساتھ بدی کا ارادہ کرتا ہے، اس کو شر کا الہام کرتا ہے وہ عملِ شر بجا لاتا ہے۔[2] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کو توفیق دیتا ہے اس کے اندر تقویٰ رکھتا ہے اور جس کو مخذول کرتا ہے اس کے اندر فجور رکھتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی کو اختیار کر کے الہام کو توفیق اور خذلان پر محمول کیا ہے۔[3] امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ الہام کی تفسیر کے لیے ایک عمدہ وجہ ہے، کیوں کہ الہام کو بیان نہیں کیا جا سکتا، یا اس کی تعلیم اور تعریف نہیں کی جا سکتی۔ الہام وہ ہے جو دل میں پڑے اور اس کے اندر رکھا جائے۔

یہ اس بات میں واضح ہے کہ اللہ نے مومن میں تقویٰ اور کافر میں فجور کو پیدا کیا ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس کو طاعت اور معصیت سکھائی۔[5] خیر اور شر کا الہام کیا، فجور اور تقویٰ کو لازم حال کر دیا۔ پھر فرمایا کہ جس شخص نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا اور اس کو تقویٰ سے اعلیٰ و انمیٰ بنایا، اس نے ہر مطلوب شے اور ہر محبوب شے

---

[1] فتح القدير (٥/٥٩٩) [2] تفسير القرطبي (٢٠/٧٥) [3] تفسير البغوي (٨/٤٣٨)

[4] فتح القدير (٥/٦٠٠) [5] تفسير الطبري (٢٤/٤٥٤)

کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور جس نے اس کو معصیت میں لگائے رکھا وہ خائب و خاسر ہوا۔ تدسیس ایک شے کو دوسری شے کے اندر مخفی رکھنے کو کہتے ہیں۔ اس جگہ مراد اخفاء و اخمال (گمنام کرنا) ہے، یعنی طاعت نہ کی۔ امام ابن اعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اپنے نفس کو من جملہ صالحین کے ٹھہرایا، حالاں کہ صالح نہیں ہے۔[1] اسی کو خون لگا کے شہیدوں میں شامل ہونا کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جس کے نفس کو اللہ تعالیٰ نے مدسوس (گمنام) کیا وہ گمراہ ہوا، یعنی اس کے ساتھ مکر کیا۔[2]

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ۝۱۱ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝۱۲ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝۱۳ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۥ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝۱۴ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝۱۵

قوم ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے (نبی کو) جھٹلایا⑪ جب اُٹھ کھڑا ہوا اس قوم کا بڑا بدبخت⑫ تو انھیں رسول اللہ نے کہا: اللہ کی اونٹنی (کی حفاظت کرو) اور اس کو پانی پلانے کی⑬ پھر انھوں نے اس کو جھٹلایا اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، تو ان کے رب نے ان کے گناہ کی وجہ سے ان پر تباہی ڈال کر سب کا صفایا کر دیا⑭ اور وہ اس (تباہی) کے انجام سے نہیں ڈرتا⑮

قصہ صالح علیہ السلام کی اونٹنی اور قوم ثمود کی ہلاکت کا:

اللہ تعالیٰ نے اس جگہ ثمود کے حال کی خبر دی کہ انھوں نے بغاوت اور سرکشی کے سبب سے اپنے رسول کو جھوٹا کہا۔ یہی قول امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ کا ہے۔[3] قبیلہ کے بدبخت سے مراد قدار بن سالف ہے، اسی نے اونٹنی کے پاؤں کاٹے تھے، اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے: ﴿ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ﴾ [القمر: ۲۹] "انھوں نے اپنے ساتھی کو آواز دی جس نے (اونٹنی پر) وار کیا اور (اس کی) کونچیں کاٹ دیں۔" یہ شخص قوم ثمود میں عزیز، شریف، صاحب قدر، نسیب، سردار تھا جس کی بات مانی جاتی تھی۔ عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ اشقیٰ ایک شخص تھا جو اپنے قبیلے میں عارم عزیز منیع تھا، جیسے کہ ابوزمعہ ہے۔[4] (رواه أحمد و البخاري و الترمذي)

سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما رفعاً کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا میں تجھ کو تمام لوگوں سے زیادہ بدبخت آدمی کے بارے میں نہ بتاؤں؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: یہ دو شخص ہیں: ایک احیمر ثمود جس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹیں اور دوسرا وہ جو تجھ کو زخمی کرے گا اس جگہ، یعنی پیشانی پر یہاں تک کہ تیری ڈاڑھی بھیگ جائے

① تفسير القرطبي (۲۰/۷۷)
② تفسير الطبري (۲٤/٤٥٧) فتح البيان (۱۵/۲۵۱_۲۵٦)
③ تفسير الطبري (۲٤/٤٥٨، ٤٥٩)
④ صحيح البخاري (٤٦٥٨) مسند أحمد (٤/١٧) سنن الترمذي (۳۳٤۳)

گی۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم)۔ اس جگہ رسول سے مراد صالح علیہ السلام ہیں، انھوں نے قوم ثمود سے کہہ دیا تھا کہ دیکھو یہ اللہ کی اونٹنی ہے، اس کو بری طرح ہاتھ نہ لگانا اور اس کے لیے پانی پینے کا جو دن مقرر ہو اس دن تم اس پر دست درازی اور زیادتی نہ کرنا، کیوں کہ اس کا دن الگ مقرر ہے اور تمھارا دن الگ، لیکن انھوں نے صالح علیہ السلام کو جھوٹا ٹھہرا کر اس اونٹنی کے پاؤں کاٹ ڈالے جس کو اللہ نے ایک سخت پتھر سے نشانی کے طور پر نکال کر حجت کو قائم کیا تھا۔ اس پر اللہ کو غصہ آیا، اللہ پاک نے ساری قوم پر اپنا عذاب اتار کر سب کو ایک ساتھ تباہ و برباد کر دیا۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم کو یہ بات پہنچی ہے کہ احیمر ثمود نے اونٹنی کی کونچیں اس وقت کاٹیں جب کہ سارے چھوٹوں بڑوں اور مردوں عورتوں نے اس سے بیعت کر لی تھی، ساری قوم عقر (کونچیں کاٹنے) میں شریک ٹھہری، اس لیے اللہ نے اُن سب کو ان کے گناہ کے سبب سے برابر کر دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایک سے بھی انجام کا ڈر نہیں رکھتا تھا، یعنی اسے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ یہی قول امام مجاہد، حسن اور بکر مزنی رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے اور امام ضحاک اور سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ عاقر انجامِ عقر سے نہ ڈرا کہ میں یہ کیا برا کام انجام دیتا ہوں۔ مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پہلا قول زیادہ بہتر ہے، سیاق اسی پر دلیل ہے۔[2] واللہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ ثمود نے اپنے رسول صالح علیہ السلام کو حرم زدگی کے طور پر جھٹلایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ طغویٰ اس عذاب کا نام ہے جو ثمود پر آیا تھا۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طغویٰ سے مراد "بِأَجْمَعِهَا" "سب کے سب" ہے۔[3] اس قوم کا بدبخت عقرِ ناقہ کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ مثل میں کہتے ہیں "أَشْأَمُ مِنْ قُدَارٍ" "قدار سے زیادہ منحوس۔" وہ أشقی اولین تھا اور ایک چھوٹے قد کا سرخ رنگ کا نوکدار آنکھوں والا آدمی تھا۔ صالح علیہ السلام نے ان سے یہ بات کہی تھی کہ یہ اللہ کا ناقہ ہے، تم ذرا اس سے بچتے رہو اور اس کے گھاٹ سے تعرض نہ کرنا (اسے نہ چھیڑنا) وہ اپنی باری سے پانی پیے، تم اپنی باری سے۔ ثمود نے اس تحذیر کو نہ سنا اور ناقہ کے پاؤں کاٹ ڈالے۔ وہ سب اس عقر پر راضی تھے، اس لیے ان سب پر اللہ کا عذاب آیا، اگرچہ عقر کرنے والا ایک ہے، اس بدبخت کا نام قدار بن سالف تھا۔ دمدمہ تضعیف و تردیدِ عذاب کو کہتے ہیں، یعنی وہ عذاب ان پر منطبق ہو گیا، وہ جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیے گئے، سب کے سب خاک سیاہ ہو گئے، کوئی بھی باقی نہ رہا، سوائے اس شخص کے جو صالح علیہ السلام پر ایمان لایا تھا۔ وہ چار ہزار آدمی تھے۔ اللہ نے ان کے ساتھ یہ کام کیا، اللہ کو کسی کا کچھ ڈر نہیں، بلکہ وہ جو چاہے سو کرے۔ مطلب یہ ہوا کہ جس طرح دنیا کے بادشاہ انجامِ بد سے ڈرتے ہیں، اللہ کسی انجام اور نتیجے سے خوف نہیں کرتا۔ عقبیٰ جزائے امر کو کہتے ہیں۔[4] واللہ أعلم.

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳۴۳۸/۱۰) اس کی سند میں "محمد بن خثیم" ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر الطبري (۴۶۲-۴۶۰/۲۴) تفسیر ابن کثیر (۶۶۸،۶۶۷/۴) [3] تفسیر الطبري (۶۵۹،۶۵۷/۲۴) [4] فتح البیان (۲۶۰-۲۵۷/۱۵)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الَّيْلِ

نمازِ ظہر وعصر اور نمازِ عشاء میں سورۃ اللیل کی قراءت:

اس سورت میں اکیس (۲۱) آیتیں ہیں۔ جمہور کے نزدیک یہ مکہ میں اتری ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کا بھی ہے۔ [1] بعض نے کہا ہے کہ مدینے میں نازل ہوئی ہے۔ سیدنا جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اور اس جیسی دوسری سورتوں کو ظہر وعصر میں پڑھتے تھے۔ [2] (أخرجه البيهقي)۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دوپہر کی نماز پڑھائی آواز بلند کی اور ﴿وَالشَّمْسِ﴾ اور ﴿وَالَّيْلِ﴾ پڑھی۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا اس نماز کے بارے میں آپ کو کوئی حکم ہوا ہے؟ فرمایا: نہیں۔ میں نے یہ چاہا کہ تمھارے لیے تعیین کروں۔ [3] (أخرجه الطبراني)

یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ تو نے ﴿سَبِّحِ اسْمَ﴾ اور ﴿وَالَّيْلِ﴾ کیوں نہ پڑھی۔ [4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس سورت کا نزول سماحت (فیاضی) اور بخل کے بارے میں ہوا ہے۔ [5] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سورت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور مسلمین پر ان کے خرچ کرنے کے بارے میں اور امیہ بن خلف اور اس کے کفر باللہ اور بخل کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اعتبار عمومِ لفظ کا ہے نہ کہ خصوصِ سبب کا۔ [6]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۙ﴿۱﴾ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ۙ﴿۲﴾ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰٓى ۙ﴿۳﴾ اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۭ﴿۴﴾ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۙ﴿۵﴾

(1) الدر المنثور (۸/۵۳۲) (2) سنن البيهقي الكبرىٰ (۲/۳۹۱)

(3) المعجم الأوسط (۹/۲۰٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه أبو الرجال الأنصاري البصري وهو منكر الحديث" (مجمع الزوائد: ۲/۲۹٤)

(4) صحيح البخاري (٦۷۳) صحيح مسلم (٤٦٥) (5) الدر المنثور (۸/۵۳۳) (6) تفسير الرازي (۳۱/۱۷۹)

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ
وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ وَمَا
يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۝

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔
رات کی قسم جب وہ چھا جائے① اور دن کی جب وہ روشن ہو② اور اس ذات کی جس نے نر اور مادہ پیدا کیا③ بے شک تمھاری کوشش (باہم) مختلف ہے④ پھر جس نے (اللہ کی راہ میں) دیا اور ڈرتا رہا⑤ اور اس نے نیک بات کی تصدیق کی⑥ تو یقیناً اسے عن قریب ہم آسان (راہ) کی توفیق دیں گے⑦ اور لیکن جس نے کنجوسی کی اور پروا نہ کی⑧ اور اس نے نیک بات کو جھٹلایا⑨ تو اسے عن قریب ہم تنگی کی (راہ کی) سہولت دیں گے⑩ اور جب وہ (دوزخ میں) گرے گا تو اسے اس کا مال کوئی فائدہ نہ دے گا⑪

﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى﴾ کی قراءت میں اختلاف کا بیان:

سیدنا علقمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں شام میں آیا، دمشق کی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھ کر کہا: ”اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ جَلِيْسًا صَالِحًا“ ”اے اللہ! مجھ کو کوئی نیک ہم نشین میسر کر۔ پھر سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا، انھوں نے کہا کہ تو کون ہے؟ میں نے کہا کہ میں کوفی ہوں۔ کہا: تو نے ابن ام عبد کو سنا ہے کہ وہ ﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى﴾ کو کس طرح پڑھتے تھے؟ میں نے کہا: ”والذكر والأنثى“ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ ان لوگوں نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ پھر کہا: کیا تم میں صاحبِ وساد اور صاحبِ سر نہیں ہیں جس کو سوا اس کے کوئی نہیں جانتا اور وہ شخص جو زبانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر شیطان سے محفوظ رکھا گیا ہے۔[1] (رواہ أحمد)

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اصحابِ عبداللہ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، انھوں نے ان کو ڈھونڈھ کر پایا اور کہا: تم میں کون سا شخص عبداللہ رضی اللہ عنہ کی قراءت پر قرآن پڑھتا ہے؟ کہا: ہم سب انھی کی قراءت پر قرآن پڑھتے ہیں۔ کہا: تم میں کون زیادہ حافظ ہے؟ لوگوں نے علقمہ کی طرف اشارہ کیا۔ پوچھا: تو نے اس سورت کو کس طرح پڑھتے سنا؟ کہا: ”والذكر والأنثى“ کہا: گواہ رہ! میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ وہ

[1] مسند أحمد (٦/٤٤٩)

اسی طرح پڑھتے تھے اور یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں یوں پڑھوں: ﴿ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ ﴾ واللہ! میں ان کی پیروی نہ کروں گا۔[1] بخاری کی روایت کے الفاظ یہ ہیں "هَكَذَا قَرَأَ ذَلِكَ ابْنُ مَسْعُودٍ وَأَبُو الدَّرْدَاءِ رضی اللہ عنہما" ''عبداللہ بن مسعود اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہما نے اس طرح پڑھا ہے۔'' اور جمہور نے اس کو اس طرح پڑھا ہے جس طرح کہ سائر آفاق میں مصحف امام عثمانی میں ثابت ہے۔ ﴿ وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ ﴾

اللہ تعالیٰ کا لوگوں کی کوشش کے مختلف نتائج کی قسم کھانا:

اللہ تعالیٰ نے رات کی قسم کھائی ہے، جبکہ وہ خلق کو اپنے اندھیرے سے ڈھانپ لے اور دن کی قسم کھائی ہے جبکہ وہ چمک اٹھے اور نر اور مادہ کے پیدا کرنے کی قسم اٹھائی ہے۔ یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَخَلَقْنَكُمْ أَزْوَاجًا ﴾ [النبا: ۸] ''اور ہم نے تمھیں جوڑا جوڑا پیدا کیا۔'' اور اس آیت کی طرح: ﴿ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ ﴾ [الذاریات: ۴۹] ''اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا۔'' متضاد اشیاء کے ساتھ قسم ہے۔ اس طرح جس چیز پر قسم کھائی ہے وہ بھی متضاد ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ بندوں کے اعمال جن کو وہ کماتے ہیں متضاد ہیں۔ کوئی شخص بھلائی کے کام کرتا ہے اور کوئی برائی کے کام کرتا ہے۔ جس شخص نے وہ دیا جس کا حکم تھا اور اپنے کاموں میں اللہ سے ڈرا اور اچھے کاموں کی جزا کی تصدیق کی۔ یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے اور خصیف نے کہا ہے کہ حسنیٰ سے مراد ثواب ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، ابو صالح اور زید بن اسلم رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ مراد خلف (بدلہ) ہے۔ سلمٰی وضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد "لا إله إلا الله" ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کی نعمت ہے جو اللہ نے اس کو دی ہے۔ امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد نماز، زکات اور روزہ ہے۔ کبھی کہا کہ صدقۂ فطر ہے۔[2] سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: حسنیٰ کیا ہے؟ فرمایا: جنت ہے۔[3] (رواہ ابن أبي حاتم)۔ میں کہتا ہوں: میرے خیال میں بھی اس جگہ اس حدیث پر اطلاع سے قبل یہی معنی گزرے ہیں۔ وللہ الحمد. یعنی اعطاء اور تقویٰ کے ساتھ ساتھ آخرت کی تصدیق کرنے والا بھی ہوا تو اس کے لیے خیر کا عمل کرنا آسان ہو جائے گا۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔

امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے لیے جنت آسان ہو جائے گی۔[4] بعض سلف نے کہا ہے کہ ثواب حسنہ، حسنہ ہے بعد حسنہ کے، جزائے سیئہ، سیئہ ہے بعد سیئہ کے، لہٰذا فرمایا کہ جس نے بخل کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یعنی مال خرچ نہ کیا اور اپنے رب سے بے پروا رہا اور حسنیٰ یعنی جزاء اور دارِ آخرت کی تصدیق نہ کی اس کو طریقِ شر پر چلنا آسان ہو جائے گا،[5] جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ

---

[1] صحيح البخاري (٤٦٦٠) صحيح مسلم (٨٢٤) [2] تفسير الطبري (٤٧٠،٤٦٩/٢٤) تفسير ابن كثير (٦٦٩/٤)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٤١/١٠) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے، نیز ''زہیر بن محمد'' ضعیف راوی ہے۔
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٤١،٣٤٤٠/١٠) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٤٠/١٠)

وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١١٠] ''اور ہم بھی ان کے دلوں کو اور ان کی نگاہوں کو پھیر دیں گے جیسا کہ یہ لوگ اس پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے اور ہم ان کو ان کی سرکشی میں حیران رہنے دیں گے۔'' اس بارے میں آیتیں بہت ہیں اور وہ سب اس بات پر دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ خیر کا قصد کرنے والے کو توفیق کی جزا دیتا ہے اور شر کا قصد کرنے والوں کو خذلان کی جزا دیتا ہے۔ یہ سب قدرِ مقدر سے ہوتا ہے، اس بات پر دلالت کرنے والی بہت سی احادیث آئی ہیں۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: کیا ہم اس چیز پر عمل کرتے ہیں جس سے فراغ ہو چکا یعنی جو مقدر کیا جا چکا؟ یا امرِ موتنف پر، یعنی جو آیندہ ہوگا؟ فرمایا: بلکہ اس چیز پر جس سے فراغ ہو چکا ہے۔ کہا: پھر عمل کرنا کس لیے ہے؟ فرمایا: « كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ »[1] (رواه أحمد) یعنی جو شخص جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہی کام کرنا اس کو آسان پڑتا ہے۔ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنازے پر بقیع غرقد میں تھے، فرمایا: تم میں سے کوئی شخص نہیں ہے لیکن اس کی جگہ جنت یا نار میں لکھ دی گئی ہے۔ کہا: کیا ہم توکل نہ کریں؟ فرمایا: تم عمل کیے جاؤ « كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ » پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ﴾[2] (رواه البخاري)۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند میل آنرا درویش انداختند

''ہر ایک کو ہر کام کے لیے بنایا، پھر اسی کام کے لیے اس کے دل میں رغبت رکھ دی۔''

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ ہم بقیع غرقد میں ایک جنازے میں تھے، اتنے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور بیٹھ گئے، ہم سب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد بیٹھ گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک ٹہنی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سر جھکا کر اس سے زمین کریدنے لگے۔ پھر فرمایا: تم میں کوئی شخص نہیں یا کوئی نفسِ منفوسہ نہیں ہے لیکن اس کی جگہ جنت یا نار میں لکھی گئی ہے اور نیک بخت یا بد بخت ہونا لکھ دیا گیا ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! تو کیا پھر ہم اپنی کتاب پر اعتماد کر کے عمل کرنا نہ چھوڑ دیں؟ ہم میں جو کوئی سعادت مند ہوگا وہ اہلِ سعادت ہو جائے گا اور جو کوئی ہم میں شقی ہوگا وہ اہلِ شقاوت ہو جائے گا۔ فرمایا: جو سعادت والے ہیں وہ اہلِ سعادت جیسے کام کرتے ہیں اور جو اہلِ شقاوت ہیں وہ بد بختوں جیسا کام کرتے ہیں۔ دونوں کو اپنا کام کرنا سہل و آسان ہو جاتا ہے۔ پھر آیتِ باب پڑھی۔[3] (أخرجه بقية الجماعة من طرق)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اے رسول اللہ! بھلا ہم جو یہ کام کرتے ہیں یہ کوئی ایسا کام ہے جس سے فراغ ہو

---

[1] مسند أحمد (١/٥) صحيح الجامع (٤٥٦١)
[2] صحيح البخاري (٤٦٦٦)
[3] صحيح البخاري (٤٦٦٥) صحيح مسلم (٤٦٤٧) سنن الترمذي (٣٣٤٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/٥١٦)

چکا ہے یا کوئی امرِ مبتدا یا مبتدع ہے؟ فرمایا: مفروغ منہ کرتے ہو اے ابن خطاب! تو عمل کیے جا، ہر کوئی "مُیَسَّر" ہے۔ جو شخص اہلِ سعادت سے ہوتا ہے وہ عملِ سعادت کرتا ہے اور جو کوئی اہلِ شقا سے ہوتا وہ بدبختی والا کام کرتا ہے۔[1] (رواه أحمد والترمذي وقال: حسن صحيح)۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اے اللہ کے رسول! کیا ہم اس امر کے لیے عمل کرتے ہیں جس سے فراغ ہو چکا ہے یا نئے سرے سے یہ کام کرتے ہیں؟ فرمایا: امرِ مفروغ منہ سے کرتے ہیں۔ سیدنا سراقہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ پھر عمل کس لیے ہے؟ فرمایا: « كُلُّ عَامِلٍ مُيَسَّرٌ لِعَمَلِهِ »[2] (رواه ابن جرير ومسلم) "ہر عامل کو اپنا مقدر عمل میسر آتا ہے۔"

بشیر بن کعب عدوی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دو جوان لڑکوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا ہم اس چیز میں عمل کرتے ہیں جس پر اقلام خشک ہو گئے اور تقدیریں جاری ہو چکیں یا کسی شے مستانف میں یعنی امرِ جدید میں عمل کرتے ہیں؟ فرمایا: بلکہ اس چیز میں جس پر اقلام خشک ہو چکیں اور مقادیر جاری ہو گئیں، کہا: تو پھر عمل کس لیے؟ فرمایا: « اِعْمَلُوْا فَكُلُّ عَامِلٍ مُيَسَّرٌ لِعَمَلِهِ الَّذِيْ خُلِقَ لَهُ » "عمل کرو، ہر عامل کو اپنا مقدر عمل میسر آتا ہے۔" ان دونوں نے کہا: "نَجِدُ وَنَعْمَلُ"[3] (رواه ابن جرير) "ہم سمجھ گئے اور ہم عمل کریں گے۔" سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمیں خبر دیں کہ ہم جو یہ کام کرتے ہیں اس سے فراغت ہو چکی ہے یا کوئی نئی بات ہے؟ فرمایا: فراغت ہو چکی ہے۔ کہا: پھر یہ عمل کیسا؟ فرمایا: « كُلُّ امْرِءٍ مُهَيَّأٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ »[4] (تفرد به أحمد) "ہر شخص کو وہ عمل مہیا ہو جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا۔"

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا: "کسی دن سورج نہیں ڈوبتا لیکن اس کے دونوں طرف دو فرشتے پکارتے ہیں جس کو ثقلین، یعنی جنوں اور انسانوں کے علاوہ ساری مخلوق سنتی ہے؛ « اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَأَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا » "اے اللہ! خرچ کرنے والے کو نعم البدل عطا کر اور روکنے والے کو تباہی مقدر کر۔" اللہ نے اس بارے میں قرآن اتارا ہے: ﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ﴾[5] (رواه ابن جرير وابن أبي حاتم مثله) پھر امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے نزولِ آیت کے بارے میں ایک غریب حدیث روایت کی ہے جس میں ایک قصہ بیعِ نخلہ کا چالیس درختِ نخلہ سے نقل کیا ہے۔[6] امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں اتری ہے، وہ مکہ میں اسلام لانے پر کچھ عجائز (بوڑھی عورتیں) اور نساء کو آزاد کرتے تھے، ان کے باپ نے کہا: اے بیٹے! تو

---

(1) مسند أحمد (٥٢/٢) سنن الترمذي (٢١٣٥)
(2) صحيح مسلم (٢٦٤٨) تفسير الطبري (٤٧٥/٢٤)
(3) تفسير الطبري (٤٧٥/٢٤) یہ روایت مرسل ہے۔
(4) مسند أحمد (٤٤١/٦) صحيح الجامع (٤٥١١)
(5) تفسير الطبري (٤٧١/٢٤) تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٤١/١٠) اس کی سند میں "عباد بن راشد" متکلم فیہ راوی ہے۔
(6) تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٣٩/١٠) اس کی سند میں "حفص بن عمر" ضعیف راوی ہے۔

ضعفاء کو آزاد کرتا ہے اگر تو طاقتوروں کو آزاد کرتا تو وہ تیرے ساتھ کھڑے ہو کر تجھ سے لوگوں کو باز رکھتے۔ کہا: اے باپ! میں وہ چیز چاہتا ہوں جو اللہ کے نزدیک ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کا مال کچھ اس کے کام نہ آئے گا جب وہ ہلاک ہو گا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب مرے گا۔[2] امام ابو صالح، مالک اور زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب آگ میں جا گرے گا۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ قسم ہے رات کی جبکہ وہ اس چیز کو چھپا لے جو روشن تھی۔ مراد آسمان و زمین کا ڈھانپ لینا ہے کیوں کہ رات کے آنے سے دن کی روشنی جاتی رہتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بلال رضی اللہ عنہ کو امیہ بن خلف سے ایک چادر اور دس اوقیہ کے عوض خرید کر اللہ کے لیے آزاد کر دیا، اس پر یہ سورت اتری: ﴿اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى﴾ تک۔ اس سے مراد سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور امیہ کی سعی ہے۔ حسنیٰ سے مراد بہشت ہے اور عسریٰ سے مراد دوزخ ہے۔[4] رات کو ہر جاندار اپنی جگہ میں آتا ہے اور تمام خلق حرکت سے ساکن ہو جاتی ہے اور سب سو جاتے ہیں اور بدن کو راحت اور روح کو غذا ملتی ہے۔ اس لیے اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے۔

پھر دن کی قسم کھائی، کیوں کہ وہ تاریکی کو دور کرتا ہے جو رات کو ہوتی ہے۔ سورج جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی چمک سے دنیا میں جو اندھیرا ہوتا ہے وہ جاتا رہتا ہے۔ اگر سارا زمانہ (ہر وقت) رات ہوتا تو معاش پیدا کرنا مشکل ہو جاتا اور اگر سارا وقت دن ہوتا تو راحت جاتی رہتی اس لیے مصلحت اسی میں ٹھہری کہ ایک کے بعد دوسرا آئے۔ پھر نر و مادہ کے پیدا کرنے کی قسم کھائی یعنی اس قادر عظیم کی جس نے ان کو بنایا۔ گویا اپنے نفسِ مقدس کی قسم کھائی۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کو ﴿وَمَا خَلَقَ﴾ کے بغیر پڑھا ہے۔ محلی نے کہا ہے کہ خنثیٰ مشکل ہمارے نزدیک ذکر ہے یا انثیٰ (یعنی مذکر ہے یا مؤنث) نہ اللہ کے نزدیک۔ اب جو کوئی یہ قسم کھائے گا کہ میں کسی نر و مادہ سے بات نہ کروں گا تو وہ خنثیٰ سے بات کرنے میں قسم توڑنے والا ہو گا۔[5] انتھیٰ. امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خنثیٰ گو ہمارے نزدیک مشکل ہے، لیکن اللہ کے نزدیک مشکل نہیں ہے، اس کو معلوم ہے کہ ذکر ہے یا انثیٰ۔

قسم کا جواب یہ ہے کہ تمھاری سعی گونا گوں ہے، یعنی تمھارے عمل مختلف ہیں، کوئی عمل جنت کا ہے اور کوئی نار کا یا کوئی تم میں مومن ہے اور کوئی کافر، یا کوئی جنت کا ثواب حاصل کرنے والا ہے اور کوئی آگ کا۔ یا کوئی راحم ہے، یعنی نرم دل اور کوئی قاسی، یعنی سخت دل اور کوئی حلیم ہے اور کوئی طائش، یعنی طیش میں آنے والا اور کوئی سخی ہے کوئی بخیل۔ جمہور مفسرین نے کہا ہے کہ اس جگہ "سعي" سے مراد عمل ہے کوئی اپنی جان چھڑاتا ہے اور کوئی اس کو ہلاک کرنے کی سعی کرتا ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٤٧١/٢٤) [2] تفسير الطبري (٤٧٦/٢٤) [3] تفسير ابن كثير (٦٧٢/٤)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٤٠/١٠) [5] تفسير الجلالين (٨١٠/١)

"شتّٰی"، "شیت"، کی جمع ہے۔ مختلف کو "شتّٰی" کہتے ہیں، پھر جس نے اپنا مال بھلائی کے کاموں میں خرچ کیا اور حرام کردہ چیزوں سے باز رہا اور اللہ کی طرف سے حصولِ خلف (یعنی خرچ کردہ مال کی جگہ اور مال حاصل ہونے) کا یقین کیا۔ مفسرین نے کہا ہے کہ یعنی معسرین (تنگ دست) کو دیا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اللہ کا حق جو اس پر تھا وہ ادا کیا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صدقِ دل سے دیا۔ "لا إله إلا الله" کی تصدیق کی۔ یہی قول امام ضحاک، سلمی اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے[1] تو ہم اس کو عملِ خیر کا بجالانا آسان کر دیں گے، وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے لگے گا اور اللہ کی اطاعت میں عمل کرنے لگے گا۔

اس جگہ حرفِ سین اللہ کی طرف تحقیق کے لیے ہے نہ کہ تسویف (تاخیر، جھوٹے وعدے) کے لیے۔ امام قسطلانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سین تلطیف (مہربانی) کے لیے ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے حق میں اتری ہے۔ کچھ ایمان والے اہلِ مکہ کے ہاتھوں میں گرفتار تھے۔ مکہ والے ان کو عذاب کرتے تھے۔[2] سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "یسریٰ" سے مراد خیر ہے۔ امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنت ہے۔[3] اور جس نے بخل کیا، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یعنی زکات نہ دی، مراد ابوسفیان بن حرب ہے،[4] اس پر خیر اور بھلائی کے اسباب دشوار کر دیتے ہیں۔ وہ فلاح کے کاموں کے لیے ضعیف ہو جاتا ہے، یہ ضعف اس کو آگ میں لے جائے گا۔ اس کے ہاتھ پر شر ہی جاری ہوتا ہے، اس کا مال اس کے اس کی ہلاکت کے وقت کچھ کام نہیں آتا۔ مراد مالِ غیر مزکی (ناپاک) ہے۔[5]

إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ﴿١٢﴾ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ﴿١٣﴾ فَأَنذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّىٰ ﴿١٤﴾ لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى ﴿١٥﴾ الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿١٦﴾ وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ﴿١٧﴾ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ ﴿١٨﴾ وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ ﴿١٩﴾ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ﴿٢٠﴾ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ ﴿٢١﴾

بے شک ہدایت دینا ہمارے ہی ذمے ہے (12) اور بے شک آخرت اور دنیا ہمارے ہی اختیار میں ہے (13) بالآخر میں نے تمھیں بھڑکتی آگ سے ڈرا دیا ہے (14) اس میں بڑا بدبخت ہی داخل ہوگا (15) جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا (16) اور بڑا متقی اس سے ضرور دور رکھا جائے گا (17) جو پاک

(1) تفسير القرطبي (٢٠/٨٣) (2) فتح القدير (٥/٦٠٥) (3) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٤٠، ٣٤٤١)
(4) تفسير الطبري (٢٤/٤٧٢) الدر المنثور (٨/٥٣٦) (5) فتح البيان (١٥/٢٦٣-٢٦٧)

ہونے کے لیے اپنا مال دیتا ہے ⑱ اور اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں جس کا بدلہ اسے دیا جائے ⑲ مگر صرف اپنے ربِ برتر کا چہرہ چاہتے ہوئے (مال خرچ کرتا ہے) ⑳ اور یقیناً وہ (اللہ) جلد اس سے راضی ہو گا ㉑

ہدایت دینا اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے:

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''هُدٰی'' سے مراد حلال وحرام بیان کرنا ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ ہدایت کے طریقوں پر چلانا ہے جو اللہ کی طرف پہنچاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ ﴾ [النحل: ۹] ''اور اللہ پر سیدھی راہ کا بتا دینا ہے۔'' پھر فرمایا کہ آخرت و اُولیٰ ہمارے لیے ہے۔ یعنی یہ سب ہماری ملکیت ہے، ہم ہی ان میں تصرف کرتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ نَارًا تَلَظّٰى ﴾ سے مراد تپتی آگ ہے جو خوب بھڑکتی ہو۔[2]

سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں فرمایا: «أَنْذَرْتُكُمُ النَّارَ أَنْذَرْتُكُمُ النَّارَ» یعنی میں نے تم کو آگ سے ڈرایا، یہاں تک کہ اگر کوئی آدمی بازار میں ہو تو وہ بھی سن لے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر جو کندھے پر تھی، وہ پاؤں کے قریب گر گئی۔[3] (رواہ أحمد) سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ رفعاً یہ ہیں کہ دوزخیوں میں سب سے ہلکا عذاب اس شخص کو ہو گا جس کے تلوؤں کے نیچے دو چنگاریاں رکھی جائیں گے، ان سے اس کا دماغ ہانڈی کی طرح جوش مارے گا۔[4] (رواہ أحمد)

ان سے مسلم کی روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ اہلِ نار میں سب سے کم درجے (اھون اہلِ نار) کے عذاب میں وہ شخص ہو گا جس کے لیے دو نعل (جوتیاں) اور دو شراک (تسمے) آگ کے ہوں گے، اس سے اس کا دماغ کھولے گا جس طرح کہ ہانڈی کھولتی ہے۔ وہ نہ دیکھے گا کہ کوئی شخص اس سے زیادہ تر عذاب میں ہے، حالاں کہ یہ سب سے ہلکے عذاب میں ہو گا۔[5] پھر فرمایا کہ داخل نہ ہو گا آگ میں مگر وہ شخص جو بڑا شقی ہے۔ آگ اس کو ہر طرف سے گھیرے گی۔ پھر بتایا کہ اشقیٰ وہ شخص ہے جس نے دل سے تکذیب کی اور عمل بالجوارح (اعضاء کے ساتھ عمل کرنے) سے پشت پھیری۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: داخل نہ ہو گا آگ میں مگر اشقیٰ۔ پوچھا: وہ کون ہے؟ فرمایا: جو طاعت پر عمل نہیں کرتا اور کسی معصیت کو اللہ کے لیے نہیں چھوڑتا۔[6] (رواہ أحمد)

---

① تفسیر الطبري (۲۴/۴۷۷) ② تفسیر الطبري (۲۴/۴۷۸)

③ مسند أحمد (۴/۲۷۲) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله رجال الصحيح'' (مجمع الزوائد: ۲/۴۱۳)

④ صحيح البخاري (۶۱۹۴) صحيح مسلم (۲۱۳) مسند أحمد (۴/۲۷۴)

⑤ صحيح مسلم (۳۱۳) ⑥ مسند أحمد (۲/۳۴۹) اس کی سند میں ''ابن لھیعہ'' ضعیف راوی ہے۔

سورۃ اللیل کی آخری پانچ آیتوں کا شانِ نزول اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت:

ان کی دوسری روایت یہ ہے کہ میری ساری امت قیامت کے دن بہشت میں جائے گی مگر جس نے انکار کیا، باز رہا، نہ مانا، پوچھا: وہ کون ہے؟ فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں جائے گا اور جس نے میری نافرمانی کی اسی نے نہ مانا۔[1] (رواه أحمد و البخاري)۔ پھر فرمایا کہ جو اتقیٰ ہے، یعنی تقی (تقویٰ شعار) نقی (پاک، خالص) وہ اس آگ سے سرکا دیا جائے گا۔ پھر فرمایا کہ اتقیٰ وہ شخص ہے جو اپنے مال کو اللہ کی اطاعت میں خرچ کرتا ہے تاکہ اپنی جان اور مال کو پاک کرے اور دین و دنیا کو سنوارے۔ یہ مال کا عطا کرنا کچھ اس لیے نہیں ہے کہ جس نے اس کے ساتھ کچھ سلوک اور احسان کیا ہے، اس کا بدلہ اتارے اور بہ مقابلہ نعمت کے دے، بلکہ یہ مال کا خرچ کرنا محض اللہ پاک کی ذات کے لیے ہے، تاکہ وہ راضی ہو اور آخرت میں اس کا دیدار پائے اور جنت کے باغات میں جائے۔ جو شخص ان صفتوں کا مالک ہے وہ جلد خوش دل ہوگا۔

بہت سے مفسرین کا قول یہی ہے کہ یہ آیت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں اتری ہے، یہاں تک کہ بعض نے اس پر اہلِ تفسیر کا اجماع نقل کیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس میں داخل ہیں اور اس امت کے سب سے پہلے شخص ہیں جو اس عموم میں داخل ہیں، کیوں کہ لفظ عام ہے اور صدیق رضی اللہ عنہ ان تمام صفات میں اور اوصافِ حمیدہ میں امت میں سب سے آگے اور پہلے ہیں۔ وہ صدیق رضی اللہ عنہ جو نہایت کریمانہ صفات کے حامل تھے، سخی تھے اور مال کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت میں خرچ کرنے والے تھے، انھوں نے ربِ کریم کی رضا کی خاطر بہت کچھ درہم و دینار خرچ کیے۔ کسی شخص کا احسان ان پر نہ تھا جس کے لیے وہ بدلہ دینے کے محتاج ہوتے، بلکہ سارے قبائل کے سرداروں اور رئیسوں پر انھی کا فضل و احسان تھا۔ اسی لیے عروہ بن مسعود، جو ثقیف کے سردار تھے، صلح حدیبیہ کے دن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: ''أَمَا وَاللّٰهِ لَوْ لَا يَدٌ لَكَ عِنْدِيْ لَمْ أَجْزِكَ بِهَا لَأَجَبْتُكَ''، یعنی اللہ کی قسم! اگر تمھارا احسان مجھ پر نہ ہوتا جس کا میں نے بدلہ نہیں اتارا ہے تو میں تمھاری بات کا جواب دیتا، حالاں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عروہ سے گفتگو سخت کی تھی۔ پس جبکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کا برتاؤ عرب کے سرداروں اور رؤساء اور قبائل کے ساتھ ایسا تھا تو اور لوگوں کا کیا ذکر ہے۔

لہٰذا اللہ پاک نے فرمایا: ﴿ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ﴾ صحیحین میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد کیا کہ جس نے کوئی جوڑا، یعنی کسی بھی چیز کا جوڑا اللہ کی راہ میں خرچ کیا تو اس کو جنت کے خازن اس طرح سے بلائیں گے کہ اے اللہ کے بندے! یہ خیر ہے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! ایسے آدمی کے متعلق پوچھنے کی کیا ضرورت ہے مگر کیا کوئی ان سب دروازوں سے بھی بلایا جائے گا؟ فرمایا: ہاں! اور مجھ کو امید ہے کہ تو انھی لوگوں میں سے ہوگا،[2] یعنی جو جنت کے سب دروازوں سے پکارے جائیں گے۔ ہر دروازے کا خازن کہے گا کہ ادھر آؤ ادھر آؤ۔

---

[1] صحیح البخاري (٦٨٥١) مسند أحمد (٣٦١/٢)
[2] صحیح البخاري (٢٦٨٦) صحیح مسلم (١٠٢٧)

باغ میں گل کھلے جاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں انگلیاں سرو اٹھاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم پر لازم ہے کہ ہدایت کے طریق کو گمراہی کے طریق سے الگ کر کے بیان کر دیں، چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا، دونوں راہیں ایک رغبت دلانے کے لیے اور دوسری ڈرانے کے لیے راہوں پر چلنے کے لیے بتا دیں، کوئی چیز چھپائی نہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے ذمے بیان کرنا ہے، یعنی حلال وحرام، فرمانبرداری اور نافرمانی کا۔[1] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ہم پر لازم ہے ہدایت کرنا اور گمراہ کرنا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ ﴾ [النحل: ۸۱] ''جو تمھیں گرمی سے بچائیں۔'' ''أَيْ: اَلْحَرَّ وَالْبَرْدَ'' [2] یا ہم پر ہدایت کا ثواب دینا ہے لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔

پھر فرمایا کہ جو کچھ دنیا اور آخرت میں ہے، وہ سب ہمارا ہے، ہمیں اس کے مالک ومختار اور اس میں متصرف ہیں۔ چنانچہ جو کوئی مانگے وہ ہم ہی سے طلب کرے، جس نے دنیا اور آخرت کا ثواب ہمارے غیر سے مانگا وہ راستہ چوک گیا۔ دیکھو میں نے تم کو بھڑکتی آگ سے، جس سے لو نکلتی ہے، ڈرا دیا ہے، یہ وہ آگ ہے جس میں ہمیشہ کے لیے بڑا بدبخت یعنی کافر جائے گا اگرچہ بعض گناہ گار بھی ایک مدتِ معین کے لیے اس میں داخل ہوں گے۔ یہ وہ اشقیٰ (بدبخت) ہے جس نے تکذیب کی، منہ موڑا، نہ رسول کو مانا اور نہ اللہ کی اطاعت اور ایمان کو اختیار کیا۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اشقیٰ وہ ہے جو اللہ کے علم میں شقی ٹھہر چکا ہے۔

تکذیب سے مراد صرف ظاہری تردید کرنا ہی نہیں ہے لیکن اس اطاعت میں کمی کرنا ہے جس کا حکم دیا گیا، اس کو جھٹلانا ٹھہرایا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی آیت کی وجہ سے مرجیہ نے یہ بات کہی ہے کہ دوزخ میں کافر کے سوا کوئی نہ جائے گا۔[3] اور اہلِ نار کے لیے منازل ہیں، منافقین درکِ اسفل (سب سے نچلے طبقے) میں ہوں گے۔ اللہ نے جس قسم کے عذاب کا وعدہ کیا ہے وہ اسی طرح کا عذاب کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ [النساء: ۴۸] ''یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے ساتھ شریک کیے جانے کو نہیں بخشتا اور اس کے سوا جسے چاہے بخش دیتا ہے۔'' سو اگر ہر غیر مشرک غیر معذب ہی ہو یعنی ہر وہ شخص جس نے شرک نہیں کیا اس کو عذاب نہیں کیا جائے گا، تو ﴿ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ کا کیا فائدہ تھا۔ کشاف میں کہا ہے کہ اس آیت کا ورود مشرکین اور مومنین کی دو عظیم حالتوں کے درمیان موازنہ کے طور پر ہوا ہے۔ اس لیے ان کی صفت کے بیان میں مبالغہ کیا گیا۔

اشقیٰ کو آگ میں داخل ہونے کے ساتھ مختص فرمایا، گویا آگ اسی کے لیے پیدا کی گئی ہے اور اتقیٰ کو نجات کے ساتھ مختص فرمایا، گویا جنت اسی کے لیے بنی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اشقیٰ سے مراد ابو جہل یا امیہ بن خلف ہے اور

---

[1] تفسير الطبري (۲۴/۴۷۷) [2] تفسير القرطبي (۲۰/۸۶) [3] تفسير القرطبي (۲۰/۸۷)

اتقیٰ سے مراد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔[1] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حصر اس آیت کے ساتھ تاویل کے طور پر ہے: ﴿ لِمَنۡ يَّشَآءُ ﴾ گویا مراد ابد کے لیے داخل ہونا اور ہمیشہ کے لیے واصل ہونا ہے۔[2] انتہیٰ. کیوں کہ فاسق کو اگر معاف کر دیا تو وہ سرے ہی سے آگ میں داخل نہ ہوگا اور اگر معاف نہ فرمایا اور آگ میں گیا تو ایک نہ ایک دن اس سے خلاصی پائے گا تو گویا معنی یہ ٹھہرے کہ داخلہ ابد تک کے لیے نہ ہو گا مگر کافر کے لیے جو شقی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے والا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ تم جنت میں جاؤ گے مگر جس نے نہ مانا، کہا: بھلا جنت میں جانے کو کون نہ مانے گا؟! اس پر انھوں نے یہ آیت پڑھی: ﴿ الَّذِيۡ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴾[3] (رواہ ابن جریر)

سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت یہ ہے: باقی نہ رہے گا اس امت میں سے کوئی لیکن اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا مگر وہ شخص جس نے سرکشی کی اللہ پر جس طرح کہ بد اونٹ اپنے اہل پر شوخی کرتا ہے۔[4] (رواہ سعید بن منصور)۔ کسی نے ان سے پوچھا تھا کہ بہت نرم بات جو تم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو وہ بتاؤ، کہا: میں نے سنا کہ فرماتے تھے: «أَلَا كُلُّكُمْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ شَرَدَ عَلَى اللّٰهِ شِرَادَ الْبَعِيرِ عَلَى أَهْلِهِ»[5] (رواہ أحمد والحاکم و الضیاء) ''ہر شخص جنت میں داخل ہو گا سوائے اس کے جس نے اللہ تعالیٰ پر اس طرح سرکشی کی جس طرح اونٹ اپنے مالکوں پر سرکشی کرتا ہے۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جو شخص مجھ سے بڑا ڈرنے والا ہے، یعنی کفر سے نہایت درجہ بچتا ہے، وہ آگ میں نہ جائے گا، بلکہ اس سے دور رہے گا۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمام مفسرین کے قول کے مطابق ﴿ الۡاَتۡقَى ﴾ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔[6]

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰٮكُمۡ ﴾ [الحجرات: ۱۳] ''اللہ کے نزدیک تم سب میں سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔'' ان دونوں آیتوں کے ملانے سے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بڑی فضیلت خاص کتابِ عزیز سے ثابت ہوئی۔ وللّٰہ الحمد۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ اشقیٰ واتقیٰ کو ہر اس شخص پر محمول کیا جائے جس میں یہ صفت موجود ہو اور اشقیٰ یعنی شقاوت (بدبختی) میں کامل شخص کافر ٹھہرے اور اتقیٰ یعنی تقویٰ میں کامل شخص مومن ٹھہرے۔ کیوں کہ کافر دوزخ سے دور نہ ہو گا اور مومن سے جنت نزدیک ہو گی تو اب بعض عصاۃ (گناہ گار) کا نار میں داخل ہونا اور بعض ایسے لوگوں سے جنت کا دور ہونا جو تقویٰ میں کامل نہ ہوں کچھ آیت کے منافی نہ ہوا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے خود ہی بتا دیا کہ اتقیٰ کون ہے جس طرح کی اشقیٰ کے متعلق بتا دیا۔ فرمایا: اتقیٰ وہ شخص ہے جو

---

[1] الکشاف (٤/٧٦٨) [2] تفسیر الجلالین (١/٨١١) [3] تفسیر الطبري (٢٤/٤٧٨)

[4] المعجم الکبیر (٨/١٨٥) الدر المنثور (٨/٥٣٧)

[5] مسند أحمد (٥/٢٥٨) مستدرك الحاکم (١٢٣) السلسلة الصحیحة (٢٠٤٣) [6] فتح القدیر (٥/٦٠٦)

اپنا مال خیرات کے راستوں میں دیتا رہتا ہے، تاکہ اللہ کے نزدیک زکی ہو۔ یہ دینا کچھ دکھانے سنانے کے لیے نہیں ہے اور نہ اس لیے کہ اس پر کسی کا احسان تھا جس کا بدلہ اتارتا ہو، بلکہ یہ دینا خاص اللہ تعالیٰ کی ذات کی جستجو کے لیے ہے۔ سو وہ شخص اس دینے اور عطا کے بدلے عنقریب خوش ہو گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا صدیق رضی اللہ عنہ سے وعدہ ہے کہ ان کا مطلوب و مرغوب ان کو کمال درجے کا حاصل ہو گا جس سے وہ راضی ہوں گے۔ اس جگہ پر یہ بندہ عاصی بھی کہتا ہے کہ اے رب! تو مجھ کو بھی اس آیت کے مصداق کرنا اور شقی سے بچانا میں بھی تیرے بندۂ عالی مقام صدیق رضی اللہ عنہ کا ہم نام ہوں اگرچہ اعمال میں ان سے کئی مرحلے دور ہوں لیکن "اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ وَأَنْتَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ" سو جیسا کہ تو سچا ہے ویسا ہی تیرا رسول بھی سچا ہے اور تجھ سے ناامیدی کفر ہے پھر میں کس لیے ناامید ہوں! ولا حول ولا قوة إلا بالله.[1]

[1] فتح البیان (١٥/٢٦٨-٢٧٢)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوۡرَةُ الضُّحٰی

اس سورت میں گیارہ (۱۱) آیتیں ہیں۔ یہ بلا اختلاف مکے میں اتری ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔[1] ابوالحسن مقری جب اس سورت پر پہنچتے تو تکبیر کہتے، یعنی "اللّٰہ أکبر" کہتے۔ مناسبت کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ وحی کے آنے میں دیر ہوئی کچھ مدت گزر گئی، پھر سورت آئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرحت اور سرور کے طور پر "اللّٰہ أکبر" کہا، مگر اس کی سند چوکس نہیں ہے۔[2] بخاری و مسلم کی روایت جندب بجلی رضی اللہ عنہ سے یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیمار پڑ گئے۔ دو یا تین رات نہ اٹھے، ایک عورت نے آ کر کہا: اے محمد! میں دیکھتی ہوں کہ تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا ہے دو تین رات سے وہ تیرے نزدیک نہیں آیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت اتاری۔[3] یہ عورت ام جمیل ابولہب کی بیوی تھی۔

سیدنا جندب رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جبریل علیہ السلام کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے میں دیر لگی۔ مشرکین نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم رخصت کر دیے گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى﴾[4] ان کی تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جبریل علیہ السلام نہ آئے اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کی ایک بیٹی نے کہا: میں نہیں خیال کرتی مگر یہ کہ تیرے صاحب نے تجھ کو دشمن رکھا۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔[5] اس کے علاوہ اور بھی سببِ نزول بیان کیے ہیں، لیکن یہ زیادہ بہتر ہے جو یہاں پر ذکر کیا گیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قراء کا تکبیر کہنے کے مقام کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ تکبیر ﴿وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى﴾ کے بعد کہی۔ دوسروں نے کہا ہے کہ ﴿وَالضُّحٰى﴾ پر کہی۔ پھر بعض نے کہا ہے کہ "اللّٰہ أکبر" کے الفاظ کہے اور بعض کا قول ہے کہ "اللّٰہ أکبر لا إله إلا اللّٰہ واللّٰہ أکبر" کہے۔[6]

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَالضُّحٰى ۙ﴿۱﴾ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ﴿۲﴾ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ؕ﴿۳﴾

[1] الدر المنثور (۸/۵۳۹) [2] تفسیر ابن کثیر (۴/۶۷۳، ۶۷۴) [3] صحیح البخاري (۴۶۶۷) صحیح مسلم (۱۷۹۷)
[4] صحیح مسلم (۱۷۹۷) [5] المعجم الکبیر (۲/۱۷۳) [6] تفسیر ابن کثیر (۴/۶۷۴)

وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝۴ وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝۵
اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝۶ وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝۷ وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا
فَاَغْنٰى ۝۸ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝۹ وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰
وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝۱۱

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

دھوپ چڑھنے کے وقت کی قسم! ① اور رات کی جب وہ چھا جائے ② (اے نبی!) آپ کے رب نے آپ کو نہ چھوڑا اور نہ ناراض ہوا ③ اور یقیناً آپ کے لیے آخرت، دنیا سے بہت بہتر ہے ④ اور جلد آپ کا رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے ⑤ کیا اس نے آپ کو یتیم نہ پایا، پھر ٹھکانا دیا ⑥ اور آپ کو ناواقفِ راہ پایا، پھر ہدایت بخشی ⑦ اور آپ کو تنگ دست پایا، پھر مال دار کر دیا ⑧ لہٰذا آپ یتیم پر سختی نہ کریں ⑨ اور سوالی کو نہ جھڑکیں ⑩ اور اپنے رب کی نعمت کا ذکر کرتے رہیں ⑪

سورۃ الضحیٰ کا شانِ نزول:

نبی اکرم ﷺ کو کئی دن وحی نہ آئی دل مکدر رہا، تہجد کے لیے نہ اٹھے۔ کافروں نے کہا کہ اس کو اس کے رب نے چھوڑ دیا۔ پھر یہ سورت اتری۔ پہلے روشن دھوپ کی اور اندھیری رات کی قسم کھائی، یعنی ظاہر میں یہی اللہ کی دو قدرتیں ہیں۔ باطن میں بھی کبھی چاندنی ہے کبھی اندھیرا۔ دونوں اللہ کے ہیں، اللہ سے بندہ دور کبھی نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے باپ آپ ﷺ کو ماں کے پیٹ میں چھوڑ کر مر گئے، دادا نے پالا، وہ آٹھ برس کا چھوڑ کر مر گئے، پھر چچا نے پالا، جب تک جوان ہوئے۔ جب نبی اکرم ﷺ جوان ہوئے تو قوم کی راہ و رسم سے بے زار تھے اور اپنے پاس کوئی رسم و راہ نہ تھی۔ اللہ پاک نے دینِ حق نازل کیا۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اپنی قوم میں اشراف بھی تھیں اور مالدار بھی تھیں ان سے نکاح ہوا انھوں نے سب مال آپ کی خدمت میں حاضر کیا۔ انتہیٰ.

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہی سورت ہے جس کو جبریل علیہ السلام نے ابطح میں اپنی اصل صورت میں ظاہر ہو کر وحی کی تھی، اللہ نے اس میں ضحیٰ کی روشنی کی قسم کھائی ہے اور سکون اور رات کے اندھیرے کی قسم کھائی ہے۔ یہی قول امام مجاہد، قتادہ اور ضحاک رحمہ اللہ کا ہے۔[1] یہ ظاہر دلیل ہے ان اشیاء کے خالق کی قدرت پر جیسا کہ اللہ تعالیٰ

---

[1] تفسير الطبري (٢٤/٤٨٤)

نے فرمایا: ﴿ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۝ وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى ﴾ [الليل: ۱- ۲] ''قسم ہے رات کی جب چھا جائے اور قسم ہے دن کی جب روشن ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾ [الأنعام: ٩٦] ''وہ صبح کا نکالنے والا ہے اور اس نے رات کو راحت کی چیز بنایا ہے اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا ہے، یہ ٹھہرائی ہوئی بات ہے ایسی ذات کی جو قادر ہے بڑے علم والا ہے۔'' وداع سے مراد رخصت کرنا اور ﴿ قَلٰى ﴾ سے مراد بغض ہے۔

آخرت دنیا سے بہتر ہے:

پھر آخرت کو دنیا سے بہتر فرمایا، لہٰذا نبی کریم ﷺ تمام لوگوں سے زیادہ زاہد (پرہیز گار) تھے اور سب سے بڑھ کر تارک تھے۔ چنانچہ یہ بات سیرتِ نبوی ﷺ سے ضرورتاً معلوم ہے کہ آپ کو جب اختیار دیا گیا کہ چاہو آخر دنیا تک دنیا میں رہو اور چاہو تو اللہ کے پاس جاؤ اور جنت میں رہو تو آپ ﷺ نے اسی چیز کو اختیار کیا جو اللہ کے پاس ہے اور اس دنیائے دنی (ناقص، کمینہ) کو پسند نہ کیا۔

دنیائے دنی کو جو فانی سمجھے اور قصۂ عمر کو کہانی سمجھے
دریائے حقیقت کو وہی جاوے تر جو مثل حباب زندگانی سمجھے

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی اکرم ﷺ بوریے پر سوئے، آپ ﷺ کے پہلو میں اس کا نشان پڑ گیا، جب آ کر میں آپ ﷺ کے پہلو میں مسح کرنے لگا اور میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ حکم نہیں دیتے کہ آپ کے لیے اس بوریے پر کچھ بچھا دیں۔ فرمایا: مجھ کو دنیا سے کیا کام ہے، میری اور دنیا کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی سوار درخت کے سائے کے نیچے ٹھہر کر اور ذرا سا آرام لے کر چل دے۔[1] (رواه أحمد والترمذي وقال: حسن صحيح)

آخرت کی بے شمار نعمتیں نبی مکرم ﷺ کی منتظر ہیں:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیرا رب دارِ آخرت میں تجھ کو وہ چیز دے گا جس سے تو راضی اور خوش ہو گا۔ یعنی اپنے اور امت کے حق میں تو خوش ہو گا۔ اس عطا میں سے ایک کوثر ہے جس کے دونوں کناروں پر لؤلؤ مجوف کے قبے ہوں گے اور اس کی مٹی مشک اذفر ہو گی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی امت پر جو فتوحات ہونے والی تھیں، وہ ایک ایک خزانے کے طور پر آپ ﷺ کے سامنے لائے گئے۔ آپ ﷺ خوش ہوئے، اللہ نے یہ آیت بھیجی: ﴿ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ﴾ اور جنت میں آپ ﷺ کو ایک ہزار قصر (محل) دیے، ہر قصر میں اس جگہ کے لائق ازواج اور خدام ہوں گے۔[2] (رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم و إسناده صحيح)

---

[1] مسند أحمد (۱/۳۹۱) سنن الترمذي (۲۳۷۷) السلسلة الصحيحة (٤٣٧)

[2] تفسير الطبري (٢٤/٤٨٧) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٤٣)

ایسی بات توقیف ہی سے کہی جاتی ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ من جملہ رضا کے جو نبیِ مکرم ﷺ کو حاصل ہو گی؛ ایک یہ بات ہے کہ آپ کے گھر والوں میں سے کوئی شخص دوزخ میں نہ جائے۔[1] (رواه ابن جرير وابن أبي حاتم)۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد شفاعت ہے۔ یہی قول امام باقر رحمہ اللہ کا بھی ہے۔[2] عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ ہم اہلِ بیت کے لیے اللہ نے آخرت کو دنیا پر اختیار کیا ہے۔[3]

رسول اللہ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات:

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو گنا جو اپنے بندے اور رسول پر کی ہیں۔ ان سب میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ ان کو یتیم (بغیر باپ کے) پاکر جگہ دی۔ آپ ﷺ ماں کے پیٹ میں تھے کہ باپ مر گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ آپ ﷺ کے باپ کا انتقال آپ ﷺ کی ولادت کے بعد ہوا۔ پھر آپ ﷺ کی ماں حضرت آمنہ بنت وہب نے انتقال کیا، اس وقت آپ چھ برس کے تھے۔ پھر آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کفیل ہوئے اور وہ ہمیشہ آپ ﷺ کی مدد کرتے، آپ ﷺ کی قدر و عزت کرتے، قوم کی اذیت سے بچاتے یہاں تک کہ جب آپ ﷺ چالیس برس کے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو مبعوث کیا۔ ابو طالب ہجرت سے پہلے مر گئے اور قریش کے کم عقل اور جاہل لوگوں نے پیش قدمی شروع کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لیے ہجرت اختیار فرمائی اور ان لوگوں کے درمیان سے نکال کر اَوس اور خزرج کے شہر میں پہنچا دیا، وہ آپ کے انصار ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت اسی طرح پر پوری اور مکمل طور پر جاری ہے۔ جب آپ ﷺ مدینے میں آئے، انصار نے آپ ﷺ کے ہمراہ ہو کر آپ ﷺ کے سامنے قتال اور جہاد کیا۔ یہ سب آپ ﷺ کے حال پر اللہ تعالیٰ کی حفاظت، پاسبانی اور عنایت تھی۔

پھر فرمایا کہ ہم نے تجھ کو بھٹکا ہوا پا کر راہ دی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۚ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ﴾ [الشورىٰ: ٥٢] ”اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح کو اتارا ہے، آپ اس سے پہلے یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کتاب اور ایمان کیا چیز ہے؟ لیکن ہم نے اسے نور بنایا، اس کے ذریعے سے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔“ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ بچپن کے زمانے میں مکہ کے کسی قبیلے میں راہ بھول گئے تھے، پھر راہ پالی۔ بعض نے کہا ہے کہ اپنے چچا کے ساتھ شام کے راستے میں ایک ناقہ (اونٹ) پر سوار شب کے وقت چلے جاتے تھے کہ ابلیس نے آ کر راہ بھلا دی، اتنے میں جبریل علیہ السلام آئے اور ایک ایسی پھونک ماری کہ ابلیس حبشہ میں جا گرا، پھر آپ ﷺ کی سواری کو راہ پر لگا دیا۔[4] (حكاهما البغوي)

---

[1] تفسير الطبري (٢٤/٤٨٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٤٣) تفسير ابن كثير (٤/٦٧٥)

[3] سنن ابن ماجه (٤٠٨٢) اس کی سند میں ”یزید بن ابی الزیاد“ ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٥٢٠٣)

[4] تفسير البغوي (٨/٤٥٦)

پھر فرمایا کہ ہم نے تجھ کو مفلس پا کر تونگر کر دیا۔ یعنی تم ایک فقیر عیال دار تھے، تم کو اپنے سوا سب سے بے نیاز کر دیا، آپ ﷺ کو مقامِ فقیرِ صابر وغنیٔ شاکر کا جامع بنایا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعثت سے قبل یہ رسول اللہ ﷺ کے منازل ہیں۔[1] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «لَيْسَ الْغِنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلَكِنَّ الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ»[2] یعنی تونگری بدل ست نہ بہ مال۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما رفعاً کہتے ہیں کہ مراد کو پہنچا وہ شخص جو اسلام لایا اور اس کا رزق کفاف ہے اور اس نے اللہ کے دیے ہوئے پر قناعت کی۔[3] (رواہ مسلم)

نعمتوں کی قدردانی مگر کیسے؟!

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو یتیم کو مت دبا اور اس کو خوار و مقہور نہ کر، بلکہ اس کے ساتھ احسان سے پیش آ، کیوں کہ تو بھی ایک وقت میں یتیم تھا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی یتیم کے لیے مہربان باپ کی طرح ہو جا اور سائل کو مت جھڑک، بلکہ اس کو جو بن سکے وہ دے، یعنی علم یا مال سے، کیوں کہ تو بھی بھٹکا ہوا تھا اللہ نے تجھ کو راہ سمجھائی۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اللہ کے کمزور (تنگدست) بندوں پر جبار متکبر اور فحاش (بد زبان) اور فظ (سخت دل) مت بن۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی مسکین کو رحمت اور نرمی کے ساتھ پھیر،[4] اور اپنے رب کی نعمت کا ذکر کر، کیوں کہ تو عیالدار تھا، اسی نے تجھ کو غنی کر دیا۔ دعائے ماثور میں آیا ہے: «وَاجْعَلْنَا شَاكِرِينَ لِنِعْمَتِكَ مُثْنِينَ بِهَا عَلَيْكَ قَابِلِيهَا وَأَتِمَّهَا عَلَيْنَا»[5] ''ہمیں اپنی نعمت کے شکر گزار اور ثنا خواں بنا اور ہم پر اس کا اتمام فرما۔'' ابونضرہ کہتے ہیں کہ مسلمین کا یہ اعتقاد تھا کہ ایک شکرِ نعمت یہ ہے کہ اس کا بیان کرے۔[6] سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں منبر کے اوپر فرمایا ہے: «مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ الْقَلِيلَ لَمْ يَشْكُرِ الْكَثِيرَ وَمَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ وَالتَّحَدُّثُ بِنِعْمَةِ اللّٰهِ شُكْرٌ وَتَرْكُهَا كُفْرٌ وَالْجَمَاعَةُ رَحْمَةٌ وَالْفُرْقَةُ عَذَابٌ»[7] (رواه عبدالله بن أحمد و إسناده ضعيف) ''جس نے تھوڑے پر شکر نہیں کیا اس نے زیادہ پر بھی شکر نہیں کیا، جس نے لوگوں کا شکر ادا نہ کیا اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہ کیا، اللہ تعالیٰ کی نعمت کا بیان شکر ہے اور اس کا ترک کفر ہے، جماعت رحمت اور اختلاف عذاب ہے۔''

صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ انصار سارا اجر لے گئے۔ فرمایا: نہیں جب تک تم اللہ سے ان کے لیے دعا کرو گے اور ان کی تعریف کرتے رہو گے[8] یعنی اس وقت تک تم کو بھی اجر ملتا رہے گا۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ رفعاً یہ ہیں: «لَا يَشْكُرُ اللّٰهَ مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ»[9] (رواه أبو

---

[1] تفسير الطبري (٢٤/٤٨٨) [2] صحيح البخاري (٦٠٨١) صحيح مسلم (١٠٥١) [3] صحيح مسلم (١٠٥٤)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٤٤) تفسير ابن كثير (٤/٦٧٦) [5] سنن أبي داود (٩٦٩)
[6] تفسير الطبري (٢٤/٤٨٩) [7] مسند أحمد (٤/٢٧٨) السلسلة الصحيحة (٦٦٧)
[8] سنن أبي داود (٤٨١٢) صحيح الأدب المفرد (١/٩٨) البتہ صحیحین میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں ملی ہے۔
[9] سنن أبي داود (٤٨١١) سنن الترمذي (١٩٥٤) صحيح الجامع (٧٧١٩)

داود والترمذي وقال: صحيح) ”جو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتا وہ لوگوں کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔“ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «مَنْ أُبْلِيَ بَلَاءً فَذَكَرَهُ فَقَدْ شَكَرَهُ وَمَنْ كَتَمَهُ فَقَدْ كَفَرَهُ» [1] (تفرد به أبو داود) ان کی دوسری روایت کے الفاظ رفعاً یہ ہیں: «مَنْ أُعْطِيَ عَطَاءً فَوَجَدَ فَلْيَجْزِ بِهِ فَإِنْ لَّمْ يَجِدْ فَلْيُثْنِ بِهِ، فَمَنْ ثَنَى بِهِ فَقَدْ شَكَرَ وَمَنْ كَتَمَهُ فَقَدْ كَفَرَ» [2] (رواه أبو داود) ”جس کی آزمائش ہوئی تو اس نے اللہ کا ذکر کیا تو اس نے اس کا شکر ادا کیا اور جس نے اسے چھپایا تو یقیناً اس کا کفران کیا۔“ یعنی جس کو دیا گیا اگر وہ پائے تو بدلہ دے۔ نہ پائے تو ثنا کرے، جس نے ثنا کی اس نے شکر ادا کیا، جس نے چھپایا اس نے کفرانِ نعمت کیا۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نعمت سے مراد یہ ہے کہ تیرے رب نے تجھ کو نبی بنایا، تجھ کو قرآن دیا۔[3] سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جو خیر تجھ کو معلوم ہو تو اس کا ذکر اپنے بھائیوں سے کر۔[4] امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو نعمت اور عزت تجھ کو اللہ کی طرف سے آئی، جیسے نبوت تو اس کو بیان کر اور لوگوں سے کہہ اور اُن کو اس کی طرف دعوت دے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کی نعمت کا ذکر اپنے گھر والوں سے، جن پر اطمینان تھا، مخفی طور پر کرتے تھے۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نماز فرض ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے لگے۔[5]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ضحیٰ سے مراد سارا دن ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ﴾ اصل میں ضحیٰ آفتاب کے اونچا ہونے کا نام ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ مراد ضحیٰ ہے بغیر تعیین کے۔ امام قتادہ، مقاتل اور جعفر صادق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد وہ ضحیٰ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بات چیت کی تھی اور رات سے مراد شبِ معراج ہے[6] یا ضحیٰ سے مراد وہ گھڑی ہے جس میں جادوگر سجدے میں گرے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴾ [طٰہٰ: ۵۹] ”اور یہ کہ لوگ دن چڑھتے ہی جمع ہو جائیں۔“ یا مراد ربِ ضحیٰ ہے، یا ضحیٰ سے مراد نورِ جنت ہے اور لیل سے مراد جہنم کا اندھیرا ہے۔ یا ضحیٰ قلوبِ عارفین کا نور ہے اور لیل کافروں کے دل کی سیاہی ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

اس جگہ دن کو رات سے پہلے ذکر کیا ہے اور پہلی سورت میں رات کو دن سے پہلے ذکر کیا تھا، اس لیے کہ ہر ایک دوسرے کے پیچھے آتا ہے اور دنیا کی اصلاح میں ہر ایک کا ایک نمایاں اثر ہے۔ اگرچہ رات کو پہلے آنے کی فضیلت ہے اور دن کو نور کی فضیلت ہے، اس لیے کبھی اِس کو پہلے ذکر کیا اور کبھی اُس کو۔ یا سورۂ ابوبکر رضی اللہ عنہ (اللیل) میں رات کو پہلے ذکر کیا، کیوں کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کفر سابق تھا اور سورت محمد میں دن کو پہلے ذکر کیا، کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نورِ محض سابق تھا اور کوئی گناہ مقدم نہ ہوا تھا اور ان دونوں سورتوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے، یہ

---

[1] سنن أبي داود (٤٨١٤) السلسلة الصحيحة (٦١٨) [2] سنن أبي داود (٤٨١٣) صحيح الترغيب والترهيب (٢٣٤/١)
[3] تفسير الطبري (٤٨٩/٢٤) تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٤٤/١٠) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٤٤/١٠)
[5] تفسير ابن كثير (٦٧٧/٤) [6] تفسير القرطبي (٩١/٢٠)

سارے اقوال لطیف نکتوں کی قسم سے ہیں، کچھ کتاب اللہ کی تفسیر نہیں ہیں۔

امام مجاہد، قتادہ، ابن زید اور عکرمہ رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ ﴿سَجٰى﴾ بہ معنی "سَکَنَ" ہے۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی "عظٰی" ہے۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "سجو" ہے، دلیل یہ ہے کہ دن کو چھپا لے جس طرح کوئی شخص کپڑے میں لپٹ جاتا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رات اپنے اندھیرے سے ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿سَجٰى﴾ بہ معنی "أقبل" ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی "استوٰی" ہے [1] لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے، اس پر جمہور مفسرین اور اہلِ لغت ہیں، یعنی مراد سکونِ لیل ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بہ معنی "أذهب" ہے۔ [2] یہ قول کہ نہ تو تیرے رب نے تجھے چھوڑا اور نہ وہ بے زار ہو گیا ہے، قسم کا جواب ہے۔ پھر کہا کہ آخرت، یعنی جنت تیرے لیے اولیٰ، یعنی دنیا سے بہتر ہے۔ حالاں کہ دنیا میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شرفِ نبوت دیا گیا جس کے مقابلے میں ہر شرف صغیر ہے اور دنیا کی ہر عزت حقیر ہے، لیکن چونکہ دنیا بشری کدورتوں سے آلودہ اور عوارض سے گدلی ہے اور اس جگہ کی زندگی خواب اور سراب اور زائل ہو جانے والے سائے کی طرح ہے، اس لیے آخرت کی بہ نسبت دنیا کچھ چیز نہیں ہے۔ ہاں اس اعتبار سے کہ دنیا خیر کے حصول کا ایک ذریعہ ہے جس سے جنت حاصل ہو سکتی ہے، اس لیے فی الجملہ خیر بھی ہے، لیکن ہر ایک کے لیے نہیں، لہٰذا ﴿خَيْرٌ لَّكَ﴾ فرمایا ہے۔ امام بقاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگ چار قسم کے ہیں: ایک وہ ہیں جن کو دارین (دونوں جہان) میں خیر ہے۔ یہ اہلِ طاعت ہیں اور اغنیاء ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جن کو دارین (دونوں جہاں) میں شر ہے، یہ اہلِ کفر اور فقراء ہیں۔ تیسرے وہ ہیں کہ جن کے لیے دنیا کی صورت خیر کی ہے اور آخرت میں شر کی ہے، یہ اہلِ کفر اور اغنیاء ہیں۔ چوتھے وہ جن کے لیے دنیا میں صورت شر کی ہے اور آخرت میں خیر ہے، یہ فقراء مومنین ہیں۔ [3] (ذكره الخطيب)

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وعدہ ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ ہر عطا کو شامل ہے جو اللہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عنایت فرمائی، جیسے نفس کا کمال اور امر اور دین کا ظہور اور غلبہ اور جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ذخیرہ کر رکھا ہے اور ہم کو اس کی کیفیت معلوم نہیں۔ [4] یا مراد حوض اور شفاعت ہے، یا جوہر کے ہزار محل۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری امت بہشت میں جائے۔ [5] سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث جو صحیح مسلم میں ہے، وہ بھی اسی پر دلالت کرتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول پڑھا: ﴿فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ﴾ [إبراهيم: ٣٦] "پس میری تابعداری کرنے والا میرا ہے۔"

---

[1] تفسير القرطبي (٩٢،٩١/٢٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٤٢/١٠) [3] نظم الدرر للبقاعي (٤٥٦/٨)
[4] تفسير البيضاوي (٥٠٢/٥) [5] شعب الإيمان (١٦٤/٢)

اور عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول پڑھا: ﴿ إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ﴾ [المائدۃ: ۱۱۸] ''اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو معاف فرما دے تو تو زبردست ہے حکمت والا ہے۔'' پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر فرمایا: ''اَللّٰهُمَّ أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ'' اور روئے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے جبریل! تم جاؤ اور محمد ﷺ سے کہو: « إِنَّا سَنُرْضِيْكَ فِيْ أُمَّتِكَ وَلَا نَسُوْؤُكَ » [1] یعنی ہم تم کو تمھاری امت کے بارے میں خوش کر دیں گے رنجیدہ نہ کریں گے۔

حرب بن شریح رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن علی بن حسین رحمہ اللہ سے کہا: کیا اس رضا سے مراد شفاعت ہے جس کا چرچا اہلِ عراق کرتے ہیں اور یہ سچ ہے؟ کہا: ہاں، اللہ کی قسم! مجھ سے محمد بن حنیفہ نے کہا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے رفعاً روایت کیا ہے کہ « أَشْفَعُ لِأُمَّتِيْ حَتّٰى يُنَادِيَنِيْ رَبِّيْ أَرَضِيْتَ يَا مُحَمَّدُ؟ فَأَقُوْلُ: نَعَمْ يَا رَبِّ رَضِيْتُ » ''میں اپنی امت کی شفاعت کروں گا تو اللہ تعالیٰ مجھے کہے گا: اے محمد! کیا تم راضی ہو؟ میں کہوں گا: ہاں، اے رب! میں راضی ہوں۔'' پھر میری طرف متوجہ ہو کر کہا: تم اے عراق والو! یہ بات کہتے ہو کہ اللہ پاک کی کتاب میں بڑی امیدواری کی آیت یہ ہے: ﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ؕ ﴾ [الزمر: ۵۳] ''(میری جانب سے) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے تم اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جاؤ، بالیقین اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔''

میں نے کہا: ہاں ہم یہ بات کہتے ہیں۔ کہا: ہم اہلِ بیت اس کے قائل ہیں کہ بڑی امیدواری کی آیت یہ ہے: ﴿ وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ﴾ اور یہ شفاعت ہے۔ [2] سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے، وہ چکی پیس رہی تھیں اور اونٹ کی کھال کا ایک کمبل اوڑھے ہوئے تھیں۔ آپ ﷺ نے ان کو دیکھ کر فرمایا: اے فاطمہ! « تَعَجَّلِيْ مَرَارَةَ الدُّنْيَا بِنَعِيْمِ الْآخِرَةِ » ''آخرت کی نعمت کے بدلے دنیا کی کڑواہٹ برداشت کرلو۔'' اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری۔ [3] (أخرجه العسكري في المواعظ وابن مردويه وابن النجار)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ رفعاً یہ ہیں: « إِنَّا أَهْلُ الْبَيْتِ اِخْتَارَ اللّٰهُ لَنَا الْآخِرَةَ عَلَى الدُّنْيَا وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى » [4] (رواه ابن أبي شيبة) ''ہم اہلِ بیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا پر آخرت کو اختیار کیا ہے اور نبی اکرم ﷺ کو کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔'' ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر دارین عطا کرے گا اس میں اہم اور اقدم امت کے لیے شفاعت ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان تینوں نعمتوں کے ذکر کرنے سے قلبِ نبوی کی تقویت مراد ہے۔ پھر حکم دیا کہ تو اپنے رب کی نعمتوں کا بیان کر۔ گویا یہ فرمایا کہ تیرے لیے راستہ یہ ہے کہ تو بھی میرے بندوں

---

[1] صحيح مسلم (۲۰۲) [2] حلية الأولياء (۱۷۹/۳) [3] الدر المنثور (۵۴۳/۸)

[4] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

کے ساتھ ویسا ہی کام کر جو میں نے تیرے ساتھ کیا ہے۔ ہم نے تجھ کو یتیم پایا تیرا باپ نہ تھا، یعنی حمل کے دو ماہ بعد، یہی ارجح ہے۔ پھر تجھ کو جگہ دی۔ نبی اکرم ﷺ کے باپ مدینہ میں مرے دار التابعہ میں دفن ہوئے۔ کسی نے کہا ہے کہ ابواء میں اعمالِ فرع سے۔ جب ماں کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ چار یا پانچ یا چھے یا سات یا آٹھ یا نو یا بارہ برس اور ایک ماہ دس دن کے تھے۔ یہ ابواء میں مرے تھے یا حجون میں۔ جب دادا مرے تو آپ ﷺ آٹھ برس کے تھے۔ اس جگہ ضلال سے مراد غفلت ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴾ [طٰہٰ: ۵۲] ''نہ تو میرا رب غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے۔'' نیز جیسا کہ اس فرمان میں ہے: ﴿ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴾ [یوسف: ۳] ''اور یقیناً آپ اس سے پہلے بے خبروں میں سے تھے۔'' یعنی ہم نے تجھ کو غافل پایا اس چیز سے جس کا تیرے ساتھ ارادہ ہے، یعنی امرِ نبوت سے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے یہی معنی اختیار کیے ہیں۔[1] بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تو نہ قرآن کو جانتا تھا اور نہ شرائع کو۔ اللہ نے تجھ کو ان کا راستہ دکھایا۔ امام سدی اور فراء رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ تجھ کو گمراہ قوم میں پایا۔ تیرے سبب سے ان کو راہ دکھائی۔[2] یا تجھ کو ان کے ہدایت کرنے کا طریقہ سکھایا، یا ہجرت سے ناواقف تھا، یا شانِ استثناء کو بھولا ہوا پایا، جبکہ تجھ سے اصحابِ کہف اور ذی القرنین کے بارے میں سوال کیا گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا ﴾ [البقرۃ: ۲۸۲] ''تا کہ ایک کی بھول چوک کو دوسری یاد دلا دے۔'' یا طالبِ قبلہ پایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ﴾ [البقرۃ: ۱۴۴] ''ہم آپ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، اب ہم آپ کو اس قبلہ کی جانب متوجہ کریں گے جس سے آپ خوش ہو جائیں۔''

گویا ضلال بہ معنی طلب ہے، کیوں کہ گم کردہ راہ طالب ہوتا ہے یا تجھ کو تیری قوم میں ضائع پا کر ان کی طرف راہ سمجھائی، گویا ضلال بہ معنی ضیاع ہے۔ یا تجھ کو محبِّ ہدایت پا کر ہدایت کی، گویا ضلال بہ معنی محبت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ﴾ [یوسف: ۹۵] ''آپ اپنے اسی پرانے خبط میں مبتلا ہیں۔'' بہر حال ضلال سے یہ مراد نہیں ہے کہ حق سے عدول (نافرمانی) میں تھے، یا باطل میں واقع تھے، کیوں کہ آپ شروع سے لے کر وحی کے نازل ہونے تک بتوں کی عبادت سے بچے ہوئے اور فاسقوں اور نافرمان لوگوں کی نجاستوں سے محفوظ رہے۔ یا تو اپنے نفس کا ضال تھا یہ نہ جانتا تھا کہ تو کون ہے ہم نے تجھ کو تیرے نفس کا شناسا کیا۔ یا شبِ معراج میں جب جبریل علیہ السلام تجھے چھوڑ کر الگ ہو گئے، اس وقت تم گم کردہ راہ تھے، ہم نے تجھ کو ساقِ عرش کی طرف راستہ دکھایا۔ یا کوئی شخص تیرے دین پر نہ تھا تو اکیلا تھا، ہم نے تیرے سبب سے خلق کو ہدایت کی۔ یا خطاب نبی اکرم ﷺ کو ہے اور مراد دوسرے ہیں، لیکن اس میں بعد ہے۔

---

[1] فتح القدير (٦١٢/٥) [2] تفسير القرطبي (٩٧/٢٠)

نظم کریم قرآنی بھی اس سے انکار کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ بات ہے کہ ضال و ھدی دونوں اس جگہ عام ہیں اور شرک اور کفر کے علاوہ ضلالت اور ہدایت کی ہر قسم کے متعلق ہیں، اس لیے کہ اعتبار عمومِ لفظ کا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ عائل فقیر بے مال کو کہتے ہیں۔ غنا سے مراد عطائے رزق ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کچھ مال کے لحاظ سے غنی نہ تھے، بلکہ اللہ کے دیے ہوئے پر راضی تھے۔ یہی غنا کی حقیقت ہے۔ یا غنا سے مراد اعانتِ انصار ہے، جب آپ ﷺ ہجرت کر کے آئے۔ یا اسلام کی فتوحات اور غنیمتیں ہیں، لیکن اس میں نظر ہے، اس لیے کہ یہ سورت مکی ہے۔ یا خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال ہے اور اولاً ابو طالب کی تربیت اور ثانیاً ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تجھ کو حجتوں اور براہین کے لحاظ سے خالی ہاتھ پایا، مگر یہ بعید ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے کہا: میں نے اپنے رب سے ایک سوال کیا، کاش! میں وہ سوال نہ کرتا۔ میں نے کہا: مجھ سے پہلے جو پیغمبر ہوئے، ان میں کسی کی مسخر ہوا تھی، کوئی مردے کو زندہ کرتا تھا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا میں نے تجھے یتیم پا کر جگہ نہیں دی، گمراہ پا کر ہدایت نہیں کی، مفلس پا کر تونگر نہیں کیا، تیرا سینہ نہیں کھول دیا، تیرا بوجھ نہیں اتار دیا، تیرا ذکر بلند نہیں کیا؟ میں نے کہا: ہاں اے رب![1] (أخرجه ابن أبي حاتم والطبراني والحاكم وصححه وابن مردويه والبيهقي وأبو نعيم وابن عساكر)۔ ان کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب یہ سورت اتری تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «يَمُنُّ عَلَيَّ رَبِّي وَأَهْلٌ أَنْ يَمُنَّ رَبِّي»[2] (رواه ابن مردويه) یعنی میرے رب نے مجھ پر احسان رکھا وہ اسی لائق ہے کہ احسان رکھے۔

میں کہتا ہوں کہ اللہ نے جو یہ تین نعمتیں اپنے رسولِ مقبول پر فرمائیں، بعینہا یہی تین نعمتیں مجھ جیسے تکالیف اور آزمائشوں میں مبتلا شخص کو بھی عطا فرمائیں۔ پانچ سال کی عمر میں یتیم ہو گیا، مجھے جگہ دی۔ میں گمراہ تھا تقلیدِ مذہب میں پھنسا ہوا تھا، مجھے ہدایت کی راہ، یعنی اتباعِ سنت کی راہ دکھائی۔ میں مفلسِ محض تھا، میرے سر پر اپنی ماں اور بہنوں کا بارِ گراں تھا، مجھے ہزاروں بلکہ لاکھوں سے زیادہ آسودگی اور تونگری بخشی۔ غنائے قلبی سے بھی ایک حصہ دیا، اگرچہ میں باوجود نسبِ سیادت کے کرم (کیڑے) کی طرح ننگِ آب اور دھوئیں کی طرف عارِ آتش ہوں، لیکن میں کسی طرح ان احسانات کا شکر ادا نہیں کر سکتا اس کے سوا کہ میں الحمد لله على نعمته الظاهرة والباطنة کا وظیفہ کرتا رہوں۔

وَلَوْ كَانَ لِيْ فِيْ كُلِّ مَنْبَتِ شَعْرَةٍ لِسَانٌ لَمَا اسْتَوْفَيْتُ وَاجِبَ حَمْدِهِ

”اگر میرے ہر بال کی ایک زبان ہوتی تو پھر بھی میں اللہ کی جس طرح حمد کرنی چاہیے ادا نہ کر سکتا۔“

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٤٣) المعجم الكبير (١١/٤٥٥) مستدرك (٢/٥٧٣) السلسلة الصحيحة (٢٥٣٨)

[2] الدر المنثور (٨/٥٤٤)

اے خدا قربان احسانت شوم این چه احسان ست قربانت شوم

''اے اللہ! تیرے احسان پر قربان ہو جاؤں۔ تجھ پر قربان ہونا کیا کوئی احسان ہے۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو وصیت کی کہ تو کسی یتیم کو کسی طرح پر کسی بھی حال میں قہر وغضب کی کسی بھی وجہ پر مت جھڑک۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یتیم کو حقیر نہ جان، تو بھی یتیم تھا۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یتیم پر ستم مت کر، بلکہ اس کا حق اس کو دے اور اپنی بے پدری کو یاد کر۔

مرا باشد از حالِ طفلاں خبر کہ در طفلی از سر برفتم پدر

''مجھے بچوں کے حال سے خبردار رہنا چاہیے کہ بچپن میں میرا باپ فوت ہو گیا۔''

امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تو یتیم کو اس کے مال سے مقہور ومحروم نہ کر کہ اس کے ضعف کی وجہ سے اس کے حق کو لے لے،[1] جس طرح کہ عرب کیا کرتے تھے کہ ان کے حقوق ضائع کر دیتے اور ان کا مال لے لیتے تھے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ ہمیشہ یتیموں کے ساتھ سلوک کرتے اور اُن کے حق میں وصیت فرماتے۔ قہر بہ معنی غلبہ ہے اور نہر بہ معنی زجر ہے۔ سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ « أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هَكَذَا » ''میں اور یتیم کا کفیل جنت میں اس طرح ہوں گے۔'' پھر سبابہ و وسطیٰ (درمیانی اور ساتھ والی انگلی) سے اشارہ کیا۔[2] (أخرجه البخاري)۔ نہر زجر کو کہتے ہیں۔ سائل کو زجر کرنے سے منع فرمایا کہ اس پر خفا نہ ہو، بلکہ تھوڑے سے تھوڑا اس کو دے دے، یا اچھی بات کہہ کر اسے پھیر دے۔ امام واحدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین نے کہا ہے کہ مراد وہ سائل ہے جو دروازے پر آ کر بھیک مانگتا ہے، اس کو ڈانٹنا نہیں چاہیے، بلکہ جو میسر ہو وہ اسے دے دے اگرچہ آدھی کھجور ہی کیوں نہ ہو۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد سائل کو لوٹا دینا ہے رحمت اور نرمی کے ساتھ۔ یا سائل سے مراد طالب علم اور دین کے بارے میں سوال کرنے والا ہے کہ اس کے ساتھ سختی اور جفا نہیں کرنی چاہیے، بلکہ نرمی کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دے۔ یہی سفیان کا قول ہے۔[3] یہ نواہی (منع کی گئی) جس طرح نبی اکرم ﷺ کے لیے ہیں، اسی طرح آپ کی امت کے لیے بھی ہیں، کیوں کہ امت آپ کی مقتدی ہے تو تمام امت میں سے ہر شخص ان ممنوعہ چیزوں میں سے ہر چیز سے منع کیا گیا۔ پھر یہ حکم ہوا کہ اپنے رب کی نعمت کو بیان کر، یعنی لوگوں میں اللہ کے انعام کا چرچا کرنا چاہیے کہ یہ بھی ایک طرح کا نعمت کا شکر ادا کرنا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ نعمت کا لفظ عام ہے، کسی ایک چیز یا ایک قسم کی نعمت کے خاص نہیں ہے۔

امام مجاہد اور کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نعمت سے مراد قرآن ہے، بلکہ قرآن تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت

---

[1] فتح القدير (٥/٦١٣) [2] صحيح البخاري (٤٩٩٨) [3] فتح القدير (٥/٦١٣)

ہے۔ گویا یہ حکم دیا کہ قرآن کی قراءت کیا کرو۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ ہمیشہ قرآن کو پڑھتے اور اس کا بیان کرتے تھے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبوت بھی ایک نعمت ہے۔ اسی کو امام زجاج رحمہ اللہ نے بھی پسند کیا ہے یعنی رسالت کی تبلیغ کرو، نبوت جو ایک بہت بڑی نعمت ہے اس کا چرچا کرو۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان تینوں نعمتوں کا، جو اس سورت میں مذکور ہیں، ذکر کرو۔ یعنی یتیم کی پناہ گیری، تنگدستی کے بعد غنا اور ضلالہ کے بعد ہدایت۔[1] نبی اکرم ﷺ کو یہ حکم امت کو بھی حکم ہے، اس لیے کہ وہ ہر کام کے کرنے میں اور ہر ممنوعہ چیز کو ترک کرنے میں رسول کا اقتدا کرتی ہے اور اللہ کی نعمت کا بیان کرنا ایک شکر ہے۔

میں کہتا ہوں کہ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اسی نام کی ایک کتاب لکھی ہے اور دوسری کتاب شکر و بیانِ منن میں شعرانی رحمہ اللہ کی تالیف ہے جس کا مختصر ترجمہ "فتح الخلاق" کے نام سے طبع ہو چکا ہے اور میرا رسالہ "إبقاء المنن بإلقاء المحن" اسی تحدیث بہ نعمۃ اللہ کے بیان میں ہے۔ سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے کہا: تجھ کو جو خیر معلوم ہو اس کا ذکر کر،[2] یعنی کوئی خاص نعمت مراد نہیں ہے، بلکہ اللہ کی ہر نعمت کا، وہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، بیان کرنا اور شکر کرنا مامور بہ ہے، یعنی اس کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ اس کی ہر نعمت اعلیٰ ہی ہوتی ہے ان میں کوئی ادنیٰ نہیں ہے۔ پھر اس کی تمام نعمتوں کا شمار کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ ﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴾ [إبراهيم: ٣٤] "اگر تم اللہ کے احسان گننا چاہو تو انھیں پورے گن بھی نہیں سکتے۔ یقیناً انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔"

اس کے باوجود ہم اللہ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ﴾ [البقرة: ٢٦٥] "اور اگر اس پر بارش نہ بھی برسے تو پھوار ہی کافی ہے۔" اپنی طرف سے نعمت کے بیان کرنے میں اور شکر ادا کرنے میں لگے رہیں گے، گو پورا شکر ادا ہو نہیں سکتا، لیکن اس مضمون کے پیشِ نظر: "مَا لَا يُدْرَكُ كُلُّهُ لَا يُتْرَكُ كُلُّهُ" "جس کی کل حقیقت معلوم نہ ہو اس کو بالکل چھوڑ نہیں دینا چاہیے۔" کچھ نہ کچھ زبان پر کلمۂ شکر کا جاری رہنا لازمی ہے۔ حدیث میں کلمہ "الحمد للہ" کو کلمۂ شکر فرمایا ہے۔ وللہ الحمد۔ الحاصل بندہ کو کسی حال میں بھی اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرنے اور شکر کرنے کو چھوڑنا نہیں چاہیے کہ یہ خود ایک کفرانِ نعمت ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: « مَنْ أُوْلِيَ مَعْرُوْفًا فَلْيُكَافِئْ بِهِ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَلْيَذْكُرْهُ فَإِنَّ مَنْ ذَكَرَهُ فَقَدْ شَكَرَهُ »[3] (أخرجه أحمد والطبراني والبيهقي) "جسے بھلائی پہنچے وہ اس کا بدلہ دے، نہ ہو سکے تو اس کا ذکر ہی کرے، اس لیے کہ جس نے اس کا ذکر کیا تو یقیناً اس نے اس کا شکر ادا کیا۔" نعمت کا بیان کرنا یوں ہوتا ہے کہ اس نعمت کو پھیلائے اس پر ثنا کرے، یہ نشر و ثنا شکر کی طرح ہے۔[4]

---

[1] فتح القدير (٥/٦١٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٤٤)

[3] مسند أحمد (٦/٩٠) شعب الإيمان (٦/٥١٦) صحيح الترغيب والترهيب (١/٢٣٥) [4] فتح البيان (١٥/٢٧٥_٢٨٥)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سُوۡرَةُ اَلَمۡ نَشۡرَحۡ

اس سورت کی آٹھ (۸) آیتیں ہیں۔ یہ بلا اختلاف مکے میں اتری ہے۔ سیدہ عائشہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔[1]

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ
اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ ﴿۱﴾ وَوَضَعۡنَا عَنۡكَ وِزۡرَكَ ﴿۲﴾
الَّذِيۡۤ اَنۡقَضَ ظَهۡرَكَ ﴿۳﴾ وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ ﴿۴﴾
فَاِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ يُسۡرًا ﴿۵﴾ اِنَّ مَعَ الۡعُسۡرِ يُسۡرًا ﴿۶﴾
فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ ﴿۷﴾ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارۡغَبۡ ﴿۸﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(اے نبی!) کیا ہم نے آپ کے لیے آپ کا سینہ نہیں کھول دیا؟① اور ہم نے آپ سے آپ کا بوجھ اُتار دیا② جس نے آپ کی کمر توڑ دی تھی③ اور ہم نے آپ کے لیے آپ کا ذکر اونچا کر دیا④ پھر بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے⑤ بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے⑥ چنانچہ جب آپ فارغ ہو جائیں تو محنت کیجیے⑦ اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کیجیے⑧

شرح صدر سے کیا مراد ہے:

سینہ کھول دیا یعنی حوصلہ کشادہ دیا، تا کہ اتنا بڑا کام اٹھالے اور ظاہر میں بھی فرشتوں نے نبی اکرم ﷺ کا سینہ مبارک چاک کیا۔ دل میں سے سیاہی نکال کر دھو ڈالا۔ وحی کا اترنا پہلے بہت سخت تھا پھر آسان ہو گیا۔ یعنی پیغمبروں اور فرشتوں میں تیرا نام بلند ہے۔ پھر فرمایا کہ جب تو خلق کو سمجھانے کے کام سے فارغ ہو تو خلوت کی عبادت میں مشغول ہو۔ انتھی۔[1]

① الدر المنثور (۸/۵٤۷)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے تیرے سینے کو منور، فراخ اور کشادہ کر دیا، جیسا کہ اس کا فرمان ہے: ﴿ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ﴾ [الأنعام: ١٢٥] ''سو جس شخص کو اللہ راستے پر ڈالنا چاہے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے۔'' پھر جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے سینۂ مبارک کو کھول دیا، اسی طرح آپ ﷺ کی شریعت کو فراخ، وسیع، مضبوط اور آسان بنا دیا جس میں نہ کوئی حرج ہے نہ بوجھ ہے نہ تنگی ہے۔ یا شبِ معراج میں آپ ﷺ کا سینہ کھول دینا ہے، چنانچہ ترمذی نے مالک بن صعصعہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو اسی جگہ پر وارد کیا ہے[1] اور یہ امر اگرچہ شبِ اسراء میں واقع ہوا لیکن اس کو اس جگہ سے کچھ منافات نہیں ہے، اس لیے کہ شرح صدر میں ایک وہ فعل بھی تھا جو شبِ اسراء میں پیش آیا اور اس سے معنوی شرح نے نشو ونما پائی۔ والله أعلم.

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ رضی اللہ عنہ سے سوال کرنے میں جرأت والے تھے، ان کے علاوہ کوئی اور اس قسم کے سوال نہیں کرتا تھا۔ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ نے نبوت کے امور میں کون سی بات سب سے پہلے دیکھی؟ آپ ﷺ سنبھل کر برابر ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا: ابو ہریرہ! میں نے دیکھا کہ میں ایک صحرا میں ہوں، میری عمر اس وقت دس برس اور چند ماہ کی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میرے سر پر کوئی کلام کرتا ہے، اتنے میں ایک مرد نے دوسرے سے کہا کہ کیا یہ وہی ہے؟ پھر وہ میرے سامنے آئے۔ ان کے چہرے ایسے تھے کہ میں نے کبھی ویسی صورتیں نہیں دیکھیں اور نہ ویسی خوشبوئیں کسی مخلوق میں پائیں اور نہ ویسے کپڑے کسی اور پر دیکھے۔ وہ دونوں مرد میری طرف منہ کر کے آئے، یہاں تک کہ ہر ایک نے میرا ایک ایک بازو پکڑ لیا۔

میں نے ان دونوں میں سے کسی کے پکڑنے اور چھونے کا احساس نہ کیا۔ ایک نے دوسرے سے کہا: اس کا سینہ پھاڑ، اس نے میرے سینے کی طرف جھک کر اسے چاک کیا۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ نہ خون بہا اور نہ درد ہوا، پھر اس سے کہا کہ اس سینے میں سے غِل (کینہ) اور حسد کو نکال۔ ایک چیز ہیئت علقہ، یعنی جمے ہوئے خون کی طرح کی نکالی اور اس کو اٹھا کر پھینک دیا۔ اس نے کہا کہ اس میں نرمی اور رحمت ڈال دے، چنانچہ جتنی چیز نکالی تھی، اتنی ہی ایک چیز چاندی کی طرح کی رکھ دی، پھر میرے دائیں پاؤں کی انگلی ابہام (انگوٹھے) کو ہلا کر کہا کہ جا دوڑ اور سلامت رہ، میں اٹھ کر دوڑنے لگا، میرے اندر چھوٹوں اور بڑوں کے لیے رحمت تھی۔[2] (رواه عبد الله بن إمام أحمد)

رسول اللہ ﷺ پر الٰہی نعمتیں اور رفعِ ذکر کا معنی ومفہوم:

یہ بات کہ ہم نے تیرا بوجھ اتار دیا۔ اس آیت کے معنی میں ہے: ﴿ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾ [الفتح: ٢] ''تاکہ جو کچھ تیرے گناہ آگے ہوئے اور جو پیچھے سب کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔'' نقاض

[1] صحيح مسلم (١٦٤) سنن الترمذي (٣٣٤٦) [2] مسند أحمد (١٣٩/٥) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی مجہول ہیں۔

کے معنی ہیں آواز، بہت سے سلف نے کہا ہے کہ بوجھ کو اٹھانا ہے۔ رفع ذکر سے یہ مراد ہے کہ جہاں کہیں میرا ذکر ہو گا وہاں تیرا ذکر بھی ہوگا۔ جیسے: "أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ" یہ قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اللہ نے آپ ﷺ کے ذکر کو دنیا اور آخرت میں بلند کیا، کوئی خطیب و متشہد اور نماز پڑھنے والا نہیں ہے، لیکن وہ آپ ﷺ کا نام پکارتا ہے، یعنی کلمۂ شہادتین کہتا ہے۔[1] امام ابو سعید رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: نبی اکرم ﷺ نے کہا: میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور کہا کہ میرا اور تیرا رب فرماتا ہے: میں نے کیوں کر یعنی کیسے تیرا ذکر بلند کیا؟ میں نے کہا ہے کہ اللہ ہی جانے! کہا: "إِذَا ذُكِرْتُ ذُكِرْتَ مَعِيَ" یعنی جب میرا ذکر ہوگا تو تیرا بھی ذکر آئے گا۔[2] (رواه ابن جرير وابن أبي حاتم)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ رفعاً کہتے ہیں کہ جب میں ان کاموں سے فارغ ہوا جن کا مجھے آسمانوں اور زمین کے کاموں کے متعلق حکم دیا تھا تو میں نے کہا: اے رب! کوئی نبی مجھ سے پہلے نہ تھا، لیکن تو نے اس کا اکرام کیا، ابراہیم علیہ السلام کو خلیل ٹھہرایا، موسیٰ علیہ السلام کو کلیم بنایا۔ داود علیہ السلام کے لیے پہاڑ مسخر کیے، سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا مسخر کی، عیسیٰ علیہ السلام کے لیے مردے زندہ کر دیے میرے لیے کیا کیا؟ فرمایا: کیا میں نے تجھ کو اس سے بہتر چیز نہیں دی؟ "لَا أُذْكَرُ إِلَّا ذُكِرْتَ مَعِيَ" اور میں نے تیری امت کے سینے ایسے بنائے کہ وہ قرآن کو حفظ کر کے پڑھتے ہیں۔ یہ چیز میں نے کسی امت کو نہیں دی اور میں نے تم کو عرش کے خزانوں میں سے ایک خزانہ عطا کیا: "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ"[3] (رواه أبو نعيم في دلائل النبوة) امام بغوی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ رفع ذکر سے مراد اذان ہے۔ اسی جگہ سے سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہ شعر کہے ہیں:

أَغَرَّ عَلَيْهِ لِلنُّبُوَّةِ خَاتَمٌ ... مِنَ اللّٰهِ مِنْ نُوْرٍ يَلُوْحُ وَيَشْهَدُ
وَضَمَّ الْإِلٰهُ اسْمَ النَّبِيِّ إِلَى اسْمِهِ ... إِذَا قَالَ فِي الْخَمْسِ الْمُؤَذِّنُ أَشْهَدُ
وَشَقَّ لَهُ مِنِ اسْمِهِ لِيُجِلَّهُ ... فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَهٰذَا مُحَمَّدٌ[4]

"اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ایک نور بنا کر آپ ﷺ پر مہر نبوت چمکا دی جو آپ ﷺ کی رسالت کی گواہ ہے۔ اپنے نام کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا نام ملا لیا جب موذن پانچ مرتبہ "أشهد" کہتا ہے، آپ کی عزت وجلال کے اظہار کے لیے اپنے نام میں سے آپ ﷺ کا نام نکالا، دیکھو تو وہ عرش والا محمود ہے اور آپ ﷺ محمد ہیں۔"

بعض نے کہا ہے کہ مراد اولین اور آخرین میں رفعِ ذکر ہے۔ جب پیغمبروں سے ایمان کا میثاق لیا اور فرمایا تھا کہ تم سب اپنی اپنی اُمتوں کو حکم دو کہ وہ آپ ﷺ پر ایمان لائیں تو اس وقت آپ ﷺ کا نام لیا گیا، پھر آپ ﷺ

---

[1] تفسير الطبري (٢٤/٤٩٤)

[2] تفسير الطبري (٢٤/٤٩٤، ٤٩٥) تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٤٥) اس کی سند میں "دراج عن ابی الہیثم" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٧٤٦)

[3] تفسير ابن كثير (٤/٦٧٨) اس کی سند میں "عثمان عطاء" ضعیف راوی ہے۔ [4] تفسير البغوي (٨/٤٦٤)

کا ذکر آپ ﷺ کی امت میں مشہور ہوا۔ اب جہاں کہیں اللہ کا ذکر ہوتا ہے وہاں آپ ﷺ کا بھی ذکر آتا ہے۔
صرصری نے خوب بات کہی ہے:

لَا يَصِحُّ الْأَذَانُ فِي الْفَرَضِ إِلَّا بِاسْمِهِ الْعَذْبِ فِي الْفَمِ الْمَرْضِيِّ

''فرضوں کی اذان صحیح نہیں ہوتی مگر آپ ﷺ کے میٹھے نام سے جو پسندیدہ منہ سے ادا ہو۔''

اور یہ بھی کہا ہے:

أَلَا تر أَنَا لَا يَصِحُّ أَذَانُنَا وَلَا فَرُضُنَا إِنُ لَّمُ نُكَرِّرُهُ فِهِمَا [1]

''تم دیکھتے نہیں کہ ہماری اذان اور ہمارا فرض صحیح نہیں ہوتا جب تک اس میں بار بار آپ ﷺ کا ذکر نہ آئے۔''

ہر تنگی کے بعد آسانی:

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد کیا کہ عسر کے ساتھ یسر ہوا کرتا ہے، پھر اس کو موکد بہ تکرار فرمایا، یعنی اس کلمے کو دوبارہ کہہ کے تاکید کی۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ بیٹھے ہوئے تھے اور آپ ﷺ کے سامنے ایک سوراخ تھا۔ فرمایا: اگر ''عسر'' یعنی مشکل آ کر سوراخ میں گھس جائے تو پھر ''یسر'' یعنی آسانی آ کر اس کے اندر گھس کر اس ''عسر'' کو باہر نکال دے گی، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔[2] (رواه ابن أبي حاتم والبزار ولفظه لوجاء العسر حتى يدخل هذا الحجر لجاء اليسر حتى يخرجه ثم قال: فإن مع العسر يسرا إن مع العسر يسرا) اس کی سند ضعیف ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے تھے: ایک ''عسر'' دو ''یسر'' پر غالب نہ ہوگا۔[3] دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک دن نبی اکرم ﷺ مسرور وخوش دل باہر آئے ہنستے تھے اور فرماتے تھے: ''لَنْ يَّغْلِبَ عُسْرٌ يُسْرَيْنِ'' ''ایک عسر دو یسر پر غالب نہ ہوگا۔'' اس کو دوبارہ فرمایا۔[4] (رواه ابن جرير)

مشکلے نیست کہ آسان نہ شود   مرد باید کہ ہر آسان نہ نشود

''کوئی مشکل ایسی نہیں کہ آسان نہ ہو جاتی ہو، آدمی کو چاہیے کہ وہ گھبرائے نہیں۔''

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب کو اس آیت کی خوشخبری دی ہے اور کہا ہے کہ دو ''یسر'' پر ایک ''عسر'' غالب نہ ہوگا۔[5] اس کے یہ معنی ہوئے کہ ''عسر'' آیتِ کریمہ کے نظم میں دونوں جگہ معرف باللام آیا ہے تو یہ ایک ہی ''عسر'' اور ''یسر'' دونوں جگہ پر نکرہ آیا ہے تو وہ متعدد ہوا۔ گویا ''عسر'' ل بعینہ وہی ہے جو ''عسر'' ثانی اور ''یسر'' مکرر ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ آسمان سے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٦٧٩/٤)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٤٤٦/١٠) مسند البزاز (٧١/١٤) اس کی سند میں ''عائذ بن شریح اور حمید بن حماد'' ضعیف راوی ہیں۔

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٤٤٦/١٠) [4] تفسیر الطبري (٤٩٥/٢٤) یہ روایت مرسل ہے۔ [5] تفسیر الطبري (٤٩٥/٢٤)

معونت کا نزول بقدر مؤنت (تکلیف) کے ہوتا ہے اور صبر کا نزول بقدر مصیبت کے ہوتا ہے۔[1] امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

صَبْرًا جَمِيْلًا مَا أَقْرَبَ الْفَرَجَا   مَنْ رَاقَبَ اللّٰهَ فِيْ الْأُمُوْرِ نَجَا
مَنْ صَدَقَ اللّٰهَ لَمْ يَنَلْهُ أَذَى   وَمَنْ رَجَاهُ يَكُوْنُ حَيْثُ رَجَا

''اچھا صبر آسانیوں کے کیا ہی قریب ہے! اپنے کاموں میں اللہ تعالیٰ کا لحاظ رکھنے والا نجات یافتہ ہے، اللہ تعالیٰ کی باتوں کی تصدیق کرنے والے کو کوئی ایذا نہیں پہنچتی، اس سے بھلائی کی امید رکھنے والا اسے اپنی امید کے مطابق ہی پاتا ہے۔''

ابن درید نے کہا ہے کہ ابو حاتم سجستانی نے مجھے یہ شعر پڑھ کر سنائے:

إِذَا اشْتَمَلَتْ عَلَى الْيَأْسِ الْقُلُوْبُ   وَضَاقَ لِمَا بِهِ الصَّدْرُ الرَّحِيْبُ
وَ أَوْطَأَتِ الْمَكَارِهُ وَاطْمَأَنَّتْ   وَأَرْسَتْ فِيْ أَمَاكِنِهَا الْخُطُوْبُ
وَلَمْ تَرَ لِانْكِشَافِ الضُّرِّ وَجْهًا   وَلَا أَغْنَى بِحِيْلَتِهِ الْأَرِيْبُ
أَتَاكَ عَلَى قُنُوْطٍ مِنْكَ غَوْثٌ   يَمُنُّ بِهِ اللَّطِيْفُ الْمُسْتَجِيْبُ
وَكُلُّ الْحَادِثَاتِ إِذَا تَنَاهَتْ   فَمَوْصُوْلٌ بِهَا الْفَرَجُ الْقَرِيْبُ

''جب مایوس دلوں پر قبضہ کر لیتی ہے اور سینہ کشادگی کے باوجود تنگ ہو جاتا ہے، تکلیفیں گھیر لیتی ہیں اور مصیبتیں ڈیرہ جما لیتی ہیں، کوئی چارہ سمجھائی نہیں دیتا اور کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی، اس وقت اچانک اللہ تعالیٰ کی مدد آ جاتی ہے اور وہ دعاؤں کو سننے والا باریک بین اللہ اس سختی کو آسانی سے اور اس تکلیف سے بدل دیتا ہے، کنگیاں جب بھرپور ہو جاتی ہیں تو جلد کشادگی آ جاتی ہے۔''

کسی اور شخص نے یہ کہا ہے:

وَلَرُبَّ نَازِلَةٍ يَضِيْقُ بِهَا الْفَتَى   ذَرْعًا وَعِنْدَ اللّٰهِ مِنْهَا الْمَخْرَجُ
كَمُلَتْ فَلَمَّا اسْتَحْكَمَتْ حَلَقَاتُهَا   فَرَجَتْ وَكَانَ يَظُنُّهَا لَا تَفْرُجُ[2]

''انسان پر کئی ایک مصائب نازل ہوتے ہیں جن سے وہ تنگ دل ہو جاتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے پاس اس سے چھٹکارا بھی ہے۔ جب یہ مصائب کامل ہو جاتے ہیں اور اس زنجیر کے حلقے مضبوط ہو جاتے ہیں اور انسان گمان کرتا ہے کہ یہ کیسے ہٹیں گے تو وہ اچانک دور ہو جاتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ کو فراغت کے بعد ذکرِ الٰہی کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ جب تم دنیا کے امور اور شغلوں سے فارغ ہو اور اس کے علائق کو قطع کر چکو تو عبادت کے لیے کھڑے ہو اور خوش دلی و سرور، فراغت، خلوصِ نیت اور رغبت کے ساتھ عبادت کرو۔ اسی

[1] كشف الأستار عن زوائد البزار (١٩٥/٢) السلسلة الصحيحة (١٦٦٤) [2] تفسير ابن كثير (٦٧٩/٤، ٦٨٠)

قبیل سے یہ صحیح حدیث ہے کہ کھانا آ جانے کے بعد نماز نہیں ہے اور نہ ہی بول و براز کی حاجت کے وقت نماز ہے۔[1] اور یہ حدیث ہے کہ جب شام کا کھانا سامنے آئے تو پہلے کھانا کھا لو[2] یعنی اس کے بعد نماز پڑھو۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب تو دنیا کے کاموں سے فارغ اور نماز کے لیے کھڑا ہو تو اب اپنے رب کے لیے محنت کر۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جب تو نماز کے لیے کھڑا ہو تو اپنے کام میں محنت کر۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب فرائض سے خالی ہو تو قیامِ لیل میں محنت کر۔ ابن عیاض رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ محنت کر اور جب تو نماز سے فارغ ہو کر بیٹھے تو اپنے رب کی طرف راغب ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ دعا میں محنت کر۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب جہاد سے فرصت ہو تو عبادت میں محنت کر۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اپنی نیت اور رغبت اللہ کی طرف کر۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ شرح صدر سے مراد فتح صدر ہے، اس طرح سے کہ جو چیز ادراک سے روکتی ہے وہ دور کر دی جائے یعنی ہم نے تیرا سینہ کھول دیا، یہاں تک کہ وہ مناجاتِ حق اور دعوتِ خلق کے لیے کشادہ ہو گیا۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی روح سے تو لوگوں سے غائب تھے اور اپنے جسدِ شریف سے ان کے ہمراہ حاضر تھے۔ آپ کے سینہ بے کینہ میں حکمتیں رکھی گئی تھیں، جہل کی تنگی دور کر دی گئی تھی۔ یا مراد شاق ہونے (سینہ شاق ہونے) کے بعد وحی کا آنا ہے۔ "صدر" (سینے) کو اس لیے خاص کیا، کیوں کہ یہ احوالِ نفس کا مقام ہے، جیسے: علوم و ادراکات۔ یا اس لیے کہ وسوسے کی جگہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ﴾ [الناس: ٥] "جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔"

پس اس وسوسے کو دواعیِ خیر (بھلائی کی باتوں) کے ساتھ بدل دیا، یا یہی شرح ہے۔ رہا دل سو عقل اور معرفت کا مقام ہے۔ شیطان اسی کا قصد کرتا ہے پہلے سینے کی طرف آتا ہے۔ یہ دل کا قلعہ ہے، اگر راستہ ملا تو اتر پڑتا ہے، پھر اپنے لشکر کے ساتھ اس کے اندر غم و اندوہ، ارادے اور لالچ کو اس کے اندر پیدا کر دیتا ہے اور پھیلاتا ہے، اس وقت دل تنگ ہو جاتا ہے نہ اسے طاعت کی لذت آتی ہے اور نہ وہ اسلام کی حلاوت پاتا ہے اور اگر شیطان کو راستہ نہ ملا اور مردود ہوا تو امن حاصل ہوتا ہے اور سینہ منشرح ہو جاتا ہے اور عبودیت پر قائم رہنا آسان پڑ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فتح اور صدر کے وسیع کرنے کا احسان رکھا، اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا بوجھ اٹھایا اور خلق کو اللہ کی طرف دعوت دی اور وحی کو پہنچایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى

[1] صحيح مسلم (٥٦٠) [2] صحيح البخاري (٦٤٠)

[3] تفسير الطبري (٢٤/٤٩٦-٤٩٨) تفسير ابن كثير (٤/٦٧٧-٦٨٠)

نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ﴾ [الزمر: ۲۲] ”کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے پس وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک نور پر ہے۔“

”وزر“ سے مراد گناہ ہے یعنی جس امرِ جاہلیت میں تم تھے اس سے تم کو الگ کر دیا۔ امام حسن، قتادہ، ضحاک اور مقاتل رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یعنی جو کچھ جاہلیت میں ہوا اس کو تم سے گرا دیا۔[1] یہ وہ بوجھ تھا جس سے تمھاری پشت بھاری ہو گئی تھی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گناہ تھے جو آپ پر گراں ہوتے تھے، اللہ نے ان کو بخش دیا۔[2] ایک قوم نے کہا ہے کہ اس سے مراد بارِ نبوت کو، جس سے کمر جھکی جاتی تھی، کم کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کو سہل کر دیا، یہاں تک کہ اس کا اٹھانا آسان ہو گیا۔ یہی قول امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت یہ ہے: ”وَحَلَلْنَا عَنْكَ وِقْرَكَ“[3] بعض نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہم نے تم کو اس وزن (بوجھ) سے بچایا جو کمر توڑنے والا تھا، گو وہ بوجھ کیا ہو۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رفع ذکر یہ ہے کہ کسی جگہ اللہ کا ذکر نہیں ہوتا لیکن اس کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی آتا ہے۔[4]

امام خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی تم میرے ہمراہ ذکر کیے جاتے ہو، اذان، اقامت، تشہد، جمعہ میں منبر پر، عید الفطر، عید الاضحیٰ کے دن، یومِ عرفہ، ایامِ تشریق میں رمیِ جمار کے وقت اور صفا و مروہ پر اور خطبۂ نکاح میں اور زمین کے تمام مشارق و مغارب میں۔ اگر کوئی شخص اللہ کی عبادت کرے اور جنت و نار کو سچا جانے اور ہر شے کو مانے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کی گواہی نہ دے تو اس کو کچھ فائدہ نہ ہوگا، وہ کافر ہی رہے گا۔ انتہی. یا مراد پہلے انبیاء کی کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے، ان کو حکم تھا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت دے جائیں اور کوئی دین نہیں مگر تیرا یہ دین اس پر غالب ہو گا۔ یا مراد آسمان کے فرشتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے اور زمین میں مومنوں کے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے اور آخرت میں مقامِ محمود پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجاتِ کریمہ اور مراتبِ جلیلہ ہیں۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے بغیر نہ کوئی نماز درست ہے اور نہ کوئی خطبہ صحیح ہے۔[5] یا مراد انبیاء سے یہ عہد لینا ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں۔ ظاہر یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کا بلند کرنا جس کا اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر احسان رکھا ان سب امور کو شامل ہے۔

ان میں سے ہر امر ذکر کو بلند کرنے کے اسباب میں سے ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنے کا حکم ہے۔ قرآن پاک میں بہت جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اللہ کے ہمراہ آیا ہے، جیسے: ﴿ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ ﴾ [التوبة: ٦٢] ”اور اللہ اور اس کا رسول رضا مند کرنے کے زیادہ مستحق تھے۔“ نیز اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] تفسير القرطبي (٢٠/١٠٥) فتح القدير (٥/٦١٨)
[2] تفسير الطبري (٢٤/٤٩٤)
[3] تفسير القرطبي (٢٠/١٠٦)
[4] الدر المنثور (٨/٥٤٩)
[5] تفسير البغوي (٨/٤١٤)

اطاعت کرنے کا حکم فرمایا ہے، جیسا کہ اس کے فرمان میں ہے: ﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ﴾ [محمد: ٣٣] ''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کا کہا مانو۔'' اور اس کا فرمان ہے: ﴿ وَمَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ [الحشر: ٧] ''اور تمھیں جو رسول دے وہ لے لو اور جس سے روکے رُک جاؤ۔'' نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ [آل عمران: ٣١] ''کہہ دیجیے! اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری تابعداری کرو، خود اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔''

غرض کہ آپ ﷺ کے ذکرِ جمیل نے آسمانوں اور زمینوں کو بھر دیا اور جو لسانِ صدق و ذکرِ حسن و ثنائے صالح آپ ﷺ کو عطا کی، وہ اپنے بندوں میں سے کسی اور کو نہیں دی۔ ﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ [الجمعة: ٤] ''یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے اپنا فضل دے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل کا مالک ہے۔'' اللهم صل و سلم و بارك عليه وعلى آله عدد ما صلى عليه المصلون بكل لسان في كل زمان و في كل و مكان۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''لَا يُذْكَرُ اللّٰهُ إِلَّا ذُكِرَ مَعَهُ فَهُوَ الَّذِي يُطْوَى بِهِ الذِّكْرُ الْجَمِيلُ وَيُبْدَأُ''۔[1] ''عسر و یسر'' سے مراد تنگی اور وسعت یا شدت اور سہولت یا بے چینی اور کشادگی ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ ہر ''عسر'' یُسر ہو جاتا ہے اور ہر شدید آسان پڑ جاتا ہے اور ہر سخت نرم پڑ جاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ''عسر'' سابق کے ساتھ ایک اور ''یُسر'' ہے۔ لہٰذا حدیث میں کہا ہے کہ «لَنْ يَّغْلِبَ عُسْرٌ يُسْرَيْنِ»[2]

امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی قول نبی اکرم ﷺ اور صحابہ و مفسرین کا ہے کہ ''عسر'' ایک ہے اور ''یسر'' دو ہیں۔ پھر حکم دیا کہ جب تو نماز سے یا تبلیغ سے یا غزوہ (لڑائی، جہاد) سے فارغ ہو تو دعا میں کوشش کر اور اللہ سے اپنی حاجت مانگ یا عبادت اور دعائیں، نماز کا سلام پھیرنے سے پہلے یا بعد میں محنت کر۔ نصب کے معنی ہیں تعب و مشقت و محنت کرنا۔ امام قتادہ، ضحاک، مقاتل اور کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی جب تو فرض نماز پڑھ چکے تو دعا میں کوشش کر اور سوال کرنے میں راغب ہو، تیرا سوال تجھ کو مل جائے گا۔ یہی قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب تشہد سے فارغ ہو تو دنیا اور آخرت کے لیے دعا کر۔ یہی قول امام زہری رحمہ اللہ کا ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب تبلیغِ رسالت سے فرصت ہو تو اپنے لیے اور مومنین اور مومنات کے لیے استغفار کر۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب دنیا سے خالی ہو تو عبادت کرنے لگ جا۔[3]

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: ''إِنِّي أَكْرَهُ أَنْ أَرَى أَحَدَكُمْ فَارِغًا لَا فِي عَمَلِ الدُّنْيَا وَلَا فِي

---

[1] الدر المنثور (٨/٥٤٩، ٥٥٠) فتح البيان (١٥/٢٩٣)

[2] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [3] فتح القدير (٥/٦١٩)

عَمَلِ الآخِرَةِ" [1] "میں تمھیں فارغ دیکھنا پسند نہیں کرتا کہ تم دنیا اور آخرت کے کام میں مشغول نہ ہو۔" پھر اللہ پاک نے فرمایا کہ تیری رغبت اللہ کی طرف ہونی چاہیے تو اسی کا فضل مانگ اس پر توکل کر، اسی کی طرف تضرع بجا لا۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی نار سے خائف اور جنت میں راغب ہو۔ [2] مطلب یہ ٹھہرا کہ ساری رغبت اللہ تعالیٰ میں ہو نہ کہ کسی اور میں۔ کوئی ہو کہیں بھی ہو جب حاجت مانگے تو اسی سے مانگے، جب اعتماد کرے تو اس پر کرے۔ [3]

---

(1) روح المعاني (١٧٢/٣) (2) تفسير البغوي (٤٦٧/٨) (3) فتح البيان (٢٨٩/١٥_٢٩٥)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ التِّيْنِ

نمازِ عشاء و فجر میں سورۃ التین کی تلاوت:

اس سورت کی آٹھ (۸) آیتیں ہیں۔ جمہور کے قول کے مطابق یہ سورت مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مدنی ہے۔[1] دوسرا قول یہ ہے کہ مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔[2] سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشاء کی نماز پڑھی تو ایک رکعت میں ﴿ وَالتِّيْنِ ﴾ پڑھی۔ میں نے کسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ خوش آواز خوش خوان نہیں سنا۔[3] (أخرجه الشيخان وأهل السنن)۔ ان کی دوسری روایت یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نماز پڑھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب میں ﴿ وَالتِّيْنِ ﴾ پڑھی۔[4] (أخرجه الخطيب) زرعہ بن خلیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم یمامہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر اسلام پیش کیا، ہم مسلمان ہو گئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کی نماز پڑھی تو ﴿ وَالتِّيْنِ ﴾ اور ﴿ إِنَّآ أَنزَلْنٰهُ ﴾ کی قراءت فرمائی۔[5] (أخرجه ابن السكن والشيرازي في الألقاب)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝١ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝٢ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝٣
لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝٤ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ
سٰفِلِيْنَ ۝٥ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ
مَمْنُوْنٍ ۝٦ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝٧ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝٨

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قسم ہے انجیر اور زیتون کی ① اور طورِ سیناء کی ② اور اس پُرامن شہر (مکہ) کی ③ ہم نے

① تفسير القرطبي (۱۱۰/۲۰) ② الدر المنثور (۵۵۳/۸)

③ صحيح البخاري (۷۳۵) صحيح مسلم (٤٦٤) سنن أبي داود (۱۲۲۱) سنن الترمذي (۳۱۰) سنن النسائي (۱۰۰۱) سنن ابن ماجه (۸۳٤)

④ مسند أحمد (۲۸٦/٤) ⑤ الدر المنثور (۵۵٤/۸)

انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا④ پھر ہم نے اسے نیچوں سے نیچے پھینک دیا⑤ مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کے لیے بے انتہا اجر ہے⑥ پھر (اے انسان!) اس کے بعد تجھے کون سی چیز جزا وسزا کو جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے⑦ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟⑧

یہ شہر مکہ کو فرمایا اور انجیر اور زیتون کے دو باغ ہیں بیت المقدس کے آس پاس کے دو پہاڑوں پر، وہ مکان برکت والا ہے اور طورِ سینین وہ ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام سے کلام ہوا۔ یہ چار جگہیں جو فرمائی ہیں بہت برکت والی ہیں، پھر فرمایا کہ انسان کو فرشتوں کے مقام کے لائق بنایا، پھر جب منکر ہوا تو جانوروں سے بدتر ہے۔ انتھیٰ.

﴿ اَلتِّيْنِ ﴾ کا مفہوم:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس جگہ کے متعلق بہت سے قول ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ "تین" دمشق کی مسجد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خود انجیر ہی مراد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ پہاڑ ہے جو اس کے نزدیک ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اصحابِ کہف کی مسجد ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام کی مسجد ہے جو جودی پہاڑ پر ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی انجیر کا درخت ہے۔ امام کعب احبار، قتادہ اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ مسجد بیت المقدس ہے۔ امام مجاہد اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہی زیتون ہے جس کو تم نچوڑتے ہو۔ کعب احبار رحمہ اللہ اور کئی ایک اہلِ علم نے کہا ہے کہ طور وہ پہاڑ ہے جس پر اللہ پاک نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا۔[2]

﴿ اَلْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ﴾ کی تفسیر:

﴿ اَلْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ﴾ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عکرمہ، حسن، ابراہیم نخعی، ابن زید اور کعب احبار رحمہم اللہ کا ہے،[3] اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ بعض ائمہ نے کہا ہے کہ یہ تین محال (جگہیں) ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک میں اولی العزم بڑی شریعتوں والے رسولوں میں سے ایک مبعوث ہوا۔ پس تین و زیتون کی جگہ بیت المقدس ہے۔ وہاں عیسیٰ بن مریم علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ دوسری جگہ طورِ سینین ہے، وہاں اللہ نے موسیٰ علیہ السلام بن عمران سے بات چیت کی۔ بلدِ امین تیسری جگہ ہے، اس جگہ میں جو آیا وہ امن میں ہوا۔ یہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ تورات کے آخر میں ان تینوں جگہوں کا ذکر آیا ہے: "جَاءَ اللّٰهُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَاءَ يَعْنِيْ الَّذِيْ كَلَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ مُوْسَى وَأَشْرَقَ مِنْ سَاعِيْرِ يَعْنِيْ جَبَلَ بَيْتِ الْمَقْدَسِ الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ مِنْهُ عِيْسَى وَاسْتَعْلَنَ مِنْ جِبَالِ فَارَانَ يَعْنِيْ جِبَالَ مَكَّةَ الَّتِيْ أَرْسَلَ اللّٰهُ مِنْهَا مُحَمَّدًا ﷺ." "اللہ تعالیٰ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٤٧) [2] تفسير الطبري (٢٤/٥٠١-٥٠٣) [3] تفسير الطبري (٢٤/٥٠٥، ٥٠٦)

طورِ سیناء سے آیا ہے، یعنی وہاں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور ساعیر یعنی بیت المقدس کے پہاڑ سے اس نے اپنا نور چمکایا جہاں سے عیسیٰ کو مبعوث کیا اور وہ فاران کی چوٹیوں پر بلند ہوا یعنی مکہ کے پہاڑوں میں اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا۔“

انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا، مگر پھر بھی وہ پستی میں گرا:

اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر اخبار کے طور پر ترتیبِ وجودی اور زمانے کی ترتیب کے مطابق فرمایا۔ پھر اشرف کی قسم کھائی، پھر جو اس سے زیادہ اشرف تھا اس کی قسم کھائی، پھر جو اُن دونوں سے زیادہ اشرف تھا اس کی قسم کھائی۔ قسم کا جواب یہ ہے کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی شکل وصورت میں بنایا، اس کا قد سیدھا ہے اور اس کے اعضاء برابر یعنی متناسب ہیں، پھر اس کو نار کی طرف رد کیا۔ یہی قول امام مجاہد، ابو العالیہ، حسن اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔[1] پھر اس حسن و تازگی کے بعد اس کا انجام آگ ہے، اگر وہ اللہ کی اطاعت اور رسول کی اتباع نہیں کرے گا۔ لہٰذا ایمان دار، عاملِ صالح کو مستثنیٰ فرمایا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ﴾ سے مراد ارذل عمر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے قرآن جمع کیا وہ ارذل عمر کو نہ پہنچے گا۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر یہی مطلب ہوتا تو استثناء میں کچھ خوبی نہیں، اس لیے بڑھاپا ایک ایسی چیز ہے کہ بعض لوگوں کو پہنچتا ہے، بلکہ مراد وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾[2] [العصر: ۱۔ ۳] ”زمانے کی قسم! بے شک (بالیقین) انسان سراسر نقصان میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔“ ﴿ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ﴾ سے مراد غیر مقطوع ہے یعنی جو ہمیشہ قائم رہے کبھی منقطع نہ ہو۔ اب اے ابن آدم! تو قیامت میں جزا کی تکذیب کس لیے کرتا ہے، حالاں کہ ہدایت کو جان چکا ہے اور اس بات کو خوب پہچانتا ہے کہ جو پہلی دفع پیدا کرنے پر قدرت رکھتا ہے، وہ بدرجہ اولیٰ دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے، پھر کونسی چیز تجھ سے معاد (قیامت کے دن) کی تکذیب کراتی ہے؟! منصور رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے کہا: کیا اس سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں؟ کہا: معاذ اللہ! بلکہ مراد انسان ہے۔[3] یہی امام عکرمہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ پھر فرمایا کہ کیا اللہ احکم الحاکمین نہیں ہے، نہ وہ جور کرتا ہے نہ ظلم۔ یہ اس کا عدل ہے کہ قیامت قائم کر کے دنیا میں مظلوم کا بدلہ ظالم سے لے گا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ تم میں جب کوئی اس سورت کو پڑھے اور آخر پر پہنچے تو یوں کہے: ”بَلٰى وَأَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ“[4]

---

① تفسیر الطبري (۲۴/۵۰۹، ۵۱۰) ② تفسیر الطبري (۲۴/۵۰۸۔۵۱۰) تفسیر ابن کثیر (۴/۶۸۱) ③ تفسیر ابن أبي حاتم (۱۰/۳۴۴۹)

④ سنن أبي داود (۸۸۷) سنن الترمذي (۳۳۴۷) تفسیر ابن کثیر (۴/۶۸۰۔۶۸۲) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ۵۷۸۴)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اکثر مفسرین کے نزدیک "تِین" یہی میوہ ہے جس کو لوگ کھاتے ہیں۔ اللہ نے اس کی قسم اس لیے کھائی ہے کہ یہ میوہ شوائبِ تنغیص (تلخی کا شائبہ یا ملاوٹ) سے خالی ہے۔ اس میں ایک بڑی عبرت ہے، کیوں کہ اپنے مہیا کرنے والے پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ نے اس کو ایک لقمہ کے برابر بنایا ہے۔ اہلِ طب کہتے ہیں کہ یہ بدن کے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند میوہ ہے اور یہ اکثر الغذا ہے۔ کتبِ مفردات و مرکبات میں اس کے بہت سے فوائد ذکر کیے ہیں، اس کو غذا اور دوا کہا ہے۔ غذا اس لیے کہ ایک لطیف کھانا ہے جو جلد ہضم ہو جاتا ہے، معدے میں زیادہ دیر تک ٹھہرتا نہیں۔ ملین طبع ہے، پسینے کے طور پر نکل جاتا ہے، بلغم کو کم کرنے والا، گردوں کو صاف کرنے والا، مثانہ کی پتھری کو ختم کرنے والا، بدن کو موٹا کرنے والا، فالج سے بچاتا ہے۔ یہ دوا اس طرح سے ہے کہ بدن کے فضلات کو خارج کرتا ہے۔ چھلکے سمیت کھایا جاتا ہے اخروٹ اور کھجور کی طرح نہیں کہ انھیں چھیل کر کھاتے ہیں، اگر خواب میں نظر آئے تو مردِ غیر ستم گر ہے اور اگر ہاتھ آجائے تو بہت سا مال ملے اور کھا لیا ہے تو اولاد نصیب ہو۔ آدم علیہ السلام نے جب جنت کو چھوڑا تو اسی کے پتوں سے اپنا ستر چھپایا۔ یہ مشار بہ فوا کہ جنت ہے (جنت کا ایسا پھل جس کے اندر پینے کی چیز بھی ہے) کیوں کہ اس میں گٹھلی نہیں ہے اور ایک خوشبودار پھل ہے۔

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد مسجد الحرام ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ پہاڑ ہے جس پر دمشق ہے۔[1] زیتون وہی درخت ہے جس کا تیل نکالتے ہیں جو بہت سی دواؤں میں ملایا جاتا ہے۔ یا اس سے مراد مسجدِ اقصیٰ ہے یا وہ پہاڑ ہے جس پر مسجدِ اقصیٰ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بلادِ فلسطین ہیں۔[2] علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ کاش! میں جانتا کہ کون سی بات اس امر کا باعث ہوئی ہے کہ ان ائمہ نے لغت عربیت کے حقیقی معنی کو چھوڑ کر ان تفسیراتِ بعیدہ کو اختیار کیا۔ یہ معانی ایسے خیالات پر مبنی ہیں جن کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ یہ نقل کی طرف راجع ہیں۔ اس سے زیادہ عجیب وہ قول ہے جس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، حالاں کہ وہ علم و روایت دونوں میں طویل الباع (صاحبِ کرم) ہیں، یعنی اس سے مراد بیت المقدس ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے ایک مرد کو سنا کہ وہ کہتا تھا کہ حلوان سے ہمدان تک تین کوہستان ہے اور زیتون کوہستانِ شام ہے۔ میں کہتا ہوں: مانا کہ تم نے یہ سنا، پھر اس سے کیا ہوتا ہے، اسی سننے سے کچھ لغت ثابت نہیں ہوتی اور نہ یہ کوئی نقل ہے کسی شارع سے۔[3] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیتون ایک پھل ہے ایک وجہ سے اور دوا ہے ایک وجہ سے۔ لوگ اس سے چراغ جلاتے ہیں جو کوئی اس کے پتوں کو خواب میں دیکھے وہ متمسک بعروۂ وثقیٰ ہو[4] (مضبوط کڑے کو تھامنے والا مطابق سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۵۶)۔ طور اس پہاڑ کا نام ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے

---

[1] تفسير القرطبي (۱۱۱،۱۱۰/۲۰) [2] الدر المنثور (۵۵٤/۸) [3] فتح القدير (٦٢٣/٥) [5] تفسير الرازي (۱۰/۳۲)

موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کی تھیں۔ ﴿ سِيْنِيْنَ ﴾ حبشہ کی زبان میں مبارک حسن کو کہتے ہیں۔ (قاله قتادة) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سریانی لغت میں بہ معنی مبارک ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس پہاڑ پر میوہ دار درخت ہوتے ہیں اس کو ﴿ سِيْنِيْنَ ﴾ کہتے ہیں اور نبط کی لغت میں "سینا" بولتے ہیں۔

امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ طُوْرِ ﴾ پہاڑ ہے۔ ﴿ سِيْنِيْنَ ﴾ درخت کو کہتے ہیں، اس کا واحد "سينة" ہے۔[1] اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑ کی قسم کھائی، اس لیے کہ یہ درخت شام میں ہوتا ہے۔ شام زمینِ مقدس ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے: ﴿ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ ﴾ [بني إسرائيل: ١] "مسجد اقصیٰ تک جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے۔" اور بڑی برکت جو اس جگہ پر اتری اور واقع ہوئی وہ یہ تھی کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔ مکہ کا نام اللہ نے بلدِ امین رکھا، اس لیے کہ وہ امن دیتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا ﴾ [العنكبوت: ٦٧] "کہ ہم نے حرم کو باامن بنا دیا ہے۔"

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مکہ ہے[2] یعنی لوگ وہاں امن میں ہوتے ہیں جاہلیت میں اور اسلام میں۔ اور وہ خود بھی غوائل (ناگہانی آفتوں) سے امن دیا گیا ہے۔ قسم کا جواب یہ ہے کہ ہم نے آدمی کو اچھی صورت اور تعدیل (ہیئت) میں بنایا۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ نے ہر ذی روح کو سرنگوں بنایا ہے سوائے انسان کے، اس کو دراز قد بنایا ہے، یہ کھانے کی چیز کو اپنے ہاتھ سے تناول کرتا ہے۔[3] اس کو علم، فہم، قوتِ گویائی، عقل، تمیز اور ادب سے زینت دی گئی ہے، اس لیے یہ سب سے اچھی مخلوق ہوا اپنے ظاہر اور باطن کے مطابق۔

﴿ تَقْوِيْمٍ ﴾ بہ معنی تعدیل ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اعتدال اور استواء (برابر کرنا) ہے۔ یہی قول عام مفسرین کا بھی ہے۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی مخلوق انسان سے زیادہ احسن نہیں ہے، کیوں کہ اللہ نے اس کو زندہ، علم والا، قدرت رکھنے والا، ارادہ کرنے والا، کلام کرنے والا، سننے والا، دیکھنے والا، تدبیر کرنے والا اور حکمت و دانائی والا بنایا ہے۔ یہ سب رب کی صفات ہیں۔ اسی پر بعض علماء نے اس حدیث کو محمول کیا ہے: « إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ »[4] یعنی اپنی صفات پر اس کو پیدا کیا۔ اس کے ساتھ اس آیت کو بھی ملانا چاہیے: ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴾ [الشورىٰ: ١١] "اس جیسی کوئی چیز نہیں۔" اور اس کے اس قول: ﴿ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴾ [طٰه: ١١] "مخلوق کا علم اس پر حاوی نہیں ہو سکتا۔" اور جو شخص بدیع خلق اور عجیب کاریگری اور انسان کی حقیقت سے واقف ہونا چاہتا ہے وہ کتاب "العبر والاعتبار" جو جاحظ رحمہ اللہ کی ہے اس کو دیکھے اور نیسابوری کی کتاب کو بھی دیکھے۔ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ وَفِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ [الذاريات: ٢١] "اور خود تمھاری ذات میں

[1] تفسير القرطبي (١١٣،١١٢/٢٠) [2] تفسير الطبري (٥٠٥/٢٤) [3] فتح القدير (٦٢٣/٥)
[4] صحيح البخاري (٥٨٧٣) صحيح مسلم (٢٨٤١)

بھی، تو کیا تم دیکھتے نہیں ہو" کی تفسیر میں دو ضخیم جلدوں میں ہے۔[1] بدائع قدرتِ الٰہی کا خلقت انسان کے بارے میں کچھ ذکر "كتاب الفكر إحياء العلوم" میں اور رسالہ "كشف الستر عن وجه الذكر و الفكر" میں بھی آیا ہے۔

حکایت:

ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا تھا: اگر تو چاند سے بہتر نہیں ہے تو تجھ کو طلاق ہے۔ بعض علماء نے فتویٰ دیا کہ وہ مطلقہ ہو گئی۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا کہ نہیں ہوئی، اس لیے کہ وہ انسان ہے اور اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو احسنِ تقویم میں بنایا ہے۔ اگر چاند کی صورت انسان کی صورت سے زیادہ احسن ہوتی تو یہ ارشاد نہ ہوتا۔[2] پھر ہم نے انسان کو ﴿ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ﴾ کی طرف پھیرا۔ اس سے مراد بڑھاپا اور ضعف ہے، جوانی اور قوت کے بعد یہاں تک کہ بچے کی طرح خرف (جس کی عقل بڑھاپے کی وجہ سے ماری جائے) اور بے عقل ہو جاتا ہے۔ یہی قول ہے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مفسرین کی ایک جماعت کا۔[3]

پیری نے ملک تن کو اجاڑا وگرنہ یاں   تھا بندوبست اور ہی عہدۂ شباب میں

امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سٰفِلِیْنَ ﴾ سے مراد ضعفاء و زمناء و اطفال ہیں اور بہت زیادہ بوڑھا شخص ان سب سے زیادہ اسفل ہے،[4] کیوں کہ بدن، سمع، بصر اور عقل کے ضعف کی وجہ سے اس سے نہ کوئی حیلہ بنے اور نہ وہ راہ پائے۔[5] (قاله الخازن)۔ امام مجاہد، ابو العالیہ اور حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ معنی یہ ہیں کہ ہم نے کافر کو نار کی طرف پھیرا،[6] کیوں کہ نار کے درجات ہیں۔ بعض درجات بعض کی نسبت اسفل ہیں۔ کافر درجات میں سے سب سے نچلے درجے میں جائے گا۔ یہ کوئی اس آیت کے خلاف نہیں ہے: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ﴾ [النساء: ١٤٥] "منافق تو یقیناً جہنم کے سب سے نیچے طبقہ میں جائیں گے۔" اس لیے کہ اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ کفار اور منافقین درک اسفل میں اکٹھے ہوں، پھر اس حکم سے ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، ان کے لیے دائمی ثواب ہے اور قائم رہنے والی نعمتیں ہیں۔

﴿ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ﴾ کے معنی ہیں "غیر منقوص" (جو کم نہ کیا گیا ہو)۔ مومن جب ارذل عمر کو پہنچتا ہے اور اپنی جوانی میں عملِ صالح کرتا تھا تو اس کے لیے اتنا ہی اجر لکھا جاتا ہے جتنا کہ صحت اور جوانی کی حالت میں لکھا جاتا تھا، اور بڑھاپا اس کو کوئی نقصان نہیں دیتا اور وہ خطائیں جو ارذل عمر کے آ جانے کے بعد وہ کرتا ہے، وہ اس پر لکھی نہیں جاتیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قرآن کا قاری ارذل عمر کو نہیں پہنچتا، پھر آیتِ باب پڑھی:

---

[1] تفسير القرطبي (٢٠/١١٤) [2] فتح البيان (١٥/٣٠٢) [3] تفسير الطبري (٢٤/٥٠٨)

[4] فتح القدير (٥/٦٢٤) [5] تفسير الخازن (٧/٢٦٦) [6] تفسير الطبري (٢٤/٥٠٩)

﴿ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾[1] یعنی وہ خرف نہیں ہوتا خواہ کتنا ہی بوڑھا کیوں نہ ہو جائے۔ سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے۔ بندہ جب بیمار ہو جاتا ہے یا سفر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے صحیح مقیم کے برابر اجر لکھتا ہے۔[2] (رواه أحمد و البخاري وغيره)

میں کہتا ہوں یہی خاصیت قراءت اور علم حدیث کے درس کی ہے کہ صاحبِ علم حدیث قرآن کے قاری کی طرح اگرچہ بڑھاپے اور کمزوری کو پہنچ گیا ہے مگر خرف نہیں ہوتا، یعنی بڑھاپے کی وجہ سے اس کی عقل نہیں ماری جاتی۔ یہ خطاب کہ تجھے اب روزِ جزا کے جھٹلانے پر کون سی چیز آمادہ کرتی ہے، کافر انسان کو ہے اور یہ سوالیہ انداز سرزنش اور ملامت کے لیے اور حجت پوری کرنے کے لیے ہے۔ یعنی جب تو نے یہ بات معلوم کر لی کہ اللہ پاک نے تجھ کو ﴿ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴾ میں پیدا کیا اور وہ تجھ کو ﴿ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ﴾ میں رد کرے گا تو پھر دوبارہ زندہ ہونے اور جزا کے انکار کی کیا وجہ ہے؟ قاضی نے کہا ہے کہ یہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے کہ اے محمد! اب ان دلائلِ ناطقہ کے ظہور کے بعد تو یقین کر کہ جو کچھ اللہ کے پاس سے تیرے پاس آیا ہے وہ سب حق اور سچ ہے[3] لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اب کون تجھ کو جھوٹا کہہ سکتا ہے اس بیان کے بعد۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[4] پھر فرمایا: کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے، کاریگری اور تدبیر میں وہ تو سب احکام میں سب سے زیادہ صحیح، انفذ اور اقضیٰ ہے، پھر دوبارہ زندہ نہ ہونے اور جزا کے نہ ہونے کا وہم کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس میں کفار کے لیے سخت وعید ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جب اس آیت کو پڑھتے تو کہتے: "سبحنك اللهم فَبَلَى"[5]

---

[1] مستدرك الحاكم (٢/٥٧٦) [2] صحيح البخاري (٢٨٣٤) مسند أحمد (٤/٤١٠)

[3] تفسير البيضاوي (٥/٥٠٨) [4] تفسير القرطبي (٢٠/١١٦) تفسير الطبري (٢٤/٥١٥)

[5] تفسير الطبري (٢٤/٥١٦) الدر المنثور (٨/٥٥٩) فتح البيان (١٥/٢٩٩_٣٠٥)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْعَلَق

سورتوں کی ترتیب توقیفی ہے:

اس کو سورت اقراء اور سورۃ القلم بھی کہتے ہیں۔ اس کی انیس (۱۹) یا بیس (۲۰) آیتیں ہیں۔ یہ مکہ میں اتری ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ قرآن میں سب سے پہلے یہی سورت نازل ہوئی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس، ابو موسیٰ اشعری اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم اسی کے قائل ہیں۔[1] حدیث طویل غارِ حرا جو صحیحین وغیرہما میں آئی ہے، اسی پر دلیل ہے۔ اس میں آیا ہے کہ "فَجَاءَ الْحَقُّ وَهُوَ فِي غَارِ حِرَاء فَقَالَ لَهُ الْمُلْكُ: اِقْرَأْ.[2] الحديث" "آپ ﷺ غارِ حراء ہی میں تھے کہ آپ ﷺ کے پاس حق آ ی اور فرشتے نے آپ ﷺ کو کہا: پڑھیے!" س بارے میں بہت سی احادیث اور آثار صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت سے آئی ہیں۔ جمہور نے کہا ہے کہ یہ سورت سب سے پہلے اتری، پھر سورت ﴿نٓ وَالْقَلَمِ﴾، پھر مزمل، پھر مدثر اتریں۔ تفسیر خازن میں نزول کے لحاظ سے سورتوں کی ترتیب تفصیل وار لکھی ہے کہ مکہ میں فلاں سورت نازل ہوئی، اس کو خوب اچھی طرح پورا بیان کیا ہے۔[3] قاضی ابو بکر بن الطیب نے کہا ہے کہ قرآن میں سورتوں کی جو ترتیب آج کے دن ہے، یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کی وجہ سے ہے۔

مکی نے اپنی تفسیر میں اس کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ آیات کی ترتیب اور بسم اللہ کو شروع میں رکھنا نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ہے، لیکن سورت براءت کے شروع میں اس کو رکھنے کا حکم نہ ہوا، اس لیے وہاں بسم اللہ کو چھوڑ دیا گیا۔ یہی قول تمام اقوال میں سب سے زیادہ صحیح ہے۔ ایک قوم نے کہا ہے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے توفیقی ہے اور سیدنا ابی، علی اور عبداللہ رضی اللہ عنہم کے مصاحف میں جو اختلاف تھا وہ جبریل علیہ السلام کے آخری بار کے قرآن کے عرض کرنے سے پہلے تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے تالیفِ سور کی ترتیب فرمائی۔ اس سے پہلے یہ کام نہ کیا تھا۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن کی تالیف اسی کے مطابق تھی جس طرح نبی اکرم ﷺ سے سنتے تھے۔ امام ابن الانباری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پورا قرآن پہلے آسمانِ دنیا پر اترا، پھر بیس برس میں علاحدہ علاحدہ ہو کر نبی اکرم ﷺ پر آیا۔

سورت کسی امرِ محدث میں نازل ہوتی۔ آیت سوال کے جواب میں آتی اور جبریل علیہ السلام آیت اور سورت کی جگہ بتا دیتے۔ سورت کا یہ انتظام آیات و حروف کے انتظام کی طرح تھا، یہ سب بندوبست رسول اللہ ﷺ کی طرف سے

[1] الدر المنثور (۸/۵۶۰، ۵۶۱) [2] صحيح البخاري (۳) صحيح مسلم (۱۶۰) [3] تفسير الخازن (۱/۱۰، ۱۱)

ہوا۔ اب جو کوئی کسی سورت کو آگے پیچھے کرے گا تو گویا وہ نظمِ آیات کو فاسد اور حروف و کلمات کو تبدیل کرنے والا ہے اور حقیر ہے۔ سورۃ البقرہ کی سورۃ الانعام پر تقدیم کی کچھ حجت نہیں ہے، اگرچہ سورۃ الانعام سورۃ البقرہ سے پہلے نازل ہو چکی تھی، اس لیے کہ یہ ترتیب نبی اکرم ﷺ سے اخذ کی گئی ہے۔ آپ ﷺ فرما دیتے تھے کہ اس سورت کو اس جگہ رکھو اور جبریل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ کو آیات کی جگہ کے متعلق واقف کر دیتے تھے۔[1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝1 خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝2 اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝3 الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝4 عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝5

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔

اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے پیدا کیا① اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا② پڑھیے اور آپ کا رب بڑا کریم ہے③ وہ ذات جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا④ اس نے انسان کو وہ علم سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا⑤

پہلی وحی اور نبوتِ محمد ﷺ کا آغاز:

جبریل علیہ السلام جب پہلی دفعہ آئے تو یہی پانچ آیتیں۔ نبی اکرم ﷺ نے کبھی لکھا پڑھا نہ تھا۔ فرمایا کہ قلم سے بھی وہی علم دیا ہے، یوں بھی وہی دے گا۔ انتہیٰ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ پہلے نبی اکرم ﷺ پر وحی کا آغاز نیند میں سچے خوابوں سے ہوا۔ جو خواب دیکھتے وہ فلقِ صبح کی طرح آتا۔ پھر آپ ﷺ کو تنہائی پسند ہوئی۔ غارِ حرا میں جا کر عبادت کرتے۔ کئی کئی رات وہاں جا کر رہتے اور زاد (توشہ) ساتھ لے جاتے۔ پھر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آتے، وہ اسی طرح کا زاد ساتھ دے دیتیں، یہاں تک کہ آپ ﷺ کو وحی آئی اور آپ ﷺ غارِ حرا میں تھے۔ فرشتے نے آ کر کہا: پڑھ! فرمایا: میں قاری نہیں ہوں۔ پھر فرشتے نے مجھے پکڑ کر دبوچا، میں تھک گیا، پھر مجھے چھوڑ کر کہا: پڑھ! میں نے کہا ہے کہ میں قاری نہیں ہوں۔ پھر مجھے دبوچا، یہاں تک کہ میں بالکل تھک گیا، پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا: ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ﴾ اور ﴿ مَا لَمْ يَعْلَمْ ﴾ تک پہنچا۔

نبی اکرم ﷺ ہانپتے کانپتے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور کہا کہ مجھے کپڑے میں کر لو، چنانچہ ایسا ہی کیا

---

[1] تفسیر القرطبي (1/59، 60)

یہاں تک کہ وہ ڈر دور ہوا۔ کہا: اے خدیجہ! میرا یہ کیا حال ہوا اور قصہ بتایا اور فرمایا: مجھے اپنی جان کا ڈر ہوا۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ کوئی نہیں، آپ کو بشارت ہو، واللہ! کبھی اللہ تعالیٰ آپ کو رسوا نہ کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہو اور سچی بات کرتے ہو اور لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہو اور مہمان نواز ہو اور نوائبِ حق (مصیبتوں) پر مدد کرتے ہو۔

پھر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا ان کو ساتھ لے کر ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی کے پاس گئیں۔ وہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچا زاد بھائی تھے اور جاہلیت میں نصرانی ہو کر عربی کی کتابت کرتے اور انجیل کی عبرانی میں کتابت کرتے تھے، جو اللہ چاہتا وہ لکھتے تھے۔ ایک بوڑھے آدمی تھے، اندھے ہو گئے تھے۔ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ اے چچا کے بیٹے! تم ذرا اپنے بھتیجے سے حال سنو۔ ورقہ نے کہا: اے بھتیجے! تم کیا دیکھتے ہو؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا بیان کیا۔ کہا: یہ وہی ناموس ہے جو عیسیٰ علیہ السلام پر اترا تھا، کاش! میں جوان ہوتا اور جس وقت تیری قوم تجھ کو نکالتی اس وقت تک میں زندہ رہتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ کیا وہ مجھ کو نکال دیں گے؟ کہا: ہاں! کبھی کوئی شخص وہ چیز نہیں لایا، جو تو لے کر آیا ہے، لیکن لوگ اس کے دشمن ہو گئے۔ اگر تیرا زمانہ مجھ کو پا لے گا تو میں خوب کمر باندھ کر تیری نصرت کروں گا۔

پھر کچھ زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا اور وحی کا آنا تھم گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت غمگین ہوئے ایسا غم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ پہاڑوں کی چوٹی سے گر پڑیں، جب کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر چاہتے کہ اپنے آپ کو گرا دیں تو جبریل علیہ السلام ظاہر ہو کر کہتے: اے محمد! تو سچا رسول ہے۔ اس بات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل ٹھہر جاتا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس آ جاتے۔ پھر جب فترتِ وحی (وہ وقت جب وحی کا سلسلہ رک جائے) کا وقت طویل ہوتا تو پھر جا کر یہی کام کرنا چاہتے اور جب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے تو جبریل علیہ السلام ظاہر ہو کر وہی بات کہتے۔ (رواه أحمد)

یہ حدیث صحیحین میں بھی بروایتِ زہری رحمہ اللہ مروی ہے۔[1] ہم نے اس حدیث پر سند اور معانی کے لحاظ سے شرح بخاری کے شروع میں کلام مستقصیٰ (انتہا کو پہنچنے والا) کیا ہے۔ فمن أراد فهو هناك محرر ولله الحمد والمنة۔

علم سے انسان کا شرف وعزت:

الحاصل سب سے پہلے جو قرآن اترا وہ یہی آیاتِ کریمات مبارکات تھیں۔ یہ آیات اول رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر کی اور اول نعمت ہے جس کا انعام ان پر فرمایا۔ ان میں انسان کی پیدائش کی ابتدا ہونے سے آگاہ کیا گیا ہے کہ وہ جمے ہوئے خون کے ایک قطرے سے پیدا کیا گیا ہے اور یہ اللہ کا ایک کرم ہے کہ اس نے انسان کو وہ چیز سکھائی جو وہ جانتا نہ تھا۔ اس کو علم سے شرف و کرم بخشا، یہ وہی قدر ہے جس کے سبب سے آدم ابو البریہ علیہ السلام ملائکہ پر ممتاز ٹھہرے۔ یہ علم کبھی ذہنوں میں ہوتا ہے اور کبھی زبان میں اور کبھی کبھی کتابت بالبنان (انگلیوں سے لگا ہوا) میں۔ غرضیکہ ذہنی، لفظی اور رسمی ٹھہرا اور رسمی، ذہنی ولفظی کو ملتزم ہے بغیر عکس کے۔ لہٰذا فرمایا کہ پڑھ تیرا رب بڑا کریم

[1] صحيح البخاري (٦٥٨١) صحيح مسلم (١٦٠) مسند أحمد (٦/٢٣٢)

ہے جس نے قلم سے لکھنا سکھایا۔ وہ بتایا جو وہ جانتا نہ تھا۔ اثر میں مروی ہے کہ علم کو لکھ کر قید کر لو۔ یہ بھی آیا ہے کہ جس نے اپنے علم پر عمل کیا، اللہ اس کو علمِ نامعلوم کا وارث کرتا ہے۔[1]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا: یعنی پڑھ جو تجھ کو وحی کی گئی یا جو کچھ تجھ پر اترا ہے یا جس کے پڑھنے کا تجھ کو حکم دیا گیا ہے اپنے رب کا نام لے کر۔ سیوطی رحمہ اللہ نے اتقان میں کہا ہے کہ سب سے پہلی سورت یہی اقراء ہے۔ یہ براعت استہلال (جلوے میں کامل ہونا) پر مشتمل ہے سورۃ الفاتحہ کی طرح۔ ایک تو سب سے پہلی یہی اتری ہے۔ پھر اس میں قراءت کرنے کا حکم ہے اور بسم اللہ سے شروع کرنے کا حکم ہے اور علمِ احکام کی طرف اشارہ ہے اور اس چیز کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید، اللہ کی ذات اور صفات کے اثبات سے متعلق ہے، خواہ صفتِ ذات ہو یا صفتِ فعل اور اصولِ دین کی طرف لے جانے والی ہے اور اس میں تعلیمِ علم کی خبر دی ہے۔ لہٰذا یہ بات کہی گئی ہے کہ اس کا عنوان ''القرآن'' رکھنا مناسب ہے، کیوں؟ کتاب کا عنوان مختصر ہوا کرتا ہے جس سے کتاب کے مقاصد ظاہر ہوں۔[2]

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ربوبیت کے عنوان کو اس لیے پیش کیا ہے تاکہ اس بات سے آگاہی ہو کہ رسول اللہ ﷺ کمالاتِ بشریہ میں انتہا پر پہنچ گئے تھے۔[3] پھر رب کی صفت خالقیت کے ساتھ کی، کیوں کہ انسان پر جو پہلی نعمت ہوئی، وہ یہی اس کا پیدا کرنا ہے۔ اسی پر باقی سب نعمتیں ترتیب پاتی ہیں۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اس بات سے آگاہ کیا گیا ہے کہ جس کو انسان کے پیدا کرنے پر قدرت ہے اور جس نے اس کو زندگی اور کمالات عطا کیے ہیں، وہ قراءت کی تعلیم دینے پر بھی قادر ہے۔[4] بنی آدم کو ایک جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔

قراءت کا حکم دوبارہ ﴿وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ﴾ سے ملا کر اس لیے فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ کے اس عذر کو، کہ میں قاری نہیں ہوں اور وہی پڑھ سکتا ہے جو لکھنا پڑھنا جانتا ہو اور آپ ﷺ امی تھے، دور کر دیا جائے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی تیرا رب حلیم ہے۔ بندوں کی جہالت پر ان کو سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔[5] بعض نے کہا ہے کہ قراءت کا پہلا حکم تو نبی اکرم ﷺ کے اپنے لیے ہے اور دوسرا اُمت کو تبلیغ کے لیے ہے، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ اکرم مبالغے کی دلیل ہے یعنی اس کا کرم ہر کرم سے زیادہ ہے، کیوں کہ اس کی نعمتوں کا شمار نہیں ہو سکتا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے انسان کو قلم سے لکھنا سکھایا، اب وہ ہر لکھی ہوئی چیز کو معلوم کر سکتا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قلم اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے اگر یہ نہ ہوتا تو نہ دین قائم رہتا اور نہ ہی زندگی صحیح ہوتی۔[6] یہ اللہ تعالیٰ کے عظیم کرم کی دلیل ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو وہ چیز سکھائی جو وہ نہیں جانتے تھے اور جہالت

---

[1] تفسير ابن كثير (٦٨٢/٤، ٦٨٣) [2] الإتقان (٣٦٤/٣، ٣٦٥) [3] تفسير أبي السعود (١٧٧/٩)
[4] فتح القدير (٦٢٨/٥) فتح البيان (٣١٠/١٥). [5] تفسير القرطبي (١١٩/٢٠) [6] تفسير القرطبي (١٢٠/٢٠) فتح القدير (٦٢٨/٥)

کے اندھیرے سے علم کے نور کی طرف لایا اور کتابت کے علم کی فضیلت پر آگاہ کیا۔ کتابت کے فوائد شمار نہیں کیے جا سکتے۔ تمام علوم کی تدوین، تمام فیصلوں کی تقلید اور اخبارات اور شروع شروع کے مقالات کو تحریر کرنا اور نازل کی گئی کتابوں کی بقا اسی کتابت کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو دین و دنیا کے سارے امور قائم نہ رہ سکتے۔ اللہ کی حکمت اور تدبیر کی باریکی پر اگر کوئی اور دلیل نہ بھی ہوتی تو یہی قلم اور لکھائی کافی دلیل ہے۔ قلم تراشنے کو کہتے ہیں۔ اس تراشنے یعنی قطع و برید کے سبب سے کلک کا نام قلم ہوا۔ سب سے پہلے جس نے لکھا، وہ ادریس علیہ السلام ہیں یا آدم علیہ السلام۔ اللہ تعالیٰ نے اس قلم کے ذریعے سے امورِ کلیہ و جزئیہ کو سکھایا۔ اس جگہ انسان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ﴾ [البقرة: ۳۱] ”اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھائے“ یا مراد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لیکن یہ بات زیادہ بہتر ہے کہ اس کو عموم پر محمول کریں، یعنی اللہ نے اس جنسِ بشر کو قلم کے واسطے سے علم کی تعلیم فرمائی۔ ①

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝۶ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝۷ اِنَّ اِلٰى
رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝۸ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝۹ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝۱۰
اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۝۱۱ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۝۱۲ اَرَءَيْتَ
اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝۱۳ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى ۝۱۴ كَلَّا
لَىِٕنْ لَّمْ يَنْتَهِ ۙ۬ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِيَةِ ۝۱۵ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝۱۶
فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ ۝۱۷ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝۱۸ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ
وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۩ ۝۱۹

ہرگز نہیں! انسان تو یقیناً البتہ سرکشی کرتا ہے ⑥ اس بنا پر کہ وہ خود کو بے پروا سمجھتا ہے ⑦ بے شک آپ کے رب ہی کی طرف واپسی ہے ⑧ کیا آپ نے اسے دیکھا جو منع کرتا ہے ⑨ ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے ⑩ بھلا دیکھ تو اگر وہ (بندہ) ہدایت پر ہو ⑪ یا تقویٰ کا حکم دیتا ہو؟ ⑫ بھلا دیکھ تو اگر وہ (حق کو) جھٹلاتا اور (اس سے) منہ موڑتا ہو؟ ⑬ کیا وہ نہیں جانتا کہ بے شک اللہ دیکھ رہا ہے ⑭ ہرگز نہیں! اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اسے پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر ضرور گھسیٹیں گے ⑮ پیشانی جو جھوٹی اور خطاکار ہے ⑯ چنانچہ اسے چاہیے کہ وہ

① فتح البيان (۱۵/۳۰۹-۳۱۲)

اپنی مجلس والوں کو بلا لے ⑰ یقیناً ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلا لیں گے ⑱ ہرگز نہیں! آپ
اس کی اطاعت نہ کریں اور سجدہ کریں اور اللہ کا قرب حاصل کریں ⑲

انسان کی مال کی وجہ سے سرکشی پر وعید:

ابو جہل کافر نبی اکرم ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا تو چڑاتا۔ اگر نیک راہ پر ہوتا، بھلے کام سکھاتا تو کیا اچھا آدمی ہوتا، اب جو منہ موڑا تو ہمارا کیا بگڑا۔ ایک دفعہ ابو جہل نبی اکرم ﷺ کو نماز میں دیکھ کر بے ادبی کرنے کے خیال سے چلا، وہاں نہ پہنچ سکا، اس کو پروں کا چھپکا لگا ڈر کر الٹے پاؤں پھرا، پھر کبھی یہ خیال نہ کیا۔ معلوم ہوا کہ سجدے میں بندہ اللہ کے نزدیک ہوتا ہے۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ انسان صاحبِ فرح واشر وبطر وطغیان (اترانے والا، شریر، متکبر اور سرکش) ہوتا ہے، جب اپنی جان کو بے نیاز اور مالدار دیکھتا ہے، پھر اس کو ملامت اور وعید اور نصیحت کی کہ اس اترانے اور سرکشی کرنے سے کیا حاصل، آخر تو اللہ ہی کے پاس آنا ہوگا، وہ اس مال کا حساب لے گا کہ کہاں سے جمع کیا اور کہاں خرچ کیا؟ حدیثِ عون میں آیا ہے کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ دو حریص ہیں جن کا پیٹ نہیں بھرتا: ایک صاحبِ علم دوسرا صاحبِ دنیا لیکن یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ صاحبِ علم اللہ کی رضا میں بڑھتا رہتا ہے اور صاحبِ دنیا سرکشی میں بہت دور نکل جاتا ہے۔ (رواه ابن أبي حاتم) پھر عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ الْاِنْسٰنَ لَيَطْغٰۤى ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ﴾[1] اور دوسرے کے حق میں یہ کہا ہے: ﴿ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾ [الفاطر: ٢٨] ”اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔“ یہ مضمون رفعاً بھی مروی ہے۔[2]

ابو جہل کی مذمت کا بیان:

ابو جہل نے نبی اکرم ﷺ کو خانہ کعبہ کے نزدیک نماز پڑھنے پر دھمکایا تھا۔ اللہ نے پہلے اس کو اچھی طرح پر نصیحت کی کہ بھلا جس کو تو سیدھی راہ پر چلنے سے منع کیا کرتا ہے، وہ اپنے کام میں اگر صحیح راہ پر ہو، یا اپنے قول میں ڈرنے کا حکم کرتا ہو تو پھر تیرا یہ منع کرنا کیسا ہوگا، کیا یہ منع کرنے والا اس ہدایت والے کو اتنا بھی نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس کو دیکھتا ہے، اس کی بات سنتا ہے، اس کو اس کے فعل کی جزا دے گا، پھر یہ تہدید اور وعید فرمائی کہ اگر یہ شخص اپنی بدبختی اور عناد سے باز نہ آئے گا تو ہم اس کو پیشانی کے بل گھسیٹیں گے۔ ﴿ نَاصِيَةٍ ﴾ سے مراد ابو جہل کی پیشانی ہے، اس کو باتوں میں جھوٹا اور کاموں میں خطا کار فرمایا ہے اور کہا کہ اب وہ قوم کو اور خاندان کو اپنی مدد کے لیے بلائے ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلاتے ہیں، تاکہ جان لے کہ کون غالب ہوتا ہے، اس کا گروہ یا ہمارا گروہ۔

صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ابو جہل نے کہا تھا کہ اگر میں محمد ﷺ کو کعبے

---

① تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٥٠) ② مستدرك الحاكم (١/١٦٩)

کے پاس نماز پڑھتے ہوئے دیکھوں گا تو اُن کی گردن پامال کر دوں گا۔ یہ بات نبی اکرم ﷺ کو پہنچی، فرمایا: وہ اگر ایسا کرے گا تو فرشتے اس کو پکڑ لیں گے۔[1] (فكذا رواه الترمذي و النسائي و ابن جرير)۔ ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ مقامِ ابراہیم علیہ السلام کے نزدیک نماز پڑھتے تھے، ابوجہل بن ہشام کا گزر ہوا۔ کہا: اے محمد! میں نے تجھ کو منع کیا تھا کہ تو اس جگہ نماز نہ پڑھا کر، آپ ﷺ نے اس کو سخت کہا اور جھڑک دیا۔ اس نے کہا: تم مجھے کیوں دھمکاتے ہو، واللہ! اس وادی میں سب سے زیادہ میری مجلس ہے۔ اس پر اللہ پاک نے یہ آیت اتاری: ﴿فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝١٧ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ﴾ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اگر وہ اپنی محفل والوں کو بلاتا تو اسی وقت عذاب کے فرشتے اس کو پکڑ لیتے۔[2] (رواه أحمد والترمذي والنسائي وابن جرير وقال الترمذي: هذا حديث حسن صحيح)

ان کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ اگر وہ ایسا کرتا تو فرشتے اس کو سب کے سامنے پکڑ لیتے اور اگر یہود اپنی موت کی تمنا کرتے تو اسی وقت مر جاتے اور آگ میں اپنی نشست گاہ دیکھ لیتے اور اگر مباہلہ والے گھر سے باہر نکل کر آتے تو پھر واپس جا کر نہ اپنا مال پاتے نہ اہل و عیال۔[3] (رواه أحمد)۔ ان کی روایت کے چوتھے الفاظ یہ ہیں کہ ابوجہل نے کہا تھا کہ اگر محمد ﷺ پھر مقام کے پاس نماز پڑھیں گے تو میں ان کو جان سے مار ڈالوں گا۔ نبی اکرم ﷺ آئے اور نماز پڑھی۔ کسی نے ابوجہل نے کہا کہ تجھے کس چیز نے روکا تھا؟ کہا: میں نے اپنے اور ان کے درمیان جگہ کو لشکروں سے بھرا ہوا پایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ واللہ! اگر وہ جنبش کرتا تو فرشتے اس کو گرفتار کر لیتے اور لوگ دیکھتے ہوتے۔[4] (رواه ابن جرير)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ابوجہل نے کہا: کیا محمد ﷺ تمھارے درمیان اپنا منہ خاک آلودہ کرتا ہے؟ کہا: ہاں! کہا: قسم ہے لات اور عزیٰ کی! اگر پھر میں نے دیکھا کہ اس نے اس طرح پر نماز پڑھی تو میں اس کی گردن کو کچل دوں گا اور اس کے چہرے کو خاک میں ملاؤں گا۔ پھر آیا اور نبی کریم ﷺ کو نماز پڑھتے پایا، چاہا کہ آپ ﷺ کی گردن کو پامال کرے کہ اتنے میں خود بخود الٹے پاؤں پھرنے لگا اور دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو بچاتا جاتا تھا۔ کہا: تجھے کیا ہوا؟ کہا: میرے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق ہے اور کچھ پر ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر وہ مجھ سے نزدیک ہوتا تو فرشتے اس کو ایک ایک عضو کر کے اچک لیتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت بھیجی۔[5] (رواه ابن جرير وأحمد ومسلم والنسائي وابن أبي حاتم)

---

[1] صحيح البخاري (٤٦٧٥) سنن الترمذي (٣٣٤٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٥١٨/٦) تفسير الطبري (٥٢٦/٢٤، ٥٢٧)

[2] مسند أحمد (٣٢٩/١) سنن الترمذي (٣٣٤٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٥١٨/٦) تفسير الطبري (٥٢٥/٢٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٥)

[3] مسند أحمد (٢٤٨/١) [4] تفسير الطبري (٥٣٦/٢٤)

[5] صحيح مسلم (٢٧٩٧) تفسير الطبري (٥٢٦/٢٤) مسند أحمد (٣٧٠/٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٥١٨/٦)

رسول اللہ ﷺ کو تسلی:

پھر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو فرمایا کہ تم اس کی اطاعت کر کے عبادت پر ہمیشگی کرنے کو ترک نہ کرنا، بلکہ جہاں تمھارا جی چاہے وہاں نماز پڑھو اس کی کچھ پروا نہ کرو۔ اللہ تمھارا نگہبان ہے، وہ تم کو لوگوں کے ہاتھ سے محفوظ رکھے گا، تم تو سجدہ کرو اللہ سے نزدیک رہو۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے کہ « أَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَهُوَ سَاجِدٌ فَأَكْثِرُوْا الدُّعَاءَ »[1] (رواہ مسلم) یعنی بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے سو تم سجدے میں بہت سی دعا کیا کرو۔ حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ ﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ﴾ اور ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ﴾ میں سجدہ کرتے تھے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿ كَلَّآ ﴾ سرزنش کے لیے ہے یا "حَقًّا" کے معنی میں ہے، مطلب یہ ہوا کہ انسان جب اپنے نفس کو غنی دیکھتا ہے تو پھر حد سے تجاوز کرنے لگتا ہے۔ اپنے رب سے تکبر کرتا ہے۔ یہ غنا خاندان والوں اور انصار اور مال کے سبب سے ہوتی ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابوجہل کو جب مال ملتا تو لباس اور کھانے اور سواری اور شراب میں زیادتی کرتا۔ یہ اس کا طغیان تھا۔ یہی قول امام کلبی رحمہ اللہ کا ہے۔[3] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سورت کا شروع کا حصہ علم کی مدح کی دلیل ہے اور سورت کا آخری حصہ مال کی مذمت پر دلیل ہے۔ یہ دین اور علم کی رغبت پیدا کرنے اور دنیا اور مال سے نفرت دلانے کے لیے کافی ہے۔[4]

﴿ الرُّجْعٰى ﴾ بہ معنی مرجع ہے، اس میں سرکشی کے انجام سے ڈرانا ہے، کیوں کہ اللہ اس کا انجام نقصان اور فقر اور موت کی طرف کرتا ہے۔ ناہی عن الصلاۃ کی مراد مفسرین کے نزدیک ابوجہل ہے۔ نبی اکرم ﷺ نماز پڑھتے تھے، اس نے اوجھڑی آپ کی پشت پر رکھ دی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: نبی اکرم ﷺ ہدایت پر ہیں اور تقویٰ کا حکم کرتے ہیں۔ تقویٰ سے مراد اخلاصِ توحید اور عملِ صالح ہے جس کے سبب سے انسان آگ سے بچتا ہے۔ ابوجہل نے تکذیب کی اور منہ موڑا۔ کیا وہ یہ بات نہیں جانتا کہ اللہ اس کے قول و فعل کو دیکھ رہا ہے۔ جب دیکھ رہا ہے تو اس کو اس کے قول و فعل کا بدلہ ضرور ہی دے گا۔ یہ سوالیہ انداز سرزنش اور ملامت کے لیے ہے۔ پھر صاف کہہ دیا کہ اگر وہ ان ناشائستہ حرکات سے باز نہ آئے گا تو ہم اس کو چوٹی سے پکڑ کر کھینچیں گے۔

"سفع" جذبِ شدید کو کہتے ہیں، یعنی گھسیٹنا۔ یہ جذب آگ کی طرف ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[1] صحيح مسلم (٤٨٢)
[2] صحيح مسلم (٥٧٨) تفسير ابن كثير (٦٨٣/٤ـ٦٨٥)
[3] تفسير البغوي (٤٧٩/٨) فتح القدير (٦٢٩/٥)
[4] تفسير الرازي (٢٠/٣٢)

﴿ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْأَقْدَامِ ﴾ [الرحمٰن: ۴۱] ’’اور ان کی پیشانیوں کے بال اور قدم پکڑ لیے جائیں گے۔‘‘ یا مراد دنیا کا عذاب ہے، بدر کے دن مسلمانوں نے اس کو قتل کی طرف کھینچا اور مار کر زخمیوں میں ڈال دیا۔ ﴿ نَاصِيَةٍ ﴾ پیشانی کے بالوں کو کہتے ہیں۔ اب وہ اپنے حمایتی بلائے، ہم بھی ملائکہ ’’غلاظ شداد‘‘ کو، جو جہنم کے داروغہ ہیں بلاتے ہیں۔ اے رسول! تم ہرگز اس کا کہا نہ مانو، اللہ کو سجدہ کرو اور عبادت کے ساتھ اس کا قرب حاصل کرو۔ اے ابو جہل! تو آگ کے نزدیک ہو۔ لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے، سجدہ سے مراد نماز ہے یا سجدۂ تلاوت ہے۔ کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے اس آیت کو پڑھ کر سجدہ کیا تھا۔[1]

[1] صحیح مسلم (۵۷۸) فتح البیان (۱۵/۳۱۲۔۳۱۷)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْقَدْرِ

اس سورت کی پانچ (۵) آیتیں ہیں۔محلی نے کہا ہے کہ یا اس کی چھے (۶) آیتیں ہیں۔[1] اکثر مفسرین کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔امام ثعلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مدنی ہے۔یہی زیادہ صحیح ہے۔امام واقدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مدینہ میں سب سے پہلے یہی سورت اتری۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس، ابن زبیر اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ مکی ہے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[4]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ
الْقَدْرِ ۝۲ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳ تَنَزَّلُ
الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴
سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

بے شک ہم نے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں نازل کیا ① اور آپ کو کیا معلوم کہ لیلۃ القدر کیا ہے؟ ② لیلۃ القدر ہزار مہینے سے بہتر ہے ③ اس رات میں فرشتے اور روح (جبریل) اپنے رب کے حکم سے ہر کام کے لیے نازل ہوتے ہیں ④ (وہ رات) طلوعِ فجر تک سلامتی (ہی سلامتی) ہے ⑤

شبِ قدر کی فضیلت:

شاید قرآن اترنا پہلے اسی شب سے شروع ہوا۔پھر ہمیشہ کے لیے اللہ پاک نے اس شب میں تین صفتیں

---

① تفسیر الجلالین (۸۱۵/۱) ② تفسیر القرطبي (۱۲۹/۲۰)

③ الدر المنثور (۵۶۷/۸) ④ تفسیر ابن کثیر-(۴۴۱/۸- ط: دار طیبة)

رکھیں۔ اس رات میں جو نیکی کرے، گویا ہزار مہینے تک وہ نیکی کی۔ اور دنیا کے جو کام مقدر ہیں وہ اس رات میں نیچے اترتے ہیں اور اللہ کی طرف سے چین اور دل جمعی اترتی رہتی ہے۔ ساری رات عبادت حلاوت سے ہوتی ہے۔ قرآن سے معلوم ہوا کہ وہ رات رمضان میں ہے۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ وہ رات رمضان کے آخری دہے میں طاق راتوں میں ہے، یعنی ۲۱ سے ۲۷ تک۔ الغیب عند اللّٰہ. انتھیٰ

اللہ پاک نے اس آیت پاک میں خبر دی کہ قرآن کا نزول اس رات میں ہوا۔ یہ رات بڑی برکت والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ [الدخان: ۳] ”یقیناً ہم نے اسے بابرکت رات میں اتارا ہے۔“ اس سے مراد شبِ قدر ہے، یہ رات رمضان میں ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ﴾ [البقرة: ۱۸۵] ”ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔“ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے کہ اللہ نے قرآن کو ایک ہی دفعہ میں لوحِ محفوظ سے بیت العزت آسمانِ دنیا میں اتارا، پھر ۲۳ برس میں حالات و واقعات کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے شبِ قدر کی شان بڑھانے کے لیے فرمایا کہ تو کیا جانے کہ شبِ قدر کیا ہے، وہ تو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ یوسف بن سعد کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے بیعت کرنے کے بعد معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا: تم نے مومنین کے منہ سیاہ کر دیے، یا تم مومنین کے منہ سیاہ کرنے والے ہو۔ فرمایا: اللہ تجھ پر رحمت کرے تو مجھ پر ملامت نہ کر۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اُمیہ کو اپنے منبر پر دیکھا، آپ کو برا لگا، ﴿ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴾ اتری مراد کوثر سے جنت کی نہر ہے اور ﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ ﴾ اتری۔ ہزار ماہ سے مراد بنی اُمیہ کی مملکت ہے۔ قاسم نے کہا ہے کہ ہم نے گنا تو ان کا زمانہ ہزار ماہ پایا، نہ ایک دن زیادہ نہ ایک دن کم۔[2] (رواه الترمذي واستغربه والحاكم وابن جرير)

لیکن اس کی سند اور صحت میں کلام ہے، بنی اُمیہ کی کل مدت ۹۲ برس ہیں، یہ ہزار ماہ سے زیادہ ہوئے، اس لیے کہ ہزار ماہ کے ۸۳ سال اور چار ماہ ہوتے ہیں۔ قاسم نے ابن الزبیر کی مدت کے ایام ساقط کر دیے، اس بنیاد پر قاسم کا قول صحت کے قریب ہے۔ اس کے علاوہ سورت شریفہ ایامِ بنی اُمیہ کی مذمت کے لیے دلیل نہیں ہے، بلکہ وہ تو شبِ قدر کی تعریف میں آئی ہے۔ اس سے حدیث کا ضعف اور نکارت ثابت ہوئی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے ایک شخص کا ذکر کیا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہزار مہینے تک ہتھیار باندھا،

---

1. تفسير الطبري (۵۳۱/۲۴، ۵۳۲)
2. سنن الترمذي (۳۳۵۰) مستدرك الحاكم (۱۸۶/۳) تفسير الطبري (۵۳۳/۲۴، ۵۳۴) اس روایت میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: (تفسير ابن كثير: ۶۸۵/۴، ۶۸۶)

مسلمانوں کو تعجب ہوا۔ اس پر اللہ نے یہ سورت بھیجی کہ تمھاری یہ رات اس کی ہزار رات سے بہتر ہے۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک شخص تھا، وہ ساری رات صبح تک قیام کرتا، پھر دن کو دشمن سے لڑتا شام تک یہی کرتا۔ ہزار ماہ تک اس نے یہی کیا۔ اس پر اللہ نے یہ سورت نازل کی کہ یہ رات اس کے ہزار ماہ سے بہتر ہے۔[2]

علی بن عروہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے بنی اسرائیل کے چار آدمیوں کا ذکر کیا کہ انھوں نے اسّی (۸۰) برس اللہ کی عبادت کی، پلک جھپکنے کی مدت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی: ایوب و زکریا وحزقیل اور یوشع علیہم السلام۔ نبی اکرم ﷺ کے اصحاب نے تعجب کیا۔ جبریل علیہ السلام نے آ کر کہا: اے محمد! تمھاری امت نے ان چار لوگوں کی اسّی سالہ عبادت پر تعجب کیا کہ ان سے کبھی پلک جھپکنے تک نافرمانی نہ ہوئی۔ اللہ نے تم پر اس سے بہتر یہ سورت نازل کی اور کہا کہ یہ اس سے افضل ہے جس سے تم نے اور تمھاری امت نے تعجب کیا۔ اس پر نبی اکرم ﷺ اور سب لوگ خوش ہو گئے۔[3] (رواه ابن أبي حاتم) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس رات کا عمل قیام ہے۔ اور دن کا عمل صیام ہے، یہ ہزار ماہ سے بہتر ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ لیلۃ القدر ان ہزار ماہ سے بہتر ہے جس میں یہ رات نہیں ہے۔ یہی قول امام قتادہ، شافعی رحمہ اللہ اور کئی اہل علم کا ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے[4] اور یہی درست ہے نہ کہ اور کچھ۔ حدیث میں مروی ہے: «رِبَاطُ لَيْلَةٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ لَيْلَةٍ فِيمَا سِوَاهُ مِنَ الْمَنَازِلِ»[5] (رواه أحمد) ''اللہ کی راہ میں ایک رات کا پہرہ ہزاروں راتوں سے بہتر ہے۔'' اسی طرح جو شخص جمعہ کے لیے اچھی ہیئت اور نیتِ صالحہ سے جاتا ہے اس کے لیے ایک سال کا عمل لکھا جاتا ہے یعنی ایک سال کے روزے اور قیام۔[6] اور اس کے علاوہ کئی ایک مطالب ومعانی بیان کیے ہیں۔ عمرو بن قیس نے کہا ہے کہ اس رات میں عمل کرنا ہزار ماہ عمل کرنے سے بہتر ہے۔[7]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ جب رمضان آیا تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تمھارے پاس رمضان کا مہینا آیا، یہ مبارک مہینا ہے۔ اللہ نے تم پر اس کے روزے فرض کیے ہیں اس مہینے میں جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیطانوں کو قید کر دیتے ہیں، اس میں ایک رات ہے جو ہزار ماہ سے بہتر ہے، جو شخص اس رات کی خیر سے محروم رہا وہ بہت بدنصیب ہے۔[8] (رواه أحمد والنسائي)۔ غرضیکہ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳٤٥۲/۱۰) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسیر الطبري (٥۳۳/۲٤)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۳٤٥۲/۱۰) یہ روایت مرسل ہے، نیز سند میں ''علی بن عروہ اور مسلمہ بن علی'' سخت ضعیف راوی ہیں۔

[4] تفسیر الطبري (٥۳٤،٥۳۳/۲٤) [5] مسند أحمد (٦٥/۱)

[6] سنن أبي داود (۳٤٥) سنن ابن ماجه (۱۰۸۷) صحیح الترغیب والترهیب (۱٦۸/۱) [7] تفسیر الطبري (٥۳۳/۲٤)

[8] مسند أحمد (۲۳۰/۲) سنن النسائي (۲۱۰٦) صحیح الجامع (٥٥)

اس رات کی عبادت جب ہزار ماہ کی عبادت کے برابر ٹھہری تو صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے رفعاً مروی ہے کہ جو کوئی شبِ قدر میں ایمان واحتساب کی نیت سے کھڑا ہو تو کثرتِ برکت کے سبب سے اس کے پہلے تمام گناہ بخش دیے گئے۔[1] اس رات میں برکت کے فرشتے اترتے ہیں، ان کے ساتھ برکت اور رحمت نازل ہوتی ہے جس طرح کہ قرآن کی تلاوت کے وقت ملائکہ کا نزول ہوتا ہے اور وہ ذکر کے حلقے کو گھیر لیتے ہیں اور طالبِ علم کے لیے اپنے پر بچھا دیتے ہیں یہ اس کی تعظیم ہے۔ اس جگہ روح سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں، گویا خاص کا عام پر عطف ہے یا ملائکہ کی کوئی اور قسم ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس رات میں ہر امر سے سلامتی ہے، یعنی اس رات شیطان کوئی برا کام یا ایذا نہیں کر سکتا۔ یہ رات اس کے شر سے سالم رہتی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ اس رات میں امور کا فیصلہ اور اجلوں اور رزقوں کی تقدیر ہوتی ہے جس طرح کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ﴾ [الدخان: ٤] ''اسی رات میں ہر ایک مضبوط کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔'' امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس رات فرشتے اہلِ مساجد پر صبح تک سلام کرتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت یہ ہے: ''مِنْ كُلِّ أَمْرٍ سَلَامٌ هِيَ حَتَّى مَطْلَعِ الْفَجْرِ''[2]

لیلۃ القدر کی تعیین اور علامات:

امام بیہقی رحمہ اللہ نے کتاب فضائل الاوقات میں علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے شبِ قدر میں ملائکہ کے نزول اور نمازیوں پر گزرنے اور ان کے لیے برکت نازل ہونے کے بارے میں ایک غریب اثر روایت کیا ہے۔[3] کعب احبار رحمہ اللہ سے بھی ایک عجیب وغریب اثر مروی ہے جس میں ہے کہ جبریل علیہ السلام کے ہمراہ فرشتے سدرۃ المنتہیٰ سے زمین پر نازل ہوتے ہیں اور مومنین اور مومنات کے لیے دعا کرتے ہیں۔[4] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ یہ رات ستائیسویں یا انتیسویں کو ہوتی ہے اور اس رات زمین پر کنکریوں سے بھی زیادہ تعداد میں فرشتے ہوتے ہیں۔[5] امام ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مِّن كُلِّ أَمْرٍ ۝ سَلَامٌ ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ یہ بالکل خیر ہے اس میں صبح کے نکلنے تک کوئی شر نہیں ہوتا۔[6]

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بھی اسی کی موید ہے۔ فرمایا کہ شبِ قدر عشر بواقی میں ہوتی ہے جس نے ان راتوں میں قیام کیا اس کو یہ کافی ہیں، کیوں کہ اللہ اس کے اگلے پچھلے گناہ بخشتا ہے۔ یہ رات طاق ہوتی

---

(1) صحيح البخاري (١٨٠٢) صحيح مسلم (٧٦٠) (2) تفسير الطبري (٥٣٥،٥٣٤/٢٤) تفسير ابن كثير (٦٨٧/٤)

(3) فضائل الأوقات (٢٥٤،٢٥٣/١) تفسير ابن كثير (٦٨٧/٤)

(4) تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٥٣،٣٤٥٢/١٠) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی ضعیف ہیں۔

(5) مسند الطيالسي (٣٣٢/١) السلسلة الصحيحة (٢٢٠٥) (6) تفسير الطبري (٥٣٥/٢٤)

ہیں ۹ یا ۷ یا ۵ یا ۳ یا آخر شب۔ یہ رات صاف روشن ہوتی ہے، گویا اس میں چاند نکلا ہے۔ ٹھہری ہوئی، نہ سرد نہ گرم اور نہ کوئی تارہ ٹوٹے۔ اس کی صبح کو سورج برابر نکلتا ہے بغیر شعاع کے جیسے چودھویں رات کا چاند ہو، شیطان کو حلال نہیں کہ اس دن اس کے ہمراہ نکلے۔[1] (رواه أحمد)۔ اس کی اسناد حسن ہے مگر متن میں غرابت ہے اور بعض الفاظ میں نکارت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت رفعاً یہ ہے کہ یہ رات نرم و کشادہ رو ہے نہ گرم ہے نہ سرد۔ اس کی صبح کو سورج ضعیف اور سرخ نکلتا ہے۔[2] (رواه أبو داود و الطيالسي) سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما رفعاً کہتے ہیں کہ میں نے شبِ قدر دیکھی پھر بھول گیا یہ آخری عشرے میں ہوتی ہے۔ یہ کشادہ رو اور چمکدار ہے، نہ گرم ہے نہ سرد، گویا اس میں چاند نکلا ہوا ہے۔ شیطان اس رات میں نہیں نکلتا جب تک کہ صبح کی روشنی چمکے۔[3]

علماء کا اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ رات پہلی اُمتوں میں بھی تھی یا یہ اسی اُمت کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس میں دو قول ہیں: مالک رحمہ اللہ نے بلاغاً کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کی عمریں دکھائیں گئیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تھے، یا جو اللہ نے چاہا اُن میں سے دکھائی گئیں۔ پس گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کی عمریں کم پائیں، یعنی ان عمروں میں عمل بھی کم ہوں گے۔ تب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ رات عطا کی جو ہزار مہینے سے بہتر ہے۔[4] یہ حدیث دوسری وجہ سے مسنداً بھی آئی ہے۔ مالک رحمہ اللہ کے اس قول کا تقاضا یہ ہے کہ اس رات کے ساتھ یہی امت خاص ہے۔ اس کو صاحبِ عدہ نے جمہور علماء سے نقل کیا ہے۔ واللّٰہ أعلم. اور خطابی رحمہ اللہ نے اس پر اجماع بیان کیا ہے، لیکن حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ یہ رات پہلی اُمتوں میں بھی تھی جس طرح کہ ہماری اُمت میں ہے۔

مرثد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس رات کے متعلق سوال کیا تھا؟ کہا: سب سے زیادہ میں نے سوال کیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے خبر دیں کہ یہ رات رمضان میں ہوتی ہے یا کسی اور مہینے میں؟ فرمایا: بلکہ یہ رمضان میں ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ کیا یہ پیغمبروں کے ساتھ ہوتی ہے جب تک کہ وہ باقی رہتے ہیں، پھر ان کے مقبوض (وفات پانے) ہو جانے کے بعد اٹھ جاتی ہے یا قیامت تک باقی رہے گی؟ فرمایا: قیامت تک ہے۔ میں نے کہا کہ کس رمضان میں ہوتی ہے؟ فرمایا: تم اس کو عشرِ اول اور عشرِ آخر میں تلاش کرو، پھر عشرِ آخر اور سبعِ اواخر (آخری سات راتوں) میں بتا دیا اور فرمایا کہ اب پھر اس کے بارے میں مجھ سے سوال نہ کرنا۔[5] (رواه أحمد والنسائي)

اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تمام امتوں کے لیے ہے اور قیامت تک ہر سال میں ہوتی ہے نہ کہ جس

---

[1] مسند أحمد (٣٢٤/٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٤٠٨/٣)

[2] مسند الطيالسي (٣٤٩/١) صحيح الجامع (٥٤٧٥) [3] صحيح ابن خزيمة (٣٣٠/٣) [4] الموطأ (٣٢١/١)

[5] مسند أحمد (١٧١/٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٢٧٨/٢)

طرح بعض شیعہ کے گروہوں نے زعم کیا ہے کہ وہ بالکل مرتفع ہوگئی ہے اس حدیث کی دلیل سے: ''فَرُفِعَتْ وَعَسَى أَنْ يَكُونَ خَيْراً لَكُمْ'' [1] ''وہ اٹھالی گئی اور شاید یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔'' اس لیے کہ رفع سے مراد وقتِ معین کا علم ہے۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ اس رات کا وقوع ماہِ رمضان کے ساتھ مختص ہے اور دوسرے مہینوں میں نہیں ہوتی بہ خلاف عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور علمائے کوفہ کے جو اس بات کے قائل ہیں کہ پورے سال میں ایک دفعہ آتی ہے اور تمام مہینوں میں یکساں آتی ہے۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے سنن میں یہ ترجمہ کیا ہے: ''بَابُ بَيَانِ أَنَّ لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي كُلِّ رَمَضَانَ'' پھر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی یہ حدیث لکھی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اور میں سنتا تھا، فرمایا: یہ ہر رمضان میں ہوتی ہے۔ [2] (وهذا إسناد رجاله ثقات) امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے حکایت ہے کہ یہ ہر ماہِ رمضان میں متوقع ہے۔ (وهو وجه حكاه الغزالي واستغفربه الرافعي جدا)

بعض نے کہا ہے کہ یہ ماہِ رمضان کی پہلی شب میں ہوتی ہے۔ (حكي هذا عن أبي رزين) بعض نے کہا ہے کہ ۱۷ کو ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث رفعاً و وقفاً آئی ہے۔ [3] یہ ایک قول شافعی کا بھی ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ شبِ بدر ہے اس دن جمعرات تھی اور ۱۷ رمضان تھی۔ اس کی صبح کو بدر کا واقعہ ہوا، اسی دن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: ''یوم الفرقان''. بعض نے کہا ہے کہ ۱۹ شب ہے۔ سیدنا علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے بھی روایت کیا گیا ہے۔ [4] سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ وہ آخری عشرے میں ہے۔ روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہے کہ صبح کو ۲۱ ہوتی ہے۔ [5] (رواه الشيخان)

امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث تمام روایات سے زیادہ صحیح ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ۲۳ شب۔ یہ صحیح مسلم میں عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے [6] اور ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے قریب السیاق ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ۲۴ شب ہے۔ یہ ابو سعید رضی اللہ عنہ سے رفعاً مروی ہے۔ [7] (وإسناد رجاله ثقات) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ آخری عشرے کی پہلی سات راتوں میں ہے۔ [8] یہ موقوف بخاری میں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، جابر رضی اللہ عنہم، امام حسن، قتادہ اور ابن وہب رحمہم اللہ کا قول بھی یہی ہے کہ ۲۴ شب ہے۔ سیدنا واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ قرآن ۲۴ کو اترا۔ [9] بعض نے کہا ہے کہ ۲۵ ہے۔ یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے رفعاً بخاری میں آیا ہے۔ اس کی تفسیر طاق راتوں کے ساتھ کی ہے۔ [10] یہی زیادہ ظاہر اور زیادہ

---

① صحيح البخاري (٤٩)

② سنن أبي داود (١٣٨٧) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح کہا ہے۔ مزید دیکھیں: (ضعيف أبي داود: ٦٧/٢)

③ سنن أبي داود (١٣٨٤) اس کی سند میں ''ابو اسحاق'' ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: (ضعيف أبي داود: ٦٥/٢)

④ تفسير ابن كثير (٦٨٩/٤) ⑤ صحيح البخاري (٧٨٠) صحيح مسلم (١١٦٧) ⑥ صحيح مسلم (١١٦٨)

⑦ مسند الطيالسي (٢٨٨/١) ⑧ صحيح البخاري (٤٢٠٠) ⑨ مسند أحمد (١٠٧/٤) ⑩ صحيح البخاري (٢٠١٧)

مشہور ہے اور بعض نے اس کو شفع پر محمول کیا ہے جس طرح کہ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مسلم میں آیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ستائیسویں شب ہے۔

یہ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مسلم میں رفعاً مروی ہے اور ابی رضی اللہ عنہ نے اس پر قسم اٹھائی اور کہا: سورج اس کی صبح کو بغیر شعاع کے نکلتا ہے۔[1] اس بارے میں سیدنا معاویہ، عبداللہ بن عمر اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہم سے بھی رفعاً مروی ہے اور یہی قول سلف کے ایک گروہ کا ہے کہ وہ ستائیسویں شب کو ہوتی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب بھی یہی ہے اور ایک روایت کے مطابق ابو حنیفہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ بعض نے قرآن پاک سے اس تاریخ کا استخراج اس طرح کیا ہے کہ لفظ ہی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ سورت کا ستائیسواں کلمہ ہے۔ واللہ أعلم.[2]

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اصحاب کو جمع کر کے پوچھا کہ شبِ قدر کس تاریخ کو ہوتی ہے؟ سب نے اس بات پر اجماع کیا کہ آخری عشرے میں ہوتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ میں نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کی کہ مجھے یہ معلوم ہے کہ یہ آخری عشرے میں ساتویں رات ہوتی ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تو نے کہاں سے جانا؟ میں نے کہا کہ اللہ نے سات آسمان بنائے، سات زمینیں بنائیں، سات دن بنائے، مہینا سات ہی پر دور کرتا ہے، انسان کو سات سے بنایا، وہ سات سے کھاتا ہے اور سات پر سجدہ کرتا ہے اور بیت اللہ کا طواف بھی سات ہی بار ہے اور رمیِ جمار بھی سات بار۔ اس طرح کی اور اشیاء بھی ہیں۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جو بات تو نے سمجھی وہ ہم نے نہیں سمجھی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: سات سے کھانا سے مراد یہ ہے: ﴿ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۝ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴾ [عبس: ٢٧- ٢٨][3] ”پھر اس میں سے اناج اُگائے اور انگور اور ترکاری۔“ یہ اسناد جید ہے مگر متن سخت غریب ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ انتیسویں شب ہے۔ اس کا ذکر دوسری طاق راتوں کے ساتھ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے۔[4] (رواہ أحمد)۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً مذکور ہے۔[5] (رواہ أحمد)۔ بعض نے کہا ہے کہ آخر شب ہے۔ یہ بات ابی بکرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی مرفوعاً مذکور ہے۔[6] (رواہ الترمذي والنسائي)۔ ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آیا ہے: ”أَنَّهَا آخِرُ لَيْلَةٍ“

امام شافعی رحمہ اللہ نے ان روایات کے بارے میں کہا ہے کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سائل کے جواب میں صادر ہوئیں۔ جب کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتا کہ لیلۃ القدر کو ہم فلاں شب میں تلاش کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: بہتر

---

① صحیح مسلم (٧٦٢) ② تفسیر ابن کثیر (٦٩٠/٤) ③ المعجم الکبیر (٢٦٤/١٠)
④ اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ ⑤ مسند أحمد (٥١٩/٢) صحیح الجامع (٥٤٧٣)
⑥ سنن الترمذي (٧٩٤)

ہے اور لیلۃ القدر تو ایک معین رات ہے، وہ منتقل نہیں ہوتی۔ (نقله الترمذي عنه بمعناه) اور ابو قلابہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ رات آخری عشرے میں منتقل ہوتی رہتی ہے، اسی پر امام مالک، ثوری، احمد، ابن راہویہ، ابوثور، مزنی اور ابن خزیمہ رحمہم اللہ وغیرہم نے نص کی ہے اور اسی کو قاضی نے شافعی رحمہ اللہ سے بیان کیا ہے۔ وهو الأشبه والله أعلم.[1]

اس قول کا استیناس (تائید) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث سے ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں تمھاری خوابوں کو کہ وہ آخری سات راتوں پر متفق ہیں تو جو کوئی اس رات کا قصد کرے، وہ آخری سات راتوں میں کرے۔[2] (رواه الشيخان واللفظ للبخاري)۔ اس رات کے منتقل نہ ہونے، اس کے ماہِ رمضان میں متعین ہونے پر شافعی کی حجت وہ حدیث ہے جو سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: «وَعَسَى أَنْ يَكُونَ خَيْرًا لَكُمْ فَالْتَمِسُوهَا فِي التَّاسِعَةِ وَالسَّابِعَةِ وَالْخَامِسَةِ»[3] [الحديث] (رواه البخاري) "شاید یہ تمھارے حق میں بہتر ہو۔ لہٰذا اسے پچیسویں، ستائیسویں اور انتیسویں رات میں تلاش کرو۔"

اس دلیل کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ ہمیشہ کے لیے معین نہ ہوتی تو اُن کو اس کا علم بعینہٖ ہر سال میں حاصل نہ ہوتا کیوں کہ تعیین کے منتقل ہونے کی صورت میں اس سال کے علاوہ اس کا متعین ہونا معلوم نہ ہوتا مگر یہ کہا جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نکل کر اسی سال میں فقط ان کو بتانا چاہتے تھے۔ حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ یہ شب مبہم رکھی جائے، تاکہ تمام مہینا اس کی جستجو میں عبادت کریں اور آخری عشرے میں زیادہ کوشش بجا لائیں۔ لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری عشرے میں اعتکاف کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی ازواج رضی اللہ عنہن نے اعتکاف کیا۔[4] (أخرجاه من حديث عائشة رضي الله عنها)

صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔[5] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب آخری عشرہ داخل ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو زندہ کرتے، گھر والوں جگاتے، خوب مضبوط کمر باندھتے۔[6] صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں کہ جس قدر جہد اس عشرے میں کرتے، اتنی دوسرے عشر میں نہ کرتے۔[7] یہی شدِ میزر کے معنی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد نساء (عورتوں) سے کنارہ کشی ہے۔ احتمال ہے کہ دونوں باتوں کی طرف اشارہ ہو، اس لیے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رمضان سے ایک عشر باقی رہتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کمر باندھتے اور عورتوں سے کنارہ کش ہو جاتے۔[8] (انفرد به أحمد)

امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ عشرے کی ساری راتیں لیلۃ القدر کی تلاش میں برابر ہیں۔ کسی رات کو کسی

---

① تفسير ابن كثير (٦٩١/٤) ② صحيح البخاري (١٩١١) صحيح مسلم (١١٦٥) ③ صحيح البخاري (١٩١٩)
④ صحيح البخاري (١٩٢٢) صحيح مسلم (١١٧٢) ⑤ صحيح البخاري (١٩٢١) صحيح مسلم (١١٧١)
⑥ صحيح البخاري (١٩٢٠) صحيح مسلم (١١٧٤) ⑦ صحيح مسلم (١١٧٥) ⑧ مسند أحمد (٦٦/٦)

دوسری رات پر ترجیح نہیں ہے۔ میں نے یہ قول شرح رافعی میں دیکھا ہے۔ مستحب یہ ہے کہ تمام اوقات میں اور خاص کر ماہِ رمضان میں بالخصوص عشرِ اخیر میں پھر طاق راتوں میں بہت دعا کرے خاص طور پر یہ دعا کرے:« اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا » کیوں کہ یہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! اگر میں شبِ قدر کو پاؤں تو کیا دعا کروں؟ فرمایا: کہہ:« اَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ »[1] (رواه أحمد والترمذي والنسائي وابن ماجه) ''اے اللہ! تو بہت معاف کرنے والا ہے، معاف کرنے کو پسند کرتا ہے لہٰذا مجھے معاف فرما۔'' ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ (وأخرجه الحاكم في المستدرك وقال: هذا صحيح على شرط الشيخين) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس جگہ پر ایک اثر غریب وعجیب جو شبِ قدر سے متعلق ہے طول طویل کعب احبار رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے[2] اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کو بطولہ لکھا ہے کہ جو رفعاً ثابت نہیں ہے، اس لیے ہم نے اس جگہ اس کا ذکر نہیں کیا۔[3]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ ﴾ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ اللہ نے قرآن کو شبِ قدر میں لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر اتارا، پھر تھوڑا تھوڑا ضرورت کے مطابق اترتا رہا۔ نزول کی ابتدا اور اس کے آخر کے درمیان ۲۳ برس گزرے۔ دوسری آیت میں یوں فرمایا ہے:﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾[الدخان: ۳] اس شب سے مراد یہی لیلۃ القدر ہے۔ تیسری آیت میں کہا ہے: ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ﴾ [البقرة: ۱۸۵] ''ماہ رمضان وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔'' یہ شبِ قدر اسی رمضان میں تھی۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ رات فیصلے کی ہے، اس کو قدر اسی لیے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس میں آیندہ سال کے امور کی تقدیر کرتا ہے، جیسے: موت، اجل اور رزق وغیرہ کا اندازہ، یا اس لیے کہ وہ عظیم القدر ہے، یا اس لیے کہ اس رات کی طاعات کی بڑی قدر ہوتی ہے اور بہت بڑا ثواب ملتا ہے۔ خلیل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس رات زمین فرشتوں کی کثرت سے تنگ ہو جاتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ ﴾ ''أَيْ: ضُيِّقَ''[4] اس رات کے فضائل اور اس کی تعیین میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔ چالیس سے زیادہ اقوال ہیں۔ اللہ نے کہا ہے کہ اے رسول! تم نے کیا سمجھا کہ یہ شب کیا ہے؟ گویا درایتِ خلق سے خارج ہے۔ یعنی عقل سے باہر ہے۔

---

(1) مسند أحمد (۱۸۲/۶) سنن الترمذي (۳۵۱۳) سنن النسائي الكبرىٰ (۵۱۹/۶) سنن ابن ماجه (۳۸۵۰) مستدرك الحاكم (۷۱۲/۱) السلسلة الصحيحة (۳۳۳۷)

(2) تفسير ابن كثير (۶۹۲/۴، ۶۹۳)

(3) تفسير ابن كثير (۶۸۵/۴ـ۶۹۳)

(4) تفسير القرطبى (۱۳۱/۲۰)

اللہ کے سوا اس کو کوئی نہیں جانتا۔ یہ رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس کے ۸۳ سال چار ماہ ہوئے۔

اکثر مفسرین رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ اس رات کا عمل ہزار ماہ کے عمل سے افضل ہوتا ہے جن میں یہ شب نہ ہو۔ اسی کو امام فراء اور زجاج رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1] یا ﴿ أَلْفِ شَهْرٍ ﴾ سے مراد پورا زمانہ ہے، اس لیے کہ عرب ہزار کے عدد کا ذکر اکثر اشیاء میں مبالغے کے طور کیا کرتے ہیں، یا اس لیے کہ پہلے زمانے میں جو شخص ہزار ماہ عبادت کرتا اس کو عابد کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مدتِ دراز کے عوض اس امت کو یہ رات عطا کی۔ اس کے سوا اور قول بھی ہیں جن کے تحت کچھ فائدہ نہیں ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ شبِ قدر میں عمل کرنا، صدقہ دینا، نماز پڑھنا اور زکات دینا ہزار ماہ سے افضل ہے۔[2]

یہ رات افضل اس لیے ٹھہری کہ اس میں روح اور فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ان کا یہ آنا اللہ کے اذن اور اجازت سے ہوتا ہے جو کام اگلے پورے سال میں ہوگا، اس کا بندوبست کرتے ہیں۔ یہ رات سراپائے سلامتی اور خیر ہے، اس میں شر کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ کسی مومن اور مومنہ پر شیطان کا اثر نہیں ہوتا۔ یا جس مسلمان پر ملائکہ کا گزر ہوتا ہے، اس سے کہتے ہیں: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا الْمُؤْمِنُ" یا بعض ملائکہ بعض پر سلام کرتے ہیں۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کا سلام اولیاء پر اور اہلِ طاعت پر ہوتا ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس رات سرکش شیاطین کو قید کر دیتے ہیں اور عفاریت جنّ (بڑے بڑے عفریت جنّ) طوق پہنا دیے جاتے ہیں۔ آسمان کے سارے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ اللہ ہر توبہ کرنے والے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ حال غروب آفتاب سے لے کر طلوعِ فجر تک ایک جیسا اور برابر رہتا ہے۔[4]

---

(1) فتح القدير (٦٣٣/٥) (2) الدر المنثور (٥٦٨/٨) (3) تفسير البغوي (٤٩١/٨)
(4) الدر المنثور (٥٧٠/٨) فتح البيان (٣٢١/١٥-٣٢٥)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

سُوْرَةُ الْبَيِّنَةِ

اس کو سورت ﴿ لَمْ يَكُنِ ﴾، سورت منفکین، سورت قیمہ اور سورت بریہ بھی کہتے ہیں۔ اس کی آٹھ (۸) یا نو (۹) آیتیں ہیں۔ جمہور کے قول کے مطابق مدنی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مدینے میں اتری ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔[1]

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو سورة البینہ سنانا:

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ اللہ نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں تم پر سورت ﴿ لَمْ يَكُنِ ﴾ پڑھوں۔ کہا: کیا میرا نام آپ سے لیا ہے؟ فرمایا: ہاں۔ وہ رونے لگے۔[2] (أخرجه الشيخان وغيرهما) اس میں سیدنا ابی رضی اللہ عنہ کی بڑی فضیلت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ ان کو یہ سورت پڑھ کر سنائیں۔ ابوحبہ بدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ سورت اتری تو جبریل علیہ السلام نے کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ کو یہ حکم کیا ہے کہ آپ یہ سورت ابی رضی اللہ عنہ کو پڑھا دو۔ ابی رضی اللہ عنہ نے کہا: "وَقَدْ ذُكِرْتُ ثَمَّ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" یعنی کیا وہاں میرا ذکر ہوا؟ فرمایا: ہاں! ابی رضی اللہ عنہ رو دیے۔[3] (أخرجه أحمد و ابن قانع في معجم الصحابة والطبراني و ابن مردويه)

لَكَ الْبَشَارَةُ فَاخْلَعْ مَا عَلَيْكَ فَقَدْ ذُكِرْتَ ثَمَّ عَلَى مَا فِيْكَ مِنْ عِوَجٍ

"تیرے لیے بشارت ہے تو اپنا بوجھ اتار پھینک، باوجود اپنی کجی کے کہ وہاں تیرا ذکر ہوا ہے۔"

کہتے ہیں کہ سیدنا ابی رضی اللہ عنہ بہت جلد الفاظِ نبوی کو اخذ کر لیتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑھنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ان الفاظ کو لے کر جس طرح سنا ہے اسی طرح خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی سکھائیں۔ اسماعیل بن ابی حکیم مزنی کی روایت رفعاً وسمعاً یہ ہے: اللہ تعالیٰ بندے کا ﴿ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ﴾ پڑھنا سنتا ہے اور فرماتا ہے: اے میرے بندے! خوش ہو جا مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم میں تجھ کو جنت میں جگہ دوں گا، یہاں تک کہ تو خوش ہو۔

[1] الدر المنثور (۸/۵۸۵) [2] صحيح البخاري (٤٦٧٦) صحيح مسلم (٧٩٩) [3] مسند أحمد (۳/٤٨٩)

(أخرجه أبو نعيم في المعرفة)۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث سخت غریب ہے۔[1] (وأخرجه أبو موسى المديني عن مطر المزني بنحوه)

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: مجھ کو حکم ہوا ہے کہ میں تجھ پر فلاں فلاں سورت پڑھوں۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ''وَقَدْ ذُكِرْتُ هُنَاكَ'' یعنی کیا میرا ذکر اس جگہ ہوا؟ فرمایا: ہاں اے ابا منذر! میں نہایت خوش ہوا۔ کہا: کون مجھ کو اس سے منع کرتا ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: ﴿قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾ [یونس: ٥٨] ''آپ کہہ دیجیے کہ بس لوگوں کو اللہ کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہیے وہ اس سے بدر جہا بہتر ہے جس کو وہ جمع کر رہے ہیں۔'' مؤمّل نے سفیان سے کہا: کیا قراءتِ حدیث کا بھی یہی حکم ہے؟ کہا: ہاں۔[2] (رواه أحمد)

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھ پر قرآن پڑھوں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورت ﴿لَمْ يَكُنِ﴾ پڑھی، اس میں یہ بھی پڑھا: «وَلَوْ أَنَّ ابْنَ آدَمَ سَأَلَ وَادِيًا مِنْ مَالٍ فَأُعْطِيَهُ لَسَأَلَ ثَانِيًا وَلَوْ سَأَلَ ثَانِيًا فَأُعْطِيَهُ لَسَأَلَ ثَالِثًا وَلَا يَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلَى مَنْ تَابَ وَإِنَّ ذَاتَ الدِّينِ عِنْدَ اللّٰهِ الْحَنِيفِيَّةُ غَيْرُ الْمُشْرِكَةِ وَلَا الْيَهُودِيَّةِ وَلَا النَّصْرَانِيَّةِ وَمَنْ يَفْعَلْ خَيْرًا فَلَنْ يُكْفَرَهُ»[3] (رواه أحمد والترمذي وقال حسن صحيح) ''اور اگر ابن آدم مال (سونے) سے بھری ہوئی ایک وادی کا سوال کرے اور وہ اسے دے بھی دی جائے تو وہ دوسری کا سوال کرے گا۔ پھر اگر اسے دوسری بھی دے دی جائے تو وہ تیسری کا سوال کرے گا۔ ابن آدم کے پیٹ کو بس مٹی ہی بھرتی ہے جو توبہ کرے، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اللہ کے ہاں دین والی امت جو تمام ادیان سے کٹ کر ایک اللہ کی جانب یکسو ہونے والی ہے، وہ امتِ مسلمہ ہے، نہ یہودیہ ہے اور نہ نصرانیہ جو بھی نیکی کرے گا تو اس کی ناقدری نہ ہوگی۔''

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۱ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا

① تفسير ابن كثير (٦٩٥/٤) اس کی سند میں ''عبداللہ بن سلمہ اور محمد بن اسماعیل جعفری'' سخت ضعیف راوی ہیں، نیز اسماعیل بن ابی حکیم کا سماع کسی بھی صحابی سے ثابت نہیں ہے۔

② مسند أحمد (١٢٣/٥) ③ مسند أحمد (١٣١/٥) سنن الترمذي (٣٧٩٣) السلسلة الصحيحة (٢٩٠٨)

صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ﴿٢﴾ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ﴿٣﴾ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا
الْكِتَابَ إِلَّا مِنۢ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴿٤﴾ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا
اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ
وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ ﴿٥﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

اہلِ کتاب کے بعض کافر اور مشرکین (کفر سے) رکنے والے نہ تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس واضح دلیل آ جائے ① اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاکیزہ صفحے پڑھے ② جن میں درست اور معتدل احکام ہیں ③ اور جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی، ان میں تفرقہ ان کے پاس واضح دلیل آ جانے کے بعد پڑا ④ حالانکہ انھیں یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ بندگی کو اللہ کے لیے خالص کر کے، یکسو ہو کر، اس کی عبادت کریں اور وہ نماز کو قائم کریں اور زکاۃ دیں، اور یہی سیدھی ملت کا دین ہے ⑤

اہلِ کتاب اور مشرکین کے کفار کا حال:

نبی اکرم ﷺ سے پہلے سب دین والے بگڑ گئے تھے۔ ہر ایک اپنی غلطی پر مغرور تھا۔ اب ضرورت تھی کہ کوئی دانا یا اللہ کا دوست یا عادل حکمران آئے جو انھیں سمجھائے، تاکہ وہ سیدھے راستے پر آ جائیں، ایسا ممکن نہ تھا، جب تک ایسا رسول نہ آئے جو عظیم المرتبت ہو اور اس کے پاس اللہ کی کتاب اور مدد قوی ہو۔ کئی برس میں ملک کے ملک ایمان سے بھر گئے۔ ہر سورت اس رسول کی ایک کتاب ہے اور اس کتاب کے آنے کے بعد کوئی شبہ نہ رہا۔ اہلِ کتاب ضد کی بنا پر اس کے مخالف ہیں، شبہے سے مخالف نہیں۔ یہ چیزیں ہر دین میں پسندیدہ ہیں۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ ہیں اور مشرکین عرب و عجم کے بت پرست ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ باز آنے والے نہ تھے، یہاں تک کہ ان پر حق واضح ہو۔ امام قتادہ رحمہ اللہ کا یہی قول ہے کہ ﴿ الْبَيِّنَةُ ﴾ سے مراد یہ قرآن ہے۔[1] پھر ﴿ الْبَيِّنَةُ ﴾ کی یہ تفسیر کی کہ اللہ کا رسول اس قرآنِ عظیم کو، جو ملائے اعلیٰ میں پاک صحیفوں کے اندر لکھا ہوا ہے، پڑھتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿١٣﴾ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿١٤﴾ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ﴿١٥﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴾ [عبس: ١٣-١٦] ”(یہ تو) پر عظمت صحیفوں میں (ہے) جو بلند و بالا اور پاک صاف ہیں، ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہے جو بزرگ اور پاکباز ہیں۔“

① تفسير الطبري (٢٤/٥٣٩)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ﴾ سے مراد صحفِ مطہرہ ہیں، یعنی یہ کتابیں اللہ کی کتبِ قیمہ میں سے ہیں، وہ عادلہ مستقیمہ ہیں، ان میں بھول چوک نہیں ہے۔ یہ اللہ کے پاس سے آئی ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تلاوتِ صحف سے مراد ذکرِ قرآن ہے، اچھی طرح سے اور اچھی ثنا کے ساتھ۔[1] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قیمہ سے مراد مستقیمہ عادلہ ہے۔[2] دوسری بینہ سے مراد پہلی اُمتوں پر نازل کی گئی کتب ہیں، یعنی اہلِ کتاب کا تفرق اور اختلاف ان پر اللہ کی حجتیں قائم ہونے کے بعد ہوا، انھوں نے ان کتابوں کے معانی اور مطالب بیان کرنے میں بہت زیادہ اختلاف کیا جس طرح کہ حدیث میں مروی ہے کہ یہود اکہتر (۷۱) فرقے ہو گئے اور نصاریٰ بہتر (۷۲) فرقے بن گئے اور یہ امت تہتر (۷۳) فرقے ہو جائے گی، سب فرقے آگ میں جائیں گے، سوائے ایک فرقے کے۔ کہا: وہ کون سا فرقہ ہے؟ فرمایا: «مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي»[3] ''وہ جو میرے اور میرے صحابہ کرام کی راہ پر گامزن ہے۔''

اعمال میں خلوص پیدا کرنے کا حکم:

یہ آیت ﴿ لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥] ''تجھ سے پہلے بھی جو رسول ہم نے بھیجا اس کی طرف یہی وحی نازل فرمائی کہ میرے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، پس تم سب میری ہی عبادت کرو۔'' لہٰذا لفظ ﴿ حُنَفَآءَ ﴾ فرمایا یعنی شرک سے توحید کی طرف یکسو ہو کر آنے والے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦] ''ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچو۔'' پھر اقامتِ نماز کا ذکر فرمایا۔ یہ بدن کی عبادات میں سے اشرف ہے اور زکات فقراء کے ساتھ احسان کرنا ہے۔ یہ ملت نہایت سیدھی اور صاف باانصاف ہے اور حالتِ اعتدال پر ہے۔ بہت سے ائمہ نے اس آیتِ کریمہ سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں، جیسے: امام زہری اور شافعی رحمہما اللہ۔ اسی لیے اخلاصِ عمل کو دینِ قیمہ فرمایا ہے۔[4]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں فرمایا ہے کہ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ ہیں اور مشرکینِ عرب کے بت پرست ہیں۔ اس جگہ اہلِ کتاب کو کفار کہا، حالاں کہ وہ اپنی دینی کتب پر ایمان لائے ہیں، یہ اس لیے کہ وہ توحید کی سیدھی راہ سے پھر گئے۔ یہود مجسمہ ہیں اور نصاریٰ تثلیث (تین خداؤں) کے قائل ہیں، اس کا تقاضا ہے کہ تمام اہلِ کتاب کو کفر پر خیال کیا جائے

---

[1] تفسير الطبري (٥٤٠/٢٤)
[2] تفسير الطبري (٥٤١/٢٤)
[3] سنن الترمذي (٢٦٤١) صحيح الجامع (٥٣٤٣)
[4] تفسير ابن كثير (٦٩٦،٦٩٥/٤)

جو نبی اکرم ﷺ سے پہلے تھے، ظاہر پر اس کے خلاف ہے، لہٰذا ماتریدی نے کہا ہے کہ اس جگہ ﴿ مِنْ ﴾ کے حروف تبعیض کے لیے ہیں، یعنی ان میں سے بعض مومن بھی ہیں۔ انفکاک کے معنی انفصال ہیں، یعنی وہ اپنے کفر سے جدا ہونے والے اور اپنے عمل سے باز آنے والے نہیں، یہاں تک کہ بیّنہ یعنی حجت واضح آئے۔

امام ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی وہ صفتیں محمد ﷺ سے منفک نہ ہوں گی، جب تک کہ آپ مبعوث نہ ہوں۔ جب آپ ﷺ مبعوث ہوئے تو حسد اور انکار کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [1] [البقرۃ: ۸۹] جب تک آپ مبعوث نہ ہوئے تھے تب تک سب مشرکینِ مکہ آپ کو امین کہتے تھے، جب مبعوث ہوئے تو برا کہنے لگے۔ نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو اور یہود نے عزیز علیہ السلام کو ابن اللہ کہا، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں یعنی کفار اپنے شرک اور کفر سے باز نہ آئیں گے، یہاں تک کہ محمد ﷺ قرآن لائیں اور ان کی گمراہی اور جہالت بیان کر دیں اور ان کو ایمان کی طرف بلائیں۔ [2] اس میں نعمت کا بیان ہے اور جہالت اور گمراہی سے چھڑانے کا بیان ہے۔

یہ آیت مومنین فریقین کے حق میں ہے، اس آیت کو قرآن کی مشکل ترین آیت کہا ہے۔ بڑے بڑے علماء نظماً وتفسیراً اس میں سرگرداں ہو گئے اور ایسی راہ چلے جس سے صواب کو نہ پہنچے۔ اس بات کی کہ "بيّنة" سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ﴿ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ فرمایا ہے۔ صحف سے مراد قرآن ہے۔ نبی اکرم ﷺ ظہرِ قلب (زبانی) پڑھتے تھے نہ کسی مکتوب کو دیکھ کر۔ جمہور اسی کے قائل ہیں کہ "بيّنة" سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں، اس لیے کہ وہ بذاتِ خود ایک حجت ہیں، لہٰذا اللہ نے ان کا نام سراجِ منیر رکھا ہے۔ امام قتادہ اور ابن زید رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ "بيّنة" قرآن ہے، [3] جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴾ [طٰہٰ: ۱۳۳] "کیا ان کے پاس اگلی کتابوں کی واضح دلیل نہیں پہنچی؟" ابو مسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صرف رسل مراد ہیں، یعنی ملائکہ [4] لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

صحف صحیفہ کی جمع ہے۔ صحیفہ ظرف مکتوب کو کہتے ہیں۔ ﴿ مُّطَهَّرَةً ﴾ سے مراد یہ ہے کہ جھوٹ اور گمراہی سے پاک ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ باطل سے پاک ہے۔ [5] بعض نے کہا ہے کہ کفر وشبہات وجھوٹ سے پاک ہے یا یہ معنی معظمہ ہے کہ مطہرین کے سوا اس کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ یہ رسول کا وصف ہے کہ باوجود امّی ہونے کے وحی کو ازبر پڑھتے ہیں، ان صحف میں کتابیں ہیں یعنی آیات واحکام جو مدلول قرآن مکتوب لفظاً ونقشاً قیّمہ ہیں، یعنی مستوی ومحکم۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ صحیفے مراد ہیں جو آسمان پر ہیں، یعنی لوحِ محفوظ

---

[1] تفسير القرطبي (٢٠/١٤١) [2] فتح القدير (٥/٦٣٧) [3] تفسير الطبري (٢٤/٥٣٩)
[4] فتح القدير (٥/٦٣٧) [5] فتح القدير (٥/٦٣٨)

میں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴾ [البروج: ۲۱- ۲۲]
''بلکہ یہ قرآن بڑی شان والا لوحِ محفوظ میں (لکھا ہوا)۔''

پھر اہلِ کتاب کو ملامت اور سرزنش فرمائی اور ارشاد کیا کہ ان کا یہ عدمِ انفکاک (باز نہ آنا) کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ انھیں دین میں کچھ شبہہ ہے، بلکہ حق اور درست طریقہ واضح اور ظاہر ہو جانے کے بعد ہے۔ پھر جب کہ وہ اہلِ کتاب ہو کر متفرق ہو گئے تو مشرکین تو بدرجہ اولیٰ ایسے ہوں گے، لہٰذا اس جگہ مشرکین کا ذکر نہ کیا۔ شناعت (برائی، طعنے) کے لیے انھیں اہلِ کتاب کا ذکر کرنے پر اکتفا کیا۔ مفسرین نے کہا ہے کہ اہلِ کتاب کا نبی اکرم ﷺ کے مبعوث ہونے پر اجماع تھا لیکن جب آپ مبعوث ہوئے تو وہ متفرق ہو گئے اور باہم اختلاف ہوا۔ بعض ایمان لائے اور زیادہ تر کافر رہے، حالاں کہ ان کو یہ حکم تھا کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں، دین میں مخلص ہوں اور یکسو رہیں۔

یہ آیت عبادات میں نیت کے وجوب پر دلیل ہے، اس لیے کہ عمل میں اخلاص قلب کا فعل ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو تیرے عمل کی خبر نہ ہو اور تو اس سے ثواب کا طالب نہ ہو۔ امام شہاب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اخلاص عدمِ شرک کا نام ہے۔[1] حنیف وہ ہے کہ سب دینوں سے منہ موڑ کر دینِ اسلام کی طرف جھکے یا مطلق حنیف وہ شخص ہے جو پانچوں ملتوں کے اصولوں سے بے زار ہو، یعنی یہود و نصاریٰ، صابئہ، مجوس اور مشرکین اور ان کے فروع (شاخوں) سے بے زار ہو اور اُن کے اعتقادات اور متبعین سے باز آ کر عملِ صالح اختیار کرے۔ ان کو یہ بھی حکم تھا کہ نماز پڑھو اور زکات دو، اس لیے کہ یہ دین کے ارکان میں سب سے بڑے رکن ہیں، کیوں کہ دینِ قیم بھی اخلاص اور درست عمل ہے اور بس۔[2]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اُولٰٓىِٕكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝۶ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓىِٕكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝۷ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝۸

بے شک اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کیا اور مشرکین آتشِ جہنم میں جلیں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، وہی لوگ مخلوق میں بدترین ہیں ⑥ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، وہی لوگ مخلوق میں بہترین ہیں ⑦ ان کی جزا ان کے رب کے ہاں

① حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (۳۸۵/۸) ② فتح البيان (۳۲۹/۱۵_۳۳۵)

ہمیشہ رہنے والے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے ابد تک، اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی، یہ (مقام) اس کو ملتا ہے، جو اپنے رب سے ڈر گیا ⑧

بدترین اور بہترین مخلوق کا بدلہ:

اللہ پاک نے فجار اور اہلِ کتاب کے کفار اور مشرکین کے انجام کا بیان کیا کہ یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں اور نبیوں اور رسولوں کے مخالف ہیں، یہ قیامت کے دن جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہوں گے، اس سے دور ہو سکنے کا تو ذکر ہی کیا۔ یہ تو اللہ کی خلقت میں سے بدترین مخلوق ہیں۔ پھر نیک لوگوں کے احوال کی خبر دی کہ جو اپنے دلوں سے ایمان لائے ہیں اور اپنے بدنوں سے انھوں نے اعمالِ صالح کیے ہیں، وہ ساری مخلوق سے بہتر ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور علماء کے ایک گروہ نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مومنین ملائکہ سے افضل ہیں، ان کی دلیل ﴿ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ﴾ ہے۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ قیامت میں ہمارے پاس ان مومنین کے لیے چمنستان ہیں جن میں پانی کے ایسے چشمے جاری ہیں جو نہ کبھی جدا ہوں، نہ وہ گزر جائیں اور نہ خشک ہوں بلکہ وہ جاری و ساری ہیں۔ اللہ ان سے راضی ہے، اللہ کی رضا مندی ساری نعمتوں سے اعلیٰ نعمت ہے اور وہ اللہ کے فضلِ عمیم (گہرے فضل) اور بہت بڑے کرم اور قائم رہنے والی نعمتوں سے خوش ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ جزا اس شخص کی ہے جو اللہ سے کما حقہ ڈرتا ہے، گویا کہ اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر نہیں دیکھتا تو یہ جانتا ہے کہ اللہ تو ضرور ہی اس کو دیکھ رہا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم کو ﴿ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ﴾ کی خبر نہ دوں؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: وہ شخص ہے جس نے اللہ کی راہ میں اپنے گھوڑے کی باگ پکڑی جس وقت کوئی کھٹکا سنا، اس پر سوار ہو بیٹھا۔ پھر فرمایا: کیا خبر نہ دوں میں تم کو خیرِ بریّہ کی؟ کہا: ہاں! فرمایا: وہ شخص جو بکریوں کے ایک گلے میں ہے، نماز پڑھتا ہے اور زکات دیتا ہے۔[2] پھر کہا: کیا میں تم کو شرِ بریّہ نہ بتاؤں؟ کہا: ہاں! فرمایا: وہ شخص جو سوال کرتا ہے اللہ کے نام سے اور دیا نہیں جاتا۔ (رواہ أحمد)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ قیامت کے دن اہلِ کتاب کے کفار اور مشرکین آگ میں جائیں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ تمام مخلوق میں سے بدترین لوگ تھے، اس لیے کہ انھوں نے جان بوجھ کر انکار کیا۔ اس میں دنیا دار علماء کے لیے تنبیہ ہے۔ پھر اہلِ ایمان اور اعمالِ صالحہ کرنے والوں کو بہترین مخلوق فرمایا۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (۳٤٥٤/۱۰)

② مسند أحمد (۳۹٦/۲) اس کی سند میں ''ابو وھب مولیٰ ابی ہریرہ'' مجہول اور ''ابو معشر نجیح'' ضعیف راوی ہے۔

ہیں کہ ہم نبی اکرم کے پاس تھے کہ اتنے میں سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ آئے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم ہے اس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، یہ اور اس کا گروہ قیامت کے دن فائزین (کامیاب ہونے والوں) میں ہوگا۔ پھر آیتِ باب اتری۔ اس وقت سے جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم علی رضی اللہ عنہ کو آتے ہوئے دیکھتے تو یوں کہتے: "قَدْ جَاءَ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ" [1] (أخرجه ابن عساكر) "خیر البریہ آ گئے ہیں۔"

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یہ تو اور تیرا گروہ ہے قیامت کے دن "راضيين مرضيين" (أخرجه ابن مردويه) ضیاء نے اس کو خود سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی رفعاً روایت کیا ہے۔ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: علی خیر البریہ ہیں۔ [2] (رواه ابن عدي وابن عساكر)۔

پھر اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ان لوگوں کی جزا ان کے رب کے نزدیک جنات ہیں، خواہ ہر ایک کو ایک جنت ملے یا بہت سی جنتیں۔ جیسا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے یہ فرمان دلالت کرتے ہیں: ﴿ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴾ [الرحمن: ٤٦] "اور اس شخص کے لیے جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا دو جنتیں ہیں۔" نیز فرمایا: ﴿ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴾ [الرحمن: ٦٢] "اور ان کے سوا دو جنتیں اور ہیں۔"

اس حساب سے ایک کو چار جنتیں ملیں گی: پہلی جنت دنیا اور مافیہا سے دس گناہ ہوگی، اس سے مراد جنتِ عدن ہے یہ تمام جنتوں کے وسط میں ہیں۔ ہر جنت کے نیچے چار نہریں جاری ہوں گی: پانی کی، شراب کی، شہد کی اور دودھ کی۔ پھر یہ لوگ ان باغوں میں سدا رہیں گے۔ یہ نہ ہوگا کہ کبھی ان سے خارج ہوں بلکہ یہ نعمتیں اور لذتیں ان کے لیے دائمی اور ہمیشہ رہنے والی ہوں گی۔ پھر اس بہترین جزا اور بڑے اجر پر ایک حاشیہ چڑھے گا یعنی اور نعمت عطا ہوگی جو متنِ متین سے بھی افضل ہے کہ اللہ ان کے اطاعتِ امر اور شرعی احکامات کو مان لینے کی وجہ سے ان سے راضی ہوگا اور اپنے مطالب اور خواہشات کے پورا ہو جانے کے سبب سے وہ اللہ سے راضی ہوں گے۔ ان کو ایسے ایسے انعامات حاصل ہوں گے جن کو نہ کسی آنکھ نے اس سے پہلے دیکھا تھا نہ کسی کان نے سنا تھا اور نہ ہی کسی دل میں ان کا خیال تک گزرا تھا۔

پھر فرمایا کہ یہ جزا اور رضا ان کے لیے ہے جو دنیا میں اللہ سے ڈرتے تھے اور اس کے خوف سے گناہوں سے بچتے تھے نہ کہ ایسا ڈرنا جو گناہوں میں منہمک رہنے کے ساتھ ہو کہ یہ درحقیقت خشیت نہیں ہے بلکہ جرأت ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾ [فاطر: ٢٨] "اللہ سے ان کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔" یعنی بندوں میں سے اللہ سے ڈرنے والے یہی علماء ہوتے ہیں۔ اور اس جنت کے بارے میں یہ کہا ہے کہ ﴿ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ﴾ اس سے معلوم ہوا کہ جنت اہلِ علم کا حصہ ہے۔ [3] میں

---

[1] تاریخ دمشق (٤٢/٣٧١) اس کی سند میں ایک سے زیادہ وجہ ضعف ہیں۔ مزید دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٩٢٥)

[2] فتح القدير (٥/٦٤٠، ٦٤١) [3] فتح البيان (١٥/٣٣٦۔٣٣٨)

کہتا ہوں: علماء سے مراد جو آیاتِ کتاب ونصوصِ سنت (قرآن وسنت) کا علم رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو علم پر عمل کرنے والے ہیں اور علمِ نافع رکھتے ہیں نہ کہ علمِ غیر نافع۔ ورنہ صرف علم میں ابلیس سب سے زیادہ ہے۔ اور عالمِ غیر عامل کا حال قرآن میں آ چکا ہے، یعنی قصۂ بلعم باعور اس کے برے انجام کا شاہد ہے۔ نیز فرمایا: ﴿ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ﴾ [الجمعة: ٥] ''اس گدھے کی طرح ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہو۔'' اب ہر عالم جس کو جنتوں کا طمع ہو وہ اپنے نفس کو ان آیات پر پیش کر کے دیکھے کہ وہ اس جزا کا مصداق ہے یا نہیں: ﴿ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۞ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ﴾ [القيامة: ١٤- ١٥] ''بلکہ انسان خود اپنے اوپر آپ حجت ہے اگرچہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔'' اس امر کی کچھ حاجت نہیں کہ کوئی دوسرا اس کو اس کے حال اور انجام سے آگاہ کرے۔

خواہی کہ عیبہائے تو بر تو شود عیاں   یکدم منافقانہ نشین در کمین خویش

''اگر تو چاہتا ہے کہ تیری برائیں تجھ پر ظاہر ہو جائیں تو تو اپنی گھات میں تھوڑی دیر کے لیے دو دلی اور دورخی انداز میں بیٹھ جا۔''

اے اللہ! یہ تیرا گناہ گار بندہ سخت شرمندہ ہے کہ تو نے اس کو علم دیا، لکھنا سکھایا، کتاب پڑھنا بتایا، قرآن و حدیث کے مطالعے کی توفیق دی، تالیف کی ہمت بخشی، اس کے باوجود اپنے آپ کو عمل میں سخت قاصر (کمی کرنے والا) پاتا ہوں، میرے پاس کلمۂ شہادت کے علاوہ نجات کے لیے کوئی سرمایہ نہیں، فوز کا اس جگہ کیا ذکر ہے، میں تجھی سے یہ سوال کرتا ہوں کہ جس طرح تو نے علم دیا اسی طرح عملِ صالح کی بھی توفیق عطا کر، تا کہ میرا یہ علم نافع ہو جائے۔ اللھم ربنا آمین:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الزِّلْزَالِ

اس سورت میں آٹھ (۸) یا نو (۹) آیتیں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یہ مدنی ہے اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، جابر اور امام عطاء رحمہم اللہ کے قول کے مطابق مکی ہے۔[1]

سورۃ الزلزال کی فضیلت:

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک شخص نے آ کر کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے کچھ پڑھاؤ۔ فرمایا: تین سورتیں "ذوات الراء" پڑھ۔ اس نے کہا: میری عمر زیادہ ہے اور دل سخت ہوگیا ہے اور زبان موٹی پڑ گئی۔ فرمایا: تین سورتیں "ذوات حٰمٓ" پڑھ، اس نے پھر ویسی ہی بات کہی۔ فرمایا: تین مسبحات پڑھ لے، اس نے وہی پہلی سی بات کہی اور عرض کی: مجھے کوئی جامعہ سورت پڑھا دو، تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سورت ﴿ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ﴾ سکھائی، یہاں تک کہ فارغ ہوئے۔ اس شخص نے کہا کہ قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں اس پر کچھ زیادہ نہ کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أَفْلَحَ الرُّوَيْجِلُ أَفْلَحَ الرُّوَيْجِلُ »[2] (أخرجه أحمد وأبو داود والنسائي ومحمد بن نصر والحاكم وصححه والطبراني وابن مردويه والبيهقي) "یہ بندہ کامیاب ہوا، یہ بندہ کامیاب ہوا۔"

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا: جس نے یہ سورت پڑھی تو اس کے لیے نصف قرآن کے برابر ہوئی اور جس نے ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھی تو ایک ثلث قرآن کے برابر ہوئی اور جس نے ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴾ پڑھی تو ربع (چوتھائی) قرآن کے برابر ہوئی۔[3] (أخرجه الترمذي و ابن مردويه والبيهقي) یہی مضمون سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ترمذی، ابن الضریس، محمد بن نصر، حاکم اور بیہقی رحمہم اللہ کے نزدیک بھی رفعاً آیا ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے اور ترمذی رحمہ اللہ نے غریب ٹھہرایا ہے۔[4] الغرض کئی حدیثوں میں اس سورت کا ربع قرآن ہونا آیا ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (۲۰/۱٤٦)

[2] مسند أحمد (۲/۱٦۹) سنن أبي داود (۱۳۹۹) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/١٦) مستدرك الحاكم (۲/٥٨٠)

[3] سنن الترمذي (۲۸۹۳) اس کی سند میں "حسن بن سلم بن صباح" مجہول راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ۱۳٤۲)

[4] سنن الترمذي (۲۸۹٤) مستدرك الحاكم (۱/۷٥٤) شعب الإيمان (۲/٤۹٦) اس کی سند میں "یمان بن مغیرہ" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ۱۳٤۲)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝١ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝٢
وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝٣ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝٤ بِاَنَّ رَبَّكَ
اَوْحٰى لَهَا ۝٥ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝٦
فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝٧ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ
شَرًّا يَّرَهٗ ۝٨

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

جب زمین پورے زور سے ہلائی جائے گی ① اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال دے گی ② اور انسان کہے گا: اسے کیا ہوا؟ ③ اس دن وہ اپنے (خود پر گزرنے والے) حالات بیان کرے گی ④ کیونکہ آپ کا رب اسے (یہی) حکم دے گا ⑤ اس روز لوگ الگ الگ ہو کر لوٹیں گے، تاکہ انھیں ان کے اعمال دکھائے جائیں ⑥ لہٰذا جس نے ذرہ بھر بھلائی کی، وہ اسے دیکھ لے گا ⑦ اور جس نے ذرہ بھر برائی کی، وہ بھی اسے دیکھ لے گا ⑧

روزِ قیامت زمین اور لوگوں کے حالات:

قیامت سے پہلے زمین میں سے سارا بوجھ نکل پڑے گا جو مال، سونا، چاندی، روپیہ اس کے اندر دبا ہوا ہے وہ سب باہر نکل آئے گا اس کو لینے والے نہ رہیں گے۔ زمین بندوں کے گناہ بتا دے گی حساب کے وقت۔ انتہیٰ.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ زمین نیچے سے ہلے گی اور جو مردے اس کے اندر ہیں ان کو نکال کر باہر ڈال دے گی، [1] یہی قول بہت سے سلف کا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ﴾ [الحج: ١] ”لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو! بلاشبہ قیامت کا زلزلہ بہت ہی بڑی چیز ہے۔“ نیز اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہے: ﴿ وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ ﴾ [الانشقاق: ٣-٤] ”اور جب زمین (کھینچ کر) پھیلا دی جائے گی اور اس میں جو ہے اسے وہ اگل دے گی اور خالی ہو جائے گی۔“

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ زمین اپنے جگر کے ٹکڑے سونے چاندی کے ستون کی

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٥٥)

طرح باہر پھینک دے گی۔ قاتل آ کر کہے گا: میں نے اسی کے لیے قتل کیا۔ قطع تعلق کرنے والا آئے گا اور کہے گا: میں نے اسی لیے قطع رحم کیا، چور آئے گا اور کہے گا: میرا ہاتھ اسی کے پیچھے کاٹا گیا۔ پھر لوگ اس کو چھوڑ کر چلے جائیں گے، اس میں سے کچھ نہ لیں گے۔[1] بلکہ آدمی اس کے اس فعل کا انکار کرے گا کہ یہ کیا ہوا کہ پہلے تو یہ ساکن ثابت اپنی پشت پر مستقر تھے، اب یہ کس طرح متحرک اور مضطرب ہو گئے۔ یہ نہ جانا کہ اسے اللہ کا حکم ہوا ہے، اس لیے حکم کی بجا آوری کے لیے تیار ہو گئے۔ پھر سارے مردوں کو پہلوں کو اور بعد والوں کو اپنے شکم سے نکال کر ڈال دے گی۔ لوگ کہیں گے: اس کو کیا ہو گیا ہے، اس دن ساری زمین اور سارے آسمان بدل جائیں گے، واحد قہار ظاہر ہو گا۔ لوگوں نے روئے زمین پر جو کام کیے تھے، اُن سب کو بیان کر دے گی۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: تم جانتے ہو کہ زمین کا خبر دینا کیا ہے؟ کہا: اللہ اور اس کا رسول جانیں! فرمایا: یہ ہے کہ وہ ہر بندے اور عورت پر اس کے عمل کی گواہی دے گی جو اس کی پشت پر کیا تھا۔ کہے گی: فلاں فلاں کام فلاں فلاں روز کیا تھا، یہ اس کا خبر دینا ہے۔[2] (رواه أحمد و الترمذي وقال: حسن صحيح غريب)

ربیعہ جرشی رفعاً کہتے ہیں کہ زمین سے اپنا تحفظ کرو، یعنی بچاؤ کرو کہ وہ تمھاری ماں ہے، اس پر کوئی خیر یا شر کا عمل کرنے والا نہیں ہے مگر وہ اس کی مخبر ہو گی۔[3]

ذرہ بھر عمل کا بھی بدلہ دیا جائے گا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ زمین سے کہے گا کہ بول، وہ بولے گی۔[4] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حکم دے گا کہ پھٹ جا، وہ پھٹ جائے گی، لوگ حساب کے موقف سے طرح طرح پر پھریں گے، کوئی نیک بخت ہو گا کوئی بد بخت، کسی کو جنت کا حکم ہو گا کسی کو نار کا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ متفرق طور پر نکلیں گے۔ پھر آخر تک اکٹھے نہ ہوں گے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرقہ فرقہ ہو کر آئیں گے،[5] یہ اس لیے کہ اپنے اعمال دیکھیں خیر و شر کی جزا پائیں، ہر ذرہ کا حساب ہو گا۔ بخاری میں ایک طویل حدیث خیل (گھوڑے) کے بیان میں آئی ہے اس میں یہ ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے حمر (گدھوں) کے متعلق سوال کیا۔ فرمایا: اللہ نے اس بارے میں کچھ نازل نہیں کیا مگر یہ آیت: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ... الخ﴾۔ صعصعہ بن معاویہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے پاس

---

① صحيح مسلم (١٠١٣)

② مسند أحمد (٣٧٤/٢) سنن الترمذي (٢٤٢٩) اس کی سند میں "یحییٰ بن ابی سلیمان" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٨٣٤)

③ المعجم الكبير (٦٥/٥) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٢٤٠٧)

④ تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٥٥/١٠) ⑤ تفسير ابن كثير (٦٩٩/٤) ⑥ صحيح البخاري (٢٢٤٢) صحيح مسلم (٩٨٧)

آئے، آپ نے ان پر یہ آیت باب پڑھی، انھوں نے کہا: "حَسْبِيَ لَا أُبَالِي أَنْ لَا أَسْمَعَ غَيْرَهَا" [1] (رواه أحمد و النسائي) یعنی مجھ کو یہی ایک آیت کافی ہے کچھ پروا نہیں اگر میں اس کے سوا اور کچھ نہ سنوں۔

سیدنا عدی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ» [2] (رواه البخاري) یعنی بچو آگ سے، آدھی ہی کھجور دے کر۔ یہ بھی صحیح میں مروی ہے کہ تو کسی نیکی کو حقیر نہ جان گو تو اپنے ڈول میں سے کسی پیاسے کے برتن میں پانی ڈال۔ یا تو اپنے بھائی سے ملے تو خندہ پیشانی سے مل۔ [3] صحیح حدیث میں فرمایا ہے کہ کوئی ہمسائی اپنی ہمسائی عورت کو حقیر نہ کرے، اگرچہ بکری کا ایک کھر ہی کیوں نہ ہو۔ [4] دوسری حدیث میں فرمایا ہے کہ سائل کو لوٹاؤ، اگرچہ ایک جلا ہوا سم دے کر۔ [5] نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! آگ سے اوٹ میں ہو گو آدھا چھوہارا دے کہ وہ بھوکے کے پیٹ میں جائے۔ [6] (تفرد به أحمد)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ انگور کا ایک دانہ صدقہ میں دے کر کہا: "كَمْ فِيهَا مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ" [7] یعنی اس میں بہت سے ذرات ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: اپنے آپ کو محقراتِ ذنوب سے دور رکھ۔ یعنی چھوٹے چھوٹے حقیر سے گناہوں سے دور رہو، ان کے لیے اللہ کی طرف سے طالب ہے۔ [8] (رواه أحمد و النسائي وابن ماجه)۔ یہ حدیث ذرہ برابر شر کے بیان میں ہے جس طرح کہ پہلی حدیثیں ذرہ برابر خیر کے بیان میں تھیں۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ کھانا کھا رہے تھے کہ اتنے میں یہ آیت اتری، انھوں نے اپنا ہاتھ اٹھا لیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! ہم کو کیا ذرہ برابر شر کا بدلہ ملے گا؟ فرمایا: اے ابوبکر! تو جو دنیا میں ناپسندیدہ چیز دیکھتا ہے وہ ذرہ شر کے برابر ہیں اور اللہ نے تیرے لیے مثاقیل خیر کو ذخیرہ کر رکھا ہے، تاکہ قیامت کو تجھے عطا کرے۔ [9] (رواه ابن جرير و ابن أبي حاتم)

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب ﴿ إِذَا زُلْزِلَتِ ﴾ اتری تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیٹھ کر رونے لگے۔ نبی اکرم ﷺ نے کہا: کیوں روتے ہو؟ کہا: مجھ کو اس سورت نے رلا دیا۔ فرمایا: اگر تم خطا اور گناہ نہ کرو، پھر وہ تم کو

---

(1) مسند أحمد (٥٩/٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٥٢٠/٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه أحمد والطبراني مرسلا ومتصلا ورجال الجميع رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٢٩٧/٧)

(2) صحيح البخاري (١٣٥١) (3) صحيح مسلم (٢٦٢٦).

(4) صحيح البخاري (٢٤٢٧) صحيح مسلم (١٠٣٠) (5) مسند أحمد (٤٣٥/٦)

(6) مسند أحمد (٧٩/٥) اس کی سند میں انقطاع ہے، "مطلب بن عبد اللہ" کا سماع سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت نہیں ہے۔

(7) الموطأ (٩٩٧/٢)

(8) مسند أحمد (٧٠/٦) سنن ابن ماجه (٤٢٤٣) السلسلة الصحيحة (٢٧٣١)

(9) تفسير الطبري (٥٥١/٢٤) تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٥٦/١٠) اس کی سند میں "ہیثم بن ربیع" ضعیف راوی ہے۔

بخشا جائے تو اللہ ایک ایسی امت پیدا کرے جو خطا اور گناہ کرے، پھر ان کو بخش دے۔[1] (رواہ ابن جریر) سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ... الخ﴾ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا میں اپنے عمل کو دیکھوں گا؟ فرمایا: ہاں! میں نے کہا کہ بڑے بڑے گناہ؟ کہا: ہاں! میں نے کہا کہ چھوٹے چھوٹے گناہ؟ کہا: ہاں! میں نے کہا کہ افسوس ہو میری ماں کو! فرمایا: خوش خبری ہو تم کو اے ابو سعید! ایک نیکی دس گناہ ہوتی ہے اور سات سو گنا تک ہوتی ہے۔ پھر اللہ جس کے لیے چاہے اور کئی گنا کر دے اور گناہ ایک ہی ہوتا ہے یا اللہ بخش دیتا ہے۔ تم میں سے کسی کی نجات اس کے عمل کی وجہ سے نہیں ہوگی۔ میں نے کہا کہ کیا آپ کی بھی؟ فرمایا: «وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ مِنْهُ بِرَحْمَةٍ»[2] (رواہ ابن أبي حاتم) ''میری بھی نہیں، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت کی آغوش میں لے لے۔'' اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ بات کہی ہے کہ جب آیت کریمہ ﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا﴾ [الدھر: ٨] ''اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں کھانا کھلاتے ہیں مسکین، یتیم اور قیدیوں کو۔'' اتری تو مسلمانوں نے یہ خیال کیا کہ ہم کو قلیل شے پر کچھ اجر نہیں ملتا۔ لہٰذا جب کوئی مسکین ان کے دروازے پر آتا ہے تو ایک کھجور یا روٹی کا ایک ٹکڑا دینے کو کم سمجھتے اور اس کو واپس کر دیتے اور کہتے کہ یہ دینے کے کچھ لائق نہیں ہے۔ ہم کو اس صدقہ پر اجر ملتا ہے جس کو ہم دوست رکھتے ہوں اور دیں۔ اسی طرح لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ قلیل گناہ پر ملامت نہ ہوگی جیسے ایک دفعہ جھوٹ بولنا یا دیکھنا یا غیبت کرنا اور اس طرح کے اور گناہ۔ ان کا خیال تھا کہ اللہ نے نار کا وعدہ کبیرہ گناہوں پر کیا ہے۔ اس پر اللہ نے ان کو قلیلِ خیر میں رغبت دلائی کہ وہ کثیر ہو سکتی ہے اور شرِ یسیر یعنی چھوٹے گناہوں سے ڈرایا کہ وہ بھی کثیر ہو سکتا ہے اور یہ آیت بھیجی۔ ذرہ سے مراد چھوٹی چیونٹی کا وزن ہے، ہر نیک و بد کے لیے ہر برائی ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے اور ہر نیکی دس گناہ لکھی جاتی ہے، جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ مومنین کے حسنات کو پھر کئی گناہ کرے گا، ہر حسنہ دس گنا ہو جائے گا اور ہر حسنہ کے بدلے دس برائیاں مٹا دی جائیں گی، پھر جس کے حسنات سیئات سے بڑھ گئے ایک ذرہ کے برابر بھی تو وہ بہشت میں جائے گا۔[3] (رواہ ابن أبي حاتم)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ تم محقرات ذنوب (حقیر سمجھے جانے والے گناہ) سے بچو کہ وہ ایک شخص پر اکٹھے ہو کر اس کو ہلاک کر دیتے ہیں، پھر اس کی مثال بیان کی کہ جیسے ایک قوم ایک جنگل میں جا اترے اور کھانا پکانا چاہا، پس ایک شخص جا کر ایک لکڑی لایا، دوسرا ایک اور لکڑی لایا یہاں تک کہ لکڑیوں کا ایک گٹھا جمع کر لیا اور آگ جلائی اور جو کچھ اس آگ میں تھا اس کو پکایا۔[4] (رواہ أحمد) یعنی اس طرح چھوٹے گناہ جمع ہو کر بڑے گناہ کی طرح ہلاک کر دیتے ہیں۔

---

[1] تفسیر الطبري (٥٥٣/٢٤) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٤٥٦/١٠) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٣٤٥٦/١٠) تفسیر ابن کثیر (٧٠٠) [4] مسند أحمد (٤٠٢/١) صحیح الجامع (٢٦٨٧)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ زلزال حرکتِ شدید کو کہتے ہیں، مراد قیامت قائم ہونے کے وقت زمین کا حرکت کرنا ہے، کیوں کہ اس وقت وہ اسرافیل علیہ السلام کی آواز سے شدید مضطرب ہو کر جنبش میں آئے گی اور ہر وہ چیز جو اس کے اوپر ہے شکستہ ہو جائے گی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نفخۂ اولیٰ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ﴾[1] [النازعات: ٦-٧] ''جس دن کانپنے والی کانپے گی اس کے بعد ایک پیچھے آنے والی (پیچھے پیچھے) آئے گی۔'' خازن میں کہا ہے کہ اس زلزلے کے بارے میں دو قول ہیں: اکثر کا قول یہ ہے کہ یہ زلزلہ دنیا میں ہوگا اور یہ قیامت کی علامات میں سے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قیامت کے دن ہوگا۔[2] انتھی.

دوسرے قول کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: ﴿ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴾ کیوں کہ یہ زمین کا اپنے بوجھ خارج کرنا نفخۂ ثانیہ کے وقت ہوگا۔ اسی طرح زمین کی شہادت دوسرے نفخے کے بعد ہوگی، اسی طرح لوگوں کا موقف سے پھرنا نفخۂ ثانی کے بعد ہوگا، جو کچھ زمین کے پیٹ میں ہوگا مردے ہوں یا دفینے وہ سب اُگل دے گی۔ اثقال ثقل کی جمع ہے۔ امام ابو عبیدہ و اخفش رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مردہ جب تک زمین کے پیٹ میں ہے تو یہ ثقل ہے زمین کے لیے اور جب زمین کے اوپر آ جائے گا تو یہ زمین کے اوپر ثقل ہوگا۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اثقال سے مراد مردے ہیں[4] زمین ان کو نفخۂ ثانیہ کے وقت باہر نکال دے گی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا اثقالِ زمین سے مراد موتی اور خزانے ہیں۔[5] انسان یعنی ہر فردِ بشر اس وقت کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے جو یہ متحرک ہوئی!

انسان سے مراد کافر ہے۔ زمین پر جو خیر اور شر ہوا تھا اس کو زبانِ حال سے بیان کرے گی، یا زبانِ قال سے بیان کرے گی۔ یہی زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ اللہ اس کو بولنے کی طاقت دے گا۔ انسان اس کے بولنے سے یا اخراجِ اثقال (اپنے بوجھ نکال پھینکنے) پر تعجب کرے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ قیامت آ گئی اور دنیا تمام ہو چکی۔ یا خلق کے احوال کا اظہار کرے گی، یہی زیادہ بہتر ہے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ وغیرہ کی حدیث کے مطابق جو اس کے متعلق آئی ہے۔ اس کا یہ خبر دینا اللہ کی وحی کے سبب سے ہوگا۔ اس دن لوگ اپنی قبروں سے نکل کر متفرق ہو کر موقفِ حساب کی طرف آئیں گے۔

صدور واپس لوٹنا ہے، یا حساب سے فارغ ہو کر جنت یا نار کی طرف جائیں گے۔ یا ''أشتات'' سے مراد یہ ہے کہ کوئی امن والا ہوگا اور کوئی خوف والا۔ کوئی جنت والوں کے رنگ کی طرح سفید رو اور کوئی اہلِ نار کے رنگ کی طرح سیاہ رو اور کوئی دائیں سمت سے پھرے گا اور کوئی بائیں سمت سے، یہ اس لیے کہ دین میں الگ الگ اور اعمال

---

[1] تفسير القرطبي (١٤٧/٢٠) [2] تفسير الخازن (٢٨٠/٧) [3] تفسير القرطبي (١٤٧/٢٠)
[4] تفسير الطبري (٥٤٨/٢٤) [5] فتح القدير (٦٤٥/٥)

میں مختلف ہوں گے۔ ہر کوئی اپنے اعمال کا معائنہ کرے گا جس نے ذرہ بھر نیکی یا بدی کی ہو گی، وہ اس کو دیکھے گا جو اپنے نامۂ اعمال میں خیر کو دیکھے گا وہ خوش ہو گا اور جو شر کو دیکھے گا وہ ناخوش ہو گا۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔'' [النساء: ٤٠]

اہلِ لغت نے کہا ہے کہ آدمی زمین پر ہاتھ مارتا ہے اور جو خاک ہاتھ میں لگ جاتی ہے اس کو ذرہ کہتے ہیں۔ یا جو چیز سورج کی شعاع میں نظر آتی ہے وہ ذرہ ہے لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ کافر اگر ذرہ برابر خیر کرتا ہے تو اس کا ثواب دنیا میں اپنے مال اور اہل اور جان میں دیکھ لیتا ہے۔ پھر جب دنیا سے باہر جاتا ہے تو اللہ کے پاس اس کی کوئی خیر نہیں ہوتی۔ اور مومن سے دنیا میں اگر ذرہ برابر شر ہوتا ہے تو اس کی سزا اسی جگہ اپنے مال اور اہل اور اولاد اور جان میں دیکھ لیتا ہے جب دنیا سے نکل کر اللہ کے پاس جاتا ہے تو وہاں اس کے لیے کوئی شر نہیں ہوتا۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قرآن میں یہ سب سے زیادہ صادق اور محکم آیت ہے۔ علماء کا اس آیت کے عام ہونے پر اتفاق ہے۔ امام کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر دو آیتیں اتریں جنھوں نے تورات، انجیل، زبور اور صحف کے مضامین کو سمو لیا[1] یعنی آیتِ باب۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جو کوئی مومن یا کافر کوئی عملِ خیر وشر کرتا ہے، اللہ اس کو اس کا وہ عمل دکھا دے گا، مومن کے سیئات بخش کر حسنات پر ثواب دے گا اور کافر کے حسنات مردود ہو کر سیئات پر اس کو عذاب دے گا۔[2] یہ احتمال لفظاً و معناً ہو سکتا ہے۔[3]

---

(1) اللباب في علوم الكتاب (٢٠/٤٥٢، ٤٥٣) (2) تفسير الطبري (٢٤/٥٥٠) الدر المنثور (٨/٥٩٥)
(3) فتح البيان (١٥/٣٤١_٣٤٥)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَةُ الْعٰدِيٰتِ

اس سورت کی گیارہ (11) آیتیں ہیں اور یہ سیدنا عبداللہ بن مسعود، جابر رضی اللہ عنہما، امام حسن، عکرمہ اور عطاء رحمہم اللہ کے قول کے مطابق مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس، انس بن مالک رضی اللہ عنہم، امام قتادہ رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یہ سورت مدنی ہے۔[1] امام حسن رحمہ اللہ نے رفعاً کہا ہے کہ ﴿ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ﴾ نصف قرآن کے برابر ہے اور ﴿ اَلْعٰدِيٰتِ ﴾ نصف قرآن ہے۔[2] یہ روایت مرسل ہے۔ (أخرجه أبو عبيد)۔ اس کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی رفعاً روایت کیا ہے اور اتنا زیادہ کہا کہ ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ ثلث ہے اور ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴾ ربع قرآن شریف ہے۔[3] (أخرجه محمد بن نصر)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۝۱ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۝۲ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝۳
فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝۴ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝۵ اِنَّ الْاِنْسَانَ
لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۝۶ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۝۷ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ
لَشَدِيْدٌ ۝۸ اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ ۝۹ وَحُصِّلَ
مَا فِي الصُّدُوْرِ ۝۱۰ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّخَبِيْرٌ ۝۱۱

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

سرپٹ دوڑتے، ہانپتے گھوڑوں کی قسم! ① پھر سم مار کر چنگاریاں نکالنے والوں کی! ② پھر صبح کے وقت حملہ کرنے والوں کی! ③ پھر اس وقت وہ گرد وغبار اُڑاتے ہیں ④ پھر اس وقت وہ (دشمن کی) جماعت کے درمیان گھس جاتے ہیں ⑤ بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے ⑥ اور بے شک وہ اس بات پر (خود بھی) گواہ ہے ⑦ اور بے شک وہ مال کی محبت میں بری

① تفسير القرطبي (۲۰/۱۵۳) ② الدر المنثور (۸/۵۹۹) یہ روایت مرسل ہے۔ ③ الدر المنثور (۸/۵۹۹)

طرح گرفتار ہے ⑧ کیا پھر وہ نہیں جانتا، جب نکال باہر کیا جائے گا جو کچھ قبروں میں ہے ⑨ اور ظاہر کر دیا جائے گا جو کچھ سینوں میں ہے ⑩ بے شک ان کا رب اس دن ان (کے حال) سے خوب آگاہ ہو گا ⑪

جنگی گھوڑوں کی قسم کھا کر انسان کی ناشکری کا بیان:

یہ جہاد والے سواروں کی قسم ہے، اس سے بڑا کون سا عمل ہے کہ اللہ کے کام کے لیے اپنی جان دینے کو حاضر ہیں۔ انتھی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے گھوڑوں کی قسم کھائی، جبکہ وہ اللہ کی راہ میں دوڑیں اور ہانپیں اور ان کی نعلوں کے پتھر پر لگنے سے آگ جھڑے اور صبح کے وقت وہ ہلا کریں جس طرح کہ نبی اکرم ﷺ صبح کے وقت اغارہ (غارت) کرتے تھے اور اذان کی آواز پر کان دھرتے تھے۔ اگر اذان کی آواز سنتے تو باز رہتے ورنہ حملہ کرتے۔[1] سواروں کا جب حملہ ہوتا ہے تو خاک اڑتی ہے اور وہ فوج کے اندر جا گھستے ہیں۔ سیدنا عبداللہ اور علی رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ اَلْعٰدِيٰتِ ﴾ سے مراد اونٹ ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ گھوڑے ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہ بات سن کر کہا کہ بدر کے دن ہمارے پاس گھوڑے کہاں تھے، وہ تو ایک لشکرِ خرد میں تھے۔ بدر کے دن صرف دو گھوڑے تھے: ایک زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس، دوسرا مقداد رضی اللہ عنہ کے پاس۔ بلکہ عادیات سے مراد عرفہ سے مزدلفہ اور پھر منیٰ کی طرف رواروی ہے۔ تب سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے قول سے رجوع کیا۔[2]

امام ابراہیم اور عبید بن عمیر وغیرہ ایک جماعت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے قول کی قائل ہے اور ایک جماعت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کی قائل ہے کہ مراد گھوڑے ہیں نہ کہ اونٹ، جیسے: امام مجاہد، عکرمہ، عطاء، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور عطاء نے کہا ہے کہ چوپایوں میں سے کوئی نہیں ہانپتا مگر گھوڑا اور کتا۔ "ضبح" اح اح کرنے کو کہتے ہیں،[3] اکثر نے یہ کہا ہے کہ ٹاپ مار کر آگ جھاڑنے والے حوافر (سم) ہیں۔ یا جنگ کا ہنگامہ گرم کرنا۔ یہ امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگوں کا مکر ہے۔[4] بعض نے کہا ہے کہ میدانِ جنگ سے پھر کر شب کے وقت اپنے گھروں میں آگ جلانا ہے۔ یا مراد قبائل کی آگ ہے۔ اور جس نے ﴿ اَلْعٰدِيٰتِ ﴾ کی تفسیر اونٹ کے ساتھ کی ہے وہ کہتا ہے کہ مزدلفہ میں آگ کا سلگانا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح قول پہلا ہے، یعنی گھوڑوں کی نعل سے آگ کا جھڑنا۔[5]

---

① صحيح مسلم (٣٨٢) ② تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٥٧) ③ تفسير الطبري (٢٤/٥٥٧-٥٦٠)
④ تفسير الطبري (٢٤/٥٦٠، ٥٦١) ⑤ تفسير الطبري (٢٤/٥٦١)

اغارہ سے مراد اللہ کی راہ میں صبح کے وقت چھاپا مارنا ہے۔ اور جس نے کہا ہے کہ مراد اونٹ ہیں، اس نے کہا ہے کہ صبح کے وقت مزدلفہ سے منیٰ کی طرف چلنا ہے۔ گرد اُڑنے سے مراد وہ مکان ہے جس میں غبار اٹھے حج میں یا جنگ میں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام عطاء، عکرمہ، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ کے نزدیک جمع سے مراد دشمن کا لشکر ہے۔[1] یا یہ مراد ہے کہ سب کے سب اس مکان میں گھس پڑتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سواروں کا ایک رسالہ بھیجا۔ ایک مہینے تک ان کی کچھ خبر نہ آئی، اس پر یہ آیت اتری،[2] یعنی وہ اس کام میں مشغول ہیں۔ انسان کو ناشکرا ٹھہرایا، یہ قسم کا جواب ہے یعنی انسان اللہ کی نعمتوں کا جاحد (منکر) ہے۔ کنود بہ معنی کفور ہے، یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام مجاہد، ابراہیم نخعی، ابوالجوزا، ابوالعالیہ، ابوالضحیٰ، سعید بن جبیر، محمد بن قیس، ضحاک، حسن، قتادہ، ربیع بن انس اور ابن زید رحمہم اللہ کا ہے۔

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کنود وہ شخص ہے جو مصائب کو گنتا ہے اور اللہ کی نعمتوں کو فراموش کرتا ہے۔[3] ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: کنود وہ ہے جو تنہا کھاتا ہے اور اپنے غلام کو مار پیٹ کرتا ہے اور اپنے مہمان کو نہیں دیتا۔[4] (رواه ابن أبي حاتم) لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ (رواه ابن جرير موقوفاً)۔ اللہ اس کا شہید ہے۔ یہی قول ہے امام سفیان اور قتادہ رحمہ اللہ کا۔ یا ضمیر کا عود انسان کی طرف ہے۔[5] یہ قول امام محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ کا ہے، یعنی انسان اپنے ناشکرا اور کنود ہونے پر زبانِ حال سے شاہد ہے۔[6] یہ احوال اس کے افعال اور اقوال سے ظاہر ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ﴾ [التوبة: ١٧] ''لائق نہیں کہ مشرک اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو آباد کریں درآں حالیکہ وہ خود اپنے کفر کے آپ ہی گواہ ہیں۔''

پھر اس کو محبتِ مال فرمایا، اس کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ مال کے ساتھ شدید محبت رکھتا ہے، دوسرے یہ کہ حریص اور بخیل ہے۔ یہ دونوں معنی صحیح ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں زہد دلایا اور آخرت میں رغبت دلائی اور انجام کار پر تنبیہ فرمائی اور جو احوال آئندہ ہونے والے ہیں ان پر آگاہ کیا اور کہا: کیا وہ نہیں جانتا کہ جب مردے قبروں سے نکالے جائیں گے اور دل کی باتیں کھل پڑیں گی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یعنی دل کے راز ظاہر ہو جائیں گے،[7] اس وقت اس کا رب ابن آدم کے تمام اعمال اور کارستانیوں کو جاننے والا ہو گا اور ان کو ان کے کرتوتوں کا بھرپور بدلہ دے گا اور کسی پر ذرا بھر ظلم نہ رکھے گا۔[8]

---

[1] تفسير الطبري (٥٦٤/٢٤، ٥٦٥)

[2] كشف الأستار (٨٢/٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فيه حفص بن جميع وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد: ٢٩٧/٧)

[3] تفسير الطبري (٥٦٥/٢٤، ٥٦٦) [4] تفسير الطبري (٥٦٦/٢٤) اس کی سند میں ''جعفر بن زبیر'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[5] تفسير الطبري (٥٦٧/٢٤) [6] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٥٨/١٠)

[7] تفسير الطبري (٥٦٩/٢٤) [8] تفسير ابن كثير (٧٠١/٤_٧٠٣)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ عادیات عادیہ کی جمع ہے۔ عادیہ وہ ہے جو تیز دوڑے اور خوب جلد جلد چلے، اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو جنگ میں دشمن کی طرف دوڑتے ہیں۔ ''ضبح'' شدت سے دوڑنے کو کہتے ہیں، یہ چلنے کی ایک قسم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ گھوڑوں کے دوڑتے وقت ان کی ٹاپوں کی آواز کو ''ضبح'' کہتے ہیں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہانپنے کی آواز کو کہتے ہیں جو دوڑنے کے وقت نکلتی ہے۔ یا سینے کی آواز کو، یہ ہنہنانا نہیں ہے۔ جمہور نے کہا ہے کہ عادیات سے مراد گھوڑے ہیں۔ عبید بن عمیر، محمد بن کعب اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اونٹ ہیں۔ اہل لغت نے کہا ہے کہ ''ضبح'' کی اصل ثعلب (لومڑی) میں ہے۔ گھوڑے کے لیے اس کا استعارہ کیا ہے۔[1] سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ضبحِ خیل ہنہنانا ہے اور ضبحِ شتر بلبلانا ہے۔[2]

راجح یہی ہے کہ اس جگہ مراد گھوڑے ہیں اور یہ سارے اوصاف اونٹ کی نسبت گھوڑے میں زیادہ ظاہر ہیں۔ جمہور کا مذہب بھی یہی ہے کہ مراد گھوڑے ہیں۔ اللہ کا لڑنے والے گھوڑوں کی قسم کھانا گھوڑوں کی اور اللہ کے راستے میں ان کو باندھنے اور پالنے کی فضیلت ہے، کیوں کہ گھوڑوں میں دینی اور دنیوی فوائد ہیں اور اجر اور غنیمت ہے۔ ''نقع'' غبار کو کہتے ہیں، اس جگہ یہی معنی مناسب ہیں نہ کہ آواز کے معنی۔ بعض نے کہا ہے کہ ''نقع'' بہ معنی گریبان چاک کے ہے۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مزدلفہ و منیٰ کے درمیان ہوتا ہے۔[3] یا بہ معنی وادی کا راستہ ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ ''نقع'' سے مراد گرد اور خاک ہے جو گھوڑوں کے دوڑانے سے اڑتی ہے۔ یہ گھوڑے دشمنوں کے بیچ میں گھس پڑتے ہیں۔ انسان سے مراد بعض افراد ہیں، یعنی کافر۔ کنود نعمت کی ناشکری کرنے والے کو کہتے ہیں۔ اس جگہ یہی معنی زیادہ مناسب ہیں۔

جمہور نے کہا ہے کہ ﴿ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ ﴾ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے اور امام حسن رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ انسان کی طرف راجع ہے۔[4] جمہور کے قول کے مطابق یہی راجح ہے۔ پھر فرمایا کہ مال کے طلب کرنے اور اسے حاصل کرنے میں انسان بہت قوی اور شدید محبت کرنے والا ہے۔ مال کے پیچھے اس کا دم نکلا جاتا ہے۔ اس جگہ خیر سے مراد مال ہے اور اسی کی طرح کا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ﴾ [البقرة: ١٨٠] ''اگر مال چھوڑ جائے۔'' یا اس سے مراد بخل ہے لیکن پہلی بات زیادہ مناسب ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے مال کا نام خیر رکھا ہے اور وہ شر ہے۔ یہ اس لیے کہ لوگ اس کو بہتر سمجھتے ہیں۔[5] کیا انسان کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ جب

---

[1] فتح القدير (٥/٦٤٧) [2] تفسير الطبري (٢٤/٥٦٠) [3] تفسير القرطبي (٢٠/١٥٩)
[4] تفسير القرطبي (٢٠/١٦٢) [5] تفسير القرطبي (٢٠/١٦٢)

قبروں کی ادھیڑ بن ہو گی اور سینوں کے اندر جو خیر اور شر ہے وہ حاصل ہو گا اور ظاہر ہو گا تو اس دن اس کے رب کو سب باتوں کی خبر ہو گی۔ کوئی راز مخفی نہ رہے گا لیکن اللہ پاک اس کی جزا دے گا اور اسی جیسا اس کا یہ فرمان ہے: ﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ﴾ [النساء: ٦٣] ''یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے دلوں کا بھید اللہ تعالیٰ پر بخوبی روشن ہے۔''

امام نے کہا ہے کہ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ جزئیاتِ زمانیات وغیرہا کا عالم ہے۔ اس لیے کہ اس نے اس دن کیفیاتِ احوال کے متعلق اپنے علم کے بارے میں واضح نص فرمائی ہے تو اب اس علمِ جزئی کا منکر کافر ہی ٹھہرے گا۔ (ذكره الكرخي)۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ کا جزئیات کا عالم ہونا سیکڑوں آیاتِ قرآنی سے ثابت ہے اور سارے سلف و خلف کا یہی عقیدہ ہے جو کوئی اس بات کا انکار کرے اور کہے کہ اللہ کو کلیات کا علم ہے نہ جزئیات کا وہ کافر ہے اس کا خون اور مال حلال ہے۔[1]

---

[1] فتح البیان (١٥/٣٤٩_٣٥٥)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

سُوْرَةُ الْقَارِعَةِ

اس سورت کی آٹھ (۸) یا دس (۱۰) یا گیارہ (۱۱) آیتیں ہیں۔ یہ بلا اختلاف مکہ میں اتری ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔[1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اَلْقَارِعَةُ ۝۱ مَا الْقَارِعَةُ ۝۲ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝۳ يَوْمَ
يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ۝۴ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ
كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ۝۵ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِيْ
عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹ وَمَآ
اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ۝۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

کھڑ کھڑا دینے والی ① کیا ہے وہ کھڑ کھڑا دینے والی! ② اور آپ کو کیا معلوم کہ وہ کھڑ کھڑا دینے والی کیا ہے؟ ③ جس دن لوگ (ایسے) ہو جائیں گے، جیسے بکھرے ہوئے پروانے ④ اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اُون جیسے ہو جائیں گے ⑤ پھر جس شخص کے پلڑے بھاری ہو گئے ⑥ تو وہ اپنی پسند کی زندگی میں ہوگا ⑦ اور جس شخص کے پلڑے ہلکے ہو گئے ⑧ تو اس کا ٹھکانا ہاویہ (گڑھا) ہوگا ⑨ اور آپ کو کیا معلوم کہ ''ہاویہ'' کیا ہے ⑩ وہ سخت دہکتی ہوئی آگ ہے ⑪

روزِ قیامت لوگ پتنگوں کی طرح بکھرے ہوئے ہوں گے:

''قارعة'' قیامت کا ایک نام ہے، جیسے: حاقة، طامة، صاخة، غاشية وغير ذلك۔ اللہ نے قیامت کے معاملے کو معظم اور اس کی شان کو ہولناک ٹھہرایا اور کہا: تو کیا جانے کہ ''قارعة'' کیا چیز ہے۔ پھر خود ہی اس کی

[1] الدر المنثور (۸/۶۰۵)

تفسیر فرمائی کہ اس دن لوگ انتشار اور تفرق اور آمد و رفت اور ہولناکیوں پر حیرانگی کی وجہ سے ایسے ہوں گے جیسے پتنگے اڑتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنتَشِرٌ ﴾ [القمر: ۷] ''گویا وہ پھیلا ہوا ٹڈی دل ہے'' اور پہاڑ ایسے ہوں گے جیسے دھنی ہوئی اون یعنی پارہ پارہ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن، قتادہ، عطاء خراسانی، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ ''عھن'' بہ معنی صوف ہے[1] یعنی اون۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انجام کار کی خبر دی، خواہ کرامت (عزت والا) ہو، خواہ اہانت (توہین والا) اور فرمایا: جس کے حسنات اس کے سیئات سے بڑھ جائیں گے وہ جنت میں جائے گا اور جس کے سیئات اس کے حسنات سے بھاری نکلیں گے، وہ دوزخ میں پڑے گا۔ ''أم'' سے مراد دماغ ہے یعنی سر کے بل نار میں گرے گا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، ابی صالح اور قتادہ رحمہم اللہ نے اسی طرح کہا ہے، یعنی ''يَهْوِيْ فِي النَّارِ عَلٰى رَأْسِهِ''[2] ''سر کے بل جہنم میں گرے گا۔'' یا مراد یہ ہے کہ اس کی ماں جس کے پاس وہ پھر کر آئے گا مغاکِ آتش ہے، گویا اس کا مرجع اور ماویٰ یہی جہنم ٹھہرا۔ ایک قراءت یہ ہے: ''وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ'' امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ''ھاویہ'' نار ہے، یہی ان کا ٹھکانا ہے۔ لہٰذا اللہ نے فرمایا کہ ہاویہ دہکتی آگ ہے۔ امام اشعث بن عبداللہ کہتے ہیں کہ مومن جب مر جاتا ہے تو اس کی روح کو مومنین کی روحوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: ذرا اپنے بھائی کو آرام دو، وہ دنیا میں تکلیف اور غم میں تھا۔ اس سے دریافت کرتے ہیں کہ فلاں کا کیا حال ہے؟ وہ کہتا ہے کہ مر گیا، کیا وہ تمھارے پاس نہیں آیا؟ وہ کہتے ہیں: اس کو اس کی ماں ہاویہ کے پاس لے گئے۔[3] (رواہ ابن جریر) امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے اس کو انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے رفعاً بھی روایت کیا ہے مگر تفصیل کے ساتھ۔[4] ہم نے اس حدیث کا ذکر کتاب ''صفۃ النار'' میں لکھا ہے: ''أَجَارَنَا اللّٰهُ مِنْهَا بِمَنِّهِ وَكَرَمِهِ''

نارِ جہنم کی شدت و ہولناکی:

حامیہ سے مراد سخت گرم، قوی اللہب کثیر السعیر دوزخ ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ بنی آدم کی آگ جس کو وہ سلگاتے ہیں جہنم کی آگ کے ستر اجزاء میں سے ایک جز ہے۔ کہا: اے اللہ کے رسول! اتنی ہی آگ کافی تھی۔ فرمایا: وہ آگ اس آگ سے ۶۹ اجزاء بڑھ کر ہے۔ (رواہ الشیخان)۔ بعض روایات میں یوں ہے کہ ۶۹ اجزاء زیادہ ہے، وہ سب اجزاء اس آگ کی طرح گرم ہیں۔[5] اس کو احمد رحمہ اللہ نے بھی رفعاً روایت کیا ہے اور یہ مسلم کی شرط پر ہے۔ یحییٰ بن جعدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمھاری یہ آگ جہنم کی آگ کے ستر اجزاء

---

[1] تفسير الطبري (٥٧٤/٢٤) تفسير ابن كثير (٧٠٣/٤) [2] تفسير الطبري (٥٧٥/٢٤_٥٧٦) [3] تفسير الطبري (٥٧٥/٢٤)
[4] الدر المنثور (٦٠٦/٨) [5] صحيح البخاري (٣٠٩٢) صحيح مسلم (٢٨٤٣) مسند أحمد (٤٧٨/٢)

میں سے ایک ٹکڑا ہے اور دو دفعہ سمندر میں ڈبوئی گئی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو اس میں کسی کو کچھ فائدہ نہ ہوتا۔[1] (رواه أحمد و هذا على شرط الصحيحين ولم يخرجاه)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ رفعاً یہ ہیں کہ یہ آگ نارِ جہنم کے سو جز میں سے ایک جز ہے۔[2] (تفرد به أحمد وهو على شرط مسلم)۔ان کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ تم جانتے ہو کہ تمھاری اس آگ کی مثال جہنم کی آگ کے مقابلے میں کیا ہے؟ وہ نار تمھاری اس دخانِ نار (آگ کے دھوئیں) سے کہیں زیادہ سیاہ ہے، یعنی ستر گنا۔[3] (رواه الطبراني)۔ تیسری روایت کے الفاظ رفعاً یہ ہیں کہ ہزار برس تک آگ کو سلگایا، تب وہ لال ہوئی، پھر ہزار برس سلگایا گیا تب وہ سفید ہوئی، پھر ہزار برس سلگایا تو سیاہ ہوئی اب یہ کالی اور بہری ہے۔[4] (رواه الترمذي وابن ماجه)

یہی مضمون سیدنا انس اور عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں بھی آیا ہے۔ ان کی چوتھی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اہلِ نار میں سے سب سے کم درجے کے عذاب میں وہ شخص ہوگا جس کے لیے وہ دو نعل ہوں گے جس سے اس کا دماغ ابلے گا۔[5] (رواه أحمد)۔ صحیحین میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آگ نے اپنے رب سے شکوہ کیا کہ اے رب! میرے بعض نے میرے بعض کو کھا لیا۔ اللہ نے اس کو دو سانس لینے کی اجازت دی ایک موسمِ سرما میں اور ایک موسمِ گرما میں۔ سو جو سخت سردی تم جاڑے میں پاتے ہو اور جو سخت گرمی جو تم موسمِ گرما میں پاتے ہو یہ اسی کا اثر ہے۔[6] بخاری اور مسلم میں یہ بھی مروی ہے کہ جب سخت گرمی ہو تو تم نماز سے ابراد کرو (نمازِ ظہر کو کچھ دیر کر کے پڑھو، تا کہ گرمی کی شدت کچھ کم ہو جائے)، کیوں کہ گرمی کی یہ سختی جہنم کی بھاپ ہے۔[7]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ "قارعة" قیامت کا نام ہے، اس لیے کہ وہ دلوں کو گھبراہٹ سے کھڑکھڑاتی ہے اور اللہ کے دشمنوں کو عذاب کا ڈر دلاتی ہے۔ فراش وہ کیڑا ہے جو چراغ پر گر کر جان دیتا ہے۔ یہی قول امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فراش اڑنے والے مچھر وغیرہ کو کہتے ہیں۔ جیسے: ٹڈی۔[8] "مبثوث" سے مراد منتشر و متفرق ہے۔ انسان کو فراش کے ساتھ تشبیہ دی ہے، اس میں کئی طرح کے مبالغے ہیں۔ ایک طیش ہے دوسرے انتشار، تیسرے بعض کا بعض پر رکوب، چوتھے کثرت، پانچویں ضعف و تذلل، چھٹے ہر طرف سے پکارنے

---

(1) مسند أحمد (٢/٢٤٤) (2) مسند أحمد (٢/٣٧٩) (3) المعجم الأوسط (١/١٥٥)

(4) سنن الترمذي (٢٥٩١) سنن ابن ماجه (٤٣٢٠) اس کی سند میں "شریک بن عبداللہ" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٣٠٥)

(5) مسند أحمد (٢/٤٣٢) مستدرك الحاكم (٤/٦٢٤) صحيح الجامع (٢٠٣٤)

(6) صحيح البخاري (٣٠٨٧) صحيح مسلم (٦١٧) (7) صحيح البخاري (٥١٠) صحيح مسلم (٦١٥)

(8) تفسير القرطبي (٢٠/١٦٥)

والے کی آواز پر لپکنا، اور ساتویں آگ میں اڑ کر گرنا۔ پھر فرمایا کہ پہاڑ چورا چورا ہو جائیں گے، جیسے: دھنی ہوئی اون رنگا رنگ کی۔

"عھن" ایسی اون کو کہتے ہیں جو مختلف رنگوں میں رنگی ہوئی ہو۔ "موازین" جمع ہے موزون کی۔ اس سے مراد اعمال ہیں جن کا میزانِ حساب میں وزن ہوگا۔ یہی قول امام فراء رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ میزان کی جمع ہے، یعنی وہ آلہ جس میں اعمال کے صحائف تولے جائیں گے۔ یا موازین سے مراد حجج و دلائل ہیں۔ بہر حال جس کے اعمالِ صالح بھاری نکلیں گے، وہ پاکیزہ اور پسندیدہ زندگی میں ہوگا۔ "عیشة" ایک ایسا لفظ ہے جس میں جنت کی تمام نعمتوں کا ذکر شامل ہے۔ اور جس کے اعمالِ بد اس کے حسنات سے بڑھ گئے، یا سرے سے حسنات تھے ہی نہیں تو اس کا مسکن جہنم ہے۔ جہنم کا نام ماں رکھا کہ جس طرح بچہ اپنی ماں کے پاس آتا ہے اسی طرح وہ جہنم کے پاس آئے گا۔ ہاویہ جہنم کے ساتویں طبقے کا نام ہے، یہ طبقہ سب سے زیادہ نیچا ہے، اس کا نام ہاویہ اس لیے ہوا کہ اس کی گہرائی کے باوجود اس میں گرتا چلا جائے گا۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی بازگشت آگ کی طرف ہوگی۔[2] امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "أم" سے مراد مستقر (جائے قرار) ہے۔[3] خطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد "نازلة سافلة" ہے، ایسا شخص عیشِ ساخط میں ہوگا (ایسی زندگی جو بہت غضب والی ہوگی)۔ مناوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کے حسنات زیادہ ہونے کی وجہ سے سیئات پر غالب آگئے وہ جنت میں جائے گا اور جس کے حسنات وسیئات برابر نکلے، اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور جس کے سیئات حسنات سے بڑھ گئے، یعنی زیادہ ہونے کی وجہ سے غالب ہو گئے، اس کو عذاب کیا جائے گا یا اس کی شفاعت کی جائے گی۔ آیتِ باب میں اس شخص کا ذکر نہیں فرمایا جس کی حسنات اور سیئات برابر ہوئیں۔ پھر تہویل و تقطیع (ڈرانے اور قطع کرنے) کے لیے یہ کہا کہ تو جانتا ہے کہ ہاویہ کیا ہے؟ ایک آگ ہے جس کی گرمی اپنی حد کو پہنچ گئی ہے اور شدت میں انتہا درجے تک پہنچی ہوئی ہے۔[4] أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا بِمَنِّهِ وَكَرَمِهِ.

---

① فتح القدير (٦٥٤/٥) ② تفسير الطبري (٥٧٥/٢٤)
③ تفسير القرطبي (١٦٧/٢٠) ④ فتح البيان (٣٥٩/١٥-٣٦٢)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ التَّكَاثُرِ

اس کی آٹھ (۸) آیتیں ہیں، سب کے نزدیک مکے میں اتری ہے، مگر بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ مدنی ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ مکی ہے۔[2]

سورۃ التکاثر کی فضیلت:

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے رفعاً کہا ہے کہ کیا تم میں سے کوئی ہر دن ہزار آیت نہیں پڑھ سکتا؟[3] (أخرجه الحاكم و البيهقي)۔ منذری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد میں ثقات ہیں، سوائے عقبہ کے جس کو میں نہیں پہچانتا۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ایک رات میں ہزار آیتیں پڑھیں، وہ اللہ سے ملے گا اور اللہ پاک اس کے منہ پر ہنسے گا۔ کہا: اے اللہ کے رسول! کس کو یہ طاقت ہے کہ ایک ہزار آیتیں پڑھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ پڑھ کر یہ سورت آخر تک پڑھی اور کہا: واللہ! یہ ایک ہزار آیت کے برابر ہے۔[4] (أخرجه الخطيب والديلمي)۔ عبداللہ بن الشخیر رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ﴿ اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ﴾ پڑھتے تھے، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ سورت اتری تھی، فرمانے لگے: آدمی زاد کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال، تیرا مال نہیں مگر اتنا جو تو نے کھا کر فنا کر دیا۔[5] (أخرجه مسلم و الترمذي و النسائي)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ رفعاً یہ ہیں: بندہ کہتا ہے: میرا مال، میرا مال۔ اس کے لیے اس کے مال میں سے تین چیزیں ہیں: ایک وہ جو کھا کر فنا کر دیا، دوسرے وہ جو پہن کر پرانا کر دیا اور تیسرے وہ جو صدقہ دے کر جمع کیا، اس کے سوا جو کچھ ہے وہ سب جانے والا ہے، لوگوں کے لیے چھوڑ جائے گا۔[6] (رواه مسلم)۔ سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کہا: میں تم پر سورت ﴿ اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ﴾ قراءت کرتا ہوں جو کوئی روئے گا اس کے لیے جنت ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورت پڑھی ہم میں سے کوئی شخص رویا اور کوئی نہ رویا، جو لوگ نہ روئے انھوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! ہم نے رونے کی کوشش کی کہ ہم روئیں لیکن ہم سے نہ ہو

---

(1) تفسير القرطبي (۲۰/۱۶۸) (2) الدر المنثور (۸/۶۰۹) (3) مستدرك الحاكم (۱/۷۵۵) شعب الإيمان (۲/۴۹۸)

(4) المتفق والمفترق (۱/۴۰۱، ۴۰۲) اس کی سند میں ''یحییٰ بن بکیر'' مجہول راوی ہے۔

(5) صحيح مسلم (۲۹۵۸) سنن الترمذي (۲۳۴۲) سنن النسائي الكبرىٰ (۳۶۱۳) (6) صحيح مسلم (۲۹۵۹)

سکا۔ فرمایا: میں پھر دوبارہ اس کو تم پر پڑھتا ہوں جو کوئی روئے گا، اس کے لیے جنت ہے اور جو شخص رونے پر قادر نہ ہو سکے وہ رونا سا منہ بنا لے۔[1] (أخرجه البيهقي في الشعب و ضعفه و الحكيم الترمذي في نوادر الأصول)

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اس سورت کی ایک تفسیر مختصر الگ سے لکھی ہے۔ اس کا ذکر رسالہ "إدامة السكر" میں آیا ہے اور یہ بات ثابت کی ہے کہ یہ سورت کچھ خاص طور پر اہلِ کفر کے حق ہی میں نہیں ہے، بلکہ اہلِ اسلام کے حق میں بھی ہے۔ میں کہتا ہوں: یہی زیادہ صحیح اور راجح ہے۔ فقط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ﴿١﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴿٢﴾ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٣﴾ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿٤﴾ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ﴿٥﴾ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ﴿٦﴾ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ﴿٧﴾ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ﴿٨﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

باہم بہتات کی حرص نے تمھیں غافل کر دیا ① یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے ② ہرگز نہیں! جلد ہی تم جان لو گے ③ پھر ہرگز نہیں! جلد ہی تم جان لو گے ④ ہرگز نہیں! اگر تم یقینی علم کے ساتھ جان لو ⑤ تم ضرور دوزخ کو دیکھو گے ⑥ پھر تم اسے ضرور یقین کی آنکھ سے دیکھو گے ⑦ پھر اس دن تم سے نعمتوں کی بابت ضرور سوال کیا جائے گا ⑧

دنیا کی محبت اور آخرت سے غفلت کا انجام:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دنیا کی محبت و آرام و رونق نے تم کو آخرت کی طلب اور عقبیٰ کی جستجو سے باز رکھا۔ یہ حالت اتنی دراز ہوئی کہ تم کو موت آ گئی اور تم نے مقبروں کی ملاقات کی، یعنی قبر کے اندر جا کر سو رہے اور اہلِ قبور میں ہو گئے۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم کو طاعت سے غافل کر دیا، یہاں تک کہ تم مر گئے۔[2] (رواه ابن أبي حاتم)۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم کو کثرتِ اموال و اولاد نے بے خبر کر دیا۔[3] سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ہم: "لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادٍ مِنْ ذَهَبٍ" "اگر ابن آدم کے پاس سونے کی ایک وادی ہو" کو قرآن میں سے خیال کرتے

---

① شعب الإيمان (٣٦٢/٢) نوادر الأصول (١٩٨/٢) اس کی سند میں "سلام بن واقد" ضعیف راوی ہے۔
② تفسیر ابن أبي حاتم (٣٤٥٩/١٠) یہ روایت مرسل ہے، نیز سند میں "عبدالرحمان بن زید اور خالد" ضعیف راوی ہیں۔
③ مصنف ابن أبي شيبة (٢٢٩/٧)

تھے، یہاں تک کہ سورت ﴿ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ﴾ اتری۔ [1] (رواه البخاري)۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ مردے کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں۔ دو واپس آ جاتی ہیں اور ایک اس کے ساتھ رہ جاتی ہے: اہل ومال وعمل۔ سو اہل اور مال تو واپس آ جاتے ہیں اور عمل اس کے ہمراہ باقی رہ جاتا ہے۔ [2] (رواه الشيخان والترمذي والنسائي)۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ رفعاً یہ ہیں کہ ابن آدم بوڑھا ہوتا ہے اور دو چیزیں اس کے ساتھ رہ جاتی ہیں: ایک حرص دوسرے امل (امید)۔ [3] (رواه أحمد و أخرجه في الصحيحين)

مرد چوں پیر شود حرص جواں میگردد

''مرد جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کی لالچ جوان ہو جاتی ہے۔''

حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے ترجمۂ احنف بن قیس میں ذکر کیا ہے کہ احنف نے ایک شخص کے ہاتھ میں ایک درہم دیکھ کر پوچھا: یہ کس کا ہے؟ اس نے کہا کہ میرا ہے، کہا: یہ تیرا اس وقت ہوگا جب تو اس کو کسی اجر یا طلبِ شکر میں خرچ کر دے۔ پھر یہ شعر پڑھا:

أَنْتَ لِلْمَالِ إِذَا أَمْسَكْتَهُ فَإِذَا أَنْفَقْتَهُ فَالْمَالُ لَكَ [4]

''جب تو مال کو روک لے تو تو مال کا ہے اور جب اسے خرچ کر دے تو مال تیرا ہے۔''

ابن بریدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ سورت بنی حارثہ اور بنی حارث دو قبیلۂ انصار کے حق میں اتری۔ انھوں نے باہم تفاخر اور تکاثر کیا۔ ایک نے کہا: بھلا تم میں کوئی فلاں بن فلاں اور فلاں کی طرح ہے، دوسرے نے بھی زندوں کے ساتھ اسی طرح کا تفاخر کیا، پھر کہا: اچھا! ہمارے ساتھ قبروں پر چلو، دوسرا گروہ کہنے لگا: تم میں فلاں کی طرح کون ہے اور قبور کی طرف اشارہ کیا۔ دوسروں نے بھی یہی کیا، اس پر اللہ نے یہ سورت اتاری، یعنی تمھارے لیے اس امر میں جس کو تم نے دیکھا عبرت اور شغل ہے۔ [5]

یکے بگور غریبانِ شہر سیری کن ببیں کہ نقش املہا چہ باطل افتادہ است

''ایک بار شہر کے غریبوں کی قبر کی سیر کر کہ امیدوں کے تصور کس طرح مٹ گئے ہیں۔''

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہم بنی فلاں سے تعداد کے لحاظ سے زیادہ ہیں اور ہم بنی فلاں سے زیادہ تیار ہیں، کیوں کہ وہ تو ہر دن گھٹتے جاتے ہیں۔ واللہ! وہ اسی طرح ساقط ہو کر اہلِ قبور میں ہو جائیں گے۔ [6] لیکن صحیح معنی ﴿ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴾ کے یہ ہیں کہ تم قبروں میں جا کر دفن ہو جاؤ گے جس طرح کہ صحیح حدیث میں

[1] صحيح البخاري (٦٠٧٥) [2] صحيح البخاري (٦١٤٩) صحيح مسلم (٢٩٦٠) سنن الترمذي (٢٣٧٩) سنن النسائي (١٩٣٧)
[3] صحيح البخاري (٦٠٥٨) صحيح مسلم (١٠٤٧) مسند أحمد (١١٥/٣) [4] تاريخ دمشق (٣٤٢/٢٤، ٣٤٣)
[5] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٥٩/١٠) [6] تفسير الطبري (٥٧٩/٢٤)

مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک اعرابی شخص کی عیادت کو گئے تو کہا: "لَا بَأْسَ طَهُورٌ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ" "کوئی حرج نہیں، یہ بیماری اللہ نے چاہا تو پاک کرنے والی ہے۔" اس نے کہا ہے کہ آپ طہور فرماتے ہیں، یہ تو ایک بہت تیز بخار ہے ایک بوڑھے شخص پر جو اس کو قبور کی زیارت کرائے گا۔ فرمایا: ہاں، یہی سہی۔[1] سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم ہمیشہ عذابِ قبر کے بارے میں شک کرتے تھے، یہاں تک کہ یہ سورت اتری۔[2] (رواه ابن أبي حاتم والترمذي واستغربه)

میمون بن مہران کہتے ہیں میں عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے پاس بیٹھا تھا، انھوں نے ﴿ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ﴾ پڑھی، پھر ذرا ٹھہر کر مجھ سے کہا: اے میمون! "مَا أَرَى الْمَقَابِرَ إِلَّا زِيَارَةً وَمَا لِلزَّائِرِ بُدٌّ مِنْ أَنْ يَرْجِعَ إِلَى مَنْزِلِهِ"[3] یعنی میں دیکھتا ہوں کہ ان مقابر سے مراد زیارت ہے اور زائر کے لیے ضروری ہے کہ اپنے گھر کی طرف لوٹ آئے، یعنی جنت یا نار کی طرف جائے کہ یہی اس کا گھر ہے۔ اسی طرح مذکور ہے کہ ایک اعرابی نے کسی شخص کو سنا کہ وہ یہ آیت پڑھتا ہے تو کہا: "بُعِثَ الْقَوْمُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ" یعنی زیارت کرنے والا جلد اپنے مقام سے دوسرے مقام کی طرف رحلت کر جاتا ہے، یعنی قبر میں ہمیشہ رہنا نہیں ہوگا۔ قبر سے نکل کر جنت یا دوزخ میں جائیں گے۔ حدیث میں فرمایا ہے: «اَلْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ»[4] "قبر یا جنت کا باغیچہ ہے یا آگ کا گڑھا۔"

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ فرمایا کہ "اب تم جلد جان لو گے! وعید ہے بعد وعید کے۔"[5] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد کفار ہیں اور دوسری بار سے مراد مومنین ہیں۔[6] پھر فرمایا کہ اگر تم اس امر کو کما حقہ جان لیتے تو تم کو طلب کا تکاثر دارِ آخرت سے باز نہ رکھتا یہاں تک کہ تم قبروں میں آئے بلکہ تم جہنم کو یقین کی آنکھ سے دیکھ لیتے۔ یہ تفسیر ہے وعید کی، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس حال سے ڈرایا، یعنی آگ سے کیوں کہ جس وقت وہ آواز کرے گی تو ہر مقرب فرشتہ، نبیِ مرسل اس کی ہیبت اور عظمت سے اور اس کے احوال دیکھ کر زانوں کے بل گر پڑے گا۔ اس بارے میں ایک اثر آیا ہے۔

نعمتوں کی پرسش سے وعید:

پھر یہ باز پرس ہو گی کہ اللہ کی نعمتوں، مثلاً: صحت، امن اور رزق وغیرہ کا کیا شکر ادا کیا۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن نبی اکرم ﷺ دوپہر کے وقت باہر نکلے، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مسجد میں پایا، کہا: تو اس وقت کیسے آیا؟ کہا: جس چیز نے آپ کو باہر نکالا، اسی نے مجھے نکالا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے، فرمایا: تو کیسے نکلا؟ کہا: اسی نے مجھے نکالا جس نے آپ دونوں کو باہر نکالا، عمر رضی اللہ عنہ بھی بیٹھ گئے۔ نبی اکرم ﷺ، ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے

---

[1] صحيح البخاري (٣٦٢٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٥٩) سنن الترمذي (٣٣٥٥)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٥٩/١٠)

[4] سنن الترمذي (٢٤٦٠) اس کی سند میں "عطیہ عوفی اور عبید اللہ بن ولید وصافی" ضعیف راوی ہیں۔ دیکھیں: (ضعيف الجامع: ١٢٣١)

[5] تفسير البغوي (٥١٨/٨) [6] تفسير الطبري (٥٨١/٢٤)

باتیں کرنے لگے، پھر فرمایا: تم دونوں اس درخت تک چل سکتے ہو؟ وہاں کھانا، پینا، سایہ ملے گا، کہا: ہاں! فرمایا: میرے ساتھ ابن تیہان ابی ہیثم انصاری کے گھر تک چلو۔ نبیِ مکرم ﷺ آگے ہوئے اور جا کر سلام کیا اور اذن چاہا۔ ام ہیثم رضی اللہ عنہا دروازے کے پیچھے سے بات سنتی تھی اور چاہتی تھی کہ آپ ﷺ کچھ اور سلام فرمائیں، جب نبیِ اکرم ﷺ نے واپس مڑنا چاہا، ام ہیثم پیچھے سے دوڑتی ہوئی آئی اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کے سلام کو سن لیا تھا، لیکن یہ چاہا کہ آپ زیادہ سلام کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: خیر ہے؟ اس نے کہا: ابو ہیثم قریب ہی میٹھا پانی لینے کے لیے گیا ہے، آپ تشریف رکھیں، وہ ابھی حاضر ہوتا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ پھر ایک درخت کے نیچے کچھ بچھا دیا، اتنے میں ابو ہیثم بھی آ گیا اور ان کو دیکھ کر خوش ہوا اور اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں، پھر ایک درخت پر چڑھ گیا، وہاں سے کچھ ڈالیں توڑیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: بس اے ابو الہیثم! کہا: اے اللہ کے رسول! آپ گدر اور پکی دونوں طرح کی کھائیں، پھر جا کر پانی لے آیا، سب نے پانی پیا۔ فرمایا: «هَذَا مِنَ النَّعِيمِ الَّذِيْ تُسْئَلُوْنَ عَنْهُ» یعنی یہ اس نعمت سے ہے جس کی تم سے باز پرس ہوگی۔[1] (رواه ابن أبي حاتم وهذا غريب من هذا الوجه) اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بالفاظِ دیگر روایت کیا ہے۔ اس کی اصل صحیح مسلم اور سننِ اربعہ میں ہے۔[2] امام احمد رحمہ اللہ بھی اس کے راوی ہیں۔

ابو عسیب رضی اللہ عنہ نے کہا: ایک رات نبی اکرم ﷺ باہر آئے مجھ کو پکارا، میں نکلا، پھر جا کر سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کو بلایا وہ باہر آئے، پھر عمر رضی اللہ عنہ کو بلایا وہ نکلے، پھر کسی انصاری کے باغ میں گئے اور باغ والے سے کہا: ہم کو کچھ کھلاؤ، وہ ایک ڈال لے آیا۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب کے ساتھ کھائی، پھر ٹھنڈا پانی مانگ کر پیا۔ پھر فرمایا: «تُسْأَلُنَّ عَنْ هَذَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ» ”قیامت کے دن تم سے اس کے بارے باز پرس ہوگی۔“ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے وہ ڈال اٹھا کر زمین پر نبی اکرم ﷺ کے سامنے دے ماری، وہ بکھر گئی۔ پھر کہا: اے اللہ کے رسول! ہم سے قیامت کے دن اس کے متعلق سوال ہوگا؟ فرمایا: ہاں! مگر تین چیز کا سوال نہیں ہوگا: ایک وہ کپڑا جس سے ستر چھپایا، یا روٹی کا ٹکڑا جس سے بھوک دور کی، یا ایک سوراخ جس میں گرمی و سردی سے بچنے کے لیے داخل ہوا۔[3] (تفرد به أحمد)

محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ سورت اتری تو کہا: اے اللہ کے رسول! ہمیں کن نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا، یہاں تو پانی اور کھجوریں ہیں اور کندھوں پر تلواریں ہیں اور دشمن حاضر ہے، پھر کس آرام کے بارے میں سوال ہوگا؟ فرمایا: «أَمَا إِنَّ ذَلِكَ سَيَكُوْنُ» یعنی سن رکھو کہ وہ چین ہونے والا ہے۔[4] (رواه أحمد) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: سب سے پہلے قیامت کے دن جس چیز کا بندے سے سوال ہوگا، وہ نعیم ہے۔ اس سے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (۳٤٦۱/۱۰) [2] صحيح مسلم (۲۰۳۸) تفسير الطبري (۵۸٤،۵۸۳/۲٤)
[3] مسند أحمد (۸۱/۵) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجاله ثقات“ مجمع الزوائد (٤۷۱/۱۰) [4] مسند أحمد (٤۲۹/۵)

کہا جائے گا: کیا تیرے بدن کو صحت نہیں دی؟ کیا تجھ کو ٹھنڈا پانی نہیں پلایا؟[1] (تفرد به الترمذي ورواه ابن حبان في صحيحه)

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اتری تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم کس آرام میں ہیں؟ آدھا پیٹ کھاتے ہیں، وہ بھی جو کی روٹی۔ اللہ نے وحی بھیجی کہ کیا تم جوتا نہیں پہنتے ہو اور ٹھنڈا پانی نہیں پیتے ہو؟ یہ نعیم ہے۔[2] (رواه ابن أبي حاتم) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں امن اور صحت کو نعیم فرمایا ہے[3] اور زید بن اسلم رحمہ اللہ کی روایت میں شکم سیری اور ٹھنڈا پانی اور گھر کا سایہ اور اپنے جسم کی ساخت میں اعتدال اور نیند کی لذت کو نعیم ٹھہرایا ہے۔[4] (رواهما ابن أبي حاتم)۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شہد کے شربت کے متعلق بھی سوال ہو گا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: دنیا کی لذتوں میں سے ہر لذت کے متعلق سوال ہو گا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: صبح و شام کا کھانا نعیم ہے۔ ابو قلابہ رحمہ اللہ نے کہا: گھی، شہد اور چپاتی نعیم ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول اشمل اقوال ہے[5] (تمام اموال کو شامل ہے)۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بدن کی صحت اور کانوں اور آنکھوں کی درستی نعیم ہے۔ اللہ پوچھے گا کہ ان کو کس کام میں استعمال کیا تھا، حالاں کہ وہ خوب جانتا ہے اور یہ تو اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی ہے: ﴿ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ﴾[6] [بني إسرائيل: ٣٦] ”بے شک کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے۔“ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: ”دو نعمتیں ہیں اکثر لوگ ان میں مغبون (جن کو نقصان پہنچا ہو) ہیں: صحت اور فراغت۔“[7] (رواه البخاري والترمذي والنسائي و ابن ماجه)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان نعمتوں کے شکر میں کمی کرتے ہیں، حق واجب کے ساتھ قیام نہیں کرتے، گویا اس قیام نہ کرنے کی وجہ سے مغبون ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ رفعاً یہ ہیں کہ ازار، سایۂ دیوار اور نان سے جو زیادہ ہے اس کا حساب قیامت کے دن بندے سے لیا جائے گا، یا اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔[8] (رواه البزار) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رفعاً کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ کو گھوڑے اور اونٹ پر سوار کیا، تجھ کو بیوی دی، تو چوتھائی لیتا تھا، سردار تھا، اس کا کیا شکر ادا کیا؟[9] (رواه أحمد تفرد به)

---

① سنن الترمذي (٣٣٥٨) صحيح ابن حبان (٣٦٤/١٦) صحيح الجامع (٢٠٢٢)

② تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٦١/١٠، ٣٤٦٢) یہ روایت مرسل ہے، نیز سند میں ”حفص بن عمر“ ضعیف راوی ہے۔

③ تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٦٢/١٠) اس کی سند میں ”عامر“ راوی کے ساتھ شک کا لفظ استعمال ہوا ہے، اگر یہ ”عامر شعبی“ ہے تو اس کی سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں ہے اور اگر یہ ”عامر“ کوئی اور ہے تو یہ مجہول راوی ہے۔

④ تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٥٩/١٠) تفسير ابن كثير (٧٠٩/٤) یہ روایت مرسل ہے نیز سند میں ”ابن زید بن اسلم اور خالد“ ضعیف راوی ہیں۔

⑤ تفسير الطبري (٥٨٦/٢٤) تفسير ابن كثير (٧٠٩/٤) ⑥ شعب الإيمان (١٤٨/٤)

⑦ صحيح البخاري (٦٠٤٩) سنن الترمذي (٢٣٠٤) سنن ابن ماجه (٤١٧٠)

⑧ كشف الأستار عن زوائد البزار (٢٤٧/٤) اس کی سند میں ”لیث بن ابی سلیم“ ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (ضعيف الجامع: ٥١١٦)

⑨ مسند أحمد (٤٩٢/٢)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ مشغول کر دیا تم کو مبارات نے، اموال کی کثرت اور اولاد کی کثرت و مباہات وتفاخر میں مشغولیت نے اللہ کی اطاعت سے غافل کر دیا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: تم کو بھلا دیا حتیٰ کہ موت نے آ پکڑا اور تم اسی بھول میں تھے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: قبائل اور خاندانوں کے ساتھ تکاثر اور فخر کرنا مراد ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: مراد معاش میں مشغولیت ہے، یعنی تم مر گئے اور قبروں میں جا کر دفن ہو گئے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت یہود کے حق میں اتری ہے، جب انھوں نے یہ کہا کہ ہم بنی فلاں سے زیادہ ہیں اور فلاں فلاں سے زیادہ ہیں، ان کو اس بات نے یہاں تک غافل کیا کہ مر گئے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا: قریش کے دو قبیلوں کے حق میں اتری ہے بنی عبد مناف اور بنی سہم۔ وہ اسلام میں سرداری اور شرافت کا گھمنڈ رکھتے تھے۔ ہر قبیلہ یہ بات کہتا تھا کہ ہماری سرداری، عزت اور عظمت زیادہ ہے، پھر مردوں پر تفاخر کرتے۔[1]

آیت شریف میں اس بات پر دلیل ہے کہ دنیا کے ساتھ اشتغال اور اس پر فخر کرنا ایک مذموم خصلت ہے، ہاں سعاداتِ حقیقیہ میں تکاثر اور تفاخر کرنا شرعی طور پر مذموم نہیں ہے، جیسے: طاعات اور حسنِ اخلاق میں تفاخر کرنا مذموم نہیں، جبکہ یہ گمان ہو کہ دوسرا ہماری اقتدا کرے گا۔ اللہ نے یہ نہیں کہا کہ فلاں تکاثر نے تم کو غافل کیا، بلکہ مطلقاً فرمایا، یہ مذمت کے لیے زیادہ مؤثر ہے، کیوں کہ خیال ہر طرف دوڑتا ہے تو اس میں ہر طرح کا تکاثر جو محتملِ (احتمال کیا گیا) مقام ہے، داخل ہوتا ہے۔ پھر وعید سنائی کہ اب تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پہلی وعید موت کے وقت کی ہے یا قبر میں اور دوسری قیامت میں۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دوبارہ کہنا سختی اور تاکید کے طور پر ہے۔[2]

پھر فرمایا کہ اگر یقیناً تم یہ بات جان لو کہ تمھارا انجام کیا ہوگا تو البتہ یہ علم تم کو اس تکاثر اور تفاخر سے مشغول کر دیتا۔ یا یہ مطلب ہے کہ البتہ تم اپنے فائدے کے کام کرتے اور جس مال میں پھنسے ہوئے ہو اس کو چھوڑ دیتے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ اگر تم علمِ یقین حاصل کرتے تو تکاثر تم کو غفلت میں نہ ڈالتا[3] اور اس تیسری جگہ میں ﴿ كَلَّا ﴾ پہلی دو جگہ کی طرح ڈرانے اور سرزنش کے لیے ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بہ معنی "حَقًّا" ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ان تینوں جگہوں میں بہ معنی "إِلَّا" ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس کو بیان کیا ہے۔[4]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یقین اس جگہ بہ معنی موت ہے۔ ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ بہ معنی بعث ہے۔[5]

تیسری روایت یہ ہے کہ علمِ یقین یہ ہے کہ آدمی اس بات کا اعتقاد کرے کہ اللہ موت کے بعد اس کو اٹھا دے گا۔[6]

---

[1] تفسير القرطبي (١٦٨/٢٠) [2] تفسير القرطبي (١٧٢/٢٠) [3] فتح القدير (٦٥٨/٥)
[4] تفسير القرطبي (١٧٤/٢٠) [5] فتح القدير (٦٥٨/٥) [6] تفسير الطبري (٥٨١/٢٤)

پھر فرمایا: ﴿ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ﴾ یہ قسم محذوف کا جواب ہے، معنی یہ ہوئے کہ قسم ہے اللہ کی بے شک تم جحیم کو آخرت میں دیکھو گے۔ اس میں وعید وتہدید کی زیادتی ہے۔ پھر اس وعید وتہدید کو تاکیداً مکرر فرمایا: ﴿ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ﴾ یعنی تم کو دوزخ کی یقینی اور حقیقی رویت ہو گی۔ اور وہ مشاہدہ ومعاینہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ پہلی رویت سے مراد آنکھوں سے دور سے دیکھنا ہے اور ثانی سے مراد قریب سے مشاہدہ کرنا ہے۔ پہلی رویت داخل ہونے سے پہلے ہے اور دوسری رویت داخل ہونے کے وقت ہے۔ یہ اس بات کی خبر ہے کہ نار میں ہمیشہ کے لیے باقی رہنا ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ اگر دنیا میں علم الیقین ہو جاتا تو دل میں عین الیقین آ جاتا، پھر جن دنیا کی نعمتوں نے تم کو آخرت سے باز رکھا ہے، تم سے ان کے متعلق سوال ہو گا۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد کفارِ مکہ ہیں جو دنیا میں آرام ونعمت وخیر میں تھے۔ ان سے شکر کا سوال ہو گا حالاں کہ انھوں نے نعمت کا کوئی دلی شکر ادا نہ کیا، بلکہ غیر کی عبادت کی اور شرک کیا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: نعمتوں کے متعلق سوال صرف اہلِ نار سے ہو گا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اللہ ہر نعمت کا سوال اس شخص سے کرے گا جس کو وہ نعمت دی گئی۔[1] یہی ظاہر ہے، کسی فرد یا قسم کے ساتھ نعمت کو خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں اس لیے کہ اس کو معرفہ جنس یا استغراق کے لیے لایا گیا اور صرف سوال سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس سے سوال کیا جائے اسے عذاب کیا گیا ہو، بلکہ اللہ مومن سے سوال کرے گا تو نے میری نعمت کو کہاں صَرف کیا؟ تاکہ وہ اپنی تقصیر (کمی، قصور) سے آگاہ ہو اور جان لے کہ مجھ سے واجب شکر ادا نہیں ہوا۔ پھر علماء نے کہا ہے کہ سوال فلاں فلاں امر کے متعلق ہو گا، لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس کو عام سمجھا جائے۔[2]

---

[1] فتح القدير (٦٥٨/٥) [2] فتح البيان (٣٦٥/١٥_٣٦٩)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْعَصْرِ

اس سورت کی تین (۳) آیتیں ہیں۔ جمہور کے نزدیک یہ مکے میں اتری ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مدنی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مکی ہے۔[1]

سورۃ العصر کی جامعیت:

ابو مزینہ داری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دو صحابی مرد جب آپس میں ملتے جب تک ان میں سے ایک دوسرے پر سورۃ العصر کو پڑھ نہ لیتا، جدا نہ ہوتا۔ پھر سلام کر کے چلے جاتے۔[2] (أخرجه الطبراني والبيهقي)۔ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اور اپنے مسلمان ہونے سے پہلے مسیلمہ کذاب کے پاس گئے۔ مسیلمہ کذاب نے کہا: اس مدت میں تمھارے صاحب پر کیا اترا؟ انھوں نے کہا کہ ایک مختصر اور بلیغ سورت اتری ہے۔ کہا: وہ کیا ہے؟ کہا: ﴿ وَالْعَصْرِ ... الخ﴾ اس نے ذرا فکر کر کے کہا: مجھ پر بھی اس کے مثل ایک سورت نازل ہوئی ہے، کہا: کیا؟ کہا: ”يَا وَبَرُ يَا وَبَرُ إِنَّمَا أَنْتَ أُذُنَانِ وَصَدْرٌ وَسَاتِر حَقَرٌ نقر“ پھر کہا: اے عمرو! کہو یہ کیسی سورت ہے؟ کہا: واللہ! تو جانتا ہے کہ میں تجھ کو جھوٹا جانتا ہوں۔ خرائطی نے اس کو اپنی کتاب ”مساوي الأخلاق“ میں مثل اس کے یا اس کے قریب قریب مسند کیا ہے۔ وبر ایک کیڑا ہوتا ہے بلی کی مشابہ، بڑی چیز اس میں یہی دو کان اور سینہ ہے باقی دمیم ہے۔ مسیلمہ نے چاہا کہ اس ہذیان کو ترکیب دے کر قرآن کا مقابلہ کرے، لیکن بت پرستوں پر بھی اس زمانے میں اس کو رائج نہ کر سکا۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: ”لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ هَذِهِ السُّوْرَةَ لَوَسِعَتْهُمْ“[3] ”اگر لوگ اس سورت پر غور کریں تو ہدایت وراہنمائی کے لیے یہ کافی ثابت ہو۔“

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَالْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳

(1) تفسير القرطبي (۲۰/۱۷۸) (2) المعجم الأوسط (۵/۲۱۵) شعب الإيمان (۶/۵۰۱) السلسلة الصحيحة (۲۶۴۸)
(3) تفسير ابن كثير (۴/۷۰۹، ۷۱۰)

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

زمانے کی قسم!① بے شک انسان خسارے میں ہے② سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی③

خسارے سے کون بچے گا:

عصر وہ زمانہ ہے جس میں بنی آدم کی خیر اور شر حرکات واقع ہوتی ہیں۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد عصر کا وقت ہے۔[1] لیکن مشہور پہلی بات ہے۔ اللہ نے قسم کھائی کہ انسان خسارے اور ہلاکت میں ہے، لیکن اس خسارے سے وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جو دل سے ایمان لائے اور جوارح سے انھوں نے نیک کام کیے اور حق کی وصیت کر گئے، یعنی اطاعت بجا لانے کی اور حرام کردہ چیزوں کو ترک کرنے کی وصیت کر گئے اور مصائب اور تقدیر کے فیصلوں پر اور ایذا دینے والوں کی ایذا پر صبر کرنے کی وصیت کر گئے۔ شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ نے کہا: اصل دین تین امر ہیں: حکم کی گئی بات پر عمل کرنا اور خطرے والی چیز کو چھوڑ دینا اور تقدیر پر صبر کرنا۔ اس سے شریعت کی کوئی بات خارج نہیں ہوتی۔ الغرض اس تواصی سے مراد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عصر کی قسم کھائی۔ عصر سے مراد دہر ہے۔ دہر میں عبرتیں ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے مطابق رات اور دن کا آنا اور اندھیرے اور روشنی کا ایک دوسرے کا تعاقب کرنا۔ ان عبرتوں میں اللہ عزوجل کی کاریگری اور اس کی توحید پر واضح دلیل ہے۔ رات کو عصر کہتے ہیں، اسی طرح دن کو کہتے ہیں، اسی طرح صبح و شام کو کہتے ہیں۔ رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عصر میں عجیب و غریب چیزیں ہیں۔ اس میں آسانیاں ہیں، تنگیاں ہیں اور اس میں غنا اور فقر ہے۔ آدمی کی بقیہ عمر ایک بے قیمت چیز ہے اگر ہزار برس لایعنی باتوں میں ضایع ہوں، پھر آخری عمر میں ایک لحہ سعادت نصیب اور ثابت ہو جائے تو ابد الآباد جنت میں رہے گا۔[2] اس سے معلوم ہوا کہ سب اشیاء سے اشرف شے باقی عمر کے لحات ہیں، اس لیے دہر اور زمانہ اصولِ نعم میں سے ٹھہرا اور نیز زمان مکان سے اشرف ہے۔ اس لیے اللہ نے اس کی قسم کھائی، کیوں کہ یہ زمان ایک خالص بے عیب نعمت ہے۔ امام قتادہ اور حسن رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ عصر سے مراد زوالِ شمس سے غروبِ شمس تک کا وقت ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دن کی آخری ساعت ہے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نمازِ عصر ہے جس کو صلاۃِ وسطی کہتے ہیں۔[3] اللہ تعالیٰ نے اس کی محافظت کا حکم دیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ عصرِ نبوت کی قسم ہے۔ بعض

---

[1] تفسیر ابن کثير (٧١٠/٤) [2] تفسير الرازي (٨٠/٣٢) [3] تفسير القرطبي (١٧٩/٢٠)

نے کہا ہے کہ "وَرَبِّ الْعَصْرِ" کے معنی میں ہے، لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی قراءت یہ تھی: "وَالْعَصْرِ وَنَوَائِبِ الدَّهْرِ، إِنَّ الإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ، وَإِنَّهُ فِيهِ إِلَى آخِرِ الدَّهْرِ"[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی یوں ہی پڑھا ہے: "وَإِنَّهُ لَفِيهِ إِلَى آخِرِ الدَّهْرِ"[2] (أخرجه عبد بن حميد)

"خسر" بہ معنی نقصان ہے، رأس المال جاتے رہنے کو خسران کہتے ہیں، یعنی ہر انسان تجارت وسعی وعمر کو دنیا کے اعمال میں صَرف کرنے میں نقصان اور حق سے گمراہی میں پڑا ہوا ہے، یہاں تک کہ وہ مرے۔ اس جگہ انسان سے مراد کافر ہے یا کافروں کی جماعت، جیسے: ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل اور اسود بن عبدالمطلب بن اسد، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے، اس لیے کہ انسان کے لفظ میں عموم ہے اور استثنیٰ اس پر دلیل ہے۔ امام اخفش رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "خسر" سے مراد ہلاکت ہے۔

امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عقوبت ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شر ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ نقص ہے۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ "خسر" کو جو نکرہ رکھا ہے اس سے اس کی تعظیم ہے، یعنی اس کی حقیقت اللہ ہی جانتا ہے۔ انسان ہر طرف سے محاط ومغمور (گھرا ہوا) ہے اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔ جو گھڑی اللہ کی معصیت میں صَرف ہوتی ہے اس کے خسران میں کچھ شک وشبہ نہیں ہے اور جو مباحات (فخر وتکبر) میں مشغول ہے وہ بھی درحقیقت خسران ہے۔ اور جو گھڑی طاعات میں بسر ہوتی ہے وہ غیر متناہی ہے اور اعلیٰ چیز کو چھوڑ دینے اور ادنیٰ چیز ہی کی طرف توجہ کرنے میں بھی ایک طرح کا خسران ہے۔ ہاں جو لوگ ایمان اور عملِ صالح کے جامع ہیں یعنی جن میں یہ دونوں باتیں ہیں انھیں نہ تو رنج ہے نہ خسران اور نہ نقصان ہے، کیوں کہ انھوں نے آخرت کے لیے کام کیے ہیں۔ ان کو اعمالِ دنیا نے باز نہیں رکھا۔ پھر ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت کر گئے۔

حق سے مراد ایمان، توحیدِ خالص اور شریعت پر قیام ہے اور نافرمانی سے بچنا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حق قرآن ہے[4] لیکن اس کو عموم پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے۔ صبر سے مراد نافرمانیوں سے بچنا اور فرائض پر پابندی ہے اور آزمایشوں پر صبر کو حق کے ساتھ ذکر کیا، اس میں صبر کی عظیم قدر اور شرف پر دلیل ہے، لہٰذا صابرین کا صبر بے حساب ہے اور اللہ پاک صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔[5] وللّٰه الحمد.

---

[1] تفسير الطبري (٥٨٩/٢٤) [2] الدر المنثور (٦٢٢/٨) [3] تفسير القرطبي (١٨٠/٢٠)

[4] تفسير الطبري (٥٩٠/٢٤) تفسير القرطبي (١٨١/٢٠) [5] فتح البيان (٣٧٥/١٥ ـ ٣٧٧)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْهُمَزَةِ

اس سورت کی نو (9) آیتیں ہیں اور یہ بلا اختلاف مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔[1] امام محلی رحمہ اللہ نے کہا: یہ مدنی ہے،[2] لیکن پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ﴿۲﴾ يَحْسَبُ
اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۚ﴿۳﴾ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۖ﴿۴﴾ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ
مَا الْحُطَمَةُ ؕ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۙ﴿۶﴾ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ؕ﴿۷﴾
اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ۙ﴿۸﴾ فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۠﴿۹﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

ہر طعنہ زن، عیب جو کے لیے ہلاکت ہے ① جس نے مال جمع کیا اور اُسے گن گن کر رکھا ② وہ سمجھتا ہے کہ بے شک اس کا مال اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا ③ ہر گز نہیں! اسے ضرور حُطَمَہ میں پھینکا جائے گا ④ اور آپ کو کیا معلوم کہ حُطَمَہ کیا ہے؟ ⑤ وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے ⑥ جو دلوں تک پہنچے گی ⑦ بے شک وہ (آگ) ان پر (ہر طرف سے) بند کر دی جائے گی ⑧ لمبے لمبے ستونوں میں ⑨

چغل خور اور مال و دولت کے حریص کا انجام بد:

یعنی جس دل میں ایمان ہے تو نہ جلائے، کفر ہے تو جلائے۔ انتہیٰ

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "ھماز" قول میں ہوتا ہے اور "لماز" فعل میں۔ مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کو حقیر کرتا ہے اور ان میں نقص نکالتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ﴾ وہ ہے جو

[1] الدر المنثور (۸/۶۲۳) [2] تفسیر الجلالین (۱/۸۲۱)

طعن وغیبت کرے۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو منہ پر کہے وہ "ھماز" ہے اور جو پیٹھ پیچھے کہے وہ "لماز" ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: مراد زبان اور آنکھ ہے۔ لوگوں کا گوشت کھاتا ہے، ان پر طعن کرتا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ھمز" ہاتھ وآنکھ سے ہوتا ہے اور "لمز" زبان سے ہوتا ہے۔ یہی قول امام ابن زید رحمہ اللہ کا ہے۔

امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "ھمزۃ" لوگوں کا گوشت ہے، اس سے مراد اخنس بن شریق ہے، یا کوئی اور۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ لفظ عام ہے۔[1] جمع مال سے مراد اوپر تلے گن کر رکھنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ﴾ [المعارج: ١٨] ''اور جمع کر کے سنبھال رکھتا ہے۔'' یہی قول امام سدی اور ابن جریر رحمہ اللہ کا ہے۔[2] امام محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا: اس کو اس کے مال نے غافل کر دیا۔ دن میں اس کو ادھر سے اٹھا کر ادھر رکھتا ہے۔ پھر جب رات ہوتی ہے تو ایسا سوتا ہے جیسے کوئی مردار بدبودار پڑا ہو۔ اس کو یہ گمان ہے کہ وہ اس مال کو جمع کرنے سے ہمیشہ اس جگہ رہے گا، ایسا ہرگز نہیں ہونے کا۔ بلکہ یہ مال کو جمع کرنے والا حطمہ میں پھینک دیا جائے گا۔ یہ آگ کے ایک طبقے کا نام ہے، یہ نام اس لیے ہوا کہ اس کے بعض اجزاء بعض کو روند ڈالتے ہیں۔ ثابت بنانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ آگ ان کو دل تک جلا دے گی اور وہ زندہ ہوں گے۔

پھر کہا: پہنچ گیا ان کو عذاب اور رونے لگے۔[3] محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا کہ آگ ہر شے کو جسد سے کھا جائے گی جب دل تک پہنچے گی تو پھر بدن کی طرف رجوع ہوگی۔[4] دل کا بچا رہنا اس لیے ہے کہ عذاب کی تکلیف جسد کو پہنچے اور دل بے چین رہے اور تڑپے۔ ﴿مُّؤْصَدَةٌ﴾ سے مراد مطبقہ ہے۔ یہ تفسیر سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رفعاً آئی ہے۔ (رواہ ابن مردویہ) امام عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ستون لوہے کے ہوں گے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آگ کے ہوں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "عمد" سے مراد ابواب ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت یہ ہے: "مُؤْصَدَةٌ بِعُمُدٍ مُمَدَّةٍ" سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہم چرچا کرتے تھے کہ ان کو آگ کے ستونوں میں عذاب کیا جائے گا۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ امام ابوصالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قیود سے مراد گراں بار ہیں،[5] یعنی بھاری وزن۔

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں: "ویل" بہ معنی خزی و عذاب و ہلاکت ہے۔ یہ ان پر بددعا ہے۔ ﴿هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ کے بہت معنی کیے گئے ہیں، سب کا مرجع طعن و اظہارِ عیب کی طرف ہے۔ اس میں اقوال، افعال اور

---

① تفسیر الطبري (٢٤/٥٩٦-٥٩٨) تفسیر ابن کثیر (٤/٧١٠، ٧١١) ② تفسیر الطبري (٢٤/٥٩٨) تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٦٣)
③ تفسیر ابن کثیر (٤/٧١١) ④ تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٦٤) ⑤ تفسیر الطبري (٢٤/٦٠٠، ٦٠١) تفسیر ابن کثیر (٤/٧١١)

آوازوں وغیرہ کا نکالنا ہے جس سے لوگ خندہ زن ہوں یعنی ہنسی اڑائیں۔ آیت ہر اس شخص کو شامل ہے جس میں یہ اوصاف ہوں۔ اس کا کسی خاص سبب پر نازل ہونا اس سے مانع نہیں کہ اس کو عام لوگوں کے لیے سمجھا جائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس سے مراد چغل خور لوگوں کے اندر تفریق ڈالنے والا اور بھائیوں کو بھڑکانے والا ہے۔[1] مال کو نکرہ لائے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مراد وہ مال ہے جو فساد مچانے میں انتہا کو پہنچ گیا ہے۔ ایسے مال پر کوئی عقل مند کب فخر کر سکتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس مال کو زمانے کے حوادث اور مشکلات کے لیے گن کر رکھا ہے۔[2]

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ورثاء کے لیے رکھا ہے،[3] مراد مال کے جمع کرنے اور اس کو روکے رکھنے اور بھلائی کے کاموں میں خرچ نہ کرنے کی مذمت ہے۔ کیا وہ یہ سمجھا ہے کہ اس کا مال سدا اس کو باقی رکھے گا اور زندہ چھوڑ دے گا، وہ کبھی نہ مرے گا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مال اس کی عمر بڑھائے گا۔[4] بعض نے کہا ہے کہ اس میں عمل صالح کی طرف ترغیب ہے، یعنی مال سے عمر نہیں بڑھتی بلکہ عملِ صالح سے حیاتِ ابدی ملتی ہے۔ یہ مال تو اس کو جہنم میں لے جائے گا جس کو حطمہ کہتے ہیں۔ وہ حطمہ ایک آگ ہے اللہ کی دہکائی ہوئی جو دل پر چھا جاتی ہے۔ دل کا بالخصوص اس لیے ذکر کیا کہ یہ عقائدِ زائفہ اور نیاتِ خبیثہ اور برے اعمال کی منشا کی جگہ تھا۔ یا اس لیے کہ جب الم (تکلیف) دل تک پہنچ جاتا ہے تو دل والا مر جاتا ہے، کیوں کہ سارے جسم میں یہی دل سب سے زیادہ لطیف اور درد کو محسوس کرنے والا ہے۔ تھوڑی سی تکلیف پہنچتے ہی مر جاتا ہے اور وہ لوگ نہ مریں گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴾ [الأعلىٰ: ١٣] ''نہ وہ مرے گا نہ جیے گا (بلکہ حالتِ نزع میں پڑا رہے گا)۔''

بعض نے کہا ہے کہ تاکہ دل عذاب کی مقدار کو معلوم کرے۔ یہ آگ ان پر موندی جائے گی اور وہ ستونوں میں جکڑ بند ہوں گے۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دروازے ان پر بند کر دیے جائیں گے، پھر ان کو لوہے کی میخوں سے ٹھونک دیں گے نہ کوئی باہر آئے نہ کوئی وہاں جائے۔[5] ﴿ مُّمَدَّدَةٍ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ ستون چھوٹے نہ ہوں گے، بلکہ طویل ہوں گے یا ''عمد'' سے مراد اغلالِ جہنم ہیں یا قیود، یعنی جولان۔[6] واللّٰه أعلم.

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٦٣) [2] فتح القدير (٥/٦٦٤) [3] تفسير القرطبي (٢٠/١٨٣)
[4] تفسير القرطبي (٢٠/١٨٤) [5] تفسير البغوي (٨/٥٣١) [6] فتح البيان (١٥/٣٨١۔٣٨٥)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْفِيْلِ

اس سورت کی پانچ (۵) آیتیں ہیں۔ یہ بلا اختلاف مکہ میں نازل ہوئی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے۔[1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ﴿۱﴾ اَلَمْ
يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ﴿۲﴾ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ
طَيْرًا اَبَابِيْلَ ﴿۳﴾ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۴﴾ فَجَعَلَهُمْ
كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ﴿۵﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(اے نبی!) کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ ① کیا اس نے ان کی چال کو بیکار نہیں کر دیا؟ ② اور اس نے ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے ③ جو اُن پر کھنگر کی کنکریاں پھینک رہے تھے ④ پھر اللہ نے انھیں کھائے ہوئے بھوسے کی طرح کر دیا ⑤

بیت اللہ کو ڈھانے والوں کی بربادی اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش:

یمن کے ملک پر ایک مدت تک حبشی غالب رہے۔ دیکھا کہ سارے عرب کعبہ کا حج کرتے ہیں، چاہا کہ سب ہمارے پاس جمع ہوا کریں۔ کعبے کی طرح کا ایک کعبہ بنایا، دنیا کا تکلف کیا۔ یہاں سے زیادہ کوئی بھی زیارت کے لیے نہ آیا، جھنجھلا کر کعبہ شریف پر فوج سے چڑھائی کر دی اور اس کو گرانے کے لیے بہت سے ہاتھی لے کر آئے۔ راستے میں عرب کی کئی قوموں نے مزاحمت کی، سب کو مار کر آگے بڑھتے رہے، جب حرم کی حد میں پہنچے تو آسمان سے جانور آئے، سبز چڑیا کے برابر، تین تین کنکر لے کر، دو پنجوں میں اور ایک منہ میں اٹھائے ہوئے، لاکھوں کی تعداد

① الدر المنثور (۶۲۷/۸)

میں۔ وہ لگے پتھر مارنے، وہ کنکر ایسے چلتے تھے جیسے بندوق کی گولی، اگر پیٹھ میں لگا تو پیٹ سے نکلا، آدمی تو کیا چیز ہے ساری فوج میں سے ایک نہ بچا۔ اسی کے آخر میں نبی اکرم ﷺ پیدا ہوئے۔ انتھی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی ایک نعمت تھی جس کا احسان اللہ نے قریش پر رکھا کہ اصحابِ فیل کو جو کعبہ کو منہدم کرنے کی غرض سے چڑھائی کر کے آئے تھے اور چاہتے تھے کہ کعبہ کا نشان باقی نہ چھوڑیں، اللہ نے ان کو برباد کر دیا اور ان کی کوشش ناکام ہوگئی اور عمل اکارت کیا۔ وہ لوگ نصاریٰ تھے، ان کا دین اس وقت قریش کے حال کے قریب تھا جو بت پوجتے تھے۔ لیکن اللہ کی طرف سے یہ کارروائی بطور ارہاص وتوطیہ مبعثِ نبوی (نبی اکرم ﷺ کی جائے بعثت کو بچانے کی خاطر) ہوئی، کیوں کہ زیادہ مشہور اقوال کے مطابق نبی اکرم ﷺ اسی سال پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور فیصلے نے لسانِ حال سے کہا کہ اے قریش کی جماعت! تم کو دشمن کے لشکر پر یہ کامیابی تمھاری خیریت کی راہ سے نصیب نہیں ہوئی، بلکہ یہ کام بیتِ عتیق کی حفاظت اور اسے بچانے کے لیے ہوا جس کو ہم نبی امی محمد قرشی ۔صلوات اللّٰہ وسلامه علیه۔ کی بعثت سے مشرف کریں گے اور نمایاں وقار بخشیں گے اور وہ خاتم الانبیاء ہوں گے۔

قصہ اصحابِ فیل کا:

اصحابِ فیل کا قصہ مختصر طور پر اصحابِ اخدود کے قصے میں گزر چکا ہے۔ حمیر کا آخری بادشاہ ذونواس نام کا تھا، مشرک تھا، اسی نے اصحابِ اخدود کو قتل کیا تھا اور وہ لوگ نصاریٰ تھے، تقریباً بیس ہزار لوگ تھے، ان میں سے کوئی نہ بچا مگر دوس ذوثعلبان، وہ ملکِ شام کے بادشاہ قیصر کے پاس جا کر مستغیث ہوا، وہ نصرانی تھا، اس نے اس کی سفارش ملک حبشہ کے حاکم نجاشی کو لکھ دی، کیوں کہ وہ دوس سے بہت قریب تھا۔ اس نے دوس کے ہمراہ دو امیر روانہ کیے: ایک ارياط، دوسرے ابرہہ بن الصباح ابو یکسوم نام۔ وہ ایک بڑا لشکر لے کر چلا اور یمن میں آ کر گھروں کے اندر گھس گیا اور ملک کو حمیر سے نکال لیا۔

ذونواس اس دریا میں ڈوب کر مر گیا اور حبشہ ملکِ یمن کے مستقل بادشاہ ہو گئے، ان پر بھی دو امیر ارياط اور ابرہہ حاکم تھے، پھر ان کے آپس میں اختلافات ہو گئے، نوبت لڑنے مرنے پر آ گئی۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ ہر دو لشکروں کے آپس میں مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں تو ہمارے سامنے آ اور ہم تیرے سامنے آئیں، ہم میں سے جو دوسرے کو قتل کر ڈالے، وہی مستقل بادشاہ ہو۔ اس نے اس بات کو قبول کر لیا، دونوں میں لڑائی ہوئی، ہر ایک کے پیچھے ایک قناط تھی۔ ارياط نے ابرہہ پر حملہ کیا، ایک ایسی تلوار ماری جس سے اس کی بتیسی اور منہ اور چہرے پر زخم آیا۔ ابرہہ کے غلام عتودہ نے ارياط پر حملہ کر کے اس کو قتل کر ڈالا اور ابرہہ زخمی ہو کر پھر آیا، زخم کا علاج کیا، وہ اچھا ہو گیا۔ حبشہ کے لشکر کی مستقل تدبیر کی جگہ یمن ٹھہرا۔

نجاشی نے اس کو اس کے فعل پر بہت کچھ ملامت لکھی اور اس کو دھمکایا اور قسم اٹھائی کہ میں تیرے شہروں کو پامال کر دوں گا اور تیرا سر کاٹ دوں گا۔ ابرہہ نے اس کو خط لکھا اور بہت کچھ نرمی اور مصانعت (چاپلوسی) کی اور ایک قاصد ہدیے اور تحفے دے کر روانہ کیا اور یمن کی خاک جراب میں بھر کر اور اپنی پیشانی کے بال کاٹ کر بھیجے اور لکھ بھیجا کہ آپ اس جراب کو پامال فرما لیں اور قسم کو سچا کر لیں اور یہ میری چوٹی حاضر ہے، میں نے اس کو آپ کی خدمت میں روانہ کیا ہے۔ جب قاصد یہ سامان لے کر وہاں پہنچا تو بادشاہ خوش ہوا اور راضی ہو گیا اور ابرہہ کو بدستور اس کے کام پر مقرر رکھا۔

ابرہہ نے نجاشی کو کہلا بھیجا کہ میں یمن کی زمین میں ایک ایسا کنیسہ بناؤں گا جو بے مثل ہو گا، پھر صنعاء میں ایک کنیسہ ہائلہ (ہولناک، شدید) بنانا شروع کیا جو بہت بلند اور اس کا صحن چاروں طرف سے آراستہ تھا۔ عرب نے اس کا نام قلیس رکھا اس لیے کہ وہ بہت بلند تھا، جو کوئی اس کی طرف نظر کرتا تو قریب تھا کہ اس کی ٹوپی گر جائے اس کی بلندی کے سبب سے۔ پھر ابرہہ نے ارادہ کیا کہ عرب کے حج کو اس کنیسے کی طرف پھیر دے۔ جس طرح کہ لوگ مکہ میں کعبہ کا حج کرتے ہیں، اسی طرح اس جگہ کا حج کعبے کے بدلے میں کیا کریں۔

ساری مملکت میں اس کی منادی کرا دی، عربِ عدنان و قحطان کو یہ بات اچھی نہ لگی اور قریش نے اس بات پر انتہائی غم و غصہ کیا، یہاں تک کہ بعض نے رات کو جا کر اس قلیس میں حدث کر دیا اور پاخانہ کر دیا۔ جب سدنہ یعنی کنیسہ کے مجاوروں نے یہ حال دیکھا تو ابرہہ کو خبر دی اور کہا کہ یہ کام بعض قریش نے کیا ہے اپنے گھر (بیت اللہ) کے پیچھے غصے میں آ کر، کیوں کہ تم نے ان کے گھر جیسا دوسرا گھر بنایا ہے۔ ابرہہ نے قسم کھائی کہ میں مکہ میں جا کر ایک ایک پتھر کو اکھیڑ کر ویران کر دوں گا۔ امام مقاتل بن سلیمان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ جوانانِ قریش نے وہاں جا کر آگ لگا دی۔ اس دن تیز ہوا چلتی تھی، وہ کنیسہ جل کر زمین پر گر گیا۔ اس پر ابرہہ نے تیاری کی اور ایک بڑا لشکر لے کر چلا، تاکہ اس کو کوئی روک نہ سکے اور ایک بڑا قد آور ہاتھی کہ اس جیسا کسی نے دیکھا نہ ہو اپنے ساتھ لیا، اس کا نام محمود تھا۔ وہ ہاتھی حبشہ کے بادشاہ نے اس کو اسی کام کے لیے بھیجا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ آٹھ یا بارہ ہاتھی اور بھی تھے۔ واللہ أعلم.

مطلب یہ تھا کہ جا کر کعبہ کو ڈھا دیں۔ ڈھانے کی تجویز یہ تھی کہ بیتِ عتیق کے ارکان (ستونوں) کو زنجیر باندھ کر ہاتھی کے گلے میں ڈال دے، پھر ہاتھی کو ہانکے، تاکہ کعبہ کی دیوار یکبارگی گر پڑے۔ عرب نے جب سنا کہ وہ اس ارادے سے چلا ہے تو ان کو بڑا صدمہ ہوا اور یہ خیال کیا کہ ہم پر حق ہے کہ ہم کعبہ کو بچائیں اور جو کوئی اس کے ساتھ مکر کرنا چاہے اس کو رد کریں، تب ایک شخص جو اہلِ یمن کے اشراف میں سے تھا، جس کو ذونفر کہتے تھے اور وہ ملوکِ یمن میں سے تھا باہر نکلا اور تمام عرب کو جنگ کے لیے بلایا اور کہا کہ ابرہہ سے جہاد کرو، یہ بیت اللہ کو ڈھانا

چاہتا ہے اور مکہ کو ویران کرنا چاہتا ہے، ان لوگوں نے قبول کیا اور مقاتلہ سے پیش آئے۔

ابرہہ نے ان کو شکست دی، کیوں کہ اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ بیت اللہ کی کرامت اور عظمت کو ظاہر کرے۔ ذونفر گرفتار ہوگیا۔ ابرہہ نے اس کو اپنے ساتھ لیا اور آگے چلا۔ جب خثعم میں پہنچا تو نفیل بن حبیب اپنی قوم کے ساتھ سامنے آیا اور لڑائی کی۔ ابرہہ نے اس کو بھی شکست دی اور نفیل گرفتار ہوگیا۔ ابرہہ نے چاہا کہ اس کو قتل کر ڈالے، پھر قصور معاف کر کے اپنے ہمراہ لیا، تاکہ بلادِ حجاز کا دلیلِ راہ ہو۔ جب طائف کی سرزمین میں پہنچا تو یہاں کے ثقیف لوگ نکلے اور اپنے گھر کے ڈر سے جس کو لات کہتے تھے اس کے موافق ہو گئے۔ ابرہہ نے ان کی خاطر داری کی۔ انھوں نے ابو رغال کو ان کے ہمراہ راہنما کے طور پر کر دیا، پھر ابرہہ مغمس میں، جو مکہ کے قریب ہے، آ کر اترا اور اس کے لشکر نے اہلِ مکہ کے اونٹوں اور دوسرے چار پاؤں پر دستِ غارت گری دراز کیا۔ ان چرائی کے جانوروں میں سے عبد المطلب کے دو سو اونٹ بھی پکڑ لیے، جس نے یہ لوٹ ماری وہ ابرہہ کا امیر تھا جو لشکر کے مقدمے پر تھا، اس کو اسود بن مقصود کہتے تھے۔ بعض عرب نے اس کی ہجو کہی۔

پھر ابرہہ نے حناطہ حمیری کو مکہ کی طرف بھیجا اور حکم دیا کہ قریش میں جو شخص سب سے اشرف ہو اس کو لے آؤ، اس سے یہ بات کہو کہ بادشاہ تم سے لڑنے کو نہیں آیا، مگر اسی صورت میں وہ لڑے گا، اگر تم اس کو اللہ کے گھر سے روکو گے۔ حناطہ آیا، لوگوں نے اس کو عبد المطلب بن ہاشم کا پتا دیا۔ اس نے عبد المطلب کو ابرہہ کا پیغام دیا۔ عبدالمطلب نے کہا: واللہ! ہم بھی اس سے لڑنا نہیں چاہتے اور نہ ہم میں اس بات کی طاقت ہے، یہ اللہ کا گھر ہے حرمت والا اور اس کے خلیل ابراہیم علیہ السلام کا گھر ہے، سو اگر اللہ اس کو اس گھر سے منع کرے گا تو یہ اس کا گھر ہے اور حرم ہے اور اگر اس کو اپنے گھر کو مخلی کر دے گا (خالی کر دے گا) تو واللہ! ہمارے پاس اس سے بچانے والی چیز نہیں ہے۔

حناطہ نے کہا: تو پھر تم میرے ساتھ اس کے پاس چلو۔ جب یہ ابرہہ کے پاس گئے تو ان کی عزت اور قدر و منزلت کی۔ عبد المطلب ایک مردِ جسیم خوبصورت تھے، ابرہہ اپنے تخت سے اترا اور اُن کے ساتھ بساط پر بیٹھا اور اپنے ترجمان سے کہا کہ ان سے کہو: تمھارا کیا مطلب ہے؟ انھوں نے کہا: میرا مطلب یہ ہے کہ میرے دو سو اونٹ جو بادشاہ نے لے لیے ہیں، وہ مجھ کو واپس کر دیں۔ ابرہہ نے کہا کہ میں تم کو دیکھ کر خوش ہوا تھا، پھر جب تم نے بات کی تو مجھ کو تم میں بے رغبتی ہوئی، تم دو سو اونٹ کے پیچھے مجھ سے گفتگو کرتے ہو اور اس گھر کو جو تمھارا اور تمھارے آباء کا دین ہے چھوڑتے ہو، میں تو اس گھر کو گرانے آیا ہوں تم مجھ سے بات نہ کرو۔ عبد المطلب نے کہا: میں تو فقط اونٹ کا رب (مالک) ہوں۔

رہا گھر سو اس کا رب اور ہے، وہ اپنا گھر آپ بچائے گا۔ ابرہہ نے کہا: وہ مجھے نہیں روک سکتا۔ کہا: تم جانو۔

تمھارا کام جانے۔ بعض نے کہا: عبد المطلب کے ہمراہ اشراف عرب کی ایک جماعت گئی تھی۔ انھوں نے تہامہ (مکہ معظمہ کے نزدیک ایک مقام) کا ایک تہائی مال پیش کیا اور کہا کہ تم لوٹ جاؤ اور اس گھر سے تعرض نہ کرو۔ ابرہہ نے نہ مانا اور عبد المطلب کے اونٹ واپس کر دیے۔ وہ قریش کے پاس واپس آئے اور حکم دیا کہ مکہ سے نکل کر پہاڑوں میں جا کر پناہ پکڑیں، لشکر کی زیادتی کے خوف سے۔ پھر عبد المطلب نے کھڑے ہو کر کعبہ کے دروازے کو پکڑ کر قریش کے کچھ افراد کے ساتھ مل کر اللہ سے دعا کی اور ابرہہ اور اس کے لشکر پر مدد طلب کی اور کہا:

لَا هَمَّ إِنَّ الْمَرْءَ يَمْنَعُ رَحْلَهُ فَامْنَعْ حِلَالَكَ
لَا يَغْلِبَنَّ صَلِيْبُهُمْ وَمَحَالُهُمْ أَبَدًا مَحَالَكَ

''ہم بے فکر ہیں، ہر گھر والا اپنے گھر کا بچاؤ خود کرتا ہے۔ اے اللہ! تو بھی اپنے گھر کو دشمنوں سے بچا۔
ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ان کی صلیب اور ڈول تیرے ڈولوں پر غالب آئیں۔''

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پھر عبد المطلب حلقۂ باب کو چھوڑ کر پہاڑ کی چوٹی پر چلے گئے۔[1] امام مقاتل بن سلیمان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک سو اونٹنی خانہ کعبہ کے نزدیک چھوڑ گئے، وہ سب قلادہ دار تھیں (ان کے گلوں میں قلادے تھے) اس خیال سے کہ اگر لشکر والے ناحق ان کو لیں گے تو شاید اللہ ان سے انتقام لے۔ جب صبح ہوئی تو ابرہہ نے مکہ میں آنے کی تیاری کی اور فیل کو، جس کا نام محمود تھا، تیار کیا اور لشکر کو تیاری کا حکم دیا، جب ہاتھی کا منہ کعبے کی طرف کیا، نفیل بن حبیب نے ہاتھی کے پہلو میں کھڑے ہو کر اس کے کان پکڑ کر کہا: اے محمود! بیٹھ جا اور تو جہاں سے آیا ہے وہیں لوٹ کر چلا جا، کیوں کہ تو بلد الحرام میں ہے، پھر ہاتھی کا کان چھوڑ دیا، وہ بیٹھ گیا اور نفیل وہاں سے دوڑ کر ایک پہاڑ پر چڑھ گیا۔

فیل کو کتنا ہی مارتے تھے، وہ اٹھتا نہیں تھا، یہاں تک کہ زمین کا ایک ٹکڑا اس کے سر پر مارا اور اس کے گلے میں ایک آنکس لگائی، ان سے اس کو گھبرایا، تاکہ کھڑا ہو جائے وہ کھڑا نہ ہوا، پھر اس کو یمن کی طرف متوجہ کیا کہ وہ واپس ہو، وہ اٹھ کر تیز چلنے لگا، پھر اس کو شام کی طرف متوجہ کیا تو اس نے اسی طرح کیا، پھر اس کا منہ مشرق کی طرف کیا، تب بھی وہ چلنے لگا۔ جب مکہ کی طرف منہ پھیرا تو پھر بیٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے دریا کی طرف سے کچھ پرندے ابابیل اور بلسان کی طرح کے بھیجے ہر پرندے کے ساتھ تین تین کنکریاں تھیں: ایک چونچ میں اور دو دونوں پنجوں میں۔ وہ دانۂ نخود اور مسور کی طرح تھیں جس پر وہ کنکری گری وہ مر گیا، سب کو وہ کنکریاں نہیں لگیں، آخر کو بھاگ کر راستے کی طرف چل دیے اور نفیل کے متعلق پوچھنے لگے، تاکہ وہ رستہ بتائے۔ نفیل قریش کے ہمراہ پہاڑ کی چوٹی پر تھا، حجاز کے عرب لوگ وہ سزا دیکھ رہے جو اللہ تعالیٰ نے اصحابِ فیل پر اتاری۔ نفیل کہتا تھا:

[1] السيرة النبوية لابن هشام (١/١٧٠)

أَيْنَ الْمَفَرُّ وَالْإِلٰهُ الطَّالِبُ وَالْأَشْرَمُ الْمَغْلُوْبُ غَيْرُ الْغَالِبِ

''بھاگ نکلنے کی جگہ کہاں ہے؟ جب کہ اللہ تعالیٰ تعاقب میں ہے اور ابرہہ اشرم مغلوب ہو چکا، وہ کبھی غلبہ نہ پا سکے گا۔''

امام واقدی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ جب وہ حرم میں داخل ہونے سے تھک گئے اور ہاتھی کو تیار کیا تو تمام اطراف میں جس طرف اس کو لے جانا چاہتے تو وہ اس راستے پر چلتا اور جب اس کا منہ حرم کی طرف کرتا تو بیٹھ جاتا اور چلاتا۔ ابرہہ فیلبان پر خفا ہوتا اور اس کو مارتا اور کہتا: تو اس کو زبردستی سے لے چل اور حرم میں داخل کر، اس میں بہت دیر ہوئی، اور عبدالمطلب اشرافِ مکہ کی جماعت کے ساتھ جن میں مطعم بن عدی اور عمرو بن عائذ و مسعود بن عمرو ثقفی بھی تھے، کوہِ حرا پر بیٹھے ہوئے دیکھ رہے تھے کہ حبشہ کیا کرتے ہیں اور اس ہاتھی کا انجام کیا ہوتا ہے، کیوں کہ یہ ایک بہت ہی عجیب وغریب معاملہ تھا۔ اس دوران میں اللہ تعالیٰ نے ﴿طَيْرًا أَبَابِيْلَ﴾ کو بھیجا، وہ زرد رنگ کے پرندے تھے جھنڈ کے جھنڈ کبوتر سے چھوٹے اور اُن کے پاؤں لال تھے۔ ہر پرندے کے ساتھ تین کنکر تھے، ان پرندوں نے آکر لشکر کا حلقہ کر لیا اور وہ کنکر چھوڑنے شروع کیے، وہ سب لوگ ہلاک ہو گئے۔

امام محمد بن کعب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دو فیل لائے تھے، محمود تو بیٹھ گیا اور دوسرے نے شجاعت کی وہ کنکر سے ہلاک ہوا۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا: ابرہہ کے ہمراہ ایک ہاتھی تھا، وہ خاص بادشاہ کی سواری کے لیے تھا، وہ بیٹھ گیا، تاکہ دوسرے ہاتھی اس کی اقتدا کریں، ان میں سے ایک ہاتھی نے بہادری کی، اس پر کنکری گری، باقی ہاتھی بھاگ گئے۔ امام عطاء بن یسار رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا: اس ساعتِ راہنہ (اس وقت کی گھڑی) میں سب کو عذاب نہیں پہنچا، بلکہ بعض جلدی ہلاک ہوئے اور بعض کا ایک ایک عضو ساقط ہونے لگا، وہ بھاگنے لگے۔ ابرہہ انہیں میں تھا جن کا عضو عضو ساقط ہونے لگا تھا، یہاں تک کہ بلادِ خثعم میں پہنچ کر مر گیا۔

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ وہاں سے نکلے اور راہ میں گرتے جاتے اور ہر منہل (چشمہ، گھاٹ) پر ہلاک ہوتے۔ ابرہہ کے بدن پر آفت آئی، وہ اس کو لے کر چلا، اس کی ایک ایک پور گرتی جاتی تھی۔ جب صنعاء میں پہنچے تو ابرہہ پرندے کے اس چوزے کی طرح ہو گیا جس کے بال و پر گر چکے ہوں، پھر وہ نہ مرا، یہاں تک کہ اس کا سینہ دل تک پھٹ گیا، لوگوں کا یہی اعتقاد ہے۔ امام مقاتل بن سلیمان رحمہ اللہ نے کہا: قریش نے ان کا بہت سا مال چھین لیا اور ان کے پاس جو کچھ تھا وہ لے لیا۔ عبدالمطلب نے اس دن ایک گھڑا بھر کے سونا پایا۔[1] یعقوب بن عتبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اسی سال عرب میں چیچک دکھائی دی اور حرمل اور حنظل کے درخت نظر آئے۔[2] اسی طرح عکرمہ رحمہ اللہ سے بطریق جید مروی ہے۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: اللہ نے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث

[1] تفسير ابن كثير (٤/ ٧١٤، ٧١٥) [2] تفسير الطبري (٢٤/ ٦١٤، ٦١٥)

کیا تو جو نعمتیں قریش پر گنیں ان میں سے ایک نعمت یہ بھی گنی کہ حبشہ کو ان سے پھیر دیا، تا کہ قریش کی مدت کو بقا ہو۔ لہٰذا ﴿ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ﴾ مع ﴿ لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ ﴾ تا قولہ: ﴿ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ ﴾ نازل فرمائی کہ کوئی شے قریش کے احوال سے تبدیل نہ ہو، کیوں کہ ان کے ساتھ اللہ کا ارادہ خیر کا تھا، اگر وہ اس کو قبول کر لیں۔

ابن ہشام نے کہا ہے کہ ابابیل سے مراد جماعات (جھنڈ) ہیں۔ عرب نے اس کا واحد نہیں بولا۔ عرب کے نزدیک ﴿ سِجِّيلٍ ﴾ شدید اور سخت شے کو کہتے ہیں۔ یہی قول یونس نحوی اور امام ابو عبیدہ رحمہ اللہ کا ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ دو کلمے فارسی کے ہیں، عرب نے ان کو ایک کلمہ کر لیا ہے یعنی اصل میں سنگ وگل ہے۔ سنگ پتھر کو کہتے ہیں اور گل مٹی کو۔ وہ کنکر انھی دو جنس کا تھا یعنی پتھر اور مٹی کا۔ عصف برگِ کشت کو کہتے ہیں جو کاٹا نہ گیا ہو، اس کا واحد عصفہ ہے۔ عبد الرحمان نے کہا: ابابیل سے مراد فِرق (فرقے، ٹکڑے) ہیں۔[1]

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابابیل وہ پرندے ہیں کہ بعض بعض کے پیچھے ہوں۔ امام حسن بصری اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ أَبَابِيلَ ﴾ کے معنی کثیرہ ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ أَبَابِيلَ ﴾ متتابع مجتمع (جھنڈ کے جھنڈ ایک دوسرے کے پیچھے) کو کہتے ہیں۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مختلفہ کو، کوئی ادھر سے آئے اور کوئی ادھر سے، یعنی وہ پرندے ہر طرف سے ان پر آئے۔ بعض نحویوں نے کہا ہے کہ ﴿ أَبَابِيلَ ﴾ کا واحد "أبیل" ہے۔ اسحاق بن حارث نے کہا ہے کہ ﴿ أَبَابِيلَ ﴾ سے مراد "أقاطیع" ہے، جیسے: ابل مؤبلہ۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان کی سونڈ تھی جیسے خرطومِ طیر اور کفِ دست (ہتھیلی) ایسی تھی جیسے کتے کی ہتھیلی۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ سبز پرندے تھے، دریا سے آئے، ان کے سر ایسے تھے جیسے درندوں کے سر۔ عبید بن عمیر نے کہا ہے کہ کالے پرندے دریائی تھے، ان کی چونچ اور ناخن میں کنکر تھے، یہ سب اسانید صحیح ہیں۔

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ سبز پرندے تھے، ان کی چونچیں زرد تھیں، وہ اس لشکر پر آتے جاتے تھے۔[2] عبید بن عمیر رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ جب اللہ نے ہاتھی والوں کو ہلاک کرنا چاہا تو دریا کی طرف سے کچھ پرندے پیدا کر کے بھیجے، جیسے: خطاطیف (ابابیل کی قسم کا ایک جانور)۔ ہر پرندہ تین تین کنکریاں لے کر آیا، ایک چونچ میں دو پنجوں میں اور لشکر کے سر پر صف سی باندھی، پھر چیخ کر وہ کنکری ڈال دی۔ جس شخص کے سر پر گرتی اس کی دبر سے نکل جاتی اور جس بدن پر گرتی دوسری جانب سے پار ہو جاتی، پھر ایک سخت ہوا چلی جس سے وہ کنکریاں اور سخت ہو کر لگیں، سب کے سب ہلاک ہو گئے۔[3] سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ سِجِّيلٍ ﴾ سے مراد پتھریلی مٹی ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: عصفِ مأکول سے مراد تبن ہے جس کو عام زبان میں ہبور کہتے ہیں، یعنی گھاس پھوس

---

[1] تفسیر ابن کثیر (٤/٧١٥)
[2] تفسیر الطبري (٢٤/٦٠٦، ٦٠٧)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (١٠/٣٤٦٦)
[4] تفسیر الطبري (٢٤/٦٠٨)

کا کچرا۔ دوسرا مفہوم ہے کہ گیہوں کا بھس۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عصف گھاس ہوئی اور ماکول قصیل جس کو چوپایوں کے لیے قطع کرتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ عصف دانے کے چھلکے کو کہتے ہیں جیسے گندم کی بھوسی۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عصف برگِ کشت اور برگِ بقل ہوا جبکہ چوپائے اس کو کھالیں پھر وہ کچرا ہو جاتا ہے۔[1] مطلب یہ ٹھہرا کہ اللہ نے ان کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان کا مکر و غیظ انہیں پر الٹ پڑا: ﴿ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ﴾ [الفاطر: ٤٣] ''اور بری تدبیروں کا وبال ان تدبیر والوں ہی پر پڑتا ہے۔'' وہ کسی خیر کو نہ پہنچے عموماً ہلاک ہو گئے۔ کوئی مخبر ان سے واپس نہ پھرا مگر زخمی ہو کر۔ خود ابرہہ کا سینہ دل تک پھٹ گیا جب وہ لوٹ کر صنعا میں داخل ہوا، اس نے سب سے یہ حال بیان کیا، پھر مر گیا اس کے بعد اس کی جگہ پر اس کا بیٹا یکسوم بیٹھا، پھر اس کا بھائی مسروق بن ابرہہ، پھر سیف بن ذی یزن۔ حمیری نے کسریٰ کے پاس جا کر حبشہ کا استغاثہ کیا۔ کسریٰ نے اس کے ساتھ ایک لشکر کر دیا، حبشہ سے لڑائی ہوئی، اللہ نے عرب کا ملک عرب کو دلا دیا جو اُن کے آباء میں چلا آتا تھا۔ عرب کے وفود اس کے پاس مبارک دینے کے لیے آئے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے مکہ میں ہاتھی کے قائد اور سائیس کو دیکھا، دونوں اندھے اپاہج تھے، لوگوں سے روٹی مانگتے تھے۔[2] (رواہ ابن اسحاق و الواقدي)۔

اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ دونوں مقعد (بیٹھے رہنے والے) تھے۔ اساف اور نائلہ کے نزدیک لوگوں سے بھیک مانگتے تھے جہاں مشرک لوگ ذبیحہ کرتے تھے۔ فیل کا قائد یعنی فیلبان کا نام انیس تھا۔ حافظ ابونعیم رحمہ اللہ نے کتاب ''دلائل النبوۃ'' میں اصحابِ فیل کا قصہ عثمان بن مغیرہ سے روایت کیا ہے، لیکن یہ ذکر نہیں کیا کہ ابرہہ یمن سے اس جگہ آیا ہو، بلکہ سالارِ لشکر شمس بن مقصود نام کا تھا اور سارے لشکر میں بیس ہزار افراد تھے اور یہ ذکر کیا ہے کہ وہ پرندے رات کو اُن پر آ پڑے، صبح کو لشکر افتادہ ہو گیا، لیکن یہ سیاق نہایت غریب ہے، اگرچہ ابونعیم نے غیر پر اس کی قوت اور رجحان دیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ابرہہ اشرم حبشی خود مکہ میں آیا تھا، چنانچہ سیاقات اور اشعارِ مذکور اس پر دلیل ہیں۔ عروہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابرہہ نے اسود بن مقصود کو لشکر کا سردار بنا کر ہاتھی کے ساتھ بھیجا تھا، خود اس کے آنے کا ذکر نہیں کیا، لیکن صحیح یہی ہے کہ وہ خود آیا تھا اور شاید ابن مقصود مقدمہ جیش پر سردار تھا۔ واللہ أعلم.

پھر ابن اسحاق رحمہ اللہ نے اصحابِ فیل کے قصے میں عرب کے اشعار کا ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اشعارِ مذکور نقل کیے ہیں۔[3] سورۃ الفتح کی تفسیر میں گزر چکا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب حدیبیہ کے دن اس گھاٹی پر پہنچے جدھر سے قریش پر مبوط ہوتا تھا تو آپ کا ناقہ بیٹھ گیا، اس کو کتنا ہی زجر کیا وہ نہ اٹھا۔ لوگوں نے کہا کہ قصواء نے

---

[1] تفسیر الطبري (٦١٦/٢٤) تفسیر ابن کثیر (٧١٦/٤) [2] السیرۃ النبویۃ لابن ھشام (١٧٦/١)

[3] تفسیر ابن کثیر (٧١٦/٤، ٧١٧)

سرکشی کی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اس نے نہ سرکشی کی ہے اور نہ یہ اس کی عادت ہے، اس کو حابسِ فیل (ہاتھی کو روکنے والا) نے روکا ہے۔ پھر فرمایا: اس کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! آج کے دن یہ لوگ مجھ سے کوئی ایسی چیز نہ مانگیں گے جس میں اللہ کی حرمات کی تعظیم کریں لیکن میں وہ ان کو دوں گا۔ پھر ناقہ کو زجر کیا، وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔[1] یہ حدیث بخاری کے افراد میں سے ہے۔ صحیحین میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا: اللہ پاک نے مکہ سے ہاتھی کو روکا اور اپنے رسول اور مومنوں کو ان پر مسلط کیا۔ آج کے دن اس کی حرمت اسی طرح پر عود کر آئی جس طرح کہ اس روز تھی، اب یہ بات حاضر شخص غائب کو پہنچا دے۔[2]

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ اس جگہ ﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ﴾ سے مراد رویتِ قلب ہے، یعنی علم۔ اس لیے کہ یہ علم ضروری قوت وجلاء میں مشاہدہ اور واضح ہونے کے برابر ہے۔ امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی کیا تو نے یہ خبر نہیں سنی۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ کیا تجھے معلوم نہیں۔[3] یہ اللہ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کے لیے اللہ کے فعل پر اظہارِ تعجب ہے کہ ہم نے اصحابِ فیل کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ مراد حبشہ ہیں جو خانہ کعبہ کو ویران کرنے کے ارادے سے آئے تھے۔ یہ نبی اکرم ﷺ کو یا ہر اس شخص کو خطاب ہے جو خطاب کے لائق ہو، یعنی اے محمد! تم یا یہ لوگ جو تمھارے زمانے میں موجود ہیں اور جو اُن کے بعد ہوں گے، وہ اخبارِ متواترہ سے فیل والوں کی داستان جانتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے ان کے ساتھ کیا اس کو پہچانتے ہیں۔ پھر اے لوگو! تم کو کیا ہوا ہے جو تم ایمان نہیں لاتے ہو۔ صاحبِ افیال یمن کا بادشاہ ابرہہ تھا، اس کا نام اشرم تھا، اس لیے کہ اس کے باپ نے اس کو حربہ (لڑائی کا ہتھیار) سے مارا تھا، اس کے ناک اور جبین پر زخم کا اثر تھا۔

ابرہہ ہر سفید رو کا لقب ہے، وہ نصرانی تھا۔ یہ سب تیرہ ہاتھی تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہاتھی والے صفاح میں آ کر اترے۔ عبدالمطلب نے ان سے جا کر کہا کہ یہ اس کا گھر ہے اس پر کوئی مسلط نہ ہوگا۔ انھوں نے کہا: ہم جب تک اس کو ڈھا نہ لیں گے تب تک یہاں سے نہ جائیں گے۔ ہاتھی کو جتنا آگے بڑھاتے تھے اتنا ہی پیچھے کو ہٹتا تھا۔ اللہ نے طیر ابابیل کو بلایا اور ان کو کالے کنکر، جن پر مٹی لگی تھی، دیے۔ انھوں نے اصحافِ فیل کے مقابلے میں آ کر وہ کنکر پھینک مارے، کوئی شخص نہ بچا مگر اس کو خارش ہو گئی جو کوئی اپنے بدن پر خارش کرتا وہاں کا گوشت گل کر گر جاتا۔[4] (أخرجه ابن المنذر و عبد بن حمید أبو نعيم و البيهقي)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا ہم نے ان کو ان کے اس مکر اور جدوجہد میں، جو وہ کعبہ شریف کو برباد کرنے اور

---

[1] صحیح البخاري (۲۵۸۱) [2] صحیح البخاري (۱۱۲) صحیح مسلم (۱۳۵۵) تفسیر ابن کثیر (۷۱۱/٤-۷۱۷)

[3] فتح القدیر (٦٦٦/٥) [4] دلائل النبوة للبیهقي (۱۲٤/۱)

منہدم کرنے میں کر رہے تھے اور اہلِ مکہ کو لوٹنا اور برباد کرنا چاہتے تھے، اس میں ان کو ہلاک و برباد نہیں کر دیا۔ وہ کعبہ تک نہ پہنچ سکے اور نہ ان کا ارادہ پورا ہوا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب ہاتھی والے مکہ کے نزدیک ہوئے، عبد المطلب نے ان کا استقبال کیا اور اُن کے بادشاہ سے کہا: تم یہاں کس لیے آئے ہو؟ تم کسی کو ہمارے پاس بھیج دیتے، ہم تم کو ہر چیز دے دیتے۔ اس نے کہا: مجھے یہ خبر ملی ہے کہ جو کوئی اس گھر میں آتا ہے وہ امن میں ہو جاتا ہے، میں اس جگہ کے لوگوں کو ڈرانے آیا ہوں۔ کہا: ہم تم کو یہاں کی ہر شے لا دیتے ہیں، تم اس کو لے لو اور چلے جاؤ۔ اس نے سوائے مکہ میں داخل ہونے کے اور کچھ نہ مانا اور ذرا سا مکہ کی طرف چلا۔ عبدالمطلب ایک پہاڑ پر پیچھے ٹھہر گئے اور کہا: میں اس گھر کا اور گھروں والوں کا ہلاک ہونا نہیں دیکھوں گا۔ اتنے میں دریا کی طرف سے ایک بادل کے ٹکڑے کی طرح کا دَل آیا اور ان پر سایہ کیا، وہ طیر ابابیل تھے، انھوں نے کنکر مار کر سب کو ادھیڑ دیا۔ فیل چلانے لگا، وہ سب بھس کی طرح ہو گئے۔[1] (أخرجه البيهقي و ابن المنذر و الحاكم وغيرهم)

"طیر" اسمِ جنس ہے۔ ﴿ اَبَابِيْلَ ﴾ سے مراد قطع قطع ہے یعنی پرے کے پرے اونٹوں کی قطار کی طرح آنے لگے۔ لشکر والے بھاگ کھڑے ہوئے۔ عرفہ کے قریب سب ہلاک ہو گئے اس سے قبل کہ حرم میں قدم رکھیں۔ یہی زیادہ صحیح ہے۔ ایک جماعت نے کہا ہے کہ مزدلفہ و منیٰ کے درمیان وادیِ محسر میں تباہ ہوئے۔ (قاله ابن حجر)

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ آسمانی پرندے تھے، نہ اس واقعہ سے پہلے دکھائی دیے نہ بعد میں۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کالی چڑیاں تھیں، دریا کی طرف سے فوج فوج ہو کر آئیں جس کو ان کا کنکر لگا، وہ بھسم ہو گا۔[3] بعض نے کہا ہے کہ وہ عنقائے مغرب تھا جو ضرب المثل ہے لیکن عرب ابابیل کا استعمال طیر میں کرتے ہیں اور طیر کے علاوہ بھی بولتے ہیں۔ پھر جب وہ سب برباد ہو چکے تو وہ طیر جہاں سے آئے تھے، اسی طرف چلے گئے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ سِجِّيْلٍ ﴾ "سجل" سے مشتق ہے، یعنی وہ عذاب ان پر مسجل ہو چکا تھا اور لکھا جا چکا تھا۔ صحاح میں کہا ہے: یہ مٹی کا ایک کنکر تھا جو جہنم کی آگ میں پختہ کیا گیا تھا، اس پر ہر ایک شخص کا نام لکھا تھا۔ لفظ کا اصل سنگ اور گِل ہے۔ یا ﴿ سِجِّيْلٍ ﴾ بہ معنی شدید ہے۔ ابن ابزیٰ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہی پتھر ہے جو آسمان سے قومِ لوط علیہ السلام پر برسے تھے۔[4] یا سجین کے سنگ ریزے تھے، یعنی جہنم سے آئے تھے جس کو وہ کنکر لگا اس کو چیچک نکل آئی، سارے بدن پر آبلے پڑ گئے، وہ مسور کے دانے سے بڑا اور چنے کے برابر تھا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بندوق یعنی گلولہ کی طرح تھا۔ آسمان سے آ کر لشکر کو گھیر لیا اور وہ سنگ ریزے چھوڑ دیے۔ لشکر کے آگے تجاوز نہ کیا[5] یعنی لشکر کے علاوہ کسی اور پر نہیں پھینکے۔ سارے ہاتھی والے کچرے

---

[1] دلائل النبوة للبيهقي (١/١٢١، ١٢٢) مستدرك الحاكم (٢/٥٨٣) [2] تفسير القرطبي (٢٠/١٩٦)
[3] تفسير البغوي (٨/٥٤١) [4] فتح القدير (٥/٦٦٧) [5] الدر المنثور (٨/٦٣١، ٦٣٢)

کی طرح ہو گئے یعنی پامال کیے ہوئے چارے یا لید یا بھس کی طرح ہو گئے جس کو جانور کھا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت فیل کے سال میں ہوئی۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ واقعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پچاس دن پہلے ہوا۔[2] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی قول زیادہ صحیح ہے، اسی فیل کے سال کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی تاریخ کہتے ہیں۔[3] قیس بن مخرمہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں فیل کے سال میں پیدا ہوئے۔[4] بعض نے کہا ہے کہ عامِ فیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے چالیس سال پہلے تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ ۲۳ سال پہلے۔[5]

---

[1] مستدرك الحاكم (٢/٦٥٨) [2] تفسير القرطبي (٢٠/١٩٤) [3] تفسير الخازن (٧/٢٩٥)
[4] سنن الترمذي (٣٦١٩) [5] فتح البيان (١٥/٣٨٩_٣٩٣)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوْرَةُ قُرَيْشٍ

اس کو سورت لإیلاف بھی کہتے ہیں۔ اس کی چار (۴) آیتیں ہیں۔ جمہور کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ امام ضحاک اور کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مدنی ہے[1] لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مکہ میں اتری ہے۔[2]

قریش کے فضائل میں سے ایک ان کے نام پر سورت قریش:

ام ہانی رضی اللہ عنہا بنت ابی طالب نے کہا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے قریش کو سات فضیلتیں دیں جو ان سے پہلے کسی کو نہیں دیں اور نہ کسی کو اُن کے بعد دے گا: نبوت، خلافت، حجابت، سقایت، فیل پر نصرت، ہفت یا دہ سالہ عبادت، جن میں ان کے سوا کسی نے اللہ کی عبادت نہیں کی، قرآن کی ایک سورت کا خاص ان کے حق میں نزول، جس میں کسی غیر کا کچھ ذکر نہیں ہے، یعنی ﴿لِإِيْلٰفِ قُرَيْشٍ﴾[3] (أخرجه البخاري في تاريخه والطبراني والحاكم وصححه و ابن مردويه والبيهقي)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے[4] لیکن سیدنا زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس کی شاہد ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے قریش کو سات خصال میں فضیلت دی ہے: ایک یہ کہ انھوں نے اللہ کی دس برس عبادت کی کہ اس دوران میں سوائے قریش کے کسی نے اللہ کو نہ پوجا اور مدد کی ان کی فیل کے دن اور وہ مشرک تھے اور ان کے بارے میں قرآن کی ایک سورت اتاری جس میں سارے جہاں میں سے کسی اور کو شریک نہ کیا اور ان میں نبوت اور خلافت و سقایت رکھی۔[5] (رواه الطبراني وابن مردويه وابن عساكر والخطيب في تاريخه عن ابن المسيب مرفوعاً وهو مرسل)

---

(1) تفسير القرطبي (۲۲۰/۲۰) (2) الدر المنثور (۶۳۴/۸) (3) مستدرك الحاكم (۵۸۴/۲) السلسلة الصحيحة (۱۹۳۳)
(4) تفسير ابن كثير (۷۱۸،۷۱۷/۴) (5) المعجم الأوسط (۷۶/۹) الدر المنثور (۶۳۵/۸) ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ۝۱ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۝۲ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝۳ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۝۴

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

قریش کے مانوس ہونے کی وجہ سے ① (یعنی) ان کے سردی اور گرمی کے سفر سے مانوس ہونے کی وجہ سے ② لہٰذا انھیں چاہیے کہ وہ اس گھر (کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں ③ جس نے انھیں بھوک میں کھانا کھلایا اور اُنھیں خوف سے امن دیا ④

نبی اکرم ﷺ سے بارھویں پشت میں ایک شخص نضر بن کنانہ تھا اس کی اولاد قریش ہیں، سب مکے میں جمع تھے، عرب لوگ جو حج کے لیے آتے ان کی دیکھ بھال کرتے، کعبہ کے خادم تھے۔ جب قریش ان عربوں کے گھر جاتے تو وہ ان کی عزت کرتے اور حسنِ سلوک کرتے، یہی ان کا معاش تھا۔ جاڑے میں یمن کو جاتے اور گرمی میں شام کی طرف جاتے اور آپس میں دشمنی سے لڑتے۔ حرم کے ادب کی وجہ سے قریش پر کوئی چور اور ڈاکو نہ آتا۔ فرمایا کہ اس گھر کی طفیل تم کو روزی ہے اور امن ہے اور تم اس گھر والے کی عبادت نہیں کرتے ناشکرے ہو۔

کیا یہ سورت پہلی سورت سے جدا ہے؟

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ سورت اپنے سے پہلی سورت سے جدا ہے۔ مصحفِ امام میں دونوں سورتوں کے درمیان ایک سطر بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لکھی ہے، اگرچہ متعلق ماقبل ہے۔ ابن اسحاق اور ابن زید رحمہما اللہ نے اس کی تصریح کی ہے۔

قریش کن ملکوں سے مانوس تھے:

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے فیل کو مکہ سے روکا اور اہلِ فیل کو قریش کے ائتلاف و اجتماع کے لیے (یعنی ان میں الفت ڈالنے کے لیے اور انھیں اکٹھا کرنے کے لیے) ہلاک کر دیا، تاکہ اپنے شہر میں امن و امان سے رہیں۔ یا مراد زمستان کی رحلت یمن کی طرف اور تابستان کی رحلت شام کی طرف ہے۔ تجارت کے سلسلے میں کہ سوداگری کے لیے وہاں جاتے، پھر صحیح سلامت اپنے شہر میں آ جاتے، کیوں کہ لوگ ان کی عزت و آبرو کرتے تھے اور ان کو اللہ کے حرم کا ساکن سمجھتے تھے، اس لیے جو کوئی ان کو پہچانتا تھا، وہ ان کا احترام کرتا تھا، بلکہ اگر کوئی اور بھی ان کے ساتھ

شامل ہو جاتا تو وہ بھی سفر اور رحلت میں امن سے رہتا۔ اب رہا شہر مکہ میں ان کی اقامت کا زمانہ تو اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں فرماتا ہے: ﴿ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ﴾ [العنكبوت: ٦٧] ”کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم کو با امن بنا دیا ہے حالاں کہ ان کے اردگرد سے لوگ اچک لیے جاتے ہیں۔“ لہٰذا فرمایا: ﴿ لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ﴾

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ لام لامِ تعجب ہے، گویا یہ کہا کہ ایلافِ قریش سے تعجب کرو کہ ہم نے الفت کی یہ نعمت کس طرح سے ان کو عطا فرمائی۔ مسلمین کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ دو سورتیں جدا اور مستقل ہیں۔[1] پھر ان کو شکر کرنے کا راستہ سمجھایا کہ اس گھر کے رب کی عبادت کرو۔ اس سے مراد توحیدِ خالص ہے عبادت کے ساتھ جس طرح کہ ہم نے اُن کے لیے حرم کو امن دینے والا اور عزت والا گھر مقرر کر دیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ۫ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴾ [النمل: ٩١] ”مجھے تو بس یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے پروردگار کی عبادت کرتا رہوں جس نے اسے حرمت والا بنایا ہے، جس کی ملکیت ہر چیز ہے اور مجھے یہ بھی فرمایا گیا کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہو جاؤں۔“

پھر فرمایا: ہم نے ان پر امن اور کھانا دے کر اپنا فضل و کرم کیا۔ اب ان کو چاہیے کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کریں اور اس کے سوا کسی بت و شریک و آستانے کو نہ پوجیں۔ لہٰذا جس نے اللہ کی یہ بات مان لی، اللہ نے اس کے لیے دنیا اور آخرت میں امن جمع کر دیا اور جس نے یہ بات نہ مانی اس سے ان دونوں کو، یعنی دنیا کو اور آخرت کے امن کو سلب کر لیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾ [النحل: ١١٢- ١١٣] ”اللہ تعالیٰ اس بستی کی مثال بیان فرماتا ہے جو پورے امن و اطمینان سے تھی اس کی روزی اس کے پاس ہر جگہ سے بافراغت چلی آ رہی تھی۔ پھر اس نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا کفر کیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے بھوک اور ڈر کا مزہ چکھایا جو ان کے کرتوتوں کا بدلہ تھا۔ ان کے پاس انہی میں سے رسول پہنچا پھر بھی انھوں نے اس کو جھٹلایا، پس انھیں عذاب نے آ دبوچا اور وہ تھے ہی ظالم۔“ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا: « وَيْلٌ لَكُمْ قُرَيْشٍ لِإِيْلَافِ قُرَيْشٍ »[2] (رواه ابن أبي حاتم)۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ «وَيْحَكُمْ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ اُعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ » (رواه ابن أبي حاتم)۔ لیکن صحیح بات اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کی ہے نہ کہ اسامہ بن زید کی۔[3]

---

[1] تفسير الطبري (٦٢١/٢٤) [2] المعجم الكبير (١٧٧/٢٤) [3] تفسير ابن كثير (٧١٨/٤، ٧١٩)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿ لِاِیْلٰفِ ﴾ کا لام پہلی سورت کے آخری حصے کے متعلق ہے۔ گویا اللہ نے یہ فرمایا: "أَهْلَكْتُ أَصْحَابَ الْفِيْلِ لِأَجْلِ تَأَلُّفِ قُرَيْشٍ" امام فراء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سورت پہلی سورت سے متصل ہے، اس لیے کہ اللہ نے حبشہ کے فعل کے متعلق اپنی نعمت کا قریش پر ذکر کرنے کے بعد ﴿ لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ ﴾ کہا، یعنی یہ کام جو ہم نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا، یہ قریش پر ہماری ایک نعمت ہے کہ وہ تجارت کے لیے نکلتے تھے تو اُن کو کوئی لوٹتا نہیں تھا، اس لیے کہ ان کو اہلِ بیت اللہ جانتے تھے۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے بھی یہی ذکر کیا ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ہم نے ان کو کچرا کر ڈالا تالیفِ قریش کے لیے۔ اسی وجہ سے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اس سورت کو اور سورت فیل کو ایک ٹھہرایا ہے، ان میں کوئی فاصلہ نہیں رکھا اور بسم اللہ نہیں لکھی۔[1] لیکن جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم وغیرہم نے ایسا نہیں کیا۔ اس سورت کا سورۃ الفیل سے انفصال (جدا کرنا) مستفیض اور مشہور ہے۔ کشاف میں کہا ہے کہ یہ لام "لیعبدوا" سے متعلق ہے۔[2] کشاف سے پہلے یہ بات خلیل بن احمد کہہ چکے ہیں، یعنی اگر وہ اللہ کی تمام نعمتوں کی وجہ سے اللہ کی عبادت نہیں کرتے تو اسی نعمتِ جلیل کے سبب سے اس کی عبادت کریں۔

امام کسائی اور اخفش رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہ لام تعجب کا ہے، یعنی ایلافِ قریش سے تعجب کرو۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ لام بہ معنی "إِلیٰ" ہے اور ایک قراءت میں بہ فتحِ لام ہے اور اسی طرح عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ہے، اس بنا پر کہ لام امر ہے[3] اور یہ لغتِ مشہور ہے۔ قریش نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر کی اولاد کو کہتے ہیں۔ جو شخص نضر کی اولاد میں ہے وہ قرشی ہے اور بعض نے کہا ہے کہ فہر بن مالک بن نضر کی اولاد ہے۔ لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔

رحلت سے مراد یمن اور شام کی طرف سفر کرنا ہے۔ جاڑوں میں یمن کو جاتے، اس لیے کہ وہ سفر کے لیے گرم ملک ہے اور گرمی میں شام کی طرف کوچ کرتے، اس لیے کہ وہ سفر کے لیے سرد ملک ہے۔ یہ بھی مروی ہے کہ جاڑوں میں مکہ کے اندر رہتے اور گرمی میں طائف کو جاتے مگر پہلی بات زیادہ بہتر ہے۔ قریش کا جاہلیت اور اسلام میں تجارت کے لیے سفر کے لیے کوچ کرنا مشہور ہے۔

امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قریش کی زندگی تجارت پر تھی، وہ سال میں دو سفر کرتے: ایک سردی میں، دوسرا گرمی میں۔ اگر یہ سفر نہ ہوتا تو مکہ میں مقام نہ کر سکتے اور اگر امن نہ ہوتا تو تصرف پر قدرت نہ رکھتے۔[4] سب

---

(1) تفسیر القرطبي (۲۰/۲۰۰) (2) فتح القدير (٥/٦٦٩، ٦٧٠)

(3) تفسیر القرطبي (۲۰/۲۰۱، ۲۰۲) (4) فتح القدير (٥/٦٧١)

سے پہلے جس نے یہ کوچ کرنا نکالا، وہ ہاشم بن عبد مناف تھا۔ یا وہ اس حکم کے سبب سے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کرو نہ کہ کسی اور کی، کیوں کہ وہ بت پرست ہو گئے تھے، یا وہ اس گھر کے سبب سے تمام عرب پر شرف رکھتے تھے، اس لیے ان کو یہ نعمت یاد دلائی۔ پھر کہا کہ اسی گھر کے رب نے تم کو بھوک میں کھانا دیا جو سفر کی تکالیف کے سبب سے تمھیں پہنچی تھی۔ یا کھانا دینے سے مراد یہ ہے کہ جب انھوں نے نبی اکرم ﷺ کی تکذیب کی تو آپ ﷺ نے ان پر بد دعا فرمائی اور ان پر زمانۂ یوسف علیہ السلام کی طرح سات برس کا قحط پڑا، اب انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ آپ دعا کریں ہم مومن ہیں۔ آپ ﷺ نے دعا کی، اللہ نے قحط دور کیا اور بھوک گئی اور کھانا ملا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا ہے: ﴿ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ ﴾ [البقرة: ١٢٦] ''اور یہاں کے باشندوں کو پھلوں کی روزیاں دے۔'' پھر فرمایا کہ جس شدید خوف میں وہ گرفتار تھے اس میں امن دیا۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: بعض عرب بعض کو لوٹتے اور قید کرتے تھے۔ اللہ نے حرم کے سبب قریش کو اس بلا سے امن میں رکھا تھا۔ امام ضحاک، ربیع، شریک اور سفیان رحمہم اللہ نے کہا: خوفِ حبشہ اور فیل سے امن دیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جذام سے امن دیا۔ یا اس سے مراد ابراہیم ﷺ کا یہ قول ہے: ﴿ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا ﴾[1] [البقرة: ١٢٦] ''اے پروردگار! تو اس جگہ کو امن والا شہر بنا۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ نے ان کو رحلت (سفر) سے نہی کی اور یہ حکم دیا کہ تم اس گھر کے رب کو پوجو اور اُن کو کفایت کی۔ یہ ان پر اللہ کی ایک نعمت تھی۔[2] قریش کی فضیلت میں بہت سی احادیث آئی ہیں اور فرمایا ہے کہ لوگ خیر و شر میں قریش کے تابع ہیں اور یہ امر یعنی خلافت ہمیشہ ان میں رہے گی، جب تک کہ دو آدمی بھی باقی رہیں گے۔ یہ احادیث کتبِ احادیث میں موجود ہیں۔[3] وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

---

[1] تفسیر الطبري (٢٤/ ٦٢٣، ٦٢٤) [2] تفسیر الطبري (٢٤/ ٦٢٢) [3] فتح البیان (١٥/ ٣٩٧۔ ٤٠٠)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْمَاعُوْنِ

اس کو سورتِ "أرایت" سورتِ "دِین" اور سورتِ "یتیم" بھی کہتے ہیں۔اس کی چھے (۶) یا سات (۷) آیتیں ہیں اور یہ مکے میں اتری ہے۔ یہی قول امام عطاء اور جابر رحمہ اللہ کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مکی ہے۔ دوسرے قول میں کہا ہے کہ مدنی ہے یہی قول امام قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ نصف اول مکی ہے اور نصف ثانی مدنی ہے۔

سورۃ الماعون کا شانِ نزول:

پہلی نصف سورت عاص بن وائل کے حق میں اتری ہے اور دوسری نصف عبداللہ بن ابی بن سلول کے حق میں اتری ہے۔ امام مقاتل اور کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عاص بن وائل کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ولید بن مغیرہ کے حق میں نازل ہوئی۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عمرو بن عائذ کے حق میں نازل ہوئی۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابوسفیان کے حق میں نازل ہوئی۔[2] بعض نے کہا ہے کہ بعض منافقین کے حق میں نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝١ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝٢ وَلَا
يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝٣ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۝٤ الَّذِينَ
هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝٥ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝٦ وَيَمْنَعُونَ
الْمَاعُونَ ۝٧

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(اے نبی!) کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو جزا وسزا کو جھٹلاتا ہے؟① تو یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے② اور مسکین کو کھانا کھلانے کا شوق نہیں دلاتا③ چنانچہ تباہی ہے ان

---

[1] تفسير القرطبي (۲۰/۲۱۰) [2] تفسير القرطبي (۲۰/۲۱۰)

نمازیوں کے لیے ④ جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں ⑤ وہ جو دکھاوا کرتے ہیں ⑥ اور (لوگوں کو) استعمال کی معمولی چیزیں بھی دینے سے انکار کرتے ہیں ⑦

منکرینِ قیامت کے اوصاف:

غافل ہیں، یعنی نماز قضا کرتے ہیں یا جان بوجھ کر تنگ وقت میں پڑھتے ہیں۔ انتہی۔[1]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے رسول! تم نے دیکھا قیامت اور جزاء وثواب کا انکار کرنے والے کو۔ ایسا ہی شخص بغیر باپ کے بچوں پر قہر کرتا ہے اور ان کا حق نہیں دیتا نہ اس کو کھلاتا ہے اور نہ اس کے ساتھ احسان کرتا ہے۔ اور نہ محتاج کے کھلانے پر ترغیب دلاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ⑰ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ﴾ [الفجر: ١٧-١٨] ''ایسا ہرگز نہیں بلکہ (بات یہ ہے) کہ تم (ہی) لوگ یتیموں کی عزت نہیں کرتے اور مسکینوں کے کھلانے کی ایک دوسرے کو ترغیب نہیں دیتے۔'' مسکین سے مراد وہ فقیر ہے جس کے پاس کوئی شے نہیں جس سے گزر اوقات کر سکے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ سَاهُونَ ﴾ سے مراد منافقین ہیں جو ظاہر میں نماز پڑھتے ہیں اور باطن میں نہیں پڑھتے۔① یعنی اعلانیہ میں تو نماز کا التزام کرتے ہیں اور پوشیدگی میں اس سے بالکل غافل ہیں، یا شرعی طور پر نماز کا جو وقت مقرر ہے اس پر ادا نہیں کرتے، جب بالکل آخری وقت ہو جاتا ہے تب نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ قول امام مسروق اور ابو الضحیٰ رحمہ اللہ کا ہے۔②

امام عطاء بن دینار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي قَالَ: ﴿ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ﴾ وَلَمْ يَقُلْ فِي صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ''③ ''سب تعریف اس اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے ﴿ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ﴾ کہا اور ''فِي صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ'' نہیں کہا۔'' یا ہمیشہ نماز میں تاخیر کرتے ہیں، یا نماز کے ارکان بہ خوبی بجا نہیں لاتے جس طرح کہ شریعت کا حکم ہے، یا اس میں خشوع وخضوع نہیں کرتے اور اس کے معانی پر غور نہیں کرتے۔ غرضیکہ اس لفظ میں یہ سب معانی شامل ہیں اور جس شخص میں ان صفتوں میں سے ایک صفت پائی جاتی ہے، اس کو اس آیت میں ایک حصہ ملتا ہے اور جس میں تمام صفتیں موجود ہیں اس کو اس سے پورا حصہ ملتا ہے۔ وہ نفاق کے عمل میں کامل ہے جس طرح کہ صحیحین میں مروی ہے کہ یہ منافق کی نماز ہے، یہ کلمہ تین بار فرمایا کہ بیٹھا ہوا سورج کا انتظار کرتا ہے، جب سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہوتا ہے، تب وہ اٹھ کر چار ٹکریں مار لیتا ہے وہ یاد نہیں کرتا اللہ کو مگر تھوڑا۔④

یہ نمازِ عصر کا آخری وقت ہے جو وسطیٰ نماز ہوتی ہے جس طرح کہ اس کے بارے میں نص آئی ہے، آخر وقت تک جو کراہت کا وقت ہے، بیٹھا رہتا ہے، پھر اٹھ کر کوے کی طرح چار چونچیں لگاتا ہے، نہ اطمینان کرتا ہے نہ خشوع،

---

① تفسير الطبري (٢٤/٦٣١) ② تفسير الطبري (٢٤/٦٣٦)

③ تفسير الطبري (٢٤/٦٣٣) تفسير ابن كثير (٤/٧١٩) ④ صحيح مسلم (٦٢٢)

لہٰذا یہ فرمایا کہ ذکر قلیل کرتا ہے اور اس کا اس طرح سے اٹھ کر نماز پڑھنا اس لیے ہے کہ لوگ دیکھیں نہ کہ اللہ کی ذات کے لیے ہے۔ گویا اس نے بالکل نماز ہی نہیں پڑھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [النساء: ١٤٢] ''بے شک منافق اللہ سے چالبازیاں کر رہے ہیں اور وہ انھیں اس چالبازی کا بدلہ دینے والا ہے اور جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بڑی کاہلی کی حالت میں کھڑے ہوتے ہیں صرف لوگوں کو دکھاتے ہیں، اور الہ کی یاد تو یونہی سی برائے نام کرتے ہیں۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے رفعاً کہا ہے کہ جہنم میں ایک وادی ہے جس سے خود جہنم پناہ مانگتی ہے، ہر دن میں چار سو مرتبہ۔ وہ وادی امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ریا کاروں کے لیے تیار کی گئی ہے، وہ خواہ اللہ کی کتاب کے حامل ہوں۔ یا ذات اللہ کی تصدیق کرنے والے ہوں، یا بیت اللہ کا حج کرنے والے ہوں، یا اللہ کے راستے میں نکلنے والے ہوں۔[1] (رواه الطبراني) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: «مَنْ سَمَّعَ النَّاسَ بِعَمَلِهِ سَمَّعَ اللّٰهُ بِهِ سَامِعَ خَلْقِهِ وَحَقَّرَهُ وَصَغَّرَهُ»[2] (رواه أحمد) ''جس نے اپنے عمل کے متعلق لوگوں کو سنایا تو اللہ تعالیٰ اس کے متعلق اپنی مخلوق کے کانوں تک سنا دیتا ہے اور وہ اسے حقیر و ذلیل کر دیتا ہے۔'' ہاں جس نے اللہ کے لیے عمل کیا اور لوگوں کو اس کی خبر ہو گئی اور وہ خوش ہوا تو ریاء میں داخل نہیں ہے۔

اس پر دلیل وہ حدیث ہے جو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نماز پڑھتا تھا، ایک آدمی آیا مجھ کو یہ بات اچھی معلوم ہوئی۔ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا، فرمایا: تیرے لیے دو اجر لکھے گئے: ایک اجر پوشیدہ کام کرنے کا اور دوسرا اجر علانیہ کا۔ (رواه أبو يعلىٰ) ہارون بن معروف نے کہا ہے کہ مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ عبداللہ بن مبارک نے کہا ہے "نِعْمَ الْحَدِيْثُ لِلْمُرَائِيْنَ"[3] ''ریا کاروں کے حق میں یہ اچھی حدیث ہے۔'' یہ حدیث اس وجہ سے غریب ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! ایک آدمی ایک عمل چھپا کر کرتا ہے، پھر جب اس پر کوئی مطلع ہوتا ہے تو اس کو اچھا لگتا ہے۔ فرمایا: «لَهُ أَجْرَانِ أَجْرُ السِّرِّ وَأَجْرُ الْعَلَانِيَةِ»[4] (رواه أبو يعلىٰ والترمذي واستغربه وابن ماجه) ''اسے دوہرا اجر ملے گا پوشیدہ اور ظاہر کا۔''

سیدنا ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ﴾ تو

---

[1] المعجم الكبير (١٧٥/١٢) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ٥/١)

[2] مسند أحمد (٢١٢/٢) السلسلة الصحيحة (٢٥٦٦) [3] تفسیر ابن کثیر (٧٢٠/٤) اس کی سند میں ''سعید بن بشیر'' ضعیف راوی ہے۔

[4] سنن الترمذي (٢٣٨٤) سنن ابن ماجه (٤٦٢٦) اس کی سند میں ''حبیب بن ابی ثابت'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے، نیز ''ابوسنان'' متکلم فیہ راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٣٤٤)

نبی اکرم ﷺ نے کہا: «اَللّٰهُ أَكْبَرُ هٰذَا خَيْرٌ لَكُمْ مِنْ أَنْ لَوْ أُعْطِيَ كُلُّ رَجُلٍ مِنْكُمْ مِثْلَ جَمِيْعِ الدُّنْيَا هُوَ الَّذِيْ إِنْ صَلّٰى لَمْ يَرْجُ خَيْرَ صَلَاتِهِ إِنْ تَرَكَهَا لَمْ يَخَفْ »[1] (رواه ابن جرير) یعنی یہ آیت تمھارے لیے ساری دنیا سے بہتر ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو نماز پڑھتا ہے تو خیر کی امید نہیں رکھتا اور اگر نماز کو ترک کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا۔ اس کی سند میں جابر جعفی ضعیف ہے اور اس کے شیخ کا نام نہیں لیا گیا۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے اس آیت کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو دیر لگا کر نماز پڑھتے ہیں۔[2] (رواه ابن جرير)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تاخیرِ نماز سے احتمال ہے کہ بالکل ترک کرے، یا وقت کے بعد پڑھے یا اول وقت سے دیر لگائے۔ پدرِ مصعب نے کہا: یعنی غافل رہا، یہاں تک کہ وقت تنگ ہو گیا۔[3] ماعون سے منع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو اپنے رب کی اچھی طرح سے عبادت کی اور نہ خلق کے ساتھ احسان کیا کہ کوئی ایسی شے جس سے فائدہ ہو اور استعانت لی جائے عاریت دی، حالاں کہ وہ شے فائدہ لینے کے بعد واپس آ جاتی۔ پھر یہ لوگ زکات کو روک کر اور صدقات کو روک کر بدرجہ اولیٰ اس وعید میں شامل ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد ماعونِ زکاۃ ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، امام سدی، ابو صالح، محمد بن حنفیہ، سعید بن جبیر، عکرمہ، مجاہد، عطاء، عطیہ، زہری، حسن، قتادہ، ضحاک اور ابن زید رحمہم اللہ کا ہے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: اگر نماز پڑھے تو دکھانے کے لیے اور اگر فوت ہو گئی تو کچھ غم نہ کیا اور مال کی زکاۃ نہ دی۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ مال کا صدقہ نہ دیا۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: یہ منافقین ہیں، نماز ظاہر میں ہوتی ہے اس کو پڑھا، زکات مخفی چیز ہے وہ نہ دی۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ماعون وہ چیز ہے جس کو لوگ آپس میں دست گردان لیتے ہیں، جیسے: کلہاڑی، دیگچی، ڈول وغیرہ۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ ہم اصحابِ محمد ﷺ آپس میں چرچا کرتے تھے کہ ماعون دلو و فاس و قدر (ڈول، کلہاڑی اور ہانڈی) ہے جس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ یہی بات سعید بن عیاض نے اصحابِ نبی ﷺ سے سنی تھی۔

سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہر معروف صدقہ میں ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد میں عاریت دلو و قِدر (ڈول اور ہانڈی) کو ماعون سمجھتے تھے۔ دوسرے قول میں میزان (ترازو) بھی کہا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد متاعِ بیت ہے۔ یہی قول امام مجاہد، ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر، ابو مالک رحمہم اللہ اور کئی ایک اہلِ علم کا ہے کہ مراد گھر کے متاع کا عاریتاً دینا ہے۔ یہ قول امام عکرمہ رحمہ اللہ کا حسن ہے جس میں تمام اقوال شامل ہیں اور اس کا مرجع ایک ہی

---

[1] تفسير الطبري (٦٣٣/٢٤) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے، نیز ''جابر جعفی'' ضعیف راوی ہے۔
[2] تفسير الطبري (٦٣٢/٢٤، ٦٣٣) اس کی سند میں ''عکرمہ بن ابراہیم'' ضعیف راوی ہے۔ [3] تفسير ابن كثير (٧٢١/٤)

چیز کی طرف ہے، یعنی مال یا منفعت کے ساتھ معاونت کرنے کو چھوڑ دینا۔ لہٰذا محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد معروف ہے اور اس جگہ سے حدیث میں مروی ہے: « كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ »[1] ''ہر نیکی صدقہ ہے۔'' امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قریش کی زبان میں ماعون بہ معنی مال ہے۔ علی نمیری سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: ماعون حجر وصدید ہے۔ (رواہ ابن الأثیر)۔ حجر پتھر کا دیگچہ اور حدید سے مراد پیتل کا دیگچہ ہے۔[2] واللّٰہ أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿ أَرَءَيْتَ ﴾ میں خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور دین سے مراد جزاء وحساب آخرت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ کا حکم ہے۔[3] وہ لوگ عورتوں اور بچوں کو وارث نہ کرتے، اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ یتیم کو دکھ دیتے ہیں اور مسکین کو نہیں کھلاتے، مال کا بخل کرتے ہیں۔ ''ویل'' سے مراد عذاب یا ہلاکت ہے، یا جہنم کی وادی ہے۔ ﴿ سَاهُونَ ﴾ سے مراد غفلت و بے پروائی ہے۔ اس جگہ ''عن'' کہا، ''في'' نہ کہا، اس لیے کہ مومن کی نماز سہو سے خالی نہیں ہوتی۔ اس دلیل سے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی سہو ہوتا تھا اور اس لیے کہ نماز سے غفلت سے مراد اس کے وقت سے تاخیر کرنا ہے۔

امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ منافقوں کے حق میں اتری ہے کہ نماز پڑھنے پر نہ امید ثواب کی رکھتے ہیں اور نہ نماز چھوڑ دینے پر سزا کا خوف ہے، اس لیے اتنی غفلت کرتے ہیں کہ نماز کا وقت جاتا رہتا ہے۔ اگر مومنین کے ساتھ ہوئے تو دکھانے اور سنانے کے لیے پڑھ لی اور جب کوئی نہ ہوا تو اڑا دی، پھر کون پڑھتا ہے۔ امام نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سر سے سجدے کا اشارہ کر لیتے ہیں اس طرح اور اس طرح۔ قطرب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہ نماز پڑھتا ہے نہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ''ساہون'' کے بجائے ''لاہون'' ہے۔[4] مصعب بن سعد رحمہ اللہ نے اپنے باپ سے کہا: تم نے یہ آیت دیکھی ہے، ہم میں سے کون سا شخص سہو نہیں کرتا یا حدیثِ نفس نہیں کرتا۔ انھوں نے کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ مراد وقت کا ضائع کرنا ہے۔[5]

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اس آیت کا مطلب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، فرمایا: اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو نماز دیر کر کے پڑھتے ہیں۔[6] (رواه الحاكم و البيهقي) لیکن زیادہ صحیح موقوف ہے۔ پھر ریا سے مراد یا تو نماز کا دکھانا ہے یا ہر عملِ صالح کا دکھانا ہے، تاکہ لوگ ان کی تعریف کریں۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لیکن جو شخص

---

[1] صحيح البخاري (٥٦٧٥) صحيح مسلم (١٠٠٥) [2] تفسير الطبري (٢٤/٦٣٥_٦٤٢) تفسير ابن كثير (٤/٧٢١، ٧٢٢)

[3] تفسير الطبري (٢٤/٦٢٩) [4] فتح القدير (٥/٦٧٤) [5] الدر المنثور (٨/٦٤٢٢)

[6] سنن البيهقي الكبرىٰ (٢/٢١٤) اس کی سند میں ''عکرمہ بن ابراہیم'' ضعیف راوی ہے۔

نوافل کا اظہار کرتا ہے، تاکہ لوگ اس کی پیروی کریں اور اپنے نفس پر ریا سے بچا ہوا ہے تو اس کا کچھ ڈر نہیں ہے اور نہ وہ ریا کار ہے۔[1] اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ ماعون سے مراد دلو وفاس و قِدر ہے اور وہ چیز جس سے منع نہیں کیا جاتا، جیسے: پانی، نمک یا مال کی زکات۔ بعض نے کہا ہے کہ عام طور پر ایک بندے کا حق ہے یا منافعِ اموال۔ اللہ نے صدقہ وزکات اور ہر معروف کا نام ماعون رکھا ہے، اس لیے کہ وہ کثیر میں سے قلیل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مسلمان لوگ منافقوں سے ڈول، کلہاڑی اور اس قسم کی چیزیں عاریت مانگتے تھے وہ نہ دیتے اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری۔[2]

---

[1] تفسير الخازن (٧/٣٠٠) [2] الدر المنثور (٨/٦٤٤) فتح البيان (١٥/٤٠٣ـ٤٠٦)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْكَوْثَرِ

اس کو سورتِ نحر بھی کہتے ہیں۔ اس کی تین (۳) آیتیں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام کلبی اور مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مکی ہے۔ حسن و عکرمہ و مجاہد رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مدنی ہے، یہی قول قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما و عبداللہ بن الزبیر و عائشہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ مکہ میں اتری ہے۔[2]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴿۲﴾ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ
الْاَبْتَرُ ﴿۳﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(اے نبی!) یقیناً ہم نے آپ کو کوثر عطا کی ① تو آپ اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھیں اور قربانی کریں ② بے شک آپ کا دشمن ہی جڑ کٹا ہے ③

کوثر بہشت میں ایک نہر کا نام ہے، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے میٹھا ہے، جو ایک دفعہ پی لے اسے ساری عمر پیاس نہ لگے۔ اس کا پانی ایک حوض میں بھرتا ہے، محشر میں دو پرنالے گرتے ہیں: ایک سونے کا اور ایک چاندی کا۔ حوض چورس ہے، اس کے چاروں طرف دو دو مہینے کی راہ ہے۔ اس کا ایک فرش ہے جس پر تخت ہیں جو چاندی اور سونے کے ہیں اس کے کنارے پر ایک ایک موتی کے بنگلے ہیں اندر سے خالی۔ حوض میں سونے اور چاندی کے آب خورے اترتے ہیں اتنی تعداد میں جتنے آسمان کے تارے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے یار وہاں کھڑے ہیں امت وہاں پہنچتی جاتی ہے، جو وہاں جا پہنچا اس کا پانی پیا، پھر محشر کی ساری مدت پیاس نہ لگے، اور اپنے گروہ میں جا ملا، امن میں آ گیا، جو نہ پہنچا اس پر افسوس ہے۔ قربانی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ضروری تھی اور امت میں مالدار پر ضروری ہے، مفلس کے لیے ضروری نہیں۔ کافر کہتے ہیں: اس شخص کا بیٹا نہیں، زندگی تک اس کا نام ہے بعد میں کون نام لے گا۔ سو ان کا نام قیامت تک روشن ہے، اس کافر کو کوئی نہیں جانتا۔ انتہیٰ۔

① تفسير القرطبي (۲۰/۲۱٦) ② الدر المنثور (۸/٦٤٦)

سورۃ الکوثر کی فضیلت:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کو کچھ اونگھ سی آ گئی، پھر سر اٹھا کر مسکرائے، پھر خود کہا یا آپ ﷺ سے لوگوں نے کہا ہے کہ آپ کو کس بات پر ہنسی آئی؟ فرمایا: ابھی مجھ پر ایک سورت اتری ہے، پھر یہ سورت پڑھی اور فرمایا تم جانتے ہو کہ کوثر کیا چیز ہے؟ کہا: اللہ اور اس کا رسول جانیں۔ فرمایا: ایک نہر ہے جو اللہ نے جنت میں مجھ کو دی ہے۔ اس پر کثیر ہے۔ اس پر قیامت کے دن میری امت آئے گی، اس کے برتن اتنے ہیں جتنے آسمان کے تارے ہیں، ان میں سے ایک بندہ کھینچا جائے گا، میں کہوں گا: اے رب! یہ میری امت کا آدمی ہے۔ مجھ سے یہ بات کہی جائے گی: تو نہیں جانتا کہ ان لوگوں نے تیرے بعد کیا کیا نکالا۔[1] (رواه أحمد)

کوثر کا معنی ومفہوم:

حوض کی صفت میں آیا ہے کہ اس میں دو پرنالے آسمان سے نہرِ کوثر سے بہیں گے، اس کے آبخورے آسمان کے تاروں جتنے ہوں گے۔ اس کو مسلم، ابو داود اور نسائی نے روایت کیا ہے۔[2] بہت سے قراء نے استدلال کیا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے اور بہت سے فقہاء نے کہا ہے کہ یہ بسم اللہ اس سورت میں داخل ہے اور سورت کے ساتھ اتری ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ تجھ کو کوثر دی گئی ہے، وہ ایک جاری نہر ہے، اس کے دونوں کناروں پر موتی کے قبے ہیں، میں نے اس کی خاک پر ہاتھ مارا وہ مشکِ اذفر ہے اور اس کی کنکریاں موتی ہیں۔[3] (رواه أحمد) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ میں جنت میں داخل ہوا، ناگہاں ایک نہر دیکھی جس کے دونوں کناروں پر موتیوں کے خیمے ہیں، میں نے ہاتھ مارا کہ یہ پانی کس چیز پر رواں ہے، وہ مشکِ خالص تھا، میں نے کہا کہ اے جبریل! یہ کیا چیز ہے؟ کہا: یہ وہ کوثر ہے جو اللہ پاک نے آپ کو دی ہے۔[4] (رواه أحمد) صحیح بخاری اور مسلم کا لفظ سیدنا انس سے مرفوعاً یہ ہے کہ جب آپ آسمان پر گئے تو کہا: میرا ایک نہر پر گزر ہوا جس کے کنارے پر قبے خالی موتیوں کے تھے، میں نے کہا: اے جبریل! یہ کیا ہے؟ کہا: یہ کوثر ہے۔[5] یہی صحیح بخاری کے لفظ ہیں۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی رفعاً روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ شبِ معراج میں گئے تو جبریل علیہ السلام ان کو آسمانِ دنیا پر لے گئے، وہاں ایک نہر تھی جس پر گوہر اور زبرجد کے محل تھے نبی اکرم ﷺ اس کی خاک سونگھنے لگے اور جبریل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کیا ہے؟ کہا: یہ وہ کوثر ہے جس کو تیرے لیے تیرے رب نے چھپا رکھا ہے۔[6] ان کی

---

(1) مسند أحمد (١٠٢/٣) صحيح الجامع (٧٠٢٧)

(2) صحيح مسلم (٤٠٠) سنن أبي داود (٤٧٤٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٥٢٣/٦)

(3) مسند أحمد (٢٤٧/٣) السلسلة الصحيحة (2513) (4) صحيح البخاري (٦٢١٠) مسند أحمد (١٠٣/٣)

(5) صحيح البخاري (٤٦٨) (6) صحيح البخاري (٧٠٧٩) تفسير الطبري (٦٤٦/٢٤، ٦٤٧)

روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے کہا: میں جنت کی سیر کرتا تھا کہ اتنے میں ایک نہر سامنے دیکھی۔ جس کے دونوں کناروں پر خالی موتیوں کے قبے تھے۔ ایک فرشتے نے جو ساتھ تھا کہا: تو جانتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ یہ کوثر ہے جو اللہ نے تجھ کو دی ہے۔ تو آپ ﷺ نے زمین پر ہاتھ مارا اور اس کی مٹی اٹھائی وہ مشک تھی۔[1] ان کی روایت کے تیسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کوثر کیا ہے؟ فرمایا: ایک نہر ہے جو اللہ پاک نے جنت میں مجھ کو دی ہے۔ اس کی خاک مشکِ خالص ہے، وہ دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھی ہے، اس پر چڑیاں آتی ہیں جن کی گردنیں اونٹ کی گردنوں کی طرح ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! وہ چڑیاں بہت عمدہ ہیں۔ فرمایا: ان کو کھانے والے اور بھی زیادہ عمدہ ہیں۔[2] (رواه ابن جرير)

اس کو امام احمد رحمہ اللہ نے بھی سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے مگر ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بجائے عمر رضی اللہ عنہ کا نام لیا ہے۔[3] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ کوثر کیا ہے؟ فرمایا: ایک نہر ہے جو تمھارے نبی کو دی گئی ہے، اس کے کناروں پر خالی موتی ہیں، اس کے آبخورے اتنے ہیں جتنے آسمان کے ستارے۔[4] (رواه البخاري وأحمد وابن جرير عنها بنحوه)۔ مسروق نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا: مجھ سے کوثر کا حال کہو، کہا: وہ ایک نہر ہے بطنانِ جنت میں۔ میں نے کہا کہ بطنانِ جنت کیا ہے؟ کہا: وسطِ جنت، اس کے کنارے پر موتیوں اور یاقوت کے محل ہیں، اس کی خاک مشک ہے اور کنکریاں لولو و یاقوت ہیں۔[5] (رواه عبد بن حميد)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جو کوئی یہ چاہے کہ کوثر کی آواز سنے، وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کر لے، یعنی اس آواز کی نظیر سنے گا نہ کہ خود اس کی آواز کو۔[6] اس کو دارقطنی نے بھی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔ بخاری سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ہیں کہ کوثر وہ خیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو دی ہے۔ ابو بشر نے امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے کہا: لوگ یہ اعتقاد کرتے ہیں کہ کوثر بہشت میں ایک نہر ہے۔ سعید رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ نہر اسی خیر میں سے ہے۔[7] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کوثر کا ترجمہ خیرِ کثیر کیا ہے۔[8] یہ تفسیر نہر وغیرہ کو شامل ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد دنیا و آخرت میں خیرِ کثیر ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد نبوت و قرآن ہے اور آخرت کا ثواب ہے۔[9]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند کے ساتھ کوثر کی تفسیر نہر کے ساتھ بھی آئی ہے۔ کہا ہے کہ وہ بہشت میں ایک نہر ہے جس کے کنارے سونے چاندی کے ہیں، وہ یاقوت اور گوہر پر بہتی ہے پانی اس کا برف سے زیادہ

---

① تفسير الطبري (٦٤٩/٢٤) ② تفسير الطبري (٦٤٩/٢٤، ٦٥٠) ③ مسند أحمد (٢٢٠/٣) السلسلة الصحيحة (٢٥١٤)

④ صحيح البخاري (٤٦٨١) مسند أحمد (٢٨١/٦) تفسير الطبري (٦٤٦/٢٤) ⑤ تفسير الطبري (٦٤٥/٢٤)

⑥ تفسير الطبري (٦٤٦/٢٤) اس کی سند میں انقطاع ہے، "ابن ابی نجیح رحمہ اللہ کا سماع سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ثابت نہیں ہے۔

⑦ صحيح البخاري (٤٦٨٢) ⑧ صحيح البخاري (٦٢٠٧) ⑨ تفسير الطبري (١٤٨/٢٤)

سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔[1] (وكذا رواه ابن جرير موقوفاً) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے رفعاً کہا ہے کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے، اس کے کنارے سونے کے ہیں، اس کا پانی موتیوں پر جاری ہے، دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔[2] (رواه أحمد و الترمذي وابن ماجه وابن أبي حاتم) ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ رفعاً یہ ہیں کہ کوثر کی زمین یاقوت و مرجان و زبرجد ولؤلؤ ہے۔[3]

حوض کے بارے میں یہ احادیث اکثر ائمۂ حدیث کے نزدیک متواتر ہیں۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ، امام ابو العالیہ اور مجاہد رحمہم اللہ اور بہت سے سلف کا قول یہی ہے کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے۔[4] امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حوض ہے۔[5] پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح ہم نے تجھ کو کوثر دی ہے، اسی طرح تو خالص اپنے رب کے لیے نماز فرض ونفل پڑھ اور اسی کے نام پر قربانی کر جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾ [الأنعام: ١٦٢- ١٦٣] ”آپ فرما دیجیے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہاں کا مالک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں میں سے پہلا ہوں۔“

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ اور حسن رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مراد ”نحر“ سے نحر بدن (اونٹ) ونحو ہا ہے، یہی قول امام قتادہ، قرظی، ضحاک، ربیع، عطاء، حکم، اسماعیل بن ابی خالد رحمہم اللہ اور بہت سے سلف کا ہے۔[6] یہ اس کے برخلاف ہے جس پر مشرک جمے تھے کہ غیر اللہ کو سجدہ کرتے تھے، غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَ لَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ یُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ ... الخ﴾ [الأنعام: ١٢١] ”اور ایسے جانوروں میں سے مت کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اور یہ کام نافرمانی کا ہے اور یقیناً شیاطین اپنے دوستوں کے دل میں ڈالتے ہیں تاکہ یہ تم سے جدال کریں اور اگر تم ان لوگوں کی اطاعت کرنے لگو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ گے۔“ بعض نے کہا ہے کہ نحر سے مراد داہنے ہاتھ کا بائیں ہاتھ پر نحر کے نیچے رکھنا ہے، یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے لیکن صحیح نہیں۔

امام شعبی رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ امام باقر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ”نحر“ سے مراد نماز کے شروع کرتے وقت رفع یدین کرنا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یعنی نحر کے ساتھ منہ قبلے کی طرف کرنا۔[7] ان تینوں اقوال کو

---

(1) تفسير الطبري (٦٤٥/٢٤)

(2) مسند أحمد (١٥٨/٢) سنن الترمذي (٣٣٦١) سنن ابن ماجه (٤٣٣٤) تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٧٠/١٠) صحيح الجامع (٤٦١٥)

(3) تفسير الطبري (٦٥١/٢٤) (4) تفسير الطبري (٦٤٥/٢٤، ٦٤٦) (5) تفسير الطبري (٦٤٨/٢٤)

(6) تفسير الطبري (٦٥٣/٢٤، ٦٥٤) (7) تفسير الطبري (٦٥٦/٢٤)

ابن جریر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث منکر روایت کی ہے جس سے نحر کرنے کا یہ مطلب نکلا کہ ہر تکبیر نماز پر رفع یدین کرنا چاہیے۔[1] (ورواه الحاكم في المستدرك) امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدھا کر اپنی پشت کو رکوع کے بعد اور برابر کھڑا ہو اور سینے کو ابھار۔ اس سے مراد اعتدال ہے۔ یہ سب اقوال غریب ہیں، صحیح قول یہی ہے کہ "نحر" سے مراد قربانی کا ذبح کرنا ہے، لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عید پڑھ کر اپنی قربانی ذبح کرتے اور فرماتے: جس نے ہمارے جیسی نماز پڑھی اور ہمارے جیسی قربانی کی، یعنی ذبیحہ کیا، اس کی قربانی ہوگئی اور جس نے نماز سے پہلے ذبح کیا، اس کا نسک (قربانی) نہ ہوئی۔

ابو بردہ بن نیار رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے اپنی بکری نماز سے پہلے ذبح کی ہے اور میں نے یہ جانا کہ آج وہ دن ہے جس میں گوشت کی خواہش ہوتی ہے۔ فرمایا: «شَاتُكَ شَاةُ لَحْمٍ» یعنی یہ فقط بکری کا گوشت ہوا قربانی نہیں ٹھہری۔ کہا: میرے پاس ایک عناق ہے جس کو میں دو بکریوں سے بھی زیادہ چاہتا ہوں۔ کیا وہ مجھ کو کفایت کرے گی؟ فرمایا: تجھ کو کافی ہے، تیرے بعد دوسرے کو کافی نہ ہوگی۔[2] عناق سے مراد چھے ماہ کی بکری ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کے معنی میں ٹھیک بات یہ ہے کہ تو ساری نماز خالص اپنے رب کے لیے پڑھ، نہ کسی اور ہمسر و معبودِ باطل کے لیے، اسی طرح اپنا ذبیحہ اللہ کے لیے کیا کر نہ کسی بت کے لیے، تاکہ یہ اس کرامت اور خیر کا شکر ہو جو اللہ نے تجھ کو دی ہے۔ اور وہ بے مثل و مثال ہے، تجھ کو اس کے ساتھ خالص کیا ہے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "یہی قول بہت اچھا ہے۔ محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ اور عطاء رحمہ اللہ کا بھی یہی فرمان ہے۔"[4] انتھی۔

میں کہتا ہوں کہ نماز عبادتِ بدنی ہے اور ذبح عبادتِ مالی ہے۔ اللہ نے عبادت کی دونوں قسموں میں اخلاص کا طریقہ ارشاد کیا۔ اس ارشاد سے شرک و بدعت کی جڑ کٹ گئی۔ وللّٰه الحمد.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ہی بے نام و نشاں ہے:

پھر فرمایا کہ اے محمد! تیرا دشمن اور ہدایت و حق و برہانِ ساطع اور نورِ مبین کا دشمن جس کو تو لایا ہے ابتر ہے۔ یعنی اقل ذکر اور منقطع الذکر ہے۔ عاص بن وائل نے کہا تھا: اس کو چھوڑ دو، یہ ایک مردِ ابتر ہے، اس کا کوئی عقب نہیں ہے، یہ جب ہلاک ہو جائے گا تو اس کا ذکر ختم ہو جائے گا۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ شمر بن عطیہ نے کہا: عقبہ بن ابی معیط کے حق میں اتری ہے۔[5] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کعب بن اشرف اور کفارِ قریش کی ایک جماعت کے حق میں اتری ہے۔

---

(1) مستدرك الحاكم (٥٨٦/٢) تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٧٠/١٠) اس کی سند میں "اصبغ بن نباتہ اور اسرائیل بن حاتم" سخت ضعیف راوی ہیں۔

(2) صحيح البخاري (٩١٢)

(3) تفسير الطبري (٦٥٥/٢٤، ٦٥٦)

(4) تفسير ابن كثير (٧٢٦/٤)

(5) تفسير الطبري (٦٥٧/٢٤)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ کعب بن اشرف مکہ میں آیا، قریش نے اس سے کہا: تم اپنی قوم کے سردار ہو اس کودک منقطع عن القوم کو نہیں دیکھتے کہ وہ یہ اعتقاد کرتا ہے کہ ہم سے بہتر ہے، حالاں کہ ہم اہلِ حجیج واہلِ سدانت اور اہلِ سقایت ہیں۔ اس نے کہا کہ تم اس سے بہتر ہو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] (رواه البزار وهو إسناد صحيح)۔ امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا: ابولہب کے حق میں آئی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ کے فرزند کا انتقال ہو گیا تو ابولہب نے مشرکوں کے پاس جا کر کہا: "بَتَرَ مُحَمَّدٌ اللَّيْلَةَ" یعنی آج کی رات محمد ﷺ ابتر ہو گئے، یعنی منقطع النسل۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ سورت عاص بن وائل کے حق میں اتری ہے۔ یہی قول امام مجاہد، سعید بن جبیر اور قتادہ رحمہم اللہ کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ ابوجہل کے حق میں آئی ہے۔[2]

"شانی" سے مراد "عدو" یعنی دشمن ہے، یہ لفظ عام ہے، ان سب کے لیے جو امورِ مذکورہ وغیرہ کے ساتھ متصف ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: "أبتر" بہ معنی فرد ہے، یعنی تنہا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: جب کسی مرد کی اولادِ ذکور (نرینہ اولاد) مر جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں "أبتر" ہو گیا۔ جب نبی اکرم ﷺ کے بیٹے مرے تو کہا: "بَتَرَ مُحَمَّدٌ" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل کی۔ اس کا مرجع یہی ہے کہ "أبتر" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کا ذکر منقطع ہو جائے۔ ان لوگوں نے ابوجہل سے یہ توہم کیا تھا کہ جب نبی اکرم ﷺ کے بیٹے مر گئے تو ان کا ذکر بھی جاتا رہے گا۔ حاشا وکلّا۔ بلکہ اللہ نے آپ ﷺ کا ذکر علی رؤس الاشہاد باقی رکھا اور آپ ﷺ کی شریعت کو سب کی گردنوں پر واجب کیا۔ یہ استمرار ودوام ابدالآباد تا قیامت وحشر ومعاد باقی رہے گا۔[3] وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ جو شے کثیر العدد یا قدر یا خطر ہوتی ہے عرب اس کو کوثر کہتے ہیں۔ کوثر سے مراد خیرِ کثیر ہے جو کثرت میں انتہا کو پہنچ گئی ہو۔ اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ جنت میں ایک نہر ہے، یا موقف میں ایک حوض ہے، یا نبوت، یا قرآن، یا تفسیرِ قرآن ہے۔ یا مراد اصحاب اور امت کی کثرت ہے، یا ایثار یا اسلام یا ذکر کی بلندی یا نورِ قلب یا شفاعتِ عظمیٰ یا معجزات یا اجابتِ دعا ہے۔ یا لا الہ الا اللہ یا فقہ فی الدین یا نمازِ پنج گانہ ہے۔ یہ سب اقوالِ غریبہ ہیں، سب سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ بہشت میں ایک نہر ہے جس کا ذکر بہت احادیث میں آیا ہے تو اب اسی تفسیر مرفوع کی طرف جانا زیادہ بہتر ہے اور بس۔ گو لغتِ عرب میں کوثر کے معنی خیرِ کثیر ہوں۔ جس نے کوثر کی

---

[1] تفسير الطبري (٢٤/٦٥٧، ٦٥٨) كشف الأستار عن زوائد البزار (٣/٨٣) اس کی سند میں "یحییٰ بن راشد" ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسير الطبري (٢٤/٦٥٦، ٦٥٧) تفسير ابن كثير (٤/٧٢٦، ٧٢٧) [3] تفسير ابن كثير (٧٢٧)

تفسیر مرفوع تفسیر سے ہٹ کر عام تر کی ہے، اس نے لغوی معنی پر نظر ڈالی لیکن رسول اللہ ﷺ نے کوثر کی تفسیر نہر کے ساتھ فرمائی ہے۔ یہ شرعی معنی لغوی مفہوم پر مقدم ہیں: ''إِذَا جَاءَ نَهْرُ اللّٰهِ بَطَلَ نَهْرُ مَعْقِلٍ''

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سب سے صحیح دو قول ہیں: ایک یہ کہ کوثر نہر ہے، دوسرا یہ کہ حوض ہے، اس لیے کہ اس کا نہر ہونا نبی مکرم ﷺ سے منصوص ہو چکا ہے۔ قاضی عیاض رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ احادیثِ حوض صحیح ہیں اور ان پر ایمان لانا فرض ہے اور ان کی تصدیق کرنا ایمان ہے اور یہ احادیث اپنے ظاہر پر جاری ہیں۔ اہلِ سنت و جماعت ان حدیثوں کی تاویل نہیں کرتے اور نہ کسی کا ان میں اختلاف ہے، یہ اخبار متواتر النقل ہیں۔ صحابہ کی ایک جماعت نے ان کو روایت کیا ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے کتاب ''البعث والنشور'' میں ان سب کو مع اسانید وطرقِ متکاثرہ جمع فرمایا ہے۔ صاحبِ قوت القلوب وغیرہ اس طرف گئے ہیں کہ آپ کا حوض صراط کے بعد ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے دو حوض ہیں اور دونوں کا نام کوثر ہے۔ ہاں میزان وحوض میں اختلاف ہے کہ کون پہلے ہے اور کون بعد میں۔ ابو الحسن فاسی نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ پہلے حوض ہے، معنی کا تقاضا بھی یہی ہے، اس لیے کہ لوگ قبروں سے پیاسے نکلیں گے تو صراط اور میزان سے پہلے حوض ہی آنا چاہیے۔[1]

امر بالصلاۃ سے مراد نماز ہائے پنج گانہ کو ہمیشہ قائم کرنا ہے، یا عیدِ قربان کی نماز کو ہمیشہ قائم کرنا ہے۔ پہلی بات اس صورت میں مناسب ہے کہ سورت مکی ہو اور دوسری بات اس صورت میں مناسب ہے کہ سورت مدنی ہو۔ ''نحر'' سے مراد اونٹ کو ذبح کرنا ہے، کیوں کہ عرب کا عمدہ مال یہی اونٹ ہے۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ لوگ غیر اللہ کے لیے نماز پڑھتے اور جانور ذبح کرتے تھے، اللہ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ تمھاری نماز اور قربانی اللہ ہی کے لیے ہونی چاہیے نہ کہ غیر اللہ کے لیے۔ امام قتادہ، عطاء اور عکرمہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مراد نمازِ عید اور قربانیوں کا نحر کرنا ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد مزدلفہ میں صبح کی فرض نماز اور منیٰ کے مقام پر قربانی کا جانور ذبح کرنا ہے۔[2] امام ابن الاعرابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''نحر'' یہ ہے کہ نماز میں محراب کے سامنے کھڑا ہو۔

امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھے تا کہ سینہ ظاہر ہو۔ سلیمان تیمی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہاتھ دعا کے لیے سینے کے برابر اٹھائے۔[3] ظاہر آیت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو صرف نماز کا اور صرف نحر کا حکم دیا ہے کہ یہ دونوں کام خاص اللہ کے لیے ہوں نہ کہ غیر اللہ کے لیے۔ سنت میں جہاں کہیں اس مطلق کا بیان کسی خاص قسم کے ساتھ آیا ہے تو وہ حکم مقیدلہ میں آیا ہے۔ پھر فرمایا: اے نبی! تیرا دشمن منقطع الخبر ہے عموماً، خواہ خبرِ دنیا ہو یا خبرِ آخرت۔ ابتر وہ ہے جس کے لیے عقب نہ ہو۔ یا موت کے بعد جس کا ذکر باقی نہ رہے۔ ظاہرِ آیت عموم ہے اور نبی کے ہر دشمن کا حال یہ ہے کہ وہ دنیا اور آخرت میں حرماں نصیب ہوتا ہے۔ اس آیت کا عاص بن وائل وغیرہ کے حق میں

---

[1] فتح البیان (١٥/٤١١، ٤١٢) [2] تفسير الطبري (٢٤/٦٥٣، ٦٥٤) [3] تفسير القرطبي (٢٠/٢١٩، ٢٢٠)

نازل ہونا کچھ اس کے عام ہونے کے منافی نہیں ہے، اس لیے کہ اعتبار عمومِ لفظ کا ہے نہ خصوصِ سبب کا۔ ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے ابراہیم کا انتقال ہوا تو بعض مشرکین نے بعض سے کہا کہ یہ صابی آج کی رات ابتر ہوا۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: بڑی اولاد قاسم تھے، سب سے پہلے وہی فوت ہوئے، وہ مکہ میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر عبداللہ فوت ہوئے۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا کہ محمد کی نسل منقطع ہوگئی، وہ ابترہ ہیں۔[2] کسی نے کہا: یہ کہنے والا ابوجہل تھا۔[3] واللّٰہ أعلم.

---

① المعجم الكبير (١٧٩/٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه واصل بن السائب وهو متروك" (مجمع الزوائد: ٣٠٠/٧)

② تاريخ دمشق (١٢٦/٣) ③ فتح البيان (٤٠٩/١٥-٤١٥)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْكٰفِرُوْنَ

اس سورت کی چھے (٦) آیتیں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام حسن اور عکرمہ رحمہم اللہ کے قول کے مطابق مکی ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ، ضحاک اور ابن الزبیر رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق مدنی ہے۔[1]

نوافل میں سورۃ الکافرون کی تلاوت:

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اور ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ کو طواف کی دو رکعت میں پڑھا تھا۔[2] (رواه مسلم) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ دو رکعت فجر میں پڑھتے تھے۔[3] (رواه مسلم) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: دو رکعت سنتِ فجر میں اور سنتِ مغرب میں کچھ اوپر بیس بار پڑھا۔[4] (أخرجه أحمد و الترمذي وحسنه والنسائي وابن ماجه وابن حبان وابن مردويه) سیدنا ابی رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں ﴿ سَبِّحِ ﴾ اور یہ سورت اور ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھتے۔[5] (أخرجه الحاكم و صححه)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی دوسری روایت میں اس کو ربع قرآن کے برابر اور ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ کو ثلث قرآن کے برابر فرمایا ہے۔[6] (أخرجه محمد بن نصر و الطبراني) سیدنا نوفل بن معاویہ اشجعی رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے سکھا دیں کہ میں بستر پر جا کر کیا پڑھا کروں؟ فرمایا: سورۃ الکافرون پڑھ کر سویا کر کہ یہ شرک سے براءت ہے۔[7] (أخرجه أحمد و أهل السنن)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ کیا میں تم کو ایسا کلمہ نہ بتا دوں جو تم کو اشراک باللہ سے نجات دے؟ سونے کے وقت سورۃ الکافرون پڑھا کرو۔[8] (أخرجه الطبراني وأبو يعلىٰ)

سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ رفعاً کہتے ہیں کہ جس نے اللہ سے دو سورتوں کے ساتھ ملاقات کی اس پر کچھ حساب نہیں ہے: سورۃ الکافرون اور ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾[9] (أخرجه ابن مردويه) سیدنا خباب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

① الدر المنثور (٦٥٤/٨) فتح القدير (٦٨١/٥) ② صحيح مسلم (١٢١٨) ③ صحيح مسلم (٧٢٦)
④ مسند أحمد (٢٤/٢) سنن الترمذي (٤١٧) سنن النسائي (٩٩٢) سنن ابن ماجه (١١٤٩) السلسلة الصحيحة (٣٣٢٨)
⑤ مستدرك الحاكم (٢٨٢/٢) ⑥ المعجم الكبير (٤٠٥/١٢) صحيح الترغيب والترهيب (١٤١/١)
⑦ مسند أحمد (٤٥٦/٥) سنن أبي داود (٥٠٥٥) سنن الترمذي (٣٤٠٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٢٠٠/٦) صحيح الجامع (٢٩٢)
⑧ المعجم الكبير (٢٤١/١٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه جبارة بن المغلس وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ١٦٦/١٠)
⑨ الدر المنثور (٦٥٨/٨)

نے فرمایا کہ جب تو بستر پر جائے تو سورۃ الکافرون پڑھ۔ آپ ﷺ خود بھی ایسا ہی کرتے تھے، پوری سورت پڑھتے تھے۔[1] (أخرجه البزار والطبراني وابن مردويه وفي الباب أحاديث كثيرة) کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: میں نے نبی اکرم ﷺ کو دیکھا چوبیس یا پچیس بار کہ فجر اور مغرب کی سنتوں میں سورۃ الکافرون اور ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھتے۔[2] (رواه أحمد) سیدنا جبلہ بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تو جب بستر پر آئے تو ان دونوں سورتوں کو آخر تک پڑھ کہ یہ شرک سے براءت ہیں۔[3]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ﴿1﴾ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿2﴾ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ
مَآ اَعْبُدُ ﴿3﴾ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ﴿4﴾ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ
مَآ اَعْبُدُ ﴿5﴾ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴿6﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: اے کافرو!① میں ان (بتوں) کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو② اور نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو، جس کی میں عبادت کرتا ہوں③ اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں، جن کی تم عبادت کرتے ہو④ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں⑤ تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین⑥

شرک سے براءت:

یعنی تم نے ضد باندھی ہے، اب سمجھانے کا کیا فائدہ، جب تک اللہ فیصلہ کرے۔ انتہیٰ۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ سورت بیزاری کا اظہار ہے اس عمل سے جو مشرک کرتے ہیں، اس میں اخلاص اختیار کرنے کا حکم ہے۔ ”کافرون“ میں ہر کافر جو روئے زمین پر ہے شامل ہے، لیکن اس خطاب اور مواجہہ کے مخاطب کفارِ قریش ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ اپنی جہالت کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کو کہتے تھے کہ ایک سال تم بتوں کو پوجو اور ایک سال ہم تمھارے معبود کو پوجیں گے۔ اس پر یہ سورت اتری۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے پیغمبر! تم ان کے

① كشف الأستار عن زوائد البزار (٢٨/٤) المعجم الكبير (٨١/٤) اس کی سند میں ”جابر جعفی“ ضعیف راوی ہے۔

② مسند أحمد (٩٩/٢)

③ المعجم الكبير (٢٨٧/٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رواه الطبراني ورجاله وثقوا“ (مجمع الزوائد: ١٦٦/١٠)

دین سے بالکل بے زار ہو جاؤ اور کہہ دو کہ جس کو تم پوجتے ہو، یعنی بت اور شریک، میں ان کو ہرگز نہیں پوج سکتا اور نہ ہی جس کو میں پوجتا ہوں، یعنی اللہ وحدہ لاشریک لہ، تم اس کو پوجو گے۔

پھر دوبارہ یہی فرمایا کہ میں عبادت میں تمھاری راہ پر نہیں چل سکتا اور نہ تمھارا مقتدی ہو سکتا ہوں۔ میں تو اللہ کی عبادت اس کی رضا اور محبت کے مطابق کرتا ہوں اور تم اس کی عبادت میں اس کے احکامات اور شریعت کی پیروی نہیں کرتے، بلکہ تم نے اپنے دل سے ایک نئی چیز نکالی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴾ [النجم: ٢٣] ''یہ لوگ تو صرف اٹکل کے اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور یقیناً ان کے رب کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔''

پس نبی اکرم ﷺ نے ان کے تمام اعمال سے بے زاری کا اظہار کیا، کیوں کہ عابد کو ایک معبود درکار ہے جس کی عبادت کرے اور اس کی راہ پر چلے، پس رسول اور رسول کے متبعین نے اللہ کو اس کی شریعت کے موافق پوجا۔ کلمہ اخلاص ''لا إله إلا الله محمد رسول الله'' کے یہی معنی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ ہی اس راہ کے سوا کوئی راہ ہے جس کو رسول ﷺ لائے ہیں۔

رہے مشرک تو وہ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں جس کا اللہ نے اذن نہیں دیا۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ نے ان سے کہہ دیا کہ تمھارا دین تمھارے لیے ہے اور ہمارا دین ہمارے لیے۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـــُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾ [یونس: ٤١] ''اور اگر آپ کو جھٹلاتے رہیں تو یہ کہہ دیجیے کہ میرے لیے میرا عمل اور تمھارے لیے تمھارا عمل، تم میرے عمل سے بری ہو اور میں تمھارے عمل سے بری ہوں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ﴾ [القصص: ٥٥] ''ہمارے عمل ہمارے لیے اور تمھارے اعمال تمھارے لیے۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا، یعنی تم کو تمھارا دین کفر ہے اور مجھ کو میرا دین اسلام۔[1] بعض نے کہا: آیت کے معنی یہ ہیں کہ میں اس دم وہ نہیں پوجتا جو تم پوجتے ہو اور نہ میں اپنی باقی عمر میں تمھاری بات مانوں اور نہ تم وہ پوجو گے جو میں پوجتا ہوں، یہ وہی لوگ ہیں جن کے حق میں کہا ہے: ﴿ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴾ [المائدة: ٦٤] ''اور جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے اتارا جاتا ہے وہ ان میں سے اکثر کو تو سرکشی اور کفر میں اور بڑھا دیتا ہے۔'' امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض اہلِ عربیت سے نقل کیا ہے کہ یہ عبارت بابِ تاکید سے ہے، جیسے: ﴿ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴾ [الإنشراح: ٥-٦] ''پس یقیناً مشکل کے ساتھ

[1] صحيح البخاري (٤/١٩٠٠)

آسانی ہے، بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔" یا جیسے ﴿ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ﴾[1]
[التكاثر: ٦-٧] "تو بے شک تم جہنم دیکھ لو گے اور تم اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے۔"

اس کو امام ابن الجوزی رحمہ اللہ وغیرہ نے ابن قتیبہ رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے، یہ سب تین قول ہوئے: ایک وہ جو ہم نے ذکر کیا دوسرا وہ جو بخاری وغیرہ مفسرین نے ذکر کیا، یعنی ماضی و مستقبل کے متعلق اور تیسرا یہ کہ تاکید ہے۔ چوتھا قول وہ ہے جس کی نصرت ابو العباس ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی بعض کتب میں کی ہے کہ ﴿ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ سے مراد نفیِ فعل ہے، اس لیے کہ یہ جملہ فعلیہ ہے اور ﴿ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ﴾ سے مراد نفیِ قبول ہے بالکلیہ، کیونکہ جملہ اسمیہ کے ساتھ نفی مؤکد تر ہوتی ہے گویا فعل کی اور اس کے قبول کرنے کی نفی کی جس کے معنی ہوئے نفی وقوع و نفی امکان شرعی کی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "وهو قول حسن أيضا والله أعلم"[2] امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ نے آیت ﴿ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ﴾ سے استدلال کیا ہے کہ کفر ملتِ واحدہ ہے۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ کے وارث ہوں گے یا اس کے برعکس، کیوں کہ دونوں کے آپس میں نسب یا سبب ہے جس کا توراث کرتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ جتنے دین اور ملتیں ہیں سب باطل ہونے میں ایک چیز کی طرح ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ اور جو لوگ ان کے موافق ہیں ان کا مذہب یہ ہے کہ نصاریٰ یہود کے وارث نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اس کے برعکس، ان کی دلیل وہ حدیث ہے جو عمرو بن شعیب عن جدہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: «لَا يَتَوَارَثُ أَهْلُ مِلَّتَيْنِ شَتَّى»[3] "دو مختلف ملتوں والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے۔" والله أعلم

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے: یعنی اے کافرو! میں فی الحال وہ کام نہیں کروں گا جس کے تم طالب ہو۔ یعنی بتوں کی عبادت یا آیندہ زمانہ مراد ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کتاب "بدائع الفوائد" میں اس آیت کے نیچے دس مسئلے لکھے ہیں۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما لکھتے ہیں: قریش نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ ہم تم کو اتنا مال دیں گے کہ مکہ میں تمھارے برابر کوئی مالدار نہ ہوگا اور جن عورتوں سے چاہو تمھارا نکاح کرا دیں، لیکن ہمارے معبودوں کو برا نہ کہو اور ان کا ذکر برائی کے ساتھ نہ کرو۔ اگر تم کو یہ بات منظور نہ ہو تو پھر ہم ایک اور بات کہتے ہیں جس میں تمھاری بہتری ہے، کہا: وہ کیا؟ کہا: یہ کام کرو کہ ایک سال تم ہمارے خداؤں کو پوجو اور ایک سال ہم تمھارے اللہ کو پوجیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں انتظار کرتا ہوں کہ میرا رب کیا فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اس سورت کی وحی ہوئی اور یہ آیت اتری: ﴿ قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَىِٕنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ

---

[1] تفسير الطبري (٢٤/٦٦٣) [2] تفسير ابن كثير (٤/٧٢٨، ٧٢٩)

[3] سنن أبي داود (٢٩١١) صحيح الجامع (٧٦١٤) تفسير ابن كثير (٤/٧٢٨، ٧٢٩) [4] بدائع الفوائد (١/١٤٠)

الشّٰكِرِيْنَ ﴾ [الزمر: ٦٤- ٦٦] ''آپ کہہ دیجیے اے جاہلو! کیا تم مجھ سے اللہ کے سوا اَوروں کی عبادت کو کہتے ہو، یقیناً تیری طرف بھی اور تجھ سے پہلے (کے تمام نبیوں) کی طرف بھی وحی کی گئی ہے کہ اگر تو نے شرک کیا تو بلاشبہ تیرا عمل ضائع ہو جائے گا، بلکہ تو اللہ ہی کی عبادت کر اور شکر کرنے والوں میں سے ہو جا۔''[1] (أخرجه ابن جرير وابن أبي حاتم والطبراني) پھر فرمایا کہ نہ تم آیندہ وہ کام کرو گے جو میں تم سے طلب کرتا ہوں، یعنی اللہ کی عبادت۔

بدائع میں کہا ہے کہ اس سورت کا نفیِ محض پر مشتمل ہونا اس سورتِ عظیمہ کا ایک خاصہ ہے، کیوں کہ یہ سورت شرک سے براءت ہے جس طرح کہ حدیث میں مروی ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد یہی موحدین اور مشرکین کے درمیان صرف بیزاری ہے، اس لیے دونوں طرف میں حرفِ نفی لایا گیا ہے مطلوبہ براءت کو حق ثابت کرنے کے لیے، حالاں کہ اس میں صریحاً اثبات کے معنی شامل ہیں، یعنی ﴿ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴾ براءتِ محضہ ہے۔ ﴿ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ﴾ اثباتِ معبودِ برحق ہے جس کی عبادت سے یہ مشرک بری ہیں۔ سو یہ سورت نفی واثبات کو متضمن (شامل) ہونے کے سبب سے امام الحنفاء (ابراہیم علیہ السلام) کے اس قول کے مطابق ہے: ﴿ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ﴾ [الزخرف: ٢٦- ٢٧] ''میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو بجز اس ذات کے جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے ہدایت بھی کرے گا۔'' اور موحدین کے گروہ کے قول کے موافق بھی ہے: ﴿ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ﴾ [الكهف: ١٦] ''جبکہ تم ان سے اور اللہ کے سوا ان کے اور معبودوں سے کنارہ کش ہو گئے۔''

لہٰذا نبی اکرم ﷺ ان دونوں سورتوں کو صبح اور مغرب کی سنتوں میں پڑھا کرتے تھے، کیوں کہ یہ دونوں ہی دو سورت اخلاص ہیں اور توحید کی دو نوع پر مشتمل ہیں جس کے بغیر کسی بندے کی نجات اور فلاح نہیں ہو سکتی۔ وہ دونوں عمل اور اس بات کا اعتقاد ہے کہ اللہ شرک و کفر و اولاد اور والد سے پاک ہے، کیوں کہ ﴿ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ﴾ ہے۔ دوسری نوع توحیدِ قصد و ارادت ہے کہ سوا اللہ کے کسی کی عبادت نہ کرے نہ اس کی عبادت میں کسی کو شریک ٹھہرائے، بلکہ صرف اللہ ہی معبود ہو، سو یہ سورت اس مقصدِ محمود پر بہ خوبی مشتمل ہے۔[2] پھر فرمایا کہ نہ میں اس کا عابد ہوں جس کو تم نے پوجا، یعنی زمانۂ ماضی میں یہ شرک کبھی مجھ سے نہیں ہوا اور نہ ہو گا اور نہ تم اس کو پوجو گے جس کو میں پوجتا ہوں، یعنی تم سے بھی یہ کام کسی بھی وقت میں نہ ہو گا۔ آیت کے یہ معنی اس شخص کے قول کے مطابق ہیں جس نے کہا ہے کہ اس جگہ تکرار نہیں ہے، بلکہ پہلا جملہ زمانۂ مستقبل میں عبادت کی نفی کے لیے ہے۔

امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس سورت میں اللہ کے علاوہ معبودوں کی عبادت کی، اپنے نفسِ مبارک سے حال اور مستقبل میں نفی کی اور ان سے حال اور مستقبل میں اللہ کی عبادت کی نفی کی۔[3] بعض نے کہا

---

[1] تفسير الطبري (٦٦٢/٢٤) تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٧١/١٠) المعجم الصغير (٤٤/٢)

[2] بدائع الفوائد (١٤٥/١، ١٤٦) [3] فتح القدير (٦٨٣/٥)

ہے کہ ہر جملے میں حال اور مستقبل کا احتمال ہے لیکن ہم نے ایک کو حال کے ساتھ اور دوسرے کو مستقبل کے ساتھ خاص کر لیا، تا کہ اس سے تکرار نہ سمجھا جائے۔ لیکن یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ سب تکلف اور تعسف (بے راہ چلنا) ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ اس تکرار کا مقصد تاکید ہے اور کفار کے اس طمع کو ختم کرنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کی بات مان لیں۔ پھر فرمادیا کہ تمھارا دین تمھارے لیے ہے اور میرا دین میرے لیے، تم شرک اور کفر پر راضی ہو اور میں توحید اور اسلام پر راضی ہوں۔ یا تم کو تمھارے عمل کی جزا ملے گی اور مجھ کو میرے عمل کی، اس لیے کہ دین جزا کے معنی میں بھی آتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے آیتِ سیف کے ساتھ اور بعض نے کہا ہے کہ منسوخ نہیں ہے بلکہ اخبار ہے اور اخبار میں نسخ نہیں آیا۔ کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ ساری سورت منسوخ ہے۔

قاضی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دین میرا میرے لیے ہے، میں اس کو ہرگز ترک نہیں کرنے لگا، تو اس میں کفر کا کچھ اذن نہ ہوا اور نہ جہاد سے منع کرنا نکلا تو پھر آیتِ قتال کے ساتھ اس کے منسوخ ہونے کی کیا ضرورت ہے، حالاں کہ دین کی تفسیر حساب، جزا اور عبادت کے ساتھ آئی ہے۔[1] امام ابن القیم رحمہ اللہ نے بدائع میں فرمایا ہے کہ ایک خلائق نے اس جگہ غلطی کی ہے کہ اس سورت کو منسوخ کہہ دیا، اس بنیاد پر کہ یہ آیت ان کو ان کے دین پر مقرر رکھتی ہے۔ دوسروں نے کہا ہے کہ اہلِ کتاب کے حق میں ہے کہ وہ اپنے دین پر برقرار ہیں حالاں کہ یہ دونوں قول غلطِ محض ہیں۔ نہ یہ سورت منسوخ ہے اور نہ یہ آیت مخصوص ہے، بلکہ محکم ہے اور اس کا عموم نصِ محفوظ ہے۔ یہ ان سورتوں میں ہے جن میں نسخ کا داخل ہونا محال ہے۔

یہ سورت تو اخلاصِ توحید کرتی ہے لہٰذا سورۃ الاخلاص کہلاتی ہے اور شرک و کفر سے محض براءت کا تقاضا کرتی ہے، یعنی میں ہرگز تمھاری موافقت نہ کروں گا، اس لیے کہ تمھارا دین بالکل باطل ہے، وہ تمھارے ساتھ مختص ہے، اس میں میری شرکت چہ معنی وارد؟ اور تم اس دینِ حق میں میرے ساتھ شرکت نہیں کرتے ہو تو یہ انتہا درجے کی براءت ہوئی، اقرار کہاں ہے جس کی بنیاد پر نسخ کہا جائے یا تخصیص ٹھہرے، بلکہ یہ آیت محکم، قائم اور ثابت ہے مومنین اور کافرین کے درمیان۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے بلاد اور بندوں کو ان مشرکوں سے پاک کرے۔ یہی حکم ہے اتباعِ رسول والِ سنت اور اہلِ بدعت و ضلال کے درمیان براءت کا۔ رسول اللہ ﷺ کے خلفاء اور ذریت نے ان سے کہا: ''لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلَنَا دِيْنُنَا'' ''تمھارے لیے تمھارا دین اور ہمارے لیے ہمارا دین۔'' اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کو ان کی بدعت پر برقرار رکھا گیا، بلکہ یہ ان سے اظہارِ براءت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ان کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے حتی الامکان تیار اور مستعد ہیں۔[2] انتہیٰ کلام ابن القیم رحمہ اللہ تعالیٰ۔

---

[1] تفسیر البیضاوي (٥/٥٣٩) [2] بدائع الفوائد (١/١٤٨) فتح البیان (١٥/٤١٩-٤٢٤)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ النَّصْرِ

اس کا نام سورت تودیع بھی ہے۔ اس کی تین (۳) آیات ہیں۔ بالا جماع و بلا خلاف مدینے میں اتری۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: ایامِ تشریق کے درمیان میں منیٰ کے مقام پر حجۃ الوداع میں نازل ہوئی۔[2] (أخرجه البزار وأبو يعلىٰ والبيهقي وغيرهم)

سورۃ النصر کی فضیلت:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں جب یہ سورت اتری تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا« نُعِيَتْ إِلَيَّ نَفْسِيْ »[3] (أخرجه أحمد) ''مجھے میری وفات کی خبر دی گئی ہے۔'' ابن مردویہ نے اتنا اور زیادہ کیا ہے ''وَقَرُبَ إِلَى أَجَلِيْ''[4] ''میری موت قریب آ گئی ہے۔'' تب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم امرِ آخرت میں زیادہ کوشش کرنے لگے۔[5] سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر وہ اپنی امت میں اپنے سے پہلے نبی کی نصف عمر رہا جیسے عیسیٰ بن مریم بنی اسرائیل میں چالیس سال رہے اور اب مجھ کو بیس برس ہوئے اب میں اس سال میں فوت ہو جاؤں گا۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا رونے لگیں، فرمایا: تو میرے اہلِ بیت میں سب سے پہلے مجھ سے آ ملے گی، وہ مسکرائیں۔[6] (أخرجه ابن أبي حاتم وابن مردويه) اس کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی روایت کیا ہے۔[7] (أخرجه البيهقي) یہ سورت ربع قرآن ہے اور سب سے آخر میں پوری سورت یہی نازل ہوئی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ
اَفْوَاجًا ۝۲ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(اے نبی!) جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے گی ① اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ اللہ کے دین

① الدر المنثور (۸/۶۵۹)
② مسند البزار (۱۲/۲۹۸) سنن البيهقي الكبرىٰ (۵/۱۵۲) اس کی سند میں ''موسیٰ بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔
③ مسند أحمد (۱/۲۱۷) ④ الدر المنثور (۸/۶۶۰) ⑤ سنن النسائي الكبرىٰ (۶/۵۲۵)
⑥ تفسير ابن أبي حاتم (۱۰/۳۴۷۲) الدر المنثور (۸/۶۶۰) ⑦ دلائل النبوة للبيهقي (۷/۱۶۷)

میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں ② تو آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اس سے بخشش مانگیے، بلاشبہہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے ③

سورۃ النصر میں رسول اللہ ﷺ کی وفات کا اشارہ:

یعنی قرآن میں ہر جگہ فیصلے کا وعدہ ہے اور کافر جلدی کرتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کی آخر عمر میں مکہ فتح ہو چکا، ملکِ عرب مسلمان ہونے لگے، جوق در جوق دین میں داخل ہونے لگے، وعدہ سچا ہو گیا۔ اب امت کے گناہ بخشوایا کر شفاعت کا درجہ لے۔ یہ سورت نبی اکرم ﷺ کی آخری عمر میں اتری۔ آپ ﷺ نے پہچان لیا کہ دنیا میں میرا جو کام تھا، وہ میں کر چکا اب آخرت کا سفر ہے۔ انتہیٰ.

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مجھے بدری اشیاخ کے ساتھ مشورے میں شامل کرتے۔ شاید اُن میں سے کسی کو برا لگا، کہا: یہ ہمارے ساتھ کیوں آتا ہے، اس کے برابر ہمارے بیٹے ہیں؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم جانتے ہو کہ یہ کون ہے؟ پھر ایک دن ان کو بلایا اور مجھے بھی بلایا۔ مجھ کو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ آج جو مجھ کو بلایا ہے تو کوئی خاص بات دکھانے کے لیے بلایا ہے۔ پھر کہا کہ تم لوگ اس آیت کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ ﴿ إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ﴾ بعض نے کہا: ہم کو حکم ہے کہ ہم حمد و استغفار کریں، کیوں کہ اللہ نے ہم کو نصرت اور فتح دی اور بعض خاموش رہے کچھ نہ کہا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا: کیا یہ بات اسی طرح ہے، تم بھی یہی کہتے ہو؟ میں نے کہا کہ نہیں، کہا: پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی اجل (موت) کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو جتا دیا کہ یہ تمھاری وفات کی علامت ہے، اب تم حمد و استغفار کرو۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھے بھی یہی معلوم ہے۔[1] (تفرد به البخاري و رواه ابن جرير عنه مثل هذا القصة أو نحوها)

امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ الفاظ روایت کیے ہیں کہ جب یہ سورت اتری تو نبی اکرم ﷺ نے کہا: « نُعِيَتْ إِلَيَّ نَفْسِي فَإِنِّي مَقْبُوضٌ فِي تِلْكَ السَّنَةِ »[2] (تفرد به أحمد) ”مجھے میری وفات کی خبر دی گئی ہے۔ میں اس سال فوت ہو جاؤں گا۔“ یہی قول امام ابو العالیہ، مجاہد، ضحاک رحمہم اللہ اور بہت سے لوگوں کا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو آپ کے انتقال کی خبر دی ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ مدینے میں تھے کہ یکبارگی فرمایا: « اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ جَاءَ أَهْلُ الْيَمَنِ » ”اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ کی مدد اور فتح آ گئی، یمن والے آ گئے۔“ کہا: اے اللہ کے رسول! اہلِ یمن کون ہیں؟ فرمایا: « قَوْمٌ رَقِيقَةٌ قُلُوبُهُمْ لَيِّنَةٌ طِبَاعُهُمْ اَلْإِيمَانُ يَمَانٍ وَالْفِقْهُ يَمَانٍ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَةٌ »[4] (رواه ابن جرير بسنده ثم عن عكرمة مرسلا) ”یہ ایک قوم ہے ان کے دل اور طبیعتیں نرم ہیں، ایمان وفقاہت وحکمت تو یمن کی ہے۔“

---

① صحيح البخاري، (٤٦٨٦) تفسير الطبري (٢٤/٦٦٩) ② مسند أحمد (٢١٧/١) ③ تفسير الطبري (٢٤/٦٧١)

④ تفسير الطبري (٢٤/٦٦٧، ٦٦٨) اس کی سند میں ”حسین بن عیسی حنفی“ ضعیف راوی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب یہ سورت اتری تو نبی اکرم ﷺ امرِ آخرت میں بہت کوشش کرنے لگے۔ پھر فرمایا کہ نصر و فتح آ گئی، اہلِ یمن آئے، پوچھا: وہ کون ہیں؟ کہا:« قومٌ... الخ »۔ یعنی ایک قوم ہے جن کے دل نرم ہیں، طبیعتیں ملائم ہیں، ایمان یمن کا ایمان ہے، فقہ یمن کی فقہ ہے۔[1] (رواہ الطبراني)۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بعض جلساء (ہم نشینوں) نے کہا: اس کے یہ معنی ہیں کہ جب اللہ شہر اور قلعہ جات ہم پر فتح کرے تو ہم اللہ کی حمد و استغفار کریں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ معنی بھی ملیح اور صحیح ہیں، اس کا شاہد یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے دن ضحیٰ کے وقت آٹھ رکعتیں پڑھی تھیں۔[2] بعض نے کہا: یہ صبح کی نماز تھی، اس کا جواب یہ ہے کہ اس پر مداومت نہیں کی، پھر اس دن کس طرح اس کو پڑھا اور نبی اکرم ﷺ مسافر تھے، قیام کرنے کی نیت نہیں فرمائی تھی، رمضان کے آخر تک تقریباً انیس دن رہے اور نماز کو قصر کیا اور تمام لشکر کے ساتھ افطار کیا، یعنی روزہ نہیں رکھا۔ لشکر تقریباً دس ہزار تھا تو یہ نماز فتح مکہ کی ٹھہری، اس لیے یہ کہا ہے کہ جب امیرِ لشکر کوئی شہر فتح کرے تو داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے وہاں آٹھ رکعت نماز پڑھے۔ سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فتحِ مدائن کے دن اسی طرح کیا تھا۔ پھر بعض نے کہا ہے کہ یہ آٹھ رکعتیں ایک سلام سے پڑھے، لیکن صحیح یہ ہے کہ دو دو رکعت پر سلام پھیرے جس طرح کہ سنن ابی داود میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فتح مکہ کے دن ہر دو رکعت پر سلام پھیرا تھا[3] اور جو معنی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہے ہیں کہ مراد اجل و نعیِ نبیِ اکرم ﷺ ہے وہ معنی بھی ٹھیک ہیں۔[4] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ رکوع و سجود میں « سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ » بہت کہا کرتے، قرآن کی تاویل کرتے۔[5] (رواہ الستة إلا الترمذي)

ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ آخر عمر میں یوں بہت کہا کرتے تھے: « سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَأَتُوْبُ إِلَيْهِ » اور فرماتے: میرے رب نے مجھے خبر دی کہ میں اپنی امت میں ایک نشانی دیکھوں گا اور مجھ کو حکم دیا ہے کہ جب میں وہ نشانی دیکھوں تو تسبیح حمد و استغفار کروں، وہ توبہ قبول کرنے والا ہے، پس میں نے وہ نشانی دیکھ لی، اللہ کی نصر و فتح آ گئی، لوگ اللہ کے دین میں فوج درفوج داخل ہونے لگے۔[6] (رواہ مسلم) سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ آخری عمر میں اٹھتے بیٹھتے، جاتے آتے "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ" بہت کہتے تھے۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ یہ کلمہ بہت کہتے ہیں؟ فرمایا: مجھ کو اس کا حکم ہوا ہے۔[7] (رواہ ابن جریر وھو غریب)

---

(1) المعجم الكبير (١١/٣٢٨) (2) صحيح البخاري (١٠٥٢) صحيح مسلم (٣٣٦)

(3) سنن أبي داود (١٢٩٠) اس کی سند میں "عیاض بن عبداللہ" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (ضعيف أبي داود: ٢/٥٠)

(4) تفسير ابن كثير (٤/٧٣١)

(5) صحيح البخاري (٧٨٤) صحيح مسلم (٤٨٤) سنن أبي داود (٨٧٧) سنن النسائي (١١٢٢) سنن ابن ماجه (٨٨٩)

(6) صحيح مسلم (٤٨٤) (7) تفسير الطبري (٢٤/٦٧٠) اس کی سند میں "حفص بن سلیمان" ضعیف راوی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے حدیثِ کفارۂ مجلس جمیع طرق اور الفاظ کے ساتھ ایک جزو مفرد میں لکھی ہے، اس کو اس جگہ لکھنا چاہیے۔ فتح سے مراد اس جگہ فتحِ مکہ ہے یہی ایک قول ہے سب کا۔ احیائے عرب اسلام لانے کے لیے فتح مکہ کا انتظار کرتے تھے، کہتے تھے اگر نبی اکرم ﷺ اپنی قوم پر غالب ہوئے تو وہ پیغمبر ہیں۔ جب مکہ فتح ہو گیا لوگ فوج در فوج دین میں داخل ہونے لگے، دو برس نہ گزرے تھے کہ پورا جزیرۂ عرب ایمان لے آیا اور تمام قبائل عرب میں سے کوئی شخص باقی نہ رہا مگر اس نے اسلام کا اظہار کیا۔[1] وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔ عمرو بن سلمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب فتح ہوئی تو ہر قوم نے اسلام لانے کے لیے نبی اکرم ﷺ کی طرف جلدی کی۔ قبائل اسی کی راہ دیکھتے تھے اور کہتے تھے: چھوڑ دو نبی اکرم ﷺ کو اور اُن کی قوم کو، اگر وہ ان پر غالب ہوں تو سمجھ لو کہ سچے نبی ہیں۔[2] (رواه البخاري)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے غزوۂ فتح کا بیان اپنی کتاب ''السیرۃ'' میں لکھا ہے، اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔[3] وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے افتراقِ مردم (لوگوں کے فرقوں میں مبتلا ہونے) پر رو کر کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا ہے، فرماتے تھے: «إِنَّ النَّاسَ دَخَلُوا فِي دِيْنِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا وَيَخْرُجُوْنَ مِنْهُ أَفْوَاجًا»[4] (رواه أحمد) ''لوگ فوج در فوج اللہ تعالیٰ کے دین میں داخل ہوئے اور وہ فوج در فوج اس سے نکل جائیں گے۔'' میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کا مصداق اس زمانے میں خوب مشاہدہ ہوتا ہے، زمانۂ جابر میں یہ افتراق نہ ہوگا کہ ایک ہزار سنہ ہجری کے بعد اب دنیا میں نظر آتا ہے سیکڑوں مسلمان تارکِ دینِ اسلام ہوتے جاتے ہیں۔ إِنَّا لِلّٰهِ)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے کہ ''نصر'' سے مراد ''عون'' ہے یہ نصرت اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو قریش پر عطا کی بغیر تعیین کے یا تمام جنگ کرنے والے کفار پر۔ ''فتح'' سے مراد فتح مکہ ہے، یا تمام بلاد کی فتح یا فتحِ علوم، لیکن پہلی بات زیادہ ظاہر، دوسری بات مناسب اور تیسری بہت بعید ہے۔ اللہ کے دین سے مراد اسلام ہے۔ لوگ جماعتوں کی جماعتیں مسلمان ہونے لگے۔ پہلے ایک دو دو آدمی اسلام لاتے تھے، اب قبائل کے قبائل فوج در فوج داخل ہونے لگے۔ امام عکرمہ اور مقاتل رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ﴿وَرَاَيْتَ النَّاسَ﴾ سے مراد اہلِ یمن ہیں، سات سو شخص ایک ہی دفعہ آ کر مسلمان ہو گئے۔[5] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھ کر فرمایا: «لَيَخْرُجَنَّ مِنْهُ أَفْوَاجًا كَمَا دَخَلُوْا فِيْهِ أَفْوَاجًا»[6] (أخرجه الحاكم) ''لوگ فوج در فوج اس سے نکل جائیں گے جس طرح فوج در فوج اس میں داخل ہوئے۔''

---

[1] تفسير ابن كثير (٧٣٢/٤) [2] صحيح البخاري (٤٠٥١) [3] تفسير ابن كثير (٧٣٢/٤)

[4] مسند أحمد (٣٤٣/٣) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور اس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ٣١٥٣)

[5] تفسير القرطبي (٢٣٠/٢٠) [6] مستدرك الحاكم (٥٤١/٤) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

یہ نبی اکرم ﷺ کا معجزہ ہے کہ جیسا فرمایا تھا اور جو خبر غربتِ اسلام کی دی تھی، ویسا ہی واقع ہوا، پھر اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو تسبیح، حمد اور استغفار کا حکم دیا۔ نبی اکرم ﷺ اپنے آپ کو اللہ کے حقوق کے قیام میں قاصر سمجھ کر کثرت سے استغفار کرتے، اگرچہ آپ کے سارے اگلے پچھلے گناہ معاف ہو چکے تھے۔ بعض نے کہا: انبیاء علیہم السلام کی استغفار ایک عبادت تھی وہ کچھ گناہ کے سبب سے استغفار نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے ساتھ متعبد تھے (یعنی اس کو عبادت سمجھتے تھے) یا مراد اُمت کے لیے استغفار کرنا ہے۔ تسبیح سے مراد نماز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اس کو پاکی کے معنی پر محمول کریں۔ پھر فرمایا کہ اللہ تواب ہے، یعنی اس کی شانِ کریم یہ ہے کہ جو کوئی اس کی طرف رجوع کرتا ہے بخشش مانگتا ہے، وہ اس پر رحم کرتا ہے اور اس کی توبہ کو قبول فرمالیتا ہے، اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرنے میں مبالغہ کرتا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس سورت کے بعد آیت ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ ... الخ﴾ اتری۔ نبی اکرم ﷺ اس کے بعد اسّی (۸۰) دن زندہ رہے، پھر آیتِ کلالہ اتری، اس کے بعد پچاس (۵۰) دن زندہ رہے، پھر یہ آیت اتری: ﴿ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ﴾ [البقرۃ: ۲۸۱] ''اور اس دن سے ڈرو جس میں تم سب اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔'' اس کے بعد اکیس (۲۱) دن جیے[1] یا سات (۷) دن۔ مکہ رمضان ۸ر ہجری میں فتح ہوا۔ نبی اکرم ﷺ کی وفات ماہ ربیع الاول سالِ دہم کے مکمل ہونے پر ہوئی، یعنی تاریخ ہجرت سے، اگرچہ دو ماہ اور کچھ دن گیارھویں سال کے گزر چکے تھے، اگر تاریخ کا اعتبار اوّل سال محرم سے رکھا جائے۔ چونکہ ہجرت ربیع الاول کی بارہ تاریخ کو ہوئی تھی، اس لیے باقی اسی سال میں شمار کرلیا، اگرچہ دو ماہ بارہ دن کم رہے اور وفات بارھویں تاریخ ربیع الاول کو ہوئی تھی، اس سال میں سے بھی دو ماہ اور بارہ دن پورے گزر چکے تھے، اس لیے سالِ اول کی کمی کو پورا کیا تو اب یہ کہنا کہ وفات دسویں سال میں ہوئی، اس سال کے مکمل اور ختم ہونے کے لحاظ سے صحیح ٹھہرا۔[2] واللہ أعلم.

---

[1] تفسیر القرطبي (۲۰/۲۳۳) [2] فتح البیان (۱۵/۴۲۹۔۴۳۴)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُوۡرَۃُ اللَّھَبِ

اس کو سورت ابی لہب بھی کہتے ہیں۔ اس کی پانچ (۵) آیتیں ہیں۔ یہ بلا اختلاف مکے میں اتری ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن الزبیر اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔[1]

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّ تَبَّ ؕ﴿۱﴾ مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُ مَالُہٗ وَ مَا کَسَبَ ؕ﴿۲﴾
سَیَصۡلٰی نَارًا ذَاتَ لَہَبٍ ۚ﴿۳﴾ وَّ امۡرَاَتُہٗ ؕ حَمَّالَۃَ الۡحَطَبِ ۚ﴿۴﴾
فِیۡ جِیۡدِہَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ ﴿۵﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

ٹوٹ جائیں دونوں ہاتھ ابولہب کے اور وہ ہلاک ہوگیا ① نہ اس کے مال نے اُسے کوئی فائدہ دیا اور نہ اس کی کمائی نے ② عن قریب وہ ضرور بھڑکتی آگ میں داخل ہو گا ③ اور اس کی بیوی بھی جو لکڑیاں ڈھونے والی ہے ④ اس کی گردن میں چھال کی بٹی ہوئی رسی ہو گی ⑤

سورۃ لہب کی شانِ نزول اور ابولہب اور اس کی بیوی کی رسول دشمنی:

ابولہب نبی اکرم ﷺ کا چچا تھا کفر کے مارے آپ ﷺ کی ضد میں پڑ گیا۔ ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ نے سارے قریش کو آواز دے کر جمع کیا۔ اس نے پتھر پھینکا کہ دیوانہ ہے، سب لوگوں کو ناحق پکارتا ہے اور اس کی عورت سخت دشمنی کرتی تھی، کمینہ پن کی وجہ سے۔ جنگل سے ایندھن لاتی اور نبی اکرم ﷺ کی راہ میں کانٹے ڈالتی کہ آتے جاتے آپ کو چبھیں۔ انتھی۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ بطحاء کی طرف نکل کر پہاڑ پر چڑھے اور پکارا: یا صباحاہ! قریش جمع ہو گئے، فرمایا: اگر میں تم کو خبر دوں کہ دشمن صبح یا شام کو تم پر آ کر حملہ کرے گا تو کیا تم میری تصدیق کرو

[1] الدر المنثور (۸/۶۶۵)

گے؟ کہا: ہاں! فرمایا: میں تم کو سامنے ایک عذابِ شدید سے ڈراتا ہوں۔ ابولہب نے کہا کہ تو نے ہم کو اسی لیے جمع کیا ہے؟ تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ﴾ تا آخر سورت۔[1] (رواہ البخاري)

دوسری روایت یہ ہے کہ ابولہب اپنے ہاتھ جھاڑنے لگا اور کہا: "تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ أَلِهَذَا جَمَعْتَنَا"[2] "تیرے لیے ہلاکت ہو کیا تو نے اس کے لیے ہم کو جمع کیا تھا؟" پہلا لفظ یعنی ﴿ تَبَّتْ ﴾ بد دعا ہے اور دوسرا لفظ، یعنی "تب" خبر ہے اس کے حال سے۔ یہ ابولہب نبی اکرم ﷺ کا ایک چچا تھا۔ اس کا نام عبد العزیٰ بن عبد المطلب ہے اور اس کی کنیت ابوعتبہ ہے۔ اس کو ابولہب اس کے چہرے کے سرخ و سفید ہونے کی وجہ سے کہتے تھے۔ یہ نبی اکرم ﷺ کو بہت ایذا دیتا تھا اور آپ ﷺ کو سخت دشمن سمجھتا تھا اور آپ ﷺ سے حقارت کرتا اور عیب لگاتا اور دین میں نقصان نکالتا تھا۔

سیدنا ربیعہ بن عباد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو ذی المجاز بازار میں دیکھا۔ آپ ﷺ فرماتے تھے: اے لوگو! "لا إله إلا الله" کہو، تم مراد کو پہنچو گے۔ آپ ﷺ کے پاس لوگ جمع تھے اور آپ ﷺ کے پیچھے ایک شخص تھا، روشن صورت، گول چہرے والا اور دو بٹی ہوئی زلفوں والا، وہ کہتا تھا کہ یہ شخص صابی ہے، جھوٹ بولتا ہے۔ پھر جدھر آپ ﷺ جاتے آپ ﷺ کے پیچھے جاتا۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ شخص کون ہے؟ کہا: آپ ﷺ کا چچا ہے۔[3] (رواہ أحمد)

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ربیعہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میں اپنے باپ کے ساتھ جوان مرد تھا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ قبائل کے پیچھے جاتے ہیں اور آپ ﷺ کے پیچھے ایک گول اور چمکنے والے چہرے کا ایک آدمی ہے۔ نبی اکرم ﷺ قبیلے پر کھڑے ہو کر فرماتے: اے بنی فلاں! میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تم کو حکم کرتا ہوں کہ تم اللہ کو پوجو، کسی اور کو اس کا شریک نہ کرو اور میری تصدیق کرو اور مجھ کو نہ روکو، تاکہ جو چیز اللہ نے مجھ کو دے کر بھیجا ہے میں اس کو نافذ کروں۔ آپ ﷺ جب یہ بات کہہ چکتے تو ایک شخص آپ ﷺ کے پسِ پشت سے یہ بات کہتا کہ اے بنی فلاں! یہ شخص تم سے یہ بات چاہتا ہے کہ تم لات اور عزیٰ کو چھوڑ دو اور اپنے حلفاء بنی مالک بن اقیش سے دست بردار ہو جاؤ اور جو بدعت اور ضلالت یہ شخص لایا ہے اس کو تم اختیار کرو، سو تم اس کی بات نہ سنو اور اس کی پیروی نہ کرو۔ میں نے اپنے باپ سے پوچھا: یہ کون شخص ہے؟ کہا: یہ آپ ﷺ کا چچا ابولہب ہے۔[4] (رواہ أحمد أیضا والطبراني بهذا اللفظ)

﴿ تَبَّتْ ﴾ کے معنی یہ ہوئے خاسر و خائب ہوا ابولہب اور اس کا عمل اکارت کیا اور اس کا یہ خسارہ اور ہلاکت سچ اور ثابت ہو گیا۔ اس کا مال اس کے کچھ کام نہ آیا اور نہ ہی وہ اس کے کام آیا جو اس نے کمایا۔ سیدنا

---

[1] صحيح البخاري (٤٦٨٨) [2] صحيح البخاري (٤٤٩٢)

[3] مسند أحمد (٣٤١/٤) [4] مسند أحمد (٤٩٢/٣)، المعجم الكبير (٦٣/٥)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ كَسَبَ ﴾ سے مراد "ولد" ہے۔ یہی قول سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، امام مجاہد، عطاء، حسن اور ابن سیرین رحمہ اللہ کا ہے۔ ① سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ نے اپنی قوم کو ایمان کی طرف بلایا تو ابولہب نے کہا: یہ بات جو میرا برادر زادہ کہتا ہے، اگر سچ ہے تو میں قیامت کے دن مال و اولاد فدیہ دے کر اپنی جان کو چھڑا لوں گا۔ اس پر یہ آیت اتری۔ ②

ابولہب کی بیوی کا انجام بد:

"بھڑکنے والی آگ سے مراد شعلے والی اور سخت جلانے والی آگ ہے جو خوب بھڑکتی ہو اور دہکتی چنگاریاں اڑاتی ہو۔" اس کی بیوی قریش کی عورتوں کی سرداروں میں سے تھی، اس کا نام ام جمیل یا اروی بنت حرب بن امیہ ہے۔ یہ ابوسفیان کی بہن ہے، یہ کفر، انکار اور دشمنی میں اپنے شوہر کی مددگار تھی، لہٰذا قیامت کے دن بھی جہنم میں اس کے ساتھ عذاب میں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: اس کی گردن میں رسّی ہے، وہ جہنم کا ایندھن اٹھا کر اپنے خاوند پر ڈالے گی، تاکہ جس عذاب میں وہ ہے وہ اُور زیادہ ہو جائے۔ گویا یہ عورت اس کام کے لیے تیار اور مستعد ہو رہی ہے اس لیے اپنے گلے میں مونج کی رسی لٹکائے پھرتی ہے۔

امام مجاہد اور عروہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ رسی آگ کی ہے۔ امام مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ، ثوری اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حملِ حطب سے مراد نمیمہ ہے، وہ چغل خوری کرتی تھی۔ ③ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، عطیہ، ضحاک اور ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی راہ میں کانٹے ڈالتی تھی۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو محتاجی کی عار لگاتی تھی اور خود ہیزم کش تھی، اس لیے خود اس کی نسبت یہ عار لگائی گئی، لیکن صحیح بات پہلی ہے۔ واللہ أعلم.

سعید بن مسیب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک عمدہ گلوبند تھا، کہنے لگی کہ میں اس کو نبی اکرم ﷺ کی عداوت میں خرچ کروں گی، اللہ نے اس کے عوض آگ کی ایک رسی اس کے گلے میں تجویز فرمائی۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد ﴿ مَسَدٍ ﴾ سے لیف یعنی چھال ہے۔ ④ امام عروہ بن زبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَسَدٍ ﴾ ستر (۷۰) گز کی ایک زنجیر ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آگ کا ایک گلوبند ہے جس کا طول ستر (۷۰) ہاتھ ہوگا۔ ⑤ جوہری نے کہا ہے کہ ﴿ مَسَدٍ ﴾ چھال کو کہتے ہیں یا چھال کی رسی کو یا خوص کو یعنی کھجور کا پتا۔ پھر کبھی یہ رسی اونٹ کی کھال

① تفسير الطبري (٦٧٧/٢٤) تفسير ابن كثير (٧٣٣/٤) ② تفسير البغوي (٥٨٢/٨)

③ تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٧٣/١٠) تفسير الطبري (٦٧٩/٢٤)

④ تفسير الطبري (٦٧٨/٢٤، ٦٧٩) تفسير ابن كثير (٧٣٤/٤) ⑤ تفسير الطبري (٦٨١/٢٤)

کی ہوتی ہے یا اس کے بالوں کی۔ جب بالوں کو گوندھ کر رسی بنائی تو وہ "مسد" ہوئی۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَسَدٍ ﴾ سے مراد آہنی طوق ہے۔[2]

اسماء بنت ابو بکر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب یہ سورت اتری تو عوراء ام جمیل بنت حرب بڑے ولولے میں آئی اور اس کے ہاتھ میں ایک رسی تھی، کہنے لگی: "مُذَمَّمًا أَبَيْنَا، وَدِيْنَهُ قَلَيْنَا، وَأَمْرَهُ عَصَيْنَا" "مذمم کا ہم نے انکار کیا، اس کے دین کو ہم نے ناپسند کیا اور اس کے حکم کا ہم نے انکار کیا۔" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس کو دیکھ کر کہا: اے اللہ کے رسول! یہ مردار آتی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ آپ کو دیکھ لے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ مجھے نہیں دیکھے گی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھا اور اعتصام کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٤٥] "تو جب قرآن پڑھتا ہے ہم تیرے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے ایک پوشیدہ حجاب ڈال دیتے ہیں۔" وہ آ کر سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑی ہوئی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا اور ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا: مجھے خبر لگی ہے کہ تیرے یار نے میری ہجو کی ہے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں، اس گھر کے رب کی قسم! تیری ہجو نہیں کی۔ وہ یہ کہتے ہوئے چلی گئی کہ قریش یہ بات جانتے ہیں کہ میں ان کے سردار کی بیٹی ہوں۔ ولید نے کہا: ام جمیل کو اس کی چادر میں ٹھوکر لگی، وہ اپنی اوڑھنی میں بیت اللہ کا طواف کر رہی تھی، کہا: "تَعِسَ مُذَمَّمٌ" "مذمم برباد ہو۔" اُم حکیم بنت عبد المطلب نے کہا ہے کہ میں حصان ہوں، میں بات نہ کروں گی اور ثقاف (دانا، عقلمند) ہوں، کچھ نہیں جانتے، ہم سب ایک چچا کی اولاد ہیں اب قریش جانیں۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب ﴿ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ﴾ نازل ہوئی تو ابولہب کی بیوی آئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بیٹھے تھے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ آپ علاحدہ ہو جائیں یہ کہیں آپ کو نہ ستائے۔ فرمایا: میرے اور اس کے درمیان حیلولت (آڑ) ہو جائے گی، وہ آ کر ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑی ہوئی اور کہا: اے ابو بکر! تیرے صاحب نے ہماری ہجو کی ہے، کہا: نہیں "وَرَبِّ هٰذَا الْبَنِيَّةِ" "اس گھر کے رب کی قسم!" وہ شعر نہیں کہتے اور نہ شعر پڑھتے ہیں۔ کہا: تم سچ کہتے ہو۔ جب پھر کر چلی تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اس نے آپ کو نہیں دیکھا۔ فرمایا: ایک فرشتے نے مجھ کو اس سے اوٹ میں کر لیا، یہاں تک کہ وہ پھر گئی۔[4] (رواه البزار وقال: لا نعلمه يروى أحسن من هذا الإسناد عن أبي بكر)

بعض اہل علم نے کہا ہے کہ رسّی سے مراد نارِ جہنم کی رسّی ہے جو اس کے گلے میں ہو گی اسی رسی کو گھسیٹ کر کنارۂ جہنم میں ڈالی جائے گی، پھر ہمیشہ وہ رسی اس کی گردن میں رہے گی۔ ابو حنیفہ دینوری نے کہا ہے کہ اس سے

---

[1] الصحاح للجوهري (٣/١٠٠، ١٠١) [2] تفسير الطبري (٢٤/٦٨١)

[3] مسند الحميدي (١/١٥٣) مستدرك الحاكم (٢/٢٩٣) [4] مسند البزار (١/٦٨)

مراد ڈول کی رسی ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ اس سورت میں ایک ظاہر معجزہ ہے اور نبی اکرم ﷺ کی نبوت پر ایک واضح دلیل ہے کہ جب سے یہ سورت اتری اور آپ ﷺ نے ابولہب اور امِ جمیل کے حال کی خبر دی کہ وہ شقی ہیں، ایمان نہ لائیں گے، کسی کو ان کے ایمان لانے پر مقرر نہ کیا، نہ ظاہر میں نہ باطن میں، نہ پوشیدگی کے ساتھ اور نہ اعلانیہ طور پر، یہ نبوتِ ظاہرہ پر ایک قوی دلیل ہے۔[1] وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان میں کہا ہے ﴿ تَبَّتْ ﴾ بہ معنی "خَسِرَتْ وَخَابَتْ وَضَلَّتْ" ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہر خیر سے خالی ہے۔ ہاتھ کا ذکر اس لیے کیا کہ اکثر کام ہاتھ سے ہوتے ہیں، یا دونوں ہاتھ سے مراد اس کی ذات ہے۔ اللہ نے عبد العزیٰ کا ذکر کنیت سے کیا، اس لیے کہ وہ اسی کنیت سے مشہور تھا اور عزیٰ بت کا نام ہے۔ اس کنیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ وہ ملابسِ نار رہے گا یعنی آگ میں ملبوس رہے گا، یا اس کے ہر طرف آگ ہوگی، کیوں کہ ﴿ لَهَبٍ ﴾ شعلۂ نار کو کہتے ہیں، اگرچہ اس کو ابولہب اس کی خوبصورتی کی وجہ سے کہتے تھے، اس کا چہرہ حسن کی وجہ سے چمکتا تھا جس طرح کہ آگ چمکتی ہے، یا اللہ نے یہ چاہا کہ اس کی نسبت کو ثابت کرے اور اسے جہنم میں لے جائے، تاکہ اس کی ابولہبیت حقیقی طور پر ثابت ہو اور جو فالِ بد اس نے اپنے لیے اختیار کی ہے وہ پوری ہو جائے۔[2] (قاله القرطبي)

بعض نے کہا ہے کہ اس کا نام یہی اس کی کنیت تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کا مال اور کسب اس کے کام نہ آیا اور نہ ہی اس کے جاہ وعزت اور اولاد نے اس کو کوئی فائدہ دیا۔ بلکہ اب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں گھسے گا۔ یہ جہنم کی آگ ہے اور اس کی بیوی جو ہیزم کش ہے، وہ بھی آگ میں جائے گی۔ وہ ایک آنکھ کی کانی تھی، خاردار درخت لادکر لاتی اور رات کو نبی اکرم ﷺ کی راہ میں ڈالتی تھی۔ "جید" گردن کو کہتے ہیں اور ﴿ مَسَدٍ ﴾ لیف کو جس سے رسی بنتے ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یمن میں ایک درخت ہوتا ہے جس کی چھال سے رسی بٹی جاتی ہے، اس کو ﴿ مَسَدٍ ﴾ کہتے ہیں۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ رسیاں مکے میں ہوتی ہیں۔[4]

---

[1] تفسير ابن كثير (٧٣٥،٧٣٤/٤)
[2] تفسير القرطبي (٢٣٧/٢٠)
[3] تفسير القرطبي (٢٣٧/٢٠)
[4] تفسير الطبري (٦٨١،٦٨٠/٢٤) فتح البيان (٤٤٠-٤٣٧/١٥)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْإِخْلَاص

سورة الاِ خلاص کی شانِ نزول اور فضیلت:

اس سورت کے نام بہت ہیں، خطیب رحمہ اللہ نے ذکر کیے ہیں۔ ناموں کا زیادہ ہونا اس چیز کے شرف کی دلیل ہوتی ہے جس کا نام رکھا جائے۔ اس سورت میں توحید کی صراحت اور بت پرستوں پر رد اور قائلینِ تثنیہ و تثلیث (دو یا تین معبودوں کے قائل) کا انکار ہے۔ اس کی چار (۴) یا پانچ (۵) آیتیں ہیں اور مکے میں اتری ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام حسن، عطاء، عکرمہ اور جابر کا ہے اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام قتادہ، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مدنی ہے۔[1] سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مشرکوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا: اے محمد! تم ہم کو اپنے رب کا نسب بتاؤ۔ اس پر اللہ نے یہ سورت بھیجی، جو شے پیدا ہوتی ہے وہ مرتی ہے اور جو مرتی ہے اس کی وراثت لی جاتی ہے، اللہ نہ مرے اور نہ کوئی اس کا وارث بنے۔ اللہ کا کوئی شبیہ عدیل نہیں ہے۔ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ: ۱۱] ''اس جیسی کوئی چیز نہیں۔''[2] (رواه أحمد و البخاري في تاريخه و ابن خزيمة و الحاكم و صححه)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اس کو امام ابو العالیہ رحمہ اللہ سے مرسلاً روایت کیا ہے اور ابی رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں کیا اور کہا ہے کہ یہ اصح ہے۔[3] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک اعرابی نے آ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ''اُنْسُبْ لَنَا رَبَّكَ'' ''ہمیں اپنے رب کا نسب بتاؤ۔'' اس پر یہ سورت آئی۔[4] (أخرجه الطبراني والبيهقي وأبو نعيم وغيرهم وحسن السيوطي إسناده) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ قریش نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ''اُنْسُبْ لَنَا رَبَّكَ'' پس یہ سورت نازل ہوئی۔[5] (أخرجه أبو الشيخ والطبراني) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ یہود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، ان میں کعب بن اشرف اور حیی بن اخطب بھی تھے۔ انھوں نے کہا: اے محمد! ''صِفْ لَنَا رَبَّكَ الَّذِيْ بَعَثَكَ'' اللہ تعالیٰ نے یہ سورت بھیجی۔[6] (رواه البيهقي)

---

[1] تفسير القرطبي (۲۰/۲٤٤) [2] مسند أحمد (۵/۱۳۳) مستدرك الحاكم (۲/۵۸۹) [3] سنن الترمذي (۳۳٦۵)
[4] المعجم الأوسط (٦/۲۵) شعب الإيمان (۲/۵۰۸) حلية الأولياء (٤/۳۳۵) الدر المنثور (۸/٦٦۹)
[5] الدر المنثور (۸/٦۷۰) [6] الأسماء والصفات (۲/۳۸، ۳۹) اس کی سند میں ''عبداللہ بن عیسیٰ'' ضعیف راوی ہے۔

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ رفعاً کہتے ہیں کہ جس نے یہ سورت پڑھی گویا ثلث قرآن پڑھا۔[1] (أخرجه أحمد والنسائي وغيرهما) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: "إِنِّي أُحِبُّ هَذِهِ السُّوْرَةَ"، "میں اس سورت سے محبت کرتا ہوں۔" فرمایا: « حُبُّكَ إِيَّاهَا أَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ »[2] (رواه أحمد والترمذي والبيهقي) "تیری اس سے محبت تجھے جنت میں داخل کر دے گی۔" اس بارے میں کہ جس نے اس سورت کو پڑھا اس کے گناہ چنیں و چناں بخشے گئے، بہت سے حدیثیں سنن وغیرہ میں آئی ہیں، لیکن ضعیف غریب ہیں اور بعض موضوع ہیں۔ ہاں قرآن کا ایک تہائی ہونا اس کا کئی طرح سے ثابت ہوا ہے۔ بعض روایات صحیح اور بعض حسن ہیں۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ یہ سورت ثلث قرآن کے برابر ہے۔[3] (رواه أحمد والبخاري وغيرهما)

یہ سورت باوجود چھوٹی ہونے کے تمام معارفِ اسلامیہ پر مشتمل ہے اور ملحد پر رد کرتی ہے۔ حدیث میں اس کو ثلثِ قرآن کہا ہے، کیوں کہ قرآن کے مقاصد عقائد و احکام و قصص میں محصور ہیں۔ کشاف میں جو یہ کہا ہے کہ سارے قرآن کے برابر ہے سوذوانی نے کہا ہے کہ میں نے یہ روایت کتبِ تفسیر و حدیث میں نہیں دیکھی۔[4] انتھیٰ.

اس کی فضیلت میں اگر اور کچھ نہ آتا مگر یہی ایک حدیث جو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیحین وغیرہما میں مروی ہے تو وہ کافی تھی، یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ایک چھوٹے سے لشکر میں بھیجا تھا، وہ اپنے اصحاب کو نماز پڑھاتا اور اسی سورت پر ختم کرتا، وہ لوگ جب واپس آئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، فرمایا: اس سے معلوم کرو کہ وہ یہ کام کس لیے کرتا ہے؟ پوچھا: تو اس نے کہا ہے کہ یہ رحمان کی صفت ہے اور میں اس کا پڑھنا دوست رکھتا ہوں۔ فرمایا: اس کو خبر کر دو کہ اللہ تعالیٰ اس کو دوست رکھتا ہے۔[5] (هذا لفظ البخاري في كتاب التوحيد)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ بخاری کی کتاب الصلاۃ میں یوں ہیں کہ ایک انصاری مرد مسجد قبا میں نماز کی امامت کرتا تھا، جب کوئی سورت نماز میں پڑھتا جو سورتیں نماز میں پڑھی جاتی ہیں تو اس کو اسی سورت سے آغاز کرتا کہ پہلے ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھتا، پھر کوئی اور سورت پڑھتا۔ ہر رکعت میں اسی طرح کیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اس سے اس بارے میں گفتگو کی کہ تو نماز کو اس سورت سے کیوں شروع کرتا ہے، کیا تو اس کو کافی نہیں سمجھتا اور دوسری سورت بھی پڑھتا ہے، یا تو تو اسی سورت کو پڑھا کر یا اس کو پڑھنا چھوڑ دے اور دوسری سورت پڑھ۔ اس نے کہا: میں اس کا پڑھنا ہرگز نہیں چھوڑوں گا، تمھاری خوشی ہو تو میں امامت کروں اور اگر خوشی نہ ہو تو

---

[1] مسند أحمد (١٤١/٥) سنن النسائي البيهقي الكبرىٰ (١٧٤/٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٣٠٧/٧)

[2] مسند أحمد (١٤١/٣)

[3] صحيح البخاري (٦٢٦٧) مسند أحمد (٣٥/٣)

[4] فتح البيان (٤٤٥/١٥)

[5] صحيح البخاري (٦٩٤٠)

امامت کرنا چھوڑ دوں۔ وہ لوگ اس کو افضل جانتے تھے، کسی اور کا امامت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب نبی اکرم ﷺ کا اس طرف جانا ہوا تو آپ ﷺ سے یہ حال بیان کیا۔ فرمایا: اے فلاں! تجھ کو اس بات سے کون مانع ہے کہ تو اپنے ساتھیوں کی بات مان لے اور تو نے اس سورت کو نماز کی ہر رکعت میں پڑھنا لازمی کیوں اختیار کر لیا ہے؟ اس نے کہا ہے کہ "إِنِّيْ أُحِبُّهَا" "میں اس سے محبت کرتا ہوں۔" فرمایا[1]: « حُبُّكَ إِيَّاهَا أَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ » "تیری اس سے محبت تجھے جنت میں لے جائے گی۔"

ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث کئی طرح پر سوائے بخاری کے اور ائمۂ حدیث نے بھی روایت کی ہے۔ یہ سورت توحید اور صفاتِ الٰہی کے بیان کے لیے مجرد ہے۔ اس میں علم کے شرف کی دلیل ہے۔ توحید کے متعلق علم کا شرف معلوم ہی کی وجہ سے ہوتا ہے سو اس علم کا معلوم اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات ہیں کہ کون چیز اللہ کے وصف میں جائز ہے اور کون سی ناجائز ہے تو اب اس سورت کے شرفِ منزلت اور جلالتِ محل کا کیا پوچھنا۔ توحید کے بیان میں اہلِ دین نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، جیسے: دینِ خالص، تقویۃ الایمان، دعایۃ الایمان، درنضید، تطہیر الاعتقاد اور تجرید التوحید المفید الی غیر ذلک۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ حرانی اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ کی تالیفات اس بارے میں ایسی ہیں جیسے محراب میں خطیب ہو۔ یہ وہ علم ہے جس کے مدعی بہت ہیں، لیکن سوا چند علماء وفحول اہلِ علم کے اس کی باریکیوں کو کوئی نہیں پہنچا، حالاں کہ شرک کے ستر (۷۰) دروازے ہیں اور بدعت کے بہتر (۷۲) دروازے۔ شرک جلی سے تو بعض اہلِ اسلام بچ بھی جاتے ہیں لیکن شرکِ خفی سے بچنا اسی کو نصیب ہوتا ہے جس کو اللہ کی طرف سے توفیق دی جاتی ہے۔ اللهم اهدنا الصراط المستقيم، صراط الذين أنعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين. آمين!

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک مرد نے ایک شخص کو سنا کہ وہ بار بار ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھتا ہے، صبح کو آ کر نبی اکرم ﷺ سے ذکر کیا، گویا اس نے اس عمل کو قلیل اور حقیر جانا، فرمایا: « وَالَّذِي نَفْسِيْ بِيَدِهِ إِنَّهَا لَتَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ »[2] (ورواه النسائي أيضًا) "قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یقیناً وہ ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔" سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: کیا تم میں کوئی اس بات سے عاجز ہے کہ ایک رات میں تہائی قرآن پڑھے؟ یہ بات ان پر شاق گزری اور کہا: ہم میں یہ طاقت کس کو ہے۔ فرمایا: « اَللّٰهُ الْوَاحِدُ الصَّمَدُ » ثلث قرآن ہے۔[3] (تفرد به البخاري) ان کی تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک رات قتادہ ابن نعمان اسی سورت کو پڑھتے رہے۔ اس کا ذکر نبی اکرم ﷺ سے ہوا، فرمایا: واللہ! یہ سورت نصف یا ثلث قرآن کے برابر ہے۔[4] (رواه أحمد).

---

[1] صحيح البخاري (٧٤١) [2] صحيح البخاري (٤٧٢٦) سنن النسائي (٩٩٥)
[3] صحيح البخاري (٤٧٢٧) [4] مسند أحمد (١٥/٣) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ پوری رات میں ایک سورت یا ایک آیت کو بار بار پڑھنا صحیح ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ ایک مجلس میں یہ بات کہہ رہے تھے کہ کیا تمھارا ایک آدمی ہر رات میں ایک تہائی قرآن نہیں پڑھ سکتا؟ لوگوں نے کہا: کس کو اتنی طاقت ہے؟ کہا: ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ ثلث قرآن ہے، اتنے میں نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے اور ابو ایوب رضی اللہ عنہ کی بات سنی۔ فرمایا: « صَدَقَ أَبُو أَيُّوبَ » [1] (رواه أحمد) ''ابو ایوب نے سچ کہا ہے۔'' سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جمع ہو جاؤ میں تم پر ثلث قرآن پڑھوں گا، لوگ جمع ہو گئے۔ نبی اکرم ﷺ نے باہر آ کر ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھی، پھر چلے گئے۔ بعض نے بعض سے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے تو یہ فرمایا تھا کہ میں ثلث قرآن پڑھوں گا، ہم سمجھے تھے کہ کوئی خبر آسمان پر سے آئی ہو گی آپ ﷺ نے نکل کر فرمایا: میں نے تم سے کہا تھا، وہ ٹھیک ہے؛ « أَلَا وَإِنَّهَا تَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ » [2] (هكذا رواه مسلم ورواه الترمذي وقال: حسن صحيح غريب) ''سن لو! وہ ثلث قرآن ہے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس جگہ بہت سی حدیثیں اس سورت کے ثلث قرآن ہونے کے بارے میں نقل کی ہیں۔ سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے کہا کہ کیا تم میں سے ایک شخص اس بات سے عاجز ہے کہ ہر دن ایک تہائی قرآن پڑھے؟ کہا: ہاں اے اللہ کے رسول! ہم اس سے بہت ضعیف اور بہت عاجز ہیں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے قرآن کے تین ٹکڑے کیے؛ ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ ثلث قرآن ہے۔ [3] (رواه أحمد ومسلم والنسائي) اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اس سورت کو ہر شخص ہر شب ہر روز ضرور پڑھ لیا کرے۔ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں بھی اس کو ثلث قرآن ٹھہرایا ہے۔ [4] (رواه أحمد والنسائي في اليوم والليلة)۔ حمید بن عبد الرحمان کہتے ہیں کہ چند صحابی آپس میں نبی اکرم ﷺ سے یہ حدیث روایت کرتے تھے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ثُلُثُ الْقُرْآنِ لِمَنْ صَلَّى بِهَا » [5] (رواه النسائي) یعنی اس کا نماز میں پڑھنا ایک تہائی قران پڑھنے کے برابر ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ آیا، آپ ﷺ نے ایک شخص کو سنا کہ وہ ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ پڑھتا ہے۔ فرمایا: واجب ہو گئی! میں نے کہا: کیا چیز؟ فرمایا: جنت۔ [6] (رواه مالك بن أنس والترمذي و النسائي وقال الترمذي: حسن صحيح غريب) نیز یہ حدیث کہ « حُبُّكَ إِيَّاهَا أَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ » پہلے گزر چکی ہے۔ عبداللہ بن حبیب رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ہم کو پیاس اور تاریکی پہنچی، ہم منتظر تھے کہ نبی اکرم ﷺ

---

[1] مسند أحمد (١٧٣/٢) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ [2] صحيح مسلم (٨١٢) سنن الترمذي (٢٩٠٠)

[3] صحيح مسلم (٨١١) مسند أحمد (٤٤٣/٦) سنن النسائي الكبرىٰ (١٧٦/٦)

[4] مسند أحمد (٤٠٤/٦) سنن النسائي الكبرىٰ (١٧٥/٦) [5] سنن النسائي الكبرىٰ (١٧٥/٦)

[6] الموطأ (٢٠٨/١) سنن الترمذي (٢٨٩٧) سنن النسائي (٩٩٤)

آ کر نماز پڑھائیں، آپ ﷺ آئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہا: پڑھ، میں چپکا رہا، پھر فرمایا: کہہ میں نے کہا: کیا کہوں؟ فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ اور معوذتین شام و صبح تین بار، تجھ کو یہ ہر دن دو بار کفایت کریں گے۔[1] (رواه عبدالله بن أحمد و أبو داود والترمذي و النسائي وقال الترمذي: حسن صحيح غريب)

تمیم داری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جس نے کہا: ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاحِدًا أَحَدًا صَمَدًا لَمْ يَتَّخِذْ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ“ گیارہ بار تو اللہ اس کے لیے چالیس لاکھ نیکیاں لکھتا ہے۔[2] (رواه أحمد)۔ اس کی سند میں خلیل بن مرہ ہے، بخاری وغیرہ نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جس نے ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ کو دس بار پورا پڑھا، اللہ اس کے لیے بہشت میں ایک محل بناتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اب ہم اس کو بہت پڑھا کریں گے اے اللہ کے رسول! فرمایا: «اَللّٰهُ أَكْثَرُ وَأَطْيَبُ»[3] (تفرد به رواه أحمد) ”اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ اور اس سے بھی اچھے دینے والا ہے۔“

مسند دارمی میں اتنا اور زیادہ ہے کہ جو کوئی بیس بار پڑھے گا اس کے لیے دو محل اور جو تیس بار پڑھے گا اس کے لیے تین محل تیار ہوں گے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: اب ہمارے محلات بہت سے ہو جائیں گے۔ فرمایا: «اَللّٰهُ أَوْسَعُ مِنْ ذٰلِكَ»[4] (وهذا مرسل جيد) ”اللہ تعالیٰ کے پاس بڑی وسعت ہے۔“ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت رفعاً یہ ہے کہ جو کوئی ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ کو پچاس بار پڑھتا ہے اللہ اس کے پچاس برس کے گناہ بخش دیتا ہے۔[5] (رواه أبو يعلىٰ) لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سورۃ الاخلاص کی فضیلت کے بیان میں احادیثِ کثیرہ نقل کی ہیں جن میں دو سو بار پڑھنے کا اجر آیا ہے لیکن زیادہ تر ضعیف ہیں۔

سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ مسجد میں آیا، ایک شخص نماز میں یہ دعا کرتا تھا: ”اَللّٰهُمَّ أَسْأَلُكَ بِأَنِّي أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ“ ”اے اللہ! بے شک میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہی ایک ہے، بے نیاز ہے، جو نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور نہ تیرا کوئی ہمسر ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَقَدْ سَأَلَهُ بِاسْمِهِ الْأَعْظَمِ الَّذِي إِذَا سُئِلَ بِهِ أَعْطَى وَإِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ»[6] (رواه أهل السنن وقال الترمذي: حسن غريب) ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اس شخص نے اللہ تعالیٰ کے اس اسمِ اعظم

---

① مسند أحمد (٣١٢/٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٠٨٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٧٥) تفسير الطبري (٥٤٢٨٩) صحيح الترغيب والترهيب (١٥٨/١)

② مسند أحمد (١٠٣/٤) اس کی سند میں ”خلیل بن مرہ“ ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٦١٣)

③ مسند أحمد (٤٣٧/٣) اس کی سند میں ایک سے زیادہ ضعیف راوی ہیں۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ٢٢٤/١)

④ سنن الدارمي (٥٥١/٢) یہ روایت مرسل ہے۔ ⑤ سنن الدارمي (٥٥٣/٢)

⑥ سنن أبي داود (١٤٩٣) سنن الترمذي (٣٤٧٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٣٩٤/٤) سنن ابن ماجه (٣٨٥٧) صحيح الترغيب والترهيب (١٣٠/٢)

کے واسطے سے دعا کی ہے کہ جس کے واسطے سے جب اس سے سوال کیا جائے تو وہ عطا فرما دیتا ہے اور اگر دعا کی جائے تو وہ شرفِ قبولیت سے سرفراز کرتا ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اس کا مغرب کے بعد دس بار پڑھنا آیا ہے۔ فرمایا: جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو اور جس حورِ عین کو چاہے بیاہے۔[1] (رواه أبو يعلىٰ)۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی سند پر کچھ تکلم نہیں کیا۔ جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ جو کوئی گھر میں داخل ہوتے وقت اس کو پڑھے گا اس گھر والوں سے اور اس کے ہمسایوں سے فقر دور ہو گا۔[2] (رواه الطبراني) لیکن اس کی اسناد ضعیف ہے۔

سورۃ الاخلاص کی تمام حالات میں کثرت کے ساتھ قراءت کرنے کے بارے میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تبوک میں تھے۔ سورج نکلا اور اس دن جیسی روشنی اور شعاع چمک پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جبریل علیہ السلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: آج یہ کیسی چمک ہے اور روشنی ہے کہ اس جیسی کبھی نہیں دیکھی؟ کہا: معاویہ بن معاویہ لیثی کا مدینے میں انتقال ہو گیا ہے۔ اللہ نے ستر ہزار فرشتے بھیجے کہ ان پر نماز پڑھیں۔ کہا: یہ کس سبب سے؟ کہا: وہ رات دن چلتے ہوئے اور کھڑے بیٹھے ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھا کرتے تھے۔[3] (الحديث رواه أبو يعلىٰ) اس کی سند میں علاء ابو محمد ثقفی ہے جس پر حدیث وضع کرنے کی تہمت لگائی گئی ہے۔ یہ حدیث کئی طرق سے آئی ہے، اس کی سب اسانید ضعیف ہیں۔

اس کی فضیلت معوذتین کے ساتھ بھی وارد ہوئی ہے اور اس کے ساتھ استشفاء (شفا طلب کرنا) کا ذکر بھی آیا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو بستر پر آتے تو ہر رات دونوں ہتھیلیاں جمع کر کے دم کرتے اور یہ سورت معوذتین کے ساتھ پڑھ کر جہاں تک بدن پر ہاتھ پھیرا جا سکتا تھا مسح فرماتے، سر اور چہرے اور سامنے کے بدن سے ہاتھ پھیرنا شروع کرتے اور تین بار ایسے ہی کرتے۔[4] (رواه أهل السنن)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

① مسند أبي يعلىٰ (۳۳۲/۳) اس کی سند میں ''عمر بن نبهان'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ۲۵۴۱)

② المعجم الكبير (۳۴۰/۲) اس کی سند میں ''مروان بن سالم'' سخت ضعیف راوی ہے۔

③ مسند أبي يعلىٰ (۲۵۶/۷) اس کی سند میں ''علاء ثقفی'' سخت ضعیف راوی ہے۔ (مجمع الزوائد: ۶۳۰/۹)

④ صحيح البخاري (۴۱۲۹) سنن أبي داود (۵۰۵۶) سنن الترمذي (۳۴۰۲) سنن النسائي الكبرىٰ (۱۹۷/۶) سنن ابن ماجه (۳۸۷۵) تفسير ابن كثير (۷۴۱_۷۳۶/۴)

(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: وہ اللہ ایک ہے① اللہ بے نیاز ہے② اس نے (کسی کو) نہیں جنا اور نہ وہ (خود) جنا گیا③ اور کوئی ایک ہی اس کا ہمسر نہیں④

سورۃ الاخلاص کا شانِ نزول اور صفاتِ الٰہیہ کا بیان:

صمد ہے یعنی کھاتا پیتا نہیں، اس کی طرح کا کوئی نہیں، یعنی نہ جورو رکھے نہ بیٹا۔ انتہی[1].

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہود نے کہا کہ ہم عزیر ابن اللہ کے عابد ہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ ہم مسیح ابن اللہ کے عابد ہیں اور مجوس نے کہا کہ ہم سورج اور چاند کے عابد ہیں اور مشرکوں نے کہا کہ ہم بت پرست ہیں، تب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ سورت اتاری اور فرمایا: تو کہہ کہ اللہ ایک ہے اس کا نظیر، وزیر، ہمسر اس جیسا برابری والا کوئی نہیں ہے۔ اس لفظ کا اطلاق اللہ عزوجل کے سوا کسی پر نہیں ہوتا، کیوں کہ وہی اپنی ساری صفات و افعال میں کامل ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ صمد وہ ہے جس کی طرف تمام مخلوق اپنی حاجات اور مسائل میں محتاج ہو۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ صمد اس کو کہتے ہیں جو سیادت و شرافت وعظمت وحلم وعلم وحکمت میں کامل ہو۔ سو ایسا شخص فقط اللہ پاک ہے۔ یہ صفات اسی کے لائق ہیں اور کوئی اس کے جوڑ کا نہیں ہے اور نہ کوئی شے اس جیسی ہے۔ فَسُبْحَانَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ ابو وائل نے کہا: صمد وہ سید ہے جو سیادت میں حد تک پہنچ گیا ہے۔ یہی قول عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔ امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا کہ صمد بہ معنی سید ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی خلق کے بعد باقی اور حی و قیوم جس کو زوال نہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ صمد وہ ہے جس سے کوئی شے باہر نہ نکلے اور کھانا نہ کھائے۔ امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا کہ یعنی وہ جس نے کسی کو نہ جنا اور نہ کسی سے جنا گیا، گویا ابعد کو اس لفظ کی تفسیر ٹھہرایا ہے۔ یہ تفسیر جید ہے۔

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام سعید بن مسیّب، مجاہد، ابن بریدہ، عکرمہ، سعید بن جبیر، عطاء، عطیہ، ضحاک اور سدی رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ صمد وہ ہے جس کا جوف نہ ہو، یعنی ٹھوس ہو پولا (نرم) نہ ہو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ مراد صمد بغیر پیٹ کے ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صمد وہ ہے جو نہ کھائے نہ پیے۔ امام ابن بریدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صمد ایک نور ہے۔ بریدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صمد وہ ہے جس کا جوف نہ ہو، یعنی اندرون شکم نہ ہو۔ امام ابو القاسم طبرانی رحمہ اللہ نے "کتاب السنة" میں ان اقوال کے ذکر کے بعد کہا ہے کہ یہ سب معانی صحیح ہیں۔ ہمارے رب کی صفتیں ہیں سب اسی کے محتاج ہیں۔ وہ اپنی سرداری میں انتہا کو پہنچ گیا ہے، نہ اس کا پیٹ ہے نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے، خلق کے بعد باقی رہے گا۔ اسی طرح

بیہقی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے، پھر والد ولد و صاحبہ کی نفی فرمائی۔[1]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ كُفُوًا ﴾ سے مراد صاحبہ ہے،[2] جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ [الأنعام: ١٠١] ''وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اللہ تعالیٰ کے اولاد کہاں ہوسکتی ہے حالاں کہ اس کے کوئی بیوی تو ہے نہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا۔'' یعنی جبکہ وہ ہر چیز کا خالق اور مالک ٹھہرا تو پھر مخلوق میں اس کا نظیر کہاں سے آئے گا جو اس کی برابری کر سکے۔ تعالَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ وَتقدَّس وَتنزَّه۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴾ [مریم: ٨٨- ٩٥] ''ان کا قول تو یہ ہے کہ اللہ رحمٰن نے بھی اولاد اختیار کی ہے، یقیناً تم بہت بری اور بھاری چیز لائے ہو۔ قریب ہے کہ اس قول کی وجہ سے آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں کہ وہ رحمٰن کی اولاد ثابت کرنے بیٹھے۔ شانِ رحمٰن کے لائق نہیں کہ وہ اولاد رکھے آسمان وزمین میں جو بھی ہیں سب کے سب اللہ کے غلام بن کر ہی آنے والے ہیں۔ ان سب کو اس نے گھیر رکھا ہے اور سب کو پوری طرح گن بھی رکھا ہے۔ یہ سارے کے سارے قیامت کے دن اکیلے اس کے پاس حاضر ہونے والے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ﴾ [الانبیاء: ٢٦- ٢٧] ''(مشرک لوگ) کہتے ہیں کہ رحمٰن اولاد والا ہے (غلط ہے) اس کی ذات پاک ہے، بلکہ وہ سب اس کے باعزت بندے ہیں۔ کسی بات میں اللہ پر پیش دستی نہیں کرتے بلکہ اس کے فرمان پر کاربند ہیں۔'' نیز فرمایا ہے: ﴿ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ۭ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴾ [الصّٰفّٰت: ١٥٨- ١٥٩] ''اور ان لوگوں نے تو اللہ کے اور جنات کے درمیان بھی قرابت داری ٹھہرائی ہے اور حالاں کہ خود جنات کو معلوم ہے کہ وہ (اس عقیدہ کے لوگ عذاب کے سامنے) پیش کیے جائیں گے۔ جو کچھ یہ (اللہ کے بارے میں) بیان کر رہے ہیں اس سے اللہ تعالیٰ بالکل پاک ہے۔'' اور صحیح بخاری میں آیا ہے: نہیں ہے کوئی زیادہ صابر تکلیف پر اللہ سے جس کو وہ سنتا ہے، وہ اس کے لیے اولاد ٹھہراتے ہیں اور اللہ ان کو رزق اور عافیت دیتا ہے۔[3]

---

[1] تفسیر الطبري (٢٣٤/٦٩٠_٦٩٢) [2] تفسیر الطبري (٢٤/٦٩٤) [3] صحیح البخاري (٦٩٤٣)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ اللہ عزوجل نے کہا ہے کہ جھٹلایا مجھ کو ابن آدم نے اور اس کو یہ نہ چاہیے تھا، گالی دی مجھ کو ابن آدم نے اور اس کو یہ نہ چاہیے تھا۔ اس کا مجھ کو جھٹلانا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے: اللہ مجھ کو اعادہ نہ کرے گا جیسے مجھے پیدا کیا، حالاں کہ پہلی دفعہ پیدا کرنا دوسری دفعہ کے پیدا کرنے سے زیادہ آسان نہیں ہے اور اس کا مجھ کو گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے اللہ نے اپنی اولاد اختیار کی، حالاں کہ میں "أَحَدٌ صَمَدٌ لَمْ أَلِدْ وَلَمْ أُوْلَدْ"، ہوں کوئی میرے جوڑ کا نہیں ہے۔[1] (رواہ البخاري)

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ کا لفظ مبارک جمیع صفاتِ ثبوتیہ کے کمال پر دلیل ہے، جیسے: علم و قدرت اور ارادہ اور احد دلیل ہے جمیع صفاتِ جلال پر، یہ صفاتِ سلبیہ ہیں، جیسے قدم و بقاء۔ صمد وہ ہے جس کا حاجات میں قصد کریں، اس لیے کہ وہ ان کی حاجات پورا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صمد وہ سید ہے جس کے اوپر اور کوئی سید نہ ہو۔[2] یا صمد کے معنی دائم باقی ہیں ازل سے ابد تک، یا وہ جو کسی کا محتاج نہ ہو، سب اسی کے محتاج ہوں، یا جو رغائب میں مقصود اور مصائب میں مستعان بہ ہو، یا وہ شخص کہ جو چاہے سو کرے اور اپنے ارادے کے مطابق حکم دے یا کامل بیعت (وہ ہستی جس کے لیے مکمل فرمانبرداری ہو) ہو۔

اسم شریف کی تکرار اس لیے ہے کہ جو اس صفت کے ساتھ متصف نہیں ہے وہ الوہیت کا استحقاق نہیں رکھتا۔ یا صمد اسم شریف کی صفت ہے، لیکن سیاق کا تقاضا ہے کہ ہر جملہ مستقل ہو۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ صمد وہ ہے جس کے احشاء (جو کچھ پیٹ کے اندر ہے، دل جگر وغیرہ) نہ ہوں۔[3] ﴿لَمْ يَلِدْ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اس کا بیٹا نہیں جس طرح کہ مریم کا بیٹا تھا۔ ﴿لَمْ يُوْلَدْ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی کا بیٹا نہیں جس طرح کہ عیسیٰ اور عزیر علیہما السلام پیدا ہوئے۔ یہ اس لیے کہ کوئی اس کا ہم جنس نہیں ہے اور اس کی طرف عدم کی نسبت خواہ وہ سابقاً ہو یا لاحقاً ہو، محال ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرکینِ عرب کہتے تھے کہ ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ یہود نے کہا ہے کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ نصاریٰ نے کہا کہ مسیح ابن اللہ ہیں۔ یہ لفظ کہہ کے کہ وہ ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ ہے، ان کی تکذیب کی۔[4] پھر فرمایا کہ اللہ کے جوڑ کا کوئی نہیں ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ: ١١] "اس جیسی کوئی چیز نہیں۔" "کفو" کلامِ عرب میں بہ معنی نظیر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کوئی اس کے مثل نہیں ہے۔[5] الغرض کلام کا حاصل اشراک وتشبیہ وتعطیل ہے اور یہ سورت اس کو دفع کرتی ہے۔[6] وللہ الحمد.

---

[1] صحیح البخاري (٤٦٩٠) [2] معاني القرآن (٣٧٧/٥) [3] روح المعاني (٢٧٤/٣٠)
[4] فتح القدیر (١٩٨/٥) [5] تفسیر الطبري (٦٩٣/٢٤، ٦٩٤) [6] فتح البیان (٤٤٧/١٥_٤٥١)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سُوْرَةُ الْفَلَقِ

معوذتین کے متعلق عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا موقف:

اس کی پانچ (۵) آیتیں ہیں۔ یہ مکہ میں اتری۔ یہی قول امام حسن، عکرمہ، عطاء اور جابر رحمہم اللہ کا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مدینہ میں اتری ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ یہی صحیح ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کو مصحف سے دور اور محو کر دیتے اور کہتے کہ قرآن کو غیر قرآن کے ساتھ نہ ملاؤ۔ یہ دونوں سورتیں کتاب اللہ نہیں ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فقط تعوذ کرنے کے لیے فرمایا تھا اور خود عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان دونوں سورتوں کو نماز میں نہیں پڑھتے تھے۔ امام بزار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مطابقت نہیں کی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا نماز میں پڑھنا بخوبی ثابت ہے اور یہ مصحف میں لکھی گئی ہیں۔[2]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ زعم اجماعِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے خلاف ہے۔ امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے بھی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرح کہا ہے مگر ابن الانباری رحمہ اللہ نے اس کو رد کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ انکار بھول کے طور پر تھا جس طرح کہ انھوں نے سورۃ الفاتحہ کو بھی مصحف سے ساقط کر دیا تھا۔[3] سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج کی رات مجھ پر کچھ آیتیں اتریں کہ میں نے ویسی آیتیں نہیں دیکھیں: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾[4] (أخرجه مسلم والترمذي والنسائي وغيرهم)

سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چشمِ زخم جن سے تعوذ کرتے۔ جب معوذتین اتری تو پھر اس کے ماسوا کو ترک کر دیا۔[5] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رفعاً کہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم معوذتین

---

[1] تفسير القرطبي (٢٠/٢٥١) [2] مسند أحمد (١٢٩/٥) المعجم الكبير (٢٣٤/٩) مسند البزار (٢٩/٤)

[3] تفسير القرطبي (٢٠/٢٥١) [4] صحيح مسلم (٨١٤) سنن الترمذي (٢٩٠٢) سنن النسائي (٥٤٠)

[5] سنن الترمذي (٢٠٥٨) سنن النسائي (٥٤٩٤) سنن ابن ماجه (٣٥١١) صحيح الجامع (٤٩٠٢)

کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ دم مکروہ جانتے تھے۔[1] (أخرجه أبو داود و النسائي و الحاكم و صححه)۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے رفعاً کہا ہے کہ یہ دونوں سورتیں سب سے زیادہ اللہ کو محبوب ہیں۔[2] (رواه ابن مردويه)۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب بیمار ہوتے تو انہی کو پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتے۔ جب زیادہ بیمار ہوئے تو میں نے پڑھ کر آپ ﷺ کے ہاتھ سے دم کیا تاکہ برکت ہو۔ (أخرجه مالك في الموطأ)

رسول اللہ ﷺ پر جادو کی حقیقت:

اس کا اصل صحیحین میں ہے۔[3] زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک یہودی نے نبی اکرم ﷺ پر جادو کیا، آپ ﷺ بیمار ہو گئے جبریل علیہ السلام معوذتین لے کر آئے اور کہا: ایک یہودی شخص نے تم پر جادو کیا ہے، وہ جادو فلاں کنویں میں ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بھیجا، وہ اس کو نکال کر لائے۔ فرمایا: اس کو کھولو، ہر گرہ ایک آیت پر کھلتی گئی، نبی اکرم ﷺ اٹھ کھڑے ہوئے۔ گویا بندھے ہوئے تھے کھل گئے۔[4] (أخرجه عبد بن حميد)

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے مطولاً روایت کیا ہے[5] کہ نبی أکرم ﷺ کے سحر کی مدت چالیس دن تھی، یا چھ ماہ، یا ایک سال۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی قابلِ اعتماد ہے۔ امام راغب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو جادو کچھ نبی ہونے کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ اس کا اثر بدن پر انسان ہونے کے ناتے سے تھے جس طرح کہ لوگ کھاتے پیتے اور بول و براز کرتے اور بیمار پڑتے ہیں۔ یہ تاثیر اس حیثیت سے تھی کہ آپ بشر تھے، نہ اس حیثیت سے کہ آپ نبی تھے۔

جادو کا یہ اثر اس وقت قادح (عیب لگانے والا) ہوتا کہ اس کی کچھ تاثیر کسی امرِ نبوت میں پائی جاتی جس طرح کہ اُحد کے دن آپ کے دانت کا ٹوٹنا اس کو قادح نہیں تھا کہ اللہ نے اس قول میں آپ ﷺ کو بچانے کا وعدہ کیا تھا: ﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ [المائدة: ٦٧] ''اور آپ کو اللہ تعالیٰ لوگوں سے بچالے گا۔'' اسی طرح یہ بات کہ بعض مشرکین کا گرد و نواح میں اگر اہلِ اسلام پر غلبہ ہو جاتا ہے تو یہ کچھ اس آیتِ کریمہ کے مخالف نہیں: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ [المائدة: ٣] ''آج میں نے تمھارے لیے دین کو کامل کر دیا۔'' قاضی نے کہا ہے کہ اس سے کفار کی یہ بات سچ نہیں ٹھہرتی کہ آپ ﷺ مسحور ہیں، یعنی جادو کی وجہ سے مجنون ہیں۔[6] اہلِ سنت کا مذہب یہ ہے کہ جادو حق ہے اور اس کی حقیقت ہے اور یہ قولاً و فعلاً ہوتا ہے اور جادو کی وجہ سے بیماری و قتل اور میاں بیوی کے

---

(1) سنن أبي داود (٤٢٢٢) سنن النسائي (٥٠٨٨) مستدرك الحاكم (٢١٦/٤) اس کی سند میں ''عبدالرحمان بن حرملہ'' ضعیف راوی ہے۔

(2) الدر المنثور (٦٨٥/٨)　(3) الموطأ (٩٤٢/٢) صحيح البخاري (٩٤٢٨) صحيح مسلم (٢١٩٢)

(4) مسند عبد بن حميد (١١٥/١) سنن النسائي (٤٠٨٠) السلسلة الصحيحة (٢٧٦١)

(5) الدر المنثور (٦٨٧/٨)　(6) تفسير البيضاوي (٥٥١/٥)

درمیان اختلاف کا اثر ہوتا ہے۔ اس بارے میں تمام کلام اس مقام میں حاشیۂ جمل میں تحریر کیا گیا ہے۔ معوذتین کی فضیلت میں صحیح احادیث آئی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان کو نماز فرض وغیرہ میں پڑھا ہے۔ جو کچھ ہم نے بیان کر دیا ہے وہی کافی ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دونوں سورتیں مدنی ہیں۔ زر بن حبیش نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے معوذتین کا حال دریافت کیا اور کہا: تمھارے بھائی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان کو مصحف سے نکالتے ہیں۔ کہا: میں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا تھا: مجھ کو فرمایا تو ان کو پڑھ سو میں وہی بات کہتا ہوں جو نبی اکرم ﷺ نے کہی تھی۔[2] (رواه أحمد والبخاري)
بہت سے قراء وفقہاء کے نزدیک یہ بات مشہور ہے کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ معوذتین کو مصحف میں نہیں لکھتے تھے، شاید انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے ان کو نہیں سنا یا ان کے نزدیک یہ متواتر نہیں ہوئیں، پھر انھوں نے جماعت کے قول کی طرف رجوع کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے معوذتین کو مصحف میں لکھا تھا اور سائر آفاق (تمام اطراف) میں بھیجا۔ وللہ الحمد.

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں نبی اکرم ﷺ کا معوذتین کو نماز میں پڑھنا اور سوتے وقت اور قیام کے وقت اور ہر فرض نماز کے بعد اُن کو پڑھنے کا حکم دینا امام احمد رحمہ اللہ اور اہلِ سنن کے نزدیک چند حدیثوں میں آیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان دونوں سورتوں کو صبح کی نماز میں پڑھا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عقبہ سے یہ طرق متواتر ہیں، محققینِ حدیث میں سے اکثر کے نزدیک قطعیت کا فائدہ دیتے ہیں۔[3] سیدنا عقبہ رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ کیا میں تجھ کو تین سورتیں نہ سکھا دوں کہ ان کے مثل تورات، انجیل، زبور اور فرقان میں نہ اتریں؟ وہ ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾ اور معوذتین ہیں[4] اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”اِقْرَأْ بِهِمَا وَلَنْ تَقْرَأَ بِمِثْلِهِمَا“[5] (رواه النسائي) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی احادیث میں رسول اللہ ﷺ کا جنوں اور انسانوں کی نظر اتارنے کے لیے ان کے ساتھ تعوذ کرنا اور دم کر کے بدن پر ہاتھ پھیرنا اہلِ سنن کے نزدیک کئی طرق سے آیا ہے۔[6]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝ وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ۝ وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝

① فتح البيان (١٥/٤٥٣_٤٥٥) ② صحيح البخاري (٤٦٩٣) مسند أحمد (٥/١٢٩)
③ تفسير ابن كثير (٤/٧٤٤، ٧٤٥) ④ مسند أحمد (٤/١٤٨) اس کی سند میں ”علی بن یزید“ ضعیف راوی ہے۔
⑤ سنن النسائي الكبرىٰ (٤/٤٤١) صحيح الترغيب والترهيب (٢/٩٤) ⑥ تفسير ابن كثير (٤/٧٤٣_٧٤٦)

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(اے نبی!) کہہ دیجیے: میں صبح کے رب کی پناہ میں آتا ہوں ① (ہر) اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ② اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ چھا جائے ③ اور گرہوں میں پھونکیں مارنے والیوں کے شر سے ④ اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے ⑤

مراد رات کا اندھیرا یا چاند کا گہن ہے اور اس میں ظاہر و باطن کی سب تاریکیاں آ گئیں اور تنگ دستی اور پریشانی اور گمراہی بھی آ گئی۔ ﴿اَلنَّفّٰثٰتِ﴾ سے مراد جادوگر ہیں۔ حاسد کی ٹوک لگ جاتی ہے۔ انتہی۔

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ''فَلَق'' صبح ہے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔ امام مجاہد، سعید بن جبیر، عبداللہ بن محمد بن عقیل، حسن، قتادہ، قرظی، ابن زید اور زید بن اسلم رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام قرظی، ابن زید اور ابن جریر رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿فَالِقُ الْاِصْبَاحِ﴾ [الأنعام: ٩٦] ''وہ صبح کا نکالنے والا ہے۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''فَلَق'' ''خَلَق'' ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ ساری خلق سے پناہ مانگیں۔ کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''فَلَق'' جہنم میں ایک جنگل ہے جب وہ کھولا جاتا ہے تو سارے دوزخی اس کی گرمی کی شدت سے چیختے ہیں۔[1] زید بن علی عن آبائہ نے کہا ہے کہ علماء یوں کہتے ہیں کہ ''فَلَق'' جہنم کی تہہ میں ایک کنواں ہے، اس پر ایک پردہ پڑا ہے، جب وہ اٹھا دیا جاتا ہے تو اس سے ایک ایسی آگ نکلتی ہے جس سے اس کی گرمی کی شدت کی وجہ سے خود جہنم چیختی ہے۔[2] یہی قول عمرو بن عنبسہ، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور امام سدی رحمہ اللہ کا ہے۔ اس کے متعلق ایک مرفوع حدیث بھی آئی ہے[3] لیکن منکر ہے۔

ابوعبدالرحمان حبلی نے کہا ہے کہ ''فَلَق'' جہنم کا نام ہے۔[4] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح قول پہلا ہے کہ ''فَلَق'' سے مراد صبح ہے۔[5] یہی بات صحیح ہے اس کو بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اختیار کیا ہے۔[6] ﴿شَرِّ مَا خَلَقَ﴾ سے مراد شر جمیع مخلوقات ہے۔ ثابت بنانی اور حسن بصری رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد جہنم اور ابلیس اور ابلیس کی اولاد ہے۔[7] ﴿وَقَبَ﴾ سے مراد غروبِ آفتاب ہے۔ اس کو بخاری نے بیان کیا ہے،[8] یہی قول امام مجاہد، ابن عباس، قرظی، ضحاک، زہری، خصیف، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ کا ہے۔ امام عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد جانا ہے رات کا۔ بعض نے کہا ہے کہ رات کے اندھیرے کا آنا ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مراد ستارہ ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ

---

① تفسير الطبري (٧٠١،٧٠٠/٢٤) تفسير ابن كثير (٧٤٦/٤)
② تفسير ابن أبي حاتم (٣٤٧٥/١٠)
③ تفسير الطبري (٧٠٠/٢٤) اس کی سند میں ایک سے زیادہ راوی ضعیف ہیں۔
④ تفسير الطبري (٧٠٠/٢٤)
⑤ تفسير الطبري (٧٠١/٢٤)
⑥ صحيح البخاري (١٩٠٣/٤)
⑦ تفسير ابن كثير (٧٤٦/٤)
⑧ صحيح البخاري (١٩٠٣/٤)

کہتے ہیں کہ عرب سقوطِ ثریا کو ﴿غَاسِقٍ﴾ کہتے تھے اور اسقام وطواعین کا کثرت سے ہونا اس سقوط کے واقع ہونے کے وقت بتاتے تھے اور ثریا کے طلوع ہونے پر ان آفات کا مرتفع ہونا (دور ہونا) یقین کرتے تھے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ ﴿غَاسِقٍ﴾ سے مراد چاند ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: «تَعَوَّذِيْ مِنْ شَرِّ هٰذَا الْغَاسِقِ» ''اس غاسق کے شر سے پناہ پکڑ۔'' اور مجھے چاند کا نکلنا دکھایا۔ (رواه أحمد والنسائي وقال الترمذي: حديث حسن صحيح)

ترمذی کے الفاظ یہ ہیں کہ اس کے شر سے اللہ کی پناہ مانگ کہ یہ غاسق ہے جبکہ سمٹ آئے۔ نسائی کے الفاظ یہ ہیں کہ پناہ مانگ اللہ کی اس غاسق سے جبکہ سمٹے۔[2] اگلے قول والوں نے کہا ہے کہ یہ رات کی نشانی ہے۔ سو یہ کچھ اس کے خلاف نہیں ہے، اس لیے کہ قمر و نجوم کی سلطنت رات ہی کو ہوتی ہے۔ امام مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿النَّفّٰثٰتِ﴾ سے مراد جادوگرنیاں ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جبکہ وہ منتر کریں اور گرہوں میں پھونکیں۔ امام طاؤس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رقیہ مارد مجانین (شیطانی منتر، تعویذ گنڈے) سے زیادہ شرک کے قریب کوئی چیز نہیں ہے۔ حدیث میں مروی ہے کہ جبریل علیہ السلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: اے محمد! کیا تم بیمار ہو؟ کہا: ہاں! کہا: «بِسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ دَآءٍ يُؤْذِيْكَ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ حَاسِدٍ وَعَيْنٍ اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ»[3] ''اللہ تعالیٰ کے نام کے ذریعے میں آپ کو ہر تکلیف بیماری ہر حاسد اور نظر بہ سے دم کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ آپ کو شفا عطا کرے۔'' شاید یہ جادو کا اثر تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت خراب ہوئی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفا بخشی اور یہود کے جادوگروں اور حاسدوں کے مکر اور چالوں کو رد کیا اور ان کی ناکامی اور بربادی انھیں کی تدبیر میں فرمائی، وہ رسوا ہوئے لیکن اس کے باجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دن بھی ان کو معاتب نہ فرمایا (برا بھلا نہ کہا)، بلکہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو شفا اور عافیت بخشی۔ سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک یہودی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا، چند روز تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار رہے، جبریل علیہ السلام نے آ کر کہا کہ یہود نے آپ پر جادو کیا ہے اور فلاں فلاں کنوئیں میں آپ کے لیے کچھ گرہیں لگائی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو بھیجا کہ اس سحر کو نکال لائے۔ چنانچہ جا کر اسے لے آئے اور اسے کھول ڈالا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کھڑے ہوئے گویا پابندی سے کھل گئے، لیکن اس کا کچھ ذکر یہودی سے نہ کیا اور نہ اس کے روبرو کچھ بدخلقی کی یہاں تک کہ انتقال ہوا۔[4] (رواه النسائي)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خیال کرتے تھے کہ عورتوں کے پاس آتے ہیں، حالاں کہ آتے نہیں تھے۔ سفیان نے کہا ہے کہ ایسا جادو بہت سخت ہوتا

---

(1) تفسير الطبري (٢٤/٧٠٢-٧٠٣) تفسير ابن كثير (٤/٧٤٧)
(2) سنن النسائی الکبریٰ (٦/ ٨٣)
(3) مسند أحمد (٦/٦١) سنن الترمذي (٣٣٦٦) سنن البيهقي الكبرىٰ (١/٨٤) صحيح الجامع (٧٩١٦)
(4) سنن النسائي (٤٠٨٠) مسند أحمد (٤/٣٦٧) السلسلة الصحيحة (٢٧٦١)

ہے۔ فرمایا: اے عائشہ! تو نے جانا کہ اللہ نے میرے استفتاء کا فتویٰ دیا، میرے پاس دو مرد آئے: ایک سر کے پاس بیٹھا دوسرا پاؤں کے پاس۔ اس نے کہا: اس مرد کا کیا حال ہے؟ دوسرے نے کہا: یہ مطبوب ہے، یعنی مسحور ہے، اس پر جادو کیا گیا ہے۔ کہا: اس کو کس نے جادو کیا ہے؟ کہا: لبید بن اعصم نے۔ یہ بنو زریق کا ایک شخص تھا اور یہود کا حلیف تھا اور منافق تھا۔ کہا: کس چیز میں جادو کیا ہے؟ کہا: سر کے بالوں اور کنگھی میں۔ کہا: وہ کہاں ہے؟ کہا: ذروان کے کنویں کے اندر، گابھے کے ایک چھلکے میں، ایک پتھر کے نیچے ہے۔

پھر نبی اکرم ﷺ اس کنویں پر گئے اور اس سحر کو نکالا اور فرمایا کہ یہ وہی کنواں ہے جو مجھ کو دکھایا گیا تھا، اس کا پانی ایسا تھا جیسے حنا کا نچوڑ اور اس جگہ کے نخل ایسے تھے جیسے شیاطین کے سر۔ جب وہ نکالا گیا تو میں نے کہا: آپ اس کو ظاہر نہیں فرماتے؟ کہا: سن! اللہ نے مجھے شفا بخشی اور میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی شخص پر شر انگیزی کروں۔[1] (رواه البخاري) دوسری روایت میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو خیال ہوتا کہ میں نے فلاں کام کیا ہے، حالاں کہ وہ کام نہ کیا ہوتا۔ پھر اس کنویں کو بھروا دیا۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم کہتی ہیں کہ ایک یہودی لڑکا نبی اکرم ﷺ کی خدمت کرتا تھا، یہود نے اس کو بلا کر آپ ﷺ کے سر کی کنگھی اور شانے کے کچھ بال لے کر سحر کیا۔ ساحر لبید بن اعصم تھا۔

سیدنا علی، عمار بن یاسر اور زبیر رضی اللہ عنہم گئے تھے اور اس چاہ (کنویں) کا پانی نکالا تھا، وہ ایسا تھا جیسے مہندی کا رنگ ہو، پھر پتھر اٹھایا اور وہ گابھا نکالا، اس میں ایک کنگھی اور آپ ﷺ کے سر کے کچھ بال تھے اور ایک تانت تھی، اس میں بارہ گرہیں تھیں سوزن زدہ (حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نسخہ مطبوعہ مصر میں یہی تعداد لکھی ہے، مگر اور تفاسیر میں گیارہ کا عدد ہے، یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ اگلی روایت میں یہ ہے کہ ہر آیت پر ایک گرہ کھل گئی اور آیتیں دونوں سورتوں کی گیارہ ہیں نہ کہ بارہ فليعلم)۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے دونوں سورتوں کو نازل کیا۔ ہر آیت پر ایک گرہ کھل گئی اور جب آخری گرہ کھلی تو نبی اکرم ﷺ نے اپنی طبیعت ہلکی محسوس کی، گویا پابندی سے باہر نکل آئے اور جبریل علیہ السلام نے آ کر دم کیا اور کہا: «بِسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُّؤْذِيْكَ مِنْ حَاسِدٍ وَعَيْنٍ اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ» صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: کیا ہم اس خبیث کو گرفتار نہ کریں اور مار ڈالیں؟ فرمایا: اللہ نے مجھ کو شفا دی، اب لوگوں کو شر پر ابھارنا مجھے پسند نہیں ہے۔[3] والله أعلم.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ "فَلَق" بہ معنی صبح ہے۔ مثل میں کہتے ہیں: "هُوَ أَبْيَنُ مِنْ فَلَقِ الصُّبْحِ" وہ

[1] صحيح البخاري (٥٤٣٢) [2] صحيح البخاري (٥٤٣٣) [3] الكشف والبيان (٣٣٨/١٠) تفسير ابن كثير (٧٤٨/٤)

صبح سے بھی زیادہ واضح اور روشن ہے۔" اور بعض نے کہا ہے کہ جہنم میں ایک درخت ہے یا نار کا نام ہے یا نار کے اندر قید خانہ ہے یا پہاڑ اور پتھر مراد ہیں کہ پھٹ کر ان میں سے پانی بہتا ہے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "فَلَق" ہموار زمین کو کہتے ہیں۔[1] یا ہر چیز کو جو حیوان و نبات و جماد سے پھٹ کر نکلتی ہے، گویا "فَلَق" بہ معنی شق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ﴾ [الأنعام: ٩٥] "وہ دانہ کو اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے۔" لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔ "فَلَق" کے ذکر میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص تمام عالم سے ان ظلمات کا ازالہ کرنے پر قادر ہے اس کو یہ قدرت بھی ہے کہ وہ پناہ گیر بھی ہے کہ ہر خوف اور خشیت کو بھی دور کرے۔ یا طلوعِ صبح خوشی کے آنے کی ایک مثال ہے کہ جس طرح انسان کو رات کو طلوعِ فجر کا انتظار ہوتا ہے، اسی طرح ایک خوفزدہ اور پناہ مانگنے والا نجات اور فلاح کے لیے امداد کے آنے کا منتظر ہوتا ہے۔

﴿ شَرِّ مَا خَلَقَ ﴾ سے مراد تمام مخلوق ہے، اس میں سارے شرور آ گئے۔ یہ شر عام ہے، اس کے بعد جو تین شر ذکر کیے ہیں وہ خاص ہیں۔ اس جگہ تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے اور نہ ہی بدنی تکالیف اس عموم سے خاص ہیں۔ ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی قراءت میں "شَرٍّ" تنوین کے ساتھ ہے لیکن اس میں نہایت بعد اور ضعف ہے۔ یعنی اس شر سے جو ابھی تک پیدا نہیں ہوا ہے۔ ﴿ غَاسِقٍ ﴾ رات ہے اور "غسق" رات کا اندھیرا ہے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رات کو ﴿ غَاسِقٍ ﴾ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ دن کی نسبت زیادہ سرد ہوتی ہے اور "بَارِد" کو ﴿ غَاسِقٍ ﴾ اور "بَرَد" کو "غَسَق" کہتے ہیں،[2] لیکن یہ قول بارد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ﴿ غَاسِقٍ ﴾ ثریا ہے، یا سورج جب غروب ہو یا چاند جب غائب ہو جائے یا سانپ جب کاٹ کھائے یا ہرنا گہاں آنے والا جب کہ ضرر پہنچائے یا بھیک مانگنے والا جبکہ سوال سے تنگ کرے لیکن راجح وہی پہلا قول ہے۔ ﴿ النَّفّٰثٰتِ ﴾ سے مراد وہ عورتیں ہیں جو جادو کیا کرتی ہیں۔ "نفث" پھونکنے کو کہتے ہیں جس طرح کہ منتر کرنے والے دم کرتے ہیں، خواہ اس کے ساتھ تھوک ہو یا نہ ہو۔

یہ آیت معتزلہ کے قول کے باطل ہونے کی دلیل ہے کیوں کہ وہ سحر کے حق ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ "عُقَدٌ" جمع ہے "عُقْدَةٌ" کی۔ وہ سحر کرنے کے وقت دھاگے پر گرہیں لگاتی تھیں۔ یہ لبید بن اعصم یہودی کی بیٹیاں تھیں، انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کیا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: "نفاثات" بہ معنی "ساحرات" ہے۔[3] دوسرا قول یہ ہے کہ "نفث" وہ منتر ہے جو جادو آمیز ہو۔[4] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے: جس نے کوئی گرہ لگائی، پھر اس میں پھونکا، اس نے جادو کیا اور جس نے جادو کیا وہ مشرک ہوا اور جو کسی شے کے ساتھ متعلق ہوا وہ اسی کو سونپا گیا۔[5] (أخرجه النسائي وابن مردويه)

---

(1) تفسير القرطبي (٢٠/٢٥٤) (2) تفسير القرطبي (٢٠/٢٥٦) (3) الدر المنثور (٨/٦٩٠)
(4) تفسير الطبري (٢٤/٧٠٤) (5) سنن النسائي (٤٠٧٩) الدر المنثور (٨/٦٩٠)

ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ میری عیادت کے لیے آئے اور فرمایا: کیا میں تجھ پر وہ منتر نہ کروں جو جبریل علیہ السلام نے مجھ کو کیا تھا؟ میں نے کہا: ہاں "بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي" فرمایا:« بِسْمِ اللّٰهِ أَرْقِيكَ وَاللّٰهُ يَشْفِيكَ مِنْ كُلِّ دَاءٍ فِيكَ وَمِنْ شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ » "اللہ تعالیٰ کے نام سے میں تجھے دم کرتا ہوں اور وہ تجھے ہر بیماری سے شفا دے گا اور گرہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے اور حاسد کے حسد کے شر سے۔" تین بار اس کو پڑھا۔[1] (أخرجه ابن ماجه و ابن سعد و الحاکم)۔ دم کرنے اور تعویذ کرنے کے جواز کے بارے میں اختلاف ہے۔ جمہور صحابہ، تابعین اور من بعدہم نے جائز کہا ہے، جبکہ وہ شرعی طریقے سے ہو۔ ان کی دلیل سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث ہے کہ جب کوئی نبی اکرم ﷺ کے گھر والوں میں سے بیمار ہوتا تو آپ ﷺ اس پر معوذات پڑھ کر پھونکتے۔[2] (الحدیث)

دوسری جماعت نے رقی میں تفل ونفث کرنے کا انکار کیا ہے اور بغیر تھوک کے پھونکنے کو جائز رکھا ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منتر کرنے والے کو جائز نہیں ہے کہ دم کرے یا مسح کرے یا گرہ لگائے۔[3] علامہ نسفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت یا حدیث سے رقیہ کرنا جائز ہے نہ کہ سریانی وعربی و ہندی سے کہ اس کا اعتقاد حلال نہیں اور نہ اس پر اعتماد کرنا صحیح ہے۔[4] ﴿حَسَدَ﴾ کہتے ہیں کہ اس شخص سے نعمت کے زوال کی تمنا کرنا جس سے حسد کیا جائے۔ ﴿إِذَا حَسَدَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ حسد کو ظاہر کر دے بہ موجب اس کے عمل درآمد کے اور وہ حسد اس کے لیے اس کا باعث ہو کہ وہ اس شخص کو شر پہنچائے جس سے حسد کیا گیا۔ عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے کہا ہے: "لَمْ أَرَ ظَالِمًا أَشْبَهَ بِالْمَظْلُومِ مِنْ حَاسِدٍ"[5] "میں نے حاسد سے بڑھ کر مظلوم سے اشبہ کوئی ظالم نہیں دیکھا۔"

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں نبی اکرم ﷺ کو جملہ مخلوقات کے شر سے عموماً پناہ مانگنے کا ارشاد کیا۔ پھر بعض شرور کا خاص طور پر ذکر فرمایا، اگرچہ وہ بھی عموم میں داخل تھے، یہ اس لیے کہ ان میں مزید شر اور تکلیف کی زیادتی ہے۔ ایک ﴿غَاسِقٍ﴾ دوسرے "نفاثات"، تیسرا حاسد یہ تینوں گویا مزید شر کی وجہ سے اس لائق ہیں کہ ان کو الگ الگ ذکر کیا جائے اور سورت کو حسد پر ختم کیا، تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ حسد سب سے بڑی اور شدید شر ہے اور وہ پہلا گناہ ہے جس کے ساتھ آسمان میں ابلیس نے اور زمین میں قابیل نے اللہ پاک کی نافرمانی کی تھی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ﴾ یعنی "نَفْسِ ابْنِ آدَمَ وَعَيْنِهِ"[6] واللّٰه أعلم.

---

[1] سنن ابن ماجه (٣٥٢٤) مستدرك الحاكم (٥٩٠/٢) اس کی سند میں "عاصم بن عبید اللہ" ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الجامع: ٢١٦٦)

[2] صحیح مسلم (٢١٩٢) [3] اللباب في علوم الكتاب (٥٧٤/٢٠) [4] تفسير النسفي (٣٦٦/٤)

[5] فتح القدير (٧٠٥/٥) [6] الدر المنثور (٦٩١/٨) فتح البيان (٤٥٧/١٥-٥٦٢)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

سُوْرَةُ النَّاسِ

اس سورت کی چھے (٦) آیتیں ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مکی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مدنی ہے۔[1] حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے "بدائع الفوائد" میں بیس ورق تک معوذتین کے فوائد لکھے ہیں۔[2] یہ جگہ اس کی تفصیل تحریر کرنے کے لائق نہیں بالخصوص اس لحاظ سے کہ ان کا تعلق اہلِ علم کے ذوق سے ہے نہ کہ عام لوگوں سے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

قُلۡ اَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ﴿۱﴾ مَلِكِ النَّاسِ ۙ﴿۲﴾ اِلٰهِ النَّاسِ ۙ﴿۳﴾ مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ ۙ الۡخَنَّاسِ ۙ﴿۴﴾ الَّذِىۡ يُوَسۡوِسُ فِىۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ۙ﴿۵﴾ مِنَ الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿۶﴾

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

(اے نبی!) کہہ دیجیے: میں انسانوں کے رب کی پناہ میں آتا ہوں ① انسانوں کے بادشاہ کی ② انسانوں کے معبود کی ③ وسوسہ ڈالنے والے (اللہ کے ذکر کو سن کر) پیچھے ہٹ جانے والے کے شر سے ④ جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے ⑤ خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے ⑥

ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہے:

شیطان گناہ پر آمادہ کرتا ہے اور خود نظر نہیں آتا۔ حدیث میں آتا ہے پناہ مانگنے کے لیے ان سورتوں کے برابر کوئی دعا نہیں ہے۔ انتہی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ عزوجل کی تین صفتیں ہیں: ربوبیت وملکیت و آلہیت، چنانچہ وہ ہر شے

---

① الدر المنثور (٨/٦٩١) فتح القدیر (٥/٧٠٧) ② بدائع الفوائد (٢/٤٢٤)

کا رب و ملیک و الٰہ ہے۔ بندے اسی کی مخلوق و مملوک اور غلام ہیں۔ اس لیے پناہ شرِ وسواسِ خناس سے یعنی شیطان سے مانگے جو انسان پر مسلط ہے، کیوں کہ کوئی ایسا آدمی نہیں ہے جس کے لیے ایک قرین نہ ہو جو فواحش کو اس کے لیے زینت نہ دیتا ہو اور اس کو دھوکا دینے میں کوتاہی کرتا ہو۔ محفوظ وہی رہتا ہے جس کو اللہ محفوظ رکھے۔[1] صحیح میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص نہیں ہے، لیکن اس کا قرین اس پر مقرر ہے، کہا: اے اللہ کے رسول! آپ بھی۔ فرمایا: میں بھی لیکن اللہ نے میری مدد کی اور وہ فرمانبردار ہو گیا ہے، وہ مجھ کو صرف خیر کا حکم کرتا ہے۔[2]

بدنِ انسانی میں شیطانی گردش:

صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے حالتِ اعتکاف میں صفیہ رضی اللہ عنہا کے زیارت کرنے کا قصۂ طویل آیا ہے۔ اس میں یہ ذکر بھی ہے کہ دو انصار نے آپ ﷺ کو صفیہ رضی اللہ عنہا سے بات کرتے دیکھ کر چلنے میں جلدی کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھہرو! یہ صفیہ بنت حیی ہے۔ انھوں نے کہا: سبحان اللہ! اے اللہ کے رسول! فرمایا: « إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنْ بَنِيْ آدَمَ مَجْرَى الدَّمِ » ''شیطان ابن آدم میں خون کی طرح گردش کرتا ہے۔'' میں ڈرا کہ کہیں تمھارے دل میں کچھ اور آئے۔[3] سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت رفعاً یہ ہے کہ شیطان اپنی سونڈ ابن آدم کے دل پر رکھے ہوئے ہے، اگر اس نے ذکر کیا تو سرک جاتا ہے اور اگر بھول گیا تو دل کو لقمہ بناتا ہے، یہ ہے وسواسِ خناس۔[4] (رواه أبو يعلىٰ وهو غريب)

ابو تمیمہ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ سوار تھا، گدھے نے ٹھوکر کھائی، میں نے کہا: شیطان ہلاک ہو! فرمایا تو « تَعِسَ الشَّيْطٰنُ » ''شیطان برباد ہو۔'' نہ کہہ، کیوں کہ جب تو یوں کہے گا تو وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھے گا اور کہے گا: میں نے اپنی قوت سے اس کو پچھاڑ دیا ہے اور جب تو بسم اللہ کہے گا تو وہ چھوٹا ہو کر مکھی کی طرح ہو جائے گا۔[5] (تفرد به أحمد وإسناده جيد قوي) اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ دل جب اللہ کو یاد کرتا ہے تو شیطان چھوٹا اور مغلوب ہو جاتا ہے اور جب اللہ کا ذکر نہیں کرتا تو بڑا اور غالب بن جاتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمایا ہے کہ تم میں جب کوئی شخص مسجد میں ہوتا ہے تو شیطان آ کر اس کو شبہے میں ڈالتا ہے جس طرح کہ آدمی اپنے جانور کو دباتا ہے، پھر جب وہ ساکن ہوا تو اس کو رتق کرتا ہے یا لگام لگاتا ہے، یعنی اس کو نکیل ڈالتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ تم یہ حال دیکھتے ہو کہ مزنوق مائل ہوتا ہے اللہ کا ذکر نہیں کرتا، ملجم منہ کھولے ہوتا ہے، وہ بھی اللہ عزوجل کا ذکر بجا نہیں لاتا۔[6] (تفرد به أحمد)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے وسواسِ خناس کے معنی میں کہا ہے کہ شیطان بنی آدم کے دل پر حابس ہے،

---

[1] تفسير ابن كثير (٧٤٩/٤) [2] صحيح مسلم (٢٨١٤) [3] صحيح البخاري (١٩٣٠) صحيح مسلم (٢١٧٥)
[4] مسند أبي يعلىٰ (٢٧٨/٧) اس کی سند میں ''زیاد نمیری اور عدی بن ابی عمارہ'' ضعیف راوی ہیں۔ دیکھیں: (السلسلة الضعيفة: ١٣٦٧)
[5] مسند أحمد (٥٩/٥) صحيح الجامع (٧٤٠١) [6] مسند أحمد (٣٣٠/٢)

جب انسان نے سہو اور غفلت کی تو شیطان نے وسوسہ ڈالا، پھر جب اس نے اللہ کا ذکر کیا تو شیطان ہٹ جاتا ہے۔ یہی قول امام مجاہد اور قتادہ رحمہما اللہ کا ہے۔ سلیمان والدِ معتمر نے کہا: میں نے سنا ہے کہ شیطان یا وسواس بنی آدم کے دل میں غمی اور خوشی کے وقت نقب لگاتا ہے اور جب وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان چل دیتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وسواس سے مراد شیطان ہے، وہ حکم کرتا ہے۔ جہاں اس کا کہنا مانا وہ گھس پڑا۔ یہ وسواس خاص طور پر بنی آدم کے سینے میں کرتا ہے یا جن و انسان دونوں میں کرتا ہے، اس میں اختلاف ہے۔ پہلی بات ظاہر ہے اور دوسرے قول کے مطابق لفظِ ناس میں غالباً جن! بھی داخل ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: ان کے حق میں استعمال "رجال من الجن" آیا ہے تو پھر لفظ ناس پر جن کا اطلاق کچھ جدت اور بدعت نہیں ہے۔[1] ﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ کے الفاظ جو ﴿يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ﴾ کی تفصیل کے طور پر ہیں قولِ ثانی کو تقویت دیتے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وسوسہ ڈالنے والا کبھی انسان ہوتا ہے اور کبھی جن۔ مراد شیاطینِ جن و انس ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا﴾ [الأنعام: ۱۱۲] ''اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان پیدا کیے تھے کچھ آدمی اور کچھ جن، جن میں سے بعض بعضوں کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تا کہ ان کو دھوکا میں ڈال دیں۔''

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے، میں بیٹھ گیا، فرمایا: اے ابو ذر! تو نے نماز پڑھ لی؟ میں نے کہا: نہیں! فرمایا: اٹھ نماز پڑھ، میں نے اٹھ کر نماز پڑھی پھر بیٹھ گیا۔ فرمایا: اے ابوذر! « تَعَوَّذْ مِنْ شَرِّ شَيَاطِيْنِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ » ''جن و انس کے شیاطین سے پناہ پکڑ۔'' میں نے کہا: کیا شیاطین الانس بھی ہوتے ہیں؟ فرمایا: ہاں۔ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! نماز کا کیا حال ہے۔ فرمایا: "خَيْرُ مَوْضُوْعٍ مَنْ شَاءَ أَقَلَّ وَمَنْ شَاءَ أَكْثَرَ" یعنی ایک بہتر تجویز کی گئی ہے جس کا جی چاہے کم پڑھے جس کا جی چاہے زیادہ کرے۔ میں نے کہا: روزے کا کیا حال ہے؟ فرمایا: "فَرْضٌ مُجْزِيٌّ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَزِيْدٌ" یعنی ایک فرض ہے جو کفایت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاس زیادہ تر ہے۔ میں نے کہا: صدقے کا کیا حال ہے؟ فرمایا: "أَضْعَافٌ مُضَاعَفَةٌ" چند در چند ہے۔ میں نے کہا: کون سا صدقہ افضل ہے؟ فرمایا: یعنی جو باوجود قلب کے، یعنی مال کی محبت کے باوجود دیا جائے، یا چپکے سے کسی فقیر کے حوالے کیا جائے۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کون سے نبی سب سے پہلے تھے؟ فرمایا: آدم علیہ السلام۔ میں نے کہا: کیا وہ نبی تھے؟ فرمایا: ہاں، نبیِ مکلم تھے، یعنی اللہ نے ان

[1] تفسیر الطبري (۷۰۹/۲٤-۷۱۱) تفسیر ابن کثیر (۷٤۹/٤، ۷۵۰)

سے بات چیت کی تھی۔ میں نے کہا: رسول کتنے ہوئے؟ کہا: تین سو اور کچھ اوپر، دس یا پندرہ اوپر بتائے۔ میں نے کہا: آپ پر جو اترا اس پر افضل کیا ہے؟ فرمایا: آیۃ الکرسی: "اَللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ"[1] (رواه أحمد والنسائي وقد أخرج هذا الحديث مطولا جدا أبو حاتم و ابن حبان في صحيحه بطريق آخر و لفظ آخر مطولا جدا)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں اپنے جی میں ایسی بات کرتا ہوں کہ اگر آسمان سے گر پڑوں تو یہ مجھے زیادہ بہتر ہے اس سے کہ وہ بات منہ سے نکالوں۔ فرمایا: «اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَللّٰهُ أَكْبَرُ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ رَدَّ كَيْدَهُ إِلَى الْوَسْوَسَةِ»[2] (رواه أحمد وأبو داود والنسائي) "اللہ اکبر اللہ اکبر سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے اس کی تدبیر کو وسوسہ بنا دیا۔" حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آخِرُ التَّفْسِيْرِ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ انتہیٰ.

فتح البیان کا بیان:

فتح البیان کا بیانِ فاتح یہ ہے کہ رب کے معنی ہیں: مربی و مصلحِ احوال۔ اللہ ساری مخلوق کا رب ہے، پھر جو اس جگہ ﴿ بِرَبِّ النَّاسِ ﴾ فرمایا تو اس لیے کہ شرفِ ناس پر دلیل ہو اور نیز اس لیے کہ یہ پناہ مانگنا، اسی شر سے ہے جو ناس کے سینوں میں واقع ہوتا ہے۔ ﴿ مَلِكِ النَّاسِ ﴾ میں یہ بیان ہے کہ اللہ کی بادشاہی کچھ ویسی بادشاہی نہیں ہے کہ جس کے ہاتھ کے نیچے ممالیک (مملوک، غلام) ہوتے ہیں، بلکہ اس کی سلطنتِ قاہرہ و مملکتِ کاملہ سب پر فائق (اعلیٰ) ہے۔

﴿ اِلٰهِ النَّاسِ ﴾ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اس کی ربوبیت کے ساتھ معبودیت و الوہیت بھی لگی ہوئی ہے جس کا تقاضا ہے کہ اس کو قدرتِ تامہ اور تصرفِ کاملہ حاصل ہو اور وہ ایجاد بھی کر سکے اور نیست و نابود بھی کر سکے۔ اور کبھی رب ملک ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا، جیسے: "رَبُّ الدَّارِ وَرَبُّ الْمَتَاعِ" اور اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [التوبہ: ۳۱] "ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنایا ہے۔" اس لیے رب کے بعد ملک کا ذکر کیا، پھر کبھی کوئی ملک الہ ہوتا ہے اور کبھی نہیں، اس لیے ملک کے بعد ﴿ اِلٰهِ النَّاسِ ﴾ بھی فرمایا، کیوں کہ یہ نام مبارک اس کے ساتھ خاص ہے۔ اس کے اس وصف میں کوئی شریک نہیں۔ رب کے نام سے شروع کیا یہ اس کا نام ہے جو انسان کی اوائل عمر سے بلوغت و عقل تک اس کی اصلاح اور مختلف کاموں کی تدبیر کرتا ہے، تاکہ آدمی دلیل سے پہچان لے کہ میں ایک بندہ ہوں اور اپنے رب ملک کا غلام ہوں۔

پھر جب یہ بات جان لے کہ اس کی عبادت مجھ پر واجب ہے اور میں ایک عبد مخلوق ہوں اور وہ الہ معبود ہے

---

[1] مسند أحمد (۱۷۸/۵) سنن النسائي (۵۵۰۷) اس کی سند میں "عبید بن خشخاش" مجہول اور "ابو عمر دمشقی" ضعیف راوی ہے۔

[2] مسند أحمد (۲۳۵/۱) سنن أبي داود (۵۱۱۲) سنن النسائي الكبرىٰ (۱۷۱/۶) تفسير ابن كثير (۷۴۹/٤۔۷۵۰)

تو اب اس کا ﴿ اِلٰهِ النَّاسِ ﴾ ہونا روشن ہو گیا۔ ناس کے لفظ کو بار بار دھرانے سے اس کے مزید شرف کا اظہار ہے کہ بار بار ان کا نام لیا۔ یا پہلے لفظ ناس سے مراد اطفال (بچے) اور دوسرے سے شباب (جوان) اور تیسرے سے شیوخ (بوڑھے) اور چوتھے سے صالحین اور پانچویں سے مفسدین ہیں۔ لیکن اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ علامہ نسفی رحمہ اللہ کا یہ کلام لطائفِ بیان کے قبیل سے ہے نہ کہ تفسیرِ قرآن سے۔[1] ''وسواس'' سے مراد وسوسہ انداز ہے۔ وسوسہ حدیثِ نفس کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وسواس شیطان کے فرزند کا نام ہے۔

''خناس'' کے معنی کثیر التاخر (زیادہ ذیر کرنے والا) ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بندہ جب اللہ کا ذکر کرتا ہے تو شیطان منقبض (سمٹا ہوا) ہو جاتا ہے اور جب ذکر نہیں کرتا تو دل پر منبسط (پھیلنے والا) ہو جاتا ہے۔[2] کثیر الاختفاء (زیادہ چھپ جانے والا) ہونے کی وجہ سے اس کا نام خناس ہوا۔ ظاہر یہ ہے کہ صرف اللہ کا ذکر کرنا شیطان کو دور کر دیتا ہے، اگرچہ وہ ذکر پناہ مانگنے کے طور پر نہ ہو۔ اللہ کا ذکر کرنے میں بڑے فوائد ہیں جن کا حاصل ہونا دارین کی کامیابی ہوتا ہے۔

شیطان کی ایک سونڈ ہے، جیسے: کتے کی خرطوم (تھوتھنی)، وہ انسان کے سینے میں رکھتا ہے۔ جہاں انسان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہوا، اسی وقت وسوسہ کیا اور جہاں اللہ کو یاد کیا تو گھٹ گیا۔ امام مقاتل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شیطان خنزیر کی شکل کا ہے، خون کی طرح آدمی کی رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔ اللہ نے اس کو انسان پر مسلط کیا ہے۔[1] اس کا وسوسہ یہی ہے کہ وہ آدمی کو اپنی طاعت کی طرف بلاتا ہے، خفیہ بات سے چپکے چپکے یہاں تک کہ وہ بات اس کے دل میں اتر جاتی ہے بغیر آواز سننے کے۔

پھر فرمایا کہ یہ شیاطین دو طرح کے ہیں: ایک شیاطینِ جن یہ سینوں میں وسوسہ ڈالتے ہیں۔ دوسرے شیاطین الانس ان کا وسوسہ لوگوں کے سینوں میں اس طرح ہوتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو آدمی کے سامنے ناصح اور شفقت کرنے والا ظاہر کرتے ہیں۔ جو بات کہ شیطان کے وسوسے سے جی میں پڑتی ہے، ویسے ہی ان کی بات کا اثر انسان کے دل میں ہوتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ شیطان انسانوں کے سینوں میں جنوں اور انسانوں کی طرف سے وسوسہ ڈالتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ لفظ ناس میں انسان اور جن دونوں شامل ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ کچھ جن کے نفر آئے تھے، ان سے پوچھا: تم کون ہو؟ کہا: ''نَاسٌ مِنَ الْجِنِّ'' یعنی ہم لوگ جن ہیں اور اللہ نے ان کا نام رجال رکھا ہے۔ ﴿ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ ﴾ [الجن: ٦] ''چند انسان بعض جنات سے پناہ طلب کیا کرتے تھے۔''

احسن یہ ہے کہ مراد پناہ مانگنا ہے شرِ وسواس اور شرِ ناس سے۔ شیطانِ جن سینوں میں وسوسہ کرتا ہے اور شیطانِ انس علانیہ آتا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن اور انسان دونوں میں شیاطین ہوتے ہیں۔ ہم جن وانس کے

---

[1] تفسير النسفي (٤/٤٦٦) فتح البيان (١٥/٤٦٦) [2] تفسير الطبري (٢٤/٧١٠) [3] تفسير القرطبي (٢٠/٢٦٣)

شیاطین سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔[1] بعض نے کہا ہے کہ شیطان جس طرح انسان کے سینے میں وسوسہ ڈالتا ہے اسی طرح جن کے صدر میں وسوسہ انداز۔ "جنة" کا واحد "جنی" ہے جس طرح کہ انس کا واحد "إنسی" ہے لیکن پہلا قول تمام اقوال سے زیادہ راجح ہے اور ﴿مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ ثقلین کے ذکر کا بیان کرنے کے لیے ہے۔ ان کو ارشاد کیا ہے کہ ان دونوں میں سے جو کوئی اللہ کی پناہ مانگے گا اس سے دنیا اور آخرت کی مشکلات دور ہو جائیں گے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے۔ فرمایا: « اَلْحَالُ الْمُرْتَحِلُ » کہا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: « اَلَّذِيْ يَضْرِبُ مِنْ أَوَّلِ الْقُرْآنِ إِلَى آخِرِهِ كُلَّمَا حَلَّ اِرْتَحَلَ »[2] (أخرجه الترمذي) یعنی وہ شخص حال مرتحل ہے جو قرآنِ کریم کو اوّل تا آخر پڑھتا ہے، جب پڑھ چکتا ہے تو پھر اسے شروع سے پڑھتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جب قرآنِ کریم کی تلاوت ختم کرے تو پھر اسی وقت شروع قرآن سے پڑھے اسی نیت سے کہ پھر دوبارہ سہ بارہ۔ إلی غیر النهایة۔ ہمیشہ ایک بار ختم کر کے دوسری بار پڑھتا رہے، کتاب اللہ کی تلاوت کبھی ترک نہ کرے، اس میں قرآن کو ناظرہ پڑھنے والا اور حافظِ قرآن دونوں شامل ہیں، یہ اس لیے کہ قرآن کی تلاوت سے بڑھ کر کوئی عملِ خیر نہیں ہے۔ یہ تلاوت انواعِ اذکار اور دعوات کو بھی شامل ہے، اس میں نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے کا بھی ذکر آیا ہے۔ کتابِ عزیز کے فضائل بے حساب ہیں۔ علماء نے ان فضائل کو مستقل کتابوں میں بھی لکھا ہے اور خود کتاب وسنت میں سورتوں اور کثیر آیات کی فضیلت بھی شامل ہے۔ اس بارے میں رسالہ "فصل الخطاب في فضل الكتاب" ایک عمدہ بیان ہے جو شافی ہے اور کافی نصیحت آموز ہے، بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال ہو۔

آج تین شعبان ۱۳۰۵ ہجری روز یکشنبہ (اتوار) کو یہ ترجمہ پارہ عم کا جس کی ابتداء آٹھ رجب سنہ مذکور روز پنج شنبہ (جمعرات) کو ہوئی تھی، تمام ہوا۔ اس سے قبل مختلف اوقات میں جوں جوں فرصت ملی دس پاروں کا ترجمہ لکھا گیا ہے اور طبع بھی ہو چکا ہے۔ اس مرتبہ اس خیال سے کہ اس پارے کی سورتیں غالباً نماز میں پڑھی جاتی ہیں اور اکثر نئے سیکھنے والے بچے اس پارے کو ترجمے کے ساتھ پڑھتے ہیں، اس پارے کا ترجمہ لکھا گیا۔ ہر چند دل کا ارادہ تو یہ ہے کہ پورے قرآن شریف خصوصاً بقیہ ۱۹ پاروں کا ترجمہ لکھا جائے، لیکن کتابِ عزیز کی عظمت اور طولِ تحریرِ تفسیر کے سبب سے ہمیشہ ہمت کمی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق ساتھ ہے تو کچھ تعجب نہیں ہے کہ باقی اجزائے قرآن کا بھی اسی طرز اور عنوان کے ساتھ ترجمہ ہو جائے بشرطیکہ عمرِ فانی قدرے وفا کرے کیوں کہ اب یہ

---

[1] تفسیر الصنعاني (۴۱۰/۳)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۹۴۸) فتح البيان (۱۵/۴۶۵۔۴۶۹) اس کی سند میں "صالح مری" ضعیف راوی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۱۸۳۴)

میری آخر عمر ہے۔ ۱۲۴۸ ہجری میں ولادت ہوئی تھی، اب ۱۳۰۵ ہجری ہے۔ اب حیاتِ مستعار ۵۷ سال تک ہوگئی ہے: ﴿وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا﴾ [لقمان: ٣٤] ''کوئی (بھی) نہیں جانتا کہ کل کیا (کچھ) کرے گا۔'' میں اللہ تعالیٰ سے امیدِ واثق رکھتا ہوں کہ اس خدمت کی برکت سے میرا خاتمہ ایمان پر کرے اور مجھ کو آفاتِ دارین سے مکمل امن بخشے۔ خَتَمَ اللّٰهُ لِيْ بِالْحُسْنٰى وَزِيَادَةٍ وَرَزَقَنِيْ فِيْ الدَّارَيْنِ حُسْنَ السَّعَادَةِ وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ.

إِنَّ خَتَمَ اللّٰهُ بِغُفْرَانِهِ فَكُلُّ مَا لَاقَيْتُهُ سَهْلٌ

''اگر اللہ تعالیٰ اپنی بخشش کے ساتھ میرا خاتمہ کر دے تو میرے لیے ہر چیز کا سامنا کرنا آسان ہے۔''

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ أَجْمَعِيْنَ.